ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم معاہدہ ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے، اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اسی کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔

"ادارہ الفرقان"

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندوستان پاکستان سے

سالانہ چندہ (بسکۂ ہندوستان) ؎

سالانہ چندہ (بسکۂ پاکستان) ؎

ششماہی ... ؎

فی کاپی ... آٹھ آنے

جلد ۲۷ | بابت محرم الحرام ۱۳۷۹ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء | شمارہ ۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا، وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ر اگست تک پہنچ جانی چاہیے

پاکستان کے خریدار

اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ، اسٹریلین بلڈنگ، لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت

رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۵ر تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

افتتاحِ جلد بست و ہفتم

باسم اللہ الذی لم یزل ولا یزال حیًّا قیومًا
لہُ الملک ولہُ الحمد وھو علیٰ کلِّ شیٍٔ قدیر
ونصلّی علیٰ رسولہٖ خاتم النبیین محمدٍ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ
اجمعین

جس حیّ و قیوم نے زمین و آسمان کو تھام رکھا ہے، زمین و آسمان کی وسعتوں میں اور سب کچھ بھی اُسی کے تھامے تھما ہوا ہے۔ آفتاب کا یہ عظیم کرہ ہو یا خاک کا کوئی حقیر ذرّہ، دونوں کا وجود بھی اُسی کے امر "کُن" کا نتیجہ اور دونوں کی بقا بھی ہر لحظہ اُسی کی مشیّت سے وابستہ!

—— انسانی مصنوعات و اختراعات کا معاملہ بھی چنداں جُدا نہیں ہے۔ جب تک اس" کا ارادہ ہم آہنگ نہ ہو نہ انسانی فکر و عمل سے کوئی شئے وجود میں آسکتی ہے اور نہ اسکی بقا کا انتظام ہی اسکے بس کی بات ہے۔ انسانی فکر و عمل کا تراشا ہوا یہ کاغذی وجود جو ہر ماہ "الفرقان" کے نام سے منصّۂ شہود پر آتا ہے، اسی کارسازِ مطلق کا ارادہ تھا جو اُسے وجود میں لایا اور اُسی کی نظرِ کرم ہے جو چوتھائی صدی سے بھی اوپر سے اُسے تھامے ہوئے ہو اسی کے نام سے آج ستائیسویں سال کی ابتدا ہو رہی ہے۔

ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں
مری انتہائے نگارش یہی ہے

سب سے بڑا سانحہ

آنریبل گورنر یو۔پی شری ری وی گری نے روٹری کلب (میرٹھ) کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"آخری جنگ عظیم کے بعد ایک سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ سچائی اور دیانت داری کا جذبہ ختم ہو گیا ہے ــــ لوگوں میں ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان کا حشر کیا ہوگا۔" (قومی آواز ۲۲ جولائی ۱۹۵۹ء)

اے عشق مرحبا، وہ یہاں تک تو آگئے!

بات یہی ہے کہ سب کچھ کیے جائیے۔ پنج سالہ منصوبوں پر منصوبے بنائے جائیے، اربوں روپیہ ان منصوبوں پر خرچ کیے جائیے۔ نئے نئے اور بڑے بڑے کارخانے کھولیے۔ کوآپریٹو کھیتی کی اسکیمیں لائیے۔ "پل بنا، چاہ بنا" کے وظائف پڑھیئے۔ جمہوریت کا راگ الاپیئے۔ عوامی معیار زندگی کو بلند تر بنانے کے لیے زمین سے آسمان تک اُڑ دیجیے! لیکن اگر ہندوستان کے عوامُ خواص میں سچائی اور دیانت داری کے اوصاف نہیں پیدا ہوتے تو ہر دُور اندیش اور حقیقت شناس ان "فیض کے اسباب" کے باوجود یہی کہنے پر مجبور ہوگا کہ

نہیں معلوم ہندوستان کا حشر کیا ہوگا!

کس قدر تشویش انگیز صورت حال ہے کہ ہندوستان کا معیار اخلاق روز بروز گرتا جارہا ہے۔ مگر باتیں ہیں تو ہر دم بس "معیار زندگی" کو بلند کرنے کی! اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی، ملک کے در و بست پر قابض ہونے والوں میں سے، خال ہی خال کوئی آواز اُٹھتی ہے، اور وہ بھی ایسی جیسے "نقار خانے میں طوطی کی صدا"!

دوسری طرف یہ بھی بڑا سانحہ ہے کہ جن مشرقی ملکوں میں سچائی اور دیانت داری کا قابل رشک سرمایہ پایا جاتا ہے، وہاں اس سرمائے سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جارہا ہے، اور صرف روزمرہ کی محدود سی زندگی میں یہ سرمایہ کام آرہا ہے۔ سرزمین پاک (حجاز) سے ہر سال حجاج کے ذریعہ کچھ خوش کن خبریں مل جاتی ہیں۔ امسال بھی نہایت معتبر حجاج سے یہ ایک واقعہ سننے میں آیا ہے، کہ ایک عرب تاجر کی دوکان سے دس لاکھ ریال کی چوری ہوئی۔ ملزم عین حجاز کی سرحد پر گرفتار کیا گیا۔ گرفتار کرنے والا صرف ایک

کانسٹبل تھا۔ تیسرا ان دونوں کے درمیان کوئی نہ تھا، ملزم نے رشوت کی پیش کش کرنی شروع کی، اور آخر میں بات پورے کے پورے دس لاکھ پر پہنچ گئی۔ مگر اُس عرب سپاہی کی دیانت کو یہ دس لاکھ کی مار سوت بھر بھی ادھر سے اُدھر نہ کر سکی۔ اور اُس نے ملزم کو لے جا کر قاضی کے سامنے پیش کر دیا ــــــ یہ واقعہ اتنا مصدقہ ہے کہ ملزم چونکہ (ہماری بد قسمتی سے) ہندوستانی تھا اس لیے اس کی رپورٹ حکومت ہند کو بھی مل چکی ہے۔

اہل حجاز کی دیانت داری صرف پولس ہی تک محدود نہیں ہے کہ ڈسپلن کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔ وہاں باہمی، بلکہ آفاقیوں کے ساتھ بھی، اعتماد کی جو فضا ہر دیکھنے والے کو نظر آتی ہے اور ہم ہندوستان و پاکستان والوں کو تو خصوصاً محو حیرت کر دیتی ہے۔ وہ صرف اسی سچائی اور دیانت داری کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر کسی کو ایک دوسرے کے متعلق دغدغہ نہیں ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عظیم و نایاب سرمایہ بھی ہے اور قومی دولت کے وسائل و ذخائر کی بھی کوئی انتہا سرزمین پاک میں نہیں۔ لیکن ان دو سرمایوں کے ملنے سے جو ترقیاتی کام مملکت میں ہو سکتے تھے اُن کے خانے میں اب تک صفر ہی صفر نظر آتا ہے۔

پہلی سالگرہ کا تحفہ

بغداد کی خبر ہے کہ

"اس ہفتہ یہاں مسلمان لڑکیوں نے پردہ ترک کر کے مردوں کی بر ابری کا اعلان کر دیا ہے ــــ عراق پانچ روز سے ۱۴ جولائی کے انقلاب کی سالگرہ پر خوشیاں منا رہا ہے اس دوران لڑکیوں نے انقلاب کی خوشی میں بغیر کسی جھجک کے رقص کیا۔"

(قومی آواز ۲۰ جولائی)

اس کے مقابلے میں ایک خبر یہ ہے کہ

"نیویارک (امریکہ) میں ــــ طلبا کی طرف سے دیے گئے ایک خیر مقدمی جلسے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن (نائب صدر جمہوریہ ہند) نے تمیر ۲۰ ہندوستانی لڑکیوں کو ناچنے اور گانے کی دعوت دی۔ ہندوستان کے مستقل مندو ــــ مسٹر

سی، ایس، جھا اور قونصل جنرل سٹرگو پالامینن نے لڑکیوں کو بڑھاوا دیا لیکن کسی لڑکی نے جرأت نہیں دکھلائی۔

اس کے بعد نائب صدر نے لڑکیوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ناچنا گانا ہندوستان کی روایات کا جز و ہے۔ آپ لوگوں کو اپنی میراث نہ چھوڑنا چاہیے۔ بڑی مشکل سے کچھ لڑکیاں گانے پر آمادہ ہوئیں۔ لیکن ناچنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوئی"

(ایضاً ۱۹ر جولائی)

کہیے اس پر کیا تبصرہ کیا جائے ـــــ ایک قوم کے یہاں ناچنے گانے کی کوئی جگہ نہیں، اور پردہ اس کی روایات کا عظیم جزو ہے۔ مگر وہاں انقلاب کی سال گرہ کی خوشی کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک رقص نہ فرمایا جائے اور پردے کی روایات کو تار تار نہ کر دیا جائے۔ دوسری طرف ناچنا گانا ایک قوم کی عظیم میراث ہے، مگر اس کی لڑکیاں بلادِ رقص و سرود میں رہتے ہوئے اس روایت سے شرما رہی ہیں۔ اُن کے ملک کا نائبِ صدر فرمائش کرتا ہے، قونصل جنرل بڑھاوا دیتا ہے مگر وہ بصد شرم گانے سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوتیں ـــــ یا مظہر العجائب !!

سچ ہے کہ اسلام کو اب ایک نئی قوم کی ضرورت ہے! ـــــ دیکھیے یہ سعادت کس کی طرف جاتی ہے؟ لیکن یہ ہونا بہرحال ہے۔ قرآن کا واشگاف اعلان ہے:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ	اگر تم پھر گئے تو خدا (اپنے دین کے لیے) تم سے کسی اور قوم کو بدل دے گا اور پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

(محمّد۔ ع)

اور کہیں کہیں کچھ ظاہری آثار بھی نظر آرہے ہیں ـــــ مگر یہ ہوگا بڑا حسرتناک واقعہ کہ اسلام کی گود میں پلے ہوئے الحاد کو گلے لگائیں، اور کوئی پروردۂ کفر اٹھ کر اسلام کی آنکھ کا تارا بنے۔

وسیع نقطۂ نظر

یو، پی کے وزیر اعلیٰ شری سمپورنانند نے ریاست کی "سماجی فلاح تخمینہ کمیٹی" کی افتتاحی تقریر میں ناجائز بچوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> " ناجائز اولاد کا ایسا کوئی مسئلہ پرانے ہندو سماج میں نہیں تھا۔ اس لیے کہ قدیم سماج میں آٹھ قسم کی شادیاں تسلیم کی جاتی تھیں ـــــ قدیم ہندو سماج کے اس وسیع نقطۂ نظر کے نتیجے میں ہر بچہ جائز اولاد قرار دیا جاتا تھا، کیونکہ وہ اپنے والدین کی خطاؤں کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔"

موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر فرمایا کہ

> " سماجی نقطۂ نظر میں انقلاب لانا ، سماجی فلاح کا اتنا ہی اہم جزو ہے جتنا کہ معذور اور بدنصیب اشخاص کی امداد کرنا ۔"
>
> (قومی آواز ۔ ۲۳ر جولائی)

جہاں تک بچے کے بے گناہ اور معصوم ہونے کا تعلق ہے، صحیح بات ہے۔ اور اس سماجی نقطۂ نظر میں بے شک تبدیلی ہونا چاہیے جس کے تحت ناجائز بچوں کے ساتھ بھی خطاوار کا سا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مگر نقطۂ نظر کی یہ وسعت اگر مطلوب ہے کہ اس طرح کی ولادتوں کو سندِ جواز بھی دے دی جائے تو یہ نقطۂ نظر سماج کی بہبودی کا نہیں "خرابیِ بسیار" کا حامل ہو گا۔ ناجائز طور پر جو بچے وجود میں آجاتے ہیں اُن کی زندگی کا حل ضرور نکالنا چاہیے۔ اور سماجی نقطۂ نظر میں ایسی اصلاح کرنی چاہیے کہ ان بے گناہوں کی زندگی اجیرن نہ ہو۔ لیکن ایسا حل کہ جس سے ان بچوں کے " ماں باپ " کی خطاکاری بھی جائز ہو جائے کسی سماج کی طرف سے اس بات کا اعلان ہے کہ وہ ان خطاکاریوں کو روکنے سے قاصر ہے! ـــــ اسلام نے بھی اس طرح کے بچوں کو پوری انسانی عزت کے ساتھ سماج میں جگہ دینے کی تلقین کی ہے۔ مگر اُس میں یہ قوت تھی کہ وہ ناجائز تعلقات کو روک سکے، اس لیے اُس نے بلا تامل ان چاروں قسم کی "شادیوں" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھیں، اور جن کے خوبصورت نام کے ذریعہ قبل اسلام کا عرب سماج ناجائز تعلقات کے بارے میں اپنی بے بسی کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔

اور صرف ایک طریقہ مقرر کیا۔ اسلام نے مؤثر عقائد و اعمال اور معاشرتی ضابطوں کا ایسا حصار انسان کے گرد کھینچا کہ اگر کسی سے بھولے بھٹکے یہ جرم سرزد ہو بھی گیا تو اُس نے خود کو باصرار سزا دلوانے کا وہ رویہ اختیار کیا جو بجائے خود معاشرے میں زنا سے نفرت کا ایک عظیم نفسیاتی محرک اور ایسا خاموش مبلّغ کہلانے کا مستحق ہے، جس کے سامنے سیکڑوں تدبیریں اور تقریریں ہیچ ہوں۔

افسوس! تاریخ کا ایسا کھلا تجربہ سامنے ہوتے ہوئے بھی لوگ یہ سوچنا نہیں چاہتے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ جو کچھ سوچ سکتے ہیں بس یہ کہ آج جو جنسی انارکی اور آوارگی ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے کس فلسفے کی رو سے اُسے جائز کر کے اپنے ذہن کو اس جنجال سے نکال لیں ــــــ مگر اس میں ذمہ داری حال کے مسلمان معاشرہ کی بھی کم نہیں ہے۔ کاش اس چیز کو ایک گزشتہ تجربہ کہہ کر جھنی کی طرف اشارہ نہ کرنا پڑتا، بلکہ حال میں بچشم خود مشاہدے کی دعوت دی جا سکتی تو شاید آج کے انسان کو اپنے مسائل کی تلاش میں اس طرح بھٹکنا نہ پڑتا۔

تنگیٔ نظر!! ایک طرف ہمارے وزیر اعلیٰ کی وسعتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ وہ ناجائز بچوں کے ساتھ حُسن سلوک ہی پر راضی نہیں بلکہ ناجائز ولادتوں کو بھی جائز تسلیم کرانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ تنگی نظر کہ اُردو جو مادرِ ہند کی مصدقہ طور پر جائز اولاد ہے اُس کے دو چار حرف بھی ان کے اقتدار میں اس طرح دھکّے کھاتے ہیں کہ سماج میں ناجائز بچے کیا وہ دھکّے کھاتے ہوں گے۔

اس سے اشارہ اُس کشاکش کی طرف ہے جو یو، پی کے ایوان بالا کے اپوزیشن لیڈر اور ایوان کے سرکاری افسران کے درمیان، حال ہی میں بڑی شدّت کے ساتھ اس مسئلے پر برپا رہی ہے کہ آیا مخالف لیڈر (اپنے نام کا) اُردو سائن بورڈ بھی اُس کمرے پر لگا سکتا ہے جو اُسے کونسل ہاؤس میں سرکار کی طرف سے ملا ہوا ہے! اخبارات نے انکشاف کیا ہے کہ مخالف لیڈر نے یو، پی لیجسلیٹو کونسل کے افسران سے اس کی خواہش کی کہ اُن کے سائن بورڈ پر ہندی اور انگریزی کے ساتھ ایک طرف اُردو بھی لکھوا دی جائے۔ جس کی تعمیل نہ ہونے پر لیڈر مذکور نے اپنی طرف سے اُردو سائن بورڈ تیار کرا کر آویزاں کر لیا۔ لیکن افسران مذکور نے اُسے دیکھتے ہی ہٹا دیا۔

اس پر ذمہ داروں سے رجوع کرنے پر مخالف لیڈر کو یہ جواب ملا کہ

"حکومت یو، پی کا حکم ہے کہ سرکاری دفتروں اور سرکاری عمارتوں پر سوائے
ہندی کے کسی اور زبان میں سائن بورڈ نہ لگایا جائے !"

اس کے بعد کشاکش باہم جو ... بد کہ مخالف لیڈر نے ایک تاریخ مقرر کر کے نوٹس دیا کہ اگر اس تاریخ تک اُن کی خواہش کی تعمیل نہ ہوئی تو وہ خود اپنی مرضی کا سائن بورڈ لگائیں گے، اور اس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری لیں گے۔ تب کہیں جاکر ہمارے وسیع النظر وزیر اعلیٰ کی حکومت میں یہ "وسعتِ نظر" پیدا ہوئی ہے کہ اُردو کا سائن بورڈ جو ہٹا لیا گیا تھا وہ لاکر مخالف لیڈر کے کمرے پر آویزاں کر دیا گیا۔

ہائے اُردو ! جو ناجائز اولاد سے بھی گئی گزری ہوگئی۔ اور اس کے چار لفظ بھی اُس وقت تک ناقابل برداشت ہیں جب تک کوئی سخت قسم کا والی وارث دھمکی سے نہ بات کرے۔

آپس ہی میں !

خبر ہے کہ

" جون پور میں ایک تعزیے کے راستے کے مسئلے پر شیعہ سُنیوں میں ہنگامہ ہوا، اور پولیس کو مداخلت کرنا پڑی ۔"

(قومی آواز ۲۴ر جولائی)

بریں عقل و دانش بباید گریست

آج بھی شیعہ سُنیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو آپس ہی میں سر پھٹول کریں ؟ کیا باہر سے اُنھیں بالکل اطمینان حاصل ہے کہ خانہ جنگی سوجھنے لگی ؟

جوڑے کی رسم

حیدر آباد دکن سے ہمیں ایک لمبا چوڑا مضمون "جوڑے کی رسم" سے متعلق اس بنیاد پر موصول ہوا ہے کہ اس میں بعض دوسروں کے ساتھ "تبلیغی جماعت کو بھی ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ مضمون بھیجنے والی ایک خاتون ہیں اُنھوں نے ہمیں لکھا ہے کہ ہم اگر ایماندار ہیں تو اس مضمون کو بے کم و کاست "الفرقان" میں

شائع کریں۔

مضمون اگر سنجیدگی اور شائستگی کے تقاضوں سے گرا ہوا نہ ہوتا اور اس طول و عرض کا نہ ہوتا کہ الفرقان کے قریب قریب دو نمبر اس میں سما جائیں تو ہم ضرور اس کی اشاعت پر غور کرتے۔ موجودہ صورت میں افسوس ہے کہ وہ بالکل قابل غور بھی نہیں ہے ۔۔۔۔ البتہ اس میں جوڑے کی رسم کی جو حقیقت بتائی گئی ہے (جو بہار کی تلک کی رسم سے ملتی جلتی ہے[1]) اس کی بنا پر ہمارے لیے یہ کہنا ضروری ہے کہ اگر اس رسم کی حقیقت یہی ہے تو کوئی شبہہ نہیں کہ شریعت کے، شریعت کے مزاج کے اور اسلام کے ظاہری اور باطنی تقاضوں کے بالکل خلاف ہو۔ اور وہ لوگ جو قولاً یا عملاً اس کی تائید کرتے ہیں، خواہ تبلیغی جماعت کے ہوں یا جماعت اسلامی کے یا کسی اور حلقے کے، وہ یقیناً سخت مجرم اور خاطی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تبلیغی جماعت یا جماعتِ اسلامی سے گہری اور ذمہ دارانہ وابستگی رکھنے والے کس طرح ایک ایسی قبیح رسم کی تائید کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ میں ایسا ہے اور اس رسم کی حقیقت بھی کم و بیش وہی ہے جو اس مضمون میں بیان کی گئی ہے، تو یہ ان لوگوں کی زندگی کا بڑا افسوس ناک تضاد ہو۔ اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

---

[1] اس رسم کی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ شادی میں لڑکے والے لڑکی والوں پر مطالبات کا غیر معمولی بار ڈالتے ہیں اور بالفاظ دیگر نہایت ذلیل قسم کی سودے بازی کرتے ہیں۔

ماہنامۂ پیامِ مشرق لاہور کے متعلق

زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت علامۂ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی رائے

ماہنامۂ پیامِ مشرق پاکستان کا علمی مذہبی اور دینی رسالہ ہے جو ایک عرصہ سے مسلمانوں کی اصلاحی تربیتی اور دینی خدمات انجام دے رہا ہے، وقت کے تقاضوں کے مطابق موزوں اور برمحل عنوانات پر سیر حاصل بحث کرنا پیامِ مشرق کا خاص موضوع اور کامیاب موضوع ہے، مضامین معیاری اور محققانہ ہوتے ہوتے ہیں جس سے دلوں کے خلجانات رفع ہوتے ہیں، آج کے دور میں مسلمانوں کی فکری اصلاح کے لیے ایسے ہی رسائل کی ضرورت ہے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس رسالہ کو قبول فرما کر مسلمانوں کے لیے نافع فرمائے۔ والسّلام

محمد طیّب غفرلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ۲۱ر شوال ۱۳۸۸ھ

ماہنامۂ پیامِ مشرق لاہور

- ★ اس میں پیام ہے دہریت، نیچریت اور قادیانیت سے بچنے کا۔
- ★ پیام ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر شرک و بدعات میں ملوث ہو چکے ہیں۔
- ★ پیام ہے تزکیۂ نفس کا ان کے لیے جو دنیا کی ہوس میں پھنس کر رضائے الٰہی سے دور ہو گئے ہیں۔
- ★ پیام ہے سلف صالحین کا آج کے خلف کے لیے کہ جن بزرگوں کے ذریعہ سے ہم تک اسلام پہونچا ہے ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں۔
- ★ پیام ہے آج کے ان مجتہدوں کو جن کا خیال ہے کہ ائمۂ دین اور محدثین عظام اسلام سمجھنے سے قاصر رہے۔
- ★ الغرض "پیامِ مشرق" ہے مغرب زدہ لوگوں کی اصلاح کے لیے۔
- ★ آپ بھی پیامِ مشرق قبول کیجیے اور اپنے شہر کے ایجنٹ سے طلب فرمائیے۔
- ★ زرِ چندہ سالانہ پانچ روپے آٹھ آنے فی پرچہ آٹھ آنے نمونہ کا پرچہ چار آنے کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔

نوٹ:۔ ہندوستان میں ترسیلِ زر کا پتہ۔ ناظم کتب خانۂ امداد الغرباء سہارنپور (انڈیا)

مینجر ماہنامۂ پیامِ مشرق، شیرانوالہ گیٹ لاہور

اشتہار کی تمام تر ذمہ داری مشتہر حضرات پر ہے۔ —— (ادارۂ الفرقان)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

اندازِ فکر میں انقلاب کی ضرورت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی[1] ——— مترجمہ مولوی احسان الحق صاحب ندوی

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں　　نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

اس وقت ہم مسلمانانِ عالم، "امت مسلمہ" کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں اور اس کو جس نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں وہ فکر و نظر کا ایک افسوس ناک انقلاب ہے، ایک طویل عرصہ سے ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ امت مسلمہ اس سے زیادہ کچھ حیثیت و حقیقت نہیں رکھتی کہ وہ دنیا کے بہت سے انسانی جتھوں میں سے ایک جتھا ہے جو اس رُبع مسکون کے مختلف حصوں میں تقسیم ہو، مختلف ملکوں اور مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا ہو، اس میں مختلف قوموں، نسلوں اور ملکوں کے لوگ شامل ہیں، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مقامی معاشرت و معیشت رکھنے والے اس کے حلقۂ منتسبین میں ہیں، جگہ جگہ اس کے گرد و پیش مخصوص مقامی حالات و مخصوص ماحول ہے، اس کی طاقتیں اور صلاحیتیں اور اس کے مادی وسائل و ذرائع ہر جگہ محدود ہیں ——— اس کی ان مختلف و مختلف شاخوں اور حصوں میں قدر مشترک دو ——— اور صرف دو ——— مسلّم بنیادیں اور حقیقتیں ہیں، ایک "عقیدہ کی وحدت" دوسری "مغرب کی دریوزہ گری اور مرعوبیت" اور سیاست و معیشت میں اس پر کلی انحصار و اعتماد۔"

دنیا کے نقشہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اپنی ذات اور اپنی قیمت و حیثیت کا اندازہ

---

[1] یہ مضمون دمشق کے بین الاقوامی اسلامی رسالہ "المسلمون" کے افتتاحیہ کے طور پر حال ہی میں لکھا گیا۔

ہم انھیں طاقتوں اور انھیں مادی وسائل و امکانات ـــــــ مواد خام، ملکی آمدنی و تحصیل، تعدادِ نفوس اور فوجی طاقت و قوت ـــــــ کی بنیادوں پر کرتے ہیں، اسی میزان و معیار پر ہم اپنے کو تولتے ناپتے ہیں، اور فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں ملک و مقام پر ہم کچھ قوی ہیں، ہمارا پلڑا بھاری ہے اور فلاں ملک و مقام میں ہلکا، بعض وقت ہم کو اپنا وجود بالکل بے وزن نظر آنے لگتا ہے اور بعض حالات میں ہم اپنے کو موثر اور وزنی محسوس کرنے لگتے ہیں، بحیثیت مجموعی ہم اپنی کوئی خاص طاقت و قیمت نہیں پاتے۔

ہم نے آج مغرب کی امامت و پیشوائی کو ایک ناگزیر اور لابدی شے سمجھ لیا ہے، اس پر اس طرح ایمان لے آئے ہیں جیسے اس میں کسی تغیر و تبدیلی کا امکان ہی نہیں، تاریخ اسلام میں ایک وقت آیا تھا جب مسلمانوں کی زبانوں پر یہ فقرہ چڑھا ہوا تھا" اذا قیل لک ان التتر انھزموا فلا تصدق"! (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو یقین مت کرنا[1]) مسلمانوں کی بدقسمتی سے یہی جملہ ایک دوسرے عنوان سے پھر مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے، اور اب کا عقیدہ و ایمان بنتا جا رہا ہے کہ مغرب ناقابل شکست ہے اور موجودہ حالات میں تبدیلی خارج از بحث ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مغرب سے آنکھیں ملانے کا تصور تک نہیں کر سکتے، اور اگر کبھی ہم اپنی " دانش مندی و دور اندیشی" اور علم و مطالعہ و تجربہ سے نظریں بچا کر اسکی مخالفت کا تصور دل میں لاتے بھی ہیں تو ہم اپنے امکانات و وسائل اپنی مادی قوت و طاقت عسکری صلاحیت اور جنگی انتظامات کا جائزہ لینے لگتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جدید ایجادات اور ایٹمی آلات حرب میں ہمارا کیا حصہ ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم پر یاس و حرماں نصیبی اور اپنی شومئ قسمت کا احساس طاری ہو جاتا ہے، ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم دنیا میں ضعف و پستی اور ذلت و خواری ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، ہماری اپنی کوئی زندگی نہیں،

---

[1] ساتویں صدی ہجری میں جبکہ تاتاری عالم اسلام پر چڑھ آئے تھے اور اس سرے سے اس سرے تک ان سے مرعوبیت اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جملہ اسلامی معاشرے میں زبان زد خاص و عام تھا، اور تاریخ میں بالفاظہ منقول و ماثور ہے۔

ہم مغربی قوموں کے حاشیہ بردار اور دست نگر ہی بن کر زندگی گزار سکتے ہیں، زندگی کی اس دوڑ میں خود ہمارا کوئی حصہ نہیں، ہم دنیا کے اس اسٹیج پر کوئی اہم پارٹ ادا نہیں کر سکتے، ہماری قسمت میں یہی مقدر ہے کہ ہم مغرب کے دو "حریف خاندانوں" میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیں اور اسکے رحم وکرم پر زندگی گزاریں۔

یہی اندازِ فکر ہے جو آج تمام عالم اسلام پر چھایا ہوا ہے، تمام مسلم اقوام و مسلم ممالک اسکے شکار ہیں، کیا عرب، کیا عجم، ہر جگہ یہی ذہن کام کر رہا ہے، ممالک عربیہ سے لیکر پاکستان انڈونیشیا و ترکی تک کے مسلمان اسی طرز پر سوچنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ہندوستان، چین، سیام، و برما (جہاں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں لیکن کثیر تعداد میں ہیں) اس سے آگے ایک حرف نہیں سوچتے، اسی اندازِ فکر کو اس وقت تمام اسلامی دنیا میں صحیح، دانشمندانہ اور علمی اندازِ فکر سمجھا جاتا ہے، اور یہی بلند سے بلند پروازِ فکر ہے،

لیکن تاریخ عالم بتلاتی ہے کہ اسی عالم اسباب و عالم مادی میں ایک جماعت انسانی ایسی بھی پائی گئی ہے جو اس اندازِ فکر اور اس منطق و استدلال کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہو۔ اس جماعت کا اپنا ایک مخصوص طریقِ فکر و طریقِ عمل ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس جماعت کے افراد نے اپنے مقاصد میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی ہے، دنیا کے تمام انقلابات میں اصلح و افضل، اعلیٰ و مفید تر انقلابات کا وجود انھیں کے دم سے ہوا، ان کے اس اندازِ فکر پر تاریخ کے ان قوی ترین و عظیم ترین انقلابات کی بنیاد ہے جنھوں نے دنیا کے مسلّمات و مزعومات اور رسوم و قیود کو اس طرح بدل ڈالا ہے کہ عالم انگشت بدنداں رہ گیا ہے، یہ وہ انقلابات ہیں جنھوں نے ایک طویل مدت کی سیاہ بختی کے بعد دنیا کو آفتاب سعادت کا نور بخشا ہے، اور ایک وسیع ابتری، ایک عالمگیر فساد کے بعد معاشرہ انسانی کو طمانینت و راحت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

تنہا یہی وہ طریقِ فکر ہے جس میں ان پسماندہ و شکست خوردہ، کمزور و بے سامان قوموں کے لیے نویدِ جانفزا ہے، جن کے پاس دنیا کے لئے کوئی صالح و صحیح دعوت و پیغام ہو۔

کوئی امت جس کا سرمایۂ امید اور منتہائے علم و نظر محض علم اسباب و خواص اشیاء ہی ہو، جو مادیات و محسوسات اور ساز و سامان اور اس کی کثرت و فراوانی ہی پر سارا دار و مدار و انحصار سمجھتی ہو، جس کا یقین ان اشیاء عالم و مادیات عالم سے آگے کسی چیز پر نہ ہو۔ اور پھر جس چیز پر اس کا یہ یقین و ایمان ہے اس میں وہ دیوالیہ بھی ہو ۔۔۔ تو اس کے لیے سوائے مایوسی و افسردگی اور نوحہ و ماتم کے اور کیا ہے؟ اُس کی ناامیدی و یاس کا کیا ٹھکانا جس کے درد کی دوا موت کے سوا کچھ نہ ہو۔

مختصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

آپ سوال کریں گے، کہ ایسی بھی کوئی جماعت ہو سکتی ہے جو اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے سوچ سکتی ہو، اور اگر ہو بھی سکتی ہے تو پھر وہ کامیاب و بامراد بھی ہو سکتی ہے؟ آپ اس کے لیے تاریخ کی کوئی مثال اور کوئی عملی نمونہ چاہیں گے، ذرا ماضی کے اوراق الٹیئے، اور "صحف صادقہ" اور وحیٔ آسمانی کی طرف کان لگائیے۔

سرزمین مصر پر ایک ظالم و جابر "بادشاہ" فرمانروا ہے، جس نے قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، انکے ساتھ جانوروں اور چوپایوں کا سا معاملہ کرتا ہے، ان کے اندر نہ کوئی حوصلہ اور امنگ ہے نہ کوئی ولولہ اور جوش، انکا "حال" پریشان مستقبل تاریک تعداد کے اعتبار سے ایک حقیر اقلیت، سامان کے لحاظ سے فقیر و بے بضاعت، اہمیت کے اعتبار سے حقیر و بے حیثیت، دشمن قاہر و زبردست، ظالم و بے درد، خود بیکس و بے بس، بے یار و مددگار، نہ دوست نہ غمخوار، نہ حامی نہ مددگار، ایک حتمی و یقینی انجام۔ ہلاکت۔ آنکھوں کے سامنے، اور انجام سے پہلے جب تک زندہ ہیں بدبختی و بدنصیبی، مصیبت و کلفت زندگی کے ساتھ، ننگ بر ہراحت یہ کہ ظالم نسل کشی پر آمادہ، اور قومی زندگی کے بقا و تسلسل کا دشمن ہے۔

اس خونی، بھیانک اور ہلاکت خیز ماحول میں موسیٰ پیدا ہوتے ہیں، فرعون جو بادشاہ وقت ہے، چاہتا ہے کہ موسیٰ پیدا نہ ہوں مگر وہ پیدا ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ زندہ نہ رہیں مگر وہ زندہ رہتے ہیں، لکڑی کے ایک سربمہر صندوق میں رہنا پڑتا ہے

مگر وہ وہاں بھی زندہ رہتے ہیں، نیل کی بے شعور و بے درد موجوں کے حوالے کر دئیے جاتے ہیں مگر پھر بھی زندہ رہتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ کی قدرت اپنا تماشہ دکھاتی ہے کہ وہ اپنے سب سے بڑے دشمن، خونی و وحشی جلّاد کی گود اور اسکی حفاظت و نگرانی میں پلتے بڑھتے ہیں، دوربین، بیدار مغز پولیس کی عقابی نگاہوں سے وہ مستور و مخفی رہتے ہیں، پھر انکو مصر سے جلا وطن ہونا پڑتا ہے، مسافرت و کس مپرسی کی حالت میں ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں، لیکن اللہ ان کے لیے ایک باعزّت و کریمانہ ضیافت کا انتظام کرتا ہے حتیٰ کہ اس اجنبیت و غربت میں ان کے لیے اسباب سکینت و طمانیت (لتسکنوا الیہا) بھی مہیا فرماتا ہے ــــــ پھر وقت آتا ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر واپس ہوتے ہیں اثنائے راہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے، راستہ بھیانک و سنسان ہے کہ اہلیہ محترمہ دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہیں، موسیٰؑ کو آگ کی تلاش ہوتی ہے، تاکہ بیوی رات کی اس ناقابل برداشت سردی میں کچھ تاپ کر آرام حاصل کر سکیں، لیکن یہاں قدرت الٰہی کچھ اور کرشمے دکھاتی ہے آگ کی تلاش کے نتیجہ میں انھیں وہ نور اور وہ روشنی حاصل ہوتی ہے جس سے سارے عالم کو منور و فیض یاب ہونا ہے، موسیٰؑ صرف ایک عورت کے لیے مدد و چارہ سازی چاہتے ہیں لیکن اللہ انھیں اس وقت کی تمام انسانیت کی چارہ سازی اور سامان راحت و سکینت عطا فرماتا ہے اور انھیں پیغمبری و رسالت کی دولت و عزّت سے سرفراز فرماتا ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھئے احوال ۔۔۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

موسیٰؑ فرعون کے پاس آتے ہیں، فرعون اپنی شان و شوکت اور اپنے نشۂ حکومت و سطوت میں سرشار ہے، اپنے رؤسا و انصار اور مصاحبین و اہل دربار کے ساتھ سریر آرا ہے، یاد رہے کہ یہ وہ موسیٰ ہیں جن کی کل تک تلاش تھی، اور جن کے قتل و گرفتاری کے لیے فوج اور پولیس سرگرداں تھی، جرم ان پر ثابت ہو چکا ہے، اس جرم کے بجواب وہ اور مدعا علیہ ہیں، مزید یہ کہ زبان میں لکنت بھی ہے ــــــ ان کا پہلو اور موقف ہر اعتبار سے کمزور، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرعون، اسکے مصاحبین و اہل دربار، ان کے پیغام و دعوت، انکے عقیدہ و ایمان اور اسکی صداقت و حقانیت پر ان کے بحث و استدلال اور

ان کے اظہار و اعلان پر غضبناک ہو جاتے ہیں، فرعون ساحران مصر کو موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے بلاتا ہے تاکہ ان کے زورِ فن سے معجزات موسیٰؑ کا جواب دے اور ان کو بیکار و غیر مؤثر ثابت کرے، کہ اس نے ان کو بھی مداری کا کرتب اور جادو کا کھیل سمجھا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی بالکل خلاف امید اور ظاہر اسباب کے برعکس موسیٰؑ ہی کا پلہ بھاری رکھتا ہے سارے کے سارے جادوگر دیکھتے ہی دیکھتے سپر انداز ہو جاتے ہیں، موسیٰؑ کی برتری تسلیم کر لیتے ہیں، اور زبان سے کہتے ہیں اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ (ہم ایمان لائے مالک دوجہاں پر، ہم ایمان لائے موسیٰؑ و ہارون کے رب پر)

ابھی اور سنیئے، موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات سرزمین ظلم و جور سے نکال کر مقام امن و نجات کی طرف لے جاؤ، فرعون کو پتہ لگ جاتا ہے، وہ اور اسکی افواج پیچھے پیچھے ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی مصلحت و مشیت یوں نمودار ہوتی ہے کہ موسیٰؑ راستہ بھول جاتے ہیں اور بجائے شمال و مشرق کے عین مشرق کی سمت رواں ہوتے ہیں ــــــ پیدا گئے کہ کر کے ساتھ ساتھ سمندر کی لہریں جھلملاتی نظر آئیں، سامنے لہریں لیتا ہوا سمندر تھا پیچھے مڑ کر دیکھا تو ظالم دشمن کی فوجوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا، بنو اسرائیل کی حالت چکی کے دو پاٹ کے درمیان حقیر و بے بس دانۂ گندم کی تھی، کہ اللہ کی مدد ــــــ وہی خلاف قیاس و خلاف اسباب و خلاف عقل و فہم مدد ــــــ نمودار ہوتی ہے، سمندر پایاب ہو جاتا ہے، کئی جگہ سے پانی پھٹ جاتا ہے، سمندر پر خشکی کے راستے بن جاتے ہیں اور وہ رکا ہوا پانی بلند ٹیلوں اور عظیم دیواروں کی شکل میں کھڑا ہو جاتا ہے، موسیٰؑ اور ان کی قوم سمندر عبور کر لیتی ہے، فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ انھیں راستوں پر چل پڑتا ہے، لیکن سمندر کی پُرغضب موجیں فرعون اور اسکے پورے لشکر کو لقمۂ نہنگ بنا لیتی ہیں، اور ہمیشہ کے لیے وہ سب وہیں غرق ہو جاتے ہیں۔

آپنے دیکھا کہ کس طرح فرعون اور اسکی ساری کی ساری طاقتور، دولتمند اور اسباب و وسائل سے ہر طرح لیس و مسلح قوم ایک بے سروسامان، و بے ہتھیار قوم کے مقابلہ میں ہلاک ہو کر رہ گئی، اور بالآخر وہی مفلس و بے ساز و سامان قوم بنی اسرائیل زمین کی

مالک و مختار بنی۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا	اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو
يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ	کمزور ہو رہے تھے اس زمین کے مشرق و
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا	مغرب کا کہ جس میں ہم نے برکت رکھی ہے،
وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ	اور پورا ہوا تیرے رب کا اچھا وعدہ
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا	بنی اسرائیل پر، اس بنا پر کہ وہ ٹھہرے
وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ	رہے، اور برباد کر دیا ہم نے وہ جو بنایا تھا
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا	فرعون اور اسکی قوم نے اور وہ جو انگور
يَعْرِشُونَ۔	چڑھایا کرتے تھے چھتریوں پر۔

آپ ذرا غور کریں وہ کون سی طاقت ہے اور اس میں کیا راز ہے جس کی بنا پر موسیٰؑ نے اپنے ملک اور اپنے زمانے کی سب سے بڑی طاقت پر غلبہ حاصل کیا، اور بنی اسرائیل جیسی نہتی قوم نے اپنے کثیر التعداد اور کثیر الوسائل حریف پر فتح پائی، وہ کون سا ہتھیار ہے جس کو لے کر انھوں نے عظیم الشان اور زبردست دشمن کا مقابلہ کیا اور اسے زیر کیا، اور اپنے باغی و حیات کش ماحول کو اپنے ہم مرضی اور تابع بنا لیا۔

موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں آپ نے بارہا پڑھا ہوگا، ایک مرتبہ پھر اس نقطۂ نظر سے اور اس سوال کو سامنے رکھ کر پڑھ جائیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہتھیار جس کے ذریعہ موسیٰؑ فرعون اور اسکی قوم کا مقابلہ کر سکے اور بنی اسرائیل غالب آئے اور جس کی بدولت مصر اور "مشارق الارض و مغاربہا" کے وہ وارث و مالک بنے وہ صرف "ایمان" "اطاعت" اور "دعوت الی اللہ" کی طاقتیں ہیں، یہ ایمان اور یہ اطاعت گزاری اور جذبۂ دعوت اس پورے قصہ کی جان اور اس کا اصل عنوان ہے، یہ پیغمبرانہ ایمان اس وقت صاف عیاں ہوتا ہے جب موسیٰؑ فرعون اور اسکی قوم کو پیغام الٰہی پہونچاتے ہیں، یہ ایمان ہی کی تو طاقت تھی جسکی بنا پر موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سیاست اور شاطرانہ چالوں اور موشگافیوں سے پست نہیں ہوئے، اور بالآخر غالب آئے، وہ چاہتا ہے کہ موسیٰؑ کو ان کے اصل موضوع و مقصد سے ہٹا دے، اور ان کو دوسری

باتوں میں پھنسالے، کبھی چاہتا ہے کہ اپنے مصاحبین و درباریوں کو ان کے خلاف بھڑکا دے، لیکن موسیٰؑ اپنی دعوت اور اپنے اصل پیغام پر جمے رہتے ہیں، اپنے راسخ یقین و ایمان و عقیدہ کو ایک لمحہ کے لئے نہیں بھولتے ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش اور تزلزل نہیں پیدا ہوتا، فرعون کہتا ہے "ما رب العالمین" تمام عالموں کا رب، (جس کا بار بار تمہارے منہ سے تذکرہ سنتا ہوں) کون ہے؟ جواب دیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ مُوْقِنِیْنَ! (وہ جو تمام آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں پیدا کرنے والا ہے، اگر تم یقین کرو) فرعون غصہ میں بھر جاتا ہے، چاہتا ہے کہ اہل مجلس بھی غصہ ہو جائیں، اپنے گرد والوں سے کہتا ہے "اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ" کیا سنتے نہیں ہو، لیکن موسیٰؑ اپنی بات چھوڑتے نہیں، فرماتے ہیں رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَائِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ (رب العالمین وہ ہے) جو تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے، فرعون غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے اور جھلا کر کہتا ہے اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ یہ تمہارے پاس پیغام لے کر آنے والا مجنون ہے، موسیٰؑ اب بھی اسکی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے، اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہیں، قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ فرمایا وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ انکے درمیان ہے اس کا پیدا کرنے والا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو (تو جانو)

اسکے بعد فرعون انتہائی سیاست سے کام لے کر ایک بہت خطرناک موضوع چھیڑتا ہے اور ایک بہت اشتعال انگیز سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے مَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلیٰ ان گزشتہ لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ (ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے) لیکن موسیٰؑ اپنے پختہ اور قوی ایمان اور پیغمبرانہ حکمت عملی کی وجہ سے موقع کی نزاکت پر غالب آجاتے ہیں، جواب دیتے ہیں "عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتَابٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی۔ ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہے، نہ بہکتا ہے میرا رب، نہ بھولتا ہے.... اور اتنا کہہ کر اپنی پہلی بات، اپنے معبود حقیقی اور خدائے بے ہمتا ولا ثانی کی ثنا و تعریف میں پھر لگ جاتے ہیں، کہنے لگتے ہیں اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی۔ (میرا رب) وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا، اور چلائیں تمہارے لیے اس میں راہیں،

اور نازل کیا آسمان سے پانی، پھر نکالے ہم نے اس میں سے مختلف قسم کے بہت سے سبزے۔

اس ایمان ویقین کا سب سے زیادہ کامل اور واضح ظہور اس وقت ہوتا ہے جبکہ موسیٰ اپنے سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر دیکھتے ہیں پیچھے دیکھتے ہیں تو دشمن کی فوج جوش غضب میں موجیں مار رہی ہے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی گنجائش، نہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کی، وہ اور انکی ساری قوم گویا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تھی جہاں پس کر ہلاک ہو جانے کے سوا کوئی صورت فرار نہیں۔ بنواسرائیل کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہو وحشت اور خوف واضطراب میں واویلا کرتے ہیں" اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ " ہم تو فرعون کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوئے"۔ لیکن موسیٰؑ ہیں کہ اپنی جگہ کوہ استقامت، ایک لمحہ کے لیے دل میں کوئی شبہ و اندیشہ نہیں ہوا، ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی حوصلہ مند اور پُرامید ہیں، انھیں یقین ہے کہ انکا اللہ اپنے بندے کا مددگار ہے، وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، پورے جزم و وثوق کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں۔"كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ " ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھ کو راستہ دے گا۔

آپ دیکھئے کہ ان حالات میں کہ جب بنی اسرائیل مصر میں ذلت ومشقت اور عسرت وفقر اور بدبختی و درماندگی کی زندگی گزار رہے ہیں، ظلم واستبداد کی شقی ترین قسموں اور صورتوں کو جھیل رہے ہیں انکو کس بات کی ہدایت کی جاتی ہے؟ ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کو کس چیز کا حکم دیا جاتا ہے؟ ان سے یہ نہیں کہا جاتا ــــ اگرچہ عقل کی میزان میں اور آج کی دنیا میں یہی اس کا واحد حل ہے ــــ کہ مادی اسباب اور ذرائع و وسائل پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دو، حتیٰ کہ فرعون اور اسکی قوم کے انتظامات اور ساز وسامان اور آلات و وسائل تمھارے سامنے ماند پڑ جائیں، تاکہ پھر اس پر غلبہ حاصل کر سکو، بلکہ ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو پکارو، اسکی طرف متوجہ ہو اسکی قدرت، طاقت اور حاکمیت کا یقین پیدا کرو، اطاعت و فرمانبرداری کی شرط پر اسکی مدد و نصرت کے وعدے پر راسخ و کامل ایمان رکھو، اس پر بھروسہ و اعتماد کرو، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو قوی کرو، یہاں تک کہ اللہ کی مدد کے مستحق ہو جاؤ، اور تمھارے اند

نیابت الٰہی اور خلافت ارضی کی صلاحیت اور شان پیدا ہو جائے، اس وقت ہم اسکا خارجی ظہور بھی کر دینگے

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ	اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی
اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ	کو کہ ٹھہراؤ اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر
بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً	اور بناؤ اپنے گھر قبلہ کی طرف، اور قائم
وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (یونس ع ۹)	کرو نماز اور خوشخبری دے دو ایمان والوں کو۔

اطاعت و فرماں برداری کی مثال دیکھئے، آپ دیکھیں گے کہ حکم الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے اور بے چوں و چرا اور بسر و چشم بات مان لینے میں پیغمبر کس حد تک بڑھے ہوتے ہیں، حال یہ ہے کہ اچانک حکم ہوتا ہے "اذھب الی فرعون انہ طغیٰ" (جاؤ فرعون کے پاس اس نے بہت سر اٹھایا ہے) اور یہ فرعون ہے کون، کس کے پاس جانے کا حکم ہو رہا ہے؟ بادشاہ وقت کے پاس، وہ بھی ایسا کہ جو غضب ناک اور جوش انتقام سے بھرا ہوا ہے، جس کی گرفت شیر کے چنگل سے کم نہیں، جس کے دبدبہ و سطوت کے سامنے کوئی چیز ٹھہرتی نہیں۔ اس فرعون کے سامنے اور ان ناموافق حالات میں موسیٰؑ کو اس کے پاس دعوت و پیغام لے جانے کا حکم دیا جا رہا ہے، لیکن موسیٰؑ جاتے ہیں، بلا توقف و تردد قصر شاہی کا رخ کرتے ہیں، اس بادشاہ کے دیوان خاص میں جاتے ہیں جو خدائی و ربوبیت کا دعویدار ہے، اور اس کو دعوت دیتے ہیں کہ اللہ واحد و قہار کی عبادت کرے، اسکو خدا مانے اور اسکے سامنے سر جھکائے، اور یہ نہیں کہ ایک دفعہ کہکر اور اعلان حق کر کے فرصت پا جائیں، موسیٰؑ علیہ السلام اپنی اس دعوت اور جد و جہد اور اپنے وعظ و ارشاد میں لگے رہتے ہیں، یہانتک کہ اللہ جو کہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ان کے اور ان کی قوم کے درمیان انصاف و حق کو فیصل فرما دیتا ہے،

آپ نے دیکھ لیا کہ "ایمان و اعتماد" "اطاعت و فرمانبرداری" اور "دعوت الی اللہ" ہی وہ طاقت تھی کہ جس سے موسیٰؑ نے مشکلات زمانہ کا مقابلہ کیا اور جس کے ذریعہ اور جس سطح زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی ــــــ اسی شہنشاہی پر کہ جو باعتبار تمدن سب سے زیادہ سب سے زیادہ وسیع، باعتبار اسباب و وسائل سب سے زیادہ غنی اور سرمایہ دار عظیم و باہیبت تھی ــــــ فتح و غلبہ حاصل کیا۔

اگر موسیٰؑ آج کے مفکرین و قائدین کی طرح بنی اسرائیل کے صرف ایک مفکر و لیڈر ہوتے، اور اسی طرح سوچتے جس طرح آج کے "سیاست داں" زعماء سوچتے ہیں، اگر وہ ان اسباب و وسائل اور امکانات و مواقع کا جائزہ لیتے جو اس وقت انکی قوم کو حاصل تھے، اور ہر چیز کو واقعیت اور حکمت عملی کی ترازو سے تولتے ــــ اور دوسری طرف وہ لوازمات شاہی دیکھتے، تعداد و مقدار اور ساز و سامان دیکھتے، فرعون کی افواج اور آلات حرب دیکھتے، اسکی ثروت و دولت اور اموال دیکھتے ــــ اور کیا انھوں نے دیکھا نہ تھا؟ کیا ان چیزوں سے وہ واقف نہ تھے؟ جبکہ انکے مرکز، عین قصر شاہی میں انھوں نے پرورش پائی اور جوانی تک وہیں رہے، لیکن اسکے باوجود انکی نظر میں اسکی کوئی اہمیت نہ تھی، اور اس سب کو کسی شمار و قطار میں نہ لائے ــــ لیکن اگر وہ ایسا کرتے، اور ان چیزوں کو اہمیت دیتے اور نظروں میں لاتے، اور پھر ان چیزوں میں فرعون کی قوم سے اپنی قوم کا مقابلہ کرتے، تو کیا میزان "عقل" میں اور آج کے قانون سیاست میں انکے لیے یہ جائز ہوتا؟ اور ان کے لیے اس بات کا امکان اور گنجائش ہوتی کہ وہ فرعون کا مقابلہ کریں، اور اس سے وہ بات کہیں جو اسکے لئے سخت ناراضگی اور غیظ و غضب کا باعث بنے؟

آج کی عقل "سلیم" اور حکمت و سیاست اور فہم و فراست کی رو سے تو ضروری تھا کہ وہ اس جرأتِ 'بیجا' کا تصور تک نہ کریں، بالکل فیصل شدہ اور یقینی راستہ انکے سامنے یہ تھا کہ اپنی اور اپنی قوم کی حالیہ قسمت و نصیب پر قانع و مطمئن ہو جائیں، اپنی قوم کی نشأۃ و ترقی، حریت، واقبال مندی، اور سر سبزی و شادمانی سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں، زمانہ کے حالات سے متفق ہو جائیں، وقت کے دھارے پر بہتے رہیں اور اپنی قوم کو بھی تلقین کریں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ ایمان کی ہوا چلتی، نہ صلاح و تقویٰ کے باغ لگتے، نہ اخلاق ہوتے نہ اعمال ہوتے، نہ شرافت ہوتی نہ انسانیت۔

لیکن یہ ہوتا کیسے، موسیٰؑ "قومی رہنما" نہیں تھے، خود انکی رہنمائی کیجاتی تھی، وہ نبی تھے، انکے سامنے اللہ کی ہدایتیں اور ان ہدایتوں پر عمل کرنے پر اسکی طرف سے نتائج و انعامات کے وعدے تھے، وہ ایک داعی اور اللہ کے دین کے مبلغ تھے، انکا طرز فکر و عمل مبلغین و اہل دعوت

کا عقل اور ذہن کا عمل کا یہ وہ طریقہ ہے جس نے بارہا تاریخ کے دھارے بدل دیئے ہیں، یہ وہ طاقت ہے جس کی کرشمہ سازی سے عجائب و خوارق کا ظہور ہوا ہے، جس نے بارہا عقل و دانش کو دم بخود کر دیا ہے۔

رسولوں کے سردار، سیدالانبیاء اور خاتم الرسل محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سب سے زیادہ مفصل اور واضح آپکے سامنے ہے، اگر آپ نے بھی عام رہنماؤں کی طرح سوچا ہوتا، اور وہ اسباب و وسائل اور لوازمات و انتظامات کہ جو قریش کے پاس تھے آپ نظروں میں لاتے ۔۔۔ اگر آپنے وقت کی ان دو عظیم الشان شہنشاہیوں کی طرف نظر کی ہوتی، جنھوں نے اس وقت کے تمام آباد اور متمدن خطۂ زمین کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا، یعنی شہنشاہیت روم اور شہنشاہیت ایران، اور وہ تمام طاقتیں اور اختیارات و اقتدارات کہ جن سے وہ بہرہ مند تھے، آپ نظر میں لاتے، اور آپ ایسا کر سکتے تھے، بالخصوص جبکہ آپ انکی طاقت و قوت اور انکی وسعت مملکت سے واقف تھے، اور انکا پورا اندازہ رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے کہ آپ پیغمبرانہ فہم، ہوش و بیدار مغزی رکھتے تھے، لیکن پھر بھی آپؐ کی سیرت مبارکہ تبلاتی ہے کہ آپ نے بالکل ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دی، اگر آپنے ایسا کیا ہوتا تو کیا میزان عقل اور قانون خرد میں یہ جرأت مناسب و معقول ہوتی کہ آپ تمام انسانیت کو اپنے پیغام کا مخاطب بنائیں، اور یہ کہ اس عہد کی دنیا کے دو مالک و خود مختار اور مغربی و مشرقی شہنشاہیوں کے دونوں سربراہوں کو یہ خط لکھیں کہ وہ اسلام کی دعوت قبول کریں، اگر آپنے اس طرح سوچا ہوتا تو وہی صورت حال اور عالم کا وہی نقشہ جو اس وقت عالم پر چھایا ہوا تھا اور صدیوں سے چھایا ہوا تھا اب بھی قائم رہتا، اور شاید ہمیشہ کے لیے دنیا کی قسمت میں یہی صورت حال لکھ جاتی، اگر فتح و ظفر کا انحصار و دار و مدار انھیں مادیات، و وسائل پر آپ سمجھتے تو کب وہ دن آتا جب آپؐ ایمان لانے والی ایک مٹھی بھر جماعت اس قوت و طاقت اور سامان و وسائل کی مالک ہوتی جو ان دو عظیم شہنشاہیوں کی قوت و طاقت کا مقابلہ کر سکے؟ بلکہ نہیں آپ تو اس قوت و طاقت کو سوچتے جو ان سے بھی بڑھی ہوئی ہو، اور جو ان کو شکست دے سکے اور ان پر غلبہ حاصل کر سکے، اور اگر انھیں چیزوں پر دار و مدار ہوتا تو کب تک آپکے لئے واجب اور ضروری ہوتا کہ آپ انتظار فرماتے رہیں؟ پھر اس وقت

اس دنیا اور اس انسانیت کا کیا انجام ہوتا؟ یقیناً انسانیت کی قسمت پھوٹ گئی ہوتی، اور دنیا رہتی کہ یہ پھر قیامت تک کبھی نہ ٹوٹتی، افق انسانیت پر صبح سعادت کا طلوع کبھی نہ ہو پاتا، اور انسانیت کی تاریخ موجودہ تاریخ کے بجائے کچھ اور ہوتی۔

لیکن اللہ کو ابھی انسانیت کے ساتھ خیر مقصود تھی، اللہ نے آپ کو "رہنما" نہیں بلکہ بتائے راہ یافتہ اور ہادی مہدی بنایا تھا، آپ وہی کرتے تھے جو آپ کو حکم ملتا تھا، آپ کو احکام و ہدایات اوپر سے ملتی تھیں، انھیں کا آپ اس عالم میں نفاذ فرماتے تھے، آپ کو ان احکام و ہدایات پر اعتماد کلی تھا، آپ ان کے نتائج اور ان پر اللہ کے وعدہ و انعامات پر اس طرح یقین رکھتے تھے۔ گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، آپ کا ایمان تھا کہ کمزور اللہ کی مدد و نصرت کے ساتھ بہت قوی ہوتا ہے، وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا، اور وہ قوی جس کے ساتھ اللہ کی مدد و حمایت نہ ہو انتہائی ضعیف ہے، وہ کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتا، آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا کہ "ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون" (اگر اللہ تمہارا مددگار ہو جائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں اپنی مدد سے محروم کر دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے، آپ کو بتایا جا چکا تھا کہ "کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله" (کتنی ہی قلیل التعداد جماعتیں غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے کثیر التعداد جماعتوں پر) آپ سے بڑھ کر ان وعدوں پر کہ جو اعتقاد، عمل صالح، توحید، جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے ہیں، کون ایمان و یقین رکھنے والا اور ان پر کامل و راسخ اعتماد و ایمان کرنے والا ہو سکتا ہے، نتیجہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

"اَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم" کے تحت حتی الامکان تیاری و انتظام کے بعد آپ نے اور آپ کے سچے و صحیح جانشینوں نے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لی، اور زمین و آسمان کا نقشہ بدل ڈالا، سیلابوں اور طوفانوں کے رخ پھیر دیئے، جس کی بدولت آج تک دنیا میں ایمان، توحید، حقانیت، صداقت، نیکی، اخلاق، محبت، شرافت اور انسانیت کی روشنی

موجود ہے۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

آپ کو غلط فہمی نہ ہو، جو شخص آ سے یہ باتیں کر رہا ہے وہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو اسباب و وسائل کے ترک و اہمال کی دعوت دیتے ہیں، اور ترکِ سعی اور تعطل کو "اعتماد و توکل" کہتے ہیں، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو عالم خواب و خیال میں رہتے ہیں، جن کی باتوں کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، میں نے عالم اسلام کو اور ان قوموں اور حکومتوں کو کہ جنکے ہاتھ میں اس عالم کی زمام قیادت رہی ہے، انکی اس کوتاہی اور تقصیر پر ہمیشہ سخت ملامت کی ہے جو انھوں نے حربی و صنعتی تیاری کے سلسلہ میں برتی ہے، میں نے انکے اس تغافل اور عدم توجہی کو انسانیت کی شقاوت اور بدبختی اور اسکے ہدایت و تعمیر اور ترقی و اقبال مندی کے راستہ سے ہٹکر زوال و انہدام اور شقاوت و بدبختی کے راستہ پر پڑنے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب شمار کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود مجھے اس طرز فکر سے شدید اختلاف ہے جو اس وقت تمام عالم اسلام کی عقلیت پر مسلط ہے، میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا کہ مختلف گوشہ ہائے عالم میں پھیلی ہوئی اسلامی جمعیتوں کو ایک جامد اور غیر متحرک، بلکہ غیر ذی حیات انسانی بھیڑ سمجھا جائے، بالکل ویسے ہی جیسے کہ اس وقت عالم کے بقیہ تمام انسانی گلے ہیں، جو بھیڑوں اور چوپایوں کے ریوڑ سے زیادہ کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتے، جن کے پاس دنیا کو دینے کے لیے کوئی پیغام اور کام کی بات نہیں، جن کے مقام اور جن کے اقتدار کا فیصلہ ہمیشہ صرف مادی ترقیوں اور وسائل و آلات کی فوقیت پر ہوتا ہے، یہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ "ازالۂ حیثیت عرفی" کے مرادف ہے کہ انکو اس عام انسانی ترازو پر تولا جائے، اور انکے اصل سرمایہ اور ان کی عظیم طاقت "ایمان باللہ" "اطاعت" اور "پیغام و دعوت کی روح" کو نظر انداز کر دیا جائے، اگر غیر مسلم اقوام انکو اس معیار سے تولتی ہیں تو وہ معذور ہیں کہ انکو اس روحانی و ایمانی طاقت کے سرچشمہ کا احساس و اندازہ نہیں، لیکن مسلمان خود انھیں اسی ترازو پر تولیں، یہ ان کے لیے بڑے شرم و عار کی بات ہے اور بڑے حسرت و ماتم کا مقام ہے۔

۵ مومناں با خوئے و بوئے کافراں   لا الہ گویاں و از خود منکراں

یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم مادی ساز و سامان کے اعتبار سے فقیر ہیں، ہم کمزور و نہتے ہیں، علم و صناعت کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، سیاست اور اقتصادی حالت میں اور قوموں کو نہیں پہونچتے، ان چیزوں میں ہم میں اور اقوام مغرب میں صدیوں اور قرنوں کا فرق ہو گیا ہے ـــــ اور بڑی حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قائدین و زعماء کے فکر و اہتمام کا موضوع بنیں، اور یہ باتیں خاصی توجہ و التفات کی مستحق ہیں ـــــ لیکن اسکے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم اسکے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں، ہمارا صرف وجود بڑی قیمت رکھتا ہے، ہمارے پاس وہ پیغام، وہ دعوت اور وہ دین ہے جو انسانیت کی غذا اور اسکی روح ہے، یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر دنیا اس وقت ایک دردناک و المناک انجام کی طرف تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور روز بروز اس قعر ہلاکت سے قریب تر ہوتی جارہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی دن یہ انجام ہلاکت انسانیت مجسم کو نگل جائے ـــــ ہمارے پاس وہ ایمان و یقین ہے جو امانت و احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے، جواب دہی اور بازپرس کا خوف پیدا کرتا ہے، نفس لوامہ پیدا کرتا ہے اچھے برے کی تمیز پیدا کرتا ہے اور صرف ذاتی و وقتی لذت و نفع کو اچھے برے کا معیار نہیں بننے دیتا، یہی وہ طاقت ہے جو کار خیر اور خدمت خلق کے جذبات دلوں میں پیدا کرتی ہے، اور اندر سے اسکے تقاضے اور داعیے پیدا ہوتے ہیں۔

آج کی متمدن دنیا کی وہ قومیں جن کو دنیا کی امامت و پیشوائی کا دعویٰ ہے اس طلسمی طاقت اور اس "کلید حیات" سے محروم ہیں، جنھیں ہم آج "سرمایہ دار" قومیں کہتے ہیں وہ اس سرمایۂ عظیم کے اعتبار سے دیوالیہ ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ یہ اسباب و وسائل اور آلات و اسلحہ، اور ساز و سامان و لوازمات آسائش ضائع ہیں ـــــ صرف ضائع اور غیر مفید نہیں ـــــ بلکہ وبال جان اور ہلاکت و بربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں، اور ان کو موت کے گڑھے کی طرف لے جارہے ہیں، یورپ کو سخت ضرورت ہے کہ جلد از جلد اس آب حیات اور سرمایۂ زندگی کو قبول کرلے، یہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس سے اسکے مزمن و مہلک مرض کا علاج ہوسکتا ہے، ہم مسلمانان عالم مغرب کے ان علوم و فنون اور ان ایجادات و مصنوعات،

کے اتنے محتاج وضرورت مند نہیں جتنا کہ مغرب ہمارے ایمان ویقین کا محتاج ہے، یا یمان ہی دراصل معاشرے کی اساس وبنیاد ہے، پھر اس ایمان ویقین کے بعد وہ قانون اور شریعت ہے جو آج بیسویں صدی کی تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کا صحیح حل پیش کرتی ہے، یوں سمجھئے، صاف، واضح اور بلیغ الفاظ میں، کہ ہمارے پاس ایک پیغمبر کے وجود کی نعمت موجود ہے جو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ ایمان وشریعت اسی کی امانتیں ہیں کہ جس کے ہم مسلمان حامل ہیں، اللہ کا فیصلہ ہے کہ اب قیامت تک تمام وہ لوگ جو اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی وخوشنودی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، انکو راستہ یہیں سے ملے گا، یہیں وہ نور ہے جو صراط مستقیم دکھاتا ہے، اور تاریکیوں اور گمراہیوں سے نکالکر منزل مقصود تک پہونچاتا ہے۔ ؎

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

مسلمان اپنا مقام پہچانیں، ہماری ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ ہم اس وقت حیران، سراسیمہ، اور سرگردان وآوارہ یورپ کو صحیح راستہ کی طرف بلائیں، اپنے دنیاوی فوائد، منافع، اور راحتوں اور لذتوں کو بالکل نظر انداز کرکے، انتہائی اخلاص و دلسوزی کے ساتھ، اور اس اعتماد ویقین کے ساتھ کہ یہی ہمارا منصب ومقام ہے، ہم ہی اس وقت عالم کی اصلاح ورہنمائی کی قوت وصلاحیت رکھتے ہیں، ہم ہی اسکے صحیح مبلغ ومعلم ہیں، ہم اسکے نجات دہندہ ہیں، ہم ہیں جو اسکو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی اور جنت و حیات دوام کا راستہ دکھاسکتے ہیں، اور اسکو ان انعامات کی بشارت سنا سکتے ہیں، ہم ہی ہیں جو اسکو اللہ کی ناپسندیدگی اور اسکے عذاب، دوزخ وجہنم سے ڈرا سکتے ہیں، اور اس کو بچا سکتے ہیں ؎

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن! تو بشیری، تو نذیری

ہمیں اپنے ایمان ویقین کی اس عظیم طاقت سے کام لینا چاہیئے، ہمیں چاہیئے کہ ہم

قافلۂ انسانی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں، یہ کیا شومئی قسمت ہے کہ ایک عرصہ سے ہم گرد کارواں بنے ہوئے ہیں، اس "کہنہ دماغی" کو ہم کب تک "عقل و دور اندیشی" کہتے رہیں گے۔ اس معمورۂ عالم میں بہت سے گوشے ایسے ہیں جہاں فطرت سلیم کے خزانے مدفون ہیں، ایشیا، افریقہ، کے وسیع خطہ ہائے ارض ایسے ہیں جہاں زرخیز و شاداب ذہنوں پُرمحبت و پُرخلوص دلوں اور طاقتور و صناع ہاتھوں کی کمی نہیں، ہمیں انکو دین و ایمان، زندگی کے حقیقی و نیک مقاصد اور کائنات کے افضل و برتر اصول و حقائق پہونچانا چاہیئے، آپ یقین کریں کہ یہ قومیں اس چیز کی پیاسی ہو رہی ہیں، اور آپکے انتظار میں ہیں ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

امید ہیاں تک کیجاتی ہے کہ ان کے ایمان قبول کرلینے کے بعد اور اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اور اسکے دلوں میں اتر جانے کے بعد اور اس پیغام و دعوت اور مشن کو خود اپنا لینے کے بعد تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا، اور جس طرح عہد اول میں ایرانیوں ترکوں اور دیلمیوں کے ایمان لانے سے، اور قرون وسطیٰ میں تاتاریوں اور مغلوں کے اسلام لانے سے تاریخ کے دھارے بدل گئے ہیں، آج بھی بدلیں گے۔

لیکن اس انقلاب کی بنیاد کیا ہے؟ اسکی بنیاد اپنے اندر کا فکری انقلاب ہے؟ ہم کو بلا توقف و تاخیر اپنا موجودہ انداز فکر بدل لینا ہے، اور اس طرح پر سوچنا ہے جس طرح پیغمبر سوچتے ہیں، یہی انقلاب فکر باذن اللہ ـــــ عالم میں انقلاب کا باعث ہوگا۔ اسکے بغیر دنیا کی کوئی طاقت عالم کو وحشت و درندگی، آدم کشی اور غارت گری کے گڑھے سے نہیں نکال سکتی، عرصہ سے بڑے بڑے عقلاء عالم تدبیریں کرکے عاجز آچکے ہیں، اسکے لئے تو "شان کلیمی" ہی درکار ہے ؎

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

ہمارا مرض اور علاج

(از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی)

ہر قوم کی کچھ خصوصیتیں ہوتی ہیں، ان خصوصیتوں کا اس کی تاریخ کی تشکیل میں بڑا ہاتھ ہوتا ہو خاص کر جب کوئی آزمائش کی گھڑی اس پر آتی ہو ___ خواہ اس کا تعلق فتح و کامرانی کے لمحوں سے ہو یا شکست و نامرادی کے، یا اس کی کوئی اور شکل ہو ___ تو یہ اسکے حق میں بڑی حد تک فیصلہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس کا رُخ بلندی یا پستی کی طرف موڑ دیتی ہیں۔

مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ ہو کہ وہ حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، ان کا معیاری اور مثالی دور تو بیشک انسانیت کا معیاری اور مثالی دور تھا جس میں انھوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے اعلیٰ ترین انسانی جوہر دکھائے، لیکن اس کے بعد سے ان کی تاریخ برابر اس حقیقت کا منظر ہو کہ ان کی قوتِ فکر ان کے احساس کی شدت کا ساتھ نہیں دے پاتی ہو۔ مثلاً عروج و اقتدار کے زمانے میں وہ اپنے پچھلے دنوں کو آناً فاناً فراموش کر بیٹھتے ہیں اور آرام طلبی اور عیش کوشی میں ایسا منہمک ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ سدا سے اسی کے عادی چلے آرہے ہیں اور آئندہ کے بارہ میں کسی نے ان سے وعدہ کر لیا ہو کہ اب نہ کبھی دھوپ ڈھلے گی، نہ شام ہوگی۔ ان کا نیرِ اقبال ہمیشہ چمکتا ہی رہے گا حتیٰ کہ حال میں تیل کی دریافت نے جن عرب ممالک میں دولت کی خوب فراوانی کر دی ہو وہاں کے حالات دیکھ کر کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا ہو کہ یہی وہ علاقے ہیں جو محض پچیس تیس برس قبل اتنے افلاس زدہ تھے۔ اور نہ وہاں کے ذمہ دار طبقوں کو غالباً کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ تیل کے ذخیروں کی بہرحال ایک حد ہو، ایک دن آئے گا کہ تیل کے چشمے خشک ہو جائیں گے اور سونے کی چڑیا اُڑ جائے گی۔ اس لیے جو دولت اس وقت ان سے حاصل ہو رہی ہو اسے اسراف کی راہوں میں صرف

کرنے کے بجائے ملک کی معیشت کو مضبوط بنانے اور مستقبل میں کام آنے والی زرعی وصنعتی ترقی کی مہموں کو روبکار لانے میں لگایا جائے تاکہ موجودہ کثرت زربس چار دن کی چاندنی نہ ثابت ہو جس کے بعد پھر وہی اندھیری رات ہو۔ اسی طرح جب وہ ابتلا کے دور میں گرفتار ہوتے ہیں اور ان کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہو تو وہ اپنے کو سنبھالنے اور بدلے ہوئے حالات کا سنجیدگی اور استقلال سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کے حوصلے یکبارگی پست پڑ جاتے ہیں، ہمت جواب دے جاتی ہو، خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہو یقین کی دولت جاتی رہتی ہو۔ نفع ونقصان کی تمیز مٹ جاتی ہو اور وہ یا تو گوشوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی میت پر خود ہی ماتم کرنے کو وقت سے انتقام لینے کی بہترین تدبیر سمجھ کر اسی میں اپنے کو مشغول کر لیتے ہیں یا مستی سرفروشی کے جنون میں مبتلا ہو کر ہنگامی چیزوں میں اپنی بچی کھچی قوتیں برباد کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہو کہ مسلمانوں پر بحیثیت ایک قوم کے جب بھی زوال آیا ہو تو اس کی رفتار بہت تیز ہوئی ہو اور اس کے بعد وہ ایسا نڈھال ہو گئے ہیں گویا کہ تاریخ میں ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ گر کر پھر اٹھ کھڑا ہونا ان کو نہیں آتا ہو۔ یہی حال عربوں کا ان سے اقتدار چھنتے ہی ہوا، یہی صورت اسپین میں پیش آئی، دولت عثمانیہ کے خاتمہ پر بھی ایسا ہی ہوا، ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوا تو یہی صورت واقع ہوئی اور اب ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد پھر وہ اسی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

برطانوی راج قائم ہوا تو مسلمانوں کے حق میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کے لیے یہ اپنے طرز کا پہلا تجربہ تھا، وہ آٹھ سو سال سے مسلسل حکومت کرتے چلے آ رہے تھے، تنزل اور محکومی سے واقف نہ تھے۔ ان کے برخلاف ہندو اپنے یہاں متعدد نشیب وفراز دیکھے ہوئے تھے، ان کو زمانے کے ساتھ چلنا آتا تھا، وہ وقت کے تقاضوں کو پہچانتے تھے اور ان کو پورا کرنے کا گر جانتے تھے، چنانچہ حالات بدلتے ہی انھوں نے اپنے اندر مناسب تبدیلیاں کر لیں اور ترقی کی راہ پر انگریزوں کے پیچھے پیچھے چلنے میں ان کو ذرا بھی دقت نہ ہوئی، مسلمانوں کو اپنی برتری کا غرہ تھا۔ وہ انگریزوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، انھوں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، اس کی ان کو بڑی سخت قیمت ادا کرنا پڑی۔ مگر انھوں نے پرواہ نہ کی، ان کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ہندو ان سے بہت آگے نکل چکے تھے، اور یہ فاصلہ آخر تک قائم رہا۔

لیکن اب ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد جو حالات سامنے آئے ہیں ان کا مقابلہ مسلمانوں کے لیے جتنا دشوار ہو رہا ہے اور وہ اس سلسلہ میں جس عام ذہنیت، ناعاقبت اندیشی، مغلوبیت، فکری انتشار اور قوتِ عمل کے فقدان کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس کا جواز بحران کے قومی مزاج کی اس کمزوری کے جس کا شروع میں تذکرہ کیا جا چکا ہے نہیں ہو سکتا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے سامنے نہ کوئی سوچا سمجھا راستہ ہے اور نہ کوئی متعینہ منزل، نہ ان کا کوئی موقف ہے نہ تنظیم، نہ قیادت، ان کی حالت اس مسافر کی سی ہے جو کسی خطرناک ریگستان میں قافلہ سے الگ ہو گیا ہو وہ ہر سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، ایک بار دھوکا کھاتے ہیں، دوسری بار دھوکا کھانے کو فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ میں ان کی مشکل حل ہونے کے بجائے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے دل مایوس اور قویٰ شل ہوتے جاتے ہیں، ان کے ہم وطنوں کی نگاہوں میں ان کا بھرم مٹتا جاتا ہے اور خود ان کی نگاہوں میں بھی ان کے قومی وقار کی قیمت روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ دو راہوں سے ہے، ایک راہ کا تعلق تعلیم، تہذیب اور معاشرت سے ہے، دوسری کا معاش اور اقتصاد سے۔

کسی قوم کا اس کے ماضی سے رابطہ تاریخی اور تمدنی روایتوں کے ذریعہ ہی قائم رہتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے ماضی سے کٹ کر الگ ہو جائے یا کاٹ کر الگ کر دی جائے اس کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا ہے، وہ اس درخت کے مانند ہو جاتی ہے جس کی جڑیں نیچے سے قطع کر دی گئی ہوں، ملک میں اس وقت جو نئی تعلیمی پالیسی رائج کی جا رہی ہے وہ اس پہلو سے مسلمانوں کے لیے سخت خطرناک ہے کیونکہ اس کا مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے تعلیمی وسائل اکثریت کی زبان اور کلچر کی تقویت و اشاعت کے لیے استعمال کیے جائیں تاکہ اقلیتوں کے ذہنوں کو آہستہ آہستہ موڑ کر ایک واحد تہذیبی نمونہ پر لایا جا سکے جو درحقیقت اکثریت کی تہذیب ہی کا نمونہ ہو۔ اس طرح صرف قومیت اور ریاست کو ہم معنی کرنے میں آسانی نہ ہوگی ــــ جو ہر رجعت پسند حکومت کا نصب العین ہوتا ہے۔ بلکہ اس تہذیبی احساس کمتری کا بھی مداوا ہو جائے گا جو صدیوں سے اکثریت کے جگر کا ناسور بنا ہوا ہے۔ تہذیبی احساس کمتری طاقت حاصل ہو جانے کے بعد عموماً تہذیبی جارحیت کا رنگ اختیار

کرلیتا ہے، اور ہندستان کی وہ اقلیتیں جو ملکی کردار کے علاوہ کچھ اپنا انفرادی کردار بھی رکھتی ہیں مثلاً مسلمان، سکھ، اور اینگلو انڈین، آج کل اسی جارحیت کا شکار ہو رہی ہیں، ان اقلیتوں میں سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں کو ہے۔ کیونکہ سکھ ایک علیحدہ جماعت ہوتے ہوئے نسلی حیثیت کے سوا جذباتی اور تاریخی اعتبارات سے بھی ہندوؤں سے خاصہ قریب ہیں، اور اینگلو انڈین کی ایک تو تعداد بہت کم ہے جس کے باعث ان کو آسانی سے اُن کے حال پر چھوڑا جاسکتا ہے، نیز ان کی تنظیم کا مسئلہ بھی اس بنا پر کچھ دشوار نہیں ہے۔ اور دوسرے تعلیمی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ان کی عمومی سطح اکثریت کی عمومی سطح سے نمایاں طور پر بلند ہے۔ اس وجہ سے ان کا اکثریت میں ضم ہونا مشکل ہے۔

دوسرا سوال معاشی استحکام کا ہے، آزادی کے بعد سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت برابر گرتی جارہی ہے، ان کی بہت بڑی تعداد بلا مبالغہ فقر و فاقہ کی زد میں آگئی ہے، شمالی ہند میں وہ ایک عرصے زمینداری اور سرکاری ملازمت کے سہارے جیتے چلے آرہے تھے، عزت و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے ان کے یہی دو سب اہم ذریعے تھے، زمینداری کے خاتمہ نے ان کی کمر توڑ دی، لاکھوں مسلمان زمیندار اور ان کے اتنے ہی متوسلین یکایک اپنے رزق کے واحد ذریعے سے محروم ہو گئے۔ ویسے زمینداریوں کے ختم ہونے سے ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کو یکساں متاثر ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ ہندو زمیندار عموماً کاشتکاری کا کام بھی کرتے تھے اور دیہاتوں میں لین دین کا کاروبار بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا اس لیے زمینداری کے انسداد سے ان کو نقصان تو پہونچا مگر مفلوک الحالی کی نوبت نہ آئی، مسلمانوں میں جن کے پاس زمینداریاں تھیں وہ کاشتکاری کو ایک گھٹیا درجہ کا کام سمجھا کیے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کہیں کے نہ رہے۔ زمینداری ختم ہوتے ہی ایسے قوانین بنے کہ جو زمینیں نام کو خود کاشت تھیں اور فی الحقیقت دوسروں کو لگان یا بٹائی پر اٹھی ہوئی تھیں ان پر ان کا کوئی اختیار نہ رہ گیا۔ اب اگر وہ کاشتکاری کرنا چاہتے بھی تو زمین نہ ہونے کے باعث نہیں کرسکتے تھے، مجبوراً معاوضہ کے بانڈ ملتے ہی انھوں نے ان کو بیچ بیچ کر کھانا شروع کر دیا۔ کئی سال سے ان کی گذر اوقات اسی پر ہے۔ پہلے معاوضہ کے بانڈ تھے، اب بحالی کے بانڈ ہیں، لیکن یہ بانڈ آخر کب تک ساتھ دیں گے؟ دو، چار، چھ برس میں جب یہ یک بیک کر ختم ہو جائیں گے تو اللہ کے ان بندوں کو دو وقت کی روٹی کہاں سے ملے گی؟ ——— یہ حال اس طبقہ کا ہے جس کے ہاتھ میں بارہ پندرہ برس قبل تک ہندوستان میں مسلم سوسائٹی کی

قیادت تھی۔ رہ گئیں سرکاری ملازمتیں تو مسلمانوں کو اس کی عام شکایت ہو کہ ان میں ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا ہو۔ نئی جگہیں ان کو تقریباً ملتی ہی نہیں اور جو پرانی جگہوں پر کام کرتے چلے آرہے ہیں ان کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ تجارت سے عمومی طور پر مسلمان الگ ہے اور اب اس کے لیے نہ ان کے پاس سرمایہ ہو، نہ تجربہ، بعض مخصوص اسباب کی بنا پر کسی قومی تنظیم کے بغیر ان کا اس میدان میں قدم رکھنا اس وقت پُرخطر بھی ہو۔

اب سوال یہ ہو کہ جو قوم اپنے تہذیبی و تمدنی سرمایہ سے تیزی سے محروم ہو رہی ہو اور اس پر معاش کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے ہوں وہ اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے یا اپنی صلاحیتیں دوسری راہوں میں صرف کرتی رہے تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ یہی نہ کہ یا تو وہ اپنا وجود کھو بیٹھے گی یا پستی کی اس سطح پر جا پہونچے گی جہاں ہم آج اچھوتوں کو پاتے ہیں؟ مسلمان اپنی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں کچھ اسی طرح کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ تلخی اور مایوسی نے ان کی عملی قوت سلب کر لی ہے۔ ان پر ایک گہرا جمود، ایک قبرستان جیسی مردنی چھائی ہوئی ہو۔ اس جمود میں اگر زندگی کی ایک آدھ لہر نظر بھی آتی ہو تو اس کی نوعیت یا تو سیاسی ہو یا مذہبی۔ یہ بات بھی کتنی حسرتناک ہو کہ جبکہ مسلمانوں کی بقاء و ترقی کا مسئلہ اس وقت اصلاً و اولاً معاشی و معاشرتی ہو، ان کی قوم کے ذمہ دار عناصر کو اگر ان کی چارہ گری کی فکر ہوتی بھی ہو تو اس طرز کی جو ان کی ضروریات سے میل نہیں کھاتی ۔ سیاسی تنظیم کا یہ وقت نہیں ہو۔ جو سیاسی منزل ملک نے اپنے لیے تجویز کی ہو اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم ان کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہوگی۔ سیاسی لیڈروں اور کارکنوں میں ایک تعداد یقیناً ایسوں کی ہو جو قوم کے مخلص ہیں اور وہ دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ مستقبل کو محفوظ کرنے کی یہی سب سے بہتر صورت ہو۔ مگر اس میں اکثریت انہی کی ہو جو قیام پاکستان کے بعد بے روزگار ہو گئے ہیں یا سیاسی بزم آرائی ان کی عادت بن چکی ہو۔ اور وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، ذاتی مفاد پر قوم کے مفاد کو قربان کرنے والوں سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہو، لیکن جو لوگ واقعی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر ان کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہو بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا نا کہ مرکزی اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمان نمائندوں کی تعداد میں دو چار فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ تو کچھ ہونا نہیں ہو تو اس اضافہ سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچ جائے گا؟

ان کی کون سی دشواری حل ہو جائے گی، کون سی ضرورت پوری ہو جائے گی؟ ایک کھلی ہوئی بات ہو کہ کاؤنسلوں اور اسمبلیوں کے ذریعہ مسلمان بحیثیت ایک جماعت کے ملک کے حالات پر کوئی فیصلہ کن اثر نہیں ڈال سکتے ہیں اور کاؤنسلوں اور اسمبلیوں کے باہر سیاسی جدوجہد ان کے لیے زہر کا کام کر سکتی ہو۔

یہ حقیقت ہو کہ مذہبی اور دینی جدوجہد مسلمانوں کی بقاء وترقی کے لیے بھی ایک ناگزیر چیز ہے۔ مگر تنہا یہ جدوجہد مسلمانوں کی بقاء وترقی کے پورے مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتی، بلکہ فی زمانہ دینی کام کرنے والے، عام طور پر، جس محدود نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے اپنا دائرۂ عمل بناتے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہو کہ یہ بالکل ممکن ہو کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم وتربیت کا کام خوب زور وشور سے ہوتا ہے اور وہ شودروں اور اچھوتوں کے ہم پلہ ہوتے چلے جائیں۔ اس لیے اپنے دینی بزرگوں سے ہماری التجا ہو کہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں ذرا وسعت پیدا کریں۔ اور مسلمانوں کے اس وقت کے خاص مسائل کو بھی اپنے دائرۂ فکر وعمل میں شامل کریں۔

ہر عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، ان تقاضوں کو سمجھنے اور برتنے ہی میں دنیا میں کامیاب رہنے کا راز مضمر ہو۔ اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت معاشی تنظیم اور ملّی معاشرت کی حفاظت ہو، اور چونکہ ملّی معاشرت کا تحفظ بھی معاشی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہو اس لیے اصل سوال معاشی تنظیم واستحکام کا رہ جاتا ہو۔ اس معاملہ میں اصولاً اور اخلاقاً سب سے پہلی ذمہ داری تو حکومت کی ہو، ایک مہذب اور ذمہ دار ریاست کے جہاں اور بہت سے فرائض ہیں وہاں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنے باشندوں کے لیے رزق ومعاش کی آسانیاں پیدا کرے، ان کو روزگار سے لگائے اور دیکھے کہ ان کی محنت کا ان کو معقول معاوضہ ملتا ہو۔ نیز مسلمانوں کی ایسی بڑی آبادی کی اقتصادی بدحالی سارے ملک کو آگے بڑھنے سے اگر روک نہیں سکتی ہو تو اس کی رفتار سست ضرور کر سکتی ہو اور اس کے لیے مختلف طرح کی دوسری پریشانیاں بھی پیدا کر سکتی ہو اس لیے بھی یہ حکومت کے سوچنے کا مسئلہ ہو۔ لیکن بدقسمتی سے جو مزاج اس وقت ملک کا ہو رہا ہو وہ حکومت سے اس طرح کی کوئی توقع رکھنے کی اجازت نہیں دیتا ہو۔ اس لیے مسلمانوں کو اگر ایک باعزت قوم کی طرح زندہ رہنا ہو تو ان کو اپنی تعمیر نو کے لیے خود آگے بڑھنا چاہیے۔

سب سے پہلی بات جو مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی ہو وہ یہ کہ ان کا مسئلہ نہ تو چند لوگوں کا

مسئلہ ہے جسے انفرادی طریقہ سے سوچا جا سکتا ہے اور نہ کوئی عارضی صورت ہے جو کچھ عرصہ بعد ختم ہو جائے گی۔ ان کا سوال چار کروڑ انسانوں کا سوال ہے جو ملک کے طول و عرض میں ریاست ریاست، شہر شہر، اور دیہات دیہات پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ایک ایسا سوال ہے جسے اگر نظر انداز کیا گیا تو وہ بالآخر اپنے کو حل تو ضرور کرے گا مگر اس طور پر کہ نہ چمن رہے گا، نہ فکر چمن بندی ہوگی۔ مسلمانوں کو ایک جماعت کی طرح سوچنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ ان میں جو اہلِ اقتدار ہیں ان کو اس بارہ میں کسی شبہ میں نہ رہنا چاہیے کہ خدانخواستہ اگر جماعت کا سفینہ غرق ہوا تو وہ بھی سلامت نہ رہیں گے، ان کی عزت اور دولت اور قوت ان کو ہلاک ہونے سے ہرگز نہ بچا سکے گی، جب اسپین سے مسلمان نکالے گئے تھے، یا جب ہندوستان کے قدیم باشندوں اور حکمرانوں کو اچھوت اور ناپاک بنایا گیا تھا تو کیا ان کے ممتاز افراد کے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی تھی! پھر جو آجکل مسلمانوں میں نمایاں اور صاحبِ ثروت ہیں وہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگر قوم پر بُرا وقت آیا تو ان کو چھوڑ دیا جائے گا کہ تم نے معاشرہ کے ساتھ دغا کر کے جو دولت اکٹھا کر رکھی ہے اس سے حسبِ دستور لطف اندوز ہوتے رہو اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ چونکہ تم نے عوام سے خود کو الگ رکھا ہے اس لیے تمہارا حشر ان کے ساتھ نہ ہوگا، چونکہ تم ان کے بھوک اور فاقے میں شریک نہیں ہوئے اس لیے تم کو کبھی ان کے بھوک اور فاقہ میں شریک نہ کیا جائے گا۔

آخر میں جو دردمند حضرات قوم کی خدمت کی آرزو اور حوصلہ رکھتے ہوں ان کے سامنے ہم کام کا ایک خاکہ پیش کر رہے ہیں جو نہ کسی معنوں میں جامع ہے نہ مکمل، بلکہ اس کی حیثیت محض ایک ابتدائی مشورہ اور ایک دعوتِ فکر کی ہے جو شاید مسئلہ کو صحیح روشنی میں لانے کا محرک ہو سکے۔

(۱) مسلمانوں سے خوف، سراسیمگی، مایوسی اور پست ہمتی کے خیالات دور کرنا۔

(۲) ان کے اجتماعی احساس کو بیدار کرنا۔

(۳) ان میں محنت، استقلال، سادگی اور کفایت شعاری کی عادتیں پھیلانا۔

(۴) مسلمان دستکاروں اور کاریگروں کی تنظیم اور ان کی پشت پناہی کے لیے امداد باہمی انجمنوں کا قیام۔

(۵) چھوٹے چھوٹے دار الحرفہ جاری کرنا۔

(۶) تعلیمیافتہ مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ سرکاری ملازمتوں پر ٹوٹ کر نہ گریں۔

(۷) جو بااثر مسلمان اپنے عہدوں یا پیشوں سے ریٹائر ہوں ان کو آمادہ کرنا کہ وہ اپنی بقیہ عمر قوم کے لیے وقف کر دیں اور اس کی تعمیری خدمت کریں۔

(۸) مسلمانوں کو زکوٰۃ کی اہمیت بتانا اور اس کو ان میں رائج کرنا۔

(۹) اس کی کوشش کرنا کہ لوگ جو صدقہ، خیرات و زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں نکالیں ان کو بہتر سے بہتر مدوں میں صرف کریں۔

(۱۰) مسلمانوں میں بھیک مانگنے کے رواج کو ختم کرنا۔

مسلمان ہونا آسان ہو مگر صحیح مسلمان بننا بہت مشکل ہو۔ صحیح مسلمان بننے کی پہلی شرط یہ ہو کہ آدمی اپنے کو صحیح انسان بنائے اور صحیح انسان کہلانے کا وہی مستحق ہو جو اپنے کو ایک الگ تھلگ جزیرہ نہیں بلکہ ایک وسیع سلسلہ کی کڑی سمجھتے ہیں۔ بقول مولانا حالیؔ۔

می تواں قطبِ زماں شد، می تواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد، بجز انساں شدن
چیست انسانی؟ تپیدن در غمِ ہمسائگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن بریاں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریٔ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

یہی نقطۂ نظر متقاضی ہے کہ ہم اپنے اپنے حال میں مگن رہنے کا بجائے "پوری قوم" کے وسیع نقطۂ نظر سے سوچیں۔ اور ان کاموں کی فکر کریں جو قوم بحیثیت المجموع کی قوت و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔

حدیثِ پرویز

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

ایک محترم بزرگ نے جولائی ۱۹۵۹ء کے "طلوعِ اسلام" کے کچھ اوراق بھیجے ہیں، جن کا عنوان ہے۔ "ہماری تاریخ میں کیا لکھا ہے؟"

"طلوعِ اسلام" تو آپ سمجھتے ہوں گے؟ —— پرویز صاحب کے خیالات کا ترجمان ہے۔ اور ان کے خیالات معلوم ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں انھوں نے —— مضمون پر نام اگرچہ درج نہیں ہے مگر غالباً انھوں نے ہی —— یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ "ہماری تاریخ" قرآن فہمی کے راستہ میں روک ہے، قرآن ہمیں کچھ بتاتا ہے اور "تاریخ[1]" ہمیں کچھ سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور پھر اس مشکل کا حل انھوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف پڑے اُسے رد کر دینا چاہیے۔ اور اس تاریخ کو قرآن کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کرنا چاہیے۔

بظاہر اس حل میں اُصولی طور پر کوئی بات قابلِ اختلاف نہیں ہے، بڑا نیک کام اور بڑا صحیح نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ تو پرویز صاحب بھی جانتے ہیں کہ نفس تاریخی روایات (خواہ وہ قرنِ اول ہی سے متعلق ہوں، کسی کے نزدیک بھی سند و حجت اور سو فی صدی صحیح نہیں ہیں۔ لوگ بے تکلف ان تاریخی بیانات کو رد کرتے آئے ہیں۔ جو قرآن مجید سے متصادم ہوں، پھر یہ مشکل کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ —— مشکل یوں پیدا ہو رہی ہے کہ پرویز صاحب "تاریخ" میں حدیث کو بھی شامل کہتے ہیں، یعنی جو دھری ان کا تاریخ کے بارے میں ہے بعینہٖ احادیث کے بارے میں بھی ہے، اور لوگ احادیثِ صحیحہ کو حجت مانتے ہیں۔

[1] قرنِ اول کی تاریخ۔

پس ظاہر ہو کہ جب احادیث کی حالت یہ ہو کہ وہ قرآن کے خلاف کچھ بتاتی ہوں، اور لوگ حدیث کو سند اور حجت بھی مانتے ہوں تو لامحالہ قرآن فہمی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا ہو گی! ــــــ آئیے دیکھیں کیا واقعی وہ احادیث بھی جن کو ہم "احادیث صحیحہ" مانتے ہیں، قرآن فہمی کے راستہ میں رکاوٹ اور اصل دین کے لیے حجاب ثابت ہوتی ہیں؟

پرویز صاحب نے مثالیں پیش کی ہیں۔ ان میں ایک مثال تمہیداً اور باقی دو ایک ضمناً آئی ہیں۔ اصل مثال جس کے شرح و بسط ہی سے پورا مضمون تیار ہوا ہے ایک ہے۔ آئیے پہلے اسی پر غور کریں۔

اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ "قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسن عمل ہے نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات!" ــــــ اس ضمن میں قرآنی آیات، "ولقد کرمنا بنی آدم"۔ "و لکلٍّ درجات مما عملوا" اور "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" الآیۃ۔ پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ "صحابہ کبار پکے اور سچے مومن تھے۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی" ــــــ اس ذیل میں "والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اُولٰئک ھم المؤمنون حقا۔ الآیۃ۔ ــــــ "محمد رسول اللہ والذین معہ اشداءُ علی الکفار رحماءُ بینہم"۔ الآیۃ (آیات قرآنی) کو پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا اُمت کا اجتماعی فریضہ ہے ــــــ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ــــــ اس کے لیے (انھیں ہدایت تھی کہ) باہمی مشورے سے اپنے میں سے بہتر فرد کو (جو معیار خداوندی پر پورا اُترے) منتخب کر کے رسول کا جانشین بنائیں ــــــ وامرھم شوریٰ بینہم (۴۲/۳۸)

یہ قرآنی تصریحات "تھیں ــــــ" تاریخ" اس کے برعکس (بقول پرویز صاحب) بتاتی ہے کہ (۱) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور آپ کے بعد امیر المومنین کا سوال سامنے آنے لگا تو بعض صحابۂ کبار قرابداری اور "وراثت" کے نقطۂ نظر سے سوچنے لگے۔ (۲) اور جب آپ کی

آنکھ بند ہوگئی تو بجائے "شوریٰ" کے استبداد سے کام لے کر اور حسب و نسب کو درمیان میں لاکر خلافت کا فیصلہ کیا گیا۔ (۳) اور پھر اس سلسلہ میں نزاع کا وہ قولی و عملی انداز اختیار کیا گیا جو "رحماء بینھم" کے بھی خلاف تھا اور اُن کی طبندی کردار سے بھی فروتر!

ہم بتا چکے ہیں کہ جہاں تک محض تاریخی روایات کا سوال ہو ان کو کوئی بھی استناد کا وہ درجہ نہیں دیتا کہ اگر پرویز صاحب کو یہ روایات قرآن کے بیانات سے متصادم نظر آئیں تو کوئی مشکل محسوس کی جائے۔ اس لیے اگرچہ ہوسکتا ہو کہ ہمیں اس نوع کی روایات سے نتیجہ اخذ کرنے میں پرویز صاحب سے اختلاف رائے ہو لیکن (جب ہمارا موقف یہ ہو جو ابھی عرض کیا گیا تو) کوئی ضرورت نہیں کہ جو روایات اس مثال کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے محض کتب تاریخ سے لی ہیں، ہم اُن پر بھی گفتگو کریں۔[۵] ہمیں تو اُن حدیثی روایات کو دیکھنا ہو جنھیں ہم (حدیث کو حجت ماننے والے) لازماً صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

پرویز صاحب بخاری کی حسب ذیل روایت پیش کرتے ہیں کہ

> اس بیماری میں جس میں آپ نے وفات فرمائی۔ علی ابن ابی طالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا، ابو الحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہو۔ تو عباس بن عبد المطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہوگے۔ بخدا میرا یہ خیال ہو کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں، چلو رسول اللہ

---

[۵] یہ عجیب بات ہو کہ پرویز صاحب رونا تو اس تاریخ کا رونا چاہتے ہیں جو "دین بن گئی ہو" (ملاحظہ ہو طلوع اسلام ص۱۲) ——— اور وہ وہی واقعات ہیں جو معتبر احادیث کی روایات کے ذیل میں کتب حدیث میں آئے ہیں، اور جنھیں "صحیح" مانا جاتا ہو ——— لیکن بیچ میں روایات وہ لے آئے ہیں جو حدیث کی نہیں تاریخ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ جنھیں سند اور حجت کوئی نہیں مانتا ——— خدا ہی جانے یہ خلط مبحث کیوں ہے۔

صلعم کے پاس چلیں اور آپ سے دریافت کرلیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرمادیں گے (اس پرؒ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہوسکتی ہے، عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور رہوگا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اور پھر اس پر لکھتے ہیں

"اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضور کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت اور کسی کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لیے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافت حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے وہ بھی قابل غور ہے یعنی اگر ہم نے رسول اللہ سے دریافت کرلیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لیے کوئی گنجائش (CHANCE) نہیں رہے گا۔

شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت بھی خدا کی طرف سے موہبت ہے۔ اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں ....

لیکن سُنی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک خلیفہ اُمت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے۔ مذہبی خلافت کوئی جائداد نہیں ہے جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ہے۔ یہ تصور کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ہے، ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لیے

ؒ بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔ (منہ)

اسلام آیا تھا۔

جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں سنیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی، یہ معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔"

ہم اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس سے اُن نتائج کا اخذ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے جنھیں پرویز صاحب ظاہر اور بدیہی ٹھہرا رہے ہیں۔

۱۔ وہ کہتے ہیں:۔

"اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔"

یہ بالکل بے بنیاد خیال ہے۔ روایت کے الفاظ کی روشنی میں حضرت عباسؓ کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ کہ ان کے سامنے "حضور کے بعد" کا سوال آ گیا تھا کہ حضورؐ کے بعد ہم لوگوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ (نہ یہ کہ اُن کے دل میں "خلافت کا خیال" پیدا ہو گیا تھا[1]) ـــــ رہے حضرت علیؓ! تو (اُن پر اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں) اُن کے دل میں یہ سوال تک نہ آیا تھا کہ بعد میں کیا ہوگا؟ انھوں نے تو حضرت عباسؓ کے ذکر چھیڑنے پر کہا جو کچھ کہا۔ اپنی طرف سے وہ (اس روایت میں) ایک لمحہ کے لیے بھی سوچتے نہیں نظر آتے کہ حضورؐ کے بعد کیا رہے گا؟ چہ جائیکہ وہ اس فکر میں غلطاں نظر آئیں کہ میں کس طرح حضورؐ کی جانشینی پر قبضہ کر لوں!

۲۔ ـــــ "وہ (حضرت عباسؓ) اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافت حضرت علیؓ کے

---

[1] ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے وہ کسی صاحب زبان پر پوشیدہ نہیں۔ اگر پرویز صاحب پر پوشیدہ ہو تو ہم انھیں سمجھائیں!

متعلق، توثیق کرالینا چاہتے تھے۔"

یہ بھی محض پرویز صاحب کا اختراع ہے۔ حضرت عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں:-

"چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں، اور آپ سے دریافت کریں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوگی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرمادیں گے۔"

کیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ خلافت کے مسئلہ میں حضرت علیؓ کی خلافت کی (یا کسی کی بھی خلافت کی) توثیق کرالینا چاہتے تھے؟ یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ خلافت کن لوگوں کو ملے گی، تاکہ اگر یہ منصب خاندانِ نبوت سے باہر جانے والا ہو تو حضورؐ اپنے خاندان والوں کے حق میں کچھ وصیت اپنے جانشین کے لیے فرمادیں[۱]؟

۴- پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسولؐ اللہ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ معاذ اللہ اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔ کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی۔ یہ معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔"

---

[۱] حضرت عباسؓ نے اس وصیت کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ یہ ایک الگ سوال ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں ضمناً یہ سوال یہاں پیدا ہو، اس لیے ہم مختصراً کچھ روشنی ڈالے دیتے ہیں ——— ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ چونکہ ایک معمر اور تجربہ کار بزرگ تھے۔ ان کے سامنے قریش (قبل اسلام) کی وہ ساری تاریخ تھی جس میں بنو ہاشم سے بعض دوسرے قریشی خاندانوں کی چشمکیں، رقابتیں اور آویزشیں موجود تھیں اور یہ سب عناصر اب اسلام میں آچکے تھے اور جس طرح آئے تھے یہ بھی حضرت عباسؓ پر روشن تھا، ان کی عصبی طاقت کا بھی انھیں اندازہ تھا اس لیے قدرتی طور پر انھیں اس قسم کا خطرہ ہو سکتا تھا کہ یہ عناصر غلبہ حاصل کرلیں۔ اور پھر ان پچھلی رقابتوں کے اثرات رونما ہوں اسلیے انھوں نے اسکی پیش بندی ضروری سمجھی۔ واللہ اعلم

جہاں تک بخاری کی روایت کا تعلق ہو (مرسل شعبی سے اضافہ کو چھوڑ کر[۵]) اس کے تو کسی لفظ سے وہ تصور جو پرویز صاحب کے دل میں "قائم" ہو رہا ہو، کبھی کے دل میں شبہ بن کر بھی نہیں گزر سکتا حضرت عباسؓ کے الفاظ ابھی دوبارہ آپ کے سامنے آ چکے ہیں ان میں نظریہ وراثت اور موروثی استحقاق کا شائبہ تک نہیں ورنہ حضرت عباسؓ اس کی گنجائش کیوں سمجھتے کہ جس طرح ہماری نامزدگی کا امکان ہے اسی طرح کسی دوسرے کی نامزدگی کا بھی برابر کا امکان ہو؟ یہ تصور تو جب قائم ہو سکتا تھا جب الفاظ یوں ہوتے کہ چلو خلافت کا حق تو ہمارا ہی ہو چل کے حضورؐ سے اس کی تصریح بھی کرا لیں تاکہ بعد میں کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔ اسی طرح حضرت علیؓ کا بھی جو جواب بخاری کی روایت میں ہو (کہ اگر آپ نے ہمارے متعلق انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی نہیں دیں گے الخ) اس سے بھی کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت علیؓ امر خلافت میں اُمت کے شاورتی فیصلہ کے بجائے (خدانخواستہ) وراثتی استحقاق کے قائل تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے یہ الفاظ کہ لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی نہیں دیں گے، یہی تصور دیتے ہیں کہ وہ خلیفہ کے تقرر کو مشورہ ہی سے طے ہونے والی بات سمجھتے تھے۔

اب رہ جاتی ہو حضرت علیؓ کے جواب میں مُرسل شعبی سے اضافہ شدہ فقرہ کی بات! تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی بنیاد وراثتی استحقاق ہی کے نظریہ پر رکھی جائے اور لازمی طور پر یہ سمجھا جائے کہ حضرت علیؓ خلافت کو وراثۃً اپنا حق سمجھتے تھے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہو کہ بغیر وراثتی استحقاق کے نظریہ کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خیال یہ ہو کہ لوگ خاندان نبوت ہی میں سے ("معیارِ خداوندی پر پورا اترنے والے") کسی فرد کے انتخاب کو مصلحت سمجھیں گے! کیا اس بنیاد پر اس قسم کا کوئی فقرہ کسی کی زبان سے نہیں نکل سکتا؟ پھر اس فقرہ سے کیوں یہ لازم آتا ہو۔ اور کیوں یہ تصور قائم ہونا ضروری ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں وراثتی استحقاق کا نظریہ کام کر رہا تھا؟؟

۴۔ پرویز صاحب آخری بات فرماتے ہیں کہ

---

[۵] مرسل شعبی سے اضافہ کو چھوڑ کر، اس لیے کہ جیسا کہ آپکے سامنے آ چکا ہو پرویز صاحب نے یہ اعتراض بخاری ہی کی روایت کی بنا پر اٹھایا ہو۔ اور ظاہر ہو کہ مرسل شعبی کا اضافہ "بخاری کی روایت" سے خارج ہو۔

"پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہو اس سے اُن کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہو وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں"

اس سے اشارہ اس جواب کی طرف ہو کہ

"اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا"

اس سے حضرت علیؓ کے کردار پر کیا زد پڑتی ہو؟ یہ کہ وہ (معاذ اللہ) حکومت کی طمع میں بُری طرح گرفتار تھے؟ ——— ٹھیک ہو جس کے سامنے حضرت علیؓ نہ ہوں، خلافت ملنے کے بعد کی ان کی زندگی نہ ہو، صرف یہی چند الفاظ و نقوش اس کے سامنے ہوں وہ ضرور دنیا میں پائے جانے والے ہزاروں حریصانِ حکومت کی طرح انھیں بھی ایک سمجھ لے گا ——— اور یہ معاملہ صرف انھیں کے ان فقروں کے ساتھ خاص نہیں، خود رسولؐ کے بہت سے ارشادات کو اسی طرح غلط معنیٰ پہنائے جا سکتے ہیں۔ اور پہنانے والوں کی زد سے تو قرآنی فقرے بھی بچ کر نہیں جاتے ——— لیکن جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ حضرت علیؓ نے کیا؟ اور جب خلافت ان کو مل گئی تو انھوں نے کیسی فقر و مسکنت اور زہد و تقشف کی زندگی گزاری۔ کس طرح وہ دنیا و مافیہا سے نفور رہے ——— کہ راتوں کو اپنی داڑھی پکڑ کر روتے اور یہ کہتے نظر آتے۔

یا دنیا! أبی تعرّضت ام لی	اے دنیا کیا تو میرے درپے ہوئی ہو۔ کیا تو
تشوّقت۔ هیهات هیهات	مجھے اپنے حسن و جمال سے مسحور کرنا چاہتی ہو۔
غرّی غیری قد بتتّك ثلاثًا	دور ہو دور!! کسی اور کو لبھانے کی کوشش
لا رجعة لی فیك فعمرك	کر، میں تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ تو
قصیر وعیشك حقیر وخطرك	مجھ سے مایوس ہو جا، تیری عمر کیا؟ تیرا عیش
کبیر۔ آه! من قلة الزاد وبُعد	کیا؟ اور تجھ سے خطرہ کتنا بڑا ——— آہ!
السفر ووحشة الطریق۔	کہ زادِ سفر کم ہو۔ سفر دراز ہو اور راہ کی
صفة الصفوة لابن الجوزی (ج ۱ - ص ۱۲۰)	وحشت ناکیاں۔ الاماں!!!

—— راتوں کو یہ کہتے نظر آتے اور دن اُن کی راتوں کی اور ان کا عمل ان کی زبان کی تصدیق کرتا ——
پس جس شخص کو یہ سب معلوم ہو —— وہ کیونکر ان الفاظ میں حضرت علیؓ کی سیرت و کردار کی
خامیاں اور (معاذ اللہ) پستیاں دیکھ سکتا ہو؟ ایسا شخص تو ان الفاظ کا واقعی محرک جاننے کے لیے
ان کا پس منظر تلاش کرے گا۔ اور تلاش و جستجو میں فوراً ہی اسکی نظر اس حقیقت کی طرف جائے گی کہ
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غایت احتیاط سے عام طور پر ہر معاملہ میں اپنے اقرباء کو پیچھے
رکھتے تھے۔ دوسروں کو دیتے تھے اپنوں کو محروم کرتے تھے، چاہے انھیں پورا استحقاق ہو۔ حضورؐ
کی یہی عادت شریفہ تھی جس نے حضرت علیؓ کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ حضورؐ کے سامنے اگر بات
آئی تو بہت ممکن ہے کہ آپ ہمارے حق میں انکار فرمادیں، خواہ ہم کتنے ہی اہل اور مستحق ہوں۔
اس لیے میں کیوں خواہ مخواہ اپنے حق میں مہر لگواؤں؟ اور اس اعزاز (نیابت رسولؐ) کا دروازہ
اپنے ہاتھوں اپنے اوپر بند کردوں، جس کا اگر انسان حق ادا کرسکے تو رسالت و نبوت کے بعد
انسان کی سب سے بڑی سعادت ہے۔

غور فرمائیے۔ جب تمام قرائن حضرت علیؓ کے جواب کا ایک ایسا پاکیزہ محرک سامنے
لارہے ہوں تو کیوں ایک دنی محرک کی طرف تصور دوڑایا جائے، اور کیوں نہ اسی پاکیزہ اور اعلیٰ
جذبہ کو ان الفاظ کا محرک ٹھہرایا جائے[1]؟ کیا اس اعلیٰ جذبہ کے ماتحت اس طرح کا جواب نہیں
دیا جاسکتا تھا؟ —— پھر اس جواب سے حضرت علیؓ کی سیرت و کردار پر کیونکر کوئی زد پڑتی
ہے[2]؟؟ (باقی آئندہ)

---

[1] ہمارے اس انداز گفتگو سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ہم کوئی سفارش کر رہے ہیں کہ حضرت علیؓ کے جواب کا یہ محرک
سمجھ لینا چاہیے۔ بلکہ حقیقت یہ ہو کہ مذکورہ قرائن شہادت دیتے ہیں کہ یہی محرک تھا اور گرد و پیش کے ان قرائن کو نظر
میں رکھنے والا اس جواب کو کسی پست جذبہ پر محمول کر ہی نہیں سکتا۔ پس اگر اس جواب سے کوئی شخص غلط نتیجہ پر
پہونچتا ہو تو اس کی ذمہ داری ہماری "تاریخ" پر نہیں، اس شخص کے جہل یا اس کی بے ایمانی پر ہو!

---

[2] بلکہ، اگر اس محدود اور ضابطہ کی سی گفتگو میں ہمیں نکتہ سنجی کی اجازت دی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیرت و

کردار کی پستی کا تو سوال ہی کیا، اس جواب سے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بلندیٔ نظر ظاہر ہوتی ہے، ذرا غور تو کیجیے، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ بھائی! ذرا بعد کی فکر کرلو۔ خلافت اگر ہمارا حصہ نہ ہو تو حقوق کی حفاظت کا تو بندوبست ہو جائے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ چچا، میں ہرگز اس معاملے میں آنحضرتؐ سے بات نہیں کروں گا۔ حقوق کی حفاظت ہونا نہ ہونا تو کوئی ایسی اہم بات نہیں، ایسا نہ ہو کہ حقوق کی فکر میں ہم اس سعادت عظمیٰ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں جس کے سامنے دنیا کے سارے حقوق ہیچ ہیں۔ یعنی رسول پاکؐ کی نیابت و خلافت! تو میں اس قیمت پر یہ سودا کبھی نہیں کر سکتا ـــــ العظمة لله۔ کیا ٹھکانا ہے اس بلندیٔ نظر اور عظمتِ کردار کا!

انتخاب

مولانا جلال الدین رومیؒ

مغرب کی نظر میں

مولانا جلال الدین رومی تصوف اور طریقت کے بہت بڑے امام تصور کیے جاتے ہیں ان کی مثنوی اور دیوان کبیر کو مسلمانوں میں اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ ایران اور ہندوستان میں تو ان کی تعلیمات ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا لازمہ بن گئیں۔ آج بھی جب ہمارے ملک میں فارسی کا رواج برائے نام رہ گیا ہے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا ہو جس کو مولانا کی مثنوی کے دو چار شعر زبانی نہ یاد ہوں۔

مغرب میں جب مشرقی علوم سے شغف پیدا ہوا اور یہاں کا سرمایۂ علم و معرفت یورپی زبانوں میں منتقل کیا جانے لگا تو مولانا جلال الدین رومی کے افکار و خیالات کی طرف بھی یورپی مؤرخین اور محققین نے توجہ دی اور ان کا پیش کردہ فلسفۂ تصوف متعدد زبانوں میں منتقل کیا۔

شیخ سعدیؒ (وفات ۱۲۹۱ء) پہلے ایرانی شاعر ہیں جن کا خزانۂ فکر ۱۶۵۱ء میں کسی یورپی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے کوئی ایک سو سال بعد حافظ شیرازی (وفات ۱۳۸۹ء) کی نظموں کا ترجمہ کیا گیا۔ مولانا رومی کی تخلیقات کو کسی یورپی مصنف یا مترجم نے گوئٹے کے عہد تک ہاتھ نہیں لگایا۔ سب سے پہلے وان ہیمر نے دیوان کبیر اور مثنوی کے پچاس منتخب حصے ترجمے کے ساتھ شائع کیے، اگرچہ ان ترجموں میں صحت معانی کا بڑا خیال رکھا گیا مگر اصل میں شاعری کا جو حسن، خوشبوتی اور بانکپن موجود ہے ان ترجموں میں یہ رنگ بالکل مفقود ہے۔

اس صدی میں ایک جرمن مستشرق فریڈرک روکرٹ (۱۸۶۶ - ۱۷۸۸) نے جو ویانا میں ہیمر سے فارسی سیکھتا تھا مولانا کی نظموں کا ترجمہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تصوف کی حقیقی روح جرمن زبان میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوا۔

مولانا جلال الدین رومی نے اپنی نظموں کا انتساب شمس الدین کی طرف کیا تھا۔ روکرٹ نے اپنے تراجم کا انتساب خود مولانا کی ذات کی طرف کیا، روکرٹ نے پہلی بار جرمن ادب کو غزل سے روشناس کیا اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مولانا کی مثنویوں کی اہتزاز انگیز نغمگی اور تصوف کا سوز و ساز گہرائی، گیرائی اور کیف و مستی اپنانے اور ان کو اپنی مادری زبان کا سرمایہ بنا دینے میں ناکام نہیں رہا۔ روکرٹ بعض اوقات مولانا کے کسی ایک مصرعہ سے اس قدر وجد میں آتا ہے کہ ایک پوری نئی غزل تخلیق کر ڈالتا ہے۔ اس نے ہیمر کے بے روح تراجم کے بعض حصوں پر نظرثانی کر کے ان میں اصل کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ روکرٹ کے تراجم موجودہ صدی میں انگریزی زبان میں بھی منتقل کیے گئے۔

یورپ نے مشرقی تہذیب ثقافت سے روشناسی اور واقفیت حاصل کرنے کے معاملے میں دلچسپی کا مظاہرہ پچھلی صدی کے اوائل میں کیا۔ یہ دلچسپی زبان و لغت سے زیادہ ثقافت سے تعلق رکھتی تھی۔ جب انیسویں صدی نصف سے آگے بڑھی تو عالم اسلام پوری طرح مغرب کی توجہات کا مرکز بن چکا تھا، اور نئے نئے تراجم اور کتابیں اشاعت پذیر ہونے لگی تھیں، اس زمانے میں مولانا رومی کی تصانیف کے کچھ حصے بھی انگریزی اور جرمن زبانوں میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔ انگلینڈ میں وہائٹ فیلڈ مثنوی کا مطالعہ کر رہا تھا اس کے ترجمے نے علم الٰہیات اور مشرقی علوم کے حلقوں میں بعض دلچسپ مباحث کا باب کھولا۔ اس سے چند سال پیشتر ایک جرمن مستشرق جی روزن نے بھی مثنوی کی ابتدائی چند حصوں کا منظوم ترجمہ کیا، اس نے اپنی کتاب میں ایک مفید دیباچہ کے ساتھ تشریحی حاشیے بھی لکھے مگر روزن مولانا جلال الدین رومی کی روح کو اپنانے میں اس قدر کامیاب نہ ہوا جتنی کامیابی روکرٹ کو حاصل ہوئی تھی۔ یہی صورت حال ایک اور آسٹریلوی مستشرق روزن ویگ سٹوانو کے ساتھ بھی پیش آئی۔ البتہ طباعت کی آرائش و زیبائش کے اعتبار سے اس کی کوشش قابل ستائش رہی۔ روزن اور روزن ویگ سٹوانو ان ترجموں کے اثرات سے اپنے آپ کو بالاتر نہ رکھ سکے جو انیسویں صدی میں کیے گئے تھے۔ یہ اگرچہ ایک فطری بات تھی مگر ترجمہ کے معاملے میں یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اصل کی خوبصورتی اور مطلب پر وقت اور مقام کا اختلاف اثرانداز نہیں ہونا چاہیے۔ ان تراجم میں فن شاعریت اور مولانا کا تصوف پوری طرح جلوہ نما ہے لیکن قاری ان کے ذریعہ ان اسرار و رموز کی تہہ اور کنہہ کو پہنچنے سے قاصر رہتا ہے جو مولانا کو مولانا بنا گئے۔

کسی شاعر یا مصنف کی کاوشوں سے متعلق کامیاب تصنیف وہی قرار دی جاسکتی ہے جو اس کو مناسب طریق پر سمجھنے میں مدد دے سکے۔ مشہور برطانوی مستشرق آر۔ اے۔ نکلسن نے ۱۸۹۸ء میں ایک ایسی ہی کاوش کے ذریعہ سرمایۂ علم میں اضافہ کیا۔ اس نے دیوانِ شمس تبریزی کی کوئی چالیس غزلیں طبع کیں۔ اس کتاب میں اس نے مولانا کے اوصاف، خصوصیات اور تصوف کی تاریخ سے متعلق بعض بڑی قیمتی معلومات شامل کی ہیں۔ یہ مایۂ ناز مصنف یورپ کو تصوف کی تاریخ سے روشناس کرنے کے لیے چالیس سال تک متواتر جدوجہد کرتا رہا، اور یہ اسی کاوش کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ اور ایشیا دونوں کے پاس مثنوی مولانا روم سے متعلق آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک ناقابل فراموش کتاب موجود ہے۔ موجودہ دور میں جو شخص بھی مولانا کی مثنوی کا غائر مطالعہ کرنا چاہے گا اس کو اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ "دیوانِ کبیر" پر بھی ایک ایسی ہی کتاب کی ضرورت ہے۔

انگریزی زبان میں مولانا پر جو اور کام کیا گیا ہے، اُن میں مولانا کی وہ رباعیات بھی شامل ہیں جن کو حال ہی میں ایک انگریزی محقق اے۔ جے۔ آربری نے شائع کیا ہے۔ موصوف تصوف میں تخصص حاصل کر رہے ہیں۔ مصنف نے کچھ منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔

مولانا کا اثر مغرب پر کتنا گہرا اور وسیع ہے؟ اس سلسلے میں مشرقی جرمنی کی ایک سادہ مثال پیش کر دینی خالی از دلچسپی نہ ہو گی۔ یہاں ایک معمر صاحبِ فن فارسی زبان سے بالکل ناواقف ہے، اُس نے مولانا کو جرمن زبان کے تراجم کے ذریعہ جانا پہچانا اور اُن سے متاثر ہو کر بڑی خوب غزلیں لکھیں۔

(البلاغ، بمبئی)

ضروری اعلان

شوال اور ذی قعدہ ۸۹ھ کا الفرقان دفتر میں بالکل ختم ہو چکا ہے اس لئے انسادونوں شماروں کے متعلق کسی شکایت کی تلافی اب نہیں کی جاسکتی۔

مینجر

تعارف و تبصرہ

القادیانی والقادیانیہ از، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناشر مجلس ختم نبوت ملتان (پاکستان)۔ قیمت ۳/۱۲ صفحات ۱۴۰

قادیانیت عربی ممالک اور دوسرے اسلامی ممالک میں نفوذ کی سعی کافی عرصہ سے کر رہی ہے۔ باہر کے یہ سب لوگ اسکی اصل حقیقت سے ناواقف ہیں۔ قادیانیت کے اصل مآخذ ان کی دسترس سے باہر بھی ہیں۔ اور رسائی ہو بھی جائے تو غیر زبان کی وجہ سے وہ لوگ ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجلس ختم نبوت ملتان نے اس چیز کو محسوس کیا اور شاید انہی حضرات نے شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہ العالی کو اسکی طرف متوجہ کیا۔ حضرت ممدوح چونکہ قادیانیت کی فتنہ کاریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسلئے آپنے خصوصاً عرب ممالک اور عموماً دوسرے اسلامی ممالک کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بڑے اہتمام اور خصوصی دلچسپی کے ساتھ یہ عربی کتاب تیار کرائی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

عربی تحریر و تقریر پر مولانا ندوی کی قدرت محتاج بیان نہیں ہے۔ جس شخص کی عربی انشاپردازی پر خود عربوں کو اتنا اعتماد ہو کہ "المسلمون" (دمشق) جیسے بلند پایہ عربی ماہنامہ کی اداریہ نگاری کا فریضہ اُسے ہندوستان میں بیٹھ کر انجام دینا پڑے، اسکی عربی کے متعلق کیا موقع ہے کہ ایک ہندی زبان کھولے۔

اس کتاب کی تحریر و تالیف میں ایک شیخ وقت کی روحانی مدد کے ساتھ ساتھ (جو ہمارے نزدیک ایک حقیقت ہے) چونکہ اس موضوع کے خصوصی ماہرین کی معاونت بھی شامل رہی ہے (جن کا ذکر مؤلف نے پیش لفظ میں کیا ہے) اس لیے یہ واقعہ ہے کہ یہ عربی میں قادیانیت کے صحیح تعارف کی ایک کامیاب کوشش بن گئی ہے۔

اس کتاب میں چار ابواب ہیں، اور ہر باب کئی کئی فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلا باب ـــــ الشخصیات الاساسیہ وعصرها وبیئتها۔

دوسرا باب ـــــ تطور فکرة المرزا غلام احمد وعقیدته وتدرجه فی الدعاوی۔

تیسرا باب ـــــ القادیانی فی المیزان

چوتھا باب ـــــ القادیانیة فی المیزان

پہلا باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اول میں بدءِ قادیانیت کے وہ حالات دکھائے گئے ہیں جو اسکے نشو ونما کے لیے مساعد ہوئے۔ فصل دوم میں مرزا جی کی پیدائش سے وفات تک کا تذکرہ ہے۔ سوم میں۔ اُن کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین بھیروی کا تعارف ہے ـــ یہ باب مختصر ہے۔

باب دوم میں بھی تین فصلیں ہیں۔ ۱ مرزا، ایک مصنف اور داعیٔ اسلام کی حیثیت میں۔ ۲ تصنیف و دعوت سے دعوئے "مسیح موعود" تک۔ ۳ "مسیحیت" سے نبوت اور اس سے بھی آگے تک۔

باب سوم میں چار فصلیں ہیں۔ ۱ زندگی اور سیرت۔ ۲ برطانوی حکومت کی پشت پناہی اور تنسیخ جہاد۔ ۳ فحش کلامی اور بدگوئی۔ ۴ پیشینگوئی جو پوری نہیں ہوئی۔

چوتھا باب بھی چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ اوّل ـــ ایک متوازی دین اور متوازی امت۔ دوم ـــ نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت۔ سوم ـــ لاہوری شاخ، اس کا عقیدہ اور تفسیر (از مولوی محمد علی ایم اے) چہارم ـــ قادیانیت نے کیا دیا؟

اس تفصیل سے کتاب کی جامعیت کا کافی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کی عمومی حیثیت ایک جامع متن کی ہے، یا اسے آئینہ قادیانیت کہہ لیجئے ـــ قادیانیت کے اصل مآخذ .... سے بھرپور (اور منتخب) مواد ہر فصل میں دیدیا گیا ہے۔ صرف آخری باب کی بعض فصلیں ایسی ہیں جن میں مواد کم اور تبصرہ زیادہ ہے۔

آیئے، کچھ تھوڑی سی سیر بھی اس کتاب کی کریں!

قادیانیت کے لئے مساعد حالات

انیسویں صدی عیسوی کا دور عالم اسلامی کے بڑے فکری اضطراب اور شدید ذہنی کشمکش کا دور تھا

۱۸۵۷ء کے حادثۂ ہزیمت اور اس کے لائے ہوئے مصائب نے ہندوستان میں یہ اضطراب اور کشمکش سب ہی جگہ سے زیادہ شدید کر دی تھی۔ ایک عجیب اندرونی افراتفری برپا تھی۔ مسلمانوں پر یاس نے اس حد تک غلبہ پا لیا تھا کہ کسی معجزاتی عامل کے بغیر حالات کی اصلاح ناممکن نظر آنے لگی تھی، پنجاب میں یہ صورت حال باقی تمام ہندوستان سے بھی شدید تر تھی، کیونکہ وہاں سکھوں کی وحشی حکومت نے مسلمانوں کا حال اور بھی زیادہ خراب کر رکھا تھا۔ یہ حال تھا جو کسی کے مہدی موعود بن کر ظاہر ہونے کے لئے بڑا ساز گار تھا۔ (خلاصہ باب اول۔ فصل اوّل)

دعوائے مسیحیت و نبوت اور اسکی تمہید

مرزا غلام احمد قادیانی (پیدائش ۱۸۳۹ یا ۴۰) ان حالات میں ایک اسلامی مصنف، مناظر اور داعی کے روپ میں ظاہر ہوئے، اور دس بارہ سال تک، اپنی تالیفات و ملفوظات میں مناسب موقعوں سے، عنوان بدل کر، امتیوں کے لیے خصائص و مراتب نبوت کے امکانات لوگوں کو پلاتے رہے، اور پھر جب زمین پوری طرح تیار ہو گئی تو اس انداز سے دعوائے "مسیحیت" کی طرح ڈالی کہ ثانی اثنین حکیم نور الدین (خلیفۂ اول) نے ایک خط میں عرض کیا کہ حضور تو "مثل مسیح" اور ان احادیث کا مصداق ہیں جن میں نزول مسیح کی خبر دی گئی ہے۔ پھر آپ اس کا دعویٰ کیوں نہیں فرماتے؟ جواب دیا کہ اس عاجز کا منتہائے آرزو بس یہ ہے کہ "یدخلہ اللہ فی عباد المتواضعین المطیعین" (اللہ تعالیٰ اپنے مطیع و متواضع بندوں میں داخل کر لے) مجھے اس بلند بانگ دعوے کی کیا حاجت؟ ـــــ مگر قبل اسکے کہ سال (۱۸۹۱ء) گزرے، یہ تکلف برطرف ہو گیا اور سننے والوں کو خوشخبری سنا دی گئی کہ تم نے مسیح موعود کا وہ عہد مسعود پا لیا ہے جس کے انتظار و اشتیاق میں تمہارے باپ دادے اس دنیا سے گزر گئے۔

اسکے بعد جب آٹھ نو سال کے عرصہ میں معتقدین کو "آمنا وصدقنا" کہنے کی اچھی طرح عادت پڑ گئی تو اصل منتہائے آرزو (مرتبہ نبوت) کی طرف اس حزم و احتیاط کے ساتھ قدم اٹھایا گیا کہ ایک جمعہ میں یکایک جامع قادیان کے خطیب نے "اپنی طرف سے" انکشاف کیا کہ مرزا صاحب نبی و رسول ہیں، اور دیگر انبیاء کی طرح ان پر بھی ایمان واجب ہے۔ مرزا صاحب نہایت خاموشی کے ساتھ ہفتہ بھر اس شگوفہ کا رد عمل دیکھتے رہے۔ اندازہ ہوا کہ سوائے چند "بدنصیبوں" کے یہ گولی

بھی لوگ ہضم کرلیں گے، لہٰذا دوسرے جمعہ میں خطیب صاحب نے "ملأ اعلیٰ" کے اشارہ سے پھروہی راگ چھیڑا۔ اور اب کی مرزا صاحب کو بھی مخاطب کیا کہ "غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں" مرزا صاحب خاموش رہے۔ نماز اطمینان کے ساتھ ہوگئی، ارادہ فرمایا کہ واپس ہوں۔ خطیب صاحب نے دامانِ مبارک پکڑ لیا کہ اب تو آپ کو بات صاف کرنا ہی ہوگی، میرا خیال غلط تو نہیں ہے؟ ـــــ کہیں اتنے پر جاکر مرزا صاحب نے بصد تکلف زبان کھولی کہ "ھذا الذی ادین بہ وادعیہ" (وہاں بھی، بات یونہی ہے!) اور پھر پوری درازنفسیوں کے ساتھ ثبوت ہونے لگی ـــ

(خلاصۂ باب دوم)

حیات ومعیشت "نبی"! ان نبی صاحب کی ـــ جو (معاذ اللہ) خود تمام انبیاء سے بڑھ کر اور اُنکے "صحابہ" تمام نبیوں کے اصحاب سے بڑھ کر تھے ـــــ زندگی اور معیشت کیا تھی؟ اس روحانی سیادت سے پہلے وہ نہایت خستہ حال تھے، لیکن جب اس سیادت نے فتوحات کا دروازہ کھول دیا، تو معیشت کا رنگ یہ ہوا کہ خواجہ کمال الدین مولوی محمد علی لاہوری سے گلے مل کر روتے ہیں کہ ہم اپنی عورتوں اور بیٹیوں کو اقتداءِ اصحاب نبیؐ کی ترغیب دے کر زہد و قناعت پر آمادہ کرتے اور اس طرح اپنے مال میں سے قادیان کا حصہ نکالتے تھے، مگر جب ہماری یہ عورتیں، بیٹیاں قادیان گئیں اور دیکھا کہ مرزا صاحب کے گھرانے کے کیا ٹھاٹھ باٹھ ہیں، تو انھوں نے کہہ دیا کہ تم اب تک ہمیں دھوکے میں رکھتے تھے۔ اب ہم قادیان کی خاطر زہد و قناعت کا کوئی وعظ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

...... پسر تمام کند ایک ایسا شخص جو قادیانیوں کے ہاتھ پر "مسلمان" ہوا، انھیں کی تربیت میں رہا۔ مصر میں اسے تعلیم دلائی گئی اور جامعہ تعلیم الاسلام قادیان کا پرنسپل بنا۔ امامت میں مرزا بشیر الدین محمود (موجودہ خلیفہ و فرزند مرزا غلام احمد) کی نیابت کا اعزاز تک اُسے حاصل تھا اسی شخص پر جب "اسرارِ خلوت" کھلے تو ۱۹۳۰ء میں ایک عدالتی بیان میں اس نے قلمبند کرایا کہ

"مرزا بشیر الدین محمود اعلیٰ درجہ کا فاسق ہے، وہ دینی پیشوائی کے پردے میں نوجوان لڑکیوں کا شکار کرتا ہے۔ اس کام کے لیے عورتوں اور مردوں میں

سے اُس نے باقاعدہ دلال چھوڑ رکھے ہیں"

(باب سوم۔ فصل اول)

زبان اپنی کتابوں کے بارے میں تحریر ہے کہ

"یہ ایسی کتابیں ہیں کہ ہر مسلمان ان کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے علوم و معارف سے استفادہ کرتا ہے۔ اور میری دعوت کی تصدیق کرتا ہے۔ بجز کسبیوں کی اولاد کے" (اوکما قال)۔۔۔ الخ (فصل سوم)

الکفر ملّۃ واحدۃ ڈاکٹر شنکرداس مہرا، اخبار "بندے ماترم" میں لکھتے ہیں:۔

احمدی (قادیانی) تحریک کی ترقی، عربی تہذیب اور اسلامی وحدت پر ایک بے پناہ ضرب ہے، ۔۔۔۔۔۔

احمدی تحریک اسلام اور عرب تہذیب کی واحد حریف ہے۔ اسی لیے احمدی تحریک خلافت سے علٰحدہ رہے، کہ وہ ترکی اور جزیرۂ عرب کے بجائے قادیان کو مرکز خلافت بنانا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ خواہ مسلمانوں کے لیے کتنا ہی تکلیف دہ ہو، کہ وہ ہمیشہ اتحاد اسلامی اور اتحاد عربی کے خواب دیکھا کرتے ہیں لیکن وطن پرست ہندوستانیوں (غیر مسلموں) کے لئے سرچشمۂ سرور و اطمینان ہے!"

(باب چہارم فصل اول)

اس سے زیادہ کی اِن صفحات میں گنجائش نہیں۔ کتاب شروع سے آخر تک پڑھنے ہی پڑھنے کی ہے۔ بہت ہلکی پھلکی اور نہایت کارآمد۔ ہم جیبوں کے لیے خاص طور پر مفید، جو قادیانی اور قادیانیت کی خرافات، مہملات، کا طومار پڑھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ طباعت بہترین عربی ٹائپ سے ہوئی ہے اور کاغذ بھی اعلیٰ درجہ کا لگا ہے۔

ماہنامہ میثاق زیر ادارت مولانا امین احسن اصلاحی۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8 \times 1}$ صفحات ۵۶ کاغذ گلیز۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ پتہ۔ رحمٰن پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مولانا اصلاحی کی شخصیت تعارف سے بے نیاز ہو۔ وہ ایک صاحب فکر عالم ہیں اور ایک خاص قرآنی مکتب فکر کی امانتوں کے حامل ہیں۔ ہمارا اشارہ استاذ حمید الدین فراہی کے اسکول کی طرف ہو جس کے غالباً اسوقت سب سے بڑے فاضل مولانا موصوف ہی ہیں۔ مولانا کا یہ ماہنامہ جون سے نکلنا شروع ہوا ہے اور دو شمارے اس وقت تک آ چکے ہیں۔ دونوں کے دونوں اول سے آخر تک مولانا ہی کے اثرات خامہ پر مشتمل ہیں اور ہر مضمون قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے۔ "تذکرہ و تبصرہ" (اداریہ) تو مستقل عنوان ہے ہی۔ "تدبر قرآن" اور "تزکیہ نفس" کی نوعیت بھی مستقل عنوانات ہی کی سی ہے ——— تدبر قرآن، مولانا کی تفسیر قرآن کا نام ہو جسے انھوں نے اس ماہنامہ میں "بسم اللہ" سے شائع کرنا شروع کیا ہو یہ خصوصاً طلبا، اور تعلیم یافتہ حضرات کے استفادہ کے لائق ہو۔ "تزکیۂ نفس" اُن کے مضامین کا ایک سلسلہ ہے۔ جس کا کافی حصہ میثاق سے پہلے دوسرے بعض رسالوں میں نکل چکا ہے۔ اس سے متوسط درجہ کے عوام بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جولائی کے شمارہ میں "انفاق اور آفات انفاق" کا مضمون ہو۔ جس کا ایک حصہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے جو اس کے مفید اور پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے۔

تفسیر قرآن کی طرح "اسلامی قانون" بھی مولانا اصلاحی کا خاص موضوع مطالعہ ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر بھی ان کے مضامین پہلے ہی شمارہ سے میثاق میں آرہے ہیں۔ گذشتہ سال سفر حج میں مولانا نے جو سفرنامہ تیار کیا تھا اس کی قسطیں بھی میثاق میں نکل رہی ہیں۔ کسی صاحب فکر اور صاحب قلم مومن کے سفرنامۂ حجاز میں جو خصوصیتیں ہو سکتی ہیں وہ قریب قریب سب اس میں موجود ہیں۔ وللناس فیما یعشقون مذاهب۔

ہمیں امید ہے کہ تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ نیا دینی ماہنامہ خاص طور پر مقبول ہوگا۔ اور "میثاق ایمانی" کی تجدید کا باعث بنے گا۔ جو اس کا مقصد اشاعت ہے۔

۱۔ چہل حدیث زوجین
۲۔ چہل حدیث سلوک

از درویش میر شبیر علی صاحب چشتی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

۶۶ صفحات قیمت ۵۰ نئے پیسے

۱۴ صفحات قیمت ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ نشاۃِ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن

چہل حدیث کا انتخاب اور اشاعت حدیث کی رو سے ایک مبارک کام ہو۔ میر شبیر علی صاحب نے اسی جذبہ سے چہل حدیث کے یہ دو مجموعے مرتب کیے ہیں۔ نمبر ۱ میں ایسی چالیس حدیثیں (مع ترجمہ و تشریح) ہیں جن سے میاں بیوی کے باہمی حقوق، ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اولاد پر ماں باپ کے حقوق، نیز عورتوں کے باہمی حقوق واضح ہوتے ہیں، گویا کتاب کا دائرہ اپنے موضوع سے وسیع تر ہو۔ کتاب کی فی الجملہ افادیت میں شبہ نہیں، مگر اس میں اصلاح اور نظر ثانی کی بہت گنجائش ہو۔ نمبر ۲ میں ایسی چالیس حدیثیں ہیں جو سالکین کے لیے مشعل راہ ہیں ان کے ساتھ بھی ترجمہ اور مختصر تشریحات ہیں، یہ انتخاب حتہ حتہ نظر میں بہت مناسب نظر آیا۔ سالکین کیا ہر مسلمان کے کام کی چیز ہے ـــــ مرتب پر ذرا کہیں کہیں صوفیت غالب ہوگئی ہو۔ مثلاً "اپنے مبشرات سے مراد مرید کے اپنے خواب ہیں، دوسروں کے مبشرات پیر کے خواب ہیں جو مرید کے لیے دیکھتا ہے" (صفحہ ۳) یہ تحدید تو حدیث سے زائد ہے۔

انسانی فضیلت کا راز

از حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی۔ ۱۰۴ صفحات قیمت بارہ آنے ناشر:۔ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

یہ مولانا موصوف کی ایک تقریر ہو جو دار العلوم حقانیہ کے جلسۂ دستاربندی (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں فرمائی گئی تھی۔ اس میں مولانا نے اس حقیقت کو واضح کیا ہو کہ انسانی فضیلت کا راز وہ امانت علم ہو جو پیغمبروں کے ذریعہ نوعِ انسانی کو ملی ہے، مولانا کے بیان کی عالمانہ شان اور اس کی دل نشینی اور دلپذیری ایک حرف بیان کی بھی محتاج نہیں، ہند و پاکستان میں کم لوگ ہوں گے جنھیں موصوف کے مواعظ و بیانات سننے کا اتفاق نہ ہوا ہو اس تقریر کے مطالعہ سے لوگ ان شاء اللہ

وہی لطف اور وہی فائدہ حاصل کریں گے جو مجلس تقریر میں شرکت سے حاصل ہوتا۔ دارالعلوم حقانیہ کے ادارۂ نشر و اشاعت نے اچھا کیا کہ اس کو شایع کر کے عام کر دیا۔

۱۔ **میراث محبوب** : از پیرزادہ سید نثار علی صاحب نظامی } ناشر: کتب خانۂ انجمن ترقی اردو
۲۔ **مرقع اسناد** : علامہ اخلاق حسین صاحب دہلوی } جامع مسجد، دہلی

یہ دونوں رسالے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی جدّی وراثت اور نسبی جانشینی کے ایک دعوے کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ اس نزاع سے دلچسپی یا درگاہ سلطان المشائخ سے وابستگی رکھنے والوں کے لیے لائق مطالعہ ہیں۔ بحث سنجیدہ اور تحقیقی انداز سے کی ہے۔ پہلے رسالہ پر قیمت درج نہیں ہے۔ ۲ پر دس روپے درج ہے یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی، جبکہ ضخامت کل ۴۴ صفحات ہے۔ اول الذکر کی بھی ضخامت اتنی ہی ہے۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک قول و قرار، ایک عہد و پیمان ہے اور اس میں

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت و بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لاتے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والاخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

جلد ۲۷ | بابتہ صفر المظفر ۱۳۷۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۹ء | شمارہ ۲

تصحیح محرم ۱۳۷۹ھ کا شمارہ غلطی سے "مطابق جولائی ۱۹۵۹ء" لکھ گیا تھا۔ براہ کرم جولائی کاٹ کر اگست لکھ لیجیے تاکہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو۔

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا، وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے اور رسالہ دیر سے بھی پہنچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ ستمبر تک پہنچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:- رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ:-

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصل دین ہی خطرے میں اور عصری طوفانوں کی زد میں ہے۔ ایسے میں اختلافی بحثیں
چھیڑنا اور باہمی مباحثوں پر وقت صرف کرنا انتہائی ناعاقبت اندیشی اور دینی محاذ کو کمزور
کرنے کے مترادف ہے۔

اس قسم کی نصیحتیں ہیں جو آجکل بہت سننے میں آ رہی ہیں۔ اور یہ فی الاصل ہے بھی صحیح بات، مگر صحیح باتیں اگر غلط محل میں استعمال کی جانے لگیں تو وہ انتہائی خطرناک اور گمراہ کن بھی ہو جاتی ہیں۔ "اِن الحکم الا للہ" بالکل صحیح بات اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت تھی، مگر اسی کو خوارج نے جب غلط محل میں استعمال کیا تو وہ اسلام میں ایک شدید فتنہ بن گیا اور سیدنا علی بن ابی طالب رضؓ کو کہنا پڑا کہ "کلمۃُ حقٍ أُرید بھا الباطل" یہ فی الاصل کلمۂ حق ہے مگر اس کا استعمال جس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے وہ باطل ہے"

اسی طرح وہ "کلمہ" جو اوپر نقل کیا گیا، اصلاً حق ہے، مگر اُسکے استعمال میں بہت سے لوگ غلطی اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے نظر آ رہے ہیں۔

مسائل کی ایک نوع وہ ہے جن پر آدمی کی ایک رائے ہونی چاہیئے، مگر دوسری رائے کی بھی وہاں گنجائش ہوتی ہے۔ اسلئے اپنی رائے پر اعتماد کے باوجود کسی دوسری رائے کی بھی گنجائش تسلیم کی جانی چاہیے، اور تبادلۂ خیالات ہو تو ہو مگر بحث و نزاع کی صورت ہرگز نہ اختیار کیجائے۔ اس کی مثال فقہ کے وہ مسائل ہیں جن میں دونوں طرف کے دلائل موجود ہیں، معاملہ کسی دلیل

کی ترجیح وغیرہ کا ہوتا ہے، یا جیسے آج کل دین کی خدمت ونصرت میں بہتر طریق کار کا مسئلہ ہے کہ اس میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک نوع وہ ہے جہاں ایک رائے کے سوا دوسری رائے کتاب وسنت کے خلاف اور دوسرا مسلک از قبیل منکرات وبدعات ہوتا ہے، اور تبادلۂ خیالات سے کام نہ چلتا ہو تو فی نفسہ لازم ہے کہ اسکی تردید کی جائے۔ لیکن اگر وقت ایسا ہے کہ ان مسائل سے اہم تر مسائل درپیش ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت کے تمام دینی رجحان رکھنے والے عناصر کے اتفاق اور تعاون وتناصر کی اور اس بات کی ضرورت ہے کہ امت کی عام توجہ انھیں اہم تر مسائل کی طرف رہے تو ان غلط خیالات واعمال کی اصلاح کی حکیمانہ کوشش تو بہرحال جاری رہنی چاہیئے لیکن برملا تردید اور نزاع کی نوبت بیشک نہیں آنی چاہیئے۔

مسائل کی یہ دونوں انواع فروع سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان میں واقعی یا اضافی (یعنی وقت کے نقطۂ نظر سے) غلطی کا اثر محض کسی ایک جزئیہ تک محدود رہتا ہے، لیکن بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا اثر پورے دین کی یا دین کے بڑے حصہ کی سلامتی پر پڑتا ہے۔ اور ان میں اگر کوئی غلط اصول قائم ہونے دیا جائے تو بجائے دشمنوں کے خود اپنوں ہی کے ہاتھوں، اور بجائے بدنیتوں کے خود مخلصین ہی کے ہاتھوں دین کا حلیہ بگڑ کر رہ سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص الحاد اور دہریت کے عصری طوفان کے مقابلہ میں اسلام کا علمبردار ہو اور اسلامی نظام فکر وعمل ہی میں انسانیت کی نجات سمجھتا ہو۔ مگر وہ یہ اصول ساتھ لیکر چلتا ہو کہ خلیفۂ وقت مقتضیات زمانہ کے تحت دینی احکام کی ان تمام شکلوں میں ترمیم کر سکتا ہو جو قرآن میں منصوص نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ اس شخص کے اس خیال کو فروعی اختلافات پر قیاس کر کے اور یہ سوچ کر کہ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلیئے کہ یہ اصول دین کے ایک بڑے حصہ کو تلپٹ کر کے رکھ دے گا۔ علیٰ ہذا جو بھی شخص اور جو بھی دینی گروہ اس طرح کا کوئی غلط اصول قائم کرتا ہے۔ وہ خواہ عصری طوفانوں کے مقابلہ میں "اصل دین" کے لیے کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، اسکی اس غلطی اور اس زیغ سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

اگر آپکے گھر پر، محلہ پر، یا شہر پر باہر سے کوئی حملہ ہو رہا ہو۔ اور اندر آپ ہی میں کا کوئی شخص

بے وقوفی سے یا بھول چوک سے کسی حصہ میں آگ لگا دے، تو کون عقلمند ہوگا جو کہے کہ پہلے بیرونی حملہ پسپا کرو، آگ بعد میں بجھانا؟ ظاہر ہے کہ اہل خانہ، اہل محلہ یا اہل شہر کو دونوں کام ساتھ ساتھ کرنا پڑیں گے اور یہی دانشمندی اور عاقبت اندیشی ہوگی! کوئی کہنے لگے کہ بیرونی حملہ پسپا نہ ہوا اور دوسری طرف توجہ کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ گئی تو آگ سے جو کچھ تم بچاؤ گے اس سے بھی محروم ہو جاؤ گے، اس لیے کہ وہ دشمن لے اُڑے گا۔ لہٰذا سب یکسو ہو کر بیرونی مورچے ہی پر ڈٹے رہو تاکہ آگ سے جو کچھ خود بچ رہے (جیسے سکے اور معدنیات وغیرہ، بلکہ خود وہ زمین جس پر از سر نو تعمیر کی جا سکتی ہے) وہ تو ہمارا رہے، بتائیے کون ہے جو اس منطق کو قبول کر لے گا؟

اسی طرح یہ منطق بھی سخت تباہ کن ہے کہ فلاں اصول سے زیادہ سے زیادہ نظام عمل میں کچھ فتور پیدا ہو جائے گا، مگر یہ جو الحاد و بیدینی کا سیلاب ہے، اس میں تو ایمانیات اور اساسات دین تک کی خیر نہیں۔ پس پہلے اس کو روکو۔ اندر کے فتنوں کی بعد میں خبر لینا۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کا خطرناک اصول اگر کوئی ایسا شخص پیش کرتا ہے جس کا اہل دین میں کوئی خاص وقار اور کوئی خاص وزن نہیں ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق اہمیت کے باوجود اتنی توجہ اور اتنی فکر کا مستحق نہیں ہے جتنی توجہ اور جتنی فکر کا مستحق ایسا کوئی وہ اصول ہے جو کسی ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کیا جائے جسے اہل دین کی نظر میں کوئی خاص وزن اور کسی دینی طبقہ کی نظر میں دینی اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے کسی شخص سے اگر ایسی کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو اس پر اسے ٹوکنا خصوصیت کے ساتھ زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک بڑی جماعت کی گمراہی کا خطرہ یقینی ہے۔

ہاں اب یہ اس شخص کا اور اس کے حامیوں کا فرض ہے، اگر وہ مخلص ہیں، کہ انہیں اگر کسی بات پر ٹوکا جاتا ہے تو وہ اس کو نزاع کی صورت نہ دیں۔ تاکہ حتی الامکان اور کسی نہ کسی حد تک اتحاد و تعاون کی گنجائش باقی رہ سکے۔ لیکن اگر وہ "اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ" کا مظاہرہ کرنے لگ جائیں۔ اور ایک اصولی اختلاف کو زبردستی ذاتی عناد کا نتیجہ قرار دے کر تنابز بالالقاب کی مہم شروع کر دیں۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اتحاد و تعاون کی گنجائش برقرار رکھنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں۔

اور اسکی تمامتر ذمہ داری اسی شخص پر ہے جو بحث کو یہ غلط رنگ دے ـــــ تاہم یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص ضبط و تحمل سے کام لے کر، اپنی حد تک فضا کو زیادہ خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کرے۔

لیکن اسکے بعد اگر یہ درجہ آجائے کہ حق واضح ہو جانے پر اور اسکی شہادتیں چاروں طرف سے ہویدا ہو جانے پر بھی آدمی اپنی بات کی پچ میں بنیترہ بازی دکھائے اور اپنی ساری ذہانت، ساری استدلالی قوت اور تقریر و تحریر کی تمامتر مہارت ایک باطل کو حق بنا دینے میں صرف کرنے لگے۔ کتاب و سنت کا غلط استعمال کرے اور فقہاء و محدثین کے بیانات کو بے محل استعمال میں لائے۔ اور اس طرح ایک اصولی گمراہی کے ساتھ ساتھ دس جزئی علمی و دینی غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا کرے۔ تو ہرگز روا نہیں ہے کہ اسکے ساتھ ادنیٰ رعایت کی جائے۔ وہ اگر عصری طوفانوں کے مقابلہ میں "اصل دین" کی حفاظت کی کوئی بڑی خدمت بھی انجام دے رہا ہے اور ان طوفانی لہروں کی تخریب کے مقابلہ میں تعمیر نو کا علمبردار ہو۔ تو لوگ ایسی تعمیر کو لیکر کیا کریں گے جس میں کتنی ہی خرابیوں کی صورتیں پیشگی مضمر ہوں؟ اور جسکا معمار اس بات کا روادار ہو کہ محض اپنے وقار کی خاطر دین کے کتنے ہی سرے کو کسی وقت خود اپنے ہی ہاتھوں مسخ کردے

تَحْسَبُونَہٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِيمٌ۔

اِرشاداتِ مجدّدِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے پیرایے میں

تلخیص و ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی

مکتوباتِ معصومیہ کے تلخیص و ترجمہ کے بعد اب مکتوباتِ امامِ ربّانی ہر سہ جلد کی تلخیص کا کام شروع کر رہا ہوں ـــــ وہ مکتوبات جو علمی حقائق و معارف پر مشتمل اور متوسط اذہان سے بالاتر ہیں ان کو اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے ـــــ احسان و تصوف، تعمیرِ باطن اور اُمّتِ مسلمہ کی عام بہبودی اور ملّتِ بیضاء کی سرسبزی کے لیے جو کچھ جس مکتوب میں ہے اس کو شامل کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارادہ ہے کہ مکتوب الیہم کے حالات بھی جہاں تک معلوم ہو سکیں وہ حاشیے پر لکھ دیے جائیں، تاکہ معلوم ہو کہ مجدّد الفِ ثانیؒ نے احیاءِ سنت اور ترویجِ احکامِ شریعت کی جدوجہد میں اُس زمانے کی عظیم و مؤثر شخصیتوں سے مکاتبت کر کے کس کس پیرایے میں اپنے درد دل کو صفحاتِ رقعات کے سپرد کیا ہے، اور کس حذاقت کے ساتھ اُمّت کے اصل مرض کی تشخیص اور ازالے کی تجویز پیش کی ہے۔ درحقیقت آپ نے اپنے خلفاء و مریدین کے علاوہ دیگر علماء و صلحاء، اُمراء و حکام، عوام و خواص غرضکہ سب کے سامنے احساسِ عظمتِ دین کی ضرورت رکھی اور سب کو بیدار کیا۔ ـــــ تاریخ گواہ ہے کہ مستقبل قریب میں ان مکتوبات کی صدائے بازگشت نے قافلۂ اُمّتِ مصطفویہ کے حق میں امیرِ کارواں کا کام انجام دیا ـــــ اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ آج بھی ان مکتوبات کی روشنی میں ہم اپنی منزلِ مقصود کا پتہ چلا سکتے ہیں ـــــ گو ترجمہ لفظی نہ ہو گا۔ لیکن حتی الامکان کوشش اس امر کی ہو گی کہ لفظوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مفہوم پورا پورا واضح

ہو جائے ـــــ اللہ تعالیٰ اس کام کو بحسن و خوبی انجام پذیر کرے اور ان ارشادات عالیہ پر عمل پیرا ہونے کی مجھے اور تمام مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے ـــــ (آمین)

[نسیم احمد فریدی غفرلہٗ]

مکتوب (۲۳) جلد اول ـــــ عبد الرحیم[1] خانخاناں کے نام (بزبان عربی)

{ناقص پیر سے اخذ طریقہ کی مضرت اور کفریہ لقاب کی ممانعت کے بیان میں]

تمہارا خط مجھے ایک صاحب سے ملا اور انھوں نے زبانی بھی تمہارا پیغام پہونچایا۔ میں نے (قاصد کی آمد پر) یہ شعر پڑھا۔

اهلاً لسُعدیٰ والرسولِ وحبّذا ـــ وجه الرسول لحُبِّ وجه المرسلِ

(سُعدیٰ اور اس کے قاصد کو مرحبا ـــــ خط بھیجنے والے کی محبت کی بنا پر قاصد کی ذات قابل مدح ہو)

---

[1] مرزا عبد الرحیم بن بیرم خاں خانخاناں ـــــ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ کو لاہور میں امیر جمال خاں میواتی کی صاحبزادی کے بطن سے پیدا ہوئے ـــــ چار سال کی عمر تھی کہ باپ پٹن گجرات میں قتل ہو گئے۔ آگرہ میں ان کی پرورش ہوئی۔ تعلیم مولانا محمد امین اندجانی، قاضی نظام الدین بدخشی، حکیم علی گیلانی اور علامہ فتح اللہ شیرازی سے حاصل کی، گجرات پہونچ کر شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے بھی اخذ علوم کیا ـــــ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً اکبر بادشاہ نے ان کو جہانگیر کا اتالیق مقرر کیا، پھر یہ برابر ترقی کرتے رہے ـــــ بلاد گجرات، بلاد سندھ اور اقطاع اقلیم دکن انھیں کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔ خانخاناں (امیر الامراء) ان کا لقب تھا۔

عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبانوں کے ماہر تھے اور فصاحت کے ساتھ ان زبانوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ شعر گوئی میں بھی کمال حاصل تھا، علم ادب اور فن تاریخ میں خاص ملکہ تھا ـــــ تزک بابری جو ترکی زبان میں تھی اس کا ترجمہ سب سے پہلے انھوں نے ہی ۹۹۸ھ میں کیا، مطالعۂ کتب کا اتنا شوق تھا کہ گھوڑے کی پشت پر عین میدان جنگ میں بھی کتاب ہاتھ میں رہتی تھی اور حد یہ ہو کہ غسل کرتے وقت بھی غسل خانے سے باہر ایک خادم کتاب کے اجزاء ہاتھ میں اٹھائے کھڑا رہتا تھا، ان کے یہاں علماء کا اتنا مجمع رہتا تھا کہ کسی بادشاہ یا امیر کے یہاں اتنا نہیں پایا گیا۔ علماء کا انتہائی اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ اموال و صلات سے برابر ان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ ان کی امداد

(باقی صفحہ پر)

ظہورِ کمالات کی استعداد رکھنے والے بھائی! اللہ تعالیٰ تمھاری استعداد کو قوۃ سے فعل میں لائے۔
سنو ـــــ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ افسوس اس پر ہے جو یہاں زراعت نہ کرے۔ زمینِ استعداد کو معطل اور تخمِ اعمال کو ضائع کردے ـــ یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ زمین کو بے کار اور ضائع کردینا دو طریقے پر ہوتا ہے۔

(۱) یا تو اس میں کچھ بویا ہی نہ جائے۔ (۲) یا اس میں خراب بیج ڈالے۔

امرِ دوئم، مضرت و فساد کے لحاظ سے امرِ اول کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جیسا کہ ظاہر ہے ـــــ بیج کی خرابی اور اس کا فساد یہ ہے کہ کسی ناقص پیر سے طریقہ اخذ کرکے اس کے مسلک پر گامزن ہو۔ اسلئے کہ ناقص پیر اپنی خواہشاتِ نفسانی کا پیرو ہوتا ہے اور وہ بات جو خواہشِ نفسانی سے آمیختہ ہوتی ہے کچھ اثر نہیں کرتی، اور اگر اثر کرے گی تو خواہشات کے لیے ہی معین و مددگار ہوگی، بس ظلمت پر ظلمت بڑھے گی۔
ـــــ نیز ناقص کو یہ تمیز بھی نہیں ہوتی کہ کون سا راستہ اللہ تک پہونچاتا ہے اور کون سا نہیں؟ اس لیے کہ وہ خود واصل نہیں ہے ـــــ اور اسی طرح وہ طلبہ کی مختلف استعدادوں کی بھی تمیز نہیں رکھتا اس کو "طریقۂ جذبہ" اور "طریقِ سلوک" میں بھی امتیاز نہیں ہوتا، بااوقات ایک طالبِ علم کی استعداد، ابتداءً طریقِ جذبہ کے مناسب اور طریقِ سلوک کے غیر مناسب ہوتی ہے، اور وہ ناقص رہنما اُس کو (اُس کی استعداد کے برخلاف) طریقِ سلوک پر گامزن کرتا ہے، لہٰذا اس کو بھی اپنا جیسا گمراہ کردیتا ہے ـــــ
شیخ کامل و مکمل جب کسی ایسے گم کردہ منزل، طالب کی تربیت کرتا ہے تو اولاً اس کو اس امر کی احتیاج ہوتی ہے کہ وہ پیرِ ناقص کے غلط اثرات کو زائل کرے اور اس کے سبب جو فساد لاحق ہوا ہے اس کی اصلاح کرے

(بقیہ حاشیہ صـ)
دور دراز علاقوں تک علماء کے پاس پہونچتی تھی۔

شعراء کا بھی ایک بڑا گروہ ان کے اردگرد جمع ہوگیا تھا ـــ غرضکہ یہ علم و ادب، حلم و تواضع اور شجاعت و کرم کا مرقع تھے ـــ علامہ حکیم سید عبدالحی حسنی نے "نزہۃ الخواطر" جلد خامس میں ماثر الامراء اور خزانۂ عامرہ کے حوالے سے ان کے مفصل حالات لکھے ہیں اور فرمایا ہے۔ لم یخیض من الھند احد مثلہٗ ولا من غیرہ من الاقالیم السبعۃ من یکون جامعاً لاشتات الفضائل۔ یعنی ہندوستان بلکہ ہفت اقلیم میں ایسا جامع فضائل امیر پیدا نہیں ہوا۔ ۱۰۳۶ھ میں وفات پائی اور دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کے سامنے دفن ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانی" کے متعدد مکتوبات ان کے نام ہیں۔

ــــــ پھر وہ تخم صالح جو اس طالب کی استعداد کے موافق ہو اس کی استعداد کی زمین میں ڈالے ۔ اس سے پیداوار اچھی ہوگی ــــــ .... صحبت شیخ کامل ، کبریت احمر کا حکم رکھتی ہو ، اس کی نظر دوا اور اس کا کلمہ شفا ہو ...... اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں جادۂ شریعت مصطفویہ پہ ثابت قدم رکھے ، کیونکہ یہی امر مدار نجات اور ذریعۂ سعادت ہو ، کسی نے کیا خوب کہا ہو ؎

محمدؐ عربی کا برد ئے ہر دو سرا است　　کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

.... اس حامل رقعہ نے یہ بھی بیان کیا کہ تمھارے حاضر باش شعراء میں سے ایک شاعر صاحب کفری تخلص فرماتے ہیں ، حالانکہ وہ صاحب (نسباً) سادات عظام میں سے ہیں ــــــ خدا جانے ان شاعر صاحب کو اس غلط قسم کے تخلص پر کس چیز نے آمادہ کیا ــــــ مسلم کو چاہیئے کہ وہ اس قسم کے ناموں سے ــــــ جتنا شیر خونخوار سے بھاگتا ہو اُس سے بھی زیادہ بھاگے ــــــ اور پوری پوری کراہت کرے ، اس لیے کہ یہ اسم (کفر) اور اس کا مسمیٰ دونوں اللہ اور اُس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور تمام سچے مسلمانوں کے نزدیک قابل بغض ہیں ۔ پس ایسے اسم قبیح سے پرہیز کرنا واجب ہو ــــــ اور بعض مشائخ کی عبارات میں غلبۂ سکر کی بنا پر کفر کی مدح اور زنار بندی کی جو ترغیب پائی جاتی ہو وہ عبارات ظاہر معنیٰ سے پھیر لی گئی ہیں اور ان کی تاویل کی گئی ہو ۔ اس وجہ سے کہ اہل سکر کا کلام محمول علی التاویل ہوتا ہو اور "ظاہر متبادر" سے پھیر لیا جاتا ہو ــــــ وہ غلبۂ سکر کی بنا پر معذور ہوتے ہیں ...... لیکن جو اہل سکر نہیں وہ ان کی تقلید میں غیر معذور ہیں ۔ ان بزرگوں کے نزدیک بھی اور عند الشرع بھی ......

اُن صاحب سے میری جانب سے کہو کہ وہ اپنا تخلص تبدیل کر کے اسلامی تخلص رکھیں ، یہ تخلص حال و قال مسلم کے موافق بھی ہو ــــــ اور اس اسلام کی طرف اس کا انتساب ہو جو عند اللہ و عند الرسول پسندیدہ ہو ــــــ اور اس میں موقع تہمت سے بچنا بھی ہو جس کا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ میں حکم فرمایا ہو ــــــ اتقوا من مواضع التہم ــــــ (تہمت کے موقعوں سے بچو) ۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو ۔ ولعبدٌ مومن خیرٌ من مشرکٍ ــــــ مومن بندہ مشرک سے بہتر ہو ــــــ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ ــــــ

مکتوب (۲۴) محمد[1] قلیج خاں کے نام ــــــ (بزبان عربی)

---

[1] امیر کبیر فاضل علامہ قلیج محمد خان الاندجانی ــــــ ان کو اکبر بادشاہ نے قلعہ سورت کی حفاظت کے لیے متعین (باقی صفحہ ...)

سلمکم اللہ سبحانہ وحافاکم بحرمۃ سید المرسلین علیہ وآلہ الصلوات والتسلیمات

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے) المرء مع من احب (آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے اس کی محبت ہے) پس خوشا نصیب اس کے جس کے قلب میں اللہ کے ماسوا کی محبت نہ ہو اور وہ اللہ کی مرضیات کے علاوہ کسی چیز کا ارادہ نہ کرے۔ ایسا آدمی اللہ کے ساتھ ہی ہے۔ اگرچہ اس کا ظاہر مع الخلق ہو...... قلب سے ایک سے زیادہ کی محبت متعلق نہیں ہوتی۔ جب تک کسی ایک سے تعلق حبی قائم ہے، اس کے ماسوا سے محبت نہیں ہوگی ــــ اور یہ جو دیکھنے میں آتا ہے کہ اشیاء متعددہ سے انسان کو محبت ہے جیسا کہ مال، اولاد، مدح، رفعت عند الناس سے ــــ درحقیقت یہ سب مل کر ایک ہی چیز بنتی ہے اور وہ نفس ہے ــــ ان سب مذکورۂ بالا چیزوں کی محبت اسی ایک نفس کی محبت کی فرع ہے، کیونکہ یہ سب چیزیں (آدمی) نفس ہی کیلئے چاہتا ہے۔ فی نفسہ ان اشیاء کو نہیں چاہتا ــــ جب اس سے اپنے نفس کی محبت زائل ہوئی تو تبعاً ان تمام چیزوں کی محبت بھی زائل ہوگئی ــــ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عبد اور رب کے درمیان نفسِ عبد، حجاب ہے۔ عالم حجاب نہیں ہے ــــ اس لیے کہ عالم فی نفسہ بندے کا مقصود نہیں کہ اس کو حجاب قرار دیا جائے۔ بندہ کا مقصود تو نفس ہے لہذا وہی حجاب بھی ہے۔ پس جب تک بندہ مرادِ نفس سے خالی نہ ہوگا، رب اس کا مقصود نہ بنے گا اور اس کے دل میں محبتِ خدا نہیں سما سکتی۔ یہ دولتِ عظمیٰ فناءِ مطلق کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور فناءِ مطلق، تجلیٔ ذاتی سے متعلق ہے، ظلمات کا بالکلیہ

(بقیہ صفحہ ۹)

کیا تھا، پھر گجرات کا حاکم کیا، بعدہٗ وزارت کے عہدے پر پہنچایا، ــــ اکبر نے ان کو اپنے لڑکے دانیال کا اتالیق بھی مقرر کیا تھا۔ مختلف اوقات میں بعہد اکبری لاہور، کابل، آگرہ، مالوہ اور پنجاب کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا اور سنبھل کا علاقہ ان کی جاگیر میں دیا گیا ــــ بعہد جہانگیر گجرات کے حاکم بعدہٗ پنجاب و کابل کے حاکم بنائے گئے۔ معقول و منقول کے ماہر تھے، صالح و متقی تھے، درس و افادہ میں بھی مشغول رہتے تھے اور جس زمانہ میں لاہور میں تھے بنفسِ نفیس روزانہ ایک مدرسے میں پہونچ کر فقہ اور حدیث و تفسیر کا درس دیتے اور نشر و اشاعتِ علوم میں کوشش کرتے تھے۔ غرضیکہ صاحبِ سیف و قلم بھی تھے اور مسندِ درس و تدریس کی زینت بھی۔ اسّی سے زیادہ عمر پائی اور بعہد جہانگیری ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی۔

(ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد خامس صد ۳۱۲ و ۳۱۳)

رفع ہونا آفتاب کے طلوع ہوئے بغیر متصور نہیں ـ جب یہ محبت جس کو محبت ذاتیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے حاصل ہوگئی تو محب کے نزدیک انعام محبوب اور ایلام[1] محبوب دونوں مساوی ہوگئے ــ اسی وقت اخلاص حاصل ہوگا ـــ اب وہ اپنے رب کی عبادت اپنے نفس کے لیے نہیں کرے گا کہ انعام طلب کرے اور ایلام کو دفع کرے۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں اس کے نزدیک برابر ہوتی ہیں ـ الخ

مکتوب (۲۹) ـــــ شیخ نظام[2] الدین فاروقی تھانیسری کے نام

اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو تعصب و تعسّف سے محفوظ رکھے اور تلهف و تاسف سے نجات دے. بحرمۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم۔

اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے اعمال یا فرائض ہیں یا نوافل ـــ مگر نوافل کا فرائض کے مقابلے میں کوئی اعتبار نہیں ـ اپنے وقت میں کسی فرض کا ادا کرنا ہزار سالہ نوافل سے بہتر ہے۔ اگرچہ وہ نوافل بہ نیتِ خالص ادا کیے جائیں ــ کوئی بھی نفل ہو، نفلی نماز ہو، نفلی روزہ ہو، ذکر و فکر ہو،

---

[1] تکلیف دینا۔

[2] شیخ نظام الدین فاروقیؒ ابن شیخ عبدالشکور فاروقیؒ ـــ آپ سلسلۂ امدادیہ، صابریہ، چشتیہ کے اکابر طریقت میں سے ہیں ـــ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کئی مکتوبات آپ کے نام ہیں۔ اور ان سے آپ کے اور مجدد صاحبؒ کے باہمی خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے ـــ یہ مکتوب بھی اصلاحی نقطۂ نظر سے بربنائے رابطۂ محبت لکھا گیا ہے ـــ شیخ نظام الدین تھانیسریؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کے برادر زادہ، داماد، اور مرید و خلیفہ تھے۔ جہانگیر کی ناراضگی کے باعث آپ نے بلخ کو جائے رہائش بنالیا تھا۔ حضرت شیخ ابوسعید گنگوہیؒ آپ ہی کے خلیفہ تھے ـــ ان کے علاوہ بہت سے علماء و مشائخ نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ شرح لمعات عراقی، شرح سوانح غزالی، رسالۂ حقیقۃ، رسالۂ غیبیہ اور تفسیر نظامی آپ کی تصنیفات ہیں ـــ انوار العارفین مؤلفۂ صوفی محمد حسین مرادآبادی کے بیان کی رو سے آپ اُمّی تھے، لیکن چشمۂ علم لدنی آپ کے باطن میں جوش زن تھا۔ جو حقائق و معارف بیان فرماتے تھے آپ کے خلفا، اس کو قلمبند کر لیتے تھے، اس طرح یہ چند تصنیفات تیار ہوگئیں۔ ۸ رجب ۱۰۳۶ھ، بقولے ۱۰۲۴ھ اور بقولے ۱۰۲۲ھ کو جمعہ کے دن وفات پائی۔ بلخ میں آپ کا مزار مبارک ہے ـــ (انوار العارفین و نزہۃ الخواطر جلد خامس)

یا اس کے مثل ہو ـــــ بلکہ میں کہتا ہوں کہ کسی فرض کی ادائیگی کے وقت سُنن میں سے کسی سنت کی رعایت کرنا بھی یہی حکم رکھتا ہے (یعنی ہزار سالہ نوافل سے بہتر ہے) ـــــ منقول ہے کہ ایک دن امیرالمومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز فجر جماعت سے ادا کرنے کے بعد مقتدیوں پر نظر دوڑائی۔ ایک شخص کو اپنے اصحاب میں سے اس وقت نہ پایا، دریافت فرمایا کہ فلاں صاحب جماعت میں نہیں آئے؟ حاضرین نے عرض کیا کہ وہ رات کے اکثر حصے میں (نفلی نماز ادا کرنے کی وجہ سے) بیدار رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھ لگ گئی ہوگی۔ یہ سُن کر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اگر تمام رات وہ سوتے رہتے اور فجر کی نماز با جماعت ادا کرلیتے تو تمام رات جاگنے سے بہتر ہوتا ـــــ پس کسی سنت کی رعایت (فرائض میں) کرنا اور کسی مکروہ سے اجتناب کرنا (چاہے مکروہ تنزیہی کیوں نہ ہو چہ جائیکہ مکروہ تحریمی) ذکر و فکر اور مراقبہ و توجہ سے بدرجہا بہتر ہے ـــــ ہاں اگر یہ امور کسی ادب کی رعایت اور کسی مکروہ سے اجتناب کا لحاظ رکھتے ہوئے کیے جائیں تو عظیم الشان کامیابی کی بات ہے ..... ایک دانگ (چھ رتی وزن) زکوٰۃ کا حساب کر کے نکالنا۔ نفلی طریقے پر سونے کے بڑے بڑے پہاڑ خیرات کر دینے سے کہیں زیادہ افضل ہے ـــــ اور اس زکاتی دانگ کے تصدق کرنے میں کسی ادب (سنت) کا لحاظ رکھنا ـــــ مثلاً اس کو ایسے فقیر کو دینا جو عزیز قریب ہو ـــــ اور بھی زیادہ بہتر ہے" لہٰذا عشار کی نماز آدھی رات کے بعد پڑھنا اور اس تاخیر کو قیام لیل (تہجد) کا ذریعہ بنانا سخت مکروہ بات ہے۔ اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک اس وقت میں عشار کی نماز مکروہ ہے، ظاہر یہ ہے کہ اس کراہت سے کراہت تحریمی مراد ہے۔ کیونکہ حنفیہ نے نماز عشار کو نصف لیل تک مباح قرار دیا ہے اور دوسرے نصف میں مکروہ کہتے ہیں۔ اور وہ مکروہ جو مقابل مباح ہو مکروہ تحریمی ہے۔ ـــــ اور شافعیہ کے نزدیک تو نصف لیل کے بعد نماز عشا، (بطور ادا) جائز ہی نہیں، بنابریں قیام لیل کے لیے اور حصول ذوق و جمعیت کے واسطے تاخیر نماز عشار کرنا بہت ہی نازیبا بات ہے ـــــ اس غرض (تہجد) کے حاصل کرنے کے لیے تو وتر کی تاخیر ہی کافی ہے۔ اور تاخیر وتر مستحب بھی ہے ـــــ وتر بھی (نصف لیل کے بعد) اچھے وقت ادا ہوتا ہے۔ اور قیام لیل نیز بیداری وقت سحر بھی میسر ہو جاتی ہے ـــــ الحاصل یہ عمل (تاخیر عشار)

ترک کرنا چاہیے ...... یہ بھی معتبر لوگوں نے نقل کیا ہو کہ آپ کے بعض خلفاء کے مُریدان کو سجدۂ تعظیمی کرتے ہیں، فقط زمین بوسی پر ہی اکتفا نہیں کرتے ـــــ اس فعل کی خرابی اظہر من الشمس ہو۔ اُن کو سختی سے منع کیجئے۔ اس قسم کے افعال سے ہر ایک کو اجتناب کرنا چاہیے، علی الخصوص وہ شخص جو مخلوق کا مقتدیٰ بنے اس کو تو اس قسم کے افعال سے پرہیز کرنا بہت ہی ضروری ہو ـــــ ورنہ اس کے پیرو اس کے اعمال کی اقتداء کریں گے۔ اور وبال میں گرفتار ہوں گے ـــــ نیز طبقۂ صوفیا کے علوم "علوم احوال" ہیں اور احوال' اعمال کی میراث ہیں، اُس شخص کو "علوم احوال کی میراث ملتی ہو جو اعمال کو درست کرے، اور اعمال کی تصحیح اس وقت میسر ہوتی ہو کہ اعمال کو پہچانے اور ہر عمل کی کیفیت جانے ـــــ اس کا تعلق علم احکام شرعی سے ہو، نماز، روزہ اور تمام فرائض کا علم نیز معاملات نکاح وطلاق اور بیع وشراء کا علم اور ہر اس بات کا علم جس کو حق سبحانہٗ تعالیٰ نے واجب کیا ہو اور اس کے کرنے کی دعوت دی ہو (ضروری ہے) ـــــ اور یہ علوم اکتسابی ہیں ان کے سیکھے بغیر چارہ نہیں ہو۔ اور علم دو مجاہدوں کے درمیان ہو، ایک مجاہدہ' علم کی طلب میں اس کے حاصل ہونے سے پہلے، دوسرا مجاہدہ' علم کا (صحیح) استعمال اس کے حاصل ہونے کے بعد ـــــ پس ضروری ہو کہ جس طرح جناب کی مجلسِ مبارک میں کتبِ تصوف کا مذاکرہ ہوتا ہو کتبِ فقہ بھی مذاکرہ میں آئیں۔ کتبِ فقہ فارسی زبان میں بھی بہت سی ہیں ـــــ مثلاً مجموعۂ خانی ـــــ عمدۃ الاسلام ـــــ اور کنز فارسی ـــــ بلکہ اگر کتبِ تصوف کا مذاکرہ نہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ تصوف کا تعلق احوال سے ہو، قال سے نہیں اور کتبِ فقہ کا مذاکرہ نہ کرنا احتمالِ ضرر رکھتا ہو ـــــ زیادہ کیا طول دوں ـــــ القلیل یدل علی الکثیر (اس تھوڑے سے میں بہت کچھ ہو) ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ـــ ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

رزقنا اللہ سبحانہٗ وایاکم اتباع حبیبہ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات۔

مکتوب (۳۲) ـــــ مرزا حسام[۵۱] الدین احمد دہلویؒ کے نام ـــــ

التفات نامۂ گرامی صادر ہوا ـــــ اللہ کا شکر ہو کہ ہم دور افتادہ فراموش نہیں ہوئے۔

---

[۵۱] مرزا حسام الدین بن قاضی نظام الدین حنفی بدخشی ثم دہلوی ـــــ آپ ۹۹۰ھ میں ہندوستان میں پیدا ہوئے اور (باقی صفحہ ۱۴ پر)

اور کسی نہ کسی بہانے ہمارا ذکر آجاتا ہو۔ ع۔ بارے بہ ہیچ خاطرِ خود شاد می کنم

آپ نے پیرِ دستگیر (حضرت خواجہ باقی باللہؒ) کی نسبتِ خاصہ کی عدمِ واقفیت کے بارے میں لکھا تھا اور اس کا سبب دریافت کیا تھا ـــ مخدوما! اس قسم کی باتیں بطریقِ تحریر بلکہ تقریر میں بھی مناسب نہیں ہیں معلوم نہیں کسی کی سمجھ میں کیا آئے اور اس سے کیا نتیجہ نکالے۔ اس کے لیے حضور، بشرطِ حُسنِ ظن اور طولِ صحبت درکار ہو، جس طور پہ ہو ـــ مگر اس وجہ سے کہ کسی سوال کا جواب بھی کچھ نہ کچھ چاہیے اس قدر لکھتا ہوں کہ ہر مقام کے "علوم و معارف" جداگانہ ہیں اور "احوال و مواجید" علیحدہ ہیں ـــ کسی مقام میں ذکر و توجہ مناسب ہو کسی مقام میں تلاوت و نماز۔ کوئی مقام مخصوص بہ جذبہ ہو اور کوئی مخصوص بہ سلوک، کوئی مقام ایسا ہو کہ ان ہر دو دولتوں (جذبہ و سلوک) سے مرکب ہے ـــ ایک مقام وہ بھی ہو کہ جذبہ و سلوک سے جدا ہو، نہ جذبہ کو اس سے تعلق نہ سلوک کو ـــ یہ مقام بہت ہی نادر ہو ـــ

اصحابِ آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام کے ساتھ ممتاز اور اس دولتِ عظمیٰ سے مشرف ہیں اس مقام کے حضرات کو امتیازِ تام حاصل ہوتا ہو، ارباب مقاماتِ دیگر سے کمتر مشابہت رکھتے ہیں۔ بخلاف اصحابِ مقاماتِ دیگر کے کہ وہ بایکدگر مشابہت رکھتے ہیں اگرچہ کسی حیثیت سے ہو... مشائخِ سلاسل

یہیں تعلیم حاصل کی ـــ ابوالفضل کی ہمشیرہ آپ کو منسوب ہوئی تھیں ـــ ان کو ان کے والد کے انتقال کے بعد منصب و جاگیر پہونچے تھے ـــ اکبر بادشاہ نے ان کو اپنے لشکر میں عبدالرحیم خانخاناں کے زیرِ قیادت داخل کرلیا تھا، خانخاناں ان کے والد قاضی نظام الدینؒ کے شاگرد تھے ـــ انھوں نے کچھ دنوں لشکر کی خدمت بکراہت انجام دی، آخر کار بلطائف الحیل اس خدمت سے مستعفی ہوئے اور دہلی آگئے، یہاں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے دربارِ فیض آثار میں رہ کر فیوض حاصل کیے اور خلیفۂ مجاز ہوئے اور پیر و مرشد کی وفات تک برابر ان کی خدمت کرتے رہے۔ قرآن مجید کو ایک ماہ میں پندرہ مرتبہ ختم کر لیتے تھے ـــ غلبۂ ترک و تجرید کی بنا پر تمام عمر مسندِ ارشاد و مشیخت پر نہ بیٹھے۔ اپنے مرشد کی حیات میں ان کی خدمت اور بعد وفاتِ مرشد اُن کے صاحبزادگان کی تربیت کی ـــ ۱۰۴۳ھ میں آگرہ میں انتقال کیا اور دہلی میں اپنے پیر و مرشد کے مقبرے میں دفن ہوئے ـــ آپ خواجہ ابرار کے لقب سے مشہور تھے، آپ کے نام مکتوباتِ امامِ ربانی تقریباً پندرہ عدد ہیں ـــــ الفرقان بابتہ رمضان و شوال ۱۳۸۳ھ میں آپ پر مفصل مقالہ لکھ چکا ہوں، یہ مختصر حالات نزہۃ الخواطر سے ماخوذ ہیں ـــ

میں سے بہت کم حضرات نے اس مقام کی خبر دی ہو۔ پھر بھلا اس کے معارف کا بیان کیونکر کیا جائے۔
ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم —— اصحاب کرامؓ کو یہ نسبت "عزیز الوجود" اول قدم میں ظاہر ہوتی تھی اور درجۂ کمال کو پہونچی تھی — دوسرے کو اگر اس دولت سے (قضا و قدر) مشرف کریں اور اصحاب کرام کی نسبت کے مطابق تربیت دیں تو وہ جذبہ و سلوک کے منازل قطع کرنے اور علوم و معارف کے طے کرنے کے بعد اس دولت عظمیٰ سے سعادت یاب ہوگا۔ اس نسبتِ مخصوص کا ابتدا میں ظاہر ہونا مخصوص ہے۔ برکت صحبت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ —— البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے کسی کو اس برکت سے مشرف کردیا جائے اور اس کی صحبت بھی ابتدا میں اس نسبت علیہ کے ظہور کا سبب ہوجائے، ...... اس بیان سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ ے

ومن بعد هذا ما يدق صفاته　　وما كتمه احظى لديه واجمل

(اس کے بعد وہ باتیں ہیں جن کا بیان دقیق ہے اور جن کا پوشیدہ رکھنا زیادہ اچھا اور بہتر ہے)
اس کے بعد اگر ملاقات ہوئی اور مستمعین کی طرف سے حسن استماع کا گمان غالب ہوا تو اس مقام سے متعلق کچھ اور بیان بھی ان شاء اللہ کیا جائے گا —— وهو سبحانه الموفق ——

بعض دوستوں کے بارے میں آپ نے لکھا تھا۔ اس فقیر نے اُن کی لغزشوں کو معاف کردیا۔ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے، وہ بھی معاف فرمائے گا — لیکن دوستوں کو نصیحت کیجئے کہ حضور و غیبت میں دسپئے آزار نہ رہیں اور اپنے طور طریقے کو بدلیں —— إِنَّ اللهَ لا يُغَيِّرُ ما بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا ما بِأَنْفُسِهِمْ، وَإِذا أَرادَ اللهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلا مَرَدَّ لَهُ وَما لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ والٍ ——

ے بے شک اللہ کسی قوم کی عافیت و نعمت کو متغیر نہیں کرتا جب تک وہ متغیر نہ کریں اس کیفیت کو جو اُن کے قلب میں ہے (یعنی جب وہ اخلاق جمیلہ کو اخلاق رذیلہ سے بدل دیں گے اللہ اُن کی عافیت و نعمت کو بدل دے گا) اور جب اللہ کسی قوم پر عذاب کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں ہے —— اور اُن کے لیے سوائے خدا کے کوئی کارساز نہیں ہے ——

میاں شیخ الہداد کے بارے میں خاص طور پر لکھا تھا فقیر کے لیے (ان کو معاف کرنے میں بھی) کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن مشار الیہ کا اپنے تغیر وضع سے نادم ہونا ضروری ہے۔

اَلنَّدَمُ تَوبَۃٌ (ندامت توبہ کا دوسرا نام ہے) ان کا آپ سے سفارش طلب کرنا بھی ندامت کی فرع ہے، بہر تقدیر فقیر اپنی طرف سے معاف کرتا ہے جانب دیگر کو وہی جانیں ــــ علاوہ ازیں سرہند کو اپنا گھر تصور کریں۔ علاقہ محبت اور ہم پیرگی کی نسبت ایسی چیز نہیں ہے کہ عارضی امور سے ٹوٹ جائے۔ زیادہ کیا لکھوں ــــ والسلام ــــ مخدوم زادگان اور تمام اہل بیت دعا کے ساتھ مخصوص ہیں ــــ

مکتوب (۳۳) حاجی محمد لاہوری کے نام ــــ

[مذمت علماء سوء اور مدح علماء حق]

اہلِ علم کا دُنیا سے محبت کرنا اور اس سے رغبت رکھنا ان کے چہرۂ جمال پر بدنما داغ ہے۔ ــــ ایسے علماء سے خلائق کو اگرچہ فائدہ حاصل ہو جائے لیکن ان کا علم خود ان کے حق میں نافع نہیں ہوتا۔ ہر چند تائیدِ شریعت اور تقویتِ ملّت ان سے ہو مگر یہ تائید و تقویت اہلِ فجور اور ارباب فتور سے بھی ہو جایا کرتی ہے ــــ جیسا کہ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مردِ فاجر کے متعلق تائیدِ دین کی خبر دی ہے اور فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّینَ بِالرَّجُلِ الفَاجِر (بیشک اللہ تعالیٰ دینِ اسلام کی خدمت کسی مردِ فاجر سے بھی لے لیتا ہے) ایسے علماء سنگِ پارس کی مانند ہیں کہ تانبا اور لوہا جو بھی اس تک پہنچتا ہے سونا ہو جاتا ہے لیکن وہ خود پتھر کا پتھر ہی ہے۔ جو آگ پتھر اور بانس میں پوشیدہ ہے اس کا حال بھی یہی ہے کہ مخلوق کو تو اس آگ سے منفعت حاصل ہوتی ہے لیکن خود وہ پتھر اور بانس اپنی آتش درونی سے بے نصیب ہیں ــــ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ علم ان علماء سوء کے حق میں مضرت رساں ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ان پر حجّت قائم کر دیتا ہے۔

---

۵۱ آپ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلفاء میں سے ہیں ــــ بعد وفات خواجہ دہلویؒ بتقاضائے بشریت کچھ باہمی رنجش ہو گئی تھی جس کا ازالہ بعد میں ہو گیا۔

ان اشد الناس عذابا یوم القیمۃ عالم لم ینفعہ اللہ بعلمہ (بیشک سب سے زیادہ شدید عذاب قیامت کے دن اس عالم پر ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہیں پہونچایا) ـــــ اور (علم ایسے علماء کے حق میں) مضرت رساں کیوں نہ ہو جبکہ اس علم کو جو خدا کے نزدیک عزیز اور اشرف موجودات ہو، دنیائے دنیہ اور مال وجاہ و ریاست کا وسیلہ بنا رکھا ہو، حالانکہ یہ چیزیں نزد حق تعالیٰ ذلیل وخوار ہیں اور بدترین مخلوقات ـــــ پس عزیز خدا کو ذلیل کرنا اور خدا کے نزدیک جو چیز ذلیل ہو (دنیا) اس کو عزت دینا بے انتہا قبیح ہو۔ یہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے مقابلہ ومعارضہ کرنا ہے ـــــ تدریس وافتاء اس وقت نافع ثابت ہوتے ہیں جب کہ خالصًا لوجہ اللہ ہوں، اور شائبۂ حُبِّ وجاہ وریاست اور حصولِ مال ورفعت سے خالی ہوں ـــ اور اس خلو کی علامت دنیا ومافیہا سے بے پرواہ اور بے رغبت ہونا ہو۔ جو علماء کہ محبت دُنیا کی بلا میں مبتلا ہیں وہ علماء دنیا میں سے ہیں اور یہی علماء سوء، شرار مردم اور دُزدانِ دِین (دین کے چور) ہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو مقتدائے دین اور بہترین خلائق جانتے ہوں ـــــ یحسبون[۱] انہم علیٰ شیٔ الا انہم ہم الکاذبون استحوذ علیہم الشیطان فانساہم ذکر اللہ اولئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ہم الخاسرون ـــــ

ایک درویش نے شیطان لعین کو دیکھا کہ بیکار بیٹھا ہو اور گمراہ کرنے اور بہکانے کے کام سے فارغ ہوگیا ہو۔ اس درویش نے اس کی وجہ دریافت کی۔ شیطان نے کہا کہ اس وقت علماء سوء نے اس کام میں میری بڑی مدد کی ہو اور مجھ کو اس مہم سے بے فکر کردیا ہو۔ ـــــ سچ یہ ہو کہ اس زمانے میں ہر وہ سستی اور مداہنت، جو امور شریعت میں ہورہی ہو اور ہر وہ فتور جو ترویج ملت میں ظاہر ہورہا ہو تمام کا تمام علماء سوء کی نحوست کا اثر ہو اور اُن کی نیتوں کے

---

[۱] گمان کرتے ہیں کہ وہ کچھ مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ آگاہ رہو یقیناً وہ لوگ اپنے اس خیال میں جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان غالب آگیا ہو اس نے اللہ کی یاد کو ان کے دلوں سے فراموش کردیا ہو۔ یہ جماعت لشکر شیطان ہو۔ آگاہ رہو کہ بے شک وشبہ لشکر شیطان کے افراد خسارہ میں ہیں۔

کے فساد کا نتیجہ ہو ـــــ ہاں وہ علماء جو دنیا سے بے رغبت ہیں اور جاہ و ریاست، مال و رفعت کی محبت سے آزاد ہیں وہ علماء آخرت ہیں۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے وارث ہیں ـــــ بہترین خلائق وہی ہیں ـــــ فردائے قیامت میں ان کی سیاہی قلم کو شہداء فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ وزن کیا جائے گا اور ان کی سیاہی کا پلہ غالب رہے گا۔ نوم العلماء عبادۃٌ (علماء کی نیند عبادت ہے) ایسے ہی علماء کے حق میں متحقق ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جمال آخرت اُن کی نظر میں مستحسن ہو اور قباحتِ دُنیا ان کے مشاہدے میں آگئی ہو۔ آخرت کو انھوں نے پائدار دیکھا ہو اور دنیا کو داغِ زوال سے داغدار پایا ہے۔ بیشک انھوں نے خود کو باقی کے سپرد کر دیا اور فانی سے علیحدہ رکھا ہو۔ عظمتِ آخرت کا خیال رکھنا درحقیقت جلالِ خداوندی کا نظر میں رکھنا ہو اور دنیا و مافیہا کو ذلیل رکھنا شاہدۂ عظمتِ آخرت کے لوازم میں سے ہو ـــــ دنیا و آخرت آپس میں سوتن سوتن ہیں اگر ایک راضی ہوئی دوسری ناراض ہوگئی۔ اگر دنیا عزیز ہو تو آخرت خوار ہو اور دنیا خوار ہو تو آخرت عزیز ہو ـــــ ان دونوں کا جمع ہونا جمع اضداد کے قبیل سے ہو..... ہاں مشائخ کی ایک جماعت نے جس نے اپنی خودی اور اپنے ذاتی ارادہ سے نجات حاصل کرلی ہو، صحیح نیتوں کے ساتھ اہلِ دُنیا کی صورت بنالی ہو اور بظاہر راغبِ دنیا نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کو کوئی تعلق دنیا سے نہیں ہو ـــــ دنیا و مافیہا سے اُن کا باطن بالکل آزاد اور فارغ ہو ـــــ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ـــــ کوئی چھوٹی بڑی تجارت اُن کے حق میں ذکرِ خدا سے مانع نہیں ہوتی ـــــ وہ تجارت و بیع سے تعلق رکھتے ہوئے بھی بے تعلق ہیں۔ حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند قدس سرہ نے فرمایا ہو کہ میں نے منیٰ کے بازار میں ایک تاجر کو دیکھا کہ کم و بیش پچاس ہزار اشرفیوں کا مال اس نے خریدا اور بیچا لیکن اس کا دل ایک لحظہ کے لیے بھی حق تعالیٰ سے غافل نہیں ہوا۔

مکتوب (۳۶) حاجی محمد لاہوری کے نام ـــــ

[اس بیان میں کہ شریعت تمام سعادت دنیویہ و اخرویہ کی کفیل ہو اور طریقت درحقیقت خادمانِ شریعت ہیں۔]

.....شریعت کے تین جز ہیں (۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص ـــــ جب تک یہ تین جز متحقق نہ ہوں گے شریعت متحقق نہ ہوگی ـــــ شریعت متحقق ہوگی تو رضائے حق سبحانہٗ حاصل ہوگی ـــــ اور یہ رضائے باری

ہی تمام سعادات دنیویہ و اخرویہ سے بلند و بالا ہو ـــــ ورضوانٌ من اللہ اکبر ـــــ پس شریعت ہی تمام سعادت دارین کی ضامن ہو ـــــ اب کوئی مقصد نہ رہا کہ اس مقصد کے لیے شریعت کے علاوہ کسی امر کی احتیاج ہو ـــــ طریقت و حقیقت جن کے ساتھ صوفیاء ممتاز ہیں دونوں شریعت کے جزء سوم یعنی اخلاص کی تکمیل کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ پس ان دونوں کی تحصیل سے غرض تکمیل شریعت ہی ہے، نہ کوئی اور امر علاوہ شریعت کے ـــــ احوال و مواجید، علوم و معارف، جو صوفیاء کو اثنا راہ میں حاصل ہوتے ہیں وہ مقاصد نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت اُن خیالات کی ہے جن سے اطفال طریقت کی تربیت ہوتی ہو۔ ان سب چیزوں سے آگے بڑھ کر مقام رضا تک پہونچنا چاہیے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہو جہاں مقاماتِ جذبہ و سلوک کی انتہا ہو ـــــ اس لیے کہ منازل طریقت و حقیقت کو طے کرنے سے مقصود سوائے تحصیلِ اخلاص کے اور کچھ نہیں ـــــ اور اخلاص رضاء باری تعالیٰ کو مستلزم ہے ـــــ تجلیات و مشاہدات عارفانہ سے گزار کر دولتِ اخلاص اور مقام رضا تک ہزاروں میں سے کسی ایک کو پہونچایا جاتا ہے کوتاہ نظر لوگ احوال و مواجید کو مقاصد میں اور مشاہدات و تجلیات کو مطالب میں شمار کرتے ہیں ـــ اسی وجہ سے "زندانِ وہم و خیال" میں گرفتار اور کمالاتِ شریعت سے محروم رہتے ہیں...... ہاں یہ بات ضرور ہو کہ حصولِ مقام اخلاص اور وصول بمرتبۂ رضاء ان احوال و مواجید اور علوم و معارف کے تحقق سے وابستہ ہو ـــ لہٰذا یہ احوال و مواجید مقدماتِ مقصود ہیں (نہ کہ مقصود) ـــــ مجھے یہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں کامل دس سال کے بعد اس راہ میں چل کر واضح ہوئی ہو اور "شاہد شریعت" کما حقہ جلوہ گر ہوا ہے ـــــ ہرچند کہ میں شروع سے بھی احوال و مواجید میں گرفتار نہ تھا اور حقیقتِ شریعت کے تحقق کے علاوہ کوئی مقصد میرے پیش نظر نہ تھا، لیکن بعد عشرۂ کاملہ (پورے دس سال کے بعد) حقیقتِ امر پورے طریقے پر ظاہر ہوئی ـــــ الحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ مبارکاً علیہ ـــــ الخ

مکتوب (۳۷) شیخ محمد خیری کے نام ـــــ

[اتباعِ سنت نبویہ کی ترغیب میں]

تم نے جو مکتوب بھیجا تھا اُس کے مطالعہ سے مسرور ہوا ـــ طریقۂ نقشبندیہ پر اپنی استقامت تم نے لکھی تھی ـــــ الحمد للہ علیٰ ذٰلک ـــــ حضرت حق سبحانہٗ اس طریقہ کے اکابر کی برکت سے

زیادت بے نہایت عنایت فرمائے ——— یہ (نقد کبریت احمر ہو اور متابعت سنت پر مبنی ہو ——

یہ فقیر اپنے متعلق لکھتا ہو کہ مدتوں علوم و معارف آب نیساں کی طرح مجھ پر برسے ہیں، اور جو کام ہونا چاہیے تھا عنایت خداوندی سے انجام پایا (لیکن) اب سوائے ایک آرزو کے کوئی آرزو باقی نہیں رہی اور وہ یہ ہو کہ سنن مصطفویہؐ میں سے کسی سنت کو زندہ کیا جائے.....

مکتوب (۳۹) شیخ محمد خیری کے نام ———

[اس بیان میں کہ مدار کار قلب پر ہو محض اعمال صوری ہی سے کام نہیں چلتا]

...... مدار کار قلب پر ہو اگر دل غیر خدا میں گرفتار ہو خراب و ابتر ہو ۔ محض اعمال صوری اور عبادات رسمی سے کام نہیں چلتا ——— التفات ما سوائے سلامتی قلب ——— اور اعمال صالحہ ——— جو بدن سے تعلق رکھتے ہیں اور شریعت نے جن کے کرنے کا حکم فرمایا ہو یہ دونوں چیزیں درکار ہیں ۔ (مگر) بغیر اعمال صالحہ بدنیہ کے سلامتی قلب کا دعویٰ بھی محض باطل ہے ۔ اس دنیا میں جس طرح بے بدن کے روح غیر مقصود ہو اسی طرح احوال قلبی، بغیر اعمال صالحہ بدنی کے محال ہیں ——— بہت سے ملحدانِ زمانہ اس قسم کا (یعنی احوال قلبی بغیر اعمال صالحہ کا) دعویٰ کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کے برے معتقدات سے ہمیں بچائے ——— اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ———

مکتوب (۴۱) شیخ ... درویش کے نام ———

[ترغیب متابعت سنت مصطفویہؐ میں]

حق سبحانہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو سنت مصطفویہؐ کی متابعت سے مزین فرمائے بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات ———

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، محبوب رب العٰلمین ہیں ——— ہر چیز جو خوب و مرغوب ہو وہ محبوب و مطلوب کو دی جاتی ہے ——— بنابریں حق سبحانہ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں ۔ انک لعلیٰ خلق عظیم ——— (اے رسول آپ بلند اخلاق پر فائز ہیں) نیز فرمایا ہو انک لمن المرسلین علیٰ صراط مستقیم ——— (بیشک آپ مرسلین میں سے ہیں سیدھے راستے پر) ایک جگہ فرمایا ۔ ان ھٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل

(باقی صفحہ پر)

قسط دوم

حدیثِ پرویز

از ——————— عتیق الرحمٰن سنبھلی

بخاری کی اس روایت پر گفتگو کرنے کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں:۔

"اب آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (جانشینیٔ رسول) کا معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اسکے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی، تاکہ امت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا......... اس لیے امت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس اجتماع کی جو روداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابل غور ہے"

یہ تمہید ڈال کر پرویز صاحب نے سقیفۂ بنی ساعدہ کی روداد بیان کی ہے۔ اور اس سے حسب ذیل دو الزامات (جن کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں) "تاریخ" پر عائد کئے ہیں:۔

۱۔ یہ "ہماری تاریخ" بتاتی ہے کہ خلافت کا فیصلہ جو قرآن کے حکم کے مطابق باہمی مشاورت کے ذریعہ ہونا چاہیے تھا، حضورؐ کے صحابہ نے استبداد سے کام لے کر اور حسب و نسب کو درمیان میں لا کر یہ فیصلہ کیا ——— ۲۔ اور اس سلسلہ میں نزاع کا وہ قولی اور عملی انداز اختیار کیا گیا، جو "رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ" کے بھی خلاف تھا اور صحابۂ کرام

کی بلند کرداری سے بھی فروتر !

پرویز صاحب کے اس خلطِ مبحث کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ان کے سامنے مسئلہ تو حدیثی روایات پر اعتماد و عدمِ اعتماد کا ہے۔ لیکن وہ بحث میں لاتے ہیں! تاریخی روایات کو بھی۔ اور اس بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں ان سب کو لیجا کر چسپاں کر دیتے ہیں حدیث پر ——
اب ہم تھوڑی سی وضاحت اپنے اس اشارہ کی کر دینا چاہتے ہیں۔

سقیفۂ بنی ساعدہ کے اجتماع کی روداد سے متعلق تمام روایات، پرویز صاحب نے تاریخِ طبری یا محمد حسین ہیکل (مصری) کی کتاب ابوبکر صدیق سے نقل کی ہیں (جو ہیکل نے طبری وغیرہ مورخین ہی کی کتابوں سے لی ہیں) اور اسکے بعد (کافی بعد کے بعض واقعات کے متعلق بعض حدیثی روایات درمیان میں لاکر) بے تکلف ارشاد فرما دیا ہے کہ

> " اس مقام پر آپکے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جب تاریخ کی یہ کیفیت ہے اسے مسترد کیوں نہ کر دیا جائے؟ ایسا کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ہے' ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہو کہ یہ خدا کی طرف سے رسول اللہ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں اسلئے یہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں (مثلہٗ معہٗ) (طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۵۹ء ص۲۰)

کوئی حد ہے اس خلطِ مبحث کی! بلکہ یہ ڈبل خلطِ مبحث ہے، ایک تو یہ کہ حدیثی روایات کے ساتھ خالص تاریخی روایات پر بھی " احادیث " کا اطلاق کیا جا رہا ہے —— اور اس طرح، تاریخ کے سر جو الزامات آتے ہیں، الفاظ کے کھیل سے انھیں حدیث کے سر منڈھا جا رہا ہے —— دوم یہ کہ " مثلہٗ معہٗ " کا اطلاق صرف اقوال و افعالِ نبویؐ پر کیا جاتا ہے، نہ کہ حدیث کی کتابوں میں ان اقوال و افعال کے ساتھ ساتھ جو دوسری چیزیں آجاتی ہیں ان پر بھی۔ لیکن پرویز صاحب نے صرف ایک ارشاد نبوی کو ضمناً ذکر میں لاکر اس پورے تاریخی سلسلۂ روایات کو جو کتبِ حدیث ہی کی نہیں بلکہ کتب تاریخ کی بھی (اور زیادہ تر انہی کی) روایات پر مشتمل ہے، حدیث کے ماننے والوں کے نزدیک بے تکلف " مثلہٗ معہٗ "

کا مصداق ٹھیرادیا ہے۔ اور اس طرح یہ گمراہ کن اور بے حد تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ لوگ عہد رسالت سے متعلق خالص تاریخی روایات تک کو "مثلہٗ معہٗ" کے زمرہ میں شامل کرتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی روایات تو الگ رہیں، حدیثی روایات میں بھی جو چیزیں اقوال و افعال نبوی کے ماسوا ہوتی ہیں انکی اہمیت کا بھی وہ درجہ کسی کے نزدیک نہیں ہوتا جو اقوال و افعالِ نبوی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی ہے جو "مثلہٗ معہٗ" کا مصداق ہے۔

بہرحال ہم اس دوسرے غلطِ مبحث سے فی الوقت صرف نظر کرتے ہوئے صرف پہلے غلطِ مبحث کے متعلق پرویز صاحب سے پوچھتے ہیں کہ آخر یہ کیا اندھیر ہے کہ وحشت تو ہو آپ کو طبری اور محمد حسین ہیکل کی تالیفات سے اور رد کرنے لگیں آپ بخاری اور مسلم کو؟ گمراہ کن ٹھیریں کتب تاریخ کی روایات لیکن آپ لوگوں کو یہ پڑھائیں کہ حدیث بھی چونکہ تاریخ ہی ہے اس لیے اسکی روایات کو بھی تاریخی روایات کے ساتھ باندھ کر دریا برد کر دو؟ —— یہ آخر کونسی منطق ہے؟ قصور جس کا ہو سزا اسی کو ملنی چاہیئے۔ نہ یہ کہ قصور ہم زید کا ثابت کریں اور پھانسی کسی اور کو زید نام رکھ کر دلادیں!——
سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خلافت کا فیصلہ استبداد سے کام لے کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی قرابت کی دھونس دیکر کیا گیا، نیز یہ کہ وہاں صحابہ کرام اس طرح "دست بگریباں" نظر آئے جو ان کی شانِ "رحماء بینھم" اور انکی سیرت عالیہ سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا، آپنے تمامتر روایات طبری اور محمد حسین ہیکل کی کتابوں سے لی ہیں۔ ان روایات کی بنیاد پر آپ کو کس طرح حق پہنچتا ہے کہ اس "تاریخ" کے اعتماد کو مجروح کریں جو "دین بن گئی ہو"؟ ان روایات سے خطا ہوئی ہے تو ان کے ماخذ کے عدم اعتماد کا فتویٰ صادر کر دیجئے۔ لیکن اگر حدیث کے اعتماد کو مجروح کرنا ہے تو یہ روایات بجائے تاریخ کے کسی صحیح احادیث کے مجموعہ سے لاکر دکھایئے!

بخاری پر آپ کی خاص طور سے نظر کرم ہے، کیونکہ حدیث والوں کو اسی پر سب سے زیادہ اعتماد ہے۔ اور وہی حدیث کا سب سے زیادہ مضبوط مورچہ ہے۔ اسی لیے آپنے اس مضمون میں بھی حدیث کے نام سے جہاں کہیں موقع ملا ہے، بخاری ہی پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری میں سقیفہ کی تقریروں کا متن آپ کی پیش کردہ رپورٹ کے مقابلہ میں اس طرح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ :۔

فلما جلسنا قليلاً تشهد خطيبهم	ہم سقیفۂ بنی ساعدہ میں جا کر تھوڑی
فاثنى على الله بما هو اهله	ہی دیر بیٹھے تھے کہ انصار کا خطیب
ثم قال امّا بعد فنحن	کھڑا ہوا اور خطبہ مسنونہ کے بعد اُس
انصار الله وكتيبة الاسلام	نے کہا ۔" ہم اللہ کے انصار اور
وانتم معاشر المهاجرين	اسلام کا لشکر ہیں، اور تم تو اے مہاجرین
رهطٌ وقد دفّت دافةٌ	ایک تھوڑی سی تعداد ہو۔ اور ایک
من قومكم.	پریشان حال جماعت ہو جو اپنی قوم
	سے نکل کر ہم میں آگئی ہے [1]

اسکے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب انصار کا خطیب خاموش ہوا تو میں نے چاہا کہ کچھ بولوں، مگر ابوبکرؓ نے مجھے روک دیا اور خود کھڑے ہو کر فرمایا:۔

ما ذكرتم فيكم من خير	تم نے جو کچھ اپنے بارے میں کہا ہے،
فانتم له اهل ولن يُعرف	(اے انصار) یہ بالکل درست ہو۔ لیکن اسکو
هذا الامر الّا لهذا الحيّ	کیا کیا جائے کہ اہل عرب اس قبیلۂ قریش
من قريش هم اوسطُ العرب	کے سوا کسی کی سرداری کو جانتے ہی نہیں یہ
نسباً وداراً وقد رضيتُ	باعتبار نسب اور گھرانے (یا مقام) کے عرب
لكم احد هذين الرجلين	میں سب سے فائق ہیں اور اسی لئے سب ان
فبايعوا ايّهما شئتم.	کی سرداری پر مجتمع چلے آرہے ہیں) اچھا تو میں

ان دو آدمیوں میں سے ایک کو تمھارے لئے پسند کرتا ہوں انہیں سے کسی ایک سے بیعت کر لو۔ (یعنی عمرؓ اور ابو عبیدہؓ میں سے ایک)

[1] اسکے بعد روایت میں ایک فقرہ ہے" فاذا هم يريدون ان يختزلونا من اصلنا وان يحضنونا منّا الامر" اس روایت میں تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطیب انصار ہی کا قول ہو لیکن بعض روایات میں ایسے الفاظ ہیں جو اسے حضرت عمرؓ کا فقرہ بتاتے ہیں، یعنی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ (میں نے خطیب انصار کے ان جملوں سے یہ سمجھا کہ) "یہ لوگ ہمیں اس معاملہ سے الگ کر دینا چاہتے ہیں"۔ ہمارا رجحان اسی دوسری روایت کی جانب ہو ——— واللہ اعلم بالصواب۔

بخاری ہی کی کتاب المناقب (مناقب ابی بکر) میں حضرت عائشہؓ سے بھی اس واقعہ کی ایک روایت ہے اور اس میں اسی تقریر کا اتنا ٹکڑا اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیقؓ نے فرمایا:-

"پس بات یوں رہے گی کہ ہم امیر اور تم وزیر" (فنحن الامراء وانتم الوزراء)

اس پر ایک انصاری کھڑے ہوئے (جن کا نام حباب بن منذرؓ بتایا گیا ہے) اور انھوں نے کچھ روایتی پرجوش الفاظ فرماکر فرمایا:— کہ نہیں اگر ہو تو یوں ہو کہ دو امیر ہوں

منا امیرٌ و منکم امیر	ایک امیر ہم میں سے اور ایک اے
یا معشر قریش!	قریش! تم میں سے۔

(بخاری۔ کتاب الحدود۔ باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت)

یہ ہے بخاری میں سقیفہ کی تقریروں کا رنگ! سوال یہ ہے کہ ان تقریروں میں کہاں کوئی بات "رحماءُ بینھم" کے خلاف نظر آرہی ہے؟[1] اور کہاں "صحابہ کرام کے باہمی تعلقات اور اخلاق کا وہ نقشہ" نظر آرہا ہے جس کی بنا پر ان کتابوں کو چاک کر دیا جائے؟

اچھا اب اِن تقریروں کے علاوہ باقی روئداد بھی اس اجتماع کی، بخاری سے سُن لیجئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-

فکثر اللغط وارتفعت	(حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد
الاصوات حتّٰی فرقت	نمائندہ انصار نے جو تقریر کی) اس پر
من الاختلاف فقلت	ایک شور ہونے لگا حتیٰ کہ میں ڈرا کہ
اُبسُط یدك یا ابا بکر	اختلاف بڑھ نہ جائے، پس میں نے
فبسطَ یدَہٗ فبایعتہٗ وبایعہٗ	ابوبکر سے کہا لائیے ہاتھ بڑھائیے۔
المھاجرون ثم بایعتہٗ	انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور
الانصار ونزونا علیٰ سعد	میں نے بیعت کی اور دوسرے مہاجرین نے

---

[1] پروفیسر صاحب نے اجتماع سقیفہ کی روئداد پیش کرتے ہوئے اپنے اعتراض کی اسی شق کو پہلے سامنے رکھا ہے۔ ہم بھی اُن کے اتباع میں پہلے اسی شق پر گفتگو کر رہے ہیں۔ حسب نسب اور استبداد والی شق پر گفتگو بعد میں آئے گی۔

بن عبادہ فقال قائل منھم قتلتم سعد بن عبادہ فقلت قتل اللہ سعد بن عبادہ۔

(ایضاً)

بیعت کی۔ اور پھر انصار نے بیعت کی۔ اور ہم بیعت کرنے والوں کی اس یلغار نے سعد بن عبادہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ (یعنی وہ اس ہجوم میں پس گئے[1]) اس پر ایک انصاری نے کہا تم نے تو سعد بن عبادہ کو مار ڈالا۔ میں نے کہا اللہ اس کو مارے۔

یہاں نہ ہمیں کوئی "دست وگریباں" ہوتا نظر آتا ہے اور نہ ایک دوسرے کی داڑھی نوچتا ہوا۔[2] لے دے کے حضرت عمرؓ کا ایک فقرہ ہے "قتل اللہ سعد بن عبادہ" تو اس کو باہمی تعلقات اور اخلاق کی خرابی پر کوئی بدعقل یا حضرت عمر سے قطعاً ناواقف ہی محمول کرسکتا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ دینی معاملات میں حضرت عمر کا پارہ بہت تیز تھا۔ وہ اس معاملے میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اور ہمیں کسی بدعقل کا علم نہیں ہے جو ان معاملات میں حضرت عمرؓ کی حرارت اور تیزی کو "رحماءُ بینھم" کے خلاف سمجھے۔ خلافت کا مسئلہ سراسر ایک دینی اور نہایت اہم دینی مسئلہ تھا۔ (جیسا کہ اس مسئلہ پر اس وقت اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا۔ سعد بن عبادہؓ جو انصار کے لیڈر تھے، ان کا موقف حضرت عمر کے نزدیک انتہائی غلط تھا اور جو کارروائی وہ کرنے جارہے تھے (یعنی قریش کو چھوڑ کر انصاری امارت کا قیام) وہ اُن کی (حضرت عمرؓ کی) نظر میں اسلام کے لیے نہایت نقصان دہ تھی۔ اس پر ان کا غصہ قدرتی بات تھی۔ کوئی کھاچنبھے کی اور ریں بجبیں ہونے کی بات نہیں، اگر کوئی روایت یہ بتاتی ہے کہ

---

[1] نزا علیہ کے معنی کسی پر گرنے اور روندنے کے آتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس بیان کے شروع میں آیا ہو کہ جب ہم سقیفے میں پہنچے تو سعد بن عبادہ بخار کی وجہ سے ایک کمبل میں اس طرح لپٹے ہوئے بیٹھے تھے کہ پہچانے نہیں گئے اور پوچھنا پڑا یہ کون ہیں؟ حضرت سعد کی اسی ہیئت کا نتیجہ تھا کہ جب ایکدم سے لوگ بیعت کے لیے بڑھے تو وہ اس ہجوم میں پس گئے۔

[2] پرویز صاحب نے یہ سب کچھ دکھانی کی کوشش کی ہے۔

وہی ہے جو حدیثی روایات میں ہے) ہم یہ بھی کہنے کو تیار ہیں کہ اگر کسی مستند ذریعہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ کتب حدیث کی روایات میں کچھ اختصار ہے اور فی الواقع کچھ تیزی اور سخت کلامی سقیفہ کی مجلس میں ہوئی بھی تھی، جسے تاریخ نے بہت بڑھا چڑھا کر ہم تک پہنچایا ہے، تو ہم نفس تیزی اور سخت کلامی سے بھی گھبرانے اور غصہ میں آکر ایسی کسی مستند روایت کو پٹخ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کوئی شاذ واقعہ، کسی خاص ماحول میں، کسی کے عمومی وصف کے خلاف سرزد ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ یہ انتہائی عقلی افلاس ہوگا کہ ہم صحابۂ کرام کی تاریخ کا کوئی اتفاقی واقعہ ان کے عام رنگ سے ہٹا ہوا پائیں اور ذریعہ علم پر ہم کوئی معقول جرح نہ کر سکتے ہوں تو ہم بجائے اسکی توجیہہ کے کھٹ سے اس روایت کو غلط کہدیں اور دلیل صرف یہ دیں کہ یہ صحابہ کے عام رنگ کے خلاف ہے جو قرآن سے ثابت ہو۔ قرآن ہی نے تو صحابۂ کرام کی پاکیزگیٔ نفس اور طہارت وتقویٰ کی سب سے بلند تر شہادت "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کہہ کر دی ہے۔ اس میں تمام ایمانی بلندیوں اور اخلاقی طہارتوں کا دفتر سمٹا ہوا ہے، اور ہمارا ایمان ہے کہ اُن کا عام رنگ اور عام حال یہی تھا، لیکن قرآن ہی ہمیں بتاتا ہے کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ رسولِ پاکؐ کے کئی ایک اصحاب قابل گرفت حد تک اور ان گنے چنوں کے علاوہ بھی بہت سے نفر قابل گرفت حد تک تو نہیں لیکن قابل سرزنش حد تک اِن رفقتوں سے پھسل گئے۔ اٹھایئے قرآن اور پڑھئے سورۂ نور (اٹھارواں پارہ) ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ	جن لوگوں نے یہ طوفان تہمت برپا کیا ہے وہ تم ہی میں کا ایک گروہ ہے ....
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔	ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنے کیے کی جزا ہے، اور ان میں سے جس نے اس تہمت میں سب سے بڑا حصّہ لیا ہے اس کے لیے زبردست عذاب ہے۔

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔

جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان بیبیوں نے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا۔ اور یوں کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔

پھر ایک آیت کے بعد فرمایا جاتا ہے:۔

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ، سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(النور۔ پ ۱۸ ع ۲)

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور کرم نہ ہوتا دنیا میں اور آخرت میں تو جس شغل میں تم پڑے ہو اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا، جبکہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکال رہے تھے جس کا تمہیں مطلق صحیح علم نہ تھا۔ اور تم اس کو معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی ــــ اور تم نے اس کو سنا تھا تو کہا ہوتا کہ ہم کیونکر ایسی بات منہ سے نکالیں۔ توبہ توبہ یہ تو بڑا زبردست بہتان ہے۔ اللہ تم کو نصیحت فرماتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو پھر دوبارہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنا!

یہ اتفاقی بات ہے کہ مثال میں قرآن کا ایک ایسا ٹکڑا آ گیا ہے جس کے اشارے (اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ) کو سمجھنے کے لیے ہم اسی " تاریخ " کا منہ دیکھنے پر مجبور ہیں، جس کو پرویز صاحب " عجمی سازش " کا نام دے کر اوّل سے آخر تک مجروح کر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اگر پرویز صاحب

کا کہاں امکان کہ ہم اس " تاریخ " کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں تو کوئی بتائے کہ کس سے ہم اس واقعہ کو دریافت کرنے جائیں گے جس کی طرف قرآن نے " جَآءُ وا بالا فکِ " کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے؟ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو ایک معقول آدمی کو تاریخ کا ممنون ہونے اور محدثین کی مساعی کا شکرگزار ہونے پر مجبور کرتی ہیں جنھوں نے ہماری اس ضرورت کو پورا کیا اور ان امور میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جن سے ہمیں اطمینان حاصل ہو سکتا کہ ان کی پہنچائی ہوئی روایات میں صحت ہے یا نہیں ؟

بہرحال یہ تو ایک درمیانی بات ہے، اصل بات جو ان آیات کو سامنے لاکر کہنا تھی یہ ہے کہ دیکھئے یہ " تاریخ " نہیں قرآن بتا رہا ہے کہ حضورؐ کا سایہ بھی ابھی قرن اوّل کے مسلم معاشرہ پر قائم تھا کہ وہ حضرات جنھیں قرآن " رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ " کا سرٹیفکیٹ دیکر انکے تزکیۂ طہارت کی عظیم ترین شہادت دے رہا ہے، اُن میں سے ایک تعداد کسی نہ کسی طور پر زنا کی یا ایک ایسی تہمت میں ملوث ہوگئی جس پر جلال و عتاب الٰہی کا وہ رنگ ہے کہ ایک مومن ان آیات سے گزرتا ہے تو پسینہ چھوٹ جاتا ہے، دیکھئے، پھر دیکھئے! فرمایا جا رہا ہے:۔

" اگر تم پر اللہ کا خاص فضل و کرم دنیا اور آخرت میں نہ ہوتا تو یہ جو کام تم نے کیا تھا یقیناً اس پر اللہ کا زبردست عذاب تم کو آ لیتا "

اور فرمایا جاتا ہے:۔

" تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ یہ اللہ کی نظر میں بہت ہی بڑی بات تھی "

اور آگے چلئے، عتاب و سرزنش کا یہ سلسلہ ان الفاظ پر جا کر رُکتا ہے:۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔	اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو خبردار ! جو آئندہ کبھی ایسے کام میں پڑے !

یہ واقعہ کیا تھا؟ کس پر تہمت ناگفتہ بہ رکھی گئی تھی؟ اس سب کو چھوڑ دیجئے کہ یہ قرآن[۱] میں مذکور

---

[۱] یہ بات ہم پرویز صاحب کی رعایت سے کہہ رہے ہیں، لیکن ہمارے بہت سے (باقی اگلے صفحہ پر)

ہوئیں ہے، لیکن یہ جتنا کچھ مذکور ہے، کیا یہ بتانے کے لیے کچھ کم ہے کہ کوئی بہت بڑی دینی اور اخلاقی لغزش صحابہ کرام سے ہوئی تھی، کہ بس اللہ کا خصوصی فضل وکرم ہی حائل ہوگیا ورنہ نہ معلوم کیا ہونا تھا! ـــــ تو کیا ہم قرآن کی ان آیات سے انکار کردیں؟ اور کہدیں کہ یہ صحابہ کرام کو بدنام کرنے کے لیے کسی "عجمی" نے الحاق کردیا ہے؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! ـــــ سیدھی بات ہو کہ صحابہ کرام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) ناظرین کے لیے قرآن کا یہ اقتباس چیستاں بن کر رہ جائے گا، اگر ہم واقعہ کا ذکر نہ کریں۔ واقعہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم سفر تھیں غزوہ سے واپسی ہوئی اور مدینہ کے کچھ دور ایک مقام پر رات گزارنے کے لیے لشکر نے قیام کیا۔ حضرت عائشہؓ اتر کر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں۔ واپس آئیں تو دیکھا کہ گلے کا ہار کہیں گر گیا ہے۔ پلٹ کر اس کی تلاش میں چلی گئیں۔ یہاں اتنے میں کوس رحلت بج گیا، اور جو لوگ حضرت عائشہؓ کا محمل اٹھا کر سواری پر رکھتے تھے انھوں نے رکھدیا، چونکہ ہلکی پھلکی تھیں اس لیے اٹھانے والوں نے یہ نہ محسوس کیا کہ وہ محمل میں نہیں ہیں۔ قافلہ کوچ کر گیا۔ اب جو وہ منزل پر واپس آئیں تو قافلہ (لشکر) کا کہیں پتہ نشان نہ تھا۔ حیران و پریشان ہو کر بیٹھ رہیں، زیادہ دیر ہوئی تو اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ ایک صحابی صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ جو اس منزل ہی پر سوتے رہ گئے تھے یا اس غرض سے چھوڑ دیے گئے تھے کہ سپیدۂ سحر طلوع ہونے پر چلیں۔ اور راستہ میں لشکر کی کوئی چیز گر گئی ہو تو اٹھاتے ہوئے لائیں وہ جب اپنی جگہ سے روانہ ہوئے تو دیکھا کوئی لیٹا سا ہے۔ ذرا قریب پہنچے دیکھا کہ حضرت عائشہ ہیں (پردہ سے پہلے دیکھے ہوئے تھے اس لیے پہچانتے تھے) یہ دیکھ کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ حضرت عائشہ ان کی آواز سے چونک اٹھیں، کپڑے سمیٹے اور چادر لپیٹی۔ حضرت صفوان نے اپنا اونٹ بٹھا دیا اور انھیں سوار کرکے خود پیدل چلے حتیٰ کہ دوپہر میں جہاں لشکر آرام کے لیے ٹھیر گیا تھا لشکر سے جا ملے۔ لوگوں نے ان کو اور ایک عورت کو اس طرح آتے ہوئے دیکھا۔ پتہ چلا کہ حضرت عائشہ ہیں۔ سرگروہ منافقین عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ اسکی طینت بد کو ایک شوشہ ہاتھ آگیا اور اس نے چھوڑ دیا کہ (معاذ اللہ) یہ دونوں ایک دوسرے سے بچے ہوئے ہرگز نہیں ہوسکتے۔ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ، حضرت مسطح بن اثاثہؓ (مہاجر بدری) اور حمنہ بنت جحشؓ (صحابیہ) کے متعلق روایات میں نام زد طور پر آتا ہے کہ یہ اس شوشہ سے متاثر ہوگیے اور وہی کہنے لگے جو رأس المنافقین نے کہا تھا۔ قافلہ مدینہ آگیا، اور اس ہوائی نے مہینہ بھر تک مدینہ میں خوب (باقی اگلے صفحہ پر)

انھوں نے سعد بن عبادہ کے متعلق یہ فقرہ کہا!

اگر تاریخ کے بعض اوراق کو غلط سمجھ کر آپ نے اسلام کی پوری تاریخ سے دستبردار ہونے اور ماضی کے تمام نقوش سے آنکھیں بند کر لینے کا فیصلہ نہیں کر لیا ہے۔ تو یہ دیکھئے حضرت عمر اپنے دورِ خلافت میں فلاں صحابی کو درّہ لگا رہے ہیں، فلاں کو ڈانٹ رہے ہیں، فلاں مسلمان پر حد جاری کر رہے ہیں اور فلاں سے قصاص لے رہے ہیں۔ کیا آپ کہنے کو تیار ہیں کہ یہ سب "رحماءُ بینھم" کے خلاف تھا؟ ——— اور جانے دیجئے تاریخ کے بیانات کو، قرآن کی اس قسم کی آیات کو کیا کیجئے گا کہ جن کا وصف "رحماءُ بینھم" بتایا جا رہا ہو، انہی سے کہا جا رہا ہے کہ لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ (النور - ع ۱) "اللہ کے دین کے معاملہ میں ان دونوں کے ساتھ تمھیں آپس کی نرم دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے"۔ یہ حدِّ زنا کا معاملہ ہے۔ کیا زنا کے بعد آدمی مسلمان نہیں رہتا۔ یا عہدِ رسالت کے کسی مسلمان سے یہ جرم ہو جاتا (اور ہمارے نزدیک یہ ہوا بھی ہے) تو کیا وہ "رحماءُ بینھم" کے زمرہ سے خارج ہو جاتا؟ ——— پھر یہ عقل کی دشمنی نہیں ہوگی تو کیا ہوگا کہ حضرت عمر کے اس فقرے کو کوئی "رحماء بینھم" کے خلاف بتانے لگے؟

دراصل ہم ابتک تو اس بنیاد پر گفتگو کر رہے ہیں کہ احادیث کی روایاتِ صحیحہ میں اس واقعہ کی تقریروں اور گفتگوؤں کی روداد کیا ہے اور کیا نہیں ہے اور ہم خود اس کے قائل ہیں کہ اس واقعہ کی جو تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں ہیں وہ پوری طرح صحیح نہیں ہیں (اور نہ ہونا کچھ تعجب بھی نہیں جب کہ تاریخ کی (نہ کہ حدیث کی) روایات میں چھان پھٹک کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ طبری نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "چونکہ تاریخ کا معاملہ" اخبار مخبرین اور نقل ناقلین" پر منحصر ہے۔ "استخراج بالعقول اور استنباط بالفکر" کو اس میں دخل نہیں ہے اس لئے میری اس کتاب میں ایسی جو روایت کسی کی نظر پڑے جو اسے غلط اور مہمل معلوم ہو تو اُسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ ہماری طرف سے نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلے لوگوں سے ہم تک پہنچی ہے اور جیسی ہم کو پہنچی تھی ویسی ہی ہم نے دوسروں کو پہنچا دی ہے" (ص ۵) لیکن یہ سمجھنے کے باوجود (کہ تاریخ کی یہ تمام تفصیلات صحیح نہیں ہیں قابل اعتماد صرف

کا عام رنگ اور عام حال بیشک وہی تھا جس پر انہیں "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کا طغرائے امتیاز عطا ہوا۔ لیکن بشری فطرت کی کمزوریاں (جن سے سوائے رسول کے کوئی بشر معصوم نہیں) اور منافقین کی ریشہ دوانیاں مل جل کر بعض دفعہ ایسا اثر پیدا کر دیتی تھیں کہ گاہے ان میں سے بعض کا وہ عام رنگ ہلکا پڑ جاتا تھا۔ چنانچہ یہی صورت اس واقعہ اِفک میں بھی بنی، کہ منافقین نے ایک شوشہ چھوڑا اور بعض صحابہ اس کے تأثر میں بہہ گئے، اور کیسے کیسے صحابہ؟ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ جن کا امتیازی وصف ہی حرمت و ناموسِ نبوی کا دفاع تھا۔ شعراء مکہ آنحضرت کی ہجو کرتے اور رکیک حملے کرتے تھے، تو حسان بن ثابت مدینہ میں بیٹھ کر اس کا جواب دیتے۔ حضور ان کی اشعار خوانی کے لیے مسجد نبوی میں منبر رکھواتے اور "فداک ابی و اُمّی" تک کا انعام انھیں عطا فرماتے ـــــ حضرت مسطح بن اثاثہؓ جو مہاجر بھی تھے اور بدری (شریک جنگ بدر) بھی۔ اور یہ آخری وصف وہ وصف ہے جس پر درگاہِ رب العزت سے "قد غفرت لکم" کا خصوصی مژدہ سنایا گیا ہو۔

پس اگر یہ ہو سکتا تھا کہ منافقین کی ریشہ دوانیوں کے زیر اثر صحابہ کرام سے اتنی زبردست لغزش ہو جائے کہ جن ازواج مطہرات کے متعلق فرمایا گیا تھا "یہ مسلمانوں کی مائیں ہیں ـــ" (وازواجہ امھاتھم) انھیں پر "اِفک" میں وہ شریک ہو جائیں یا اس تہمت ناگفتہ بہ کو سن کر ہضم کر لیں۔ اور یہ بھی اسی حالت میں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ابھی سروں پر قائم ہے، جو بجائے خود تزکیہ کا ایک بڑا سامان اور اعلیٰ ایمانی کیفیات کا ضامن ہے، تو اس

(بقیہ حاشیہ صـــ) گشت کیا، حضورؐ اور حضرت عائشہ کی آزردگی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ چرچے برابر بڑھتے جا رہے تھے اور کتنے ہی سچے مسلمان بھی اس میں مبتلا ہو رہے تھے کہ حضرت عائشہ کی برارت میں یہ آیات نازل ہوئیں جن میں ظاہر کیا گیا کہ یہ سراسر تہمت ہو۔ جس کے پھیلانے کی ذمہ دار تمھیں میں کی ایک جماعت ہے اور پھر اس جماعت میں سے منافق عبداللہ بن اُبی جو اس تہمت کا بانی مبانی اور سب سے زیادہ حصہ دار تھا اسکو "والذی تولیٰ کبرہ لہ عذاب عظیم" کہہ کر الگ کر دیا گیا۔ اور جو مومنین تہمت پھیلانے میں تو شریک تھے مگر اس کو سنتے اور انکار نہ کرتے تھے یا اس طرح کے تذکروں میں کسی نہ کسی طور پر خود بھی حصہ لیتے تھے ان کو سخت سرزنش فرمائی گئی۔

کے مقابلہ میں یہ کیا بڑی بات ہے کہ حضور کا سایۂ مبارک بھی سر سے اٹھ چکا ہے، بلکہ ایسا وقت ہے کہ ہوش و حواس بھی پوری طرح قائم نہوں گے ــــ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے قوی القلب صحابی کے متعلق آتا ہے کہ ان کا عجیب حال وفات نبوی کی خبر سن کر ہو گیا تھا ــــ تو یہ کیا بڑی بات ہے کہ ایسے وقت میں منافقین کا گروہ صحابہ کے اس گروہ کو جس میں منافقین کا یہ گروہ ملا جلا رہتا تھا (یعنی انصار) کوئی ایسی بات سمجھانے میں کامیاب ہو گیا ہو جس کے نتیجہ میں سقیفے کے اس اجتماع میں، ان کے رویّہ میں کچھ تیزی اور سختی پیدا ہو گئی ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لیے وہ "رحماءُ بینھم" کی شان بھول گئے ہوں؟ اگر منافقین کی ریشہ دوانیاں کچھ وقت کے لیے "ازواجہ امّھاتھم" کا نص بھلا سکتی ہیں تو "رحماءُ بینھم" سے غفلت تو اس کے مقابلہ میں بہت ہی ہلکی بات ہے!

اگر آپ غور کریں گے، اور قرآن کی شہادت آپ کے نزدیک کوئی چیز ہے تو آپ خود بالیقین اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع ہی دراصل منافقین کی اندرونی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا[1] ــــ منافقین کے متعلق "تاریخ" نہیں خود قرآن بتاتا ہے کہ یہ مہاجرین کی جڑ کاٹنے اور مدینہ سے انھیں بیدخل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ کھولئے سورۂ المنافقون" (اٹھائیسواں پارہ)

ارشاد ہوتا ہے:-

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا۔	یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان لوگوں پر جو رسول کے پاس (جمع ہو گئے) ہیں تاکہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:-

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ	یہ کہتے ہیں کہ اب جو ہم لوٹ کر مدینہ پہنچیں گے تو "عزت والے" (یعنی ہم) ان ذلیلوں

---

[1] ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس حقیقت کا اشارہ ہمیں مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی فاضلانہ تصنیف "صدیق اکبر" سے ملا تھا۔ ہم نے جب غور و فکر کیا تو حسب ذیل قرآن سے اسکی تائید ہوئی جو ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

مِنْهَا الْاَذَلَّ۔	کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ (جو بہت سر
(ع۔۱)	چڑھ گئے ہیں۔)

یہ تھے منافقین کے عزائم اور ان کی ریشہ دوانیوں کا حال! یہ باتیں وہ کس سے کہتے تھے؟ انھیں سے جو رسول اور ان کے مہاجر ساتھیوں کو مدینہ لائے تھے، اور اپنا سب کچھ ان کے لیے حاضر کیے ہوئے تھے، یعنی انصار ـــــــ یہ واقعہ کیا تھا جس کی طرف قرآن میں یہ اشارات ہیں؟ واقعہ یہ تھا کہ ایک غزوہ سے اسلامی لشکر کی واپسی ہو رہی تھی، جس کے ساتھ حضورؐ بھی تھے۔ ایک بات پر ایک انصاری اور ایک مہاجر میں کچھ مناقشہ ہو گیا۔ مہاجر کے کسی حمایتی نے مغلوب الغضب ہو کر انصاری کے ایک دھکا مار دیا۔ لشکر میں منافقین کا گروہ اور خود رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ بھی تھا۔ کیونکہ حضور ان کا پردہ فاش نہیں کرتے تھے اور عام لوگ انکو مسلمان ہی سمجھتے تھے (اور یہ الفاظ جو قرآن نے نقل کئے ہیں اسی عبداللہ بن ابی کے تھے) انھیں آیات کے ذیل میں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ایک انصاری صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منافق سے درگزر کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے عرض کیا تھا کہ حضور! قصہ یہ ہے کہ آپ کی مدینے تشریف آوری سے کچھ قبل اس شخص کا قبیلہ اسکو باقاعدہ بادشاہ بنا کر اسکی تاجپوشی کی تیاریاں کر رہا تھا، کہ آپ کی آمد ہو گئی۔ اور یہ کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ اسی کا اثر ہے کہ اس سے اس طرح کی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک فکر و نظر کام کرتی ہے عبداللہ بن اُبَیّ کے گروہ کے دل کی یہی آگ تھی جس نے ان کو منافقت کی راہ پر ڈالا۔ اور اسی آگ کی لپٹیں تھیں جو کبھی کبھی اس طرح منھ سے نکلتی تھیں کہ "لا تنفقوا علیٰ من عند رسول اللہ الخ" یا "لیخرجنّ الاعزّ منہا الاذل" ـــــــ سوچنے کی بات ہے کہ جب منافقین کا گروہ انصار کو مہاجرین سے لڑانے اور ان کے خلاف ورغلانے کی تدبیریں اور اپنے لیے میدان صاف کرنے کی کوششیں آنحضرت کی زندگی میں کرتا رہتا تھا، اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا، تو جب اس طرح کی کسی کوشش کا بہترین موقع فراہم ہوا ہوگا ـــــــ یعنی وفات نبوی کا موقع ـــــــ تب یہ گروہ کیونکر متقی اور پرہیزگار بن کر بیٹھ گیا ہوگا؟ کیا معنی تھے کہ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا؟

غور کیجیے کہ ادھر تو حضور کا وصال ہوا ہے، نعشِ مبارک ابھی شرمندۂ تجہیز و تکفین نہیں ہے لوگوں کو غش آرہے ہیں، اور حواس پراں ہیں۔ کیا سوچا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسول کو اپنے گھر بلا کر لانے والے، اس پر اپنی جان اور مال سے فدا ہونے والے، بڑی سے بڑی مصیبت اٹھا کر اس کا روئے انور دیکھ کر ساری مصیبتیں بھول جانے والے[1] آپکی آنکھ بند ہوتے ہی ایسے بے مروت اور سخت دل ہو گئے ہوں گے کہ تجہیز و تکفین اور تدفین سے بھی پہلے انتخابِ امیر کے قضیہ میں لگ جائیں! اور بجائے آپکی بالیں پر اشکہائے عقیدت لٹانے اور مہاجرین کی طرح ماہئ بے آب نظر آنے کے اپنے گھروں پر بیٹھے فکرِ فردا کرنے لگیں؟ حاشا ثم حاشا!! — یہ بے مروتی یہ بے رخی اور یہ سخت دلی، ان جاں نثارانِ رسول سے، تصور میں بھی نہیں آسکتی عقل کہتی ہے، ایمان کہتا ہے اور منافقین کے عزائم اور انکی ریشہ دوانیوں کی جو خبر ہمیں قرآن نے دی ہے وہ کہتی ہے کہ ہو نہ ہو یہ منافقین کی کسی سازش کا نتیجہ تھا — ایسی سازش کہ اگر کامیاب ہو جاتی تو منافقین کی ساری مرادیں بر آتیں — یقیناً انصار کے بعض افراد کو منافقین نے کوئی ایسی دینی پٹی پڑھائی تھی، کہ اسی کے اثر سے یہ اُن ہونی ہوئی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ اس طرح کا کوئی وعظ اور اس طرح کی کوئی تلقین تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی بات تو اور تھی، وہ بتقاضائے رسالت آپ آپ مسلمانوں کے امیر تھے۔ لیکن اب تو قدرتی طور پر نظم و نسق کی ذمہ داریاں انہی لوگوں کی طرف لوٹتی ہیں جو اس سرزمین (مدینہ) کے اصل باشندے ہیں، اور جن کا یہ اصلی وطن ہے۔ پس ایسی صورت میں

---

[1] غزوہ احد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہو جانے کی خبر اڑی اور مدینہ کی عورتیں تک یہ خبر سُن کر اُحد کی طرف دوڑ پڑیں تو کسی نے میدانِ جنگ کے قریب انہیں کسی ایک کو بتایا کہ تمہارے باپ بھائی اور شوہر ..... آج سب کام آگئے تو انھوں نے فرمایا یہ چھوڑو مجھے رسول اللہ کی خیریت بتاؤ۔ غالباً روایت میں یوں آیا ہے کہ اتنے ہی میں انکی نظر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو بے اختیار پکار اٹھیں۔ کل مصیبۃ بعدک جلل یا رسول اللہ! اگر آپ سلامت ہیں تو یا رسول اللہ پھر ہر مصیبت ہلکی ہے۔)

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے، لوگ سراسیمہ اور پراگندہ حواس ہیں، چاروں طرف کی غیر مسلم طاقتوں سے اسلام کی نوزائیدہ طاقت کو خطرات ہیں، اور یہ خبر ان طاقتوں کا حوصلہ بڑھا سکتی ہے، اور مدینہ پر آنًا فانًا کوئی مصیبت آسکتی ہے، اس لیے اہل مدینہ کو چاہیئے کہ وہ جلد سے جلد امارت کا نظم قائم کریں اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ براہوں۔

ان میں سے ہر بات نہایت معصوم اور انصارِ مدینہ کے جذبۂ دینی کو صد درجہ اپیل کرنے والی تھی۔ ہم وثوق کے ساتھ سمجھتے ہیں اور سمجھنا چاہیئے کہ اسی قسم کی کوئی بات تھی جو انصار کے اندر گھلے ملے منافقین کے گروہ نے اپنے لیے میدان صاف کرنے اور اسلام کا کام تمام کرنے کے لیے انصار کے دلوں میں اتار دی تھی۔ اور محض یہی سبب تھا کہ مہاجرین سے رجوع کیے بغیر اور ایسی حالت میں کہ جسد نبوت کی تکفین و تدفین کے تمام مراحل ابھی باقی تھے۔ یہ لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہوگیے، اور امیر کا انتخاب کرنے لگے۔

اس اجتماع کے انعقاد میں منافقین کے عمل دخل کی تائید اس قرینہ سے بھی ہوتی ہے کہ منافقین اگر سب نہیں تو بیشتر خزرجی تھے۔ (اس لیے کہ عبداللہ بن اُبَی (رأس المنافقین) خزرجی[1] ہی تھا) اور اس اجتماع کے لیڈر بھی خزرجی تھے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ جن کو امیر بنایا جارہا تھا وہ بھی خزرجی تھے۔ اور حباب بن منذرؓ جن کی تقریر نمائندۂ انصار کی حیثیت سے پرویز صاحب نے پیش کی ہے وہ بھی خزرجی ہیں۔

بہرحال یہ تھا اس اجتماع کا پس منظر، جس کے ثبوت میں کوئی تاریخی دستاویز تو ہمارے پاس نہیں ہے، لیکن تمام قرائن کا یہ گویا قطعی فیصلہ ہے!

اب اصل مسئلہ کی طرف آئیے! حضرت عمر اور حضرت ابوبکر وغیرہ یکایک اطلاع پاکر اس اجتماع میں پہنچتے ہیں۔ ان کے پہنچنے پر جو پہلی تقریر انصار کی طرف سے ہوتی ہے، اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے اس کارروائی پر اعتراض کیا ہوگا۔ انصاری لیڈر، جن کے ذہن میں ہمارے قیاس کے مطابق وہ باتیں اتر چکی تھیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، ان کی سمجھ میں اس اعتراض کی

[1] انصار کے دو قبیلے تھے ایک کا نام اوس تھا ایک کا خزرج۔

معقولیت نہ آئی اور انھوں نے کہا:۔

نحن انصار اللّٰہ وکتیبۃ الاسلامؔ — ہم اللہ کے انصار اور اسلام کی فوج
وانتم معاشر المھاجرین رھط — ہیں اور اے مہاجرین تم تو ایک چھوٹی سی
وقد دفت دافۃ من قومکم — تعداد ہو۔ ایک پریشان حال جماعت تھی

جو اپنی قوم سے نکل یہاں چلی آئی تھی (پس یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم کیوں اس کارروائی پر معترض ہو رہے ہو۔)

انصاری خطیب کے یہ جملے ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ بات نہایت مضبوطی کے ساتھ اتری ہوئی تھی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مملکت مدینہ کا نظم و نسق قدرتی طور پر ہم اہل مدینہ ہی کی ذمہ داری ہے۔ یہ بات از خود بھی ان کے ذہن میں ہو سکتی تھی، مگر اس کا یہ ظہور کہ ایسے ہوشربا سانحہ کے وقت اس کام کے لیے اجتماع منعقد ہو جائے، قیاس کہتا ہے کہ یہ منافقین ہی کی وعظ و تلقین کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس خیال کا تقاضہ کچھ مؤخر ہو کر پورا ہوتا ـــــ بہرحال یہ خیال تھا جس کے نتیجہ میں انصار انتخاب امیر کی کارروائی کرنے کے لیے بیٹھے ـــــ اور یہ خیال یقیناً ایک حد تک بجا تھا جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقریر کے اس فقرے[1] سے معلوم ہوتا ہے ـــ جو بخاری کی دوسری روایات میں آیا ہے ـــــ کہ "امیر تو قریش ہی میں سے ہونا چاہیئے لیکن وزیر انصار ہوں گے"[2] یہ گویا صدیق اکبرؓ کیطرف سے اس امر کا اعتراف تھا کہ انصار کا موقف فی الجملہ صحیح ہے (غلطی صرف خاص امارت کے مطالبہ میں ہے۔)

ظاہر بات ہے جب کسی کے موقف کی یہ نوعیت[3] ہو تو کچھ بھی بعید نہیں، بلکہ انسانی فطرت

---

[1] نحن الامراء و انتم الوزراء" بخاری باب مناقب ابی بکرؓ ـــــ عن عائشہؓ)

[2] خصوصاً یہ بات اور ذہن میں رکھیئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار کے موقف کی فی الجملہ صحت کا اعتراف فرماتے ہوئے ان کے مطالبۂ امارت سے اختلاف، بخاری کی روایت کی رو سے، اس بنیاد پر کیا تھا کہ "عرب قریش کے سوا کسی کی سرداری کو تسلیم نہیں کر سکتے" یہ ظاہر ہو کہ یہ ایسی بات نہ تھی کہ انصار کو (باقی ص پر)

سے نہایت قریب ہے کہ وہ اپنے موقف پر اصرار کرے۔ اور جب اسکی مخالفت میں اصرار ہو حتیٰ کہ وہ اپنے موقف سے کچھ نیچے بھی اتر آئے کہ "مِنَّا امیرٌ و منکم امیرٌ" (ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے) کی تجویز پیش کرے، اور اس پر بھی مخالفت ہو تو اُسے کچھ شکایت ہو، اسکی طرف سے کچھ گرمی کا اظہار ہو۔ ظاہر ہو کہ یہ بات انسانی طبیعت سے، خواہ وہ کسی بھی درجہ کے انسان ہوں، ذرا بھی بعید نہیں ہے ——— ایسی صورت حال میں ہنگامی طور پر بڑی سے بڑی بات ہو سکتی ہے۔ اور جو اس دنیا میں رہتا ہے وہ جانتا ہو کہ ہو سکتی ہی نہیں ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں میں بدگمانیاں اور شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس سے انکی نیک نفسی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یہ تو انصار کی بات ہے ——— رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ——— رہا مہاجرین کا معاملہ! تو انکی طرف سے اگر کسی مرحلہ پر کوئی تلخی یا درشتی آئی، تو وہ تو اور بھی ناقابل اعتراض ہے۔ مہاجرین ان آزمائشی لمحات میں بھی "رُحَمَاءُ بینھم" کی شان اس طرح برقرار رکھے ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ جن سے سب سے زیادہ تیزی اور سختی کا خطرہ ہو سکتا تھا وہ اسی بخاری کی روایت میں بیان کرتے ہیں کہ انصار کا پہلا خطیب جب خاموش ہوا تو میں نے بڑھ کر چاہا کہ بولوں۔ حالانکہ ابوبکرؓ کے سامنے مجھے یہ جرأت نہ کرنی چاہیئے تھی۔ مگر کیوں کی؟ سنیئے! سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

كُنتُ زَوَّرتُ مَقالَةً — میں نے اپنے نزدیک ایک بڑی عمدہ

اَعجَبَتنِي اُرِيدُ اَن اُقَدِّمَهَا — تقریر سوچ رکھی تھی۔ میں نے اس کو ابوبکر

بَينَ يَدَيْ اَبِي بَكرٍ وكُنتُ — سے پہلے پیش کر دینا چاہتا تھا اور مقصد

اُدَارِيُ مِنهُ بَعضَ الحَدِّ — یہ تھا کہ ابوبکر کہیں اس موقع پر گرم نہ ہو جائیں

لہٰذا میں پہلے سے ایسی باتیں کہہ دوں کہ انکی نوبت نہ آئے۔ (گویا پیش بندی ہو جائے اور مجلس کی فضا خوشگوار رہے)

یہ تھا مہاجرین میں سے اس شخص کا رویہ جس سے سب سے زیادہ شدت کا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو تقریر سے روک دیا۔ اور خود کھڑے ہوئے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رویہ کیا رہا؟ حضرت عمرؓ ہی فرماتے ہیں:۔

فَكَانَ هُوَ اَحلَمَ مِنِّي وَاَوقَرَ — پس وہ تو مجھ سے بھی زیادہ حلیم اور باوقار

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اس سے اختلاف کا حق نہ ہوتا۔ انصار کی رائے ہو سکتی تھی کہ ایسا نہیں ہے، ہم امارت کی ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں۔ اور انصار کی خدمات اور اسلام میں انکے مقام کی بنا پر اسلام کے تمام حلقہ بگوش اُن کے سامنے جھک سکتے ہیں۔

واللهِ ما ترَكَ من كلمةٍ	تھے ہی (اس موقع پر بھی اُن کا یہی رنگ
أعجبتني في تزويري إلّا قالَ	رہا) بخدا کوئی وہ بہتر بات جو میں نے سوچ
في بديهتهِ مثلها او أفضلَ	رکھی ہو، انھوں نے ایسی نہیں چھوڑی کہ
منها۔	فی البدیہہ اُس جیسی یا اُس سے بہتر نہ کہی ہو۔

بخاری کی روایت میں اس تقریر کا حاصل کہیئے یا محض ایک جزو کہیئے ذکر ہوا ہے۔ پوری تقریر کا نقشہ اس سے سامنے نہیں آتا۔ مسند احمد کی روایت میں اگرچہ ہے تو اختصار ہی مگر ایسا اختصار ہے کہ گویا پوری تقریر سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا اس روایت میں دیکھئے:۔

راوی ۔ حُمید بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں :۔

فتكلّم ابوبكر ولم يترك شيئاً	حضرت ابوبکر نے تقریر فرمائی اور اس
أُنزلَ في الانصار ولا ذكرهُ	تقریر میں انھوں نے انصار کے فضائل
رسول الله صلى الله عليه	ومناقب میں سے کوئی چیز نہ چھوڑی جو
وسلم في شأنهم إلّا وذكرهُ	قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہو۔۔۔
قالَ الا وقد علمتم انّ	مگر یہ کہ اسکو بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا۔
رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
قالَ لو سلك الناس وادياً	کہ اگر سب لوگ ایک وادی میں چلیں اور
وسلكت الانصار وادياً	انصار ان سے الگ دوسری وادی میں
لسلكتُ وادي الانصار[1]	تو میں انصار ہی کی وادی اختیار کرونگا
(مسند احمد جلد اوّل ۔ مرویات ابی بکر)	اور اُنہی کے ساتھ چلوں گا۔

یہ ہے ان روایات کی رو سے، اس مجمع میں مہاجرین کی شان، جنھیں بدنام کُن تاریخ کا نام دیکر نسیاً منسیاً کرا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے ــــــــ کیا برادرانہ روش ہے اور کیسا الفت و مودّت سے لبریز انداز گفتگو! لیکن ہم مانے لیتے ہیں کہ بعد کے کسی مرحلہ پر مہاجرین کے رویہ میں کچھ سختی آگئی اور کچھ تیز باتیں ان کی طرف سے بھی نکل گئیں۔ تو بالفرض اگر ہم اسکے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ یہ باتیں محض جوابی اور غیظِ طبعی کی پیدا وار تھیں۔ تو ہم بتا چکے ہیں کہ

(باقی صفحہ ۱۳۴ پر)

ترجمہ

قانون اور مذہب

سر الفریڈ ڈیننگ

["سر الفریڈ ڈیننگ، انگلستان کے مشہور ماہر قانون اور جج ہیں۔ اس وقت دولت برطانیہ کے چیف جسٹس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔" آپ کا یہ مضمون "چراغ راہ" اسلامی قانون نمبر سے نقل کیا جا رہا ہے۔ اور مضمون نگار کا یہ تعارف بھی چراغ راہ ہی سے لیا گیا ہے۔ ادارہ]

عہد قدیم میں مذہب اور قانون کا تعلق بہت ہی گہرا تھا مگر جدید زمانہ میں مذہب کا قانون پر کوئی نمایاں اثر باقی نہیں رہا ہے۔ گزشتہ ادوار میں مذہب، اخلاق اور قانون اجزاء لاینفک کی حیثیت رکھتے تھے، مثلاً توراۃ کے احکام عشرہ میں سے پہلا حکم مذہبی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں "خدا نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خدا ہوں، تیرا کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے میرے"۔ پانچواں حکم اخلاقی نوعیت کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "اپنے والدین کی عزت کرو، تاکہ تیرا قیام اس زمین میں دراز ہو جو تجھے خدا عطا کرے۔" آٹھواں حکم ایک قانونی فریضہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے۔ "تو ہرگز چوری نہ کر"۔ قدیم مذاہب و اقوام سب میں یہی صورت حال تھی۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ مذہب اخلاق و قانون تینوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ اس تفریق و امتیاز کو بہت دور تک پہونچا دیا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سے لوگوں میں اب یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب اور قانون کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کا مقولہ یہ ہے کہ "مذہب خدا اور انسان کے تعلقات متعین کرتا ہے اور قانون ایک انسان اور دوسرے انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے"۔ اسی طرح ان لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ قانون کا اخلاق سے بھی واسطہ نہیں ہے، قانون بہر حال واجب الاتباع ہے، خواہ وہ اخلاقی لحاظ سے صحیح ہو یا غلط، قانون کا مقصد معاشرہ میں نظم و ضبط کو برقرار رکھنا ہے، نہ کہ عدل

انصاف کو قائم کرنا۔

میری دانست میں تفریق و انقطاع کا یہ تصور حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اگرچہ مذہب و قانون کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں بہت بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مذہب کے بغیر اخلاق کا وجود ناممکن ہے۔ اخلاق کے بغیر قانون کا وجود محال ہے۔ آئیے میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کروں کہ ہمارے قانون کے بنیادی اصول کس طرح عیسائیت کی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اُصولِ حق و صداقت

سب سے پہلے ہم حق و صداقت کے اُصول کو لیتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ سچ بولنا ہر آدمی کا بنیادی فریضہ ہے۔ اب اگر مذہب، اخلاق اور قانون کے تقاضوں سے قطع نظر کر کے محض مصلحت وقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حق پرستی کے خلاف بھی اتنے ہی دلائل دیے جا سکتے ہیں، جتنے اس کے حق میں دیے جا سکتے ہیں۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ "دیانت و صداقت بہترین پالیسی ہے" لیکن ایک مصلحت بین انسان کی نگاہ میں اسی ضرب المثل پر کاربند ہونا، دانشمندانہ نہیں، بلکہ سراسر احمقانہ فعل قرار پائے گا۔ اگر جھوٹ بولنے سے اس کا مقصد حاصل ہوگا تو وہ ضرور جھوٹ بولے گا اور دلیل یہ دے گا کہ اصل اعتبار مقصد کا ہے نہ کہ ذریعہ کا ـــــ مثلاً ایک مصلحت پرست انسان کے خلاف اگر یہ الزام عائد کیا جائے کہ وہ نشہ کی حالت میں کار چلا رہا تھا، تو وہ بڑی آسانی سے انکار کر دے گا، خواہ یہ الزام صحیح ہی کیوں نہ ہو، ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ سے ہمیں صرف اس لیے نفرت ہے کہ ہمیں اپنے والدین نے اس وقت سچ بولنے کی تعلیم دی تھی جبکہ ان کی آغوش عاطفت میں ہمارے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں دینِ مسیحیت نے یہ سکھایا ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حال میں سچ بولیں سینٹ پال نے فرمایا تھا۔ "جھوٹ کو ترک کر کے ہر آدمی اپنے ہمسایہ کے سامنے سچ بولے، کیونکہ ہم ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔" ہمارے اندر غصا و ناراضگی کے جذبات سب سے زیادہ اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے، ہمارے سامنے دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری شخصیت کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی، نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا آدمی ہمیں دھوکا دے اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی دوسرے کو دھوکا دیں۔

بعض مذہبی خیال رکھنے والے لوگ خاص حالات میں نیک مقصد کے لیے جھوٹ بول لینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ ایک زمانے میں اسے جائز قرار دیتا تھا مثلاً حضرت مسیح اور دوسرے صلحاء کی زندگیوں کے بارے میں افسانے گھڑ کر انھیں حقیقی واقعات کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے مقصود ایمان و اعتقاد کو پختہ کرنا تھا تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فریب تھا۔ اسی کے نتیجہ میں "مقدس فریب" (Pious Fraud) کی اصطلاح وضع کی گئی جو اب ہماری زبان میں عام رائج ہو چکی ہے۔۔۔۔ موجودہ زمانہ میں اس کی مثال وہ دروغ مصلحت آمیز ہے جس کا ارتکاب ایک معالج اپنے مریض کے سامنے کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ فعل مریض کے حق میں نفع بخش ہوتا ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ "ہمسایہ سے سچ بولنے" کا حکم قطعی اور مطلق ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے نزدیک حق گوئی ایک قطعی فریضہ ہے جس میں کسی استثنار کی گنجائش نہیں ہے۔ انھوں نے اس کے حق میں صرف اس دلیل کو کافی سمجھا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کو عالم آخرت میں حیات طیبہ نصیب نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور میں کانٹ اور بعض دیگر مفکرین کا بھی یہی خیال ہے کہ ہر حالت میں سچ بولنا قطعی ضروری ہے۔ آپ یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حالتِ جنگ میں کیا دشمن کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بولا جا سکتا ہے لیکن ایک متبع عیسائی اس کا بجا طور پر جواب دے سکتا ہے کہ جو دشمن ہمیں تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو اس پر "ہمسایہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سے سچ کہنا ضروری ہے۔

قانون اور صداقت

اب آپ قانون کو لیجیے، قانون کی نگاہ میں بھی سچ بولنا نہایت ضروری ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک خالص سچائی منظر عام پر نہ آئے قانون اور عدل کے تقاضے کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے، قانون اور عدل کی محافظت اور تنفیذ کا بہت بڑا ذریعہ ہمارا عدالتی نظام ہے۔ لیکن اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حق پرستی جس کا اصل سرچشمہ مذہبی تعلیم ہے، قانون کی بقا کے لیے کس قدر ضروری ہے، اور مذہب و قانون کا باہمی تعلق کتنا گہرا اور بنیادی ہے!۔۔۔ یہاں میں جملۂ معترضہ کے طور پر اتنا ضرور کہوں گا کہ میرا یہ استدلال ایک مفروضہ پر مبنی ہے اور یہ استدلال اسی صورت میں صحیح ہوگا جبکہ قانون بذاتِ خود عادلانہ ہو، اور عدالتوں میں بیٹھنے

والے جج خود بھی حق و انصاف کے تقاضوں کو پورے کرنے والے ہوں، اگر قانون ظالمانہ ہوگا یا عدلیہ کے علمبردار اس کے نفاذ و اجرا میں انصاف پسندی سے کام نہیں لیں گے تو عدالتوں میں ہمارے پیش ہونے والے گواہوں کے اندر لازماً یہ رجحان پیدا ہوگا کہ وہ "مقدس فریب" سے کام لے کر دروغ بیانی کریں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ وہ تھا کہ چالیس شلنگ قیمت کی چوری کی سزا موت تھی اسکا نتیجہ ایک مرتبہ یہ نکلا تھا کہ پانچ پونڈ کے ایک مسروقہ نوٹ کے بارے میں جیوری نے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نوٹ کی قدر و قیمت اُنتالیس ۳۹ شلنگ سے ہرگز زائد نہیں ہے اور اس اعلان کو کسی نے بھی قابل مذمت نہیں سمجھا تھا، بہرحال قانون کا صرف واضح اور متعین ہونا ہی کافی نہیں، بلکہ اسکی کامرانی کے لیے اس کا مبنی بر انصاف ہونا بھی ضروری ہے۔

سچائی کے لازمۂ قانون و انصاف ہونے اور اس کی ضرورت مسلم ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کی عدالتیں سچ بولنے پر اصرار کرتی ہیں اور ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم اٹھائے، ــ قانون کے نقطۂ نظر سے مذہبی تصورات و اعتقادات کی اہمیت کی اس سے زیادہ واضح مثال ہمارے قانونی نظام میں مشکل سے ملے گی، گویا ہمارے قانون کا بنیادی مفروضہ اور نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور وہ خدا اور ایمان کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولے گا۔ عدالتوں کے قیام پر صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن آج بھی جو شخص گواہ کے کٹہرے کے سامنے آتا ہے اسے سب سے پہلے حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ اس فعل کے تقدس کے پیش نظر عدالت میں ایک خاموش فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ گواہ اپنے ہاتھ میں مقدس کتاب لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے "میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچی گواہی دوں گا، میں سچائی، مکمل سچائی پیش کروں گا، اور سچائی کے سوا کچھ پیش نہیں کروں گا۔" گواہ کے ہاتھ میں جو مقدس کتاب دی جاتی ہے وہ انجیل (New Testament) ہوتی ہے، الا یہ کہ گواہ کسی دوسری کتاب کا مطالبہ کرے، جس وقت گواہ قسم اٹھاتا ہے تو وہ صرف اتنا ہی کو یہ یاد نہیں کرا رہا ہوتا کہ وہ سچ بول رہا ہے، بلکہ وہ اپنے خدا کے سامنے پختہ عہد باندھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ "مقدس فریب" اور "جزوی صداقت" (Half Truth) خدا کے ہاں کسی کام کی نہیں ہے، ایک عامی سے عامی اور جاہل سے جاہل آدمی بھی جب کٹہرے میں آتا ہے تو اسے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے، ویسٹرن سرکٹ کی ایک عدالت میں اس واقعہ کا

باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے پہلے معمول کے مطابق کلمات دُہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ "اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کرلے" چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہو گیا، اس جگہ پر اس وقت ایک پتھر نصب کر دیا گیا تھا جو اب تک اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اگر گواہ کسی ایسے مذہب یا عقیدے کا پیرو ہو جس کے لحاظ سے قسم کی کوئی دوسری شکل مناسب ہو تو عدالت میں اسی کو اختیار کیا جاتا ہے، گواہ کو بہرحال ایسی قسم اٹھانی پڑتی ہے جو اسے اپنے ضمیر اور اخلاق کے مطابق سچ بولنے کے لیے پابند کر دیتی ہو۔

اس بحث سے آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قانون کا منشا اور تقاضہ صرف اتنا ہے کہ محض عدالت میں قسم کھا کر سچ بولنا ضروری ہو اور دوسرے مواقع پر جھوٹ بولنے میں ہرج نہیں ہے۔ نہیں ہرگز نہیں!! ہر انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان سے کوئی معاملہ کرے اس میں حق و صداقت کی روش پر رہے، قانون اس معاملہ میں سخت گیر اور متشدد ہے اتنا کسی دوسرے میں نہیں ہے، وہ کسی پس وپیش اور ہیر اپھیری (manoeuvre) کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، اگر ایک بیان محض الفاظ کی حد تک صحیح ہو، لیکن اس میں کسی ایسے حصہ کو قصداً حذف کر دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے غلط تأثر پیدا ہوتا ہو تو ایسا بیان ایک "فریب" ہے جیسا کہ لارڈ کیلسنٹ (Lord Kylsant) کو ایک مرتبہ خسارہ اٹھانے کے بعد پھر اس تلخ حقیقت کا علم ہوا تھا انھوں نے کیا یہ تھا کہ ایک کمپنی کے منافع جات کے اعداد و شمار تو انھوں نے شائع کر دیے، مگر نقصانات کے اعداد شائع نہیں کیے۔ اس سے کمپنی کی مالی حیثیت کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ لارڈ موصوف کو اس کے نتیجے میں ایک سال جیل کی ہوا کھانی پڑی، غلط بیانی اور فریب دہی وغیرہ کے بارہ میں ہمارے ان جتنے بھی قوانین نافذ ہیں ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ "کسی آدمی کو کذب بیانی سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، بشرطیکہ قانون میں کچھ بھی گنجائش ہو، کسی عذر یا تاویل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کسی نیک مقصد کے لیے بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہو۔ پاکیزہ مقصد کا ذریعہ بھی پاک ہونا چاہیے۔" اس معاملہ میں ہمارا قانون تو بلاشبہ بہت مضبوط اور معقول ہے۔ مگر میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قانون تنہا کافی نہیں ہے۔ اگر لوگوں کے اندر مذہب کی سچی روح مفقود ہو تو محض قانونی دفعات بالکل بے کار اور لاطائل ہیں۔ کیا دیانت و امانت کے

آجکل ناپید ہونے کی اصل وجہ الحاد و بے دینی نہیں ہے؟ بیشتر گواہ جو ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں، وہ حلف کی تقدیس کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایسا بیان دیتے ہیں، جو ان کے خیال میں ان کے مقدمہ کے لیے مفید ہو، خواہ وہ سچ ہو یا جھوٹ ہو۔

ایفائے عہد

وعدے کا پورا کرنا بھی سچ بولنے سے کچھ اہم نہیں ہے۔ زبور کے الفاظ میں "کھرا آدمی صرف وہی ... ہے جو زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے، خواہ اسے خود تکلیف کا سامنا کرنا پڑے"۔ اس اصول کو ہمارے قانون میں بڑا دخل ہے۔ ہمارا قانون معاہدات مختلف مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب کہ صرف قانونی دستاویز پر لکھا ہوا اور مہر زدہ معاہدہ قابلِ وثوق سمجھا جاتا تھا، ایک وقت وہ تھا جب کہ صرف وہ معاہدہ لازم قرار دیا جاتا تھا جس کے عوض میں کچھ مالی لین دین عمل میں لایا جاتا تھا، لیکن موجودہ زمانہ میں ان تکلفات و رسوم کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ آج کل اگر انسان ایسا وعدہ کرتا ہے جس کی پابندی لازمی قرار دی جائے اور جس بنا پر دوسرا فریق کوئی کارروائی کرتا ہے تو اب اس کارروائی کے وقوع میں آجانے کے بعد اس وعدے کی پابندی از روئے قانون واجب ہو جاتی ہے۔

معاہدات کی حفاظت کے لیے ہمارے قانون کا مستعد ہونا بڑی خوش آئند بات ہے، لیکن بعض حالات میں یہ قانونیت حد سے تجاوز کر جاتی ہے، اس تجاوز کی سب سے واضح مثال ہمارے قانون کا وہ رویہ ہے جو اس نے مطبوعہ اور لگے بندھے معاہدات (standardised contracts) کے بارہ میں اختیار کر رکھا ہے، انشورنس کمپنیاں، بنک اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے، معاہدے کے چھپے چھپائے فارم تیار رکھتے ہیں جن میں بے شمار شرائط درج ہوتے ہیں، ایک عام آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یا تو ان سارے شرائط پر دستخط کرے یا پھر ان اداروں سے کوئی معاملہ ہی نہ کرے، ان پر دستخط کرنے والے افراد بالعموم اول تو ان سارے شرائط کو پڑھتے نہیں، اور اگر پڑھ بھی لیں تو سمجھتے نہیں، لیکن دستخط کرنے کے بعد ایک شخص ان شرائط کے ساتھ ایسا بندھ جاتا ہے گویا کہ اس نے ان میں سے ایک ایک شرط کو عمداً پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے۔ پھر جب ان شرائط کی تعبیر اور تشریح کا مرحلہ آتا ہے تو معاہدے کی لفظی

پابندی پر بہت زور دیا جاتا ہو۔ اگر معاہدہ کرنے والا احتجاج کرتا ہو اور کہتا ہو کہ "مجھے ایسی نادیدہ صورت حال کا پیشگی کچھ بھی علم و تصور نہ تھا" تو اسے جواب دیا جاتا ہو کہ "یہ تمھارا اپنا قصور ہو، تمھیں ہوشیار و خبردار رہنا چاہیے تھا"۔ لیکن میرے خیال میں یہ قانونی روش صحیح نہیں ہو اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اصلاح کی جا سکتی ہو اگر سینٹ طامس اکوی ناس (St. Thomas Aquinas) ہوتے تو وہ یقیناً دستخط کرنے والے کو معذور قرار دیتے۔ فریقین میں سے ہر ایک کے اندر حسن نیت (Good Faith) کی موجودگی ضروری ہو۔ کسی ایک فریق کو اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ بال کی کھال نکال کر الفاظ میں سے ایسا مفہوم برآمد کرے جو دوسرے فریق کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو۔ قوانین ملکی کی تعبیر میں بھی ایسی دقتیں پیش آتی ہیں۔ بعض حالات میں منصفانہ قوانین کے الفاظ کو بھی ایسے معنی پہنا لئے جاتے ہیں جو قانون سازوں کی منشاء کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ اور جن سے انصاف کے تقاضے بری طرح پامال ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرتا ہو اور جج یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ "پارلیمنٹ کے پاس کردہ قوانین کے زخموں کو پُر کرنا ہمارا کام نہیں ہو۔"

لفظی موشگافیاں

میرا خیال یہ ہو کہ معاہدات اور قوانین کی تشریح میں اس قسم کی موشگافیاں سچائی کے بنیادی اور حقیقی تصور کے قطعاً منافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ انسان الفاظ پر حاکم ہونے کے بجائے ان کا محکوم بن کر رہ جاتا ہو۔ اگر آپ انجیل پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ محض الفاظ کی غلامی کی کتنی مذمت کی گئی ہو۔ اس سلسلہ کی نمایاں مثال وہ واقعہ ہو جو یوم السبت سے متعلق ہو، تورات کا چوتھا حکم یہ ہو کہ "سبت کے دن تو کوئی کام نہ کر"۔ ایک مرتبہ حضرت مسیح کے حواری گندم کے کھیت میں سے گذر رہے تھے اور ہفتہ (سبت) کا دن تھا۔ انھوں نے خوشے توڑنے شروع کر دیے۔ فریسیوں نے کہا کہ "سبت کے دن یہ لوگ فعل حرام کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں"۔ سینٹ پال نے اسی حقیقت کو ان جامع اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہو کہ "الفاظ جان لیوا ہیں مگر معانی جان بخش ہیں"۔ کسی زمانے میں ہمارے انگریزی قانون میں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بائبل کا نیا نیا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا۔ ہمارے جج اسے پڑھا کرتے تھے اور ان کے فیصلے بلاشبہ اس سے اثر پذیر ہوا کرتے تھے، وہ قانون کی محض لفظی تعبیر پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اس خرابی یا کمزوری کو نگاہ میں رکھتے تھے، جسے رفع کرنے

کے لیے قانون بنایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ قانون سازوں کے مقصود و مدعا (Intention) کو زندگی اور قوت بخشتے تھے، لیکن انیسویں صدی میں اس وسیع نقطۂ نظر کو ایک ایسے قاعدے میں بدل دیا گیا، جو بیرن پارک کے الفاظ میں "زرّیں اصول تھا" ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام قوانین و معاہدات کے الفاظ کی تعبیر لغت اور گرامر کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں عدل، قانون اور قانون سازوں کا اصل مدعا بالکل فوت ہو جائے، میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جج بالکل آنکھیں بند کرلیں، ہاتھ باندھ لیں۔ اور صورت حال کی ساری خرابی کا الزام مقنّنہ کے سر ڈال دیں۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ الفاظ کی غلامی میں مبتلا ہوئے بغیر عبارت کی ایسی معقول توضیح و تاویل کی جانی چاہیے جو قرینِ عدل و انصاف ہو، حق اور صداقت تک رسائی صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے۔

عدل و انصاف

حق پرستی اور ایفائے عہد کے بعد آئیے۔ اب عدل و انصاف کو لیں۔ میرے خیال میں اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کو ہمیشہ ہر معاملے میں عادلانہ اور منصفانہ رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں انصاف کا مفہوم بالکل وہی ہے جسے مسیحی تعلیمات میں محبت (Love) کا نام دیا گیا ہے۔ آرک بشپ آف کنٹربری ولیم ٹمپل کا بھی یہی خیال ہے اور میں انھیں موجودہ صدی کے عظیم ترین مفکرین میں شمار کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں: "یہ امر مسلّم ہے کہ عیسائیت میں غالب اور امتیازی عنصر "محبت" ہوتا ہے اور اجتماعی تنظیمات میں محبت کا ظہور "عدل" کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو انجیل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ کسی فقیہہ نے حضرت مسیح سے پوچھا "اے میرے آقا! حیاتِ ابدی کیسے نصیب ہوتی ہے؟" آپ نے جواب دیا "کتاب میں تم نے کیا پڑھا ہے؟" اُس نے جواب دیا "لکھا ہے کہ تم اپنے خدا وند خدا سے دل و جان سے محبت کرو، اور اپنے ہمسایہ سے ایسی محبت کرو جیسی کہ تم اپنے آپ سے ہو" حضرت مسیح نے فرمایا "تم نے ٹھیک جواب دیا ہے، اس پر عمل کرو اور تم ہمیشہ زندہ رہوگے" خالق و مخلوق سے محبت کا یہ تصوّر بنیادی طور پر مذہبی تصور ہے اور زندگی کے اکثر معاملات میں اس کا عملی ظہور منصفانہ برتاؤ ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ آپ مثال فرض کیجئے کہ ٹریڈ یونین اور کارخانہ داروں کا جھگڑا چل رہا ہے اور کارخانہ میں ہڑتال کا سخت خطرہ ہے، اب ٹریڈ یونین کمیٹی کو "محبت" کا رویہ اختیار کرنا چاہیے، مگر وہ کس سے محبت کرے مزدوروں سے یا کارخانہ داروں سے، جواب یہ ہے کہ "دونوں سے"۔ آپ پھر یہ سوال کریں گے کہ عملاً اس

جواب سے کچھ رہنمائی حاصل نہیں ہو رہی۔ کہ کس طرح تجاویز مانی یا منوائی جانی چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہو کہ اس طرح کے معاملات میں باہمی محبت کا مطلب یہ ہو کہ دونوں سے انصاف برتا جائے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہو کہ ایک انتہائی غیر جانبدارٹری بیونل تشکیل کیا جائے، جس پر فریقین کو پورا اعتماد ہو، ہر فریق اس کے سامنے اپنا اپنا مقدمہ پورے زور دار دلائل کے ساتھ پیش کرے اور ہر فریق اس بات کا پختہ عزم کرے کہ فیصلہ بلا چون وچرا شرح صدر کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا، اس طرح سے دونوں کے ساتھ یکساں سطح پر انصاف ہوگا اور یہ ہمارے اس مذہبی اصول کے بالکل مطابق ہوگا کہ "تو اپنے ہمسایہ سے ویسی محبت کر جیسی تو اپنے نفس سے کرتا ہے"۔[۱]

عدالت کا فیصلہ

فریقین تنازعہ کے بارے میں ہم نے دیکھ لیا کہ مذہب کی روشنی میں ان کا طرز عمل کیا ہو، جس سے "محبت" کا تقاضہ پورا ہو — آیئے اب دیکھیں کہ تنازعہ جب جج کے سامنے پیش ہو اس کو کیا کرنا چاہیئے، اسے بھی انصاف سے کام لینا چاہیے۔ مگر اسے کیسے معلوم ہوگا کہ **انصاف** کس شے کا نام ہو، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایک بہت بڑے جج نے اس مسئلہ کو کیسے حل کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایک شربت ساز نے ایسی لاپرواہی سے شربت کو تیار اور بند کرایا کہ بوتل میں جیتا جاگتا گھونگا داخل کر دیا گیا۔ یہ بوتل اس سے ایک دوکاندار نے اور دوکاندار سے ایک گاہک نے خریدی، گاہک کی بیوی نے اسے پیا اور بیمار ہوگئی، پہلے زمانہ میں ایسے معاملات کے بارہ میں قانون کا فیصلہ یہ تھا کہ مال کا تیار کرنے والا ایسے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہو، کیونکہ آخری خریدار کے ساتھ اس کا براہ راست لین دین کا کوئی معاملہ نہیں ہوا، لیکن ۱۹۳۲ء میں ہاؤس آف لارڈس نے یہ پاس کر دیا کہ صناع اس طرح کے نتائج کا ہر لحاظ سے ذمہ دار ہو۔ اس کی بنا لارڈ اٹکن (... کا وہ فیصلہ تھا جو مسیحیت کی تعلیمات کا صحیح مظہر تھا، اور جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "ہم ہمسائے سے محبت کے اصول کا انطباق قانون کی دنیا میں اس طرح کرتے ہیں کہ ہمسائے کو کوئی گزند نہیں پہونچانا چاہیے۔ آپ کو پوری اور معقول احتیاط برتنا چاہیے کہ آپ کوئی کام ایسا نہ کریں یا کرنے سے ہاتھ روکیں جس کے کرنے یا باز رہنے سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہو کہ آپ کے ہمسائے کو تکلیف پہونچے گی"۔

---

[۱] عیسائیت اور نظام اجتماعی (Temple: Christianity and The Social order)

اب وکیل پوچھتا ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہمسایہ کون ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے وہ لوگ ہیں جو میرے فعل سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں اور اتنے قریب سے متاثر ہوتے ہیں کہ فعل کے صدور کے وقت ان لوگوں کے متاثر ہونے کا امکان بجا طور پر میرے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا جج قانون کے اصول کو نہیں، بلکہ انصاف کے اصول کو دینی تعلیمات سے اخذ کرے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک جج اگر اس ماخذ اور سرچشمہ کی طرف رجوع نہ کرے تو پھر اور کہاں جائے۔ بعض لوگ فطری انصاف (natural justice) کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی شے ہے جسے ہر شخص آپ سے آپ جانتا ہے خواہ اس کی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے اندر انصاف اور سارے اخلاقِ حسنہ کے تصورات کا نشوونما ایک لمبے تاریخی پس منظر کے تحت ہوا ہے۔ انگلستان کے قانونِ عامہ (Common Law) کو صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد ان ججوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے۔ جن کی تعلیم و تربیت عیسائیت کے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اور جو عدل و انصاف کے مقتضیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمیشہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

جرائم کا سدِ باب

اب آپ دیکھیے کہ جرائم کی روک تھام کے سلسلہ میں کس طرح مذہب اور قانون دونوں مل کر کام کرتے ہیں، یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے اور مذہب ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ معاشرہ ہی بہت سے وہ حالات پیدا کرتا ہے جو جرائم کے ارتکاب کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے ہاں گھریلو زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اکثر کمسن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (broken homes) میں سے نمودار ہوتے ہیں۔ ایک نوعمر انسان جب اپنے گرد و پیش کے ماحول میں اپنے لیے کوئی جائے پناہ نہیں پاتا تو وہ اس بے رحم دنیا سے لڑنے کا عزم کر لیتا ہے۔ اس کے اندر لازماً اجتماعیت کش اور مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگ جاتی ہے۔ یہ برباد اور ویران گھرانے جو کثیر تعداد میں مجرمین فراہم کرتے ہیں، ہمارے اس معاشرے کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں، جو رشتۂ ازدواج کا احترام کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے جو اپنے اخلاقی اقدار و معیارات کو خیرباد کہہ رہا ہے اور جو اپنے مذہب سے قطع تعلق کر رہا ہے۔ معاشرے کی اصلاح

کیے بغیر محض مجرموں کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا، مرض کو چھوڑ کر مرض کی علامات کے پیچھے پڑنا ہے۔ ہم مرض کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں، اس کے لیے پوری سوسائٹی کی اصلاح لابدی ہے۔ اور اس ضمن میں مذہبی اور اخلاقی مصلحین اور رہناؤں کی ذمہ داری بہت کٹھن ہے۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے سب سے اونچے گھرانوں میں خانگی ناچاقیوں اور ازدواجی جرائم کی مثالیں روز افزوں ہیں۔

فرد کی ذمہ داری

جرائم کی ذمہ داری اگرچہ معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن نہ تو قانون کی نگاہ میں اور نہ مذہب کی نگاہ میں فرد کو بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ عیسائیت کی رو سے ایک فرد بھی اپنے گناہوں کا بہت حد تک ذمہ دار ہے، عیسائیت ایک خطا کار کو یہ کہہ کر معاف نہیں کر دیتی کہ "جاؤ تمہارے کنبے یا تمہارے ماحول نے ایسا کرنے پر تمہیں مجبور کر دیا تھا" اس سے یہ کہنا تو اس کو اطمینان دلاتا ہے کہ برائی کی روک تھام اور اس کے خلاف انفرادی جد و جہد بالکل غیر ممکن اور غیر ضروری ہے، عیسائیت کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ مجرم سے تائب و نادم ہونے اور آئندہ اصلاح کرنے کا مطالبہ کرتی ہے — ہماری دعا کی کتاب (Book of Common Prayer) کا ادبی فقرہ یہ ہے کہ جب گنہگار اپنے گناہ سے باز آ جاتا ہے اور نیکی کا کام کرتا ہے تو وہ اپنی روح کی زندگی اور سلامتی کو محفوظ کر لیتا ہے۔" سینٹ لیوک (St. Luke) نے فرمایا ہے کہ "جب خدا ایک پشیمان اور خطاکار کو اپنے حضور میں دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔" ایک سزاوار مجرم کے اندر خیانت[۱] نفس (Sense of guilt) کے احساس کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے بقول اس احساس کے بغیر تطہیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہنری اول کے عہد میں تو اس بات کو بطور ایک قانونی دفعہ کے ثبت کیا گیا تھا کہ "جرم وہ ہے جس پر ضمیر ملامت کرے"۔ اگر غور اور تامل سے دیکھا جائے تو آج بھی قانون جرائم کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ جو فعل اخلاقی لحاظ سے قابل مذمت ہو قانونی لحاظ سے وہی مستوجب سزا و عقوبت ہے۔ گویا ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لیے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہے۔

---

[۱] ط

فرد اور جماعت

اسی بحث کے دوران میں یہ بنیادی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت — شہری اور ریاست — کے باہمی تعلقات کے حقوق کی تعیین کس طرح سے ہو، حق اور انصاف کوئی مجرد تصورات نہیں ہیں کہ ایک فکری خلا کے اندر ان کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان کا عملی مظاہرہ ایک جماعت یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے وجود ہی کے تحت ہوتا ہے۔ اب ریاست اور معاشرہ کو ایسی بنیادوں پر بھی استوار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں حق اور عدل کا گلا بالکل گھونٹ دیا جائے اور صرف اس کا ذکر خیر ہی باقی رہ جائے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے پھر مذہب کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ مذہب کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے ہمیں پھر ولیم ٹمپل کے الفاظ مستعار لوں گا وہ فرماتے ہیں "مسیحی اخلاقیات اور مسیحی سیاست کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ فرد بحیثیت فرد کے انفرادی اعزاز و احترام کا مستحق ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت خدا کی مخلوق ہے جس سے خدا محبت کرتا ہے، تو معاشرے کے حق میں ایک فرد کی افادیت سے قطع نظر ہر فرد کی ایک مستقل بالذات شخصی قدر و قیمت ہے۔ فرد کا درجہ اولین ہے اور جماعت کا درجہ ثانوی۔ ریاست شہری کے لیے ہے، نہ کہ شہری ریاست کے لیے)۔ عیسائیت نے ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ ریاست کو آخری اور مطلق اقتدار (حاصل نہیں)، بلکہ وہ اپنے اقتدار کو اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتی ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "اقتدار کسی کو حاصل نہیں سوائے اللہ کے، تمام حکمراں خدا کے محکوم ہیں۔" یہی تو وہ سپر ہے جس سے مسلح ہو کر ہمارے آباؤ اجداد نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا تھا۔ سینٹ پال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ریاست تو نیکی کے قیام میں خدا کی نائب ہے (minister of God for good)، جب تک ریاست اپنی مقدس امانت کو ادا کر رہی ہے، اس کی مزاحمت جائز نہیں لیکن جب وہ حد سے تجاوز کر کے اقتدار مطلق (absolute power) کی مدعی بنتی ہے تو اس کی مزاحمت حق بجانب ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن آدمیوں میں جبلّی طور پر جنسی یا بعض دوسرے وحشیانہ جرائم کے ارتکاب کا میلان ہو تو انھیں بانجھ[1] بنا دینا چاہیے۔ یا غیر محدود عرصہ کے لیے انھیں محبوس کر دینا

---

[1] بانجھ کے بجائے "بیکار" کا لفظ شاید مناسب تھا۔ (الفرقان)

چاہیے یا قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن ہمارے ملک میں کسی شہری سے یہ سلوک روا رکھنے کی قانوناً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مذہبی تعلیمات کا ثمرہ ہے۔ مذہب کی رو سے آزادی، زندگی اور زندگی کو وجود میں لانے والے توالد و تناسل کے ذرائع سب مقدس و محترم ہیں۔ جو خدا کا عطیہ ہیں اور جو ہی انھیں ہمیشہ کے لیے واپس لے سکتا ہے، اگر ریاست کو ان عطیات پر ہاتھ ڈالنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہی کچھ ہوگا جو نازی ریاستوں نے کیا یعنی انھوں نے اپنے سیاسی مخالفین پر یہ حربے آزمانے شروع کر دیے، میرے ذہن میں اس مسئلہ کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں ہے کہ ہم مذہب سے رجوع کریں وہی ہمیں بتائے گا کہ شہری اور ریاست کے حقوق میں توازن کی معتدل صورت کون سی ہے۔

جیمز اول (James I) کے عہد میں ایک مشہور معروف واقعہ پیش آیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ بھی مطلق العنان بادشاہ کی طرح انگلستان میں حکومت کر سکتا ہے اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر وہ معاملے میں آخری فیصلہ دے سکتا ہے، لشپ بین کرافت (Bancroft) نے بھی بادشاہ کی تائید کی، لیکن اس زمانہ میں ایک بہت بڑے لارڈ چیف جسٹس تھے ان کا نام تھا لارڈ کوک (Edward Coke) وہ اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے۔ (اور ان کی کثیر مصروفیتوں کے ساتھ تعجب ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر لیتے تھے۔) انھوں نے بادشاہ سے کہا "آپ کو فیصلے چکانے کا کوئی حق نہیں ہے، تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں" بادشاہ نے کہا "میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ تمھارے قوانین کی بنا عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے کمتر عقل ہے؟" چیف جسٹس نے جواب دیا "آپ بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہیں، لیکن قانون کے لیے بڑے تجربے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہے جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے اور خود حضور والا کی حفاظت کی جاتی ہے۔" بادشاہ نے غضبناک ہو کر کہا کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے۔" لارڈ کوک نے برکیٹن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، "بادشاہ کسی آدمی کا محکوم نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا محکوم ہے۔"

دستور کا سنگِ بنیاد

برکیٹن (Bracton) کے الفاظ جو ہمارے قاضی القضاۃ لارڈ کوک نے نقل کیے تھے یہ درحقیقت ہمارے دستور کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں ــــ خدا اور قانون سے بادشاہ کے بالاتر نہ

ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ (Executive) قانون کے ماتحت ہے۔ ہمارے قانون داں جب یہ دستوری کلیہ بیان کرتے تھے تو وہ دراصل اپنا ایک مذہبی عقیدہ دہرا رہے ہوتے تھے۔ اگر ہم اس عقیدے کو فراموش کر بیٹھیں تو ہمارا انجام کیا ہوگا اور اس خود فراموشی کی زد کہاں کہاں جاکر پڑے گی، اس کے دوررس نتائج و عواقب کا مشاہدہ کرنے کے لیے آپ ایک نظر اٹھا کر دنیا کی آمرانہ ریاستوں کو دیکھ لیں، وہاں ریاست کو فرد پر مقدم قرار دے کر فرد کے وجود کو ریاست میں گم کر دیا گیا ہے۔ وہاں شہری ریاست کے لیے زندہ ہے نہ کہ ریاست شہری کے لیے وہاں کے حکمراں خدا اور قانون کے جامع نہیں ہیں، وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہیں، تمام قوانین اور تمام عدالتیں انتظامی مشینری کے کل پرزے ہیں۔ ان کا کوئی مستقل اور آزادانہ وجود نہیں ہے، فرد کی آزادی کی حقیقت خواب و خیال سے بھی کمتر ہے۔ ایسی ہولناک مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف اور حیاتِ انسانی پر ایسے مہیب آہنی تسلط کے خلاف ہمارا مذہب پورے زور اور پوری قوت کے ساتھ احتجاج کرتا ہے۔

اب میں اپنی بحث کو ختم کرتا ہوں، آپ خود دیکھ لیجئے کہ بحث کس نتیجہ پر پہونچ کر ختم ہو رہی ہے۔ بلاشبہ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم حق اور عدل کے متلاشی ہیں تو ہم اسے بحث و مباحثوں اور مناظروں کے ذریعہ سے، مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ دریافت نہیں کر سکتے۔ صداقت اور انصاف تک رسائی نیکوکاری اور دینداری کی وساطت ہی سے ہو سکتی ہے، سچائی اور انصاف کی پہچان روح کو ہے اور روح کو زندگی اور جلا مذہب کے طفیل ہی ملتی ہے۔ قانون تو سچائی اور انصاف کو نافذ اور منطبق کرنے کا محض ایک ناقص اور ادھورا وسیلہ ہے جس کا ظہور صرف خارجی لین دین اور ظاہر کے معاملات میں ہوتا ہے۔ جس دن روئے زمین پر مذہب کا خاتمہ ہو جائے گا اسی دن زمین پر سے سچائی اور عدل کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے دور ہوئے اور دور رہے ہم پر مدتیں دراز گزر چکی ہیں آئیے ہم اس کی طرف لوٹیں، کیونکہ یہی اور صرف یہی ایک شے ہے جو ہمیں بچا سکتی ہے !!۔

(بقیہ ارشادات مجدد الف ثانی ؒ ص ۲۰)

_____ اس آیت میں بھی ملت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراط مستقیم فرمایا گیا ہو اور اس کے علاوہ تمام راستوں کو داخل سُبل کر کے ان پر چلنے سے منع فرما دیا ہو _____ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اظہار شکر، اطلاع خلق اور ہدایت خلق کے طور پر خیر الہدی ہدی محمد (بہترین سیرت سیرت محمدی ہو صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا ہو۔ نیز ارشاد فرمایا ہو ___ اَدَّبنِی رَبِّی فَاَحْسَن تادیبی) ___ میرے رب نے براہ راست میری تربیت کی ہو اور خوب سے خوب تر کی ہو۔

باطن ظاہر کا مکمل کرنے والا ہو ان دونوں میں باہم گر سر مو مخالفت نہیں ___ مثلاً جھوٹ زبان سے نہ بولنا شریعت ہو اور دل میں کذب کا خطرہ نہ آنے دینا طریقت وحقیقت ہو۔ جس کی تفصیل یہ ہو کہ اگر یہ بات اہتمام سے کرنی پڑتی ہو تو طریقت ہو۔ اور اگر بے اہتمام وتکلف میسر ہو تو حقیقت ہو۔ پس فی الحقیقۃ باطن جو کہ بالفاظ دگر طریقت وحقیقت ہو ___ ظاہر کی جو کہ شریعت ہو ___ تکمیل کرنے والا ہو۔ پس سالکان راہ طریقت وحقیقت کو اگر اثنائے سلوک میں ایسے امور ظاہر ہوں جو بظاہر مخالف شریعت ہیں تو اس کو غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا ..... ہر وہ چیز جس میں اخلاق وشمائل محبوب جلوہ گر ہوں بہ تبعیت محبوب۔ محبوب ہو جاتی ہو۔ آیۂ ___ فاتبعونی یحببکم اللہ (اے رسول کہہ دیجئے) میری متابعت کرو اللہ تم کو محبوب بنا لے گا) میں اسی رمز کا بیان ہو ___ پس متابعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں کوشش کرنا مقام محبوبیت تک پہونچاتا ہو، پس ہر عاقل پر ظاہراً و باطناً کمال اتباع رسول میں سعی کرنا لازم ہو _____ ....

(بقیہ "حدیث پرویز" ص ۳۹)

اتفاقی اور ہنگامی طور پر اس قسم کا مظاہرہ ہو جانا عمومی شان "رُحماءُ بینھم" پر ہرگز کوئی دھبہ نہیں لگاتا۔ مگر ہمیں تو یہ ماننے سے بھی انکار ہے کہ یہ تیزی اور سخت کلامی محض نفس بشری کا تقاضہ تھی۔ ہم تو سمجھتے ہیں، اور کوئی دلیل اسکے خلاف نہیں ہے، کہ جس طرح وہ شروع کی نرمی دینی احساسات کا نتیجہ تھی، اسی طرح یہ بعد کی گرمی بھی دینی جذبات کی لائی ہوئی تھی۔ جب ان کی نرمی اور شیریں کلامی انصار کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکی (جو اُن کے نزدیک اسلام کے حق میں نہایت ضرر رساں تھا) اور انھوں نے دیکھا کہ اُن کی نرمی سے کہیں بات قابو سے نکل نہ جائے تو انھوں نے سختی اور گرمی کا رویّہ اختیار کیا _____ اور اس کا منشا اور محرک دین اور صرف دین تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں! _____ اور دین کے لیے آپس میں سختی اور گرمی کو "رُحماءُ

بینہم" کے خلاف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے نہ دین کو سمجھا نہ قرآن کو سمجھا۔ (باقی)

اکتوبر ۱۹۵۹ء

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

[illegible]

ادارۂ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

شائع کیا۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (بسکۂ ہندستان) ۶ر
سالانہ چندہ (بسکۂ پاکستان) ۷ر
ششماہی ۔۔۔۔۔۔ ۳ر

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۔۔۔۔ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵ر

جلد ۲۷ | بابتہ ربیع الاوّل ۱۳۷۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۹ء | شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہِ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی میں آپکے کچھ آنے زائد صرف ہونگے اور رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۰ اکتوبر تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔

(منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔)

تاریخِ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں انکی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

بارہ سال یہ سوچتے سوچتے بیت گئے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مسئلہ کس طرح حل ہو؟ وہ کس طرح باعزت زندگی حاصل کریں؟ کس طرح ان کی نئی نسل کا اپنے دین سے کم از کم اتنا تعلق برقرار رہ سکے جتنا اس وقت مسلمان قوم کا مجموعی طور پر ہے؟ اور کس طرح انکی آئندہ نسلوں کے دین وایمان کے تحفظ کا اطمینان ہو؟

ان مسائل پر بارہ سال سے غور وخوض ہو رہا ہے بلکہ صحیح الفاظ میں ان امور کے بارے میں ایک عام فکرمندی پائی جاتی ہے۔ مگر فکر ونظر کے دائرہ سے نکل کر مستقل مزاجی کے ساتھ کسی عملی اقدام کی نوبت ابتک نہیں آئی ہے۔ دراصل یہی وجہ ہے کہ مسائل جوں کے توں ہیں۔ اور ڈور سلجھنے کے بجائے روز بروز کچھ زیادہ ہی الجھتی جارہی ہے۔ مسائل تمامتر عملی اور تدریجی حل ہونے والے ہیں۔ نہ محض سوچ بچار ان معاملات میں ہمیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ عمل کے میدان میں پہلا قدم رکھتے ہی ہم منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہمیں ایک کسان کی امید، ایک کسان کے صبر، اسکی لگن اور پیہم محنت سے کام لینا ہوگا تب کہیں جاکر ہم کسی خوش آئند حل کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

کسان کو ایک زمین سے فصل لینی ہوتی ہے تو دیکھئے وہ پہلے اس زمین کو توڑتا ہے اس میں بار بار ہل چلاکر اور دوسرے ضروری کام کرکے اسے تخم ریزی کے قابل بناتا ہے۔ پھر بیج چھڑک کر اُسے زمین میں دفن کردیتا ہو۔ دن پر دن گزرتے ہیں اور اس شدید محنت کا کوئی نتیجہ اس کے سامنے نہیں آتا۔ مگر وہ پوری امید کے ساتھ اسے پانی دیتا ہے حتیٰ کہ مہینوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ایک حقیر کونپل کی شکل میں اسکے سامنے آتا ہے۔

کسان کا اصل مقصد اور منتہائے نظر ابھی بہت دور ہوتا ہے مگر وہ گھبراتا نہیں، محنت سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ برابر اسکے ساتھ لگا رہتا ہے۔ یہ مدت مہینوں کی ہوتی ہے جس میں یہ کونپلیں اپنے طبعی ارتقاء کے مدارج طے کرتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ درجہ آجاتا ہے جس میں کسان کے دفن کیے ہوئے دانے خوشہ ہائے گندم بن کر پورے قطعہ زمین پر لہلہانے لگتے ہیں۔ کسان کو اب بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا، مگر وہ پُر امید رہتا ہے۔ صبر سے حصول مقصد کے قدرتی وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اس طرح کچھ اور دن گزر جاتے ہیں، تب کہیں جاکر بالیاں پکتی ہیں اور غلہ کسان کے گھر میں پہنچتا ہے۔

یہ ہے عمل اور اس کے نتائج کا قانون! اگر ہماری نفسیاتی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ عمل کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ عمل کے نتائج چاہتے ہیں لیکن جب غور و فکر کے نتیجہ میں دیکھتے ہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ کہ جتنی دور تک کا عملی پروگرام ہم پہلے ولہ میں بناتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ اس پروگرام کے خاتمہ تک بھی بس عمل ہی عمل ہے کوئی خاص نتیجہ دکھائی نہیں ہو سکے گا، تو ہمت چھوٹ جاتی ہے اور سارا جوش و ولولہ سرد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عمل اور نتائج کا سارا سلسلہ پہلے ہی ولہ میں ہماری نظر میں آجائے کہ ابتداء سے انتہا تک یہ یہ قدم ہم اٹھائیں گے۔ اور اس طرح یہ نتیجہ اس عمل سے نکلتا چلا آئے گا۔ حالانکہ یہ نہ ذکری مقدمات و نتائج کا نہیں بلکہ عملی مراحل اور محسوس نتائج کا ہے۔ اور کسی عملی مسئلہ میں طبعاً یہ ممکن ہی نہیں کہ عمل کے سارے مراحل انتہا تک پہلی نظر میں ہمارے سامنے آجائیں۔ عملی جد و جہد کے مراحل میں محض نظر بس ایک حد تک کام کرتی ہے۔ باقی عملی جد و جہد ہی سے آگے کے راستے فکر و نظر پر کھلتے اور اگلے مراحل کے نقشے طے ہوتے ہیں۔ تو جب ہم سارے عملی مراحل کے نقشے آج طے نہیں کر سکتے، تو کس طرح ممکن ہے کہ ہم عمل اور نتائج کا سارا سلسلہ تصور میں لاکر دیکھ لیں کہ یہ یہ کام اس اس طرح ہوتا چلا جائے گا۔ اور اس طرح سب کچھ دیکھ لینے کے بعد ہم راہ عمل میں قدم اٹھائیں۔

اگر ہمیں عمل کے لیے اس کا انتظار ہے کہ عمل کے سارے مراحل تا نتائج پہلے عالم تصور میں ہم دیکھ لیں تو گویا ہم اس طرح کی ایک انہونی شرط لگا رہے ہیں جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً (ہم تم پر جب ایمان لائیں گے جب اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں)

ہم آج قرآن میں بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ پڑھتے ہیں تو انکی حماقت پر ہنسی آتی ہے، مگر ہم خود

قریب قریب اسی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہیں، بارہ برس کے اس طویل عرصہ سے فکرمندی کے باوجود عمل سے دوری کا جو ہمارا حال ہے وہ دراصل اسی نفسیاتی کیفیت، کا نتیجہ ہے۔ عمل کے میدان میں گامزن ہونے کے لیے ہم جو شرط ذہن میں لیے ہوئے ہیں وہ دراصل اتنی ہی غلط ہے جتنی ایمان کے لیے بنی اسرائیل کی شرط تھی۔ بنی اسرائیل کے اس طرح کے رویّہ نے انھیں کتنا نقصان پہنچایا، اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں، اور ہمارا یہ رویّہ جو نقصان ہمیں پہنچائے گا، وہ اگر اب تک ہم پر مخفی ہے تو آئندہ یقیناً مخفی نہ رہ سکے گا۔

اس تمہید کے بعد ہمیں کہنا یہ ہے کہ نرے غور وفکر اور نری فکرمندی کے چکر سے نکل کر اب ہمیں عمل کی راہ اختیار کرنی چاہیے، ورنہ دن گزرتے چلے جائیں گے اور ہمارے مسائل "روز اوّل" ہی جیسے رہیں گے۔ بلکہ قدرتی طور پر ان کا حل مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا۔ مختلف انسانوں کی مختلف طبعی مناسبتیں ہوتی ہیں۔ کسی کو کسی کام سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کسی کو کسی کام سے۔ ہمارے مسائل متعدد ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ بچوں کی دینی تعلیم کا ہے۔ دوسرا مسئلہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا ہے۔ جس کی کئی شاخیں ہیں۔ اس طرح کے کئی ایک بڑے بڑے مسئلے ہیں۔ ہمیں اپنی طبعی مناسبتوں کے لحاظ سے ان مسائل میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے اور پھر اس کے لیے ابتدائی درجہ کا عملی پروگرام سوچ کر بسم اللہ کر دینی چاہیے۔ یہ اندازا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر کام آل انڈیا پیمانہ پر ہی شروع ہو۔ ہم میں سے بہت سے باصلاحیت اور فکرمند لوگوں کا بہت سا وقت اس انتظار میں بھی ضائع ہوا ہے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم "آل انڈیا" پیمانہ کو چھوڑ کر محدود پیمانوں پر فی الحال اکتفا کریں۔ بلا انتظار مقامی طور پر کام شروع کر دیے جائیں۔ انہی مقامی کاموں میں سے جس جگہ کے کام میں ابھرنے کی صلاحیت ہوگی وہ نمونہ بن کر ابھر جائے گا اور رفتہ رفتہ پورے ملک کے لیے مشعل راہ بن جائے گا اس ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ جلیں گے۔ اور خدا نے چاہا تو پورے ملک کے مسلمانوں کا جمود ٹوٹ جائے گا۔

ماضی میں اسکی کئی ایک مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک مثال دارالعلوم دیوبند کی لے لیجئے۔ یہ ادارہ جو پورے ملک کے لیے دینی رہنما بنا اور قصبے قصبے، قریے قریے اسکی لو سے چراغ جل اٹھے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معارف الحدیث

[اللہ کی توفیق سے معارف الحدیث کی تیسری جلد "کتاب العبادات" زیر تالیف ہے ۔۔۔ چونکہ بہت سی عبادتوں کے لیے طہارت لازمی یا تکمیلی شرط ہے اسلئے حدیث کی اُن کتابوں میں جو مضامین اور ابواب پر مرتب ہوتی ہیں عبادت سے متعلق حدیثوں سے پہلے طہارت سے متعلق حدیثیں درج کرنے کا دستور ہے۔ اس ناچیز نے بھی اس تیسری جلد میں اس دستور کی پیروی کی ہے ۔۔۔ آج پہلی بار اس کے بالکل ابتدائی چند صفحات ناظرین الفرقان کے لیے یہاں دیے جا رہے ہیں ۔۔۔ یہ سلسلہ انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا ۔۔۔]

طہارت و پاکیزگی کی حقیقت اور دین میں اس کا مقام

اسلام میں طہارت و پاکیزگی کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نماز، تلاوتِ قرآن اور طوافِ کعبہ جیسی عبادات کے لیے لازمی شرط ہے بلکہ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجائے خود بھی دین کا ایک اہم شعبہ اور بذاتِ خود بھی مطلوب ہے۔ قرآنِ مجید کی آیت "إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ[1]" (اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور پاک و صاف رہنے والے اپنے بندوں کو محبوب رکھتا ہے)

اور قبا میں رہنے والے اہلِ ایمان کی تعریف میں قرآنِ مجید کا ارشاد "فِيهِ رِجَالٌ

---

[1] البقرہ ع ۲۸۔

یُحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ[۱] " (اس میں ہمارے ایسے بندے ہیں جو بڑے پاکیزگی پسند ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب پاک و صاف رہنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے) ــــــ صرف ان ہی دو آیتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ اسلام میں طہارت و پاکیزگی کی بجائے خود کتنی اہمیت ہو۔ اسی طرح آگے پہلے ہی نمبر پر صحیح مسلم کی جو حدیث درج کی جارہی ہو اُس کے پہلے فقرے " اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ " کا گویا لفظی ترجمہ ہی یہ ہو کہ طہارت و پاکیزگی اسلام کا صرف ایک حکم ہی نہیں ہو بلکہ وہ دین و ایمان کا اہم جزو ہو ــــــ

ہمارے استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی ایک نفیس تحقیق یہاں قابلِ ذکر ہو، اپنی فنیظر کتاب " حجۃ اللہ البالغہ " میں فرماتے ہیں کہ

" اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خاص فضل سے یہ حقیقت سمجھا دی ہو کہ فلاح و سعادت کی جس شاہراہ کی طرف دعوت دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی (جس کا نام شریعت ہو) اگرچہ اس کے بہت سے ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت سیکڑوں ہزاروں احکام ہیں۔ لیکن اپنی اس بے پناہ کثرت کے باوجود وہ سب بس ان چار اصولی عنوانوں کے تحت آجاتے ہیں۔ طہارت، اخبات، سماحت، عدالت۔[۲]

پھر شاہ صاحبؒ نے ان میں سے ہر ایک کی حقیقت بیان کی ہو، جس کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہو کہ بلاشبہ ساری شریعت بس ان ہی چار اصول میں منقسم ہے۔

یہاں ہم شاہ صاحب کے کلام کے صرف اس حصہ کا خلاصہ درج کرتے ہیں جس میں انھوں نے طہارت کی حقیقت بیان فرمائی ہو۔ ــــــ فرماتے ہیں

ایک سلیم الفطرت اور صحیح المزاج انسان جس کا قلب بہیمیت کے سفلی تقاضوں سے

---

[۱] توبہ ع ۱۳ ۔ [۲] باب الاصول التی یرجع الیہا تحصیل الطریقۃ الثانیہ۔ ملخصاً

مغلوب اور اُن میں مشغول نہ ہو، جب وہ کسی نجاست سے آلودہ ہوجاتا ہو، یا اس کو
پیشاب یا پاخانہ کا سخت تقاضا ہوتا ہو یا وہ جماع وغیرہ سے فارغ ہوا ہوتا ہو تو
وہ اپنے نفس میں ایک خاص قسم کا انقباض و تکدر اور گرانی و بے لطفی اور اپنی طبیعت
میں سخت ظلمت کی ایک کیفیت محسوس کرتا ہو پھر جب وہ اس حالت سے نکل جاتا
ہو مثلاً پیشاب یا پاخانہ کا جو سخت تقاضا تھا اس سے وہ فارغ ہوجاتا ہو اور
اچھی طرح استنجا و طہارت کرلیتا ہو، یا اگر وہ جماع سے فارغ ہوا تھا تو غسل کرلیتا ہو
اور اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن لیتا ہو اور خوشبو لگا لیتا ہو تو نفس کے انقباض
و تکدر اور طبیعت کی ظلمت کی وہ کیفیت جاتی رہتی ہو اور اس کے بجائے اپنی
طبیعت میں وہ ایک انشراح و انبساط اور سرور و فرحت کی کیفیت محسوس کرتا ہو۔

—— پس دراصل پہلی کیفیت اور حالت کا نام "حدث" (ناپاکی) اور
دوسری کا نام "طہارت" (پاکی و پاکیزگی) ہے۔ اور انسانوں میں سے جن کی فطرت
سلیم اور جن کا وجدان صحیح ہو وہ ان دونوں حالتوں اور کیفیتوں کے فرق کو واضح
طور سے محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنی طبیعت و فطرت کے تقاضے سے "حدث" کی
حالت کو ناپسند اور دوسری کو (یعنی "طہارت" کی حالت کو) پسند کرتے ہیں
اور نفس انسانی کی یہ طہارت کی حالت ملاء اعلیٰ یعنی ملائکۃ اللہ کی
حالت سے بہت مشابہت و مناسبت رکھتی ہو کیونکہ وہ دائمی طور پر بہیمی
آلودگیوں سے پاک صاف اور اپنی نورانی کیفیات سے شاداں و فرحاں رہتے
ہیں۔ اور اسی لیے حسب امکان طہارت و پاکیزگی کا اہتمام و دوام انسانی روح
کو ملکوتی کمالات حاصل کرنے اور الہامات و منامات کے ذریعہ ملاء اعلیٰ سے
استفادہ کرنے کے قابل بنا دیتا ہو۔ —— اور اس کے برعکس جب آدمی حدث
اور ناپاکی کی حالت میں ڈوبا رہتا ہے تو اس کو شیاطین سے ایک مناسبت و
مشابہت حاصل ہوجاتی ہو اور شیطانی وساوس کی قبولیت کی ایک خاص استعداد
اور صلاحیت اس میں پیدا ہوجاتی ہو۔ اور اس کی روح کو ظلمت گھیر لیتی ہے۔"

حجۃ اللہ البالغہ ص۵۹ ج ۱

شاہ صاحبؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ طہارت اور حدث در اصل انسانی روح اور طبیعت کی مذکورۂ بالا دو حالتوں کا نام ہے اور ہم جن چیزوں کو حدث یا ناپاکی اور طہارت یا پاکیزگی کہتے ہیں وہ در اصل ان کے اسباب و موجبات ہیں اور شریعت ان ہی اسباب پر احکام جاری کرتی اور ان ہی سے بحث کرتی ہے۔

امید ہے کہ طہارت کی حقیقت اور روح انسانی کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت سمجھنے کے لیے شاہ صاحب کا یہ کلام انشاء اللہ کافی ہوگا۔ نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ طہارت و پاکیزگی شریعت کا پورا چوتھائی (¼) حصہ ہے۔

پھر اسی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے ایک دوسرے مقام پر[1] جہاں طہارت کے احکام اور اُن کے اسرار ہی کا بیان ہے فرماتے ہیں۔

> طہارت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حدث سے طہارت۔ (یعنی جن حالتوں میں غسل یا وضو واجب یا مستحب ہے۔ اُن حالتوں میں غسل یا وضو کر کے شرعی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنا) دوسرے ظاہری نجاست اور پلیدی سے جسم یا اپنے کپڑوں کو یا اپنی جگہ کو پاک کرنا۔
>
> تیسرے جسم کے مختلف حصوں میں جو گندگیاں اور میل کچیل پیدا ہوتا رہتا ہے اس کی صفائی کرنا (جیسے دانتوں کی صفائی، ناک کے نتھنوں کی صفائی، ناخن اور زیر ناف بالوں کی صفائی۔)

آگے طہارت کے متعلق جو حدیثیں درج ہوں گی اُن میں سے بعض کا تعلق مطلق طہارت سے ہوگا جو ان تینوں قسموں پر حاوی ہے۔ اور بعض کا تعلق کسی ایک خاص قسم سے ہوگا۔ اس تمہیدی بیان کے بعد اب طہارت سے متعلق حدیثیں پڑھیے۔

طہارت جزوِ ایمان ہے:۔

(۱) عَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ابواب الطہارۃ صفحہ ۱۷۳

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَاٰنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَّالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَّالصَّبْرُ ضِيَاءٌ وَّالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا ـــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طہارت و پاکیزگی جزو ایمان ہو اور کلمہ الحمد للہ میزان اعمال کو بھر دیتا ہو اور سبحان اللہ و الحمد للہ بھر دیتے ہیں آسمانوں کو اور زمین کو، اور نماز نور ہو اور صدقہ دلیل و برہان ہو اور صبر اُجالا ہو اور قرآن یا تو حجت ہو تمھارے حق میں یا حجت ہو تمھارے خلاف۔ ہر آدمی صبح کرتا ہو پھر وہ اپنی جان کا سودا کرتا ہو پھر یا تو اسے نجات دلا دیتا ہو یا اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ ظاہر ہو یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ ہو جس میں آپ نے دین کے بہت سے حقائق بیان فرمائے ہیں۔ اس کا صرف پہلا جزو اور پہلا فقرہ (اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ) طہارت سے متعلق ہو اور اسی کی وجہ سے یہ حدیث کتب حدیث میں "کتاب الطہارۃ" میں درج کی جاتی ہے ـــــ شَطْرٌ کے معروف معنی تو نصف اور آدھے کے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ کسی چیز کے جز اور حصہ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہو۔ اس عاجز کے نزدیک اس حدیث میں وہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہو۔ اور اس بنا پر اس فقرہ کا مطلب صرف یہ ہو کہ طہارت و پاکیزگی دین و ایمان کا جزو اور اس کا ایک حصہ اور شعبہ ہو۔ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کا جو کلام اوپر نقل ہوا ہو اُس سے یہ حقیقت اتنی واضح اور روشن ہو چکی ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

طہارت و پاکیزگی کی یہ اہمیت بیان فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کا اجر و ثواب اور اُس کی فضیلت بیان فرمائی ہو، تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنے کا مطلب اپنے اس یقین کا اظہار اور اس کی شہادت ادا کرنا ہوتا ہو کہ اللہ کی مقدس ذات ہر اُس بات سے پاک اور برتر ہے جو اس کی شان الوہیت کے مناسب نہ ہو ـــــ اور تحمید

یعنی الحمدللہ کہنے کا مطلب اپنے اس یقین کا اظہار اور اس شہادت کا ادا کرنا ہوتا ہو کہ ساری خوبیاں اور سارے کمالات جن کی بنا پر کسی کی حمد و ثنا کی جاسکتی ہو صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات میں ہیں اور اسلیے ساری حمد و ستائش بس اسی کے لیے ہو۔ یہی تسبیح و تحمید اللہ کی نورانی اور معصوم مخلوق فرشتوں کا خاص وظیفہ ہو۔ قرآن مجید میں خود فرشتوں کا یہ بیان خود اُن ہی کی زبانی نقل کیا گیا ہو۔ "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ" (خداوندا! ہم تیری حمد و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں)

پس انسانوں کے لیے بھی بہترین وظیفہ اور مقدس ترین شغل یہی ہوسکتا ہو کہ وہ اپنے اور سارے عالم کے خالق و پروردگار کی حمد و تسبیح کریں۔ ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی ترغیب کے لیے اس حدیث میں فرمایا ہو کہ ایک کلمہ سبحان اللہ میزانِ اعمال کو بھر دیتا ہے۔ اور اس سبحان اللہ کے ساتھ الحمدللہ بھی مل جائے تو ان دونوں کا نور زمین آسمان کی ساری فضاؤں کو معمور و منور کر دیتا ہو۔

سبحان اللہ سے میزانِ اعمال کا بھر جانا اور سبحان اللہ والحمدللہ سے آسمان و زمین کا معمور ہو جانا، یہ اُن حقائق میں سے ہو جن کے ادراک کا حاسہ یہاں ہم سب کو نہیں دیا گیا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں پر اس قسم کی حقیقتوں کو کبھی کبھی یہاں بھی منکشف فرما دیتا ہے، ہم عوام کا حصہ یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہوئی ان حقیقتوں پر ایمان لائیں، ان کا یقین کریں اور ان سے عمل کا فائدہ اٹھائیں۔ حمد و تسبیح کی اس فضیلت اور ترغیب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارہ میں فرمایا ہو کہ "وہ نور ہو" اس دنیا میں نماز کی اس خصوصیت کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی برکت سے قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہو، جس کو اللہ کے وہ بندے خود محسوس کرتے ہیں جن کی نمازیں حقیقی نمازیں ہیں، پھر اسی نور کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی فواحش و منکرات سے بچا ہوا چلتا ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہو۔ "إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" (بلاشبہ نماز میں یہ خاصیت ہو کہ وہ آدمی کو فواحش و منکرات سے روکتی ہو) اور آخرت کی منزلوں میں نماز کی اس نورانیت کا ظہور اس طرح ہوگا کہ وہاں

کی اندھیریوں میں نماز نور اور اُجالا بن کر نمازی کے ساتھ ہوگی ۔ (نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے بارے میں فرمایا ہو کہ وہ دلیل و برہان ہو۔ اس دُنیا میں صدقہ کے بُرہان ہونے کا مطلب بظاہر یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ صدقہ کرنے والا بندہ مومن و مسلم ہے۔ اگر دل میں ایمان نہ ہو تو اپنی کمائی کا صدقہ کرنا آسان نہیں ہے۔ "گر زر طلبی سخن درین است" ـــــ اور آخرت میں صدقہ کی اس خصوصیت کا ظہور اس طرح ہوگا کہ صدقہ کرنے والے مخلص بندے کے صدقہ کو اُس کے ایمان اور اس کی خدا پرستی کی دلیل اور نشانی مان کر اس کو انعامات سے نوازا جائے گا۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کے بارہ میں فرمایا ہے کہ وہ ضیاء" یعنی روشنی اور اُجالا ہے۔ بعض حضرات نے نماز اور صدقہ کی مناسبت سے یہاں لفظ صبر سے روزہ مراد لیا ہو، لیکن ناچیز کے نزدیک راجح یہ ہو کہ صبر یہاں اپنے اصلی اور وسیع معنیٰ ہی میں استعمال ہوا ہو۔ قرآن و حدیث کی زبان میں صبر کے اصل معنیٰ ہیں "اللہ کے حکم کے تحت نفس کی خواہشات کو دبانا اور اس راہ میں تلخیاں اور ناگواریاں برداشت کرتے رہنا" ـــــ اس لحاظ سے صبر گویا پوری دینی زندگی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہو اور اس میں نماز، صدقہ، روزہ اور حج اور جہاد اور ان کے علاوہ اللہ کے لیے اور دین کے احکام کی پابندی میں ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنا اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اسی کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ صبر "ضیاء" ہو قرآن مجید میں چاند کی روشنی کو "نور" اور سورج کی روشنی کو "ضیاء" فرمایا گیا ہے۔ (هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا۔ (یونس ع ۱)) اس لحاظ سے صبر اور نماز سے پیدا ہونے والی روشنیوں میں وہ نسبت ہوگی جو سورج اور چاند میں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے بارہ میں فرمایا ہو کہ وہ یا تو تمھارے واسطے اور تمھارے حق میں دلیل و حجت ہے یا تمھارے خلاف!

—— مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام اور اسی کا ہدایت نامہ ہے۔ اب اگر تمھارا تعلق و رویہ اس کے ساتھ عظمت و احترام اور اتباع کا ہوگا جیسا کہ ایک صاحب ایمان کا ہونا چاہیے، تو وہ تمھارے لیے شاہد و دلیل بنے گا اور اگر تمھارا رویہ اس کے برخلاف ہوگا تو پھر اس کی شہادت تمھارے خلاف ہوگی۔

ان سب تنبیہات و ترغیبات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں ارشاد فرمایا ہو کہ اس دنیا کا ہر انسان خواہ وہ کسی حال اور کسی شغل میں زندگی گذار رہا ہو وہ روزانہ اپنے نفس اور اپنی جان کا سودا ضرور کرتا ہو، پھر یا تو وہ اس کو نجات دلانے والا ہے یا ہلاک کرنے والا ہے —— مطلب یہ ہو کہ انسان کی زندگی ایک مسلسل تجارت ہے، اگر وہ اللہ کی بندگی اور رضا طلبی والی زندگی گزار رہا ہو تو اپنی ذات کے لیے بڑی اچھی کمائی کر رہا ہو اور اس کی نجات کا سامان فراہم کر رہا ہو اور اگر اس کے برعکس وہ نفس پرستی اور خدا فراموشی کی زندگی گزار رہا ہو تو وہ اپنی تباہی اور بربادی کا رہا ہے۔ اور اپنی دوزخ بنا رہا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم کو ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ترغیبات و تنبیہات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ و تلخیص از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۱۴۴) سیادت پناہ شیخ فرید بخاری[1] کے نام۔

فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

تصدیقِ شریعتِ محمدی کی اہمیت اور ترغیبِ سنت کے بیان میں

مرحمت نامۂ گرامی عزیز ترین زمانے میں آیا اس کے مطالعے سے مشرف ہوا، اللہ کا شکر ہے کہ فقر محمدی کی میراث آپ کو حاصل ہے نہ درویشوں سے محبت اور ان سے تعلق رکھنا اسی کا نتیجہ ہے ــــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ گرامی نامے کے جواب میں یہ بے سروساماں کوتاہ عمل کیا لکھے، بجز اسکے کہ چند ماثور و منقول فقرے آپکے جد بزرگوار خیر العرب والعجم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و محامد میں رقم کرے اور اس سعادت نامے کو اپنے لیے وسیلۂ نجاتِ اخروی بنائے ــــ

---

[1] شیخ فرید بخاریؒ ــــــ آپ کا نسب نو واسطوں سے حضرت سید جلال الدین اعظم حسینی بخاریؒ تک پہونچکر ستائیس واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہو۔(ماخوذ از نسب نامہ سادات بخاری قلمی کتب خانہ دار العلوم ندوہ لکھنؤ)ــ

حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے زمانۂ قیام لاہور میں ان کے اخراجات کا ظاہری تکفل شیخ فرید بخاری نے کیا ــــــ (جامع السلاسل قلمی کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس توصیف ومنقبت کی برکت سے خود میرا کلام قابل تعریف بن جائے گا۔
جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے :۔

ما إن مدحتُ محمّداً بمقالتی
لکن مدحتُ مقالتی بمحمّدٍ

(یعنی میں اپنے کلام سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح نہیں کرتا
بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دراصل اپنے کلام کی تعریف کرتا ہوں ۔)
اب منقبت رسول اکرمؐ لکھتا ہوں ـــــ اللہ تعالیٰ مجھے لغزش سے محفوظ رکھے اور نیک توفیق عطا فرمائے۔
بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولاد آدم کے سردار ہیں اور قیامت میں تمام

(بقیہ حاشیہ صــ) مکتوبات امام ربانی میں کئی جگہ اشارات ملتے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کی خانقاہ دہلی کے بھی اخراجات اور طالبین ومقیمین کی نگہداشت کا شیخ فرید بخاری سے تعلق تھا ـــــ
علامہ حکیم سید عبد الحیٔ صاحب حسنی رائے بریلویؒ نے شیخ فرید کے جو حالات تحریر فرمائے ہیں، ان میں سے اکثر حصے کا ترجمہ بطور خلاصہ حسب ذیل ہے :۔
نواب فرید مرتضیٰ خاں ـــ اپنے زمانہ میں سیاست، تدبر، اور سخاوت وکرم میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ اہل فضائل سے محبت رکھتے تھے اور اعلیٰ امور کے انجام دینے کی طرف میلان تھا ـــ اکبر بادشاہ کے دربار میں درجۂ امارت پر پہونچے اور ترقی کر کے میر بخشیگری کا عہدہ پایا ـــ جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے ان کے منصب میں اضافہ کیا۔ صاحب السیف والقلم کا خطاب دیا۔ پھر مرتضیٰ خاں کے لقب سے ملقب کیا ـــ گجرات کا حاکم بنایا وہاں چار سال حکومت کی پھر پنجاب کا حاکم بنایا وہاں مدت العمر حاکم رہے ـــــ
شیخ فرید بخاری نے شجاعت وسخاوت کو اس طرح جمع کیا تھا کہ اس وقت ان کا اس جامعیت میں کوئی مساوی نہ تھا۔ خوافی نے مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ ان کے دربار کا سائل کبھی نامراد نہیں گیا۔ اپنے ہاتھ سے فقراء کو درہم ودینا تقسیم فرماتے تھے اور بعض اوقات اپنی قبا، چادر اور جو کچھ پاس ہوتا سب دے دیتے تھے ـــ ایک مرتبہ ایک سائل سات دفعہ ان کے پاس آیا اور ہر دفعہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انبیاء کرام کے مقابلے میں آپؐ کے متبعین زیادہ تعداد میں ہوں گے ـــــ آپ اللہ کے نزدیک تمام اولین و آخرین میں مکرم و معظم ہیں ـــــ قیامت قائم ہونے پر سب سے پہلے آپ ہی اپنے مرقد مبارک سے اٹھیں گے ـــــ آپ سب سے پہلے شفاعت کرنے والے ہونگے اور آپ کی شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی ـــــ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کو آپ کے لیے کھولے گا ـــــ قیامت میں آپ لواءِ حمد کو اٹھائے ہوئے ہوں گے اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ سب اُس جھنڈے کے نیچے ہوں گے ـــــ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے " کہ ہم (میں اور میری امت)

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اس کو عطا فرمایا ـــــ بیواؤں، متوکلوں اور اہل حاجت کی یومیہ اور سالانہ ہر طریقے پر امداد کرتے تھے۔ وظائف تقرار کی حاضری اور غیر حاضری ہر دو صورتوں میں پہونچتے تھے ـــــ یتیموں کی کفالت اور پرورش اس طرح کرتے تھے جس طرح باپ پرورش کرتا ہے ـــ یتیموں کے لیے معلمین مقرر کیے تھے جب یتیم بچے شیخ فرید کی گود میں کھیلتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ گجرات میں کئی عمارتیں ان کی یادگار ہیں ان میں سے احمد آباد میں ایک جامع مسجد ہے جو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ کے مقبرے کے پاس ہے اور ایک محلہ ہے جو بخاری محلہ کے نام سے موسوم ہے ـــــ دلی کے قریب فریدآباد ان ہی کا بسایا ہوا ہے اس میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائی تھیں اور سرسبز و شاداب باغات لگوائے تھے ـــــ لاہور میں بھی ان کا آباد کیا ہوا ایک محلہ ہے اور ایک حمام ـــــ علاوہ ازیں بےشمار سرائیں مختلف شہروں میں بنوائی تھیں ـــــ ان کے دسترخوان پر روزانہ پندرہ سو آدمی کھانا کھاتے تھے ـــ علاوہ ازیں اپنے سامنے غریبوں کو راشن تقسیم کراتے اور اُن کے شور و غل سے تنگدل نہ ہوتے تھے۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا ان کے فضائل کثیرہ میں سے بہت تھوڑا ہے۔ اگر تفصیل درکار ہو تو ماثر الامراء کا مطالعہ کیا جائے۔

نزہۃ الخواطر جلد خامس صفحہ ۴۰۱ و ۴۰۲

کتب تاریخ و تذکرہ میں، شیخ فرید، شیخ فرید دہلوی اور شیخ فرید بخاری تینوں طرح سے مشہور ہیں۔ اکبرنامہ میں "شیخ فرید بخشی بیگی" بھی ہے ـــ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متعدد مکتوبات آپ کے نام ہیں اور سب اہم ہیں۔

(فریدی)

ظہور کے لحاظ سے آخر میں ہیں لیکن قیامت کے دن آگے ہوں گے، یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں کہتا (بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے انعام کا اظہار کرتا ہوں) ـــــ میں اللہ کا حبیب ہوں، میں مرسلین و انبیاء کا قائد ہوں اور یہ بات بھی فخراً نہیں کہہ رہا ـــــ میں سلسلۂ انبیاء کا ختم کرنے والا آخری نبی ہوں ـــ اس پر بھی فخر نہیں ـــــ میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں ـــــ اللہ نے انسانی مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے ان سب سے بہتر پیدا کیا پھر اس مخلوق کو دو حصّوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اُن میں سے بہترین پیدا کیا، پھر قبائل بنائے تو بہترین قبیلے میں مجھے پیدا کیا پھر اس قبیلے کی شاخیں بنائیں تو اُن میں سے مجھے بہترین شاخ میں پیدا کیا۔ پس از روئے نفس اور بنظر قبیلہ و بیت میں سب میں بہتر ہوں ـــــ (یہ مجھ پر اللہ کا انعام ہو) ـــــ قیامت میں سب سے پہلے قبر سے برآمد ہونے والا میں ہی ہوں گا ـــــ جب لوگ درگاہ خداوندی میں آئیں گے تو میں اُن کا قائد ہوں گا ـــــ جب وہ کلام نہ کر سکیں گے میں کلام کرنے والا ہوں گا اور جس وقت تمام لوگ میدان محشر میں پریشان و محبوس کھڑے ہوں گے میں ان کی شفاعت (شفاعت گومی) کروں گا جب وہ ناامید ہو جائیں گے میں ان کو بشارت دینے والا ہوں گا ـــــ اس روز کرامت و بزرگی اور کلید ہائے جنت میرے ہاتھ میں ہوں گی ـــــ تنا رحق کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا ـــــ نزد خدا میں فرزندانِ آدم میں گرامی ترین ہوں .... اور جب قیامت کا دن ہوگا تو میں امام انبیاء، خطیب انبیاء اور صاحبِ شفاعت ہوں گا اور ان سب خصوصیات پر مجھے کچھ بھی فخر نہیں ہے" (بلکہ یہ صرف اظہار نعمت کے لیے کہہ رہا ہوں)

(در اصل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باعث تخلیق عالم ہیں آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا اور نہ اللہ تعالےٰ (مخلوق پیدا کر کے) اپنی ربوبیت کا اظہار کرتا ـــــ آپ اس وقت نبی تھے جب آدم علیہ السلام کا پتلا بھی تیار نہیں ہوا تھا ـــــ

چہ غم دیوارِ امت را کہ دارد چنیں سیّدِ پیشرو
نماند بعصیاں کسے در گرد

ایسے عظیم الشان پیغمبرؐ کی تصدیق کرنے والے یقیناً خیر الامم ہونے چاہئیں ـــــ چنانچہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (الآیہ) (تم بہترین امت ہو اے تصدیق کنندگانِ مصطفےٰ!

جس کو لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے) کا امتیاز اُن کے لیے "نقدِ وقت" ہے — اس کے مقابلے میں آنحضرتؐ کی تکذیب کرنے والے (ظاہر ہے) بدترینِ بنی آدم ہیں — آیۂ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا — (منکر بدّو سخت ترین ہیں کفر اور نفاق میں) ایسے لوگوں کی نشاندہی کر رہی ہے — دیکھا چاہیئے کس خوش نصیب کو اتباعِ سنت کی دولت سے نوازتے ہیں اور متابعت شریعت سے سرفراز کرتے ہیں — اِس (پُر آشوب) زمانے میں کئے ہوئے اس "عملِ قلیل" کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی تصدیق کے ساتھ انجام دیا جائے "عملِ کثیر" کے درجے میں رکھا جائے گا —

اصحابِ کہف نے جو اعلیٰ درجات حاصل کیے وہ صرف ایک نیکی کی بنا پر ہی تو حاصل کئے تھے (جو بروقت ہوئی تھی) اور وہ نیکی نورِ ایمان و یقین کے ساتھ ہجرت تھی، ایسے وقت میں جبکہ معاندین و مخالفین حق کا غلبہ ہو رہا تھا — مثال کے طور پر لکھتا ہوں کہ سپاہی اگر دشمنوں کے غلبے کے زمانے میں (وفاداری کے ساتھ) تھوڑی سی جد و جہد بھی کرتے ہیں تو وہ جد و جہد بہت ہی نمایاں اور قابلِ قدر ہوتی ہے برخلاف زمانۂ امن کے اس زمانے کی جد و جہد لوڑ فاوا کی کا دنیا اعتبار نہیں ہوتا — علاوہ ازیں چونکہ آنسرورؐ، محبوبِ رب العٰلمین ہیں اس لیے آپ کے متبعین، متابعت کے طفیل میں محبوبیت کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں — قاعدہ ہے کہ محب، جس کسی کو اپنے محبوب کے اخلاق و شمائل پر دیکھتا ہے اس کو محبوب رکھتا ہے — مخالفین دین کی بدبختی کا بھی یہیں سے اندازہ کرنا چاہیئے۔

محمد عربی کابروئے ہر دو سراست کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

اگر ہجرت ظاہری میسر نہیں تو "ہجرت باطنی" کو بہت زیادہ ملحوظ رکھا جائے کہ لوگوں کے ساتھ بظاہر تو رہیں اور درحقیقت اُن کے ساتھ نہ ہوں (اُن کا غلط رنگ قبول نہ کریں) اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے آبا کرام کے راستے پر ثابت قدم رکھے — علیہم السلام الی یوم القیامہ۔

مکتوب (۴۵) سیادت پناہ شیخ فرید کے نام

(یہ مکتوب بعد وفات پیر و مرشد جامعیتِ انسان اور فضائلِ رمضان کے بیان میں تحریر فرمایا ہے۔)

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے آباء کرام کے طریقے پر ثابت قدم رکھے اور موجباتِ تاسف سے محفوظ رکھے ـــــــ "المرءُ مع من احبّ" (انسان اس کے ساتھ ہے جس سے محبت رکھتا ہے) اس حدیث کی رو سے دوستانِ خدا، خدا کے ساتھ ہیں ـــــــ البتہ بدن کا تعلق (دنیاوی زندگی) اس معیّت و اتصال کے لیے کچھ مانع ہے ـــــــ اس پیکرِ جسمانی سے جدا ہونے کے بعد (بعدِ موت) تمام تر قرب اندر قرب اور وصال در وصال حاصل ہو جاتا ہے۔ الموتُ جِسْرٌ یوصِلُ الحبیبَ الی الحبیب (موت ایک پل ہے جو حبیب کو حبیب سے ملاتا ہے) ـــــــ یہ مقولہ اسی معنیٰ کا بیان ہے اور آیہ ـــ مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللهِ لَآتٍ ـــــــ (جو اللہ کی ملاقات کی توقع رکھتا ہے پس وعدۂ خدا البتہ آنے والا ہے) ـــــــ جو کہ دراصل مشتاقوں کے لیے پیغامِ تسلّی ہے ـــــــ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ـــــــ لیکن ہم پسماندگان کا حال بزرگوں کی صحبت و حضوری کی دولت حاصل ہوئے بغیر ـــــــ خراب و خستہ ہے ـــــــ رہا، روحانیت اکابر سے فائدہ اٹھانے کا معاملہ ـــــ وہ شرائط کے ساتھ مشروط ہے ہر کسی کو اُن شرائط کے پورا کرنے کی طاقت نہیں ہے ـــــــ مگر اللہ کا شکر ہے کہ باوجود اس حادثہ جانکاہ (وفاتِ حضرت خواجہ باقی باللہؒ) کے ان فقرائے بے سروپا کے ایک مربی و معین (ظاہری اسباب کے لحاظ سے) سرورِ دین و دنیا صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے (شیخ فرید) موجود ہیں جو اس سلسلہ نقشبندیہ کی جمعیت کا سبب بن گئے ہیں ـــــــ بیشک یہ نسبت علیہ اس ملک میں بہت ہی نادر و اجنبی سی ہے اور اسکے حامل اس علاقے میں اقلِ قلیل ہیں مگر چونکہ وہ (بطریقِ اہل بیت حضرت صدیق اکبرؓ تک منتہی ہو کر) اہل بیت سے منسوب ہیں اس لیے اس کا مربی ظاہر بھی اہل بیت میں سے ہونا مناسب ہے .... آدمی جس طرح جمعیت باطن کا محتاج ہے جمعیت ظاہری کا بھی محتاج ہے بلکہ یہ دوسری احتیاج، مقدم ہے (ورنہ ـــ پراگندہ روزی پراگندہ دل) ـــــــ انسان تمام خلائق میں سب سے زیادہ محتاج واقع ہوا ہے اور یہ شدتِ احتیاج اُس کے اندر اسکی جامعیت کی وجہ سے آئی ہے ـــــــ جتنا اور سب مخلوق کو درکار ہے اتنا اس ایک انسان کو درکار ہے ـــ اور جس چیز کا وہ محتاج ہے اس سے تعلق بھی رکھتا ہے

اس لحاظ سے اس کے تعلقات سب مخلوق سے زیادہ ہیں اور ہر تعلق، جناب قدس سے روگردانی کو مستلزم ہے ــــ پس اس حیثیت سے جمیع خلائق میں بدترین بھی یہی انسان ہے ــــ اور حال یہ ہے کہ اسکی جامعیت ہی جمیع خلائق سے افضلیت کا باعث بنی ہوئی ہے اس لحاظ سے اس کا آئینہ اتم و اکمل ہے، جو کچھ تمام مخلوقات کے آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے اس ایک آئینے میں وہ سب کچھ آشکارا ہے ــــــ لہٰذا ایک حیثیت سے انسان بہترین خلائق ہوا اور دوسری حیثیت سے بدترین موجودات .... اس میں شک نہیں کہ توفیق خداوندی ان فقراء کی جمعیت ظاہری کے کفیل آپ ہیں اور جمعیت باطنی میں بھی الولد سر لابیہ (بیٹا باپ کا آئینہ دار ہوتا ہے) کی رو سے امیدواری تمام ہے ــــــ چونکہ عنایت نامہ گرامی ماہ رمضان میں صادر ہوا ہے اس لیے دل میں آیا کہ رمضان المبارک کے کچھ فضائل بھی لکھ دیے جائیں ــــــ رمضان کا مہینہ ایک عظیم الشان مہینہ ہے ــــ اس مہینے میں جو عبادات نافلہ از قسم نماز و ذکر و صدقہ ادا ہوتی ہیں وہ ثواب میں دوسرے ایام کے فرضوں کی برابر ہیں ــــــ اور اس ماہ میں ایک فرض ادا کرنا دوسرے مہینے کے ستر فرضوں کے مساوی ہوتا ہے ــــــ اس ماہ میں جو کسی روزہ دار کو افطار کراتا ہے اس کی گردن آتش دوزخ سے آزاد کر دی جاتی ہے ــــــ اور اس افطار کرانے والے کو اس روزہ دار کے اجر کے مثل عطا فرماتے ہیں بغیر اسکے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی نقصان واقع ہو ــــــ جو شخص اس ماہ مبارک میں اپنے نوکر، ملازم کے کاموں میں تخفیف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی بخشش فرماتا ہے اور دوزخ سے رہا کرتا ہے ــــــ ماہ رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو رہا فرما دیتے تھے اور جو کوئی جس شے کا سوال کرتا عطا فرماتے ــــــ جس شخص کو اس ماہ میں اعمال صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے، تمام سال توفیق اسکے شامل حال رہتی ہے ــــ اگر یہ مہینہ کوتاہ عملی میں گذر گیا تو تمام سال کوتاہی رہتی ہے۔ حتی المقدور اس ماہ میں جمعیت قلب کی کوشش کرنا چاہیئے اور اس ماہ کو غنیمت سمجھنا چاہیئے ...... اس ماہ میں دروازے بہشت کو کشادہ کیا جاتا ہے اور دروازے دوزخ کے بند ــــ شیاطین کو اس ماہ میں سکڑ بند کر دیا جاتا ہے ــ ــــ افطار (یعنی بعد غروب) جلدی کرنا اور سحری میں

تاخیر کرنا سنت ہے ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں بہت اہتمام فرماتے تھے، شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ تاخیر سحری اور تعجیل افطار میں بندے کے عجز و احتیاج کا اظہار ہوتا ہے اور یہ امر مقام بندگی کے بہت مناسب ہے ــــ خرما سے افطار کرنا سنت ہے ــــ آنحضرت افطار کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے ــــ ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی ــــ یعنی پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہو گئیں اور اجر بھی اللہ نے چاہا تو ثابت و مقرر ہو گیا ــــ ادائے تراویح اور ختم قرآن اس ماہ میں سنت موکدہ ہے۔ اس سے عمدہ نتائج پیدا ہوتے ہیں ــــ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اِن باتوں کی توفیق دے .... حضرت قبلہ گاہی (حضرت خواجہ باقی باللہؒ) فرمایا کرتے تھے کہ "حقوق شیخ فرید ہم سب پر لازم ہیں (کیونکہ دراصل) اس جمعیت باطنی کے باعث وہی ہیں" ــــ اللہ تعالیٰ ہمیشہ توفیقِ اعمالِ حسنہ عنایت فرمائے ــــ بحرمۃِ النبی وآلہ الامجاد علیہ وعلیہم الصلوات والتسلیمات ــــ

مکتوب (۱۴۶) سیادت پناہ شیخ فرید بخاری کے نام

اس بیان میں کہ وجود باری، توحید باری، رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام وہ احکام جو آنحضرتؐ اللہ کی طرف سے لے کر آئے سب کے سب بدیہی ہیں کسی نظر و دلیل کے محتاج نہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے آباء کرام کے راستے پر ثابت قدم رکھے ــــ وجود باری تعالیٰ اور ایسے ہی توحید باری بلکہ نبوت محمد رسول اللہؐ بھی بلکہ تمام وہ احکام جن کو آنحضرتؐ اللہ کی طرف سے لے کر آئے سب کے سب بدیہی ہیں ــــ اگر قدرت مدرکہ "آفات ردیہ" اور "امراض معنویہ" سے محفوظ ہے تو ان امور بالا کے اثبات کے لیے کسی فکر اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

نظر و فکر کی ضرورت تو اس وقت تک ہے جب تک علت و آفت کا وجود ہے ــــ مرض قلبی سے نجات ملنے کے بعد اور آنکھوں سے پردہ اٹھنے کے بعد یہ امور سب کے سب

بدیہی ہیں ــــــ مثال کے طور پر اس شخص کو پیش کیا جا سکتا ہے جس پر صفرا کا غلبہ ہے وہ جبتک بیماری صفرا میں گرفتار رہے، قند و نبات کی شیرینی اسکے نزدیک محتاج دلیل ہے لیکن جوں ہی مرض سے نجات مل گئی اس کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی .... یہ بات مسلّم ہو کہ استدلال کا میدان بہت تنگ ہے اور دلیل کے راستے سے یقین حاصل ہونا بہت مشکل ہے" ــــــ

پس ایمان یقینی حاصل کرنے کے لیے مرض قلبی کا دور کرنا لازمی ہے ــــ صفرا کے ایک مریض کے لیے، مرض صفرا کا دور کرنا ــــ شیرینیٔ قند کا یقین حاصل کرنے کے لیے زیادہ ضروری ہے بمقابلہ اسکے کہ شیرینی قند کے یقین کے لیے دلیل قائم کرے ــــ بھلا اس کو دلیل کے ذریعے کس طرح یقین حاصل ہو گا اس کا ذائقہ تو مرض صفرا کی بنا پر قند و شکر کی تلخی کا حکم لگا رہا ہے ــــ اسی طرح اس مسئلے کو جس کا ذکر کیا جا رہا ہے سمجھئے ــــ نفس امّارہ بالذات احکام شرعیہ کا منکر ہے پس ان احکام صادقہ کے یقین کو حاصل کرنا باوجود انکار وجدان بہت ہی دشوار ہے ــــ لہٰذا نفس کا تزکیہ ضرور ہوا ــــ یقین بغیر تزکیہ کے حاصل کرنا مشکل ہے ــ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا یعنی فلاح یاب اور کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور ٹوٹے میں رہا وہ جس نے اس کو پستی میں ڈالا ــــ پس ثابت ہوا کہ اس شریعت ظاہرہ و طاہرہ کا منکر ایسا ہی ہے جیسا کہ حلاوتِ نبات و قند کا منکر ــــ

خورشید نہ مجرم ار کسے بینا نیست

اگر کوئی نابینا ہے تو آفتاب کا کیا قصور؟ ــــ سیر و سلوک، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب سے مقصود آفاتِ معنویہ اور امراض قلبیہ کا ازالہ ہے تاکہ حقیقتِ ایمان حاصل ہو جائے ــ آیت کریمہ ــ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (یعنی ان منافقین کے دلوں میں مرض ہے) اس مرض قلبی کا پتہ دے رہی ہے ــــ آفات معنویہ کی موجودگی میں اگر ایمان ہے بھی تو ظاہری ایمان ہے اور بس ــــ اس لیے کہ نفس امارہ ایمان کے خلاف حکم لگا رہا ہے ــــ اور اپنے کفر کی حقیقت پر اصرار کر رہا ہو ــــ اس ایمان ظاہری اور تصدیق صوری کی مثال ایسی ہے جیسا کہ صفرا والے کو حلاوتِ قند و نبات کا ظاہری

یقین ہو جائے درآنحالیکہ خود اُس کا ذوق و وجدان اس کے یقین کے خلاف گواہی دے رہا ہے ـــــ اُس کو تو شیرینی کا یقینِ حقیقی اسی وقت حاصل ہو گا جب مرض صفرا کی جڑ کٹ جائے گی ـــــ اسی طرح تزکیۂ نفس اور اطمینانِ نفس کے بعد حقیقتِ ایمان ظہور پذیر ہوتی ہے اور وجدانی بنتی ہے ـــــ ایسا ایمان زوال سے محفوظ رہتا ہے ـــــ آیہ ـــــ الا انَّ اَولِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ـــــ (آگاہ ہو بیشک اللہ کے دوستوں پر خوف وحزن نہیں ہو گا) ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو ایسے ہی ایمانِ کامل سے مشرف فرمائے بحرمۃ النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۴۷) سیادت پناہ شیخ فرید بخاری کے نام

عہد اکبری کی شکایت میں اور اس بارے میں کہ بادشاہت کے اس نئے دور (عہد جہانگیری) میں شریعت کی ترویج کی جدوجہد میں دیر نہ کیجئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جادہ آباء کرام پر ثابت قدم رکھے ـــــ بادشاہ کی مثال عالم کے اندر ایسی ہے جیسا کہ دل، بدن کے اندر ہے اگر دل صحیح ہے، بدن صحیح ہے اور دل فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہے ـــــ درستی بادشاہ دراصل درستی عالم ہے اور بادشاہ کا بگڑنا عالم کا بگڑنا ہے ـــــ آپ واقف ہیں کہ دورِ ماضی (عہد اکبری) میں اہل اسلام پر کیا کچھ گذری ہے ـــــ اہل اسلام کی خرابی ابتدائے اسلام میں باوجود انتہائی کس مپرسی کے اس سے آگے نہ بڑھی تھی کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور غیر مسلم اپنے دین پر لکم دینکم ولی دین ـــــ سے یہ بات ظاہر ہے ـــــ مگر دورِ گذشتہ (عہد اکبری) میں مخالفین اسلام کھلم کھلا بطور غلبہ دار اسلام میں احکام کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار سے عاجز تھے اگر اظہار کی جرأت کرتے تھے قتل ہو جاتے تھے ـــــ واویلا، وامصیبتا واحسرتا، واحزنا ـــــ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ محبوب رب العالمین ہیں ان کی تصدیق کرنے والے ذلیل وخوار تھے اور اُن کے منکر درجۂ عزت واعتبار پر فائز تھے ـــــ مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ غمگساری اسلام میں تھے اور معاندین مذاق اور تمسخر سے ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے ـــــ آفتاب ہدایت، ضلالت کے پردے میں چھپ گیا تھا

اور نورِ حق، باطل کے حجاب میں یکسو ہو گیا تھا ـــــ اس زمانے میں کہ جب مانعِ دولت اسلام کے زائل ہونے کی خوشخبری اور بادشاہ اسلام کے جلوس کا مژدہ ہر خاص و عام کے کان میں پہونچا ہے۔ اہلِ اسلام لازم جانتے ہیں کہ بادشاہ کے مدد و معاون ہوں اور ترویج شریعت اور تقویتِ ملت کی راہ دکھائیں ـــــ یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے ہو یا ہاتھ سے ـــــ سب سے بڑی مدد مسائل شرعیہ کی وضاحت اور اظہار عقائد کلامیہ "بطورِ کتاب و سنت و اجماع" ہے۔ تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ درمیان میں آکر دین کا راستہ نہ لوٹ سکے اور کام نہ بگڑے ـــــ یہ امداد ان علماء حق کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ آخرت کی طرف رُخ رکھتے ہیں ـــــ علماء دنیا جو کہ اپنا نصب العین صرف دنیا کو بنائے ہوئے ہیں ان کی توصحبت بھی زہر قاتل ہے، اور ان کا فساد، فساد متعدی ہے۔

عالمے کہ کامرانی و تن پروری کند ‏ ‏ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

زمانۂ گزشتہ میں جو مصیبت اہل اسلام کے سر پر آئی وہ ان علماء سوء کی نحوست ہی کا کرشمہ تھا بادشاہوں کو یہی علماء سوء راہ حق سے ہٹا دیتے ہیں ـــــ بہتّر فرقے جنھوں نے راہِ ضلالت اختیار کی ان کے سربراہ اور سرغنہ یہی علماء سوء تھے ـــــ علماء سوء کے علاوہ جو بھی راہِ ضلالت پر چلا اس کا بگاڑ بہت کم دوسروں تک متعدی ہوا ہے۔ اس زمانے کے اکثر "جہلائے صوفی نما" بھی علماء سوء کے حکم میں ہیں ان کا بگاڑ بھی متعدی ہے ـــــ اگر کوئی شخص باوجود ہر قسم کی مدد کی استطاعت وطاقت کے امداد دین میں کوتاہی کرے گا اور اس کوتاہی کے نتیجے میں کارخانۂ اسلام میں خلل واقع ہوگا تو وہ کوتاہی کرنے والا اللہ کے عتاب میں مبتلا ہوگا اس بنا پر یہ قلیل البضاعۃ بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو دولتِ اسلام کے معاونین کی جماعت میں رکھے اور اس بارے میں کچھ ہاتھ پاؤں مارے ـــــ من کثّر سواد قوم فھو منھم (جو جس جماعت کی تعداد میں اضافہ کرے وہ اسی میں سے ہے) اس حدیث کی رو سے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اس بے استطاعت کو بھی جماعت کرام (معاونین اسلام) میں داخل کر دیں ـــــ اپنی مثال اس بڑھیا کی سی کھتا ہوں جس نے ایک سوت کی انٹیا لے کر خود کو حضرت یوسف علیٰ نبینا و علیہ السلام کے خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیا تھا ـــــ امید ہو کہ عنقریب انشاء اللہ العزیز آپ سے ملاقات کا

شرف حاصل کروں گا ـــــ آپ کی بلندیٔ مرتبہ سے امید ہے کہ جب کہ آپ کو اللہ تعالےٰ نے پوری طاقت دی ہے اور بادشاہ کا قرب نصیب فرمایا ہے تو خلوت وجلوت میں برابر ترویج شریعت محمدی کے سلسلہ میں کوشاں رہیں گے اور مسلمانوں کو ذلت وخواری اور پستی سے نکالیں گے

مکتوب (۴۸) سیادت دستگاہ شیخ فرید بخاری کے نام

(علماء وطلباء علوم دین کی قدر ومنزلت میں)

اللہ تعالےٰ دشمنوں کے مقابلے میں آپ کی مدد کرے بحرمتہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ـــ مرحمت نامۂ گرامی جو فقیر کو بھیجا گیا تھا اس کے مطالعہ سے مشرف ہوا ـــــ مولانا محمد قلیچ کے خط میں آپ نے لکھا تھا۔ "کچھ خرچ طالب علموں اور صوفیوں کے لیے بھیجا گیا" ـــــ اس عبارت میں طالب علموں کی تقدیم، صوفیوں پر بہت زیبا معلوم ہوئی ـــ الظاہر عنوان الباطن (ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے) کے اعتبار سے امید ہے کہ آپ کے باطن میں بھی طلباء علم دین کی جماعت، تقدیم رکھتی ہوگی۔ کوزے سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔

از کوزہ ہماں تراود کہ در وست

طالب علموں کے مقدم رکھنے میں شریعت کی ترویج پوشیدہ ہے ـــ حاملان شریعت یہی لوگ ہیں ـــ ملت مصطفویہ اسی جماعت کے ذریعے قائم ہے ـــ قیامت میں شریعت کے متعلق سوال کیا جائے گا تصوف کے متعلق نہیں ـــــ جنت کا داخلہ اور آتش دوزخ سے نجات، شریعت ہی کی پابندی سے وابستہ ہے ـــــ انبیاء علیہم السلام جو کہ بہترین کائنات ہیں انھوں نے شرائع کی دعوت دی ہے اور مدار نجات اسی پر ہے اور انبیاء کی بعثت کا مقصد بھی تبلیغ شرائع ہی ہے۔ پس سب سے بڑی نیکی، ترویج شریعت میں سعی کرنا اور اس کے احکام میں سے کسی حکم کا زندہ کرنا ہے بالخصوص ایسے زمانے میں کہ شعائر اسلام منہدم ہو گئے ہوں۔ ـــــ راہ خدا میں کروڑوں روپیہ خرچ کرنا بھی مسائل شرعیہ میں سے کسی ایک مسئلہ کو رواج دینے کے برابر نہیں ہے ـــــ اس لیے کہ مسئلہ شرعی کے رواج دینے میں انبیاء کی اقتدا اور پیروی اور ان کے کار تبلیغ میں مشارکت ہے ـــ ظاہر ہو کہ وہ مخلوقات میں بزرگ ترین ہیں اور کاملترین حسنات انھیں کے لیے ثابت ومسلم ہیں ـــ کروڑوں روپیہ

خرچ کرنا تو انبیاء کے علاوہ دوسروں کو بھی میسر ہو سکتا ہے ـــ علاوہ ازیں ادائیگی شریعت میں نفس کی پوری پوری مخالفت ہوتی ہے اسلئے کہ شریعت برخلاف نفس واقع ہوئی ہے۔ لیکن مال کے خرچ کرنے میں کبھی نفس، موافقت بھی کر لیتا ہے ـــــــ اس تائید شریعت اور ترویج ملت کے لیے مال خرچ کرنا بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے ایک جتیل (پیسہ) کو ترویج واشاعت دین کی نیت سے خرچ کرنا بغیر نیت کے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے برابر ہے ـــ.... وہ شخص جس سے بہت سوں کی نجات وابستہ ہو ظاہر ہے کہ اس شخص سے بہتر ہوگا جو اپنی نجات ہی کی فکر رکھتا ہو ـــــ البتہ وہ صوفی جو "فنا و بقا" کے بعد اور سیر عن اللہ اور سیر باللہ کے مقام طے کرنے کے بعد عالم میں گشت لگائے اور دعوت خلق کی طرف متوجہ ہو کر مقام نبوت سے حصہ رکھتا ہو ـــــ داخل مبلغان شریعت ہے اور وہ حکم علماء شریعت رکھتا ہے ـــ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے)

مکتوب (۵۰) شیخ فرید بخاری کے نام۔

(مذمت دنیا میں)

حق سبحانہ وتعالے ماسوا کی غلامی سے آزادی عطا فرما کر بس اپنا ہی پابند بنائے... بحرمۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ دنیا بظاہر شیریں ہے اور صورۃً تازگی رکھتی ہے لیکن فی الحقیقت ایک زہر ہے قاتل ـــــ اور ایک متاع ہے باطل ـــ اور ایک گرفتاری ہے بے سود ـــــ اس کا مقبول، خوار ہے اور اس کا فریفتہ مجنون ـــــ یہ سونے کے ورق سے لپٹی ہوئی نجاست کے مانند ہے اور ایسے زہر کی مثل ہے جس میں شکر آمیختہ ہو ـــــ عاقل وہ ہے جو اس کھوٹی پونجی پر نہ ریجھے اور خواب مال میں گرفتار نہ ہو علماء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ میرا مال عاقل زمانہ کو دیا جائے... تو ایسے شخص کو وہ مال دیا جائے جو دنیا کی طرف راغب نہ ہو اور یہ بے رغبتی اس کی انتہائی عقلمندی کی دلیل ہے...

بقیہ نگاہِ اولیں

ابتدا میں ایک مقامی پیمانہ کی کوشش تھی۔ دیوبند کے ایک مکتب کی حیثیت سے اسکی ابتدا ہوئی تھی۔ اس ابتدا کی انتہا آج ہمارے سامنے ہے۔

بعض مقامات پر بعض مخلصین نے بنام خدا کام شروع کر دیے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اِن کے کام کی اطلاع ہمیں پہنچے تو انؒ سے رابطہ قائم کریں۔ ان کے کام کے ڈھنگ کو دیکھیں۔ اور پھر ممکن ہو تو رابطہ رکھتے ہوئے ورنہ بغیر رابطہ رکھے ہوئے ہی ہم اپنے مقام پر کام کا آغاز کریں۔ ہر مخلصانہ کام خدا چاہتا ہے تو کسان کے عمل کی طرح اپنے نتیجہ پر پہنچ کر رہتا ہے۔ بس شرط یہ ہو کہ اخلاص قائم رہے، لگن ہو اور اپنی جیسی پوری دانائی اور بینائی سے کام کیا جائے۔
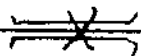
کوئی دو ماہ ہوئے ایک معاصر نے الفرقان پر ایک صحافتی خیانت کا الزام لگایا تھا۔ بعض لوگ حقیقت حال سے واقف ہونے کے لئے ہم سے رجوع کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس الزام پر ہم نے اپنی گزارشات معاصر موصوف کو اُسی وقت بھیج دی تھیں جب اس کا متعلقہ شمارہ شائع ہوا تھا۔ یہ گزارشات اپنے اختصار کی بنا پر معاصر کے ستمبر کے شمارہ میں شائع ہو سکتی تھیں مگر بعض وجوہ سے انھوں نے عذر کرتے ہوئے ستمبر کے بعد کی اشاعت میں شائع کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جن حضرات کو اس سے زیادہ دلچسپی ہے وہ یا تو معاصر کے آنے والے شمارہ کا انتظار فرمائیں یا خط لکھ کر دریافت فرمائیں کہ وہ کب تک اس تحریر کو شائع کر رہا ہے۔

قسط سوم

حدیثِ پرویز

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اَب اصل نقطۂ بحث تو ہمارے سامنے صرف یہ رہ گیا ہے کہ کیا "تاریخ" (حدیث) یہ بتاتی ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافتِ ابی بکرؓ کا فیصلہ بجائے مشورہ کے استبداد سے کام لیکر اور حسب و نسب کو معیار بنا کر کیا گیا؟ —— یہ نقطہ اور اسکے متعلقات ہیں جن پر اب گفتگو ہونی ہے ——

لیکن پہلے ذرا ایک ضمنی اعتراض سے فارغ ہو لیجئے جو پرویز صاحب نے بطور "جملۂ معترضہ" "تاریخ" پر ایک بڑا کامیاب وار سمجھ کر چسپت فرمایا ہے، اور جس کا تعلق گفتگو کی اُسی شق سے ہے جس پر ما قبل میں گفتگو ہوئی ہے، یعنی سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضراتِ صحابہؓ کے باہمی نزاع کا انداز!۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں :—

"ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے[1] میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی تھی تاریخ طبری ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب میں ... . لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلاف[2] رائے ہوا تو —— ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اُچھل پڑے اور بڑھ کر انھوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی، اور کہا :— اے ابن الخطاب! اللہ تیری[3] ماں کا بُرا کرے کہ تم مرجاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہؐ نے اس پر فائز کیا ہے، تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اُسے علیحدہ کر دوں۔"

---

[1] تنازعے نہیں تنازع۔ [2] یہ واقعہ کی غلط تعبیر ہے حضرت عمرؓ نے صرف بعض حضرات کا پیغام حضرت ابوبکرؓ کو پہنچایا تھا۔ [3] یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ طبری کے الفاظ "ثکلتك امك وعدمتك" ہیں جس کا ترجمہ ہوتا ہے، تمھاری ماں تمھیں کھوئے اور معدوم پائے! ۔ (ع)

یہ اپنے خیال میں پرویز صاحب نے تاریخ کا ایسا پردہ فاش کیا ہے کہ لوگ پڑھتے ہی تاریخ پر یکلخت نفرین بھیجنے لگیں گے، مگر اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک یہ باتیں کتب حدیث کے حوالہ سے نہ پیش کی جائیں اس وقت تک ان کا اثر اس تاریخ پر مطلق نہیں پڑتا "جو دین بنالی گئی ہے" اور اسی لئے اس اعتراض کا جواب ہمارے ذمے نہیں، لیکن اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم پرویز صاحب کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ بالکل اسی طرح کا واقعہ قرآن میں ایک جگہ نہیں دو جگہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کے متعلق بیان ہوا ہے —— فرمایا گیا ہے :—

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ	اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم کی طرف غم و غصّہ
أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي	میں بھرا ہوا، بولا کیا بُری نیابت کی تم نے
أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى	میرے بعد، کیا کچھ جلدی پڑی تم کو اپنے ربّ کے
الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ	عذاب کی؟ اور ڈالدیں تختیاں (تورات کی)
إِلَيْهِ ۔	اور پکڑا سر اپنے بھائی کا کھینچتے ہوئے اس کو
(الاعراف، ع ۱۸)	اپنی طرف ۔

یہاں صرف سر کے بال پکڑنے کا ذکر ہے، دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے داڑھی بھی پکڑی تھی —— فرمایا :—

قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ	کہا (موسیٰ نے) کہ اے ہارون! کس چیز نے روکا
ضَلُّوا ۞ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ	تم کو جب دیکھا تھا تم نے کہ یہ گمراہ ہوگئے، کہ تم
أَمْرِي ۞ قَالَ يَا ابْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ	نہ چلے آئے میرے پیچھے؟ کیا تم نے نافرمانی کی
بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۔ الآية	میرے حکم کی، کہا (ہارون نے) کہ اے میرے
(طٰہٰ، ع ۵)	ماں جائے! نہ پکڑیئے میری داڑھی اور میرا سر

پرویز صاحب خیر سے قرآن کے علمبردار اور اسکے مفسّر و ترجمان بھی ہیں، تو یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی یہ کھُلی آیات اُن کی نظر سے مستور رہی ہوں گی، مگر اس کے باوجود یہ عجیب ماجرا ہے کہ جہاں ایک طرف انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جو باتیں وہ خالص کتب تاریخ کے حوالہ سے پیش کر رہے ہیں، اُن کا الزام کتب حدیث کو کس طرح دے سکتے ہیں، وہاں یہ بھی نہیں سوچا کہ جو بات قرآن میں قابلِ اعتراض نہیں وہ تاریخ میں آکر کیسے قابلِ اعتراض ہوسکتی ہے —— درحقیقت یہی وہ باتیں ہیں جو اس بدگمانی کا جواز پیدا کرتی ہیں کہ ان لوگوں کو حدیث کے

بارے میں دیانتداری کے ساتھ کوئی غلط فہمی نہیں ہے، بلکہ ایک سوچی سمجھی بات ہے جس کے ماتحت حدیث کو ہدف بنایا جا رہا ہے، دوسرا بالفرض غلط، تاریخی روایات کی بنیاد پر حدیث کے ذخیرے کو کوئی الزام دینا صحیح بھی ہو تب بھی یہ تو عجیب بات ہے کہ جو چیز قرآن میں باعثِ وحشت نہ ہو وہ حدیث میں باعثِ وحشت ہونے لگے۔

خیر اچھا ہوا کہ پرویز صاحب نے بزعم خود یہ زبردست وار کر کے، قرآن کی یہ آیات یاد دلا دیں، قرآن کی یہ آیات جن میں حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا یہ واقعہ بلا کسی نکیر کے بیان ہوا ہے اس بات کی محکم دلیل ہیں کہ حق کے لئے غصہ میں ایسی باتوں کا ہو جانا قطعاً قابلِ نکیر بات نہیں ہے ——— اور اسلئے اگر کسی حدیثی روایت میں بھی صحابۂ کرامؓ کے متعلق ایسے واقعات نظر آئیں تو ان کی بنیاد پر حدیث کو مطعون کرنے کی جرأت وہی شخص کر سکتا ہے جو (خاک بدہن گستاخ) قرآن پر بھی لب کشائی کو تیار رہو۔

اچھا اب آئیے، اصل نقطۂ بحث کو لیجئے، جہاں سے بات ابھی شروع کی گئی تھی، یعنی پرویز صاحب کا یہ اعتراض کہ "تاریخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا فیصلہ بجائے مشورہ کے استبداد سے کام لیکر اور حسب و نسب کو معیار بنا کر کیا گیا، حالانکہ ایسا کرنا صحابہؓ سے بعید تھا۔"

ہم ناظرین کو ایک بار پھر یہ یاد دلانے پر مجبور ہیں کہ پرویز صاحب کا اصل ہدف تو حدیث ہے (کیونکہ یہی وہ "تاریخ" ہے جسے "دین بنا لیا گیا ہے") لیکن جیسا کہ وہ کرتے آرہے ہیں، یہ اعتراض بھی انھوں نے حدیث کی کسی روایت کی بنیاد پر نہیں کیا ہے، بلکہ اُن تاریخی روایات کی بنیاد پر کیا ہے جنھیں ہرگز "دین" نہیں بنایا گیا ہے، چنانچہ اس اعتراض کے لئے وہ محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیقؓ" کے حوالہ سے (تاریخ طبری کی ایک روایت میں سے) حضرت عمر فاروقؓ کی حسب ذیل تقریر پیش فرماتے ہیں، جو روایت کے بیان کے مطابق انصار کے جواب میں کی گئی تھی کہ

> "... ... ... اللہ کی قسم! عرب تمھیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے جب رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے، ہاں اگر امارت اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئے جن میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا ... ... رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے، جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں، اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیرو کار گناہوں سے آلودہ، اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کیلئے تیار ہو۔"

یہ روایت ہے جس کو بنیاد بنا کر حدیث کو مجروح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، حالانکہ تاریخ کی اس روایت میں یکے بعد دیگرے دو راوی ایسے ہیں جن کی روایات محدثین قطعاً قبول نہیں کرتے، اور یہ راوی ہیں ہشامؔ بن محمد کلبی اورؔ ابو مخنف، یہ دونوں راوی محدثین کے یہاں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ:-

ہشام بن محمدؒ :-

قال احمد بن حنبل انما کان صاحب سمرٍ ونسب ماظننت ان احداً یحدث عنه۔ وقال الدارقطنی وغیرہ متروك وقال ابن عساکر رافضی لیس بثقةٍ وقال یحیٰی بن معین غیر ثقةٍ ولیس عن مثله یروی الحدیث۔ (لسان المیزان لابن حجرؒ جلد ۶ ص ۱۹۶ – ۱۹۷ مطبوعہ حیدرآباد)۔

امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ "یہ شخص صرف ایک قصہ گو اور نساب تھا، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اس سے حدیث کی روایت کرتا ہوگا" دار قطنی وغیرہ کا قول ہے کہ "یہ متروک ہے" ابن عساکر کہتے ہیں کہ رافضی ہے قطعاً قابلِ اعتماد نہیں یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ غیر ثقہ ہے، اور اس جیسوں سے حدیث کی روایت نہیں کی جاتی ہے۔

ابو مخنف :-

لا یوثق به۔ ترکه ابو حاتم وغیرہ۔ وقال الدارقطنی ضعیف۔ وقال یحیٰی بن معین لیس بثقةٍ۔ وقال مُرّۃ لیس بشیءٍ و قال ابن عدی شیعیٌّ محترق صاحبُ اخبارھم۔ (ایضاً، ج ۴، ص ۴۹۲)۔

اعتماد کے قابل نہیں ہے، ابو حاتم وغیرہ (ائمہ جرح وتعدیل) نے اس کو متروک قرار دیا ہے، دار قطنی کا قول ہے کہ "ضعیف ہے" یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ "لائق اعتماد نہیں ہے" مُرّۃ کا کہنا ہے کہ "کچھ نہیں" ابن عدی کہتے ہیں کہ کٹر شیعی، اور جھوٹی روایات گھڑنے والا ہے۔

پس یہ کس درجہ بد دیانتی ہے کہ ایسے لوگوں کی روایات جنھیں محدثین خود رد کرتے ہیں محدثین کے سر تھوپی جائیں یقیناً اس طرز کی روایات ان شیعی راویوں نے اسی غرض سے وضع کی ہیں (جو پرویز صاحب کا بھی خیال ہے) کہ اسے اہل سنت کے مقابلہ میں، حضرت علیؓ کے احق بالخلافۃ ہونے پر حجت قائم کی جائے، لیکن یہ پرویز صاحب کی نری خوش فہمی ہے کہ "(حضرت عمرؓ کی) اس دلیل[1] کے بعد سنی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ اُن سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑ سکتا" اسلئے کہ حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ کسی ایسے ذریعہ سے ثابت ہی نہیں ہیں جو اہلِ سنت پر حجت ہوں۔

[1] یعنی جو دلیل انھوں نے اپنی سقیفہ تقریر میں قریش کی خلافت کیلئے دی تھی۔ (ع ع)

حضرت عمرؓ کی یہ تقریر پیش کرنے کے بعد "تاریخ" (حدیث) کے خلاف اپنے دعوے کی دلیل میں پرویز صاحب یوں ایک قیمتی اضافہ فرماتے ہیں :—

"لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی، وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا، تو حضرت ابو بکرؓ اٹھے، اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے، رسول اللہؐ نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ الائمۃ من قریش خلافت قریش ہی میں رہے گی، اس پر انصار خاموش ہو گئے، اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔"

پھر اس پر تبصرہ فرماتے ہیں :—

"یہ حدیث متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے، لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے ؟ قرآن مسلسل اور متواتر نسل اور خون کے تمام امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا، حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی، آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسول یہ فیصلہ کر گیا کہ حکومت میرے قبیلے کے اندر رہے گی، یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دینے کیلئے کافی ہے، لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ہے، اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے انصار و مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حقِ خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا، اور اسے سب نے تسلیم کر لیا، یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابۂ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔"

اب تک بحث پیش نظر یہ تھی کہ کیا سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلیفہ کا انتخاب بجائے شوریٰ کے استبداد سے کام لیکر اور حسب و نسب کو معیار بنا کر کیا گیا ؟ لیکن اب اسی کے ذیل میں پرویز صاحب نے ایک بحث یہ پیدا کر دی کہ کیا "الائمۃ من قریش" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہو سکتا ہے ؟ اور اس میں اور آپ کے زندگی بھر کے اسوۂ حسنہ میں کوئی تضاد نہیں ہے ؟ ——— ہم اس سوال سے بھی تعرض کرینگے، لیکن پہلے پہلی والی بحث کو نمٹا لیجئے !—

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب پرویز صاحب "تاریخ" کا یہ بیان بتاتے ہیں کہ انصار "الائمۃ

من قریش ہے، سُن کر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنانے پر راضی ہو گئے، تو "تاریخ" پر یہ الزام تو باقی نہیں رہتا کہ وہ صحابۂ کرامؓ کو شوریٰ کے بجائے استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، ہاں حسب و نسب کو معیار بنانے والا قصہ باقی رہ جاتا ہے۔

لیکن ہم پرویز صاحب کی اس دانستہ یا نادانستہ غلطی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے، جس کی بناء پر انکے الزام کا ایک حصہ از خود منہدم ہو گیا ہے، بلکہ ہم انھیں بتائیں گے کہ خود تاریخ طبری میں بھی ایک روایت ہے (اور اوّلین روایت وہی ہے) اور وہی روایت بخاری میں بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کی صورت وہ نہیں تھی جو انھوں نے تاریخ کے حوالہ سے بیان کی ہے[1]، بلکہ یہ تھی کہ جب انصار کسی طرح رضامند نہیں ہوئے اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ اختلاف کوئی بری صورت نہ اختیار کر جائے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا:۔

ابسط یدک یا ابا بکر فبسط یدہ	ابوبکرؓ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا
فبایعتہ وبایعہ المهاجرون ثم	ہاتھ بڑھا دیا، اور میں نے (حضرت عمرؓ نے) اُن سے
بایعتہ الانصار ـــــ (بخاری	بیعت کی، اور دیگر مہاجرین نے بیعت کی، اور پھر
باب رجم الحبلی من الزنیٰ اذا احصنت)	انصار نے بھی بیعت کر لی۔

ہم پرویز صاحب کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بخاری کی اس روایت سے پورا فائدہ اٹھائیں، اور اپنے اس الزام کو خوب مدلل فرمائیں کہ "تاریخ" (حدیث) صحابۂ کرامؓ کو شوریٰ کے بجائے استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، ہم نہیں چاہتے کہ دعوے کا ایک نہایت اہم ثبوت اگر پیش ہونے سے رہ گیا ہے تو ان کی اس چوک سے فائدہ اُٹھا کر خیر منائیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس بہترین ہتھیار سے آراستہ ہو کر حدیث پر مشقِ ستم فرمائیں، اور پھر لوگ دیکھیں کہ وہ کہاں تک کامیاب ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف بخاری ہی کی یہ روایت ہے جس کی بنیاد پر کوئی شخص "تاریخ" کو الزام دے سکتا ہے کہ وہ صحابۂ کرامؓ کو (نعوذ باللہ) خلیفہ کے معاملے میں شوریٰ کے بجائے "استبداد" سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، لیکن پرویز صاحب اس سے کیوں چوک گئے اور بخاری پر ہاتھ صاف کرنے کا یہ موقع انھوں نے کیوں ہاتھ سے جانے دیا؟ بخاری میں یہ روایت ان کی نظر سے نہ بھی گذری ہو تو تاریخ کی کتابوں میں (مثلاً طبری ہی میں) تو یہ روایت سب سے پہلے موجود ہے پھر یہ کیا قصہ ہے کہ طبری کی بعد والی روایتیں تو وہ پیش کرتے ہیں، مگر یہ اوّلین روایت چھوڑ جاتے ہیں جو اُن کے

---

[1] اس پر اگر تفصیلی کلام دیکھنا ہو تو راقم کے مضمون "دین میں حکمت عملی کا مقام" شائع شدہ الفرقان بابتہ محرم ۱۳۷۸ھ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

الزام کا کھلا ثبوت نہیں؟ ——— قصہ یہ ہے کہ اسی روایت میں اس اعتراض کا جواب بھی موجود ہے، اور یہ جو حضرت عمرؓ کی زبان سے واقعہ کا بیان اس روایت میں ہوا ہے، در اصل اس اعتراض کا جواب دینے ہی کیلئے ہوا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کسی کے متعلق سنا کہ فلاں شخص یوں کہتا ہے کہ :-

لو قد مات عمر لقد بايعت	عمرؓ کے انتقال کے بعد میں فلاں شخص سے بیعت کرونگا
فلاناً فوالله ماكانت بيعة	(اور اس کا مجھے کیوں حق ہوگا؟) اسلئے کہ بخدا ابوبکرؓ
ابي بكر الا فلتة فتمت۔	کی بیعت کی نوعیت بھی اسکے سوا کچھ نہیں تھی کہ یکایک

(ایک شخص کی سبقت سے) ہوگئی تھی، اور بعد میں (سب لوگوں کی رضامندی اور توثیق سے) اس کی تکمیل ہوئی۔

اس پر حضرت عمرؓ نے ایک جمعہ میں وہ تقریر فرمائی جو بخاری وغیرہ کی مذکورہ روایت میں آتی ہے، اور اسی ذیل میں بیعتِ ابی بکرؓ کا واقعہ بیان فرمایا ——— آپ نے فرمایا :- مجھے ایسی ایسی بات پہنچی ہے، تو میں آگاہ کر دینا چاہتا ہوں، کہ :-

"کوئی شخص اس خیال سے دھوکے میں نہ پڑے کہ ابوبکرؓ کی بیعت یکایک (بلا مشورہ کے) عمل میں آگئی تھی، اور بعد میں (سب کی رضامندی اور توثیق سے) اس کی تکمیل ہوئی، بیشک ابوبکرؓ کی بیعت کی نوعیت یہی تھی لیکن ایسی نوعیت میں جو خطرہ کا پہلو ہوتا ہے اللہ نے ہم لوگوں کو اس سے محفوظ رکھا، آج تم میں سے کوئی نہیں ہے جس کا فضل اور جس کی بزرگی ابوبکرؓ کی طرح مسلّم ہو، جو شخص بھی بلا مسلمانوں کے مشورہ کے کسی شخص سے بیعت کرے گا اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جس شخص کی بیعت کی جائے گی اور جو بیعت کریگا، وہ دونوں اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالیں گے، اور گویا از خود قتل کے لئے پیش کرینگے۔" (ایضاً)

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کیا صورتِ حال تھی جس میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اس نوعیت کو گوارا کیا گیا ہے، اس پہلو سے آپ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انتخاب کی کارروائی ہم لوگوں نے اپنی طرف سے نہیں کی تھی، بلکہ ہمیں یکایک معلوم ہوا کہ ہمارے بھائی انصار ایک جگہ جمع ہو کر کسی شخص کو امارت کیلئے انتخاب کر رہے ہیں، یہ خبر اتنی پریشان کن تھی کہ ہم جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی یہ خبر سُن کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور سقیفے کی راہ لی، علیؓ اور زبیرؓ وغیرہ جیسے اہم لوگ بھی چونکہ اُس وقت ہمارے پاس نہ تھے اسلئے ہم ان کو بھی اپنے ساتھ نہ لے سکے، سقیفے میں پہنچ کر انصار کی اور ہماری بات چیت ہوئی (اس کی تفصیل اس سے پہلے قسط میں گذر چکی ہے) لیکن اندازہ یہ ہوا کہ وہ ماننے والے نہیں ہیں، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ اختلاف کوئی سنگین شکل اختیار کر جائے گا۔

واقعہ کی یہ نوعیت بیان کرنے کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :-

اِنّا واللّٰہ ما وجدنا فیما حضرنا	ہم جس صورت حال سے دوچار ہوگئے تھے، خدا
من امرٍ اقویٰ من مبایعۃ ابی بکر	جانتا ہے کہ اس میں ابوبکرؓ کی بیعت سے زیادہ
خشینا ان فارقنا القوم ولم	بہتر اور مامون راستہ ہمارے سامنے کوئی
تکن بیعۃ ان یبایعوا رجلاً	دوسرا نہیں تھا، اگر ہم بیعت کا معاملہ طے
منھم فامّا تابعناھم علیٰ مالا	کئے بغیر انصار سے جدا ہوجاتے (کہ دوسرا ہم
نرضیٰ واما نخالفھم فیکون	لوگوں کو جمع کرکے مشورہ کیا جائے) تو پورا خطرہ تھا
فساداً فمن بایع رجلاً علیٰ	کہ انصار اپنے میں سے کسی شخص کی بیعت کرلیں، اور
غیر مشورۃٍ من المسلمین فلا	یہ بات اگر ہوجاتی تو پھر ہمارے سامنے دو ہی
یتابع ھو ولا الذی تابعہ	راستے تھے، یا تو ہم اپنی مرضی کے خلاف اُن کا
تغرّۃ ان یقتلا -	اتباع کرتے، یا ہم مخالفت کرتے، تو پھر فساد برپا ہوتا۔

پس (میں آگاہ کرتا ہوں کہ) جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کریگا تو یہ متبوع اور تابع دونوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں گے۔

ہم پوچھتے ہیں، کون ہے جو اس کے بعد بھی حدیث پر یہ طعن کرسکے کہ وہ صحابۂ کرامؓ کو استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے؟ کتب حدیث کی یہی وہ واحد روایت تھی جو اس طعن کی بنیاد بنائی جاسکتی تھی، مگر یہ روایت اس طعن کا ایسا جواب اپنے اندر خود رکھتی ہے کہ پرویز صاحب باوجود ضرورت کے اس کو پیش کرنے کی جرأت نہ کرسکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الزامات کی فہرست میں تو انھوں نے دکھایا تھا، کہ "تاریخ" انتخاب صدیقیؓ کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کو شوریٰ کے بجائے استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، مگر جب ثبوت کا موقع آیا تو ان کا ہاتھ اسکے ثبوت سے خالی تھا۔

انتخاب صدیقیؓ کے سلسلہ میں "استبداد" کا ذکر چھڑا ہے تو استبداد کے اُس الزام پر بھی لگے ہاتھوں غور کرتے جایئے جو اسی واقعہ کے سلسلہ میں حضرت علیؓ اور دیگر بنو ہاشم کی نسبت سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر لگایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی تقریر کے انھیں آخری فقروں میں جو ابھی ہم نے نقل کئے، اس کا بھی بھرپور جواب

موجود ہے حضرت عمرؓ نے پوری جرأت کے ساتھ اس امر کا اعتراف فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت فَلْتَۃً اور بَغْتَۃً (بلا کسی شورائی قرارداد کے) ہوئی تھی، مگر وہ فرماتے ہیں کہ بتاؤ جو صورتِ حال درپیش تھی اس میں ہمیں اس کے سوا کیا کرنا چاہئے تھا، جو ہم نے کیا؟ ہمارا کوئی ارادہ اُس وقت انتخاب کا نہیں تھا ہمیں یکایک اطلاع ملی کہ انصار انتخاب کی کارروائی کے لئے جمع ہوگئے ہیں، علیؓ وغیرہ اُس وقت ہمارے پاس نہیں تھے، اور موقع کی نزاکت متقاضی تھی کہ فوراً انصار کے مجمع میں پہنچا جائے، کہیں وہ کارروائی کر نہ گزریں، اسلئے ہم علیؓ وغیرہ کو اپنے ساتھ نہ لے سکے[۱]۔ ہم پہنچے تو یہ صورت بنی کہ انتخاب ٹل نہیں سکتا تھا، کچھ نہ کچھ ہوجانا تھا، ایسی صورت میں اگر ہم تمام اہلِ شورہ کے مشورہ کے خیال سے انصار کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے اور اس کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیتے، تو اُن کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے میں سے کسی آدمی کا انتخاب کئے بغیر نہ رہتے، اور پھر دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ہم اس غلط انتخاب پر راضی ہوجاتے یا فتنہ و فساد ہوتا، بتاؤ ایسے وقت میں ہمارا فرض اس کے سوا کیا تھا کہ مسلّمہ طور پر پوری امت کا بزرگ ترین فرد جو اُس وقت خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ اُس مجمع میں موجود تھا، ہم اُس کا انتخاب کرالیں، جس کی طرف ایک بار کچھ لوگوں کے ہاتھ بڑھ جانے کے بعد کسی طرف سے کسی بڑے اختلاف کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

کیا اس کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ انتخاب امارت کے معاملہ میں حضرت علیؓ وغیرہ کو نظرانداز کردیا گیا، اور اُن سے مشورہ تک نہیں لیا گیا؟ مشورہ کا وقت کہاں تھا؟ اگر ان سے مشورے کی فکر کی جاتی، تو وہ ہوتا، جو حضرت علیؓ کو کسی طرح بھی پسند نہ ہوتا، ورنہ حضرت عمرؓ وغیرہ تو خود سمجھتے تھے کہ اس طرح کسی کی بیعت نہیں ہونی چاہئے، اسی لئے تو وہ فرماتے ہیں، کہ خشینا ان فارقنا القوم ولم تکن بیعۃ الخ اگر وہ چاہتے ہوتے کہ اسی طرح ابوبکرؓ کی بیعت کرلی جائے، تو اُن کے سامنے یہ سوال ہی کیوں آتا کہ اس وقت یہ مسئلہ مؤخر ہونا چاہئے، جس پر وہ عمل اس خطرہ سے نہ کرسکے کہ انصار انتخاب کی کارروائی کر نہ گزریں۔ ایک طرف اُنکا یہ کہنا

---

[۱] اور یوں بھی حضرت علیؓ کی جو قرابت حضورؐ سے تھی اس کے پیشِ نظر یہی بات مناسب تھی کہ اس صدمۂ جانکاہ کے وقت میں انھیں کسی خرخشے کیلئے زحمت نہ دیجاتی، جبکہ ابوبکرؓ و عمرؓ کے پیشِ نظر خلافت کا کوئی فیصلہ کرنا اُس وقت نہیں تھا بلکہ اُس اجتماع کی کارروائی کو روکنا تھا ۔ اگرچہ وہ روک نہ سکے۔

کہ خشینا ان فارقنا القوم الخ دوسری طرف حضرت علیؓ وغیرہ کی غیر موجودگی کا خاص طور پر ذکر کرنا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ وہ محسوس فرماتے تھے کہ حضرت علیؓ وغیرہ کی غیر موجودگی بہت بڑی کمی ہے، مگر حالات نے اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ان کو خصوصاً اور ایسے دوسرے حضرات کو عموماً کسی پرسکون ماحول میں جمع کرکے باقاعدہ مشورے سے کوئی فیصلہ کر سکیں۔

ٹھیک ہے کہ بخاری کی روایت میں (جس کو ایک دوسرے مقصد سے پرویز صاحب نے بھی اپنے مضمون میں پیش کیا ہے) حضرت علیؓ کی زبان مبارک سے بھی یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں، کہ:۔

ولکنک استبددت علینا بالامر (بخاری کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر)

لیکن ظاہر ہے کہ یہ استبداد کی شکایت اُس بھیانک معنیٰ میں نہیں ہے، جو ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر "استبداد" سے سمجھے جاتے ہیں، یا جو پرویز صاحب نے "غصب" کو اس لفظ کے مترادف کے طور پر استعمال کرکے سمجھانے کی کوشش کی ہے، بلکہ اسکے معنیٰ صرف یہ ہیں، کہ:۔

"آپ نے خلافت کے معاملہ میں ہم سے مشورہ نہیں لیا، اور اس معاملہ کو طے کرنے کیلئے اپنے آپ کو کافی سمجھ لیا"[1]

اور یہ وہ بات ہے جس سے کسی کو انکار کرنے کی ضرورت نہیں، حضرت عمرؓ نے خود صراحت کیساتھ تسلیم کیا ہے کہ ہاں ایسا ہوا، لیکن اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضرت علیؓ سے بالا ہی بالا یہ کام کرلینا منظور تھا، تاہم حضرت علیؓ نے چونکہ اُس ماحول کی مجبوریوں کا بچشم خود مشاہدہ نہیں فرمایا تھا جس میں اُن کے مشورہ کو چھوڑنا گوارا کیا گیا، اس لئے اُنھیں شکایت ہوسکتی تھی، اور انھوں نے بس اسی درجہ کی شکایت فرمائی، ورنہ اُنھیں یہ اعتراف تھا (اور نہ ہونے

---

[1] حضرت علیؓ نے استبددت بالامر نہیں فرمایا، بلکہ "استبددت علینا بالامر" فرمایا، اور اسکے یہی معنیٰ ہوتے ہیں جو ہم نے کئے، پرویز صاحب نے چونکہ محض مطالعہ سے عربی سمجھنے کی مشق بہم پہنچائی ہے، اور انھوں نے دیکھا ہوگا کہ "علی" کہیں "خلاف" کیلئے آتا ہے، اسلئے انھوں نے اس جملہ کا ترجمہ فرمادیا ہے "لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے" حالانکہ وہ اگر سوچتے تو اسی قرینے سے صحیح مطلب سمجھ لیتے کہ حضرت علیؓ کہیں مقابل اُمیدوار بنے کھڑے تھے کہ اُنکے خلاف استبداد سے کام لیا گیا، مقابلہ اگر تھا بھی تو دوسروں سے تھا، حضرت علیؓ کے خلاف استبداد کا کیا سوال ؟۔

کے کوئی معنی نہ تھے) کہ حضرت ابوبکرؓ اس منصب کیلئے احق تھے، چنانچہ وہ اسی شکایت کیساتھ فرماتے ہیں:-

انا قد عرفنا فضلك وما اعطاك	ہم آپ کا فضل اور اللہ نے آپ کو جو مقام دیا ہے
الله ولم ننفس عليك خيرًا	اسکو پہچانتے ہیں، اور اللہ نے جو خیر (منصب خلافت)
ساقه الله اليك -	آپ کو بخشا ہے اس میں ہم آپ سے منافست
(ایضاً)	نہیں کرتے۔

بہرحال سقیفہ کے اجتماع کا نقشہ سامنے آجانے کے بعد کسی پہلو سے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صحابۂ کرامؓ نے مشورہ کے اصول کو نظر انداز کیا، انصار اس معاملے میں مشورے کا جو دائرہ سمجھ رہے تھے، انھوں نے اس دائرے میں کھلا مشاورتی اجتماع منعقد کیا، مہاجرین کے نمائندے (ابوبکر و عمرؓ) اس معاملے میں جو رائے رکھتے تھے انھوں نے انصار کو اپنے نقطۂ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کی، لیکن جب دیکھا کہ نہ اس اجتماع کی کارروائی ٹل سکتی ہے، اور نہ مشاورتی اتفاق سے کوئی بات طے ہو سکتی ہے، تو حضرت عمرؓ کی فراستِ ایمانی نے وہ اقدام کیا جسے بجز الہام کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، انھوں نے نہ انصار کے خلاف کوئی طاقت کا مظاہرہ کیا، نہ مخالف نمائندوں اور "ووٹروں" کو لیجا کر کہیں بند کر دیا، نہ ڈرانے دھمکانے کی پالیسی اختیار کی، بلکہ صرف یہ کیا کہ اپنا ہاتھ ابوبکرؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا، اور اس طرح زبانی اختلاف کے ماحول کو عملی اتفاق میں تبدیل کرنے کی ایک تدبیر کی، جس کی کامیابی اسی دم روشن ہو کر سامنے آگئی، اور موافق و مخالف سب اسی مجلس میں اس ایک ہاتھ پر جمع ہو گئے ——— رہی حضرت علیؓ وغیرہ سے عدمِ مشاورت تو وہ اسی صورت حال کی پیدا کردہ ایک غیر اختیاری بات تھی، جس سے اکابر مہاجرین غیر متوقع طور پر دوچار ہو گئے تھے، ورنہ وہ چاہتے تھے کہ مجلس ملتوی کی جائے، اور حضرت علیؓ جیسے حضرات جو مشورہ سے رہ گئے ہیں، ان سے بھی مشورہ لیا جا سکے ——— پس کون ہے جو کہہ سکے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ وغیرہ نے مشورہ کا اصول چھوڑ کر استبداد سے کام لیا، یا "حدیث" کو بدنام کرنے کی جرأت کر سکے کہ وہ اصحاب کرامؓ کو اس غیر قرآنی رنگ میں دکھاتی ہے؟-

---

اب آئیے، یہ بھی دیکھئے کہ کیا حدیث اس واقعہ میں صحابۂ کرامؓ کے متعلق یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے قرآن کے دیئے ہوئے معیارِ انتخاب کے بجائے، حسب و نسب کو معیارِ انتخاب بنایا؟-

ہم کہہ چکے ہیں کہ اپنے دعوؤں کے ثبوت میں جو روایتیں پرویز صاحب تاریخی کتابوں سے پیش کرتے ہیں اُن کے جواب کی ذمہ داری ہم پر قطعاً نہیں ہے، ہم اسی "تاریخ" (حدیث) کی روایتوں کے جوابدہ ہیں، جنھیں بقول پرویز صاحب "دین بنا لیا گیا ہے"۔ اِس نقطۂ نظر سے جب ہم دیکھتے ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں کوئی روایت ہم نہیں پاتے جو پرویز صاحب نے حدیث سے پیش کی ہو، البتہ ایک بات انھوں نے بے حوالہ کہی ہے، کہ:-

"جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا، تو حضرت ابوبکرؓ اُٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے، رسول اللہؐ نے فیصلہ کر دیا ہے، کہ الائمۃ من قریش خلافت قریش میں رہے گی، اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے"۔

یہ بات کُلّاً اور لفظاً تو نہیں البتہ جزواً اور معناً حدیث کی ایک روایت سے ثابت ہے۔ اور وہ مسند احمد کی یہ روایت ہے، کہ انصار کے فضائل و مناقب پر ایک زبردست تقریر فرمانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے قائد انصار حضرت سعد بن عبادہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

ولقد علمت یا سعد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال وانت قاعدٌ قریش ولاۃ ھذا الامر فبر الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم۔	سعد! تم جانتے ہو، تمھاری موجودگی ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اچھے بُرے دونوں طرح کے لوگوں کی سرداری قریش میں ہے بھلے لوگ اُن کے بھلوں کے تابع ہیں، اور بُرے اُن کے بُروں کے۔

اس پر حضرت سعدؓ نے فرمایا:-

صدقت نحن الوزراء و انتم الامراء۔ (مسند احمد، مرویات ابی بکرؓ)۔	آپ سچ فرماتے ہیں (ہمیں منظور ہے کہ) امارت آپکی وزارت ہماری۔

لیکن ہم پرویز صاحب کو ایک اس سے بھی زیادہ مفید مطلب روایت کی نشاندہی کرتے ہیں، اور وہ بخاری کی وہی روایت ہے جس کا ہم نے بار بار حوالہ دیا ہے (اور مؤرخین بھی اس واقعہ میں اولاً اسی روایت کو درج کرتے ہیں) ہم اسکے یہ الفاظ پہلے بھی نقل کر چکے ہیں کہ انصار کے فضائل کا اعتراف کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:-

ولن یعرف ھذا الامر الا	لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اہل عرب اس

لهذا الحيّ من قريش هم اوسط العرب نسبًا ودارًا۔ — قبیلۂ قریش کے سوا کسی کی سرداری کو جانتے ہی نہیں، یہ اپنے نسب اور گھرانے (یا مقام[1]) کے اعتبار سے سارے عرب میں فائق ہیں۔

توکیا فرماتے ہیں پرویز صاحب۔ ان الفاظ میں یا وہ جو مسند احمد کی روایت میں حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے بطور حدیث مرفوع ادا ہوئے نسل پرستی کا تصور ملتا ہے؟ ——— پرویز صاحب تو جو چاہیں فرما دیں، لیکن دوسرا آدمی تو اُن کے ارشادات بھی تسلیم کر سکتا ہے جب اُن میں معقولیت ہو۔ نسل و نسب پرستی کا مطلب کون نہیں جانتا، کہ اس میں صرف فلاں نسل اور فلاں خاندان سے ہونا دیکھا جاتا ہے، اور محض یہی چیز وجہ ترجیح و وجہ تکریم بنتی ہے، لیکن یہاں خواہ بخاری کی روایت لے لیجئے، یا مسند احمد کی روایت، دونوں میں سے کسی کے بھی الفاظ میں یہ بات برائے نام بھی نہیں پائی جاتی، حضرت ابوبکرؓ نے نہیں فرمایا کہ قریش اپنے نسب کی بنا پر سرداری کے حقدار ہیں حضرت ابوبکرؓ کی پوری تقریر پڑھئے، وہ انصار سے صاف فرماتے معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بنا پر بیشک تم خلافت کے اہل ہو، مگر ایک نہایت قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ پوری عرب قوم اگر کسی کی امارت پر متفق ہو سکتی ہے تو وہ قریش ہیں، اسلئے کہ عرب مدتوں سے قریش ہی کی سرداری مانتے آرہے ہیں۔

بخاری کی روایت کی رو سے حضرت ابوبکرؓ نے یہ ضرور فرمایا کہ "یہ اپنے نسب اور گھرانے (یا مقام) کے لحاظ سے سارے عرب میں فائق ہیں"، مگر یہ اس بات کی دلیل کے طور پر نہیں کہ قریش ہی منصب خلافت کے حقدار ہیں۔ اسلئے کہ یہ بات تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمائی ہی نہیں، بلکہ انھوں نے یہ بات اس بات کی وجہ کے طور پر فرمائی کہ اہلِ عرب قریش ہی کی سرداری کو کیوں مانتے ہیں، کیونکہ یہی بات ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے فرمائی تھی (کہ اہلِ عرب قریش کے سوا کسی اور کی سرداری سے آشنا ہی نہیں) پس اسکے بعد "هم اوسط العرب نسبًا ودارًا" کہنا صرف یہی معنیٰ رکھتا ہے کہ یہ لوگوں کی نظر میں قریش کے مقام کی وجہ بیان کی جا رہی ہے، پس اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ قریش کے احق بالخلافت ہونے کی دلیل دی جا رہی ہے، تو اس کو جہالت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، اسلئے کہ قریش کا احق بالخلافۃ ہونا حضرت ابوبکرؓ کی تقریر میں کہیں مذکور ہی نہیں۔

---

[1] یعنی خانۂ کعبہ کا جوار۔

تو سیدھی اور صاف بات ہے کہ جن اصحاب کرام نے قریش کی امارت پر اصرار کیا، انھوں نے اس بنیاد پر نہیں کیا کہ قریش اپنے نسب کی بناء پر اس منصب کے حقدار ہیں، بلکہ اس بنیاد پر کیا کہ عرب مجموعی طور پر (کسی بھی وجہ سے) انھیں کو اپنا سردار مانتے ہیں، پس کیوں بلا وجہ مرکزِ قیادت تبدیل کیا جائے، اور جبکہ اتحاد و اتفاق اور اسلامی قوت کے استحکام کی شدید ضرورت ہے، کیوں ایک انتشار کا خطرہ مول لیا جائے؟ کیوں نہ انھیں میں سے کسی آدمی کو منصب خلافت دیا جائے، جبکہ اسلامی نقطۂ نظر اور قرآنی معیار سے بھی اس منصب کا ایک سے ایک اہل اِن کے اندر موجود ہے! ——— بیشک اگر ایسا ہوتا کہ اس حقیقی معیار کی رو سے کوئی اہل آدمی قریش کے اندر نہ ہوتا اور صرف اس بناء پر انھیں خلافت کے لئے ترجیح دی جاتی کہ قدیم سے انھیں کی سیادت چلی آرہی ہے، تو بھی یہ بات قابلِ اعتراض ہو سکتی تھی، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ قریش اس معیار کے اعتبار سے اس منصب کے اہل نہ تھے؟ انھیں میں سے تو ابو بکرؓ و عمرؓ تھے جو اس معیار سے بھی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے، اور انھیں میں سے تو مہاجرین اوّلین تھے جنھیں قرآن پوری امت پر فضیلت دیتا ہے اور انصار تک پر اُن کا ذکر مقدم کرتا ہے، ہاں یہ بیشک نہیں ہوا کہ ابو بکرؓ و عمرؓ اس پہلو سے بھی قریش کی اہلیت جتاتے، مگر اس سے کسی کو یہ دھوکا تو نہیں ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا، اور صرف مسلّمہ سیادت کی بناء پر وہ قریش کی امارت کے حق میں تھے۔

پرویز صاحب کا ایک مغالطہ

حسب و نسب کو معیار بنانے کے الزام پر جب ہم پرویز صاحب کی تقریر پڑھتے ہیں تو وہاں ایک بڑا عجیب مغالطہ سامنے آتا ہے، جس میں یا تو پرویز صاحب خود مبتلا ہیں، یا انھوں نے دوسروں کو مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے، پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ عزت و تکریم کا قرآنی معیار صرف تقویٰ اور حسن عمل ہے، رنگ و نسل اور ذات و قبیلہ کے امتیازات کو اس میں کوئی دخل نہیں، اور اس کے بعد "تاریخ" پر اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ دیکھو تاریخ کی رو سے پہلے اسلامی خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر صحابۂ کرامؓ نے اس اہم اصول کو توڑ دیا تھا ——— حالانکہ اسلامی خلافت کا منصب اصلاً کوئی عزت و تکریم کا منصب نہیں ہے، اور کسی کو خلیفہ بنانے کا بذاتہٖ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اُسے دوسروں کے مقابلہ میں کوئی خاص عزت و عظمت دی جا رہی ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ منصب اصلاً اور بالذات محض خدمت اور ایک خاص ذمہ داری کا منصب ہے اس میں اگر کوئی عزت ہے تو صرف اس معنیٰ میں کہ ایک بارِ عظیم کے لئے ایک شخص پر اعتماد کا اظہار کیا جاتا ہے نہ کہ اس کو زندگی اور معاملات میں کوئی امتیاز دیدینے کے معنیٰ میں۔ چنانچہ

یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت ایک عام مسلمان اور ایک خلیفہ میں کوئی فرق نہیں کرتی، علیٰ ہذا وہ اسلامی معاشرہ جو اصلی اسلامی شعور اور اسلامی ذہن کا حامل ہو قطعاً کوئی فرق ایک عام مسلمان اور ایک خلیفہ میں روا نہیں رکھتا، ایسے اسلامی معاشرہ میں برسرِ منبر خلیفہ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں سنیں گے جب تک یہ نہ بتا دو کہ تمہارے جسم پر فلاں کپڑے کی دو چادریں کہاں سے آگئیں، جب کہ تمام مسلمانوں کے پاس اس کپڑے کی ایک ہی ایک چادر ہے! اور خلیفہ کو بلا ناگواری کے سننا پڑتا ہے، اور ایک عام آدمی کی طرح صفائی دینا پڑتی ہے۔ ایسے اسلامی معاشرہ میں برسرِ منبر ہی خلیفہ سے تلوار دکھا کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر تم ٹیڑھے چلوگے تو ہم اس سے تمھیں سیدھا کر دینگے، اور ایک صحیح اسلامی اسپرٹ رکھنے والا خلیفہ اس پر جز بز ہونے کے بجائے مسرور ہوتا ہے، کہ امت کا ذہن ٹھیٹ اسلامی ہے۔ خلیفہ کو بیشک ایک عزت حاصل ہوتی ہے مگر اپنی خدمات اور عظیم ذمہ داریوں کے تحمل کی بناء پر۔ رہا نفس خلیفہ بنایا جانا، تو یہ قطعاً کوئی اعزاز و تکریم کا عمل نہیں ہوتا، یہ کوئی قیصریت اور کسرویت تھوڑے ہی ہے کہ مجرد تختِ سلطنت پر بٹھا دیئے جانے سے ایک شخص دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے، اسکے حقوق الگ ہو جاتے ہیں، اس کا پیمانۂ حقوق جدا ہو جاتا ہے، وہ دوسروں کو سلام نہیں کرتا، اسے سلام کیا جاتا ہے، وہ دوسروں کے لئے نہیں اٹھتا، اس کے لئے اٹھا جاتا ہے، اسکے برابر بیٹھنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کی موجودگی میں سرے سے بیٹھنا ہی اس کی اذنِ خاص پر موقوف ہوتا ہے وہ گرجتا ہے، جبکہ دوسروں کی عاجزانہ لب کشائی تک اس کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے۔

غرض جب استخلاف (خلیفہ بنائے جانے کا عمل) اپنی ذات سے کوئی اعزاز و تکریم کا عمل ہی نہیں، تو یہاں یہ سوال اٹھانا ہی بے محل ہے کہ قرآن نے عزت و تکریم کا کیا معیار مقرر کیا ہے یہاں تو یہ دیکھا جائے گا، کہ جو خدمات اور جو ذمہ داریاں کسی کے سپرد کرنے کا نام "استخلاف" ہے، اس کیلئے اللہ کا کیا حکم ہے؟ تو قرآن نے ہر قسم کی ذمہ داریوں کے لئے عمومی طور پر بتایا ہے، کہ:-

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔	اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ جملہ قسم کی امانتیں انکے اہل کے حوالے کرو!۔

اس قرآنی حکم کے بموجب امر واقتدار کی امانت اور خلافت کی ذمہ داریاں انھیں لوگوں کے سپرد کی جائیں گی جو اس کے اہل ہوں گے، اور اہلیت کا معیار، نصب خلافت کا مقصد، کار خلافت کی نوعیت اور اس کی تمام جہتوں کو سامنے رکھنے سے خود بخود واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ جس طرح نصب خلافت کے بنیادی مقصد کو

دیکھتے ہوئے یہ بالکل واضح بات ہے، کہ خلیفہ کی زندگی سرتاسر اسلامی ہونی چاہئے اور جس طرح اسکی ذمہ داری کی مختلف جہتوں کو دیکھتے ہوئے کسی جہت کی رو سے ضروری قرار پاتا ہے کہ اس کو دین و شریعت کے علم میں راسخ ہونا چاہئے کسی جہت کی رو سے ضروری قرار پاتا ہے کہ اس میں اجتہاد کی صلاحیت ہونی چاہئے کسی جہت کی رو سے لازم ہوتا ہے کہ اس میں تدبر اور جہاں بانی کی استعداد ہونی چاہئے، اسی طرح کارِ خلافت کی نوعیت پر نگاہ کرنے سے یہ بات اشد ضروری نظر آتی ہے کہ خلافت کے منصب پر ایسے شخص کو بٹھایا جائے جس پر امت کا زیادہ سے زیادہ حصہ متفق ہو سکے۔ یہی صورت ہے جس میں خلیفہ اپنی ذمہ داریاں بہتر طریقے پر ادا کر سکتا ہے ورنہ یا تو وہ ناکام ہو جائے گا، یا اُسے لوگوں کو تابع فرماں بنانے میں سخت جد و جہد کرنی پڑے گی۔

ظاہر ہے کہ جب ایسے اشخاص موجود ہوں جو دوسرے تمام شرائط کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتے ہوں، تو عام عقل و دانش کا فیصلہ بھی یہی ہوگا، اور دینی تفقّہ کا بھی یہی تقاضہ ہوگا کہ ایسے ہی اشخاص کو اس منصب کیلئے ترجیح دی جائے ——— خواہ ایسا بھی کیوں نہ ہو کہ نفس تقویٰ میں کوئی دوسرا شخص اور دوسرے اشخاص بڑھے ہوئے ہوں! اسلئے کہ مجرد تقویٰ سے خلافت کی تمام ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکتیں۔

پس جن صحابۂ کرام نے "تاریخ" کے بیان کی رو سے، قریش کی ترجیح کا سوال اٹھایا انھوں نے اسی اصول پر اُٹھایا تھا ——— قطعاً غلط ہے یہ خیال کہ انھوں نے عزت و تکریم کے قرآنی معیار کو نظر انداز کر دیا۔ یہاں قطعاً کسی کو کوئی عزت نہیں دی جا رہی تھی، کسی کو تاج نہیں پہنایا جا رہا تھا، کسی کو تخت پر نہیں بٹھایا جا رہا تھا، کسی کو "ظل اللہ" نہیں بنایا جا رہا تھا! یہاں ایک بارِ خدمت تھا جو کسی کے سپرد کرنے کا سوال تھا، اور اُس کیلئے یہ دیکھنا ضروری تھا، کہ کون اس بار کو بہتر طریقے پر اُٹھا سکتا ہے۔

لوگ خلافت کی حقیقت کو سمجھتے نہیں، یا اس کا صحیح تصور ذہن میں رکھتے نہیں، خلافت کا لفظ بولتے ہیں، اور تصور میں لے آتے ہیں سلطنت و بادشاہت اور اسکے لوازم کو، اور پھر پریشان ہونے لگتے ہیں۔ یا پرویز صاحب جیسے لوگ، لوگوں کی اس کم نظری سے فائدہ اٹھا کر انھیں ورغلانے لگتے ہیں کہ تمھاری "تاریخ" تو خلافت کے معاملہ میں صحابۂ کرامؓ کو قبائلی تفریق کے نظریہ پر عمل پیرا دکھاتی ہے، یا وہ دیکھو "تاریخ" کے فلاں جھروکے سے نظر آتا ہے کہ فلاں بلند مرتبہ صحابی خود سے خلافت چاہتے تھے۔ حالانکہ خلافت کے اسلامی تصور میں نہ کوئی جاہ و عزت ہے، نہ تاج و اورنگ ہے، نہ دوسرے مسلمانوں پر خلیفہ کی کوئی برتری، بلکہ صرف اور صرف ایک

بارِ خدمت ہے، جو اس لفظ کے مثالی تصوّر کے اعتبار سے اس طرح اٹھایا جاتا ہے کہ خلیفہ مسجد کے بوریہ پر بیٹھتا ہے، دوسرے مسلمان اسکے پاس بیٹھے ہوں تو کوئی ظاہری امتیاز نہیں نظر آتا، کوئی اجنبی آئے تو قیاس سے خلیفہ کو متعین نہیں کر سکتا، بیت المال کا کوئی جانور گم جائے تو وہ تپتی دھوپ میں اسکے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے، جانوروں کو خارش ہو جائے تو اپنے ہاتھ سے دوا لگاتا ہے، کسی غریب کی فاقہ مستی کی خبر ہو جائے تو اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد کر پہنچاتا ہے، اسکے بچے منھ میٹھا کرنے کو ترستے رہتے ہیں، اور عید کے دن تک انھیں نئے کپڑے پہننے کو نہیں ملتے۔

صحابۂ کرام رضؓ خصوصاً مہاجرین وانصار میں سے السابقون الاوّلون خلافت کا یہی تصوّر رکھتے تھے، اور وہ سب خلافت کو اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ اس میں بجز اُخروی سعادت کے اور کوئی منفعت نہیں، جیسا کہ خلفائے راشدین کے عہدِ خلافت کا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ اس پر شاہد ہے، پس ایسے ماحول میں اگر کہا جاتا ہے کہ خلافت فلاں قبیلہ میں ہونی بہتر ہے تو کسی معقول آدمی کے ذہن میں یہ وسوسہ تک نہیں آنا چاہئے کہ کسی قبیلہ کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی برتری دی جا رہی تھی، یا ایسے ہی اگر کسی بلند مرتبہ صحابی کے متعلق نظر آتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ خلافت انھیں ملے، تو ایسے ماحول میں اور ایسے افراد کے بارے میں اس کی کوئی توجیہہ بجز اسکے معقول نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کام کیلئے دوسرے کسی متوقع شخص کے مقابلہ میں خود کو زیادہ اہل سمجھتے تھے ——— ایسی صورت میں (کہ اُن کا یہ احساس تھا) اگر خلافت کے ساتھ کسی قسم کا دنیوی اعزاز، کوئی برتری، کوئی مظاہرۂ شان وشوکت وابستہ ہوتا تب بیشک ایک رائے یہ ہو سکتی تھی کہ وہ تنزّہ برتتے تو زیادہ اچھا ہوتا، لیکن جب خلافت کے لوازم کا تخیل اسکے برعکس یہ ہو کہ آدمی خود کو مٹا دے، موٹا جھوٹا کھائے، موٹا پہنے، برتری کے بجائے فروتنی اُس کا شیوہ ہو، اور عزّت مآبی کے بجائے خاکساری اس کی زندگی کا عنوان ہو، تب تو اللہ کی، اسکے رسول کی اور امتِ مسلمہ کی خیر خواہی، جو ایک مسلمان کا فرض ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ایسے موقع پر (کہ آدمی دیکھتا ہے کہ دوسرا شخص جس کو خلیفہ بنایا جانا متوقّع ہے وہ فلاں وجہ سے بارِ خلافت کو اٹھانے کا کما حقہٗ اہل نہیں ہے، اور اسکے برعکس اُسے اپنے اوپر اعتماد ہے) اگرچہ کھُل کر تو اپنے آپ کو پیش نہ کرے کہ یہ ہدایتِ نبویؐ کے خلاف ہے[1] البتہ اگر لوگوں کی طرف سے اس کو موقع دیا جا رہا ہے تو خود کو ہرگز پیچھے

---

[1] حدیث میں آتا ہے، کہ "لا تسئل الامارة" الحدیث "امارت خود سے طلب نہ کرو۔ الخ

(رواہ البخاری ومسلم، عن عبد الرحمٰن بن سمرةؓ)

نہ ہٹائے، اسلئے کہ ایک طرف یہاں اسلام اور مسلمانوں کی خیر اندیشی کا سوال ہے، اور دوسری طرف تنزہ برتنے کا کوئی موقع نہیں۔

ہم صاف ہی صاف کیوں نہ کہدیں کہ مثلاً حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کے نامزد کئے ہوئے چھؓ حضرات میں سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما دؓو ایسے اصحاب رہ جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے حق میں دستبردار نہیں ہوتے، تو جو لوگ اس ماحول سے آنکھیں بند کرکے اپنے ماحول میں لاکر اس واقعہ کو دیکھنے لگتے ہیں، اور خلافت کے اُس وقت کے تصور کے بجائے آج کل کے مسخ شدہ تصوّر کو ذہن میں لئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ پریشان ہونے لگتے ہیں کہ ایسے عالی مرتبہ اصحاب کیسے "حبِ جاہ" کی کیفیت میں مبتلا ہوگئے! یا پرویز صاحب جیسے لوگ ہوں تو وہ جھٹ سے تاریخ کی گردن مارنے پر تُل جاتے ہیں کہ یہ تو بڑا غلط تأثر صحابۂ کرامؓ کے متعلق دیتی ہے، مگر جو لوگ اس واقعہ کو اپنے ماحول کے بجائے اسکے اصلی ماحول میں رکھ کر دیکھتے ہوں، اور خلافت کا وہ تصوّر ذہن میں رکھتے ہوں جو اُس ماحول میں تھا، انھیں ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی پریشانی پیش نہیں آسکتی!۔

پس تاریخی روایات کی چھان پھٹک ضرور کیجئے، مگر اس سے پہلے اپنے تصورات اور زاویۂ نظر کی بھی اصلاح کیجئے، کہ تاریخی الجھنوں میں بہت کچھ دخل اس کا بھی ہوتا ہے۔　　(باقی آئندہ)

تعارف وتبصرہ

درس قرآن

مرتبہ درس قرآن بورڈ، صفحات ۶۴۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر، ——— مجلد قیمت -/۱۰

شائع کردہ :——— ادارۂ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ، لاہور

ناظرین الفرقان واقف ہیں کہ ادارۂ اصلاح وتبلیغ لاہور سے درس قرآن کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں پورے قرآن مجید کی مسلسل تشریح وتفسیر اس انداز سے کیجا رہی ہو کہ ایک ایک دو دو آیتوں کو ایک سبق کی حیثیت دے دی جاتی ہو، اس سبق کا ایک عنوان مقرر کیا جاتا ہو اور اس عنوان کے محور پر ایک صفحے میں ان آیات کی تشریح کی جاتی ہو، تشریح وتفسیر سے پہلے ان آیات کا ترجمہ بھی اس طریقے سے درج کیا جاتا ہو کہ آدمی کو ہر ہر لفظ کے معنیٰ الگ الگ معلوم ہو جائیں، اس طرح ہر شمارہ میں پندرہ سبق ہوتے ہیں، یہ سلسلہ مفید ثابت ہوا ہو، اور لوگوں نے اسے کافی پسند کیا ہو۔ اس طرح جب قرآن کی پہلی منزل (سوا پانچ پاروں) کے اسباق مکمل ہو گئے تو ادارۂ اصلاح وتبلیغ نے ان سب کو یکجا کتابی شکل میں شائع کر دیا ہو۔ یہی مجموعہ اس وقت زیر تبصرہ ہے ان قرآنی اسباق کی ترتیب کا کام ایک بورڈ نے انجام دیا ہو جو ان حضرات پر مشتمل ہے۔

مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی، مولانا حافظ مرغوب احمد صاحب توفیق

حاجی عبدالواحد صاحب ایم اے اور حافظ نذر احمد صاحب۔

ہمارے نزدیک یہ تجویز بہت اچھی ہوئی کہ درس قرآن کے اس سلسلہ کو اس طرح چند جلدوں میں مدوّن کر دیا جائے۔ اب ایک طرف یہ چیز زیادہ وقیع بھی ہو گئی اور دوسری طرف اس کا افادہ مستقل بھی ہو گیا۔ ہمیں امید ہو کہ لوگ اس تحفہ کی قدر کریں گے، ہر مسلمان گھر میں عموماً اور مساجد

میں خصوصاً اس کا ایک نسخہ ضرور رہنا چاہیے۔ بلکہ لڑکیوں کو جہیز میں دینے کے لیے بھی اس تحفہ کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ

از جناب خلیق احمد صاحب نظامی استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر صفحات ۲۱۲، سائز ۲۰×۲۶/۱۶ مجلد قیمت ۴/۵۰ غیر مجلد ۳/۵۰ ناشر:- ندوۃ المصنفین، دہلی

۱۹۵۷ء میں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے صد سالہ جشن کا غلغلہ آزاد ہندوستان میں بلند ہوا تو جب سے اب تک کتنی ہی چیزیں اس یادگار تاریخی واقعہ سے متعلق نکل چکی ہیں۔ شاید اسی تحریک کا نتیجہ یہ تاریخی روزنامچہ ہو جو خلیق صاحب نے ایڈیٹ کرکے پیش کیا ہو ــــ

خلیق صاحب نے اپنی محنت (اپنے فن (تاریخ) سے ذوقی مناسبت اور گہری دلچسپی کی بنا پر) ادھر چند ہی سال میں اس موضوع پر تصنیف و تالیف میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہو، اور یہ ان کا تازہ کارنامہ ان کی اس شہرت کے عین مطابق ہو، یہ عبداللطیف نام ایک شخص کے قلم کا روزنامچہ ہو جو قلعۂ دہلی کے ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے ۱۴ رستمبر ۱۸۵۷ء تک کے روزمرہ واقعات اور ہنگامہ کارزار سے متعلق موصولہ اطلاعات پر مشتمل ہو۔ اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب (پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کے خیال کے مطابق اس دور کے روزنامچوں میں سب سے زیادہ مستند روزنامچہ ہو ــــ (پیش لفظ)

اصل روزنامچہ فارسی میں ہو، اور یہ کتاب کا ایک حصہ ہو۔ دوسرے حصہ میں اس کا مسلسل ترجمہ ہو۔ آخری حصہ میں خلیق صاحب نے ان اشخاص کا تعارف دیا ہو جن کے نام روزنامچہ میں آئے ہیں ــــ روزنامچہ سے پہلے مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہو جو افادیت میں ہمارے نزدیک اصل کتاب سے کہیں بڑھا ہوا ہو۔ ۱۸۵۷ء کے اس یادگار واقعہ پر مختلف پہلوؤں سے اتنی جچی تلی بحث پر موصوف کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہو۔

عبداللطیف بہادر شاہ کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ کرتا ہو، مگر مجاہدین آزادی کی جانب اس کا رویہ انتہائی حقارت اور مذمت آمیز ہو۔ خلیق صاحب کا خیال ہو کہ اس درجہ مذمت اور تحقیر تلافی ہو کہ یہ ماحول کی رعایت سے مصنوعیت ہو اور در اصل اس کے جذبات اس کا عکس ہیں جنھیں سیدھے طریقہ پر ظاہر کرنے سے وہ مجبور رہا ہو ــــ اور یہ بات کسی حد تک دل کو لگتی ہو۔

سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات

از جناب خلیق احمد صاحب نظامی

ضخامت ۴۸۵ صفحات، سائز متوسط (۲۰×۲۶/۸×۱)

کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت مجلد -/۹، غیر مجلد -/۸

ناشر: ــــــــــــ ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار، جامع مسجد دہلی

اس کتاب میں سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان ابراہیم لودی تک تمام سلاطینِ دہلی کے مذہبی افکار وعقائد کا اس انداز سے جائزہ لیا گیا ہے کہ ایک طرف ان سلاطین کی شخصی زندگی میں اسکے اثرات واضح ہوجائیں تو دوسری طرف نظامِ حکومت پر بھی اس کے اثرات کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہوسکے۔

مصنف نے اس کام کے لیے پچاسوں قلمی اور مطبوعہ ماخذوں کو کھنگال کر مواد فراہم کیا ہے اور پھر بڑے سلیقے سے اُسے کتاب میں پھیلایا ہے۔ اس کاوش میں اُن کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ سلاطین کی جو تصویر بنائی جائے، اس کے رنگ صرف سیاسی مورخوں ہی سے حاصل نہ کیے جائیں۔ بلکہ سماج کے جس طبقہ کی رائے ان کے متعلق حاصل ہو سکے اس کا پتہ لگایا جائے" اور اس ضمن میں انھوں نے اس دور کے مشائخ کے ملفوظات اور مکتوبات کی طرف خاص طور سے توجہ کی ہے ــــ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ مصنف ہی کے قلم سے ہے جو کئی کارآمد مباحث پر مشتمل ہے، خصوصاً "ان سلاطین کے مذہبی افکار وعقائد کے نشو ونما کی بحث (جس میں ان حکمران خاندانوں کے ہندوستان آنے سے قبل اور ہندوستان آنے کے بعد کا دہ نسلی، تمدنی، معاشرتی اور دینی احول دکھایا گیا ہے جس میں ان کے افکار وعقائد کا نشو ونما ہوا) ان سلاطین کے بارے میں بہت سی ذہنی گرہوں کو کھولتی ہے۔ "تاریخ اسلام میں سلطنتِ دہلی کا مقام" اور "سلطنت دہلی میں مذہب کی حیثیت" بھی مفید بحثیں ہیں۔ گو کہ اول کے متعلق ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی پختہ کار عالم دین کی نظر سے گزر جاتی۔

کتاب میں سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد بن تغلق کا تذکرہ دوسرے سلاطین کے تذکروں کی بہ نسبت، اس حیثیت سے ممتاز نظر آتا ہے کہ اس میں بحث ونظر کا عنصر زیادہ ہے۔ یہ دونوں سلطان اپنی بعض کامیابیوں اور بعض اطوار کی بنا پر مذہبی طبقوں میں بدنام ہیں۔ مصنف نے کافی کوشش

ان کی صفائی کی گئی ہے۔

کتاب کی ایک خصوصیت اور قابل ذکر ہے کہ اس میں مشائخ وصوفیا سے ان سلاطین کے تعلقات کا بیان کافی تفصیل سے کیا گیا ہے ــــ ہماری رائے ہے کہ اس کتاب سے لوگ مختلف پہلوؤں سے استفادہ کرسکیں گے۔

کتاب کا تعارف پروفیسر محمد حبیب صاحب کے قلم سے ہے۔ ہمیں اس کے متعلق بھی دو باتیں کہنی ہیں۔

۱۔ حبیب صاحب نے لکھا ہے کہ "رسول اکرمؐ نے وسیع وعریض ریاستوں کی تنظیم کے بارے میں چونکہ کوئی ہدایت نہیں چھوڑی تھی اس لیے بقول خلیق صاحب موضوع احادیث کے ذریعہ اس خلار کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی۔" (صفحہ ۲) ہماری دانست میں خلیق صاحب نے "اس خلا" کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا اور اگر کہیں سے اُن کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے تو یقیناً صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک تنظیمی جزئیات کا تعلق ہے؟ تو ان کا استقصا تو کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ رہے اُصول تو ان کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خلار نہیں چھوڑا، اور پھر آپ کے خلفار راشدین نے ان کے عملی انطباق سے اس کی گنجائش بھی ختم کردی کہ کسی شخص کو بادی النظر میں رسول اکرم کی ہدایات میں یہ خلار نظر آئے۔ ہمارے خیال میں خلیق صاحب نے موضوع احادیث کے ذریعہ جس خلار کو پُر کرنے کا ذکر کیا ہے وہ اس دور کے علمار میں اجتہادی صلاحیت کا خلار ہے نہ کہ کتاب وسنت کی تعلیمات میں وسیع وعریض سلطنتوں کی تنظیم کے متعلق ہدایات کا خلار!

۲۔ ایک طرف تو حبیب صاحب کا ارشاد ہے کہ "اس زمانہ کی فضا کچھ اس انداز سے تربیت پائی تھی کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی، اگر ترکِ دنیا اور خدمتِ خلق کے (ایک خاص) تصور سے عاری ہوتی تھی ...... تو ایسی مذہبیت بے اثر ہوتی تھی اور عوام اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے" دوسری طرف حبیب صاحب علاء الدین [illegible] جیسے سلاطین کے متعلق، جن کی زندگی میں مذہبیت زیادہ نظر آتی ہے، فرماتے ہیں کہ ان کا یہ مذہبی رنگ [illegible] تھا، سلاطین ان کو وہ "گرگ باراں دیدہ" [illegible] کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے "گرگ باراں دیدہ" تھے کہ زمانے کی [illegible] کو نہیں پہچان سکے اور

نمائش کی ایک عبث ریاضت کرتے رہے؟

اس تضاد کے علاوہ ایک دوسرا تضاد حبیب صاحب کے فکر میں یہ ہے کہ جب وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہوئے ہیں کہ "لوگ بہت اپنی رائے دنیاوی تقاضوں کی بنیاد پر قائم کرتے رہے۔ انھوں نے (ان تقاضوں کی بنیاد پر) بادشاہ کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی وفاداری کو برقرار رکھا" تو بلبن کے متعلق مذہبی نمائش کے اس فعل عبث کی ضرورت انھیں کیونکر محسوس ہوئی ہے؟ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ اس نے "نہایت ہی پُرفتن دور میں لوگوں کو آرام و آسائش کی زندگی بہم پہونچائی تھی۔" (زیر تبصرہ کتاب ص۱۵۲)

ریا و نمائش کا مجرد امکان تو اپنی جگہ پر، مگر یہ حقیقت ہے کہ بلبن کی مذہبیت کی تفصیلات پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ ایک نمائشی روپ اور "سیاسی حکمت عملی" کا ایک حصہ تھا، اگر اس کی مذہبیت اس کی زندگی تک محدود ہوتی تو یہ بات سوچی جا سکتی تھی۔ اور خاص "سیاسی حالات" کے پس منظر میں اس کی "توجیہ" کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کے اس طرز عمل کی توجیہ نمائش سے کیسے کی جائے کہ

(۱) "اگر کبھی یہ سُن پاتا کہ شہزادہ محمد یا شہزادہ محمود سے ایک وقت کی نماز بھی فوت ہو گئی ہے یا نماز فجر کے وقت سوتے رہ گئے اور جماعت سے نماز ادا نہ کر پائے تو ایک مہینے تک اُن سے بات نہیں کرتا تھا۔"

(زیر تبصرہ کتاب ص ۱۵۸)

(۲) "اگر کسی شخص میں زہد و صلاح کی خوبیاں نہیں ہوتی تھیں تو کوئی اہم اسکے سپرد نہیں کرتا تھا۔"

(ایضاً ص۱۵۶)

اور کیونکر ایک نمائشی انسان سے اس اصلاحی جد و جہد کی توقع کی جا سکتی ہے کہ

"اُس نے شراب نوشی اور غیر مشروع حرکات کو اپنے ملک سے اُکھاڑ پھینکا۔" (ایضاً)

"اُس کے ڈر سے لہو و لعب کی تمنا لوگوں کے دل سے نکل گئی اور شراب و

شاہ کا نام تک بھی خانان و ملوک کی زبان پر آنا بند ہو گیا۔" (ص ۱۵۵)

اور مختصر یہ کہ

"اس کے زمانہ میں تقویٰ اور پاکیزگی کو رواج ہوا۔" (ص ۱۵۶)

درحقیقت اگر ہم بلبن کی فواحش و منکرات میں ڈوبی ہوئی سابقہ زندگی اور سلطنت کے بعد بھی مصالح سیاسیہ میں اس کی سخت گیرانہ روش کے درمیان اس کی زندگی کے اس مذہبی پہلو کی کوئی معقول توجیہ کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ رسالت محمدی کا اعجاز تھا کہ جب الغ خان جیسے افراد سلطان غیاث الدین بلبن کے اس مقام پر آئے جہاں سے ان کی زندگی کا اثر امت کے اخلاق و کردار پر پڑتا تو "ان کی آن میں الناس علیٰ دین ملوکھم" کے پیش نظر انھیں اپنی ذمہ داریوں کا اس طرح احساس ہو گیا کہ خود بھی نیکی کیا اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی کہ

(۱) "ہر معاملہ کہ در امور جہانداری با بندگان خدا ورزد، چناں ورزد کہ بندگان خدا از امر و امارت و قول و فعل و اوصاف و اخلاق او بر جادۂ شریعت و معاملت زندگانی رانند و از فسق و فجور و معاصی و آثام بطاعت و عبادات و حسنات و مبرات گردانیدہ در دنیا سزاوار احسان و در عقبیٰ مستحق نجات گردند۔"

(کتاب ہذا ص ۱۰۲ بحوالہ تاریخ فیروز شاہی)

(۲) "فسق و فجور را در کام فاسقان و فاجران و عاصی و مذنباں تلخ تر از زہر سازد۔" (ص ۱۷۱)

لیکن جو لوگ تاریخ کی مادی توجیہ ہی کے قائل ہیں، وہ شاید اس غیر مادی عامل کی کار فرمائیوں کو سمجھ نہیں سکتے، خواہ مادی توجیہ پر انحصار کرنے سے کیسے ہی چند در چند خلا ان کی رائے میں نمایاں ہو جائیں۔

---

(۱۰) ابن ماجہ اور علم حدیث | از مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی

صفحات ۳۰۰، سائز متوسط (۲۰×۲۶/۸) مجلد

۲۔ بُستان المحدّثین

تالیف حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ترجمہ مولانا عبدالسمیع دیوبندی
صفحات ۲۲۶ سائز $\frac{20 \times 26}{16}$ مجلد قیمت -/۵ روپے

ناشر:۔ نور محمد اصح المطابع و کارخانۂ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ کراچی

مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی ایک صاحب نظر عالم دین ہیں۔ لغات القرآن (شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی) کے ۳ یا ۴ حصے جو انھوں نے تالیف کیے ہیں، اُن کے علم و نظر کی اچھی شہادت ہیں ــــــ حدیث خاص طور پر ان کا فن ہو۔ اس فن شریف سے متعلق بھی ان کی ایک تصنیفی خدمت "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجۃ" کے نام سے اہل علم کی نظر میں تحسین پا چکی ہے۔ ابن ماجہ پر ان کا یہ دوسرا کام ہو جو بظاہر تو ابن ماجہؒ کی سوانح عمری اور حدیث سے متعلق اُن کی خدمات کا تفصیلی تعارف ہو۔ مگر اس انداز سے ترتیب دی گئی ہو کہ ضمن میں تدوین حدیث کی پوری تاریخ مدوّن ہو گئی ہے۔

ابن ماجہ، ان کا وطن اور احوال، ان کے معاصرین، اس زمانہ کے مراکز علوم دینیہ، اور شیوخ و ائمہ حدیث۔ طلب علم میں ابن ماجہؒ کے اسفار: وہ شیوخ جن سے امام موصوف نے استفادہ کیا۔ اور ابن ماجہ کی تصنیفات و تالیفات ـــــ یہ تقریباً سوا سو صفحے کے مباحث کا خلاصہ ہو جن کا خاتمہ سُنن ابن ماجہؒ کے تذکرہ پر ہوا ہے۔ یہاں سے فاضل مؤلف نے سُنن ابن ماجہ کے مقام پر روشنی ڈالنے کے لیے حدیث کی دینی حیثیت، اس کی کتابت اور اس کی تدوین کے مختلف مراحل و ادوار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اس طرح کتاب سو صفحے اور آگے بڑھ گئی ہے۔ اس بیان میں عہد رسالت کے نوشتوں سے لے کر تیسری صدی ہجری کے مؤلفات حدیث سے گزرتے ہوئے، مؤلف پھر سنن ابن ماجہ پر پہونچ جاتے ہیں اور یہاں سے سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار، ان صحاح میں اُس کا درجہ، اُس کی احادیث کی صحت کی بحث اور اس کی شروح تعلیقات وغیرہ کے بیان پر دس پندرہ صفحے ہیں۔

اخیر میں کتاب کا ایک نہایت جامع اشاریہ (انڈکس) ہو جو تھوڑے نہیں سو صفحات کی ضخامت کا ہو۔

امید ہو کہ اہل علم میں مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی یہ خدمت قدر کی نگاہ سے

دیکھی جائے گی اور منکرین حدیث کے بہت سے اعتراضات کی لغویت اس کتاب کے مباحث سے خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔

۲۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی فارسی تالیف (بستان المحدثین) کا ترجمہ ہے جو آج سے ۲۵ سال قبل کا کیا ہوا ہے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے یہ کتاب اس ضرورت کے پیش نظر مرتب فرمائی تھی کہ دینی لٹریچر میں کتب احادیث کے حوالے چونکہ بکثرت آتے ہیں اور عوام ان کتابوں سے کم آشنا ہوتے ہیں، اس لیے تمام ضروری کتابوں کا مختصر تعارف ہو جائے ——— اس نقطۂ نظر سے یہ بڑی مفید اور کامیاب کتاب ہے۔ کتابوں کے ساتھ ان کے مؤلفین کا تعارف بھی قدرتی طور پر آگیا ہے ——— جن لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کی رعایت سے اس کا بھی پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ کتابوں اور ناموں کا صحیح تلفظ ظاہر کیا جائے۔

حیات امام احمد بن حنبلؒ

تالیف پروفیسر محمد ابوزہرہ (مصری)، ترجمہ رئیس احمد جعفری۔ سائز $\frac{20 \times 26}{16}$ صفحات ۵۰۸ مجلد قیمت دس روپے۔

شائع کردہ :- المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی دو حیثیتوں سے مسلمانوں میں عام طور پر معروف ہیں، ایک یہ کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں، دوسرے یہ کہ حق کے لیے انھوں نے تعذیب وعقوبت کے ایک طویل اور زہرہ گداز ابتلاء کا ایسی پامردی سے مقابلہ کیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

انھی امام احمد بن حنبلؒ کی مفصل سوانح عمری ہے جو مصر کے مشہور فاضل اور مصنف پروفیسر محمد ابوزہرہ نے ترتیب دی ہے اور اردو میں اسے جناب رئیس احمد جعفری نے منتقل کیا ہے۔ مولانا محمد حنیف بھوجیانی مالک مکتبۂ سلفیہ لاہور نے اسے بڑی آن بان کے ساتھ اپنے مکتبہ سے شائع کیا ہے، کاغذ سفید چکنا اور کتابت وطباعت کا معیار اعلیٰ ہے۔

کتاب بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں امام صاحب کی زندگی اور حالات و سوانح ہیں۔ فتنۂ "خلق قرآن" کے سلسلے میں آپ کے ابتلاء کی تفصیلات ہیں۔ آپ کی معیشت اور

ذرائع معیشت کا بیان ہو۔ آپ کے علمی اور اخلاقی صفات ہیں، آپ کے خاص خاص شیوخ و اساتذہ کا تذکرہ ہو۔ آپ کے معاصرین اور فکری ماحول کا بیان ہو۔ دوسرا حصہ امام صاحب کے علمی کاموں اور اس کام کی خصوصیات پر مشتمل ہو۔ اس ذیل میں آپ کے بعض افکار و آرا، حدیث اور فقہ کی خدمت۔ پھر آپ کی فقہ کی نقل و اشاعت اور اس کے ناقلین و ناشرین، آپ کی فقہ میں مختلف اقوال و روایات کی کثرت کے اسباب و وجوہ، آپ کی فقہ کے عمومی اوصاف۔ آپ کے اصولی استنباط، اُدلّہ اربعہ کے باب میں آپ کا مسلک اور اسی ذیل کے دیگر مباحث ہیں۔

اُردو میں امام احمد کی مفصل اور جامع سوانحعمری کی جو کمی تھی وہ اس ترجمے سے پوری ہو جاتی ہو۔ ترجمہ اردو کے ایک خاصے مشاق مصنف کے قلم سے ہو مگر شاید بڑی جلدی میں کیا گیا ہو اس لئے متعدد مقامات پر الفاظ اور جملے نظر ثانی کے محتاج رہ گئے ہیں۔ مثلاً ص۵۲ پر

"والد کی وفات ان کی ولادت کے بعد ہی واقع ہو گئی تھی جبکہ وہ تیس سال کے ابھی جوان عمر تھے۔"

ان خط کشیدہ الفاظ نے عبارت کو پیچیدہ کر دیا ہو۔ یوں بھی ان الفاظ کی ترتیب میں کھلا ہوا جھول ہے۔ صفحہ ۱۶۵ پر۔

"ایک مرتبہ امام احمد نے کسی موقع پر امام ابوحنیفہ کی فقہ سے اختلاف منہاج کے باعث عدم توافق کا اظہار کیا۔" ——— کس قدر ثقیل اردو ہے۔

ص۹۵ پر ——— "بہت زیادہ نکتہ آفرینیاں پیدا کیں" ——— "پیدا" بالکل زائد ہو۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ اور جملے ایسے نظر میں آتے ہیں اور کھٹکتے ہیں۔ ص۱۲۴ پر ایک جملہ نقطے دے کر نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے۔

پروفیسر ابوزہرہ نے ہمارے علم کی حد تک ایک نئی بات امام احمدؒ کے ابتلاء کے باب میں یہ پیش کی ہو کہ یہ (خلق قرآن کے مسئلہ میں) امام صاحب کی تعذیب و اذیت کی تمام تر ذمہ داری قاضی احمد بن ابی داؤد (معتزلی) پر عائد ہوتی ہو۔ مامون بالکل بری الذمہ ہو۔ انھوں نے اس بات کو متعدد دلائل و قرائن سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہو ——— مصنف نے یہ بھی رائے

ظاہر کی ہو کہ مسئلہ میں معتزلہ کا موقف ہی صحیح تھا اور اس پر بھی انھوں نے بحث کی ہو — یہ مسئلہ پیدا کیونکر ہوا؟ اس کا پس منظر بھی مصنف نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہو۔

معتزلہ کے وجود اور حکومت میں ان کے اثر و نفوذ کے بارے میں مصنف کا خیال عام خیال کے برعکس یہ ہے کہ

"اس دور میں معتزلہ کا وجود ایک ناگزیر اور لابدی چیز تھی، یہی زمانہ تھا جب زندیق (گمراہ) لوگ پیدا ہوئے اور ابھرے، یہ لوگ ایسے افکار و آرا کا اظہار کرتے تھے جو اسلامی سوسائٹی کے لیے فتنہ و فساد کے موجب تھے۔ یہ ایسی سازشیں کرتے تھے جو اسلام کے لیے تباہ کن تھیں اور جن کی بنیاد مسلمانوں کے لیے کید و فریب اور اسلام کے لیے استخفاف پر تھی۔ .... یہ رنگ دیکھ کر خلفاء عباسیہ نے ایک طرف تو تلوار میان سے نکالی اور زنادقہ پر پل پڑے، اور دوسری طرف علماء کو اس طرف آمادہ کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ زیادہ تر معتزلہ ہی اس کے لیے میدان میں اترے۔ اور انھوں نے ان کے دلائل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ..... اُن کے یہ کارنامے دیکھ کر خلفاء نے بھی انھیں اپنا مقرب بارگاہ بنایا ...." الخ ص ۱۹۴

لیکن اس کے ساتھ ہی مصنف نے اس آغاز کا جو انجام بتایا ہو وہ بڑا سبق آموز ہو اور ہمیشہ کے لیے ایک آگاہی ہو — لکھا ہو کہ

"زنادقہ اور مجوس وغیرہ کا ردّ و مقابلہ جب اس امر کا موجب ہوا کہ معتزلہ بزعم خویش اسلام کی طرف سے دفاع اور اس کے اسلامی (؟) عقائد ثابت کرنے کے لیے استدلال کا ایسا طریقہ اختیار کریں جو بالکل نیا ہو، اس کا نشان سلف صالح، صحابہ اور تابعین کے یہاں کہیں نہیں ملتا تھا، انھوں نے فلسفہ کے اسلحہ سے اپنے آپ کو مسلح کیا اور ہجوم و دفاع کے سلسلہ میں ان اسلحہ کا بے محابا استعمال شروع کر دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حریف مقابل کے افکار و خیالات خود ان میں سرایت کر گئے" ص ۱۹۴-۱۹۵

اس کتاب کا دوسرا حصہ خاص طور پر قابل استفادہ ہو۔ ہم اپنے عربی مدارس کے منتہی

طلباء اور نئے فضلاء سے خاص طور پر اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

رہبر کامل

از مولانا عبدالمجید اصلاحی، ۱۰۴ صفحات، چھوٹا کتابی سائز، قیمت ۵ آنے
پتہ:- مکتبۃ الاسرار، کوزہ گھی، سورہن۔ اعظم گڈھ

یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ہے۔ اسلامی مکاتب[1] کے طلبہ درجہ چہارم کے لیے لکھی گئی ہے، انداز بھی ریڈروں کا سا ہے، ہمارے خیال میں اس کے ذریعہ طلبہ کو سیرت پاک سے اچھی خاصی واقفیت پیدا ہو سکے گی۔

طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۴۸ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔
پتہ:- مکتبۂ دارالعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یہ مولانا موصوف کا ایک مقالہ ہے جو پانچ برس پیشتر دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا، اس وقت یہ الفرقان میں شائع بھی ہوا تھا، مکتبۂ ندوۃ العلماء نے اس کو اب الگ سے شائع کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ اسے ہم آج کے دور میں طلبائے علم دین کے لیے ایک بہترین پیغام سمجھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ طلباء کے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ پہنچوایا جائے۔

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، صفحات ۴۰
پتہ:- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یہ مولانا کا ایک عربی مضمون کا ترجمہ ہے جو حال ہی میں الفرقان میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کی تاثیر اس سے ظاہر ہے کہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی تاسیس کا یہی محرک ہوا۔ مجلس کی طرف سے یہ الگ شائع کیا گیا ہے۔ آخر میں مجلس کا دستور العمل بھی دیا گیا ہے۔

---

[1] کتاب کی لوح پر مکاتیب لکھا ہوا ہے جو غلط ہے۔

ماہنامۂ نقش دیوبند

زیر ادارت مولانا انظر شاہ کشمیری ۔ صفحات ۴۰ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ گلیز ۔ سالانہ چندہ ۵/- ۔ فی پرچہ ۸/- ۔

پتہ:۔ دفتر نقش ، دیوبند

اس ماہنامہ کے مدیر حضرت مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند اور دار العلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل اور استاذ ہیں۔ چار شمارے آچکے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ نقش کے فاضل مدیر اپنے اس نقش کو چمکانے کے پوری طرح اہل ہیں۔ اور خوش قسمتی سے انھوں نے شروع ہی سے چند اچھے لکھنے والوں کا تعاون بھی حاصل کر لیا ہے۔ پیش نظر چوتھے شمارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے "جہنم کے دو سانس" کی تیسری اور آخری قسط ہے۔ باقی عزام پاشا مرحوم کے ایک مضمون کا ترجمہ۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون "اسلام اور اخلاق" خود مدیر رسالہ کا مضمون "آخرت کی پہلی منزل" اور دوسرے مضامین۔

"آخرت کی پہلی منزل" مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے جہاں بہت سے لوگ لطف اندوز ہوں گے وہاں بہت سے الجھیں گے بھی۔ خود مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی لوگوں کا معاملہ یہی تھا۔ اس لیے شاید یہ بہتر ہوگا کہ طرز تحریر میں ان کی تقلید کی کوشش نہ کی جائے۔ بہرحال ہم نقش کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس سے ملت اسلامیہ کو نفع پہونچے گا۔

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ و عہد ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے، اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اسی کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی کام پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

یا مقلب القلوب لا تزغ قلوبنا وثبتنا في الدنيا والآخرة

توفني مسلماً وألحقني بالصالحين

ادارۂ الفرقان

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہو کہ شاید آج تک اس کو کوئی خاص مقبولیت اور تاثیر عطا فرمائی ہو، پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔ زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے۔ کتابت طباعت حسن اور معیاری قسم اول کاغذ سفید چکنا مجلد ۔/۔/۔ قسم دوم کاغذ سفید چکنا غیر مجلد ۔/۔/۔

ہندی ایڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپے ۳/۔/۔

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی اشتراک تالیف ہو ایسی خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہو کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و محبت اور ذوق و شوق کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۲/۔/۔

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ جو کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت صرف ۔/۸/۔

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم رمضان اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۔/۱۲/۔

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہو کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے

قیمت .... ۔/۱۲/۔

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمہ دعوت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے موثر انداز میں کی گئی ہے کہ اس کے مطالعہ سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔ ۔ ۔/۱۲/۔

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۔/۲/۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۱/۸/۔

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت ۱/۰/۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر خاص مقدمہ اور مبسوط مقدمہ .... ۲/۸/۔

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۱/۸/۔

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ .... قیمت ۱/۰/۔

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید منور حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہو اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔ ...... قیمت ۔/۸/۔

جلد ۲۷	بابتہ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق نومبر ۱۹۵۹ء	شمارہ ۴

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے۔

لہٰذا رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ر نومبر تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار: ۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی پیلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت: ۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۱۵ر تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

قوموں کے اچھے مستقبل کی سب سے پہلی شرط ان میں اجتماعی نفع و ضرر کا شعور ہے۔ اس پیمانے سے جب ہم ہندوستانی مسلمانوں کی روش کو ناپتے ہیں، تو سچ یہ ہے کہ بڑی یاس طاری ہو جاتی ہے۔ ہم برسوں سے اس گھٹن میں مبتلا ہیں اور اس کے اثرات گاہے گاہے قلم کی زبان پر بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں کہ آخر کب تک ہندوستان کی امت مسلمہ اس شعور سے بے بہرہ رہے گی اور کیونکر یہ شب و روز بدلیں گے جن میں اچھے بُرے کی تمیز کے چند لمحات تک میسّر نہیں آتے؟۔

ایک تازہ واقعہ جس نے اس درد میں ایک نئی ٹیس پیدا کر دی ہے، یو۔پی کے حالیہ کارپوریشن الکشن ہیں۔ یہ الکشن یوں تو ریاست کے پانچ بڑے شہروں میں ہوئے، مگر ہمارے سامنے مخصوص لکھنؤ کا الکشن ہے۔ اسی کی تفصیلات سے ہمیں اتنی واقفیت حاصل ہو سکی ہے جس سے ہمارے سامنے اس الکشن میں مقامی مسلم آبادی کے رویہ کی تصویر واضح ہو سکے، اور ہم کوئی تبصرہ کر سکیں ــــــ اس الکشن میں مسلمانوں میں اجتماعی شعور و کردار کے فقدان نے بالکل غیر متوقع طور پر کامیابی کا سہرا جن سنگھ کے سر باندھ دیا، انتخابی نامزدگیوں سے پہلے اس بات کے دور دور تک بھی امکانات نہیں تھے کہ لکھنؤ میں جن سنگھ کو اکثریت حاصل ہو گی۔ لیکن نامزدگیوں کا اعلان ہونے پر پہلی بار یہ خطرہ سامنے آیا کہ جن سنگھ کو اکثریت حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بیشتر انتخابی حلقوں سے کئی کئی مسلمان امیدواروں کے نام سامنے آئے، یہ خطرے کی پہلی گھنٹی تھی لیکن اتنی صاف تھی کہ ہر شخص جو کان رکھتا ہو اس کی آواز سن سکتا تھا اور مسلمانوں کی عقل و بصیرت کے آنکھ کان اگر کھلے ہوئے ہوتے تو وہ اس خطرے کا سدباب کر سکتے تھے، لیکن خطرہ جن دماغوں میں پیدا ہوا تھا اسی بنیاد پر پیدا ہوا تھا کہ عام مسلمانوں میں اجتماعی فہم و شعور بالکل ناپید ہے، اور اسی حقیقت نے اس خطرہ کو اس دن واقعہ بنا کر سامنے کھڑا کر دیا جس دن بیلٹ بکس

کھول کر ووٹ شمار کیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہو کہ شمالی ہند کی ہندو آبادی کی غالب اکثریت اس وقت دو کیمپوں میں تقسیم ہو ایک کانگریس، دوسرا جن سنگھ۔ اس مقابلہ میں اگرچہ دیہاتوں میں جن سنگھ کا اثر کانگریس کے مقابلہ میں بہت کم ہو اور اسی لیے مجموعی لحاظ سے کانگریس کا پلّہ بہت بھاری ہو۔ مگر شہروں میں جن سنگھ کا اثر اچھا خاصا ہو۔ پھر خاص لکھنؤ کے بارے میں تو مسلمانان لکھنؤ اس حقیقت حال سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جن سنگھ یہاں اتنا اثر پیدا کر چکی ہو کہ پچھلے دنوں بیچ شہر میں واقع ہونے والے ایک مسلم ادارے کے خلاف بالکل بے سر پیر کے چند الزامات گھڑ کے وہ ایک عام ہڑتال کرانے میں کامیاب ہو گئی، درانحالیکہ اہل شہر پر یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ یہ الزامات من گھڑت ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح تھی کہ اس کارپوریشن الکشن میں ہندو ووٹروں کی ایک بڑی تعداد جن سنگھی امیدواروں کو سپورٹ کرے گی۔ اور یہ بھی معلوم تھا، اور اخباری نمائندوں کے بیانات سے انتخابی جد و جہد کے دوران میں بھی برابر معلوم ہوتا رہا تھا کہ اس معرکے میں سب سے زیادہ منظم طاقت جن سنگھ کی ہے۔ گویا حالات بھی جن سنگھ کے موافق تھے اور اس میں موافق حالات سے فائدہ اٹھانے کی بھی پوری پوری اہلیت تھی۔

اب وہ کون طاقت ہو سکتی تھی جو جن سنگھ کو اکثریت میں آنے سے روک سکے؟ صرف مسلمان ووٹروں کی یکجہتی کی طاقت! لیکن یا تو لکھنؤ کے مسلمان اس فکر سے بے نیاز رہے کہ جن سنگھ کی کامیابی کو روکنا اُن کا اوّلین ہدف ہونا چاہیے، یا اگر اُن کو اس چیز سے دلچسپی تھی بھی تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ انھوں نے اس غور و فکر کی زحمت بالکل گوارا نہیں کی کہ جن سنگھ کی کامیابی کے امکانات ختم کرنے کا واحد راستہ کون ہو سکتا ہو؟ اس کا واحد راستہ صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمان جن سنگھ کے مقابلہ کی کسی ایک غیر فرقہ پرست پارٹی کو جس کو ہندوؤں کی بھی ہر وارڈ میں کچھ حمایت حاصل ہو سکتی، اپنی حمایت کے لیے منتخب کر لیتے، سارے شہر کے مسلمان ووٹر ایک رائے نہیں ہو سکتے تھے تو ہر وارڈ کے مسلمان ہی ایک رائے ہو کر کسی ایسی پارٹی کے امیدواروں کی حمایت کا فیصلہ کر لیتے، حتیٰ کہ اگر یہ بھی ممکن نہیں تھا اور وہ کسی پارٹی کے کنڈیڈیٹوں سے دلچسپی لینے کے بجائے صرف مسلم کنڈیڈیٹوں سے دلچسپی رکھتے تھے تو آخری درجہ کی بات یہ تھی کہ کوئی سے بھی دو مسلمان کنڈیڈیٹ طے کر کے متفقہ طور پر انھیں کو ووٹ دیتے۔ بہرحال

بجھتی شرط تھی۔ جن سنگھ کی کامیابی کے خطرے کے سدباب کا واحد راستہ تھی اور اس کی درجہ بدرجہ یہ تین صورتیں ہو سکتی تھیں۔ مگر سر پکڑ کر رونے کو جی چاہتا ہے فہم و شعور سے دشمنی کا یہ تماشہ دیکھ کر کہ جس طرح ہر ہر وارڈ میں کھڑے ہونے والے مسلمانوں نے کئی کئی کی تعداد میں کھڑے ہو کر احزاب اور کرسی کے شوق میں مسلمانوں کے مفاد کو داؤں پر لگا دیا تھا، ٹھیک اسی طرح مسلم ووٹروں نے بھی ان میں سے ہر ایک کے شوق ممبری کو لبیک کہتے ہوئے اپنے ووٹوں کی طاقت کو پارہ پارہ کر لیا۔ جتنے بھی مسلمان امیدوار کسی حلقے سے کھڑے ہو گئے اُن میں سے ہر ایک کو تھوڑے بہت ووٹ دینے والے مل گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مسلمان امیدوار ہی جتنے جیت سکتے تھے جیت سکے اور نہ کانگرس اور پرجا سوشلسٹ پارٹی میں سے کوئی پارٹی ہی اکثریت حاصل کر سکی جسے مسلمان جن سنگھ کے مقابلے میں پسند کر سکتے تھے ـــــ پھر غضب پر غضب یہ ہوا کہ ہر حلقے سے دو نمائندے منتخب کرنے کے لیے ہر ووٹر کو جو دو ووٹوں کا حق ملا تھا بہت سے مسلم امیدواروں نے اس کے بجائے اگر خود غرضی اور حرص میں آ کر اپنے ووٹروں سے یہ خواہش کی کہ وہ تنہا انہی کے حق میں ووٹ ڈال کر اپنا دوسرا ووٹ بیکار کر دیں تو ووٹران باشعور نے اُن کی اس احمقانہ فرمائش پر بھی لبیک کہا اور یہی کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے ہی کانگرسی غیر کانگرسی، مسلم یا غیر مسلم امیدوار جوان دونوں کو پا جانے کی صورت میں قطعی طور پر کامیاب ہو سکتے تھے جن سنگھ کے مقابلہ میں ناکام ہو کر رہ گئے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ اب کی خالص الکشنی اور وہ بھی مقامی سیاست کی کیا رام کہانی الفرقان نے خلاف عادت اور خلاف موضوع سنانی شروع کر دی ہے! ـــ جی نہیں، الفرقان کو نہ الکشن بازی سے کوئی دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور نہ مقامی سیاست کو اس کے دائرۂ فکر و نظر کو کوئی تعلق، ہمارا موضوع فکر اس وقت بھی صرف مسلمانانِ ہند کے فہم و شعور کا مسئلہ ہے۔ مسائل کی واقعی اہمیت اور ان کے طول و عرض کو سمجھنے کے لیے جزئی واقعات و مشاہدات بہت مفید ثابت ہوا کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے شہر کے اس الکشنی واقعہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور آپ کے سامنے بھی محض اسی طور سے پیش کیا ہے۔ یہ واقعہ اپنی ظاہری تفصیلات اور اپنے حدود و نتائج کی حد تک بیشک ایک مقامی واقعہ ہے، مگر جب ہم اس کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں متعلقہ مسلمانوں کے فہم و شعور کی کیا کیفیت

نظر آتی ہو؟ تو اس آئینہ میں ہمارے سامنے صرف ایک مقام کے مسلمانوں کے نہیں، قریب قریب پورے ملک کے مسلمانوں کے فہم و شعور کی تصویر واضح ہو جاتی ہو، یہ ایک ایسے مقام کا واقعہ ہو جہاں کے مسلمان نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ باخبر اور زیادہ باشعور ہیں۔ ان کا جب یہ حال ہو تو از خود دوسرے مقامات کے مسلمانوں کے حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہو ـــــ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک مقامی واقعہ عمومی طور پر پورے ملک کے مسلمانوں کی شعوری کیفیت کا آئینہ دار ہو۔

اگر ہمارا یہ قیاس صحیح ہو تو پھر ہم اس سے آگے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی خاطر لکھنؤ کی اس مثال سے سبق لینا چاہیے۔ انھیں دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ ملک میں اس وقت فرقہ پرست اور غیر فرقہ پرست پارٹیوں کی طاقت کا توازن کیا ہو؟ فرقہ پرست پارٹیاں اگر کامیاب ہو سکتی ہیں تو کیونکر کامیاب ہو سکتی ہیں؟ وہ کون سی غیر فرقہ پرست پارٹی ہو جو اٹھتی ہوئی فرقہ پرست طاقتوں کے مقابلہ میں سنگ گراں ثابت ہو سکے اور اس سے ٹکرا کر اگر فرقہ پرست طاقتیں چکنا چور بھی نہ ہو سکیں تو کم از کم ایک عرصہ تک ان کے لیے کامیابی کی راہ تو نہ کھل سکے، نیز یہ کہ ان کی (مسلمانوں کی) جو کچھ عددی طاقت ہو وہ کس طرح استعمال ہو کر فرقہ پرست محاذ کے خلاف زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو سکتی ہو؟ ـــــ یہ سب باتیں آج ہی سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کر لینے کی ہیں کیونکہ ان کا ہمارے مستقبل سے براہ راست تعلق ہو۔ فرقہ پرست طاقتوں کے برسراقتدار آنے سے جو زد ہم مسلمانوں پر پڑے گی، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی دوسرے پر نہیں پڑے گی!

پورے ملک کے کردار کی تصویر!

ہم نے اوپر لکھنؤ کے کارپوریشن الکشن کا جائزہ اس حیثیت سے لیا تھا کہ اس آئینہ میں مسلمانوں کی شعوری کیفیت کی کیا تصویر دکھائی دیتی ہو۔ لیکن اس چھوٹے سے آئینہ کو جب ہم دوسرے پہلو سے دیکھتے ہیں تو ایک اور تصویر اس میں روشن ہو جاتی ہو۔ اور وہ ہے ـــــ پورے ملک کے کردار کی تصویر!۔

اپنے نزدیک بہت کچھ اندازہ تھا مگر اس حد تک اندازہ اپنے ذاتی اندازہ میں کافی مبالغہ کرنے کے بعد بھی ہم نہیں کر سکتے تھے کہ پورا ملک نفاق کے حمام میں بالکل ننگا ہے، اس الکشن کے بارے

میں ایک تاثر جو متفقہ طور پر سننے میں آیا یہ تھا کہ (شاید جن سنگھ کے لوگ تو بڑی حد تک مستثنیٰ رہے ہوں اور ان کی ووٹ شماری سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے) باقی عام حال یہ تھا کہ ایک ہی پارٹی کے دو امیدوار ہیں لیکن ہر ایک کو بس اپنی فکر ہو، ظاہر میں وہ دونوں ساتھی ہیں اور ہر ایک اپنے ساتھ دوسرے کے لیے بھی کوشاں ہو، مگر اندر اندر اغیار سے سمجھوتے اور خوشامدیں ہو رہی ہیں کہ اپنوں کا ایک ووٹ مجھے دلوا دو، دوسرا تم لو، اور اس کے بدلے میں اسی طرح کی پیش کش اپنی طرف سے ہو رہی ہو۔ جن لوگوں کے دونوں ووٹ اپنی پارٹی کے لیے نہیں مل سکتے اُن کی منتیں کی جا رہی ہیں کہ بس دوسرا ووٹ مجھے دے دو —— یہ نفاق کی ایسی فضا چند دن چاروں طرف رہی کہ ہر صاحب ضمیر کا دم گھٹ گھٹ کر رہ گیا ہوگا! —— برسوں کے دیکھے بھالے اور برتے ہوئے بعض لوگ بڑی بڑی اچھی شہرتوں والے (اور صحیح شہرتوں والے) بعض لوگ جنھیں بہت سوں نے بلا کسی رشتہ ناتے کے صرف حسن ظن ہی کی بنا پر ووٹ دیا۔ اُن کے متعلق اسی دن شام کو کھلا اور اگلے دن ووٹ شماری سے بھی معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اپنے ساتھی کے ساتھ دغا کی۔ اور دوسری ساری شہرتیں ان کی برحق، مگر نفاق کے حمام میں وہ بھی ننگے ہی دیکھے گئے۔

اللہ اکبر! کیا اخلاقی حال ہو ملک کا —— مگر ملک کے ناخداؤں کے نزدیک کسی سوسائٹی کا یہ اولین اور بنیادی مسئلہ اس سے زیادہ کا ہرگز مستحق نہیں کہ بس دو چار آنسو اس پر بہا دیے جائیں اور کچھ مذمت اور کچھ نصیحت کر دی جائے۔

الکشن کے موجودہ طریقہ پر ایک تنقیدی آواز

سرو دے لیڈر شری جے پرکاش نرائن نے الکشن کے موجودہ طریقہ پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"الکشن کا موجودہ طریقہ لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنے اور آپس میں نفرت پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔ اگر ہم ایک ایسی سوسائٹی بنانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد آپس میں اشتراک، محبت اور مفاہمت ہو تو الکشن کے موجودہ طریقہ کو بدلنا ضروری ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ الکشن کا موجودہ طریقہ ہماری بگڑی ہوئی سوسائٹی کو اور زیادہ بگاڑنے

کا ذمہ دار ثابت ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو یہ منافرت اور افتراق پھیلاتا ہو، جس کا ذکر جے پرکاش جی نے کیا ہے، دوسری طرف یہ سوسائٹی میں نفاق کی پرورش کرتا اور کیرکٹر کی جڑیں ہلا دیتا ہو، تیسری طرف شرافت، وقار اور شہری آداب کی اس بری طرح پامالی اس کے طفیل میں ہوتی ہے کہ الامان الحفیظ!

اگر کوئی بڑی اصلاح اس طریقے میں ممکن نہ ہو تو ہماری سوسائٹی کے موجودہ حالات میں کم ازکم یہ تو ضروری ہو کہ کچھ مؤثر اصلاحی قوانین اس بارے میں نہایت سختی کے ساتھ نافذ کیے جائیں۔ اس طریقہ میں ایک لحاظ سے بڑی جمہوریت پروری ہے۔ مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ بعض لحاظ سے یہ جمہور کے لیے کتنا زہر ثابت ہو رہا ہے۔ آخر کچھ تدارک تو اس کا ہونا چاہیے!

آج کی دُنیا کے حقائق

شریمتی اندرا گاندھی کی ایک روایت:-

"صبح جب میں ڈالٹن گنج کے ہوائی اڈہ پر اتری تو عوام میں سے کچھ لوگ ہوائی جہاز کو کوئی دیوتا ایسی چیز سمجھ کر جیسے اس کی پوجا کرنے لگے"

اس کے بعد وہ فرماتی ہیں کہ

"اگر ہندوستان کو ترقی کرنا ہے تو اس کے باشندوں کو ایسا غیر سائنسی اور توہم پرستانہ رویہ ترک کرنا پڑے گا، اور آج کی دنیا کے حقائق کو سمجھنا ہوگا۔"

لوگوں کی نظر میں یہ آج کے حقائق ہیں مگر ذرا یاد کیجیے، قرآن آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے کس انداز میں اس "غیر سائنسی" اور "توہم پرستانہ" رویہ کی مذمت کر چکا ہے:-

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ!

کیا توہین ہے، انسانیت کی، کہ جو چیز تم خود اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو اسی کو معبود بنا لیتے ہو۔

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن بھی ایک فرسودہ کتاب ہے جس کی تعلیمات آج کی دنیا سے جوڑ نہیں کھاتیں۔ مگر یہ وہی قرآن ہو کہ جن چیزوں کو آج کے لوگ "آج کے حقائق" سمجھ رہے ہیں قرآن انھیں ڈیڑھ ہزار برس پہلے دنیا پر منکشف کر چکا ہے۔

معذرت

اس شمارہ میں "حدیث پرویز" کی چوتھی قسط جانا چاہیے تھی، مگر بعض اعذار کی وجہ سے تیار نہیں ہو سکی۔ انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں اس کی اشاعت ہو سکے گی۔

جن عوارض کی وجہ سے مذکورہ مضمون کی قسط تیار نہیں ہو سکی، وہی اس شمارے کی اشاعت میں تاخیر کا بھی باعث ہوئے ہیں۔ ہم اپنے ناظرین سے اس طویل زحمتِ انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں، ساتھ ہی یہ درخواست بھی ہے کہ جو حضرات شکایتی خط روانہ فرما چکے ہوں وہ رسالہ ملنے پر ایک کارڈ لکھنے کی زحمت اور گوارا فرمائیں، تاکہ دفتر سے بے ضرورت دوسرا پرچہ روانہ نہ ہو جائے۔

ضروری بات۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا پرچہ شکایتی خط ملنے پر فوراً بھیجد یا جائے تو ضروری ہوگا آپ شکایت کے ساتھ ۱۲ نئے پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی ارسال فرمایا کریں ان کے بغیر رسالہ کی روانگی صرف مقررہ تاریخ اشاعت ہی پر ہو سکتی ہے ——— ادارہ

معارف الحدیث

(مسلسل)

ناپاکی سے عذاب قبر:-

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيْرٍ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ (وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ لَا يَسْتَنْزِهُ) مِنَ الْبَوْلِ وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيْمَةِ ثُمَّ أَخَذَ جَرِيْدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا فَقَالَ لَعَلَّهُ أَنْ يُّخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا ——

—————— رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں پر ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ جو دو آدمی ان قبروں میں مدفون ہیں اُن پر عذاب ہو رہا ہے، اور کسی ایسے گناہ کی وجہ سے یہ عذاب نہیں ہو رہا ہے جس کا معاملہ بہت مشکل ہوتا (یعنی جس سے بچنا بہت دشوار ہوتا، بلکہ یہ دونوں اپنے ایسے گناہ کی پاداش میں عذاب دیے جا رہے ہیں جس سے بچنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا) ان میں سے ایک کا گناہ تو یہ تھا کہ وہ پیشاب کی گندگی سے بچاؤ کی یا پاک صاف رہنے کی کوشش اور فکر نہیں کرتا تھا، اور دوسرے کا گناہ یہ تھا کہ وہ چغلیاں لگاتا پھرا کرتا تھا پھر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک تر شاخ لی اور اس کو بیچ میں سے چیر کے دو ٹکڑے کیا۔ پھر ہر ایک قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ آپ نے کس مقصد سے کیا؟ آپ نے فرمایا، امید ہو کہ جس وقت تک شاخ کے یہ ٹکڑے بالکل خشک نہ ہو جائیں ان دونوں کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) عذاب قبر کے بارہ میں اصولی بحث اس سلسلہ کی پہلی جلد میں کی جا چکی ہے۔ اور وہ میں وہ حدیثیں بھی ذکر کی جا چکی ہیں جن میں صراحۃً فرمایا گیا ہو کہ عذاب قبر کی چیخ پکار کو آس پاس کی دوسری سب مخلوق سنتی ہو لیکن جن و انس عام طور سے نہیں سنتے، اور وہیں اس کی حکمت بھی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہو۔ نیز وہیں صحیح مسلم کی ایک حدیث نقل کی جا چکی ہے جس میں بعض قبروں کے عذاب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطلع ہونے کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے —— پس یہ واقعہ جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے یہ بھی اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے —— اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو عالم غیب کی بہت سی ایسی چیزوں کا مشاہدہ کراتا اور بہت سی ایسی آوازیں سنوا دیتا ہو جن کو عام انسانوں کی آنکھیں اس عالم میں نہیں دیکھتیں اور ان کے کان نہیں سنتے —— بہرحال یہ بھی اسی قبیل کی ایک چیز ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صاحبوں کے عذاب کا سبب ان کے دو خاص گناہوں کو بتایا ہو۔ ایک کے متعلق بتایا کہ وہ چغلی کرتا پھرتا تھا جو ایک سنگین اخلاقی جرم ہو اور قرآن مجید میں بھی ایک جگہ اس کا ذکر ایک کافرانہ خصلت یا منافقانہ عادت کے طور پر کیا گیا ہو۔ فرمایا گیا ہے " وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ (قلم)[1] اور کعب احبار سے مروی ہو کہ تورات میں چغلخوری کو سب سے بڑا گناہ بتایا گیا ہے[2]۔

اور دوسرے کے عذاب کا سبب آپ نے یہ بتایا کہ وہ پیشاب کی گندگی سے بچاؤ اور پاک صاف رہنے میں بے احتیاطی کرتا تھا (لَا يَسْتَتِرُ اور لَا يَسْتَنْزِهُ دونوں کا حاصلِ مطلب یہی

[1] اور نہ مانو اس شخص کی بات جو (جھوٹ بولنے میں بے باک اور) بے تحاشا قسمیں کھانے کا عادی ہو اور عیب جینی اور چغلخوری جس کا مشغلہ ہو [2] ذکرہ الشیخ عبد الحق فی شرح المشکوٰۃ۔

ہو، اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں اس موقع پر "لَا يَسْتَبْرِئُ" بھی آیا ہے، اور حاصل اس کا بھی یہی ہے)
بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب کی گندگی سے (اور اسی طرح دوسری ناپاکیوں سے بچنا یعنی اپنے جسم
اور اپنے کپڑوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا اللہ تعالیٰ کے اہم احکامات میں سے ہے اور اس میں
کوتاہی اور بے احتیاطی ایسی معصیت ہے جس کی سزا آدمی کو قبر میں بھی بھگتنی پڑے گی۔ آگے حدیث
میں جو یہ ذکر ہے کہ آپ نے کھجور کی ایک تر شاخ منگوائی اور بیچ میں سے اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک
ایک ٹکڑا اُن دونوں قبروں پر گاڑ دیا۔ اور بعض صحابہ نے جب اس کی بابت دریافت کیا تو آپ نے
فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ جب تک ان ٹکڑوں میں کچھ تری رہے گی اور یہ بالکل خشک نہ ہو جائیں گے اُس
وقت تک کے لیے ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے گی"۔۔۔۔۔ اس کی ایک توجیہ بعض شارحین نے
یہ ذکر کی ہے کہ کسی درخت کی شاخ میں جب تک کچھ تری یا نمی رہتی ہے اس وقت تک وہ زندہ رہتی ہے۔
اور اس وقت تک وہ اللہ کی تسبیح وحمد کرتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ گویا قرآن مجید کی آیت "وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا
يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ" کا مطلب ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ ہر چیز اس وقت تک جب تک کہ اس میں
کچھ زندگی ہو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتی رہتی ہے، اور جب اس چیز کی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو اس کی
حمد و تسبیح بھی ختم ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ بہر حال اسی بنا پر ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے اس فعل اور آپ کے اس ارشاد کی توجیہ یہ کی ہے کہ آپ نے کھجور کی شاخ کے یہ ٹکڑے
ان قبروں پر اس لیے گاڑے تھے کہ ان کی تسبیح وحمد کی برکت سے عذاب میں تخفیف ہو جائے اور
آپ نے ان ٹکڑوں کے خشک ہونے تک تخفیف عذاب کی جو امید ظاہر فرمائی اس کی بنیاد بھی بس
یہی تھی۔ لیکن اکثر شارحین نے اس توجیہ کو غلط قرار دیا ہے، اور ہمارے نزدیک بھی یہ توجیہ
بالکل غلط بلکہ مہمل ہے۔ ذرا غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر آپ نے یہ کام اس نقطۂ نظر سے
کیا ہوتا تو کھجور کی شاخ چیر کے آپ اس کے ٹکڑے قبروں پر نصب نہ کرتے کیونکہ وہ تو دو چار دن
میں خشک ہو جاتے ہیں بلکہ اس صورت میں آپ ان قبروں پر کوئی پودا نصب کرا دیتے جو برسہا
برس تک ہرا رہتا۔۔۔۔۔ دوسری واضح دلیل اس توجیہ کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ اگر صحابۂ کرام
نے آپ کا منشا اور نقطۂ نظر یہ سمجھا ہوتا تو وہ سب ایسا ہی کیا کرتے اور ہر قبر پر شاخ نصب
کرنے بلکہ درخت لگانے کا اس دور میں عام رواج ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بہر حال حضور کے

اس عمل اور اس ارشاد کی یہ توجیہ بالکل غلط ہو اور پھر اس توجیہ کی بنیاد پر بزرگانِ دین کے مزارات پر ہار پھول چڑھانے کی مشرکانہ رسم کا جواز نکالنا تو روحِ اسلامی پر سخت ظلم ہے۔

پس صحیح توجیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل اور ارشاد کی یہ ہو کہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اُن مُردوں کے لیے تخفیف عذاب کی دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا کہ آپ اس طرح ایک ہری شاخ کے دو حصے کر کے ان قبروں پر ایک ایک گاڑھ دیجیے جب تک ان میں تری رہے گی اس وقت تک کے لیے ان کے عذاب میں تخفیف کردی جائے گی۔ ـــــ صحیح مسلم کے آخر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث ہے اُس میں بھی دو قبروں کے عذاب کا ذکر ہے، اور وہ دوسرا واقعہ ہے۔ وہاں حضرت جابر رضی اللہ کا یہ بیان ہے کہ حضور نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ ان دو درختوں میں سے دو شاخیں کاٹ کے فلاں جگہ ڈال آؤ! حضرت جابر فرماتے ہیں، میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی، اور جب آپ سے اس کی بابت میں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہاں دو قبریں ہیں جن پر عذاب ہو رہا ہو میں نے اللہ تعالیٰ سے تخفیف عذاب کی استدعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اتنی بات قبول فرمائی کہ جب تک یہ شاخیں تر رہیں گی۔ ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی ـــــ بہرحال حضرت جابر کی اس روایت سے یہ بات صراحۃً معلوم ہو گئی کہ ہری شاخوں کو یا ان کی تری کو عذاب کی تخفیف میں کوئی خاص دخل نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات فرمائی گئی تھی کہ آپ کی دعا کی وجہ سے ہم اتنی مدت کے لیے ان کے عذاب میں تخفیف کر دیں گے ـــــ پس اصلی چیز تھی حضور کی دُعا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی بنا پر ایک محدود مدت تک کے لیے تخفیف کا فیصلہ۔

شارحین نے اس حدیث کی شرح میں اس پر بھی گفتگو کی ہے کہ یہ دو قبریں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی شاخ کے ٹکڑے گاڑے، مسلمانوں کی تھیں یا غیر مسلموں کی؟ اور پھر ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی تھیں، اس کا ایک واضح قرینہ خود اسی حدیث میں یہ موجود ہے کہ آپ نے عذاب کا سبب چغلخوری کی عادت اور پیشاب کے معاملہ میں بے احتیاطی اور لاپرواہی بتایا ہے، حالانکہ اگر یہ قبریں کافروں کی ہوتیں تو عذاب کا

سب سے بڑا سبب اُن کا کفر و شرک بتلایا جاتا ــــــ علاوہ ازیں مسند احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبریں بقیع میں تھیں اور آپ نے بقیع سے گزرتے ہوئے ان قبروں کے عذاب کو محسوس کیا تھا، اور معلوم ہے کہ بقیع مسلمانوں ہی کا قبرستان ہے ــــ بہرحال ان سب قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی تھیں ــــ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس حدیث کا خاص سبق اور اس کی خاص ہدایت یہ ہے کہ پیشاب وغیرہ کی نجاست سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش اور فکر کی جائے اور جسم اور کپڑوں کے پاک صاف رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ اور چغلخوری جیسی منافقانہ و مفسدانہ عادات سے بچا جائے۔ ورنہ ان دونوں باتوں میں کوتاہی اور بے احتیاطی کا خمیازہ قبر میں بھی بھگتنا ہوگا۔ اللّٰھم احفظنا!

پیشاب کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے :ــ

(۳) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کُنْتُ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ فَاَرَادَ اَنْ یَّبُوْلَ فَاَتٰی دَمِثًا فِیْ اَصْلِ جِدَارٍ فَبَالَ ثُمَّ قَالَ اِذَا اَرَادَ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّبُوْلَ فَلْیَرْتَدْ لِبَوْلِہٖ ۔ (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، آپ کو پیشاب کا تقاضا ہوا تو آپ ایک دیوار کے نیچے نرم اور نشیبی زمین کی طرف آئے اور وہاں پیشاب سے فارغ ہوئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو پیشاب کرنا ہو تو اس کے لیے مناسب جگہ تلاش کرے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ پیشاب کے لیے ایسی جگہ تلاش کر کے بیٹھنا چاہیے جہاں پردہ بھی ہو اور اپنے اوپر چھینٹیں آنے کا خطرہ بھی نہ ہو، اور رُخ بھی غلط نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ہوں اس کے اُس پاک پیغمبر پر جس نے اُمت کو پیشاب پاخانے تک کے آداب سکھائے۔

قسط (۳)

تجلیاتِ مجدّدِ الف ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

(از ـــــ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی)

مکتوب :- (۵۱) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

حق سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے وجودِ شریف کے ذریعے، ارکانِ شریعت اور احکامِ ملت قوت گیر اور رواج پذیر ہوں ـــ ع

کار این است وغیر ایں ہمہ ہیچ

آج ضعفاءِ اہلِ اسلام کو اس زبردست طوفانِ گمراہی میں امید نجات، اہلِ بیت خیر البشرؐ سے ہے ـــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ مَثَلُ اھلِ بیتی کَمَثَلِ سفینۃِ نوح من رکبھا نجا و من تخلّف عنھا ھلک (میرے اہل بیت کی مثال، کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے جو شخص اس پر سوار ہوا وہ نجات پا گیا اور جس نے اُس سے کنارہ کشی کی ہلاک ہوگیا)۔

آپ اپنی ہمت عالی کو تمام تر اس جانب لگائیں کہ اس سعادتِ عظمیٰ (امداد و اعانت کی دولت) کو حاصل کریں ـــ اللہ کی عنایت سے آپ کو جاہ و جلال اور عظمت و شوکت سب کچھ میسر ہے اگر شرفِ ذاتی کے ساتھ ساتھ ترویجِ شریعت بھی آپ کے ذریعے ہوگی تو بوسیلہ چوگانِ سعادت گوئے سبقت لے جائیں گے . . . . . .

مکتوب (۵۲) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

(نفسِ امّارہ کی مذمت میں)

آپ نے از روئے مہربانی جس مرحمت نامہ گرامی سے اس دعاگو کو ممتاز فرمایا تھا اس کے مطالعے سے مشرف ہوا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، آپ کی عزت میں اضافہ کرے، آپ کو شرح صدر نصیب کرے اور آپ کے کاموں کو آسان کرے ۔ بحرمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔ اور ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری و باطنی متابعت پر ثابت قدم رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے جو اس دعا پر آمین کہے ۔۔

چند فقرے ایک مصاحبِ بدذات اور ندیم بدخو (یعنی نفس امارہ) کی مذمت میں لکھے جاتے ہیں امید کہ قبولیت کے کانوں سے سنے جائیں گے ۔۔

مخدوما! انسان کا نفسِ امارہ حبِ جاہ و ریاست پر مخلوق ہوا ہے اور اس کی تمام تر توجہ یہ ہے کہ اپنے اقران و اماثل پر بلندی حاصل ہو جائے وہ یہ چاہتا ہے کہ تمام مخلوق اسکی محتاج مطیع ہو اور وہ خود کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو (درحقیقت) یہ نفس کی طرف سے ایک قسم کا دعویٰ لوہیت ہے اور خدائے بے ہمتا جل شانہٗ کے ساتھ شرکت ڈھونڈھنا ہے ۔۔ بلکہ یہ نفسِ بے سعادت شرکت پر بھی راضی نہیں ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ صرف وہی حاکم ہو اور سب صرف اس کے محکوم ہوں ۔۔۔ ...... لہٰذا نفس کے مرادات، جاہ و ریاست وغیرہ حاصل کرا کے اس کی پرورش کرنا فی الحقیقت، دشمنِ خدا کی امداد کرنا ہے اور اس کو تقویت دینا ہے ۔۔۔ اس امر کی قباحت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

حدیثِ قدسی میں وارد ہوا ہے ۔۔ الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری فمن نازعنی فی شئ منھما ادخلتہ فی النار ولا ابالی ۔۔ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ برتری میری چادر ہے اور عظمت و بزرگی میری ازار ہے پس جو کوئی مجھ سے ان دو چیزوں کے بارے میں منازعت کرے گا میں اسکو آتشِ دوزخ میں داخل کر دوں گا اور کچھ پرواہ نہ کروں گا) دنیا اسی بنا پر اللہ کے نزدیک ملعون و مبغوض ہے کہ اس کا حاصل ہونا، نفس کی مرادوں کے حصول کا معاون ہے ۔۔ پس جو دشمن کو مدد دے گا یقیناً لعنت کا مستحق ہو گا ۔۔

فقر جو فخرِ محمدی قرار پایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فقر میں نامرادیٔ نفس اور عاجزیٔ نفس حاصل ہوتی ہے ۔۔۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اور تکلیفاتِ شرعیہ کی حکمت بھی

نفسِ امّارہ کو عاجز اور خراب وخستہ کرنا ہے ــــ شریعتیں ہوائے نفسانی کو دور کرنے کے واسطے وارد ہوئی ہیں ــــ جو شخص جتنا مقتضائے شریعت پر عمل کرے گا اسی قدر خواہشِ نفسانی کو زائل کرے گا ــــ اسی بناء پر ہوائے نفسانی کے ازالے کے لیے احکامِ شرعیہ میں سے کسی ایک حکم کا بجالانا، ایسے ہزار سالہ ریاضات و مجاہدات سے بہتر ہے جو اپنی رائے سے کیے جائیں ــــ ایسے ریاضات و مجاہدات جو شریعت کے تقاضے کے مطابق نہ ہوں، ہوائے نفسانی کو تقویت دیا کرتے ہیں ــــ برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضات و مجاہدات میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے مگر اُن کو فائدہ کچھ بھی نہ ہوا البتہ نفس کو تقویت ضرور حاصل ہوگئی ــــــ شریعت کے مطابق تھوڑی سی رقم (باقاعدہ) زکوٰۃ میں نکالنا نفس کو پامال کرنے کے لیے اتنی مفید ہے کہ اپنی رائے سے یوں ہی ہزار دینار خرچ کر دینا اتنا مفید نہیں ہے ــــــ خواہش نفس توڑنے کے لئے حکمِ شریعت کے ماتحت، عید الفطر کے دن کھانا کھالینا، اپنی مرضی سے سالہا سال نفلی روزے رکھنے سے کہیں زیادہ نافع ہے ــــ اور صبح کی دو رکعت نماز جماعت سے ادا کرنا ایک مستقل سنت کا انجام دینا ہے اور یہ عمل ثواب میں اس سے کہیں زیادہ ہے کہ تمام رات، صلوٰۃ نافلہ ادا کرتا رہے اور صبح کی نماز بے جماعت ادا کرے ــــــ حاصل کلام یہ ہے کہ جب تک نفس کا تزکیہ نہ ہوگا اور اس کے اندر سے تکبر کا مالیخولیا نہ جائے گا ــــ نجات محال ہے ــــ اس مرض کے ازالے کی فکر بہت ضروری ہے تاکہ بات موت ابدی تک نہ پہونچے ــــ کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ جو تمام آفاقی و انفسی معبودانِ باطل کی نفی کے واسطے وضع کیا گیا ہے، نفس کے تزکیے اور تطہیر کے حق میں بہت نافع اور مناسب ہے ــــ اکابر طریقت نے تزکیۂ نفس کے لیے اسی کلمہ طیبہ کو اختیار کیا ہے ــــ

تا بجاروب "لا" نروبی راہ	نرسی در سرائے الّا اللہ

جب بھی نفس، مقامِ سرکشی میں آئے اور نقضِ عہد کرے اس کلمے کی تکرار سے تجدید ایمان کرنا چاہیئے ــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ کر اپنے ایمان کو تازہ کرلیا کرو ــــــ بلکہ اس کلمے کی تکرار ہمہ وقت ہونا ضروری ہے اس لیے کہ نفسِ امّارہ برابر خباثت پر اترا رہتا ہے۔

حدیث میں اس کلمے کی فضیلت میں آیا ہے کہ اگر تمام آسمان اور تمام زمینیں ایک پلے میں رکھی جائیں اور کلمۂ طیبہ کو دوسرے پلے میں رکھیں تو یقیناً کلمے والا پلہ جھک جائے گا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت والتسلیمات

مکتوب (۵۳) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

(اختلافِ علماءِ سوء، موجب فسادِ عالم ہے)

سنا گیا ہے کہ بادشاہ اسلام (جہانگیر) نے اپنے اسلامی حسن باطن کی بنا پر آپ سے فرمایا ہے کہ آپ چار ایسے دیندار عالم مہیا کریں جو حاضر رہ کر مسائل شرعیہ کو بیان کیا کریں تاکہ کوئی امر خلافِ شرع واقع نہ ہو۔ الحمد للہ سبحانہ علیٰ ذلک۔ مسلمانوں کو اس سے بہتر کیا بشارت اور "ماتم زدگان" کو اس سے اچھی کیا خوشخبری ہو سکتی ہے۔ چونکہ فقیر کی (دینی) غرض سے آپ کی طرف متوجہ رہتا ہے چنانچہ مکرر اس امر کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے لہٰذا ضرورۃً (اب بھی) اس بارے میں کہنے اور لکھنے سے اپنے آپ کو معاف نہیں رکھوں امید کہ مجھے معذور قرار دیں گے صاحب الغرض مجنون (صاحب غرض مجنون ہوتا ہے) یہ عرض ہے کہ ایسے علماء دیندار جو حب جاہ اور حب ریاست سے علیٰحدہ ہوں اور ترویج شریعت اور تائیدِ ملت کے علاوہ کوئی مطلب نہ رکھتے ہوں تعداد میں بہت قلیل ہیں۔ اگر ان میں حب جاہ ہوئی تو ہر ایک کوئی نہ کوئی ڈگر اختیار کر کے اپنی فضیلت کا اظہار کرے گا، اختلافی مسائل درمیان میں لائے گا اور اس طرز کو بادشاہ کے قرب کا ذریعہ بنائے گا لامحالہ دین کی مہم ابتر ہو جائے گی۔ زمانۂ گزشتہ (عہد اکبری) میں علماء سوء کے اختلافات نے ہی عالم کو بلا میں ڈالا تھا۔ اب بھی صحبت علماء سوء کا اندیشہ درپیش ہے۔ ایسی صورت میں ترویج دین کیا خاک ہوگی الٹی تخریب دین ہو جائے گی۔ میں علماء سوء کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ـــــــ (میرے نزدیک) اگر صرف ایک عالم کو اس غرض کے لیے منتخب کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ علماء آخرت میں سے کوئی عالم میسر آ جائے تو اس سے

اچھی کیا بات ہے اسکی صحبت کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے ــــــ اگر وہ میسر نہ آئے تو غور و فکر کے بعد علماء میں سے کسی بہتر و غنیمت عالم کا انتخاب کر لیا جائے ــــ اگر کل میسر نہ آئے تو کل کو ترک بھی نہ کیا جائے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں سوائے اس کے اور کیا لکھوں کہ جس طرح خلائق کی رستگاری علماء کے وجود سے وابستہ ہے اسی طرح دنیا کی زیاں کاری بھی انھیں سے مربوط ہے ــــ بہترین علماء بہترین خلائق اور ان میں کا بدترین بدترین خلائق ہے ــــ ہدایت و گمراہی کو اُن کی ذات سے ہی متعلق کیا گیا ہو ....

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

غرض یہ ہے کہ اس باب میں فکر صحیح اور کامل غور و خوض کو کام میں لا کر کوئی قدم اٹھائیں، جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے ۔ پھر کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا ــــ اگرچہ شرم آتی ہے کہ اس قسم کی (موٹی موٹی) باتیں ارباب عقل صحیح کے سامنے پیش کی جائیں لیکن اس بات کو اپنی سعادت کا ذریعہ سمجھ کر درد سر کا باعث بن رہا ہوں ــ

مکتوب (۴۵) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

(بدعتی اور اہل باطل کی صحبت سے اجتناب لازم ہے)

جو شخص انسان کا شکریہ نہ بجالائے گا وہ خدائے عز وجل کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا اس حقیقت کے پیش نظر ہم فقیروں پر آپ کے احسانات کا شکریہ ادا کرنا دو وجہ سے لازم ہے ــ اوّلاً اس لیے کہ حضرت خواجہ (باقی باللہؒ) کی جمعیت ظاہری کا سبب آپ ہوئے ہیں ہم نے آپ کے طفیل اس جمعیت ظاہری میں طلب حق کا موقع حاصل کیا ہے، اور کامل حصہ لیا ہے ــ ثانیاً اس وجہ سے کہ جب حضرت خواجہؒ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اس فقیر کی خدمات کا وقت آیا، تب بھی "اجتماع فقراء" اور "انتظام طالباں" کا باعث آپ ہی بنے ــ اللہ تعالےٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے ۔

گر بر تن من زباں شود ہر موئے
یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

دلی آرزو یہ ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت میں ہر نقصان دہ بات سے محفوظ رکھے ـــ بحرمتہ جدکم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ـــ یہ فقیر آپ کی صحبتِ گرامی سے دوری پر واقع ہے اس وجہ سے معلوم نہیں کہ آپ کی مجلس مبارک میں کس قسم کے لوگوں کا داخلہ ہوتا ہے اور انیس خلوت وجلوت کون کون ہے ـ

خوابم بشد (برفت) از دیدہ درین فکرِ جگر سوز

کاغوش کہ شد (کدام کس) منزل و آسائشِ خوابت

آپ یہ یقین رکھیں کہ بدعتی کی صحبت، کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے اور تمام بدعتی فرقوں میں سب سے زیادہ بدتر وہ گروہ ہے جو اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتا ہے ـــ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید (سورۂ فتح) میں ایسے لوگوں کو (صحابہ سے بغض رکھنے والوں کو) کفار قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ـــ صحابہ کرامؓ نے قرآن وشریعت کی تبلیغ کی ہے اگر یہ حضرات مطعون ہوں گے تو قرآن وشریعت پر طعن لازم آئے گا ـــ قرآن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے (ایک قرأت پر) جمع کیا ہے اگر حضرت عثمانؓ قابل طعن ہیں تو قرآن بھی مطعون ہو جائے گا ـــ اللہ تعالیٰ زندیقوں کے اعتقاد سے محفوظ رکھے ـ

جو اختلاف ونزاع صحابہؓ کے درمیان واقع ہوا تھا وہ ہوائے نفسانی کے ماتحت نہ تھا ـــ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ اقدس میں ان حضرات کے نفوس کا مکمل تزکیہ کیا گیا تھا اور ان کے نفوس، امارگی سے آزاد ہو گئے تھے ـ

اتنا تو میں جانتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے معاملے میں حق پر تھے اور ان کے مقابل (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) خطا پر ـــ ـــ لیکن یہ خطا، خطائے اجتہادی ہے جو حدِ فسق تک پہونچانے والی نہیں ـــ ایسی صورت میں ملامت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ اجتہادی غلطی کرنے والے کو بھی ایک درجہ ثواب حاصل ہوتا ہے .... ضرورت ہے کہ آپ کی مجلس شریف

میں مخدوم[1] جہانیاں جہاں گشت (حضرت سید جلال الدین بخاریؒ) کی کتب معتبرہ میں سے ہر روز کچھ نہ کچھ پڑھا جایا کرے تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کس طرح تعریف کی ہے اور ان کو کس قدر ادب و تعظیم سے یاد کیا ہے ـــــ اُن کتب معتبرہ کے مضامین سُن کر مخالفین بد اندیش شرمندہ اور ذلیل ہو جائیں گے ـــــ اس زمانے میں یہ گروہ بد بیں (مخالفین صحابہؓ) بہت سر اٹھا رہا ہے اور اطراف وجوانب میں منتشر ہو رہا ہے ـــ اسی لیے اس بارے میں یہ چند کلمات لکھے گیے تاکہ آپ کی مجلس مبارک میں اس قسم کے مخالفین کو جگہ نہ ملنے پائے ـــــ اللہ تعالیٰ آپ کو طریقۂ مرضیہ پر ثابت قدم رکھے۔

مکتوب (۵۹) سیّد محمود کے نام

[بے اتباع اہل سنت وجماعت نجات متصور نہیں اور علم وعمل شریعت سے ہی مستفاد ہیں]

مکتوب شریف وارد ہو کر موجب فرحت ہوا ـــ محبت فقرا اور اس جماعت سے اخلاص کا اظہار ہوا ـــ اللہ تعالیٰ محبت فقرا کو زیادہ کرے ـــ نصائح طلب کئے گئے تھے (لہٰذا لکھتا ہوں)

مخدوما! آدمی کو نجاتِ ابدی حاصل کرنے کے لیے ان تین چیزوں کے بغیر چارہ نہیں (۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص۔

علم دو قسم پر ہے ایک وہ علم ہے جس سے مقصود عمل ہے ـــ علم فقہ اُس کا متکفل وضامن ہے ـــــ ایک وہ علم ہے جس سے مقصود فقط اعتقاد اور یقین قلبی ہے اُس کو علم عقائد وکلام میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ـــــ عقائد فرقۂ اہل سنت وجماعت

---

[1] آپ حضرت سید احمد کبیرؒ کے صاحبزادے اور حضرت سید جلال الدین جلال اعظم گل سرخ بخاریؒ کے پوتے ہیں ـــ حضرت جلال اعظم بخاریؒ کے دوسرے صاحبزادے سید محمد غوث کی اولاد میں شیخ فرید بخاریؒ ہیں۔ اس لحاظ سے آپ ان کے ہم جدی ہیں ـــ مخدوم جہانیاںؒ نے دوبار ربع مسکون کی سیاحت کی ہے اور صدہا فقرا، ومشائخ کو دیکھا ہے اور ان سے اخذ برکت کی ہے ۷۸۵ھ یا ۷۸۸ھ میں آپ کا وصال ہوا۔　(خزینۃ الاصفیا)

کے مطابق ہوں کیونکہ یہ فرقہ، فرقۂ ناجیہ ہے ان حضرات کے اتباع کے بغیر نجات متصور نہیں ہے ـــ اگر ان کے عقائد سے سرمو مخالفت ہوئی تو خطر در خطر ہے ــــــ یہ بات کشفِ صحیح اور الہام صریح کی رُو سے بھی یقینی ہے اسکے خلاف کا کوئی احتمال نہیں ـــــ پس خوشحال ہے وہ شخص جس کو اہلِ سنت کی متابعت نصیب ہوئی اور ان کی تقلید سے مشرف ہوا ـــ اور خرابی ہے اس کی جو اُن کے خلاف چلا، اُن سے انحراف کیا، ان کے قوانین کو ترک کیا اور اُن کے زمرے سے باہر نکل گیا ــــــ ایسے لوگ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ـــ انھوں نے رویتِ باری تعالےٰ اور شفاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا ان پر فضیلتِ صحبتِ پیغمبرؐ اور فضیلتِ اصحابِ پیغمبرؐ پوشیدہ رہی، وہ اہلِ بیت رسولؐ کی دوستی سے اور اولادِ فاطمہؓ کی محبت سے بھی بے بہرہ رہے ــــــ غرض وہ اس خیرِ کثیر سے محروم رہے جس کو اہلِ سنت نے حاصل کیا ــــــ صحابہؓ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان میں سے سب سے زیادہ بزرگ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں ـــ ـــ حضرت شافعیؒ جو حضرات صحابہ کے حالات سے بہت زیادہ واقف ہیں انھوں نے فرمایا ہے کہ بعدِ وفاتِ رسولِ مقبولؐ، جب لوگ مضطر و پریشان ہوئے اور انھوں نے سقفِ آسمان کے نیچے کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ بہتر نہ پایا تو ان ہی کو اپنا امیر و حکمراں بنا لیا ــــ اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرامؓ، افضلیتِ صدیقِ اکبرؓ پر متفق تھے ـ پس قرنِ اوّل ہی میں فضیلت صدیقؓ پر اجماع منعقد ہو گیا تھا ــــ لہذا یہ افضلیت قطعی ہوئی اس سے انکار جائز نہ ہوگا۔

بیشک اہلِ بیت رسولؐ کشتیٔ نوحؑ کی مثل ہیں جو کشتیٔ نوحؑ پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جو اس پر سوار نہ ہوا وہ ہلاکت کو پہونچا ـــــ (لیکن) بعض اکابر نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے (اور ظاہر ہے کہ) ستاروں سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں ــــــ اور اہلِ بیت کو کشتیٔ نوحؑ سے تشبیہ دی ہے۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کشتی کے سوار کو ستاروں کا لحاظ رکھے بغیر چارہ نہیں ہے تاکہ ہلاکت کے خوف سے نجات ملے ـــ اور ستاروں کی رعایت کے بغیر ہلاکت سے نجات مل نہیں سکتی ــــ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ کسی ایک صحابی کا انکار تمام صحابہؓ سے انکار کے مرادف ہو

اس لئے کہ صحابہؓ سب کے سب صحبتِ خیر البشرؐ کی فضیلت میں مشترک ہیں اور یہ فضیلتِ صحبت تمام فضائل وکمالات سے بالاتر ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ حضرت اویس قرنیؓ جو کہ خیر التابعین ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ صحابی کے مرتبے کو بھی نہیں پہونچ سکے، پس کسی چیز کو بھی فضیلتِ صحبت کے مساوی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی چیز بھی ہو ـــ اس لئے کہ صحابہؓ کا ایمان صحبتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور نزولِ وحی کے مشاہدے کی برکت سے "شہودی" ہو گیا تھا۔ ایمان کے اس درجے سے صحابہ کرامؓ کے بعد کوئی بھی مشرف نہیں ہوا، رہے اعمال، سو وہ ایمان کے ثمرات ونتائج ہوتے ہیں جتنا ایمان، کامل ہوگا، اعمال میں بھی کمال ہوگا۔

صحابہؓ کے درمیان جو منازعات ومحاربات واقع ہوئے ہیں وہ محمول ہیں بلیغ حکمتوں پر، ہوائے نفسانی سے وہ منازعات صادر نہیں ہوئے بلکہ اجتہاد سے صادر ہوئے ہیں، اگر ان میں سے کوئی اپنے اجتہاد میں راہ خطا پر بھی چلا ہے تب بھی اس کے لئے ایک درجۂ ثواب ثابت ہے ـــــ یہ ہے وہ سیدھا راستہ جو افراط وتفریط کے درمیان ہے اور جس کو اہلِ سنت نے اختیار کیا ہے ـــــ یہی طریق اسلم اور سبیل محکم ہے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ علم وعمل شرع سے مستفاد ہیں اور تحصیلِ خلاص جو علم وعمل کے لئے مانند روح ہے وہ طریقِ صوفیہ کے ساتھ وابستہ ہے ......

جو نفع کہ طریقِ صوفیہ سے علم وعمل کو پہونچتا ہے وہ یہ ہے کہ علوم کلامیہ استدلالیہ، کشفی ہو جاتے ہیں اور ادائیگی اعمال میں پوری پوری آسانی میسر آجاتی ہے اور وہ سستی جو نفس وشیطان کی طرف سے ہوتی ہے زائل ہو جاتی ہے۔

ع ایں کار دولت است کنوں تا کرا دہند

والسّلام اوّلاً وآخراً ـــ

دُعا کے اسرار و آداب

(از جناب قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری رحمہ)

[قاضی سلیمان صاحب منصور پوری "صاحب" رحمۃ للعالمین" سے کون پڑھا لکھا مسلمان ناواقف ہو سکتا ہے، ذیل میں موصوف کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع کیا جا رہا ہے، جو حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب دہلوی مقیم حجاز کی عنایت سے ہمیں حاصل ہوا ہے ——————— ادارہ]

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمد للہ رب العالمین والسلام علی المرسلین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد الامین وآلہ واصحابہ اجمعین الی یوم الدین

امابعد۔ ایک مخلص نے درخواست کی کہ ایک مختصر سا رسالہ ادعیہ ماثورہ پر لکھ دیا جائے، ...نے بتعمیل درخواست یہ رسالہ لکھ دیا ہے، اگرچہ مضمون کے وسعت اور اہمیت کا اقتضا یہ تھا کہ اس ...میں جو کچھ لکھا جائے وہ مختصر نہ ہو، مگر درخواست کی پابندی بھی ضروری تھی۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قویٰ عطا فرمائے ہیں۔ اور ہر ایک قوت کا کمال دوسری قوت سے الگ ہے، مثلاً آنکھ کا کمال بینائی اور کان کا کمال شنوائی وغیرہ وغیرہ۔ اور جب کسی قوت کے کسی کمال میں ضعف یا زوال پیدا ہو جاتا ہے تو سبب عارضی کے دفعیہ کی سعی بذریعہ علاج کی جایا کرتی ہے۔ اسی طرح روحانی قویٰ کے لیے بھی روحانی امراض ہیں جن کا ازالہ روحانی ادویہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

قلب انسان کا کمال یہ ہے کہ اس میں خالق کی معرفت اور توحید راسخ ہو۔ مالک کی محبت ہی قلب کا

سرور و ابتہاج ہو، اور اسی کی رضا و اطاعت اس کا مطلوب۔ موالات و معادات اور حُب و بغض میں اسی کا رضوان مقصود ہو۔ قلب پر اسی کا جلال سایہ فگن ہو، اور اسی کا کمال نور افزا ہو۔ دُنیا کی کوئی نعمت، کوئی لذت، کوئی عیش، کوئی سرور، بلکہ زندگانیٔ دنیوی بھی مندرجہ بالا مقصود کے سامنے ذرا عزیز و محبوب نہ ہو۔ جب تک قلب کی یہ کیفیت ہے اس وقت تک اس کی صحت کامل اور سالم ہے۔ لیکن جب دل کی ان معتقدات یا کیفیات میں فتور آ جاتا ہے تو قلب کو اتنا ہی بیمار سمجھ لینا چاہیے۔

علاج قلب بذریعہ ادویات روحانی کیا جاتا ہے اور وہ دوائیں یہ ادویہ ماثورہ ہیں جو حکیم مطلق تقدس و تعالیٰ اور طبیب حاذق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز فرمودہ ہیں۔ ان مرکبات پر جب کوئی بصیر نظر کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ نسخۂ روحانی کی تجویز میں کئی اقسام کی ادویہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

(۱) توحید الوہیت کی تعلیم | کہ عرش سے فرش تک کی حکومت اور تدبیر اس واحد مالک کے قبضہ میں ہے، ریگ کا ذرہ، درخت کا پتا، نوری، خاکی، حیوان، بے جان سب پر اسی کا حکم جاری ہے۔ اور ہر ایک شے اس کے جلال کے سامنے سرفگندہ و فرماں بردار ہے۔

(۲) توحید ربوبیت کی تعلیم | کہ پالنے والا، وجود بخشنے والا، نیست سے ہست بنانے والا، پرورش کے تمام بیرونی وسائل اور تمام اندرونی ذرائع جمع کرنے والا، ہر ایک شے کو اس کی مناسبت طبع اور ضروریات فطرت کے مطابق مواہب عطا کرنے والا وہی ہے، ہر شخص اور ہر چیز اس کی پروردہ ہے۔ اور وہ سب کا پروردگار ہے۔ پانی میں تیرنے والے، ہوا میں اُڑنے والے، زمین پر رینگنے والے۔ زندگانی کا سانس رکھنے والے یا دی ترکیب سے وجود قبول کرنے والے، خاکی، ناری، نوری، کروبی، سب کے سب ہر لحظہ ہر آن اسی کی پرورش کے محتاج ہیں اور ہر وقت و ہر لحظہ اسی کی پرورش سے مستفید۔

(۳) توحید علمی | کہ سمندروں کی گہرائی یا آسمانوں کی بلندی پر کوئی چھوٹی یا بڑی جو چیز موجود ہے وہ اسی مالک کے علم کے اندر ہے۔ ریگ کا کوئی ذرہ، بحر کا کوئی قطرہ، مادہ کا کوئی جزو اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں انسان کے اعمال و افعال بلکہ نیت اور ارادے اس کے علم میں ہیں، وہی سینوں کے بھیدوں کا جاننے والا۔ وہی دل کے جذبات کا علم رکھنے والا، وہی خیالات اور وساوس پر اطلاع رکھنے والا ہے۔ وہی پکارنے کی حالت کو دیکھتا ہے، وہی پڑھنے والے کی آواز کو سنتا ہے۔

(۴) تنزیہ باری | وہ بندوں پر ظلم کرنے سے برتر و اعلیٰ ہے۔ ہماری ہر ایک مصیبت میں اس کی حکمت و دانائی کام کرتی ہے۔ ہماری ہر ایک محنت میں اس کی مصلحت مخفی ہے۔ وہ نہ کبھی بندہ کے گناہ پر اس کی روزی بند کرتا ہے اور نہ کبھی بندہ کو اس کی غفلت پر اپنی حفاظت سے محروم کرتا ہے۔

(۵) اعتراف | یعنی بندہ کا صدق دل سے یہ اقرار کرنا کہ یہ بندہ ہی ظالم ہے اور اس کے ہاتھوں کے اعمال ایسے ہی بدترین انجام کے ملتزم ہیں۔

(۶) توسل | ان تمام حالات کو زیر نظر رکھ کر ہر دعا مانگنے والے کا رب العالمین کے اسماء حسنیٰ اور صفات کاملہ کا یاد کرنا اور انہی کے واسطے سے اپنی معروضات کو پذیرائی کے لیے پیش کرنا۔

(۷) استعانت | دنیا کے حیلہ وسائل اور تعلقات سے الگ ہو کر محض رب العالمین کی مدد پر حصر کرنا۔

(۸) رجا | گوناگوں ناکامیابی، نامرادی، ہیچ میرزی، بیکسی کے ہوتے ہوئے بھی افضال و الطاف الٰہی پر اعتماد و وثوق قائم رکھنا۔

(۹) استغفار | گذشتہ تقصیرات کی معافی کا سوال بار بار پیش کرنا۔

(۱۰) توبہ | گذشتہ افعال سے بیزار ہو کر آئندہ بہترین اعمال پر کاربند ہو جانا اور گذشتہ پر ندامت و پشیمانی کا بار بار اظہار کرنا۔

(۱۱) تفویض | اپنی دعاؤں اور التماسوں کو پیش کرنے کے بعد انجام کار کو مشیت ربانی پر چھوڑ دینا اور اس کی قبولیت کے لیے بکشادہ پیشانی آمادگی رکھنا۔

(۱۲) ترک دعویٰ | نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت کو اپنے سے منسوب نہ کرنا۔ اپنے نفس کا اس میں کوئی حصہ نہ سمجھنا، اور سب کو حوالہ بخدا کر دینا۔

بس یہی وہ ادویہ ہیں جن کا استعمال عوارض قلب میں کیا گیا ہے۔ انہی کے استعمال کے لیے کہیں قرآن پاک پر تدبر کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے کبھی نماز نافلہ کا طریق بتایا جاتا ہے۔ اور کبھی جہاد کو اسی سبب سے نافع تر سمجھا جاتا ہے۔

اب دعا مانگنے والے کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دعا کی جان اضطرار قلب ہے اور اضطرار قلب ہی کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا ہے۔ الفاظ دعا کو بطور عادت زبان سے استعمال کرنا ہرگز ہرگز صحیح طریقہ دعا مانگنے کا نہیں، بعض لوگ اچھے اچھے وظیفے کرتے اور عمدہ

عمدہ اوراد پڑھا کرتے ہیں مگر اسی طرح کہ زبان ذاکر ہے اور قلب غافل اور پھر شکایت کیا کرتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوئی یا کہا کرتے ہیں کہ کلام میں اثر نہیں یا اثر نہیں رہا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ پینے کی دوا کا اثر سونگھنے سے نہیں حاصل ہوا کرتا۔

میرے عزیزو! دعا تنہائی میں مانگو، تمہارے جسم کا انداز، تمہاری آواز ایسی ہو کہ اس سے عجز و خشوع آشکارا ہو۔ تمہارے دل میں انابت الی اللہ جوش زن ہو۔ دعا کی معانی پر غور کرو اور اپنی حالت کو ان معانی کے مطابق بنالو۔

اگر اب بھی دعا مانگنا نہ آئے تو کسی شہر کی بڑی سڑک پر یا ریلوے اسٹیشن پر چلے جاؤ وہاں تم کو بھیک مانگنے والے بیٹھے نظر آئیں گے خواہ گرمی سے زمین و آسمان تپ اٹھے ہوں خواہ وحوش وطیور پناہ کے لیے سایہ میں جا ٹھہرے ہوں مگر یہ بھیک مانگنے والا ایک ہی جگہ پر اور ایک ہی وضع میں بیٹھا ہوا ہوز پر جھکا ہوا یا آنکھوں کو بند کیے ہوئے، ہاتھ آگے کو پھیلائے ہوئے ایک ہی آواز کے ساتھ مسلسل بلا انقطاع اپنی مخصوص صدا کو دہرائے جاتا ہے، خواہ سردی کی وجہ سے لوگ مکانوں کے اندر چھپ کر بیٹھے ہوں، خواہ آمد و رفت کی راہوں پر رونق نہ رہی ہو، خواہ پالا اور ہوا باہر کسی کو ٹھہرنے نہ دیتی ہو مگر وہ برف کی طرح جما ہوا ہے اور رعد کی طرح اپنی آواز دور دور تک کے جانے والوں کے کان تک پہونچا رہا ہے۔

یہ بھکاری کیا مانگتا ہے؟	پیسہ دو پیسہ!
کس سے مانگتا ہے؟	اپنے ہی جیسے انسانوں سے!
کیا کسی استحقاق پر؟	نہیں
کیا کسی وعدے پر؟	نہیں
کیا اس کو ملتا رہتا ہے؟	ہاں! میرے اور آپ کے اندازے سے بڑھ کر

اب دعا مانگنے والے کو سبق لینا چاہیے۔ وہ تو رب العالمین سے مانگتا ہے جس کی عظمت و جلال ہمارے اندازۂ وہم و خیال سے برتر ہے۔ وہ تو ایسی چیزیں مانگ رہا ہے جو قیمت و وقعت میں لاکھوں کروڑوں روپے سے اعلیٰ ہیں۔

پس لازم ہے کہ اپنے سوال کی اہمیت اور مسئول عنہ کی عظمت کے لحاظ سے دعا مانگنے والا

کی دعا میں سوز و گداز، عجز و نیاز، لجاجت و انکسار، عبودیت و افتقار پایا جائے۔

وہ بار بار اپنی تشنگی و درماندگی، عاجزی و بےچارگی، بیکسی و ناکسی کا اظہار کرے۔ بار بار اپنے آپ کو اسی کے در کا گدا، اسی کے آستان کا سوالی، اسی کے دربار کا امیدوار بتلائے۔ اسی کی دین کا فقیر، اسی کے فضل کا مسکین، اسی کے احسانات کا پروردہ ہونا زبان و دل پر لائے۔ اور اس حالت پر یہ یقین رکھے کہ وہ رحمٰن الرحیم سے مانگ رہا ہے جس کی رحمت نے اسے لباس انسانی عطا فرمایا۔ اور جس کی رحمانیت نے اسے شکم مادر میں رزق پہونچایا۔ یا ایمان رکھے کہ وہ تو غفور الودود سے مانگ رہا ہے جس کے غفران نے ہر ایک عاصی کو خود طلب فرمایا اور جس کی محبت نے ہر ایک جاندار کو محبت دے کر (؟) ہے۔

دعا مانگنے والے کو یاد رکھنا چاہیے کہ اثر دعا کے ظہور میں اگر دیر لگتی جائے اسی قدر اس کا زیادہ اعتماد بڑھتا جائے اور یقین محکم ہوتا جائے۔ دیکھو زمین سے کوئی دانہ جلد اور کوئی دانہ دیر سے نکلتا ہے۔ کوئی درخت جلد پھل دینے لگتا ہے اور کوئی دیر میں ثمر لاتا ہے۔ دعا مانگنے والے کو ضروری ہو کہ یاس و نا امیدی کا اثر اپنے دل پر نہ ہونے دے۔ ممکن ہو کہ نظر بہ اسباب دنیوی کسی مقصد میں یاس و نا امیدی کا کھلا چہرہ بھی نظر آتا ہو لیکن پھر بھی دعا مانگنے والے کی توقع اور امید رب العالمین کے ساتھ وابستہ رہے ہو اپنے مقصد کی کامیابی کو تائید غیبی کے حاصل ہو جانے پر منحصر رکھ کر روح کو اور دل کو یاس کے زہریلے اثر سے بچالے اور ہمت بلند اور عزم راسخ اور طلب صادق کے ساتھ اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو جاری رکھے۔ دعا مانگنے والے کو لازم ہے کہ دعا مانگنے کے وقت اپنے خیال کو کلیۃً اسباب ظاہری اور وسائل دنیوی کی طرف سے ہٹالے اور خوب یقین کرے کہ مالک کی لاانتہا قدرت اور لامحدود طاقت انسان کے جانے پہچانے اسباب اور وسائل میں محدود نہیں۔

دعا مانگنے والے کو لازم ہے کہ ایسی شئے کا سوال نہ کرے جو شرعاً ممنوع ہو۔ کسی ایسی شئے کا سوال نہ کرے جو سنت اللہ کے خلاف ہو۔ کسی ایسی چیز کا سوال نہ کرے جو رحم اور انسانیت کے خلاف ہو۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دعا کے منافع و فوائد لا انتہا ہیں سے فائدہ جلیلہ تو یہی ہے کہ قلب انسانی کو اپنے مالک و خالق سے نسبت صحیح حاصل ہو جاتی ہے اسے پتہ لگ جاتا ہے کہ ارض و سما میں مدبر امور کون ہے ؟۔

وہ جان جاتا ہے کہ اس کی جان کس کے قبضہ میں ہے؟

اُس کا ایمان خدائے حیّ وقیوم پر کامل ہو جاتا ہے۔

اُس کا اعتماد قریب و مجیب کی ہستی پر مکمل ہو جاتا ہے۔

رب العٰلمین کے سمع و بصر اور علم و قدرت کی صفات پر اس کا وثوق مستحکم بن جاتا ہے۔ بندہ کو اپنی بیکسی بلکہ کل عالم کی درماندگی آشکار ہو جاتی ہے، یہی عرفان جس سے بندہ خود اپنی قدر و قیمت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی معرفت جس سے اس کے سامنے کچھ کچھ شانِ الوہیت جلوہ گر ہو جاتی ہے، ہزار منفعتوں کی ایک منفعت ہو۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے، انبیاء اور فرشتے شب و روز ذکر و دعا اور تسبیح و استغفار کو اپنا ورد بنائے رکھتے ہیں۔

مبارک ہے وہ انسان جسے دعا مانگنا آجائے۔ مبارک ہے وہ انسان جسے دعا مانگنے والوں کے زمرہ میں جگہ مل جائے، دعا کی منفعت خود لذتِ دعا ہے۔ اور دعا کی اجابت دعا پر مداومت کا صلہ ہے۔ یہ وہ فائدے ہیں جو آغاز کار میں عطا فرمائے جاتے ہیں۔

دعا مانگنے والے کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ مانگتا ہے۔ جس طرح انسان اس شخص سے ناراض ہو جاتے ہیں جو ان سے ہر وقت مانگا کرتا ہے۔ پس دعا مانگنے کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ دعا مانگنے والا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرتا ہے۔

اے رب! ہم کو اپنے در کا فقیر بنا دے۔

اے رب! ہم کو اپنے گھر کا سوالی بنا دے۔

اے رب! ہم کو مانگنا سکھلا دے۔

نہایت ضروری مسئلہ یاد رکھو، خواہ کوئی وظیفہ ہو، کوئی دعا ہو، اس کے اول و آخر بلکہ اس کے درمیان میں بھی درود شریف ضرور ضرور پڑھنا چاہیے۔ سب سے افضل وہ درود ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب میں انسانیت کا مقام

(از:- استاذ مصطفےٰ السباعی)

اسلامی تہذیب اور اسکے آثار کا ایماندارانہ مطالعہ کرنے والا اس تہذیب کے رگ و پے میں بسے ہوئے اس گہرے انسانی شعور کا اعتراف کرنے پر مجبور رہے جو دوسرے تہذیبی نظاموں کے مقابلہ میں اس تہذیب کا خاص امتیاز ہے۔ اسی انسانی شعور کی بدولت ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب انسانیت کو کینہ و افتراق اور طبقاتیت و گروہ بندی کی تنگ و تاریک فضاؤں سے نکال کر محبت و تعاون، اخلاص و رواداری اور برابری ـــــ اللہ کے حضور بھی، قانون کی نظر میں بھی، اور سماجی نظام میں بھی ـــــ ایسی برابری کی حیات بخش فضاؤں میں لے جاتی ہے، جن میں کسی نسل کی دوسری نسل پر، کسی گروہ کی دوسرے گروہ پر، اور کسی قوم کی دوسری قوم پر ـــــ زور دستی کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا ـــــ یہ عظیم انسانی شعور ہمیں اسلامی تہذیب کے ہر دائرے میں جھلکتا ہوا ملتا ہے۔ اصول و مبادی دیکھئے تو وہ اس شعور سے لبریز ہیں۔ احکام و قوانین دیکھیے تو وہ اس رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اور عمل کے میدان میں آئیے تو وہاں یہی شعور واقعیت کا روپ دھارتا ہوا ملتا ہے۔

اسلامی تہذیب کے مبادی اور عظیم تر انسانی شعور

مبدءِ اول:- اسلامی تہذیب کے مبادی میں اس عظیم تر انسانی شعور کا سب سے پہلا جلوہ ہم اس وقت دیکھتے ہیں جب اسلام کا یہ اعلان سامنے آتا ہے کہ تمام لوگ ایک نفس انسانی کی اولاد ہیں۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ ـــ اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار سے جس نے

الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَۃٍ	پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور پیدا کیا
وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ	اس جان سے اس کا جوڑا۔ اور پھیلائے
مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَاءً۔	ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں۔

پس اسلام نے بتایا کہ جمیع ابناءِ بشریت کی بشری اصل ایک ہے، اور اس کے بعد ان میں قوم و وطن اور جنس و قبیلے کی جتنی بھی تقسیمیں ہو جائیں وہ سب ایسی ہیں جیسے ایک گھرانے کی اور ایک ماں باپ کی اولاد کی تقسیم۔ اور یہ اختلاف و تقسیم اور تعدد و تفرق جب اس طرح کا ہوا تو لازم ہوا کہ اس سے انسانوں میں باہم تعارف، تعاون اور خیر خواہی کا جذبہ بڑھے کا آئے۔

مبدءِ ثانی :۔ چنانچہ یہاں سے ایک دوسری اصل پھوٹتی ہے۔ اور اسلام اپنے تہذیبی نظام کے اس دوسرے انسانیت انگیز اساسی تصور کو یوں اُبھار کر سامنے لاتا ہے :۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تم کو ایک مرد
مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ	اور ایک عورت سے اور بنایا ہے تم کو قومیں
شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا	اور قبیلے تاکہ پہچان کر وایک دوسرے کی

پھر وہ اس حقیقت پر نظر کرتا ہے کہ زندگی کی کشمکش میں بعض افراد اُبھر جاتے اور بعض پست ہو جاتے ہیں، بعضوں کے گھر میں من برستا ہے اور بعض نانِ جویں کو محتاج نظر آتے ہیں، ایک شخص ہوتا ہے جو حکومت کرتا ہے دوسرے اطاعت و انقیاد کے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں، بعض قومیں سرخ و سپید اور بعض سیاہ فام ہوتی ہیں۔

مبدءِ ثالث :۔ وہ کہتا ہے کہ ہر چند یہ ایک لابدی چیز اور زندگی کی ناقابلِ تغیر اور ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو زندگی کے بلند معیار کو پا گیا اُسے پست کے مقابلہ میں، جو زردار ہو گیا اُسے بے زر کے مقابلہ میں، جسے حکومت کا مرتبہ مل گیا اسے محکوموں کے مقابلہ میں اور جو گورے رنگ پر پیدا ہو گیا اُسے کالوں کے مقابلہ میں کوئی امتیاز بھی مل گیا، یا کسی امتیازی حیثیت کا استحقاق اُس کے لئے پیدا ہو گیا، نہیں! ہرگز نہیں!! سب برابر ہیں! اللہ کی نظر میں اپنی آدمیت اور انسانیت میں سب کا درجہ ایک ہے۔ کسی کو دوسرے

کوئی فوقیت نہیں، مگر تقوے کی بنیاد پر۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ	بے شک تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے
(قرآن)	نزدیک وہ ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے۔

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، کوئی تفریق نہیں، مگر حق کی بنا پر۔

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا	پس جو عمل کرے گا ایک ذرہ برابر بھی بھلا
يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ	وہ اسکو دیکھے گا۔ اور جو عمل کرے گا ذرہ برابر
شَرًّا يَرَهُ۔ (قرآن)	بھی برا وہ اسکو دیکھے گا۔

سماج میں سب کا درجہ ایک ہے۔ قوی ضعیف کے حالات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اور افراد کے فعل سے معاشرہ کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔

مَثَلُ المؤمنين في توادِّهم	اہل ایمان کی مثال باہمی محبت،
وتراحمهم كمثل الجسد الواحد	ہمدردی میں بالکل ایسی ہے جیسے ایک
اذا اشتكى منه عضو تداعى	جسم ہو۔ جب اسکے کسی حصّہ کو تکلیف ہوتی
له سائر الاعضاء بالحمّى	ہے۔ پورا بدن اس سے متاثر ہوکر بخار اور
والسهر (حدیث)	بے خوابی میں اس کا شریک حال ہوتا ہے۔

یہی چند تصریحات نہیں ہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں بکرات و مرات اس حقیقت کو دہرایا گیا اور صریح تر کیا گیا ہے کہ تمام انسان انسانی وحدت کی لڑی میں بالکل اسی طرح منسلک ہیں جس طرح ایک ماں باپ کی اولاد۔ اور پورا انسانی معاشرہ ایک ایسی اجتماعی وحدت ہے جیسے ایک درخت کہ جب ہوا کا کوئی جھونکا اسے چھوکر گزرتا ہے تو اوپر اور نیچے کی تفریق کے بغیر درخت کی ہر ہر شاخ حرکت میں آجاتی ہے۔ اگر غور کیجئے تو اسلام کے اس موقف کو سمجھنے کے لئے بظاہر یہ ایک معمولی سی بات بھی بہت مفید ہوسکتی ہے کہ قرآن عموماً لوگوں کو ایسے الفاظ سے خطاب کرتا ہے جو ان میں وحدت اصل کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یا ایّھا النّاس! ــــ یا بنی آدم اسی طرح دینِ واحد کے پیروؤں کو خطاب کرتا ہے تو کہتا ہے یا ایّھا الّذین آمنوا! ــــــ اَیُّھا المؤمنون! انسانیت کے جمیع فرزند ہوں یا دینِ واحد کے پیرو، سب کو ایک سطح پر

رکھ کر خطاب کرتا ہے۔ اُن کے مابین کسی امتیاز اور تفریق کا شائبہ تک گوارا نہیں کرتا۔

اسلامی قانون وشریعت اور وحدتِ انسانیت

اسایات وعبادات کے بعد احکام وقوانین کے دائرہ میں قدم رکھیئے، تو یہاں بھی ہر ہر بات میں وہی عظیم انسانی شعور جلوہ گر ملے گا۔ سب سے پہلے خالص دینی ابواب لیجئے۔ نماز میں اسلام تمام انسانوں کو اللہ کے حضور ایک صف میں کھڑا کرتا ہے۔ کسی عالم کسی رئیس وامیر اور کسی بادشاہ تک کے لیے کوئی مخصوص اور ممتاز جگہ نہیں ہو سکتی۔ روزے میں سب کو یکساں طور پر بھوکا رہنا ہوتا ہے کوئی حاکم، کوئی دولتمند اور کوئی ذی مرتبت کوئی الگ قسم کا روزہ نہیں رکھ سکتا۔ حج میں سب کے سب ایک لباس پہنتے ہیں۔ ایک جگہ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک سی عبادت کرتے ہیں۔ قریب وبعید، قوی وضعیف اور خواص وعوام کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

ان خالص دینی احکام کے بعد جب آپ اسلام کے قوانین اجتماع پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہاں لوگوں کے باہمی تعلقات ومعاملات کی بنیاد صرف اور صرف حق ہے، پورے قانون کی روح عدل ہے۔ اور گویا قانون نے ظلم وجبر کے استیصال کا جھنڈا اٹھا رکھا ہے کہ ہر مجبور ومظلوم اسکے نیچے آجائے۔ اس کے بعد جب آپ خاص قانونِ تعزیرات کی طرف آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ہر جرم کی سزا ہر شخص کے لئے ایک ہے۔ کوئی بھی ہو اگر وہ قاتل ہے تو قصاص میں قتل کیا جائے گا، چوری جو بھی کرے گا، وہ چوری کی سزا پائے گا، اور زیادتی جو بھی کرے گا وہ اس کا مزہ چکھے گا۔ بغیر اس تفریق کے کہ قتل کرنے والا عالم ہے یا جاہل۔ مقتول کوئی حاکم تھا یا کسان! اور عام اس سے کہ زیادتی جس نے کی وہ مسلمانوں کا امیر تھا یا کپڑا بننے والا غریب۔ نیز عام اس سے کہ مظلوم عربی تھا یا عجمی اور شرقی تھا یا غربی ——— الغرض قانون کی نظر میں سب بالکل برابر ہیں۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى

آزاد کو اگر آزاد نے قتل کیا ہے تو وہ آزاد ہی بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ غلام کو اگر غلام نے قتل کیا ہے تو صرف وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا، اسی طرح عورت اگر عورت کی قاتل ہے تو اُس عورت ہی سے قصاص لیا جائے گا۔

اور اس سے بھی آگے بڑھکر یہ دیکھئے کہ اسلامی قانون انسانوں کے رنگ و نسل اور کیش و ملت سے بالکلیہ قطع نظر کرتے ہوئے سب کو یکساں طور پر انسانی شرف و عظمت کا حامل ٹھیراتا ہو۔ اور کہتا ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ — اور یہ حقیقت ہو کہ ہم نے عزت بخشی ہو بنی آدم کو۔

یہی عزت و کرامت ہے جو ہر ابن آدم کے لئے حیات و معیشت اور علم و عقیدے کے بنیادی حقوق کی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے، اور حکومت پابند ہوتی ہے کہ بلا کسی استثناء اور امتیاز کے ہر شخص کے یہ حقوق مہیا کرے ——— اس طرح اسلامی قانون کو انسانیت پروری کی جو بلند رفعت حاصل ہو جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔

لیکن اسلامی قانون اس سے بھی آگے جاتا ہے اور اس وقت وہ انسانی عظمت کے فکر و ادراک کی اور بھی بلند تر سطح پر پہنچ جاتا ہے جب وہ اعلان کرتا ہے کہ انسانوں کے ثواب و عذاب کا انحصار ظاہر افعال پر نہیں بلکہ نیات پر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُوَرِكُمْ — اللہ تعالیٰ کی نظر تمھارے ظاہر پر نہیں
وَلٰكِنْ إِلَىٰ قُلُوبِكُمْ — بلکہ تمھارے دلوں پر ہے۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ — اعمال کا معاملہ نیتوں سے وابستہ ہے اور
وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ — ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملے گا۔

ایک طرف یہ تصریحات ہیں دوسری طرف یہ معلوم ہے کہ اللہ کے یہاں جس نیت کو قبول حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کی رضا طلبی اور بندگان خدا کے بھلے اور اُن کے نفع کی وہ بے آمیز نیت ہے جس میں کوئی مادی غرض اور تجارتی نفع کی نیت شامل نہو ——— قرآن فرماتا ہو:۔

وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا — بندگی کرو اپنے پروردگار کی۔ اور بھلائی
الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ — کے کام کرو تاکہ تم فلاح یاب ہوسکو۔

یہ بھلائی کے کام جو آپ خالص اللہ کے لئے کرتے ہیں، اسلام بتاتا ہے کہ ان کی صحت کی شرط یہ ہے کہ جو شخص اِن نیک کاموں سے مستفید ہوتا ہو اُس سے کسی صلے یا شکرانے کی

طمع نہ کی جائے، دیکھئے وہ ایسے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کس طرح اس بلند جذبہ کو ابھارتا ہے، فرمایا جاتا ہے:۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ	اور وہ لوگ اپنی ضرورت اور خواہش
حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا	کے علی الرغم مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں
وَأَسِيرًا، إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ	کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (اور زبان حال
لِوَجْهِ اللَّهِ، لَا نُرِيدُ	سے کہتے ہوتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ
مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا	کے لئے کھلاتے ہیں تم سے کوئی صلہ اور
(قرآن)	کسی قسم کا شکریہ نہیں چاہیئے۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ اسلام کے قانون عمل میں انسانی شعور کی بلندیوں کی شاید یہ آخری گی۔ جی نہیں! اس شعور وادراک کی ایک اور بلندی باقی رہ گئی تھی اسکو بھی اسلام اس وقت سر کرلیتا ہے جب وہ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ کی غلامی اور اسکے تکوینی قانون کی اطاعت گزاری کے لحاظ سے عالم انسانیت، عالم حیوانیت، عالم نباتات وجمادات اور ارض وافلاک سب ایک وحدت ہیں۔ کیا عجیب انداز ہے، جس میں قرآن ہر مسلم سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی نماز کی ہر رکعت میں اس حقیقت کو تازہ کرلیا کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ	ہر تعریف کا سزاوار اللہ ہی جو رب
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	ہے تمام عالموں کا۔ رحمن ہے اور رحیم ہے۔

یہ خوبصورت اور بلیغ یاددہانی تلقین کر کے قرآن نے گویا ہر مسلم کو یہ یاد رکھنے کا پابند کردیا ہے کہ وہ اس وسیع کائنات کا ایک جز وہے جو بے پایاں رحمت والے معبود برحق کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور اس کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ مسلم، جو اسی عالم میں زندگی بسر کرتا اور قدم قدم پر اس سے احتیاج رکھتا ہے، اسی عالمگیر اور ہمہ گیر رحمت کا نمونہ بن کر رہے جو اللہ کی شان ہے۔ درانحالیکہ اُسے اس عالم سے کوئی احتیاج نہیں۔

اسلامی تہذیب عمل کی امتحان گاہ میں یہ وہ مظاہر ہیں جن سے ہماری تہذیب کے مبادی واحکام میں انسانی شعور کی کیفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر آپ

کو خیال ہو سکتا ہے کہ یہ صرف اعلانات تھے یا یہ تہذیب جب وقت کی غالب تہذیب ہوئی اور اُسے عمل کے سانچہ میں ڈھلنے کا موقع ملا تو اس کا واقعاتی روپ بھی یہی تھا؟ کہیں اِن رفیع الشان مبادی کا حشر انسانی حقوق کے اس بین الاقوامی چارٹر کا سا تو نہیں ہوا جس کی سالانہ یاد حکومتیں بڑی شان بان سے مناتی ہیں، درانحالیکہ دنیا کی بڑی طاقتیں سال کے ہر مہینے، مہینے کے ہر دن اور دن کی ہر ساعت میں اسے پامال کیا کرتی ہیں؟ کہیں یہ بلند بانگ اصول و مبادی اسی خاص ملک میں تو محدود ہو کر نہیں رہ گئے جہاں ان کا اعلان ہوا تھا، جیسے کہ انقلاب فرانس کے اصول و مبادی فرانس ہی کی سرزمین میں مقید کر دیے گئے اور فرانس کی نوآبادیات اور اس کے زیر انتداب علاقے آج تک اِن اصولوں کے استعمال سے محروم ہیں؟ ——— آپ سوچ سکتے ہیں کہ کہیں ان خوشنما اصولوں کی اسی طرح کی جھوٹی نمائش تو ان اصولوں کا اعلان کرنے والوں نے نہیں کی کچھ نئے مجسّے نصب کر دیے ہوں جیسا کہ نیویارک میں آزادی کا مجسمہ اس انداز سے نصب کیا گیا ہے کہ اس دیار میں قدم رکھنے والے کے سامنے سب سے پہلے حریّت پسندی کی یہی نمائش آتی ہے درانحالیکہ بیرونی دنیا میں یہی امریکہ وہ کام کرتا ہے جو زبانِ حال سے حریّت و آزادی پر لعنت برساتے، اس کا تمسخر اُڑاتے اور آزادی کے متوالوں کے لئے زہر کا گھونٹ تجویز کرتے ہیں؟

آپ کو یہ سب خیالات آسکتے ہیں، آئیے تاریخ سے فیصلہ مانگئے، کہ اُس سے زیادہ سچی بات کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ آئیے تاریخ سے ہماری تہذیب کے انسانی شعور کی دلآویز کیفیتوں کا تذکرہ سنئے، اور دیکھئے کہ اس تہذیب کے علمبرداروں اور سربراہوں کے اعمال میں کس طرح یہ شعور ایک بولتی ہوئی حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے۔

۱۔ ابوذر، جو غفار کے عربی قبیلہ کے ایک فرد تھے، کسی بات پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام، سیاہ فام بلال حبشی سے بگڑ گئے ——— یہ دونوں رسول پاک کے صحابی تھے ——— بات کچھ اتنی بڑھی کہ ابوذر نے غصّہ سے بے قابو ہو کر بلالؓ سے کہا کہ "او حبشن کی اولاد"۔ بلالؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ آپ جانتے ہیں رسول عربی نے کیا کہا؟ فرمایا ابوذر "تم نے بلال کو اس کی ماں کی طرف عار دلائی ہے؟ تم میں ابھی جاہلیت

کے اثرات ہیں!" ابوذر، جو جاہلیت کا مصداق محض شہوت پرستانہ اخلاقی بے راہ روی کو سمجھتے تھے ــــــ جو کہ صرف نوجوانوں ہی سے ممکن ہے ــــــ اس پر بولے کہ "کیا حضور، اس بڑھاپے کے باوجود مجھ سے جاہلیت سرزد ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں" ــــ یہ جو تم نے بلال کے ساتھ کیا یہ جاہلیت ہی تو ہے ــــ اسلامی نقطہ نظر سے تو یہ تمھارے برابر کے بھائی ہیں!" ابوذر پشیمانی کی تصویر بن گئے، تائب ہوئے، اور توبہ کی اس بلندی پر پہنچے کہ بلال سے کہا کہ مجھے منہ کے بل ڈال کر اپنے پیروں سے روند دو!

۲۔ قریش کی شاخ بنی مخزوم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چوری کی۔ وہ سزا کے لئے حضور کی خدمت میں لائی گئی۔ قریش پر یہ بات بڑی بھاری ہوئی جسکر ہوئی کہ کوئی سفارش کرتا کہ حضور اس پر حد جاری نہ فرمائیں۔ خیال آیا کہ اسامہ بن زید آنحضرت کو بڑے محبوب ہیں۔ اُن سے بات کی گئی کہ وہ سفارش کریں، وہ سفارش کرنے گئے۔ آپ جانتے ہیں کیا ہوا! حضور نے شدید ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ کیا تم حدود اللہ میں سفارش کی جرأت کرتے ہو؟ پھر لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا اور فرمایا:۔

"تم سے پہلی امتیں اسی میں ماری گئیں کہ جب ان میں کوئی باا ثر اور اونچے طبقہ کا آدمی چوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا اور اگر معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اس پر حد جاری کی جاتی۔ خدا گواہ ہے کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اُس کا ہاتھ کاٹے بغیر نہ رہتا۔"

۳۔ صحابہ (غالباً انصاری صحابہ) کے ایک حلقہ میں سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک منافق (قیس بن مطاطیہ) کا اُدھر گزر ہوا۔ کہنے لگا کہ یہ اوس وخزرج والوں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ محمد کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں اور ان کی مدد کچھ کام دے سکتی ہے۔ مگر یہ لوگ (سلمان وصہیب اور بلال) یہ آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ ــــــ معاذ بن جبل انصاری نے اٹھ کر اس منافق کا گریبان پکڑ لیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ بتایا کہ اس نے ایسی بات کہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مارے غصہ کے چادر سمیٹے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسی طرح مسجد تک تشریف لائے کہ ردائے مبارک گھسٹتی ہوئی آرہی تھی۔ منادی کرائی گئی اور لوگ جمع ہوئے۔

آپ نے خطاب فرمایا اور کہا۔

اَیُّھَا النَّاس! اِنَّ الربَّ	لوگو! یاد رکھو، تم سب کا رب ایک ہے
وَاحِدٌ وَ اِلْاَب واحدٌ	باپ ایک ہے اور دین بھی ایک ہی ہے
وَ اِنَّ الدِّینَ واحِد۔	(پھر کسی تفریق کے کیا معنیٰ؟)

۴۔ عدی بن حاتم الطائیؓ، اسلام لانے سے پہلے ایک دن مدینے آئے۔ یہاں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کی معیت میں ایک غزوہ سے واپس ہوئے تھے اور اسی جنگی لباس میں آپ کے ارد گرد جمع تھے۔ اس فوجی ہیئت میں صحابہ کے ادب و احترام کی کیفیت کے منظر نے عدی بن حاتم پر ایک ہیبت طاری کر دی ـــــ اور وہ ایسا محسوس کرنے لگے جیسے کسی باجبروت بادشاہ کے دربار میں ہوں ـــــ اسی اثنا میں مدینہ کی ایک غریب لونڈی رسول اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور عرض کی کہ حضور! میں کچھ تنہائی میں عرض کرنا چاہتی ہوں ـــــ آپ جانتے ہیں اس عالی دربار سے کیا جواب ملا؟ ـــــ ارشاد ہوا، بہت اچھا، تو مدینہ کی جس گلی میں کہے میں تیری بات سننے کے لیے چلا چلوں۔ یہ فرما کر آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ الگ جا کر کافی دیر تک کھڑے اس کی بات سنتے رہے۔ وہ بات کر چکی تو واپس تشریف لائے۔ اس پہلے منظر کے پہلو بہ پہلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانی حسن و جمال کا یہ منظر عدی بن حاتم کے دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔

۵۔ اکیس سال کی کشمکش و پیکار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا، اور اس پوزیشن میں آئے کہ جن لوگوں نے آپ کی تکذیب کی تھی، وطن سے نکالا تھا، اور مسلسل جنگ آپ کے خلاف برپا کر رکھی تھی ان سے بھرپور انتقام لیں، تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس دن آپ کو اس تلخ داستان کا کوئی جزو یاد نہ آیا، یاد آئی تو صرف اپنی دعوت اور اس کے وہ مبادی یاد آئے جو مکہ کے دور محن میں آپ کی زبان پر رہے تھے، اور جن کو بروئے کار لانے کا عملی اعلان آپ نے اس کامل فتحمندی سے بہت پہلے اس وقت کیا تھا جب آپ نے مدینہ میں حاکمانہ اقتدار کے ساتھ اسلام کی ابدی تہذیب کی بنیاد رکھنا شروع کی تھی۔ آپ نے کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اعلان

فرمایا اور نسلی تکبر و ظالمانہ سماجی امتیازات کے پرستار قریش سامنے کھڑے سن رہے تھے، کہ

"اے جماعتِ قریش! آج سے اللہ کا یہ فیصلہ نافذ ہوتا ہے کہ تمہارے اندر سے جاہلی غرور اور فخر با لآباء کی جاہلی خصلت نکال دی جائے ــــ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور سن لو! کہ آدم مٹی سے بنے تھے۔"

پھر آپ نے پروردگارِ عالم کا وہ ارشاد تلاوت فرمایا جس کی پکار آپ آج سے پہلے برپا کرتے رہے تھے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ	اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تم سب کو
مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ	ایک ہی مرد اور عورت سے۔ اور بنادیئے
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	ہیں تم میں قومیں اور قبیلے پہچان کی غرض
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ	سے (ان نسبتوں کو عند اللہ بزرگی میں
أَتْقَاكُمْ۔	کوئی دخل نہیں) اللہ کے نزدیک تو زیادہ
	عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق کی سربراہی کا دور آتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک ایسے آئیڈیل رئیسِ مملکت کی خصوصیات کا مجسمہ ثابت ہوئے جس کا دل اور جس کی روح انسانیت سے لبریز ہو۔ وہ خلیفہ ہوتے ہوئے بھی خلافت سے پہلے کی طرح محلہ کی ان بچیوں کے گھر جا جا کر اُن کی بکریاں دوھتے رہے جن کے باپ جہاد میں کام آگئے تھے۔ کوئی کچھ کہتا تو فرماتے تھے، خلافت سے پہلے جو وضع رہی ہے میں پسند نہیں کرتا کہ اس میں کوئی فرق آئے۔

اور عمرؓ کی زندگی کے حقائق پر کون خاک ڈال سکتا ہے؟ آپ ایک ایسے خلیفہ کا تصور کیجئے جسے قوم کے ایک ایک فرد کی عزتِ نفس کا خیال ہو، جو ضعیفوں کا سہارا، حق کے معاملہ میں سخت تر، اور سب کو ایک نظر سے دیکھنے والا ہو۔ نہیں! جس کے اوصاف میں یہ بھی شامل ہو کہ قوم کو دینے کے لئے اپنی ذات کو محروم کرے اور قوم کا پیٹ بھرنے کے لیے اپنا پیٹ کاٹے۔ آپ ایک ایسے خلیفہ کا تصور کیجئے اور پھر اس خیالی تصویر کو عمر کی تاریخی تصویر سے ملا کر دیکھئے

میں موجود کوئی فرق آپ کو اِن دونوں میں نظر آتا ہے! یہ تھے عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں۔ گھروں پر گھوم گھوم کر لوگوں کے حالات جاننے کی کوشش کرتے تھے، اس باب میں ان کے کتنے ہی واقعات ہیں جو زبان زدِ عوام و خواص ہیں۔

ایک مرتبہ ایک ضعیف بوڑھے کو بازار میں صدقہ مانگتے ہوئے دیکھا۔ کہا بڑے میاں کیا کر رہے ہو؟ جواب ملا کہ میں ایک ضعیف بوڑھا ہوں' جزیہ ادا کرنے اور پیٹ بھرنے کے لئے لوگوں سے سوال کر رہا ہوں ـــــ یہ مدینے ہی کا ایک یہودی تھا ـــــ ذرا اس جواب پر عمرؓ کا تاثر سنیئے، اور اس انسانی احساس کی عظمت کا اندازہ کیجئے جس پر وہ فائز تھے ـــــ "بڑے صاحب ہم نے آپکے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ جوانی اور توانائی کی عمر میں آپسے جزیہ وصول کیا اور اب بوڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا" یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے۔ اپنے لئے جو کچھ کھانا رکھا تھا وہ اُسے کھلایا، پھر بیت المال کے خزانچی کو حکم بھیجا کہ اس شخص کے لئے اور رعیت کے اس جیسے تمام افراد کے لئے اتنا وظیفہ مقرر کر دو جو ان کے اور انکے بال بچوں کیلئے کافی ہو سکے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ عمرؓ مدینے کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ ایک بچی نظر پڑی جو نقاہت سے لڑکھڑا رہی تھی۔ کھڑی ہوتی اور گر جاتی، کھڑی ہوتی اور گر جاتی۔ عمرؓ نے افسوس کرتے ہوئے کہا یہ کس کی بچی ہے؟ صاحبزادے عبداللہ (ابن عمرؓ) نے عرض کیا "امیر المومنین آپنے اسے نہیں پہچانا؟" فرمایا نہیں! صاحبزادے نے عرض کیا "آپ ہی کی بچی ہے۔" کہا "یہ میری کونسی بچی ہے؟" کہا "یہ فلاں ہے آپ کے لڑکے عبداللہ کی (یعنی میری) بچی"۔ حضرت نے فرمایا "اس کا یہ کیا حال کیونکر ہے؟" صاحبزادے نے عرض کیا۔ یہ حال کیسے نہ ہو جبکہ آپ ہمیں محروم رکھتے ہیں! عمرؓ نے کہا "بیٹے خدا کی قسم میں تمھیں اسکے سوا کچھ نہیں دے سکتا جو ایک عام مسلمان کی حیثیت سے تمھارے حصہ میں آتا ہو اب یہ چاہے تمھیں کافی ہو یا ناکافی! اللہ کی کتاب کا میرے اور تمھارے درمیان یہی فیصلہ ہے!

ایک تجارتی قافلہ مدینے میں اُترتا ہے جس میں عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ عمرؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کہتے ہیں کہ کیا تم آج کی رات ان کی پہرے داری کر سکتے ہو۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں اور پھر

دونوں مل کر رات بھر اُن کی نگہبانی کرتے اور حسبِ توفیق نوافل پڑھتے ہیں۔ اسی دوران میں عمرؓ ایک بچے کے رونے کی آواز سنتے ہیں، جدھر سے آواز آئی ہے اُدھر جاتے ہیں، اور بچہ کی ماں سے کہتے ہیں کہ خدا کی بندی اللہ سے ڈر اور اس کی تکلیف دور کر، کیوں رلا رہی ہے؟ اس کے بعد اپنی جگہ واپس آجاتے ہیں، پھر وہی آواز آتی ہے، پھر پلٹ کر جاتے ہیں اور اس کی ماں کو اسی طرح نصیحت کرکے چلے آتے ہیں ـــــ آخر شب میں پھر وہی آواز بچے کے رونے کی آتی ہے، اب کی اس کی ماں کے پاس جاکر کہتے ہیں کہ بُرا ہو تیرا، بڑی بُری ماں معلوم ہوتی ہے، رات بھر ہوگئی کہ تیرا بچہ بےچین ہے مگر تو اس کے لئے کچھ نہیں کر رہی؟ ـــــ اُسے کیا خبر تھی کہ یہ امیر المؤمنین ہیں جو قافلہ کے پہرے پر ہیں۔ اس نے بھی عاجز آکر کہا کہ "اے بندۂ خدا تو رات بھر سے مجھے خواہ مخواہ حیران کر رہا ہے۔ میں اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس وجہ سے یہ روتا ہے۔" پوچھا "کیوں"؟ ـــــ کہا "اس لئے کہ عمرؓ بچوں کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہیں کرتے جب تک ان کا دودھ نہ چھوٹ جائے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا اس کی عمر کیا ہے"؟ اُس نے کچھ مہینے کی بتائی۔ آپ نے فرمایا خدا کی بندی اتنی جلدی نہ کر ـــــ صبح ہو چکی تھی آپ نماز پڑھانے تشریف لے گئے۔ نماز میں گریہ کا یہ عالم تھا کہ قرأت صاف سننے میں نہیں آتی تھی۔ سلام پھیرا اور بے اختیار پکارے کہ ہائے عمرؓ کی بدبختی، اس طرح کتنے مسلمانوں کے بچے اس نے ہلاک کرا دیئے ہوں گے! ـــــ پھر ایک شخص کو یہ اعلانِ عام کرنے کا حکم دیا کہ:۔

"اپنے بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کرو، ہم آج سے ہر اس بچے کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہو۔"

اور پھر یہ حکم پوری مملکت میں نافذ کر دیا گیا۔

قسم ہے لکھنے والے کی عمرؓ کی! تاریخ نے اس سے زیادہ پیارا اور اس سے زیادہ لنانیت انگیز کوئی واقعہ آج تک روایت نہیں کیا، اور اگلی اور پچھلی تمام تہذیبیں عمرؓ کی اس جمہوری ادا کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں کہ ایک قافلہ آکر ٹھیرتا ہے تو اُس کے پہرے کے لیے وہ خود جاگتے اور اُن کے دوست اور ماتحت سوتے ہیں، کون عمرؓ؟ امیر المؤمنین!

وہ امیرالمومنین ـــ جو کسریٰ و قیصر کو مغلوب کر کے اُن دونوں کی سلطنتوں پر فرمانروا تھا!!
اس شب بیداری اور پہرہ داری میں ان کا شریک صرف ایک شخص ہوتا ہے جسے وہ اپنی معیت کے لئے آمادہ کرتے ہیں، مگر اس معیت کے باوجود اُن کی انفرادیت قائم رہتی ہے، رونے والے بچے کی طرف تنہا وہ ہی متوجہ ہوتے ہیں، تین تین بار جا کر اسکی ماں کو وہ ہی فہمائش کرتے ہیں۔ ساتھی کو یہ بات حاصل نہیں ہوتی! ـــــــ ہم میں سے کون ہے جو ایک اجنبی قافلہ کے بچوں کے بارے میں اتنا انسانی درد رکھتا ہو؟ اور ہم میں سے تو کیا، تاریخی مشاہیر میں سے آپ کو کوئی نظر آتا ہے جو اس عظیم انسانی احساس میں عمرؓ کے ہم پلہ ہو؟۔

اور آیئے۔ اسلامی تہذیب کی تاریخ کا میں ایک اس سے بھی زیادہ تابندہ ورق آپ کے سامنے کھولتا ہوں۔

عمرؓ کے خادم اسلم راوی ہیں۔ ایک رات میں حضرت عمرؓ کے ساتھ گشت میں نکلا۔ گھومتے گھومتے ہم مدینہ سے باہر نکل گیے تھے اور نواحی بستیوں کے باشندوں کے احوال کا تجسس کر رہے تھے، دور ایک جگہ آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ حضرت عمرؓ بولے، میں سمجھتا ہوں یہاں کوئی قافلہ ہے جسے رات اور سردی آڑے آگئی ہے۔ آؤ چلیں۔ ہم تیزی کے ساتھ اس رُخ پر چل کر اُن لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔ ایک عورت نظر آئی جس کے ساتھ بچے تھے اور پاس ایک ہانڈی آگ پر چڑھی ہوئی تھی۔ بچے بری طرح رو رہے۔ عمرؓ نے سلام کیا اور عورت سے پوچھا، کیا معاملہ ہے۔ یہاں تم لوگ کیسے ہو؟ جواب ملا "رات اور سردی نے رُکنے پر مجبور کر دیا ہے" ــــــ "اچھا یہ بچے کیوں رو چیخ رہے ہیں؟" "بھوک کی وجہ سے!" ــــــ "ہانڈی میں کیا چڑھا ہے؟" ــــــ "پانی ہے، تاکہ بہلا کر انھیں سلا دوں!" اور یہ کہتے ہوئے اس نے کہا "اللہ عمرؓ کے اور ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا" ـــ وہ نہیں پہچانتی تھی کہ عمرؓ ہی سے بات کر رہی ہے ــــــ عمرؓ نے کہا ارے خدا کی بندی، خدا تجھے خوش رکھے، عمر بیچارے کو تمھارے حال کی کیا خبر، کہ اسکی تم شکایت کرو، عورت نے کہا: حکومت سنبھالی ہی اور رعایا کے

حال کی خبر تک نہیں! ــــــ یہ مکالمہ پورا ہوا، عمرؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا چلو۔ ہم بڑی تیزی سے چلتے ہوئے سرکاری آٹے کے گودام پر آئے۔ عمرؓ نے وہاں سے ایک بوری آٹا لیا اور کچھ چربی اس کے ساتھ باندھی اور پھر مجھ سے کہا "یہ اٹھا کر میرے اوپر لاد دو"۔ میں نے عرض کیا "نہیں میں لادلوں گا"۔ فرمایا "کیا قیامت کے دن بھی تو میرا بوجھ اٹھالے گا؟" میں نے مجبوراً وہ سامان ان کی پیٹھ پر لاد دیا۔ بس کو لے کر وہ تیزی کے ساتھ اس عورت کی طرف روانہ ہوئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ اس کے پاس پہونچ کر یہ سامان اتارا، اور کچھ آٹا نکالا۔ پھر اس عورت سے کہا ذرا تم تیلی میں آٹا رکتی جاؤ میں اسے چلاتا جاؤں گا اور پھر خود ہی پتیلی کے نیچے آگ بھی پھونکنا شروع کی۔ آپ کی ڈاڑھی بڑی تھی، چنانچہ یہ حال میں دیکھ رہا تھا کہ دھواں ڈاڑھی کے درمیان میں سے نکل کر جا رہا تھا۔ اسی طرح لگے رہے یہاں تک کہ حریرہ تیار کردیا۔ پھر اس کو اتارا اور عورت سے کہا کہ اسکے نکالنے کے لیے کچھ دو، اس نے ایک بہت بڑا پیالہ نکال کر دیا اور آپ نے ہانڈی اس میں خالی کردی۔ پھر آپ نے اس سے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا کہ اب تم ان بچوں کو کھلاتی جاؤ اور میں پھیلا پھیلا کر حریرہ ٹھنڈا کرتا جاتا ہوں، آپ برابر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ بچے آسودہ ہوگئے۔ بقیہ کھانا اس کے پاس چھوڑا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہوگیا عورت نے شکر کے ساتھ کہا جزاک اللہ خیراً۔ امارت کے مستحق دراصل تم تھے، امیرالمؤمنین (عمرؓ) نہیں! عمرؓ نے اس پر کہا، اچھی بات کہو۔ اگر تم امیرالمؤمنین کے پاس آؤگی تو انشاء اللہ مجھے وہاں پاؤگی! یہ کہہ کر چل دیئے اور ایک آڑ میں جاکر کھڑے ہوگئے۔ مجھے دیکھ کر پھر اس کی طرف کو آئے اور بکری کی طرح دبک کر بیٹھ رہے ــــــ اب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں نے عرض کیا کہ حضرت! اب اس کے پیچھے کب تک پڑے رہیے گا؟ مگر انھوں نے کچھ جواب نہ دیا حتیٰ کہ بچوں کو میں نے دیکھا کہ لیٹ گئے اور پھر سو گئے۔ یہ دیکھ کر عمرؓ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کھڑے ہوئے اور اب میری طرف متوجہ ہوکر بولے، اسلم، بھوک نے انہیں بے چین کیے رکھا تھا اس لیے میرا جی چاہتا تھا کہ اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں جب تک اپنی آنکھ سے انھیں آرام سے سوتا ہوا نہ دیکھ لوں۔

انسانیت کی اسی منفرد نوع کا، عمرؓ ہی کا وہ واقعہ بھی ہے کہ ایک شب جب وہ حسب عادت گشت پر تھے اور مدینہ کے ایک کھلے میدان میں گزر رہے تھے تو ان کا گزر ایک بالدار خیمہ پر سے ہوا جہاں سے ایک عورت کے کراہنے کی آواز آرہی تھی اور دروازے پر ایک مرد بیٹھا ہوا تھا، عمرؓ نے اس شخص کو

سلام کیا۔ اور پوچھا کون ہو؟ جواب ملا کہ ایک بدوی ہوں، امیر المومنین کے جود وعطا سے کچھ حاصل کرنے کے ارادہ سے آیا ہوں، عمرؓ نے کہا کہ یہ اندر سے آواز کیسی آرہی ہے؟ وہ آدمی، جسے معلوم نہیں تھا کہ وہ امیر المومنین سے مخاطب ہے، شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ میاں جہاں جا رہے ہو، جاؤ، یہ سب پوچھ کر تم کیا کروگے؟ عمر مُصر ہوئے کہ نہیں بتاؤ تو، اس نے بتایا کہ اندر میری بیوی ہے جسے دردِ زِہ ہو رہا ہے، اور اس کے پاس کوئی نہیں ہے! عمرؓ یہ حال معلوم کرکے اپنے گھر آئے۔ اور اپنی اہلیہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ سے بولے کہ ایک ثواب کماؤ گی جو خود چل کر تمہارے پاس آگیا ہو؟ اہلیہ نے دریافت کیا، "کیا ہے؟" آپ نے پوری بات بتائی، اور فرمایا کہ ایک نو مولود کے لیے کپڑوں کی اور زچہ کے لیے تیل وغیرہ کی جو ضرورت ہوتی ہو وہ ساتھ لے لو، نیز ایک ہانڈی لے لو اور اس میں کچھ کھانے کا سامان رکھ لو، ام کلثوم نے فوراً تیاری کر لی، عمرؓ نے ہانڈی اٹھائی اور ام کلثوم ان کے پیچھے پیچھے چلیں، منزلِ مقصود آگئی۔ عمرؓ نے کہا تم اندر چلی جاؤ اور خود مرد کے پاس باہر بیٹھ گئے۔ وہیں چولہا آگ جلائی اور جو کچھ لائے تھے اسے پکا کر تیار کیا، بدوی غریب بیٹھا دیکھ رہا تھا اسے بالکل نہیں پتہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اتنے میں اندر ولادت کا مرحلہ طے ہو گیا، اور حضرت ام کلثوم کی آواز آئی۔ "امیر المومنین اپنے دوست کو خوشخبری دیجیے فرزند کی!" —— یہ آواز جو بدوی کے کانوں میں پہونچی، اور معلوم ہوا کہ یہ تو امیر المومنین ہیں، تو اس کے تو ہوش خراب ہو گئے۔ ایک دم سے اٹھ کر دور بیٹھنے لگا، عمرؓ نے فرمایا، نہیں نہیں، اپنی جگہ رہو، مجھ سے دور ہونے کی ضرورت نہیں، پھر ہانڈی اٹھائی اور اہلیہ کو پکارا کہ اندر لے جا کر عورت کو کھلاؤ، جب وہ کھا چکی تو واپس منگا کر اس کے مرد کو دی اور اس سے کہا۔ لو میاں کھا پی لو، تم رات بھر حیران رہے ہو —— اس کے بعد اہلیہ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ اور چلتے وقت بدوی سے کہا، کل ہمارے پاس آجانا، تمہارے لیے کچھ بندوبست کر دیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو بدوی پہونچا، آپ نے اس کے بچے کے لیے وظیفہ مقرر فرما دیا، اور اُسے بھی کچھ دیا۔

میں دیانتداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے دنیا کے بڑے آدمیوں کی زندگی کا جو کچھ مطالعہ کیا ہے، انسانی نقطۂ نظر سے اتنا بلند اور اتنا دلکش نمونہ میں نے نہیں دیکھا۔ واشنگٹن کے حالات میں میں نے پڑھا ہے کہ وہ ایک دن اس شہر کی کسی سڑک سے گزر رہے تھے جو آج انہیں کے

نام سے موسوم ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ سپاہی ایک پتھر کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو رہے تھے، ان کا ایک افسر پاس کھڑا ہوا تھا، مگر اُن کی مدد سے مطلق دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ واشنگٹن نے اس سے کہا کچھ آپ کو بھی مدد کرنی چاہیے، افسر نے جواب دیا "جی نہیں یہ میرے مرتبہ سے فروتر ہے"۔ واشنگٹن نے اپنا گون اتار کر ایک طرف ڈالا، اور ان کی مدد کر کے پتھر اٹھوا دیا۔ اس کے بعد اُن سے کہا "تمھیں جب مدد کی ضرورت ہو واشنگٹن کے گھر آجاؤ"۔ ——— بیشک یہ ایک کیا ہے نمونہ ہے اور اعلیٰ کیرکٹر کی نشاندہی کرتا ہے! مگر کہاں یہ اور کہاں عمرؓ کی پیش کی ہوئی مثال کہ رات کی نیند اور آرام چھوڑ کر عوام کی خبر گیری ہو رہی ہے، ایک حاملہ عورت کا پتہ چلتا ہے جو قریب الولادت ہے۔ کوئی اُس کے پاس مونس و مددگار نہیں ہے، گھر واپس آتے ہیں بیوی کو جگا کر ساتھ لیتے ہیں پھر دونوں (امیر المومنین اور اُن کی بیگم) اس شان سے رات کی اندھیری میں پیادہ پا اس غریب الدیار کی مدد کے لیے روانہ ہوتے ہیں، کہ امیر المؤمنین کھانا اُٹھائے ہوئے ہیں، اور بیگم صاحبہ کپڑوں کی پوٹلی دبائے ہوئے ہیں۔ اس شان سے چل کر بدوی کے خیمہ پر پہونچتے ہیں اور یہاں عمرؓ کی اہلیہ، جنھیں ہماری آج کی زبان میں مملکت کی پہلی خاتون (First Lady of the State) کہا جانا چاہیے، ایک دائی کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور امیر المومنین عمرؓ "خانساماں" کے روپ میں نظر آتے ہیں! ——— انسانی احساس کی اس بلندی کی کیا مثال لائی جا سکتی ہے جس پر روئے زمین کا کوئی حکمراں عمرؓ کے سوا آج تک نہیں پہونچا؟ ——— یہ عمرؓ کی منفرد عظمتوں میں سے ایک عظمت کا نشان ہے۔ اور ہماری اس تہذیب کے حسین ابواب میں سے ایک باب ہے جس نے عمرؓ کو ایک ایسے پیکر میں ڈھالا جو آج تاریخ کی عظیم شخصیتوں میں اسی طرح سب سے اوپر کھڑا نظر آتا ہے جس طرح یہ اسلامی تہذیب تمام دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں۔

اور یہ انسانیت عظمیٰ کا صرف ایک پتلا نہیں ہے جو ہماری تہذیب نے ڈھالا ہو، ابوبکرؓ میں یہی انسانیت جلوہ گر ہے، عثمان و علی کی سیرتوں میں انسانیت کی یہی بلندیاں ہیں، عمر بن عبدالعزیز اسی انسانیت کا پرتو ہیں، صلاح الدین ایوبی کی زندگی اسی کا ثبوت ہے اور ان کے علاوہ علماء، عظماء، قائدین، صوفیاء اور فلاسفۂ اسلام میں سے کتنوں ہی کی زندگیاں ہیں جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اس کی شہادتیں فراہم کر رہی ہیں کہ انسانیت کا بلند ترین شعور اسلامی تہذیب کا خاص حصہ ہے۔

(ماہنامہ المسلمون (دمشق) سے ترجمہ)

تعارف و تبصرہ

صُبحِ اُمید | از، مولانا ابوالکلام آزاد، صفحات ۳۰۴، سائز متوسط ۱۸×۲۲/۸ کتابت طباعت معمولی۔ مجلد قیمت ۶/- ناشر:۔ سنگم کتاب گھر، اُردو بازار دہلی

مضامین آزاد کے نام سے مولانا مرحوم کے مضامین کا جو انتخاب ایک عرصہ ہوا ہندستانی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوا تھا، کچھ اضافوں کے ساتھ اسی کا یہ ایک حصہ ہے جو مولانا عزیز الرحمٰن جامعی نے سنگم کتاب گھر دہلی کی طرف سے شائع کرایا ہے۔ اسکی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داریاں جناب حافظ فیاض احمد صاحب (جامعہ ملیہ) نے انجام دی ہیں۔

مضامین آزاد کے علاوہ کتاب کے شروع میں کچھ لوگوں کے تأثرات و آرا بھی مولانا مرحوم سے متعلق درج کی گئی ہیں، بلکہ اسی میں خود مولانا کے اپنے قلم سے بھی اپنا وہ مشہور تعارف ہو جو تذکرہ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کے اس حصہ کو "شیش محل" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

مضامین کا حصہ جو "صبح امید" کے نام سے موسوم ہے مولانا مرحوم کے ۱۵ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ سب مضامین مولانا کے "الہلال" دور کے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ مولانا کی بعض آخری دور کی تقریریں بھی اس حصہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ تقسیم کے بعد کی پہلی تقریر جو مولانا نے جامع مسجد دہلی میں فرمائی، اور زبان کے مسئلہ پر پارلیمنٹ کی تقریر بھی ان تقریروں میں شامل ہے۔

اس مجموعہ مضامین کا نام اسی میں کے ایک مضمون "صبح امید" کے عنوان سے مستعار لیا گیا ہے۔ مگر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر کوئی مناسبت اس نام اور کتاب میں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ایک احساس ہمارا یہ بھی ہے کہ مضامین کا یہ انتخاب اگر آج سے ۱۵ برس پیشتر جامعہ ملیہ کے

"چند منچلے اوولڈ بوائز" نے کیا تھا تو کچھ ایسا بیجا نہیں تھا۔ مگر یہ انتخاب مجموعی طور پر اس شان کا ہرگز نہیں تھا کہ جامعہ کے سنجیدہ بزرگ اسے آج مولانا آزاد کی یاد قائم رکھنے اور ان کے فیض و برکات کو باقی رکھنے کی نیت سے دوبارہ شائع کرتے، الہلال کے دورِ ادارت میں مولانا کی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا جس کے اثر سے تنقید و احتساب اور نوک جھونک کے میدان میں اُن کا قلم بے پناہ شوخی اور سخت بے رحمی کے مظاہرے کرتا تھا، اِس اندازِ طبیعت کو بعد میں مولانا خود ناپسند کرنے لگے تھے. چنانچہ مہر صاحب کے شائع کردہ خطوط (نقشِ آزاد) میں ایک خط میں یہ بات صراحتاً ملتی ہے۔ "ندوۃ العلماء" اور "حفظ و کرب" کی بحث کے سلسلہ کے دونوں مضمون مولانا کے اسی اندازِ طبیعت کا عکس ہیں۔ ان میں کوئی خاص افادی پہلو تو ہے نہیں، البتہ کچھ تلخ اور ناخوشگوار یادوں کو یہ ضرور اُبھار دیتے ہیں۔ اسی طرح "نشۂ نیم شبی کا خمار" پڑھ جائیے تو اس میں شوخی کی لذّت کے سوا کچھ ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اور صرف اسی لذّت کے لئے اسے پڑھا جاسکتا ہے ــــ ورنہ یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے جلسہ کی یہ حکایتِ دراز آج ہمارے لئے کیا افادیت رکھتی ہے۔

الہلال کے صفحات میں ایسے علمی ادبی، دینی اور سیاسی مضامین کی کمی نہیں ہے جو آج بھی کم و بیش افادیت رکھتے ہیں۔ درحقیقت وہی اسکے مستحق ہوسکتے ہیں کہ ان کو مولانا کی یاد قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ جیسے کہ اس مجموعہ میں بھی اور دوسرے مضامین اور تقریریں اس وصف کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قیمت ہمارے نزدیک اس مجموعہ کے پہلے مضمون کی ہے۔ جس کا عنوان ہے "الہلال کے مقاصد اور پولیٹکل تعلیم" جن لوگوں نے الہلال نہیں پڑھا وہ صرف اس مضمون کو پڑھ کر الہلال کی روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور جان سکتے ہیں کہ مولانا کا فکری نہج "الہلالی" دور میں کیا تھا ــــ آیئے چند ٹکڑے یہاں بھی پڑھ لیجئے۔

یہ ذہن میں رہے کہ یہ مضمون ایک خط کے جواب میں ہے ــــ

"آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہب سے الگ کر دیجئے لیکن اگر الگ کردیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہجاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں مذہب سے کیونکر الگ کردیں؟ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ

سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے۔ اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہو
کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا مَا قَدَرُوا اللّٰہَ
حَقَّ قَدْرِہٖ (۲۲ : ۴ ۔) ورنہ پولیٹکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر
جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتداء کرنے کی ضرورت پیش آتی ۔

ص ۷۹ ۔ ۸۰

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولیٹکل خیالات کے تین راستے موجود
ہیں ۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے ؟ پھر آپ نے ان کو گنوایا بھی ہے ، لیکن
افسوس ہے کہ آپ ایک چوتھی راہ کو بالکل بھول گئے ۔ یہ تین راستے تو آج آپکے سامنے
نمودار ہوتے ہیں ، مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جس پر چل کر ہزاروں ہستیاں
منزل مقصود تک پہنچ چکی ہیں ۔ آسمان وزمین کے فاطر نے جس وقت آدم کو آنکھیں دیکھنے
کے لئے عطا فرمائیں اسی وقت اس کے سامنے یہ راہ بھی کھول دی تھی ۔ آدم نے اس پر
قدم رکھا ۔ اور نوح نے پتھروں کی بارش میں اس کا وعظ کہا ، ابراہیم نے اس کی نشانی
کے لئے قربان گاہ بنائی ۔ اور اسمٰعیل نے اس کے لئے اینٹیں چنیں ۔ یوسف نے مصر
کے قید خانے میں ، جب ایک ساتھی نے پوچھا تو اسی راہ کی اس نے رہنمائی کی ۔ اور
موسیٰ جب وادی ایمن (ایمن ؟) میں روشنی کے لئے بے قرار ہوا تو اسی راہ کی تجلی
ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی ۔ گلیل (گیلیلی ؟) کا اسرائیلی واعظ جب یروشلم
کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اسکی نظر اسی راہ پر تھی ۔ اور پھر جب خداوند سعیر
سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اس
نے دنیا کو دعوت دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
یہی وہ راہ ہے جس کی نسبت یوسف صدیق نے قید خانۂ مصر میں یہ کہہ کر اپنا
وعظ ختم کیا تھا ۔

ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۲ ۔ ۴۰) — یہی سیدھا راستہ ہو مگر بہت ہیں جو نہیں جانتے ۔

اور جس کی نسبت داعی اسلام کو حکم ہوا تھا کہ کہدے:۔

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (۱۲ - ۱۰۸)

میرا راستہ یہ ہے، تم سب کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں سب عقل و بصیرت کے ساتھ اسی راستہ پر ہیں۔

الحمد للہ کہ ہم " وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ " کے زمرے میں داخل ہیں۔ اور اسی لئے جناب کی قرار دی ہوئی ان تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ بلکہ اس چوتھی راہِ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں "

ص ۸۴ - ۸۵

" آپ پوچھتے ہیں کہ " آجکل ہندوؤں کے دو پولیٹیکل گروہ موجود ہیں آپ ان میں سے کس کے ساتھ ہیں ؟ " گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسکے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھکر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہوجائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہوجائے گی " (ص ۸۵)

اس کے آگے اسلام کے اساسی اصول بیان کرتے ہوئے گورنمنٹ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

" گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوجائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لئے مفید ہوں گے اتنا ہی گورنمنٹ کے لئے نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لئے۔ اس کو بھولنا نہ چاہیئے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا۔ اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ یا ریوالور نہیں پکڑ سکتا " الخ (ص ۸۶)

اس کے بعد پھر مقصد اصلی کی طرف آجاتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع و تقلید ہے بلکہ اُس رب العالمین نے جس نے کتاب و حکمت اور عدل و میزان کے ساتھ اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجا، یہ راہ ہمارے لئے کھولدی ہے۔ وہ اگر توفیق بخشے تو اسی کی دی ہوئی زندگی کو اسی دعوتِ حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ نہ کسی سے جنگ ہے نہ کسی سے مناقشہ، نہ صلہ کی توقع نہ داد کی امید" (ص ۹)

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف مولانا آزاد کے یہ افکار پنڈت جواہر لال نہرو سے انتساب کے ساتھ شائع ہوں اور دوسری طرف وہ ایسے ہی خیالات رکھنے پر ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت کو گردن زدنی قرار دیں۔ پتہ نہیں انھیں اس انتساب کی خبر ہے یا نہیں۔

کتاب کے تعارف میں یہ بات ذکر ہونے سے رہ گئی کہ دس عکسی بلاک بھی اس میں شامل ہیں جن میں مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور ناشر و مرتب وغیرہ کے فوٹو بھی ہیں۔

مطالعۂ اسلامیات | از جناب حسن واصف عثمانی۔ ناشر: کتب خانہ اسلامیہ الہ آباد ۳
کتابت طباعت اور کاغذ معیاری صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت ۲/۵۰

بہمہ جہت حسنِ ظاہری سے مالا مال یہ کتاب مؤلف کے مطالعۂ اسلامیات کا نچوڑ ہے۔ مؤلف کا مقصد اس تالیف سے اسلام کے چند اہم اجزاء کی "ہمہ جہتی تاریخ اُن کے ارتقاء اور انکی وحدت کا ایسا جائزہ لینا ہے جس سے اسلامی تہذیب کے ذہنی اور عملی کارنامے کھل کر سامنے آجائیں"۔۔۔ کتاب کا سب سے پہلا عنوان ہے "سلطنت و تہذیب کا عروج" جس میں ۳۰-۳۱ صفحوں کے اندر "اسلام کی تیرہ صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ اور صحرائے عرب سے چل کر مراکش دلایا تک پیام حق لے جانے کی داستان" بیان کر دی گئی ہے ۔۔۔ یہ اجمال ہے جس کی تفصیل آگے ۱۲ عنوانات اور ڈیڑھ سو صفحات میں کی گئی ہے۔ یہ عنوانات ہیں:-

"الکتاب اللہ، الرسول اللہ، احکام قرآن، حدیث و سنت، قانون کا ارتقاء، المعتزلہ، تین فرقے، (اہلسنت، شیعہ، خوارج) زہد و اتقاء کا نظریہ صوفی تحریک

نشأۃ ثانیہ کی لہر، ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری، آثارِ حیات۔"

اسلامیات کے گہرے مطالعہ اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے (کم ازکم دینیات کی حد تک) عربی زبان اور دینی علوم سے براہ راست واقفیت ایک ضروری شرط ہے۔ جب کہ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات ہمارے مؤلف کو حاصل نہیں ہے تاہم یہ بات بڑی تحسین واعتراف کی مستحق ہے کہ انھوں نے ذوق ومحنت اور ذہنی کاوش سے پورا پورا کام لے کر ایسے پڑھے لکھے نوجوان طبقہ کی اسلامیات سے فی الجملہ واقفیت کا سامان اس کتاب میں کر دیا ہے جس نے اسلامیات پر کچھ نہ پڑھا ہو، بلکہ کتاب کا نصف آخر جو تاریخی عنوانات پر مشتمل ہے اس کی افادیت کا حلقہ کچھ اور بھی وسیع ہو سکتا ہے ـــــــ مؤلف اگر اپنی محنت کے ساتھ کسی عربی داں کی نظر بھی شامل کر لیتے تو کم ازکم "الکتاب اللہ"، "الرسول اللہ" جیسی غلطیاں کتاب میں نظر نہ آتیں۔ ان لفظی اغلاط کے علاوہ معناً بھی کتاب کے متعدد مقامات تصحیح وترمیم کے محتاج ہیں۔

مسئلۂ قربانی

از، پیرزادہ محمد بہاء الحق صاحب قاسمی۔
ماڈل ٹاؤن لاہور، ملنے کا پتہ یہی ہے۔ قیمت ۴ر

یہ رسالہ دو مقالوں پر مشتمل ہے، ایک میں لاہور کی شاہی مسجد کے خطیب مولوی غلام مرشد کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے جنھوں نے حال ہی میں قربانی کو محدود کر دینے کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے رکھی تھی، دوسرے مقالہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں قربانی کی اہمیت واضح کی گئی ہو ـــ دونوں مقالے مفید اور اچھے ہیں۔ پاکستان کے مسلمان ان سے خاص طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جمال کربلا

از، جمال قریشی احمد آبادی، صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۱/۸
ناشر، حسینی انجمن، سوداگر کی پول، جمال پور چکلہ، احمد آباد

جمال قریشی صاحب احمد آباد کے ایک نوجوان شاعر ہیں، پیش نظر کتاب ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، جو اصلاً شہید کربلا رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلاموں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نظمیں

نعتیں اور قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور سے کلام سے اسلامیت اور دینی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا کے بیان اور شہداء کربلا کی یاد میں، شاعر اپنی روشن خیالی کے باوجود مشہور عوام روایتوں اور عوامی تصورات کے چکر سے نہیں نکل سکے ہیں ——— شروع میں اعجاز صدیقی اور حبیب الرحمٰن غزنوی صاحب کے قلم سے تقریظیں ہیں، جنھیں شاعر کی کامیابی کے پہلو ابھارے گئے ہیں۔

مختصر فہرست کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ملاحظہ فرمالیجئے :-

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اُردو میں ضرور لکھئے، اور اگر ہوسکے تو انگریزی میں بھی لکھدیجئے۔
(۲) اگر آپ صرف ایک دو روپئے کی کتابیں منگوئیں گے تو محصول ڈاک کا بار بہت زیادہ پڑجائے گا، اور اگر زیادہ منگوئیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوائینگے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے بہت کم ہوجائے گا، اور آپ نفع میں رہیں گے۔

پاکستانی احباب کی خدمت میں :-

(۳) آپ حضرات کو جو کتابیں منگوانی ہوں، اُنکی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے، پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور ۸ ر رجسٹری فیس و صرفہ پیکنگ کا اضافہ کرکے کل رقم ذریعہ منی آرڈر "ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور" کے نام روانہ کردیجئے، اور ڈاک خانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیجدیجئے، یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو فوراً روانہ کرادی جائیں گی۔
(۴) یاد رکھئے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے تو ہندوستان سے پاکستان جاسکتے ہیں، لیکن ایک کتاب کے زیادہ نسخے نہیں جاسکتے۔

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

معارف الحدیث (اوّل) قیمت مجلد -/-/۵ غیر مجلد -/-/۴	معارف الحدیث (دوم) مجلد -/۸/۵ غیر مجلد -/۸/۴	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ مجلد -/-/۴	دین و شریعت مجلد -/-/۳	تذکرہ مجدد الف ثانیؒ (الفرقان کے مجدد الف ثانیؒ نمبر کا کتابی ایڈیشن) مجلد -/-/۴
اسلام کیا ہے؟ (جدید ایڈیشن) مجلد -/۸/۲	اسلام کیا ہے؟ (ہندی) مجلد -/-/۲	کلمۂ طیبہ کی حقیقت -/۶/-	نماز کی حقیقت -/۱۲/-	برکات رمضان -/۱۲/-
آپ حج کیسے کریں؟ مجلد -/-/۲	آسان حج :- (حج کیسے کریں کا خلاصہ) (جیبی سائز) -/۸/-	حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت ۲/۸/-	ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ ۱/۸/-	حضرت شاہ شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات ۱/۸/-
دیوبند اور بریلی کے اختلافات پر فیصلہ کن مناظرہ ۱/-/-	امام ولی اللہ دہلویؒ (از مولانا سندھیؒ) ۱/-/-	اسلام اور نظام سرمایہ داری -/۸/-	بوارق الغیب :- (حصہ دوم) ۱/۸/-	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ -/۴/-
	دجالی فتنہ اور سورۂ کہف ۱/۸/-	انیس نسواں -/۱۰/-		

قرآن مجید سے متعلق کتابیں

تفسیر ابن کثیر (اُردو) :- حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کی تفسیر، جو عربی تفسیروں میں بھی مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے، اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر وہ پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں، اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے پھر صحابۂ کرامؓ، تابعین، اور بعد کے ائمہ تفسیر کے ارشادات سے - یہ اس کا مکمل اُردو ترجمہ ہے۔ پانچ ضخیم جلدیں ہیں ——— (قیمت مجلد مکمل سٹ) ——— ۵۵/-/-

تفسیر بیان القرآن :-
(از حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ)
مکمل بارہ جلد مطبوعہ ہندوستان۔ ۶۰/-/-

قصص القرآن :- (از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی)
جلد اوّل :- حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات تک۔ ۶/-/-
〃 دوم :- حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰ تک کے واقعات۔ ۴/-/-
〃 سوم :- انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی قصص قرآن کا بیان ۵/۸/-
〃 چہارم :- حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات ——— ۶/-/-

رہنمائے قرآن :-
اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے انداز کی بالکل نئی کتاب۔ اصل کتاب انگریزی میں تھی، اُردو ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (پی ایچ ڈی) نے کیا ہے ——— ۱/-/-

لغات القرآن (کامل) :-
اُردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح ——— چھ جلدوں میں۔
قیمت مکمل سٹ مجلد ۳۶/۸/- غیر مجلد ۳۰/۸/-

مصباح اللغات :- اُردو میں عربی زبان کا سب سے زیادہ جامع اور مبسوط لغت ——— قیمت مجلد ۱۶/-/-

اُردو عربی ڈکشنری :- (اُردو سے عربی)
قیمت مجلد ۶/-/-

قرآن اور تعمیر سیرت :- (از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب)۔
قیمت غیر مجلد ۵/-/- مجلد ۶/-/-

قرآن اور تصوّف :- (از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب)۔
قیمت غیر مجلد ۲/-/- مجلد ۳/-/-

حدیث شریف سے متعلق کتابیں

صحیح بخاری شریف مکمل (اُردو) :- (تین ضخیم جلدوں میں)
قیمت مکمل مجلد سٹ ۲۴/-/-

جامع ترمذی شریف (اُردو) :-
امام ترمذی نے اپنی اس کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ ہر باب کی حدیثیں درج کرنے کے ساتھ وہ ائمہ امت کا مذہب بھی لکھتے ہیں۔ دو ضخیم جلدوں میں ——— قیمت مجلد ۱۸/-/-

مشکوٰۃ شریف (اُردو) :-
مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتب خانہ کا جامع انتخاب کہا جاسکتا ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔ قیمت مجلد ۱۶/-/-

ترجمان السنہ :- (از مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی) مقیم مدینۂ طیبہ
قیمت جلد اوّل ۱۰/-/- جلد دوم ۹/-/- جلد سوم ۱۰/-/-

حدیث کا ایک اہم تاریخی مجموعہ

صحیفہ ہمام بن منبہ :- ہمام بن منبہ، مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیا تھا۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا صرف تذکرہ ملتا تھا۔ ہمارے زمانہ کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے اس کا نسخہ کسی طرح حاصل کیا، اور اپنے فاضلانہ مقدمہ اور ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے، قدر دانوں کیلئے بڑا قابل قدر تحفہ ہے ——— قیمت ۳/-/-

زاد سفر :-
امام نوویؒ کی بہترین کتاب "ریاض الصالحین" کا ترجمہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے قلم سے۔ قیمت مکمل مجلد ۷/-/-

حجۃ اللہ البالغہ (مع ترجمہ اُردو) :-
اسلامی اسرار و حقائق کے بیان اور احادیث نبویہ کی عارفانہ اور حکیمانہ تشریح میں یہ کتاب بلاشبہ پورے اسلامی کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔
اصح المطابع کراچی نے اس کو تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی کے بہترین ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اصل عربی متن بھی ساتھ میں چھاپا گیا ہے۔ علماء اور تعلیمیافتہ طبقے کیلئے بہترین تحفہ ہے ——— دو ضخیم جلدیں
قیمت مجلد /-/-

علم الحدیث :- اپنے موضوع پر بہترین کتاب، نیز حدیث کے بارے میں پیدا کئے جانیوالے شبہات کا جواب ——— قیمت ۳/-

مختلف موضوعات پر منتخب کتابیں

سلسلہ تاریخ ملت :۔
(شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی)

حصہ اوّل (نبیِ عربی) عہ/
〃 دوم (خلافتِ راشدہ) ہے/
〃 سوم (〃 بنو امیہ) ہے/
〃 چہارم (〃 ہسپانیہ) عا/
〃 پنجم (〃 عباسیہ اوّل) ہے/۱۲
〃 ششم (〃 〃 دوم) للعہ/۱۲
〃 ہفتم (تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ) ہے/
〃 ہشتم (خلافتِ عثمانیہ) ہے/
〃 نہم (تاریخ صقلیہ) عہ/۱۲
〃 دہم (سلاطین ہند اوّل) ہے/
〃 یازدہم (〃 〃 دوم) ہے/
قیمت مکمل سٹ غیر مجلد ۸/۳۱، مجلد -/۳۴

تاریخ اسلام پر ایک نظر :۔
اسلام کے مختلف دوروں اور خلافت و حکومت کے مختلف سلسلوں کی جامع و مختصر تاریخ ۔/۶
مجلد ۸/۶

رحمتِ عالمؐ :۔ از مولانا سید سلیمان ندویؒ ۔ عہ/۱۲
خطباتِ مدراس :۔ 〃 〃 〃 ہے/
سیرتِ پاک :۔ از بشیر محمد شارق دہلوی عہ/
صدیقِ اکبرؓ :۔
(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی) ۔/۷

تاریخ دیوبند :۔ یہ دراصل قصبہ دیوبند و دارالعلوم دیوبند کی تاریخ ہے۔ شروع میں مولانا محمد طیب صاحب کا پیش لفظ ہے۔
قیمت مجلد ۔ عہ/

سفرنامہ ابنِ بطوطہ :۔
(از مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب)
قیمت مجلد ۔/۳

گلبانگِ حرم :۔ ۳/۱۲
آتشِ گل :۔ ۔/۶

رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی :۔
(از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب) ۔ قیمت ۔/۔/۷

عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ :۔
(از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب) ۔ قیمت ۔/۸/۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات :۔ یعنی شاہانِ عالم، عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں سے آپ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات، انکے پس منظر اور نتائج ۔
(از سید محبوب رضوی) ۔ قیمت مجلد ۔/۴/۲

تاریخ مشائخ چشت :۔
(از پروفیسر خلیق احمد نظامی) سلسلۂ چشتیہ کی نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ، تصوّف اور خاص کر چشتی سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں ۔
قیمت ۔/۱۲/

حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ :۔
(از پروفیسر خلیق احمد نظامی) شیخ موصوف ہندوستان کی نہایت اہم شخصیتوں میں سے ایک ہیں، انکی سوانح کی کمی کو اس تحقیقی کتاب نے پورا کر دیا ہے ۔ قیمت مجلد ۔/۷/

تذکرہ علّامہ ابن طاہر محدث پٹنی :۔
(از پروفیسر سیّد ابوظفر ندوی)
قیمت مجلد عہ/

حیاتِ انور :۔
خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کاشمیری کی سوانح حیات ۔
قیمت مجلد ۔/۴

سوانح قاسمی :۔ ہر سہ جلد کامل ۔ ۔/۸/۱۵

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات :۔ (دو جلدوں میں)
قیمت مکمل ۔/۱۲/۵

اسلام کا نظامِ حکومت :۔
اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی، اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہے طرزِ تحریر زمانہ حال کی قانونی زبان سے پوری مطابقت رکھتا ہے ۔ قیمت غیر مجلد ۔/۶
قیمت مجلد ۔/۷

مسلمانوں کا نظمِ مملکت :۔ یہ دراصل ایک مصری فاضل کی کتاب "النظم الاسلامیہ" کا اُردو ترجمہ ہے اسکے مطالعہ سے مسلمانوں کے نظامِ حکومت و مملکت کی ایک صاف محققانہ تاریخ سامنے آجاتی ہے ۔ قیمت غیر مجلد ۔/۱۴/ مجلد ۔/۵

اسلام کا اقتصادی نظام :۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کی مشہور تالیف ہے۔
قیمت غیر مجلد ۔/۵/ مجلد ۔/۶

اسلام کا زرعی نظام :۔ اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ۔
قیمت غیر مجلد ۔/۴/ مجلد ۔/۵

اسلام کا نظامِ عصمت و عفت :۔
اسلام نے پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کیلئے جو اصول مقرر کئے ہیں انکی تفصیل اور ان کی حکمت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے ۔
قیمت ۔ ۔/۴/

اسلام کا نظامِ مساجد :۔ اسلام کے نظام میں مساجد کا کیا مقام ہے اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں، اور اسکے بارہ میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ ۔ قیمت ۔/۸/۳

غلامانِ اسلام :۔
(از مولانا سعید احمد صاحب ایم اے)
قیمت مجلد ۔/۸/۶

فلسفہ کیا ہے ؟ :۔
(از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب)
قیمت مجلد ۔/۲

تصنیفات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ظلہٗ

- خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی قیمت -/۵
- حکایات صحابہؓ -/۲
- فضائل حج -/۳
- برکات ذکر -/۱۰/۲
- فضائل صدقات اوّل -/۸/۲
- ؍؍ ؍؍ دوم -/۱۲/۳
- فضائل نماز -/۱۲/
- فضائل رمضان -/۱۲/
- فضائل قرآن -/۱۲/
- فضائل تبلیغ -/۶/

تصانیف مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی :-

- دعوت و عزیمت اوّل -/۶
- ؍؍ ؍؍ دوم -/۸/۶
- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ... ... (زیر طبع)
- اصلاحیات (اصلاحی مضامین کا مجموعہ) .. .. .. -/۱۰/۱
- دعائیں -/۶/
- پیامِ انسانیت -/۱۰/
- مقامِ انسانیت -/۱۰/
- تذکرہ مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مرادآبادیؒ -/۸/۲

تصانیف مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (بی اے)

- تفسیر ماجدی اوّل -/۱۲
- ؍؍ ؍؍ دوم -/۱۱
- ؍؍ ؍؍ سوم -/۱۱
- ؍؍ ؍؍ چہارم -/۱۱
- حیواناتِ قرآنی -/۲
- جغرافیہ قرآنی -/۴/۱
- مناجاتِ مقبول -/۲
- (ترجمہ و تشریح از مولانا موصوف)
- سفرنامہ حجاز -/۵
- حکیم الامت -/۸/۷

تصانیف مولانا عبدالباری صاحب (ندوی)

جامع المجددین :- اس میں خصوصاً اعمال ظاہر کی صلاح و اصلاح پر بحث ہے، جو شریعت کا ایک خاص موضوع ہے۔ قیمت مجلد -/۵

تجدید تصوف و سلوک :- اس کا موضوع انسانوں کی قلبی، باطنی یا اخلاقی اصلاح ہے، اس میں تصوف کے متعلق موافقین و مخالفین کی تمام نئی پرانی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے تبلایا گیا ہے کہ تصوف در اصل نام ہے عین اسلام بلکہ کمالِ اسلام کا۔ قیمت مجلد -/۵

تجدید تعلیم و تبلیغ :- اس میں دین کی تعلیم و تبلیغ کا مکمل نظام تبلایا گیا ہے۔ قیمت مجلد -/۳

تجدید معاشیات :- معاشیات کے موضوع پر خالص ایمانی نقطۂ نظر سے اس دور کی یہ واحد تصنیف ہے، جس میں معاشیات کے نو پید نظریوں اور نعروں سے مرعوب ہوئے بغیر، بلکہ ان کو محض فریب ثابت کرتے ہوئے رزق و معاش سے متعلق خالص اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد -/۵

تصنیفات حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

- تدوین حدیث ———— -/۸/۶
- مقالاتِ احسانی ———— -/۸/۶
- امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی ———— -/-/۱۲
- تدوین قرآن ———— -/۸/۱
- تاریخ علم فقہ ———— -/۸/۱
- سوانح قاسمی (تین جلدوں میں) قیمت مکمل سٹ ———— -/۸/۱۵
- مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ———— -/۸/۱

تصنیفات مولانا احتشام الحسن صاحب

- حقیقتِ ذکر -/۱۲/۲
- تجلیاتِ کعبہ (مجلد) -/-/۳
- تجلیاتِ مدینہ -/۸/۲
- ارکانِ اسلام -/۸/۱
- دین خالص -/۸/-
- شاہراہِ ترقی -/۱۲/-
- حیاتِ مختصر -/۱۰/-
- اسلامی زندگی -/۴/-
- پستی کا واحد علاج -/۴/-
- اسلاب معاشرت -/۴/-

- نیا طوفان اور اس کا مقابلہ -/۸/
- سیرت سیّد احمد شہیدؒ -/۵
- شرق اوسط میں کیا دیکھا؟ -/۷/۱
- دو ہفتے ترکی میں -/۶/۱

- انجمن نامہ -/۳

ترجمہ قرآن کا مکمل نصاب :-
(از مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی)

- رحمانی قاعدہ عربی با تصویر ۵؍
- ؍؍ ؍؍ اُردو ۵؍
- مفتاح القرآن (اول) ۵؍
- ؍؍ ؍؍ (دوم) ۶؍
- ؍؍ ؍؍ (سوم) ۱۰؍
- ؍؍ ؍؍ (چہارم) ۱۲؍
- ؍؍ ؍؍ (پنجم) ۱۴؍
- علم القرآن ۱۲؍

ہمارے بچوں کا مبارک نصاب

- اچھا قاعدہ ۳؍ — اچھی باتیں کامل ۱۵؍
- اللہ کے رسولؐ ۷؍ — حضرت ابو بکرؓ ۷؍
- حضرت عمرؓ ۷؍ — حضرت عثمانؓ ۷؍
- حضرت علیؓ ۷؍ — اچھے قصے ۶؍
- حضرت خدیجہؓ ۸؍ — حضرت سودہؓ ۴؍

دو قابلِ مطالعہ کتابیں

"اسلامی کشکول" مسلمانوں کی فکری و عملی اصلاح کے لئے مشاہیر اہلِ قلم نے اپنی سیکڑوں کتابوں اور مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے ان کے سیکڑوں اقتباسات کا مجموعہ ہے —— قیمت -/-/۳

"ارشاد السالکین" :- ہر دینہ دار اور طالبِ خدا کے پاس رہنے کے لائق یہ [illegible] مؤثر کتاب [illegible] چھوٹی سی کتاب کو بجا طور پر [illegible] کا تمغہ کہا جا سکتا ہے۔ قیمت مجلد :- -/۸/۱

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کفیل ہے۔ لیکن یہ صرف ایک قول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم نصب العین ہے، اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا مجموعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔ جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی نظامِ زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اسی کا عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السّمٰوٰت والارض انت ولیّی فی الدنیا والآخرۃ

توفّنی مسلماً والحقنی بالصّالحین

ادارۂ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے۔ کتابت طباعت عمدہ اور معیاری قسم اول کاغذ ۔۔ پونڈ چکنا مجلد ۔/۱۰/۱ قسم دوم کاغذ ۲۴ پونڈ چکنا غیر مجلد ۱۲/۔

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ۔/۔/۳

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ قیمت مجلد ۔۔۔۔۔۔۔۔ -/-/۲

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری ۔۔۔۔۔۔ قیمت ۔۔۔۔۔۔ صرف -/۸/-

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف۔ تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت -/۱۲/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ۔۔۔۔۔۔۔ -/۱۲/-

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ مسلم سلطنے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔۔ ۔۔ -/۱۰/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت -/۶/-

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت -/-/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب ۔۔۔۔۔۔۔۔ قیمت -/-/۱

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے تابندہ فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ -/۸/۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت -/۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ۔۔۔۔ قیمت -/-/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے ۔۔۔۔۔۔ قیمت -/۱۰/-

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (ہندوستان) ۸/
سالانہ چندہ (پاکستان) ۱۰/
ششماہی ۵/

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ... ... ۱ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۲۵/

جلد ۲۷ | بابتہ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۹ء | شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا وی پی میں کچھ آنے زائد صرف ہوں گے اور رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۰ دسمبر تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستانی خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔ شکایت پر دوسرا رسالہ آئندہ ماہ کے رسالے کے ساتھ بھیجا جائے گا۔ جلدی ہو تو براہ کرم ۲ آنے پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ۔ **دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ**

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اولیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان پر انگریزی اقتدار نے جو نقصانات ملّتِ اسلامیۂ ہند کو پہونچائے اُن میں سے ایک عظیم نقصان یہ تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم کا تصوّر یکسر بدل گیا۔ ان کی تعلیم ہمیشہ دین اور دنیا کی جامع رہی تھی، مگر انگریزی اقتدار کے بعد ان میں تعلیم کا تصوّر رفتہ رفتہ صرف حرفتی رہ گیا ہے۔ یعنی یہ ایک ذریعہ ہو گیا صرف نوکریاں حاصل کرنے کا یا اس قابل بن جانے کا کہ آدمی کوئی روزگار اچھی طرح کر سکے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے وہ تعلیم کافی سمجھ لی گئی جو حکومت کے قائم کردہ یا اُس کے منظور کردہ اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی تھی۔

یہ ایک نقصانِ عظیم تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی تعلیم کی اہمیت اور اس بات کی فکر لوگوں کے ذہن سے نکل گئی کہ اُن کے بچوں کو ضروری درجہ کی دینی تعلیم ضرور ملنی چاہیے اور اس کا ہر قیمت پر انتظام رہنا چاہیے۔

تعلیم کے اسی غلط تصور اور بچوں کی ضروری درجہ کی دینی تعلیم سے بے فکری کے دھارے پر بہتے ہوئے ہم مسلمانانِ ہند ۱۹۴۷ء کے موڑ پر پہونچے اور اسی ذہنی حالت کے ساتھ ہم اس نئے دور میں داخل ہو گئے ــــــ اس نئے دور سے پہلے ابتدائی سرکاری اسکولوں کا تعلیمی نصاب اگرچہ دینی تعلیم سے خالی ہوتا تھا، تاہم اس میں ایسے اجزا بھی نہیں ہوتے تھے جو خلافِ اسلام خیالات و تصورات سے بچوں کے ذہن کو آلودہ کریں۔ علاوہ ازیں بچوں کو اُردو کی تعلیم ملتی تھی جس کے سبب سے وہ اپنے گھر کے ماحول میں آسانی کے ساتھ اسلامی دینیات سے واقف

ہو سکتے تھے۔ لیکن اس سیکولر دور میں یہ انقلاب ہوا کہ ایک طرف تو اسکولوں سے عملاً اُردو نکال دی گئی جس کے ذریعہ بچہ باقاعدہ دینی تعلیم کے بغیر بھی اپنی دینیات سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو ہی جاتا تھا، دوسری طرف نصابی کتابوں میں ہندی کے پردے میں ہندوانہ عقائد و تصورات کا وہ زہر گھولا گیا ہے جو مسلمان بچوں کی اسلامیت کے لیے یکسر قاتل ہے۔ اور ان دونوں باتوں سے مل کر اس طرح کے نتائج نکلنے لگے کہ

۱۔ "ایک اسلامیہ کالج میں دیہات سے آکر داخل ہونے والے چند لڑکوں کو جب وہاں کے حساس پرنسپل نے دینیات سے آشنا کرنے کی کوشش شروع کی تو ایک موقع پر ان میں سے ایک لڑکے نے "مکہ" کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس قسم کا پھل ہے؟ جب اس کو بتلایا گیا کہ مکہ ایک شہر ہے تو وہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہاں ہے؟"

۲۔ "ایک خاندان کا لڑکا کسی امتحان میں ممتاز ہوا اور دوسرے کسی لڑکے نے اس سے کہا مٹھائی کھلاؤ تو اس لڑکے نے اپنی ماں سے پوچھ کر یہ جواب دیا کہ میلاد شریف ہوگی جب مٹھائی تقسیم ہوگی۔ مٹھائی مانگنے والے مسلمان لڑکے نے کہا کہ میلاد شریف کیا؟ اور جب اس کو سمجھایا گیا کہ جلسہ ہوگا اور اس میں ایسی تقریر ہوگی تو اس نے کہا "اچھا کتھا؟" تو کتھا رکھنا بعد کو کرنا پہلے مٹھائی کھلاؤ۔"

۳۔ "ایک متقی عالم کا لڑکا بعینہٖ مذکورالصدر پرنسپل صاحب کے گھر رہ کر کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ پرنسپل صاحب اس زمانہ میں آٹھ دس دوستوں کے ساتھ روزانہ قرآن پاک کی تفسیر پڑھتے اور سنتے تھے، اور اس وقت وہ لڑکا دوسرے سائبان میں جاکر دور بیٹھ جاتا تھا۔ جب اُس سے کہا گیا کہ تم بھی کیوں نہیں یہاں بیٹھتے، تم بھی سنو! تو اس نے جواب دیا، آپ لوگ اردو پڑھتے ہیں جو میں نہیں سمجھ سکتا۔"

یہ واقعات حال ہی میں ایک ذمہ دار آدمی نے شائع کیے ہیں ____ کون مسلمان ہو جو

اس قسم کی باتوں کو جان کر جیسی بے چینی نہ ہوتا ہو، اور صد درجہ لعنت اس تعلیم پر نہ بھیجتا ہو، غلط تعلیمی تصور اور نقطۂ نظر کے اسی بگاڑ کے باعث جو انگریزی دور کے برکات کے طور پر اس سرے سے اُس سرے تک مسلمانوں میں پھیل چکا ہے، یہ نوبت آج تک نہیں آرہی کہ مسلمان اپنے بچوں کی دینی تعلیم کی کوئی باقاعدہ فکر کریں اور اس کے مؤثر انتظام کو اپنے بچوں کے دینی بچاؤ اور ان کی ملی موت و زیست کا مسئلہ سمجھتے ہوئے اس وقت تک چین نہ لیں جب تک اطمینان نہ ہو جائے کہ مسئلہ حل ہو گیا اور پورا پورا انتظام عمل میں آگیا۔

چھوٹی اور بڑی متعدد کوششیں اس مقصد کے لیے اب تک ہو چکی ہیں۔ اور افسوس کہ اس کا کوئی خاص فائدہ مرتب نہ ہو سکا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کام کو یونہی پڑا رہنے دیا جائے ــــــ شکر ہے کہ کچھ صاحبِ فکر اور باعمل حضرات اب تک کی کوششوں کی ناکامیوں کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اور اپنے عملی تجربات کی بنا پر ایک اعتماد اور عزم لیے ہوئے، ایک بار پھر اس مسئلہ پر ایک اجتماع کے داعی ہوئے ہیں۔

یہ اجتماع بستی (صوبہ یو، پی) میں ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء و یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو صوبائی پیمانہ پر منعقد ہو رہا ہے۔ اور خوشی ہے کہ ان داعیین نے اتنی فضا اس کے لیے تیار کر لی ہے کہ اخبارات میں مراسلوں کے ذریعہ اس سے کافی گہری دلچسپی کا اظہار ہو رہا ہے ــــــ ہم صوبہ کے تمام مسلمانوں کو پکار کر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اگر اپنے بچوں کی اس حالت پر راضی نہیں ہیں جو سرکاری اسکول کی تعلیم سے بن رہی ہے، تو پھر اس موقع کو ایک آخری موقع سمجھیں اور اس کوشش کو ناکام نہ ہونے دیں۔ مسلمان اگر یہ طے کر لیں کہ وہ اس وقت تک اپنے بچوں کی تعلیم کو تعلیم نہیں سمجھیں گے جب تک وہ اللہ اور رسول سے واقف نہ ہوں تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ کام (دینی تعلیم کا انتظام) جو آج بڑا مشکل نظر آتا ہے، بہت تھوڑی مدت میں حل ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان ہی یہ طے نہ کریں تو پھر اجتماع اور کانفرنسیں ہوا کریں، یہ کام نہ ہو سکے گا۔

بستی کے اس اجتماع کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کے داعیوں نے دو ایسی

متعین عملی باتیں اپنے کام کے نقشہ میں رکھی ہیں کہ اگر ان پر عمل ہو جائے تو واقعہ یہ ہے کہ کام بڑی حد تک قابو میں آسکتا ہے۔

یہ دو باتیں یہ ہیں کہ

۱۔ تمام دینی مدارس میں پرائمری درجات کے قیام کی کوشش!

۲۔ اسی طرح تمام اسلامیہ کالجوں میں پرائمری درجات جاری کرانے کی کوشش!

حقیقتاً اس کوشش کی کامیابی سے کام بڑا آسان ہو جائے گا، خدا کرے کہ دینی مدارس اور اسلامیہ کالجوں کے ذمہ داران اس اجتماع سے پوری طرح دلچسپی لیں تاکہ ان کے تعاون سے کام کا یہ نقشہ کم از کم ہمارے ایک صوبے میں تو بروئے کار آسکے۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

(۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ اُعَلِّمُکُمْ اِذَا اَتَیْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَاَمَرَ بِثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ وَنَهٰی عَنِ الرَّوْثِ وَالرِّمَّةِ وَنَهٰی اَنْ یَّسْتَطِیْبَ الرَّجُلُ بِیَمِیْنِهٖ ——

—— رواہ ابن ماجہ والدارمی

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں تم لوگوں کے لیے مثل ایک باپ کے ہوں اپنی اولاد کے لیے۔ (یعنی جس طرح اولاد کی خیرخواہی اور اُن کو زندگی کے اصول وآداب سکھانا ہر باپ کی ذمہ داری ہے اسی طرح تمہاری تعلیم و تربیت میرا کام ہے۔ اسی بنا پر) میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرکے بیٹھو نہ اس کی طرف پشت کرکے (بلکہ اس طرح بیٹھو کہ قبلہ کی جانب نہ تمہارا منہ ہو نہ تمہاری پیٹھ ہو) ...... (حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ) اور آپ نے استنجے میں تین پتھروں کے استعمال کرنے کا حکم دیا اور منع فرمایا استنجے میں لید اور ہڈی استعمال کرنے سے۔ اور منع فرمایا داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے سے۔ —— (سنن ابن ماجہ ودارمی)

(۵) عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قِیْلَ لَهٗ قَدْ عَلَّمَکُمْ نَبِیُّکُمْ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) کُلَّ شَیْءٍ حَتَّی الْخِرَاءَةَ قَالَ فَقَالَ اَجَلْ لَقَدْ نَهَانَا اَنْ

نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ لِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ اَوْ بِعَظْمٍ ـــــ رواہ مسلم

(**ترجمہ**) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ (بعض مشرکوں کی طرف سے تمسخر اور طنز کے طور پر) اُن سے کہا گیا کہ تمہارے اِن پیغمبر صاحب نے تو (صلی اللہ علیہ وسلم) تم لوگوں کو ساری ہی باتیں سکھائی ہیں۔ یہاں تک کہ پاخانہ پھرنے کا طریقہ بھی! حضرت سلمان نے ان سے کہا ہاں بیشک (انھوں نے ہم کو سب ہی کچھ سکھایا ہے اور استنجے کے متعلق بھی ضروری ہدایتیں دی ہیں۔ چنانچہ) انھوں نے ہم کو اس سے منع فرمایا ہے کہ پاخانے یا پیشاب کے وقت ہم قبلہ کی طرف رُخ کریں۔ یا یہ کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجا کریں یا یہ کہ ہم استنجے میں تین پتھروں سے کم استعمال کریں۔ یا یہ کہ ہم استنجا کریں (اونٹ، گھوڑے، یا بیل وغیرہ) کسی چوپائے کے فضلے۔ یا ہڈی سے۔ ـــــ (صحیح مسلم)

(**تشریح**) جس طرح کھانا پینا انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اسی طرح پاخانہ پیشاب بھی ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ نبی برحق سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے دوسرے کاموں اور دوسرے شعبوں میں ہدایات دیں اسی طرح پاخانہ و پیشاب اور طہارت و استنجا کے بارہ میں بھی بتایا کہ یہ مناسب ہے اور یہ نامناسب، یہ درست ہے اور یہ نادرست ـــــ

مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات اس باب میں دی ہیں وہ چار ہیں۔

ایک یہ کہ پاخانہ پیشاب کے لیے اس طرح بیٹھا جائے کہ قبلہ کی طرف نہ منہ ہو نہ پیٹھ ـــــ یہ قبلہ کے ادب و احترام کا تقاضا ہے۔ ہر مہذب آدمی جس کو لطیف اور روحانی حقیقتوں کا کچھ شعور و احساس ہو، پیشاب پاخانہ کے وقت کسی مقدس اور محترم چیز کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے بیٹھنا بے ادبی اور گنوارپن سمجھتا ہے۔

دوسری ہدایت آپ نے یہ دی کہ داہنا ہاتھ جو عام طور سے کھانے پینے رکھنے، پکڑنے، لینے دینے وغیرہ سارے کاموں میں استعمال ہوتا ہے اور جس کو ہمارے پیدا کرنے والے نے پیدائشی طور پر بائیں ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیت اور خاص فوقیت بخشی ہے اُس کو استنجے میں گندگی

کی صفائی کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ یہ بات بھی ایسی ہے کہ ہر مہذب آدمی جس کو انسانی شرف کا کچھ شعور و احساس ہے، اپنے بچوں کو یہ بات سکھانی ضروری سمجھتا ہے۔

تیسری ہدایت آپ نے یہ دی ہے کہ استنجے میں صفائی کے لیے کم سے کم تین پتھر استعمال کرنے چاہئیں۔ کیونکہ عام حال یہی ہے کہ تین سے کم میں پوری صفائی نہیں ہوتی۔ پس اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ اس کو صفائی کے لیے تین سے زیادہ پتھروں یا ڈھیلوں کے استعمال کرنے کی ضرورت ہے تو وہ اپنی ضرورت کے مطابق زیادہ استعمال کرے ـــــــ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حدیثوں میں استنجے کے لیے خاص پتھر کا ذکر اس لیے آتا ہے کہ عرب میں پتھر کے ٹکڑے ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے، ورنہ پتھر کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ مٹی کے ڈھیلے اور اسی طرح ہر ایسی پاک چیز ہے یہ کام لیا جا سکتا ہے جس سے صفائی کا مقصد حاصل ہو سکتا ہو۔ اور اس کا استعمال اس کام کے لیے نامناسب نہ ہو۔

چوتھی ہدایت آپ نے اس سلسلہ میں یہ دی کہ کسی جانور کی گری پڑی ہڈی سے اور اسی طرح کسی جانور کے خشک فضلے سے یعنی لید وغیرہ سے استنجا نہ کیا جائے ـــــــ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے بعض لوگ ان چیزوں سے بھی استنجا کر لیا کرتے تھے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً اس سے منع فرما دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں سے استنجا کرنا ہر سلیم الفطرت اور صاحب تمیز آدمی کے نزدیک بڑے گنوارپن کی بات ہے۔

(۶) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَى الْخَلَاءَ اَتَیْتُهُ بِمَاءٍ فِیْ تَوْرٍ اَوْ رَکْوَةٍ فَاسْتَنْجٰى ثُمَّ مَسَحَ یَدَهٗ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ اَتَیْتُهُ بِاِنَاءٍ اٰخَرَ فَتَوَضَّاَ ـــ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب استنجے کو جاتے تھے تو میں آپ کو پانی لا کے دیتا تھا۔ پانی کے برتن تور میں (جو کانسی یا پتھر سے بنا ہوا ایک برتن ہوتا تھا) یا رکوہ میں (یعنی چمڑے کے چھوٹے مشکیزے میں) تو آپ اس سے طہارت کرتے تھے۔ پھر اپنے ہاتھ کو زمین کی مٹی پر ملتے تھے، پھر میں دوسرا برتن پانی کا لاتا تھا تو اس سے آپ وضو فرماتے تھے ـــ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پتھر وغیرہ سے استنجا کرنے کے بعد پانی سے بھی طہارت فرماتے تھے۔ پھر اس کے بعد ہاتھ کو زمین پر مل کر دھوتے تھے، اس کے بعد وضو بھی فرماتے تھے ۔۔۔ حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے استنجے اور وضو کے لیے پانی لاکر دینے کی سعادت عموماً مجھے حاصل ہوتی تھی ۔۔۔ صحیحین کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خدمت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بھی خاص حصہ تھا۔

(۷) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ وَجَابِرٍ وَاَنَسٍ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَةَ لَمَّا نَزَلَتْ "فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ" قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَثْنٰی عَلَیْکُمْ فِی الطُّهُوْرِ فَمَا طُهُوْرُکُمْ قَالُوْا نَتَوَضَّأُ لِلصَّلٰوةِ وَنَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَنَسْتَنْجِیْ بِالْمَاءِ قَالَ فَهُوَ ذَاكَ فَعَلَیْکُمُوْهُ ۔۔۔۔۔۔ رواہ ابن ماجۃ

(ترجمہ) حضرت ابوایوب انصاری اور حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ یہ تینوں حضرات بیان فرماتے ہیں کہ مسجد قبا کے بارہ میں جب (سورۂ توبہ کی) یہ آیت نازل ہوئی "فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ" (اس مسجد میں ہمارے ایسے بندے ہیں جو بہت پاکیزگی پسند کرتے ہیں اور اللہ ایسے پاکیزگی پسند بندوں سے محبت کرتا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس مسجد میں نمازیں پڑھنے والے اور اس کو آباد کرنے والے انصار سے) فرمایا اے گروہ انصار اللہ تعالیٰ نے طہارت و پاکیزگی کے بارہ میں تمہاری تعریف فرمائی ہے تو وہ تمہاری کیا صفائی اور پاکیزگی ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ (طہارت و پاکیزگی کی کوئی خاص بات اس کے سوا تو ہم اپنے میں نہیں پاتے) کہ نماز کے لیے وضو کرتے ہیں، جنابت کا غسل کرتے ہیں اور پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ (یعنی صرف پتھر وغیرہ کے استعمال پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعد میں پانی سے بھی استنجا کرتے ہیں) آپ نے فرمایا بس یہی بات ہے، پس تم اس کو اپنے اوپر لازم کرلو ۔۔۔۔۔۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) عرب کے بہت سے لوگ صرف ڈھیلے پتھر سے استنجا کرنے پر اکتفا کرتے تھے، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (موٹی جھوٹی غذا اور ہاضمہ کی درستی کی وجہ سے) ان لوگوں کو اجابت اونٹ کی مینگنیوں کی طرح خشک ہوتی تھی اس لیے استنجے میں ان کو پانی کے استعمال کی خاص ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ صرف پتھر کے استعمال پر اکتفا کر لیتے تھے. لیکن انصار کی عادت پانی کے استعمال کی بھی تھی، قرآن مجید میں اُن کی اس پاکیزگی پسندی کی تحسین و تعریف نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس کو اپنے پر لازم کر لیں —— اور خود آپ کا طرزِ عمل تو یہ تھا ہی —— الغرض قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور طرزِ عمل نے اُمتِ مسلمہ کو ہدایت دی کہ اگر بالفرض کسی کا حال یہ ہو کہ اجابت کی خشکی کی وجہ سے ڈھیلے، پتھر وغیرہ کا استعمال صفائی کے لیے کافی ہو، تب بھی وہ پانی سے استنجا کرے اور ہاتھ کو مٹی وغیرہ سے مانجھے. پاکیزگی پسندی کا تقاضا یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی طریقہ پسند ہے۔

تجلّیاتِ مجدّدِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

مکتوب (۶۱) سیّد محمود کے نام ـــــ (ترغیب صحبتِ شیخ کامل)

التفات نامۂ گرامی نے مشرف کیا ـــــ چونکہ وہ طلب وشوق اور درد وتشنگی کی اطلاع دینے والا تھا نظر کو بہت بھلا معلوم ہوا ـــ طلب، مطلوب کے حصول کی بشارت دیتی ہے اور درد، مقصود تک پہنچنے کی تمہید ہے ـــ ایک درویش کا مقولہ ہے ـــ اگر نخواستے داد نداد ے خواست ـــ یعنی اگر اللہ تعالیٰ عطا کرنا نہ چاہتا تو طلب ہی پیدا نہ کرتا ـــــ دولتِ طلب کے حصول کو نعمتِ عظمیٰ تصور کر کے جو چیز اس کے مخالف ہو اُس سے بچنا چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ طلب میں سُستی راہ پا جائے اور اس حرارت میں برودت اثر کر جائے ـــ طلب کے محفوظ رکھنے کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ایک تو شکر خدا بجا لانا ہے ـــ طلب کے حاصل ہونے پر ـــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (اگر تم شکر کروگے تو میں ضرور بالضرور زیادہ عطا کروں گا تم کو) ـــ (طلب کے محفوظ رکھنے کا) دوسرا سبب، دوامِ التجا وتضرع ہے ـــ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ـــ تاکہ وہ طالب کے چہرۂ طلب کو اپنے "کعبۂ جمال لایزال" سے نہ پھیرے ـــ اگر حقیقتِ التجا وتضرع (فی الحال) حاصل نہ ہو تو کم از کم صورتِ تضرّع و نیازمندی ہی کو ہاتھ سے نہ دے ـــ حدیث وَإِن لَّمْ تَبْكُوا فَتَبَاكُوا (اگر تم کو رونا نہ آئے تو بہ تکلّف ہی گریہ کرو) ـــ اس حقیقت کو ظاہر

کررہی ہے ــــــ درد و شوق کی یہ محافظت اُس وقت تک ہے جب تک کہ شیخ کامل و مکمل میسّر نہ آئے ــــــ اور جب ایسا شیخ مل جائے تو اپنی تمام دل کی چاہتیں اس بزرگ کو سونپ دے اور جس طرح میت غسّال کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس طرح خود کو اس کے سپرد کردے . . . . . .

ابتداءً طالب کو اپنی کمالِ پستی و خساست کی بنا پر جنابِ اقدس جلّ سلطانہ سے مناسبت نہیں ہوتی اس لیے ایک "ذو جہتین برزخ" (جس کو عالم علوی و سفلی دونوں سے تعلق ہو) درکار ہے اور وہ برزخ، شیخ کامل ہے ــــــ

طلب میں فتور و سستی آجانے کے اسباب میں سب سے بڑا سبب، ایسے شیخ ناقص کی طرف رجوع کرنا ہے جس نے سلوک و جذبہ کو باقاعدہ طے نہیں کیا اور (خواہ مخواہ) مسندِ شیخت پر بیٹھ گیا ہے ــــــ طالب کو اس کی صحبت زہر قاتل اور اس سے رجوع کرنا مرض مہلک ہے ــــــ طالب کی بلند استعداد کو ایسی غلط صحبت پست کردیتی ہے اور بلندی سے گڑھے میں ڈھکیل دیتی ہے ــــــ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کوئی مریض کسی اناڑی طبیب سے دوا لے کر استعمال کرے تو اُس کا ایسا کرنا درحقیقت اپنے مرض میں اضافے کی کوشش کرنا اور (اس کے ساتھ ہی) ازالۂ مرض کی قابلیت کو بھی ضائع کرنا ہے ــــــ ہرچند وہ دوا شروع میں کچھ تخفیف مرض کردے لیکن وہ حقیقت میں مجسّم مضرت ہے ــــــ اب اگر وہ مریض طبیب حاذق کے پاس پہنچے گا تو وہ اوّلاً اُس پہلی دوا کی تاثیر کو دور کرنے کے لیے مسہلات سے علاج کرے گا۔ جب اُس پہلے اثر کا ازالہ ہوجائے تب ازالۂ مرض کی فکر کرے گا ــــــ بزرگانِ نقشبندیہ کا مدار طریق، صحبتِ شیخ پر ہے محض گفتگو سے کام نہیں بنتا بلکہ ایسی صورت میں طلب کے اندر سستی رونما ہوجاتی ہے ــــــ ممکن ہے کچھ عرصے بعد دہلی و آگرہ کی جانب ہمارا سفر واقع ہو۔ اس موقع پر اگر تم تنہا ہمارے پاس آجاؤ اور کچھ حاصل کرکے جلد واپس چلے جاؤ تو اس کی گنجائش ہے۔ اس سے زیادہ کہنا دردِ سر پیدا کرتا ہے ــــــ

بعض دو باتیں بھی دریافت کی گئی تھیں اُن کا جواب یہ ہے کہ میاں شیخ تاج (شیخ تاج الدین سنبھلیؒ) اس علاقے میں بہت غنیمت بزرگ ہیں ــــــ لیکن تمھاری استعداد کو ان سے مناسبت کم ہے ــــــ رابطۂ مناسبت کے بغیر حصولِ مطلب مشکل ہے ــــــ ویسے تمھیں سب اختیار

ہے ـــــ اگر کبھی کبھی اپنے حالات لکھتے رہا کرو تاکہ ادھر سے بھی جو اکچھ لکھا جاتا رہے تو اچھا ہے ـــــ اس لیے کہ اس طریقے سے سلسلۂ اخلاص برابر قائم رہتا ہے۔ والسّلام ـــــ

مکتوب (۶۳) شیخ فرید بخاری کے نام ـــــ

(تمام انبیاء علیہم السلام اصُول دین میں متفق ہیں)

... ... انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام سب کے سب رحمت ہیں کیونکہ ان بزرگوں کے توسط سے ایک عالم نجات ابدی سے بہرہ ور ہوتا ہے اور گرفتاریٔ دائمی سے نجات پاگیا ہے ـــــ اگر ان حضرات کا وجود نہ ہوتا تو حق سُبحانہ جو غنی مطلق ہے نہ تو عالم کو اپنی ذات وصفات کی خبر دیتا اور نہ اپنی ذات وصفات کی طرف رہنمائی کرتا اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتا اُس نے محض اپنے فضل وکرم سے بندوں کو خود اُن کے نفع کے لیے جن اوامر ونواہی کا مکلف بنایا ہے، اُن کا مکلف نہ بناتا، پھر اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات میں باہم امتیاز بھی نہ ہوسکتا ـــــ پس اس نعمت عظمیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے اور کس کی طاقت ہے کہ اس فرض منصبی (شکر) سے (کما حقہ) سبکدوش ہوسکے ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر انعام فرمایا۔ ہمیں اسلام کی طرف ہدایت کی اور ہم کو انبیاء علیہم السّلام کے تصدیق کنندگان میں سے بنایا ـــــ

انبیاء علیہم السلام، اصُول دین میں متفق ہیں، ذات وصفات باری تعالیٰ، حشر ونشر، ارسالِ رُسل، نزولِ فرشتہ، ورودِ وحی، نعمتِ جنت، عذاب جہنم ـــــ ان سب مسائل میں سب انبیاء کا ایک ہی قول ہے ـــــ ان بعض احکام میں جو فروع دین سے تعلق رکھتے ہیں ان کا اختلاف ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ہر پیغمبر اولوالعزم پر اُس زمانے کے لوگوں کے لیے بعض احکام مناسبہ کے متعلق وحی بھیجی ہے اور ان لوگوں کو احکام مخصوصہ کے ساتھ مکلف فرمایا ہے ـــــ احکام میں نسخ وتبدیل کا واقع ہونا اللہ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں سے ہے ـــــ ایک صاحب شریعت پیغمبر پر بھی اوقات مختلفہ میں نسخ وتبدیل کے طور پر احکام متضادہ وارد ہوئے ہیں ـــــ ان حضرات انبیاء کے کلمات متفقہ میں سے ایک کلمہ یہ ہے کہ

غیر حق کی عبادت نہ کی جائے نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے نیز اللہ کے علاوہ مخلوقات میں سے کسی کو اپنا رب نہ قرار دیا جائے ـــــ غیر حق کی عبادت کی نفی کرنا، انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص ہے ـــــ انبیاءؑ کے متبعین کے علاوہ کوئی بھی اس دولت سے مشرف نہیں ہوا اور انبیاء کے علاوہ کسی نے ان کلمات طیبات کے ساتھ تکلّم نہیں فرمایا ہے ـــــ منکرین نبوت اگرچہ خدائے تعالیٰ کو واحد کہتے ہیں مگر اُن کا حال دو امر سے خالی نہیں یا وہ اہل اسلام کی تقلید (کا دعویٰ) کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کو فقط "وجوب وجود" میں واحد جانتے ہیں۔ استحقاقِ عبادت میں نہیں! (اگر وہ اہل اسلام کی تقلید کا دعویٰ کرتے ہیں تو اُن کو واضح رہے کہ) اہل اسلام کے نزدیک تو اللہ تعالیٰ وجوبِ وجود میں بھی واحد ہے اور استحقاقِ عبادت میں بھی واحد ہے ـــــ کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے مراد باطل معبودوں کی عبادت کی نفی کرنا اور معبودیت حق تعالیٰ کو ثابت کرنا ہے ـــــ دوسری بات جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے یہ ہے کہ وہ تمام آدمیوں کی طرح خود کو بشر جانتے ہیں اور معبود حقیقی اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں اور تمام لوگوں کو اُسی کی طرف سر جھکانے کی دعوت دیتے ہیں نیز اللہ تعالیٰ کو حلول واتحاد سے منزّہ کہتے ہیں ـــــ منکرین نبوّت کا یہ حال نہیں ہے اُن کے تو بڑے بڑے معبودیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے اندر حلول کیے ہوئے ثابت کرتے ہیں اور اس طرح اپنے کو مستحق عبادت قرار دیتے اور اپنی الوہیّت کے اطلاق سے مطلق اجتناب نہیں کرتے ـــــ اسی وجہ سے وہ بندگی کے دائرے سے نکل کر گندے اعمال وافعال میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اُن کے ذریعے اباحت کا راستہ بھی خوب کھل جاتا ہے ـــــ (نادان) لوگ گمان کرتے ہیں کہ ان مدعیان الوہیت کو کسی قسم کی روک ٹوک نہیں یہ جو کچھ کہتے ہیں اُس کو ٹھیک جانتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اُس کو مُباح سمجھتے ہیں ـــــ یہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ـــــ وائے ہے ان کے حال پر اور ان کے متبعین کے حال پر ـــــ

تیسری بات جس میں انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور منکروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں یہ ہے کہ یہ بزرگ نزول ملائکہ کے قائل ہیں ـــــ وہ ملائکہ جو "معصوم مطلق" ہیں اور کوئی "تعلّق و تلوث" نہیں رکھتے ـــــ ملائکہ کو وہ وحی کا امین اور کلام ربانی کا حامل جانتے ہیں ـــــ الغرض یہ حضرات انبیاءؑ جو کچھ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں اور جو کچھ پہنچاتے ہیں

وہیں سے لے کر پہنچاتے ہیں ـــــ انبیاءؑ کے احکام اجتہادیہ بھی وحی کی تائید حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر بالفرض ان میں کسی سے کوئی لغزش بھی واقع ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ فی الفور وحیٔ قطعی کے ذریعے اس کا تدارک فرما دیتا تھا ـــــ اور جو لوگ منکرین نبوت اور مدعیان الوہیت ہیں وہ تو جو کچھ کہتے ہیں اپنی طرف سے کہتے ہیں اور اپنی الوہیت کے گھمنڈ میں اپنی من گڑھت ہی کو صحیح سمجھتے ہیں ـــــ پس انصاف درکار ہے کہ جو شخص کمال بے وقوفی کی بنا پر خود کو معبود اور مستحق عبادت قرار دے اور اس زعم فاسد کی بنیاد پر افعال ناشائستہ کرے اس کی باتوں کا کیا اعتبار ہے اور اس کی اتباع کس کام کی ع "سالیکہ نکوست از بہارش پیداست" اس قسم کی باتوں کا اظہار مزید وضاحت کی غرض سے ہے ورنہ حق و باطل اور نور و ظلمت دونوں جُدا جُدا اور ایک دوسرے سے ممتاز ہیں ـــــ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ـــــ (آیا حق اور گیا باطل ـــ بے شک باطل نابود ہونے والا ہی ہے)۔ اے اللہ! تو ہم کو ان اکابر (انبیاء علیہم السلام) کی متابعت پر ثابت قدم رکھ ... ...

مکتوب (۶۴) شیخ فرید بخاری کے نام ـــــ

(جسمانی و روحانی لذت و الم کے بیان میں)

... ... لذت والم دنیا دو قسم پر ہے ـــ جسمانی[1] اور روحانی[2] ـــــ جس چیز سے جسم کو لذت حاصل ہوتی ہے روح کو (درحقیقت) اس سے تکلیف ہوتی ہے اور جس چیز سے جسم دردمند ہوتا ہے روح کو اس سے لذت ملتی ہے ـــــ پس روح و جسم ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں ـــــ لیکن اس عالم آب و گل میں روح نے جسم کی قائم مقامی کرلی ہے اور جسم و جسمانیات میں گرفتار ہوگئی ہے، نیز حُکم جسم پیدا کرکے وہ جسم کی لذت سے لذت یاب اور جسم کی تکلیف سے متاذّی ہوتی ہے ـــــ یہ عوام کالانعام (چوپائے جیسے عوام) کا مرتبہ ہے ـــــ آیۂ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (یعنی جب انسان کافر ہوا تو ہم نے

اُس کو فروتر اشیاء سے بھی زیادہ فروتر کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں صادق ہے ـــــ وائے بُرا وائے اگر روح اس گرفتاری سے خلاصی نہ پائے اور اپنے وطن اصلی کی طرف رجوع نہ کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ روح کی بیماری ہے کہ وہ اپنے (حقیقی) اَلم کو لذّت سمجھتی ہے اور (حقیقی) لذت کو الم تصوّر کرتی ہے ـــــ بالکل غلبۂ صفرا کے مریض کی طرح کہ وہ شیرینی کو تلخ محسوس کرتا ہے ـــــ پس عقلا پر اس مرض کا دور کرنا لازم ہے تاکہ جسمانی آلام و مصائب میں خوش خوش رہ کر زندگی بسر کریں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر اچھی طرح غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اگر دُنیا میں درد و الم اور مصیبت کا وجود نہ ہوتا تو پھر تو دُنیا کی قیمت ایک جَو کے برابر بھی نہ تھی۔ اس دُنیا کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو یہاں کے مصائب و حوادث زائل کرتے ہیں ـــــ حوادث کی تلخی، کڑوی مگر فائدہ مند دوا کے مانند ہے جو مرض کو دور کر دیتی ہے ـــــ بعض دعوت ہائے عام میں اس فقیر کو محسوس ہوا ہے کہ کھانا پکایا گیا اور اس دعوت میں خلوص نیت نہیں تھی۔ کچھ لوگ کھانا کھانے والوں میں سے شکوہ و شکایت کا دروازہ کھول دیتے ہیں اور کھانے میں عیب نکالتے اور کھلانے والوں کی مذمت کرتے ہیں ـــــ صاحب طعام جب یہ سنتا ہے تو اُس کے دل میں شکستگی پیدا ہوتی ہے اور اُس کی یہی شکستگی قلب اُس ظلمت کا ازالہ کر دیتی ہے جو خلوصِ نیت نہ ہونے کی وجہ سے کھانے میں پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح اللہ تعالےٰ کے نزدیک وہ دعوت قبول ہو جاتی ہے ـــــ اگر شکایت کرنے والے شکایت نہ کرتے اور صاحب دعوت کا دل نہ ٹوٹتا تو کھانا (عدمِ خلوص کی بنا پر) سراسر پُر از ظلمت و کدورت تھا، قبولیت کی ایسی صورت میں کیا گنجائش ہوتی، پس مدارِ کار شکستگی قلب اور پریشاں حالی پر ہے ـــــ اور ہم " جویانِ عیش و تنعم " کے لیے یہ شکستگی، مشکل کام ہے ـــــ وما خلقتُ الجنَّ والانس الّا لیعبدونؔ (ہم نے جن و انس کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) نصِ قطعی ہے ـــــ (اب دیکھنا یہ ہے کہ عبادت کے کیا معنی ہیں؟) عبادت سے مراد (اللہ کے آگے) ذلیل اور شکستہ ہونا ہے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد اُس کی خواری و ذلّت ہے (خالقِ اکبر کے سامنے) ـــــ

مسلمانوں اور دینداروں کا اس دُنیا میں جو اُن کا جیل خانہ ہے ـــــ جویانِ عیش و عشرت ہونا دُور از عقل بات ہے ـــــ آدمی کو محنت کشی کی مشق کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے اور باربرداری کی ورزش کیے بغیر گزر نہیں ـــــ حضرت حق تعالےٰ ہم بے طاقتوں کو اس امر پر استقامت نصیب

فرمائے ـــــ بحرمۃ جدکم الامجد علیہ وعلی آلہ من الصلوات انمہا ومن التحیات اکملہا ـــــ

مکتوب (۶۵) خانِ اعظم[۱] کے نام ـــــ

[تاسف بر ضعف اسلام و زبونی مسلمانان و ترغیب تقویت اہل اسلام]

اللہ تعالیٰ آپ کی تائید کرے اور احکام اسلامیہ کے اونچا کرنے میں اعداء اسلام کے مقابلے میں آپ کی مدد فرمائے ـــــ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الاسلام بدأ غریباً

---

[۱] مرزا عزیز کوکا (کوکلتاش) شمس الدین محمد غزنوی معروف بہ اتکہ کے صاحبزادے تھے (کوکا ترکی زبان میں دودھ شریک بھائی کو کہتے ہیں کوکلتاش بھی اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ـــــ اتکہ، ترکی میں رضاعی ماں کے شوہر کو کہتے ہیں) یہ اکبر کے رضاعی بھائی تھے، ان کی ماں جیجی بیگم اکبر کی رضاعی ماں تھی ـــــ یہ بادشاہ کے بہترین جرنیلوں میں سے تھے، عقل و شجاعت دونوں میں کامل تھے ـــــ سنہ ۱۷ جلوس اکبری میں ان کو خان اعظم کا خطاب ملا ـــــ یہ کئی سال گجرات کے صوبے دار رہے ـــــ ابوالفضل سے ان کی ان بن رہتی تھی ـــــ عرصے تک یہ دربار اکبری میں حاضر نہ ہوئے۔ اکبر نے ان کو دربار میں بلایا بھی لیکن ان کو حج بیت کی آرزو تھی مع عیال واطفال بلا اجازت بادشاہ سنہ ۱۰۰۲ھ میں حجاز کو روانہ ہوگئے ـــــ بعد حج بیت اللہ ہندوستان واپس ہوکر بادشاہ کے پاس آگئے۔ بادشاہ ان سے بغل گیر ہوا اور کچھ عرصے بعد وکالت کے عہدے پر سرفراز کیا اور اپنی مہران کے سپرد کر دی، آخرکار منصب ہفت ہزاری تک پہنچے۔ عہد جہانگیری کے انیسویں سال سنہ ۱۰۳۳ھ میں بمقام احمدآباد گجرات وفات پائی ان کی نعش کو دہلی لایا گیا اور اپنے باپ کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے نزدیک بنگلے والی مرکزی مسجد کے جنوب میں سنگ مرمر کی جو عمارت چونسٹھ کھمبے کے نام سے مشہور ہے وہ انھیں خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا مقبرہ ہے جو سنہ ۱۰۲۴ھ میں تعمیر ہوا ـــــ

(ماخوذ از قاموس المشاہیر جلد اول ـــــ غرابت نگار، آثار المتاخرین، ترجمہ انتخاب سیر المتاخرین و ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد اول)

وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغربا (اسلام اپنے آغاز میں اجنبیت اور کس مپرسی کی حالت میں رہا اور جس طرح اس کا آغاز ہوا تھا عنقریب وہ پھر اسی طرح ہو جائے گا۔ پس خوشخبری ہے غربا کو یعنی اُن لوگوں کو جو ایسی حالت میں اسلام سے وابستگی رکھنے کی بنا پر اس کے شریک حال ہوں) ——— غربت اسلام اس حد کو پہنچی ہے کہ کفار برملا طعن اسلام اور "ذم مسلماناں" کرتے ہیں اور بے محابا احکام کفر کا اجرا اور اہل کفر کی مداحی کوچہ و بازار میں ہو رہی ہے ——— مسلمان، اجرائے احکام سے روک دیئے گئے ہیں اور شریعت کی انجام دہی میں قابل ملامت و مطعون ہیں ؎

بری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

سبحان اللہ و بحمدہٖ ———

... رونق شرع شریف، سلاطین کے ساتھ وابستہ تبلائی گئی ہے مگر اب قضیہ بالکل اُلٹا ہے اور معاملہ برعکس ہے ——— واحسرتا، واندامتا، واویلا ———

ہم اس دَور میں آپکے وجود کو غنیمت سمجھتے ہیں ـــ اور اس "معرکۂ ضعیف و شکست خوردہ" میں آپ ہی کو ایک ایسا جرنیل سمجھتے ہیں جو خم ٹھونک کر میدان مقابلہ میں آ جائے ——— حق تعالیٰ آپ کا ناصر و مؤید ہے ——— بحرمۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔

حدیث شریف میں ہے ـــ لن یومن احد کم حتیٰ یقال انہٗ مجنون (تم میں سے کوئی اس وقت تک ہرگز کامل ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک اس کو دین کے معاملے میں مجنون نہ کہا جائے) ـــ اس وقت وہ جنون جس کی اصل غیرت اسلام کی کثرت ہے آپ کی طبیعت میں محسوس ہو رہا ہے الحمد للہ سبحانہٗ علیٰ ذالک ـــ آج وہ زمانہ ہے کہ عمل قلیل کے مقابلے میں اجر جزیل عطا فرمائیں گے ـــ اصحاب کہف سے ہجرت کے علاوہ اور کوئی عمل نمایاں نہیں ہے مگر اسی ایک بر وقت عمل نے اُن کو فضائل عطا کیے ——— سپاہی غلبۂ اعدا کے وقت اگر تھوڑی سی جد و جہد کرتے ہیں تو اس کا بہت کچھ اعتبار ہوتا ہے بخلاف زمانۂ امن کے ——— یہ جہاد قولی جو آج آپ کو میسر ہے ——— جہاد اکبر ہے ——— اس کو غنیمت

سمجھیے اور اس میں ترقی طلب کیجیے ـــــ اس "جہاد گفتن" کو "جہاد کشتن" سے بہتر جانیے ـــــ ہم جیسے فقرائے بے دست و پا اس دولت سے محروم ہیں ۔

دادیم ترا از گنج مقصود نشاں　　گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

حضرت خواجہ احرارؒ فرمایا کرتے تھے " اگر میں شیخت پر آجاؤں تو کوئی دنیا میں میرے مقابلے میں مرید نہ پاسکے ـــــ مگر مجھے تو کسی اور کام کے لیے ہی حکم دیا گیا ہے اور وہ کام ترویج شریعت اور تائید ملت ہے " ـــــ چنانچہ خواجہ احرارؒ سلاطین کے پاس جایا کرتے تھے اور اپنے تصرف سے ان کو مطیع بناتے تھے اور اُن بادشاہوں کے ذریعے ترویج شریعت کیا کرتے تھے ـــــ التماس یہ ہے کہ جب کہ حق تعالےٰ نے بزرگان نقشبندیہ کی محبت کی برکت سے آپ کی بات میں ایک تاثیر بخشی ہے اور آپ کی عظمت مسلمانی تمام اقران و اماثل میں ظاہر ہوگئی ہے ـــــ سعی فرمائیں کہ کم از کم اہل کفر کے وہ شعائر جو اہل اسلام میں رائج ہوگئے ہیں ختم ہوجائیں ـــــ اور مسلمان اُن منکرات سے محفوظ رہیں ـــــ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری اور تمام مسلمین کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے ـــــ پچھلی سلطنت (عہدِ اکبری) میں تو دین مصطفوی کے ساتھ ایک دشمنی محسوس ہوتی تھی ـــــ اس سلطنت (جہانگیری) میں بظاہر وہ دشمنی تو نہیں ہے اگر ہے بھی تو عدم علم کی وجہ سے ہے ـــــ مگر ـــــ خوف یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس سلطنت میں بھی انجام کار دشمنی دین تک نوبت پہنچ جائے اور مسلمانوں کا معاملہ تنگ تر ہوجائے ع "چو بید بر سر ایمانِ خویش می لرزم "

اللہ تعالےٰ ہم کو اور آپ کو متابعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت قدم رکھے ـــــ فقیر ایک تقریب میں یہاں آیا ہوا ہے دل نے نہ چاہا کہ اپنے آنے کی اطلاع آپ کو نہ دوں اور بعض نفع مند باتیں آپ کو نہ لکھوں اور اس محبت قلبی سے جو مناسبت طبع کے باعث آپ سے ہے آپ کو آگاہ نہ کروں ـــــ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ـــــ مَن احبّ اخاہُ فلیُعْلِمْ اِیّاہ ـــــ یعنی جو کسی برادر مسلم سے محبت کرے اُس کو چاہیے کہ اپنی محبت کا اظہار اُس سے کردے ـــــ

وَالسَّلام علیکم وعلیٰ جمیع من اتبع الھُدیٰ

مکتوب (۶۸) خان خاناں کے نام

[اس بیان میں کہ تواضع اغنیاء کو زیبا ہے
اور استغناء ارباب فقر کو]

مخدوما! ؎ من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

تواضع اغنیاء کے لیے زیبا ہے اور استغنا اہل فقر کو۔ اس لیے کہ ہر مرض کا ازالہ اس کی ضد سے ہوا کرتا ہے ـــــ آپ کے تینوں خطوط میں استغناء اور بے نیازی کے سوا کچھ مفہوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ کا مقصود تواضع تھا۔ . . . .

میں مانتا ہوں کہ آپ نے خدمتِ فقراء بہت کچھ کی ہے لیکن آدابِ خدمت کی رعایت بھی بہت ضروری ہے تاکہ خدمت کا ثمرہ مرتب ہو، رعایت آداب کے بغیر خدمت کرنا درخت خاردار پہ ہاتھ مارنا ہے۔ . . . . . .

طائفۂ درویشاں کو ذلیل و خوار نہ سمجھیں رُبَّ اشعثَ مدفوعٍ بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرّہٗ ـــ یعنی بہت سے ایسے بندگان پراگندہ حال ہیں جن کو لوگ اپنے دروازوں سے دھکیلتے ہیں لیکن اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو ضرور پورا کرے ـــــ یہ حدیث نبوی ہے علیہ الصلوٰۃ والسّلام ـــــ ؎

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

آپ کے محبوں اور مخلصوں پر لازم ہے کہ نفس امر (صحیح بات) کا لحاظ رکھیں اور آپ کو جو بات پہنچائیں وہ نفس الامر ہو اور جو مشورہ دیں اس میں آپ کی بہتری پیش نظر رکھیں نہ کہ اپنی مصلحتیں ـــــ اپنے ذاتی مصالح ملحوظ رکھنا خیانت محض ہے ـــــ . . . . . ہر چند کہ یہ باتیں "تلخ نما" ہیں مگر آپ کے خوشامد گو تو اور بہت سے ہیں اُن پہ ہی اکتفا کریں، ہم فقراء کی دوستی کا مقصد تو پوشیدہ عیوب پر مطلع ہونا اور رذائل پنہاں کا اظہار ہے ـــــ لیکن یہ واضح رہے کہ اس قسم کی باتیں دل آزاری کے طور پر نہیں بلکہ نیک خواہی اور دل سوزی کی بنا پر لکھی جا رہی ہیں ـــــ یقین جانئے کہ (آپ کے فرزند) خواجہ محمد صدیق اگر ایک روز منتہ

بھی آجاتے تو ممکن ہے فقیر ہر حال میں اپنے کو آپ تک پہنچا دیتا لیکن انھوں نے اثناء راہ سرہند میں ملاقات کی ــــ اُمید کہ معذور رکھیں گے ــــ الخیر فیما صنع اللہ سبحانہٗ (اللہ جو کرے وہ خیر ہی خیر ہے) ــــ

مکتوب (۶۹) خان خاناں کے نام ــــ

[تواضع موجبِ نعمتِ دارین ہے اور متابعت اہلسنت و جماعت سے نجات وابستہ ہے]

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ ــــ التفات نامۂ گرامی مولانا محمد صدیق کی معرفت وصول ہوا ــــ بڑا کرم فرمایا ــــ جزاکم اللہ خیر الجزاء ــــ چونکہ آپ رعایت آدابِ فقرا بجالائے ہیں اور تواضع کے ساتھ بات کہی ہے اُمید ہے کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ (الحدیث) (یعنی جس نے اللہ کے لیے تواضع کی اللہ نے اس کو اونچا کردیا) کی رُوسے آپ کا یہ نیچے اُترنا دینی و دنیوی بلندی کا باعث بن جائے گا ــــ آپ کو بشارت ہو ــــ چونکہ آپ انابت و رجوع کے الفاظ درمیان میں لائے ہیں یوں تصور کریں کہ یہ رجوع درویشوں میں سے ایک درویش کے ہاتھ پر واقع ہوا ہے۔ اس کے نتائج و ثمرات کے منتظر رہیں ــــ لیکن اس کے حقوق کا حتی الامکان لحاظ رکھیں ــــ وصیتیں اور نصیحتیں کیا لکھوں اور علوم و معارف کا کیا اظہار کروں علماء مجتہدین اور صوفیاء محققین نے بسط و تفصیل سے سب باتیں لکھ دی ہیں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور شاید اس فقیر کے مسودات کا کچھ حصّہ بھی بعض احباب آپ کی خدمت میں لے گئے ہیں آپ کی نظر سے وہ حصّہ گزرا ہوگا ــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نجات کا طریقہ اہلسنت و جماعت کی متابعت ہے ــــ اقوال میں بھی، افعال میں بھی، اصول میں بھی، فروع میں بھی ــــ اس لیے کہ یہ گروہ ہی فرقۂ ناجیہ ہے ــــ دیگر فرقے معرضِ زوال اور قربِ ہلاک میں ہیں ــــ آج کوئی جانے یا نہ جانے کل بروز قیامت ہر ایک جان لے گا ــــ گر اُس دن جاننا کچھ نفع نہ دیگا ــــ اے اللہ ہم کو آگاہ کر دے پہلے اس سے کہ موت ہمیں آگاہ کرے ... ...

مکتوب (۷۰) خان خاناں کے نام ــــــ

. . . . . زندگانی چندروزہ کو صاحب شریعت کی اتباع میں بسر کرنا چاہیے اس لیے کہ عذاب اُخروی سے چھٹکارا اور تنعمات سرمدی تک پہنچنا اتباع شریعت کی سعادت ہی سے وابستہ ہے ــــ پس مال نامی اور جنگل میں چرنے والے چوپایوں کی پوری پوری زکوٰۃ ادا کرنا اور اس امر کو اموال و چہار پائیوں میں ۔ نہ پھنسنے کا وسیلہ بنانا چاہیے ــــ لذیذ کھانوں اور نفیس کپڑوں میں حظِ نفس کو ملحوظ نہ رکھا جائے بلکہ کھانے اور پینے کی چیزوں میں سوائے اس کے کہ ادائے عبادت پر قوت حاصل ہوگی اور کوئی نیت نہ کی جائے ــــ اچھا کپڑا اس نیت سے پہنا جائے کہ قرآن میں فرمایا ہے خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اے فرزندانِ آدم! نماز کے وقت زینت کو اختیار کرو) ــــ اگر حقیقتِ نیت میسر نہ ہو تو خود کو بہ تکلف ہی اس نیت پر لانا چاہیے ۔ ۔ ہمیشہ حق تعالیٰ سے ملتجی رہنا چاہیے کہ حقیقتِ نیت میسر آجائے اور تکلف سے نجات ملے ــــ ؎

می تواند کہ دہد اشکِ مرا حسنِ قبول آں کہ در ساختہ است قطرۂ بارانی را

علیٰ ہذا القیاس تمام امور میں علماءِ دیندار (جنھوں نے راہِ عزیمت اختیار کی ہے اور رخصت سے اجتناب ہی کیا ہے) کے فتوی کے مطابق زندگی گزار کر اس امر کو وسیلۂ نجاتِ ابدی سمجھنا چاہیے ــــ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (اگر تم اللہ کا شکر ادا کروگے اور اس پر ایمان لاؤگے تو وہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا) ــــ

مکتوب ۷۱ مرزا داراب ابن خان خاناں کے نام ــــ

اللہ تعالیٰ تمھاری تائید کرے اور تمھاری مدد فرمائے ــــ انعام کرنے والے کا شکر ادا کرنا اس شخص پر جس پر انعام ہوا ہے عقلاً و شرعاً واجب ہے اور یہ مسلّم ہے کہ وجوبِ شکر باندازۂ وصول نعمت ہے ۔ پس جتنی نعمت زیادہ ہوگی وجوب شکر بھی زیادہ ہوگا ــــ تونگروں پر ان کے درجات کے پیش نظر بہ نسبت فقراء کے کئی گنا شکر واجب ہے اسی بنا پر اس امت کے فقراء مال داروں سے پانچسو سال پہلے بہشت میں

جائیں گے ــــ منعم حقیقی کا شکر یاد لائو تو فرقۂ ناجیہ (اہلسنت وجماعت) کے مطابق تصحیح عقائد کے ذریعے ہو ــــ دوسرے مجتہدین اہلسنت کی رائے کے مطابق احکام شرعیہ علیہ کو انجام دے کر ــــ تیسرے صوفیائے اہلسنت کے طریقے سے تصفیہ وتزکیہ کرکے ــــ اور اس تیسرے رکن کا وجوب استحبانی ہے برخلاف دو سابق رکنوں کے ــــ اس لیے کہ اصل اسلام تصحیح عقائد اور ادائیگی اعمال ہی سے ہے البتہ کمالِ اسلام تزکیہ سے متعلق ہے اور جو عمل ان ارکان ثلثہ کے مخالف ہو اگرچہ ریاضاتِ شاقہ اور مجاہداتِ شدیدہ کی جنس ہی سے کیوں نہ ہو ــــ داخلِ معصیت ہے ــــ

. . . . . پس تم کو متابعت سید نا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ومتابعت خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم لازم ہے ــــ

مکتوب (۷۲) خواجہ جہاں کے نام ــــ

. . . . . دین و دُنیا کا جمع کرنا جمع اضداد کے قبیل سے ہے پس طالب آخرت کو ترکِ دُنیا ضروری ہوا ــــ مگر چونکہ اس وقت حقیقت ترک میسر نہیں ہے بلکہ مشکل ہے اس لئے ضرورتاً ترک حکمی پر اکتفا کرلیا جائے ــــ ترکِ حکمی سے مراد یہ ہے کہ امور دینویہ میں شریعت کے مقتضا کا محکوم رہا جائے، کھانے پینے، رہنے سہنے میں حدود شرعیہ کی رعایت کی جائے، ان حدود سے تجاوز نہ کیا جائے مالِ نامی میں اور جنگل میں چرنے والے مویشیوں میں زکوٰۃ ادا کی جائے ــــ جب احکام شرعیہ کی بجاآوری سے آراستگی ہوئی ــــ مضرتِ دُنیا سے نجات حاصل ہوگئی اور دُنیا آخرت کے ساتھ جمع ہوگئی ــــ اگر یہ قسم ترکِ حکمی بھی کسی کو میسر نہیں تو ایسا شخص بحث سے خارج ہے ــــ وہ حکمِ منافق رکھتا ہے محض صورتِ ایمان، آخرت میں اس کو سود مند نہ ہوگی ــــ اُس کو صورت ایمان سے بس یہ فائدہ حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کا خون اور مال محفوظ ہوجاتے ہیں ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو می گویم ــــ تو خواہ از سخنم پند گیر وخواہ ملال

دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سا صاحب نصیب ہے جو طمطراق دُنیا دی، خدم وحشم، طعامہائے لذیذ و چرب اور لباسہائے فاخرہ کے ہوتے کلمۂ حق کو سمع قبول سے سُنے ؎

گوشش از بار دُرگراں شدہ است ــــ نشنود نالہ و فغانِ مرا

اللہ آپ کو اور ہم کو متابعت شریعت مصطفویہ کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام اولاً وآخراً . . . . .

حقیقتِ ایمان

(ایک تازہ تقریر)

"یہ ناچیز اسی ماہ نومبر میں حیدرآباد دکن گیا تھا، ایک ہفتہ قیام رہا، روزانہ ایک دو تقریریں کرنی پڑتی تھیں، اور وہاں کے متعدد احباب ان تقریروں کو قلمبند کرنے کا اہتمام کرتے تھے، پہلے دن ۱۴ نومبر کو وہاں کی خاص علمی مجلس "اسلامک اسٹڈیز سرکل حیدرآباد" میں بعد مغرب ایک مختصر تقریر کی گئی تھی وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ ناظرین کو اس سے نفع پہنچائے، اور جن دوست کی یہ لکھی ہوئی ہے ان کو بھی اس کا پورا پورا اجر عطا فرمائے"۔ ————

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من تبعھم باحسان۔

محترم حضرات!

مجھے کل یہاں آکر اچانک معلوم ہوا کہ آپ حضرات کی ایک خاص قسم کی علمی مجلس میں بھی مجھے کچھ کہنا ہے، اور یہ بات مجلس کے ذمہ دار حضرات کے اور یہاں کے میرے دوستوں کے مابین طے ہو چکی ہے، میں بغیر کسی انکسار اور تواضع کے عرض کرتا ہوں کہ آپ حضرات کو یا میرے اُن دوستوں کو جنھوں نے یہ طے کیا ہے میرے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے واقعہ یہ ہے کہ میں اس طرح کا علمی آدمی نہیں ہوں کہ آپ جیسے حضرات کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ کر سکوں، اور آپ کی خدمت میں کوئی علمی تحفہ پیش کر سکوں، میرا حال یہ ہے کہ پُرانے قسم کے ہمارے دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے مینے بس وہ پڑھا ہے، اور پڑھایا بھی ہے، اور یہ سلسلہ ابتک بھی جاری ہے لیکن اسکے علاوہ میرا مطالعہ بہت محدود ہے، میں تو بس صرف

اس چیز کا مطالعہ کرتا ہوں جس کے مطالعہ کی اپنے لئے کوئی خاص ضرورت محسوس کرتا ہوں، بغیر احساس ضرورت کے مجھ سے کسی چیز کا مطالعہ نہیں کیا جاتا، اور میرا یہ حال صرف کتابوں ہی کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ یہ میرا عام مزاج ہے اور گویا میری فطرت ہے، آپ میری اس افتادِ طبع کو شاید اس سے سمجھ سکیں کہ باوجودیکہ میں طالب علمی کے سلسلہ میں اپنی ۱۳-۱۴ سال کی عمر میں دہلی رہا ہوں، پھر اسکے بعد بھی بارہا کئی کئی مہینے دہلی قیام کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور آمد و رفت کا تو کوئی حساب و شمار ہی نہیں، لیکن یہ سنکر شاید آپ کو تعجب ہو کہ میں نے آج تک "لال قلعہ" نہیں دیکھا ہے کیونکہ مجھے اسکے دیکھنے کی ضرورت کا کبھی احساس نہیں ہوا، اسی طرح اپنی عمر میں بار بار آگرہ جانے کے باوجود میں نے کبھی "تاج محل" نہیں دیکھا۔ میں اپنی اس حالت کو کوئی کمال نہیں سمجھتا، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ایک پہلو سے یہ نقص ہے، لیکن میں کیا کروں میرے مزاج اور میری طبیعت کی افتاد یہی ہے، بس یہی حال میرا کتابوں کے مطالعہ کے باب میں ہے، جب تک کسی کتاب کے مطالعہ کی خاص ضرورت مجھے محسوس نہ ہو میں اُسے نہیں دیکھتا، اسلئے میرا مطالعہ اور میری معلومات کا دائرہ بہت محدود ہے، ظاہر ہے کہ ایسا آدمی آپ جیسے ممتاز اہل علم کی معلومات میں کیا اضافہ کر سکتا ہے، اسکے باوجود جب یہ بات میرے علم میں آئی کہ آج بعد مغرب میں آپ حضرات کی "علمی مجلس" میں مدعو ہوں، اور وہاں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے طے کر لیا کہ انشاء اللہ کچھ کہوں گا، اور اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ آپ کے اور میرے لئے نفع بخش ہوگا، میں نے سوچا ہے کہ بجائے کسی علمی افادے کے اپنا ایک حال اور اپنی ایک ضرورت آپ حضرات کے سامنے بیان کروں، میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بہت سے حضرات کا بھی وہی حال ہوگا، اور اُس ضرورت میں آپ بھی میرے شریک ہوں گے، خدا کرے کہ اس وقت کی میری گذارش سے اپنی اس ضرورت کے احساس میں، اور اس کے لئے فکر مندی میں کچھ اضافہ ہو جائے۔

محترم بزرگو اور دوستو!

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے دو درجے ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ دو مقام ہیں، ایک کا اصطلاحی عنوان **اسلام** ہے، اور دوسرے کا **ایمان**۔ سورۂ حجرات میں ایک موقع پر کچھ لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔ "قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" یعنی یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہمیں ایمان حاصل ہو گیا، اے رسولؐ! آپ اُن سے کہدیجئے کہ تمہیں ابھی مقامِ ایمان حاصل نہیں ہوا ہے، اسلئے یہ مت کہو کہ ہمیں ایمان حاصل ہو گیا ہے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، کیونکہ ابھی تمہیں اسلام ہی کا مقام حاصل ہوا ہے، ایمان جس حقیقت کا نام ہے، وہ

ابھی تمھارے دلوں میں نہیں اُتری ہے ــــــــــ ان اعراب کا حال یہ تھا کہ انھوں نے دعوتِ اسلام کو قبول کر لیا تھا، اسکے بنیادی عقائد مان لئے تھے، نماز، روزہ جیسے اعمال یہ کرنے لگے تھے، اُن سے یہ فرمایا گیا کہ جس مقام پر اس وقت تم ہو یہ "اسلام کا مقام" ہے، "ایمان کا مقام" اس سے آگے ہے، اور وہ ابھی تمھیں حاصل نہیں ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں، اور آخرت کے بارے میں اور اسی طرح کے دوسرے غیبی امور کے بارے میں پیغمبر کی زبان اور اللہ کی کتاب جو کچھ بتائے دل کو اس کا ایسا یقین ہو جائے جیسا کسی چیز کے مشاہدہ کے بعد ہوتا ہے جس کے بعد کسی قسم کے شک اور وسوسہ کی گنجائش نہیں رہتی، اور پھر وہ یقین ہی زندگی کا سب سے بڑا عامل بن جاتا ہے۔ اسی کے بارے میں حضرت امام بخاریؒ نے اپنی "الجامع الصحیح" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ: "الیقین الایمان کلہ" ــــــــــ بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نظری اور علمی طور پر سمجھنا تو بہت مشکل ہوتا ہے لیکن جب وہ موجود ہو کر سامنے آجائیں تو دیکھنے والوں کے لئے وہ ایک بالکل بدیہی بات ہوتی ہے، یہ ایمان بھی اسی قسم کی ایک حقیقت ہے، اسکے حاملوں کو دیکھ کر اس کی حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آجا سکتی ہے، اس کا بہترین نمونہ صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت تھی۔ ایک صحابی (حارث بن مالکؓ) سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دریافت فرمایا: "کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا حَارِث!" (آج تمھارا کیا حال ہے؟)۔ انھوں نے عرض کیا: "اَصْبَحْتُ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ مُؤْمِنًا حَقًّا"، (خدا کے فضل سے میں نے ایمان کی حالت میں صبح کی ہے)۔ آپ نے فرمایا: "اُنْظُرْ مَا تَقُوْلُ الخ" (یعنی سوچو تم کیا کہہ رہے ہو! ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، ایمان کی بھی ایک حقیقت ہے، کیا وہی حقیقت تم کو حاصل ہے؟)۔ انھوں نے عرض کیا: ــ الحمد للہ میرا یہ حال ہے کہ عرشِ الٰہی گویا میری آنکھوں کے سامنے ہے، اور جنت کی بہاروں کا، اور اس میں جنتیوں کی ملاقاتوں کا گویا نظارہ کر رہا ہوں، اور دوزخیوں کی چیخ پکار گویا میرے کان سُن رہے ہیں۔

ان صحابیؓ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں میں نے جو کچھ آپ کی زبانِ مبارک سے سنا ہے، اور جو کچھ قرآن مجید نے بتایا ہے، اس کا مجھے ایسا یقین حاصل ہے کہ گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں، اسی طرح آخرت کے بارے میں اور دوزخ وجنت کے بارے میں، میں نے جو آپؐ سے سنا ہے اور جو قرآن مجید میں پڑھا ہے، اس کا بھی ایسا یقین حاصل ہے کہ گویا وہاں کی آوازیں تک کانوں میں گونج رہی ہیں ــ

ان صحابیؓ نے جو اپنا حال بتایا، یہی بس "ایمان کی حقیقت" ہے، اور یہ اُن ہی کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ عام جماعتِ صحابہؓ کا یہی حال تھا۔

ایک تابعی بزرگ نے جن کا مجھے اس وقت نام یاد نہیں، صحابہ کرامؓ کے بارے میں اُپنے زمانے کے لوگوں سے فرمایا تھا کہ ہم نے ان کو دیکھا ہے، وہ نماز، روزہ جیسے اعمال میں تم سے بہت بڑھے ہوئے نہیں تھے، ان کا خاص امتیاز ان کے دل کا یقین تھا، جو اُن کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا تھا، ان کے الفاظ ہیں: "ولٰکِنَّهُ شَيْءٌ وَقَرَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ"

ایک دوسرے تابعی بزرگ غالباً سیّدنا حسن بصریؒ کا صحابۂ کرامؓ ہی کے بارے میں ارشاد ہے:۔
"کَاَنَّهُمْ رَائِيْ عَيْن" یعنی اُن کے پاس بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو غیبی حقیقتیں ہم نے صرف سُنی ہیں اور جن کا ذکر ہم نے قرآن مجید میں پڑھا ہے، اُن کو انھوں نے گویا آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک صحابیؓ کا مشہور و معروف شعر ہے:۔

ارانا الهدى بعد العمى فقلوبنا
به موقنات ان ما قال واقع

یعنی ہم اندھیرے میں تھے، اور گویا بالکل اندھے تھے، آپؐ نے آکر ہمیں راہِ ہدایت دکھائی، اب خدا کے فضل سے ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے دلوں کو اس بات کا پورا پورا یقین نصیب ہے کہ جو کچھ آپؐ نے فرمایا ہے وہ بلاشبہ واقع ہونے والا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا حال یہی تھا کہ جو چیز انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن لی تھی اُس کا پورا پورا یقین ان کو حاصل تھا، ان کے لئے اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی، پھر ان کا یہ حال صرف ایمانیات ہی کے بارے میں نہیں تھا، بلکہ جس باب کی جو بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے فرمائی، ان کے دلوں کو اس کا پورا پورا یقین حاصل ہو گیا، اگرچہ ظاہری حالات کے لحاظ سے وہ بالکل بعید از قیاس ہی کیوں نہ ہو۔

مکہ معظمہ کی انتہائی مظلومیت کے دور میں یہ بات کس قدر بعید از قیاس تھی کہ عنقریب یہاں اسلام کو اقتدار اور غلبہ نصیب ہوگا، اور دشمن طاقتیں اسلام کے مقابلے میں سرنگوں ہوں گی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی، اور صحابۂ کرامؓ کے دلوں نے بغیر کسی شک و وسوسہ کے اس پر یقین کیا، ایسا بھی ہوا کہ

کبھی کسی شخص کے بارے میں آپ نے کوئی جزوی بات فرمائی جس کا تعلق نہ ایمانیات سے ہے نہ اصولِ دین سے نہ امت کے کسی اہم مسئلے سے، لیکن سننے والوں نے اس پر بھی ویسا یقین کیا جیسا یقین آج ہمیں ایمانیات کے بارے میں بھی نصیب نہیں ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ایک واقعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

آپ حضرات میں سے یہ تو بہت سوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بعض خاص حالات اور اسباب کی بنا پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ یا حکم سے شہروں اور آبادیوں سے الگ رَبذہ کے مقام پر رہائش اختیار کرلی تھی، یہ مقام مکہ معظمہ سے کوفہ جانے والی سڑک پر چند منزل کے بعد آتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے وہیں ایک جھونپڑا ڈال لیا تھا، اور وہیں اکیلے رہتے تھے، ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت ہی میں ایک سال بیمار پڑے، اور بیماری برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ زندگی کے خاتمہ کے آثار ظاہر ہوگئے، قدرتی طور پر ان کی بیوی بہت متاثر اور فکرمند تھیں، انھوں نے بیوی کو اس حال میں دیکھ کر فرمایا:۔ تم کیوں اتنی متفکر و متاثر ہو؟۔ بیوی جو انھیں کی صحبت یافتہ تھیں انھوں نے عرض کیا کہ:۔ اللہ کا جو فیصلہ ہے، وہ ہر ایک کے حق میں نافذ ہونے والا ہے، اور ہر ایک کو یہاں سے کوچ کرنا ہے، اسلئے میری یہ فکرمندی اور پریشانی آپ کی جدائی کے خیال سے نہیں ہے، بلکہ مجھے یہ فکر ہے کہ اگر اللہ کی یہی مشیئت ہے، اور وقت موعود قریب ہی آگیا ہے، تو اس جنگل بیابان میں، میں اکیلی عورت ذات کیا کرسکوں گی، اور کیسے کرسکوں گی۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا:۔ اس کی فکر بالکل نہ کرو، بالکل مطمئن ہوجاؤ، جب وہ وقت آئے گا، اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو یہاں بھیجے گا، وہی میرے کفن دفن کا سب انتظام کرینگے ——— یہاں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ وہ وقت تھا جبکہ حج میں بس چند دن باقی تھے، دو چار دن پہلے تک تو کوفہ کی طرف سے آنیوالے حجاج کے قافلے اس سڑک پر برابر گذر رہے تھے، لیکن حج کی تاریخ چونکہ بالکل قریب آچکی تھی، اسلئے یہ سڑک ایک دو دن سے بالکل خاموش تھی، جن کو کوفے سے مکہ جانا تھا، وہ حج کے حساب سے مکہ پہنچ چکے تھے، اور حج کے قریب کی وجہ سے اب مکہ سے کوئی کوفہ جانے والا نہ تھا، الغرض اس وجہ سے ایک دو دن پہلے سے یہ سڑک بالکل خاموش تھی، نہ کوئی ادھر سے اُدھر جانے والا تھا، نہ اُدھر سے ادھر آنے والا، اسلئے حضرت ابوذرؓ کی محترمہ بیوی نے عرض کیا کہ:۔ آپ یہ بات کس بنیاد پر فرمارہے ہیں، دو تین دن سے

سڑک پر تو بالکل آمد و رفت نہیں ہے، اور کوئی امید بھی نہیں ہے، کہ اب جلد ہی کوئی قافلہ اس سڑک سے گذرے گا، کوفہ سے جن کو مکہ مکرمہ جانا تھا، وہ حج کے حساب سے جا چکے، اور حج ختم ہونے سے پہلے اب کون مکہ سے کوفہ کی طرف چلے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے پھر بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ کچھ بھی ہو ایسا ہی ہوگا، میرے کفن دفن کیلئے اور میری نماز جنازہ پڑھنے کیلئے اللہ کے کچھ بندے ضرور بروقت پہنچیں گے۔ پھر فرمایا:۔ میں یہ بات اس یقین و وثوق سے اس بنیاد پر کہتا ہوں کہ ایک دفعہ جب حضورؐ کی مجلس میں، میں حاضر تھا، اور میرے علاوہ ہمارے ساتھیوں میں سے ۹ اور بھی حاضر تھے، الغرض حضورؐ کے علاوہ ہم سب دس تھے، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا، کہ :۔ تم میں سے ایک وہ ہے جس کا آخری وقت آبادیوں سے الگ ایک جنگل بیابان میں آئے گا، اور اس کی نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین کیلئے عین وقت پر اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو بھیجے گا، میں نے حضورؐ کے اس ارشاد کو یاد رکھا، اور اپنے سب ساتھیوں کو بھی یاد رکھا، میرے علاوہ جو ۹ تھے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچ چکے، اور ہر ایک کا انتقال کسی نہ کسی آبادی میں ہوا، ان دس میں سے بس میں ہی رہ گیا ہوں، اسلئے مجھے بغیر کسی شک شبہ کے یقین ہے کہ حضورؐ کی یہ بات میرے ہی بارے میں پوری ہوگی، لہٰذا تم بالکل مطمئن ہو جاؤ، اور وہ وقت بہت قریب ہے، اسلئے بس اب اس کی تیاری شروع کرو، فلاں جگہ مشک کے کچھ دانے رکھے ہوئے ہیں، ان کو پانی میں گھول کر خیمہ پر چھڑک دو، یہ اللہ کے فرشتوں کی مہمانی ہے، انھیں خوشبو مرغوب ہے، اور یہ جو تمھاری بکری ہے، اس کو ذبح کرکے اس کا گوشت پکنے کیلئے رکھ دو، یہ آنے والے ان بندوں کی مہمانی ہے، جن کو اللہ میری تجہیز و تکفین کیلئے بھیجے گا، انھیں میرا سلام پہنچانا، اور ساتھ ہی یہ پیام بھی کہ وہ کھانا کھائے بغیر نہ جائیں، اسکے بعد فرمایا کہ جب میری روح پرواز کر جائے تو تم چادر ڈھانک کے سڑک پر چلی جانا، جب اللہ کے کچھ بندے کسی طرف سے آئیں، تو انھیں اطلاع دیدینا کہ ابوذرؓ جو یہاں مقیم تھا، اس کا انتقال ہو گیا، اور آپ ہی کو اسکے کفن دفن کا کام کرنا ہے، جب وہ وقت آگیا، تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق آپ کی بیوی نے چادر اڑھادی، اور سڑک پر آکر کھڑی ہو گئیں، کچھ دیر کے بعد کوفہ کی جانب سے غبار سا اٹھتا نظر آیا، اندازہ ہوا کہ کوئی قافلہ آرہا ہے، قافلہ بہت تیز رفتاری سے آرہا تھا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و معروف صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے، جو اپنے گیارہ بارہ ساتھیوں کے ساتھ کوفہ سے مکہ معظمہ کو جارہے تھے، ان کو بہت تاخیر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ خط ملا تھا کہ

تم حج کے موقع پر مکہ معظمہ آکر مجھ سے ملو، چونکہ دن بہت کم رہ گئے تھے، اسلئے بہت تیز رفتاری کے ساتھ یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا مکہ معظمہ کی طرف جارہا تھا، بہرحال جب یہ قریب آئے اور ایک اکیلی عورت کو اس طرح سڑک پر کھڑے دیکھا، تو حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے اپنے ناقہ کو روکا، تو انھوں نے اطلاع دی کہ صحابی رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ جو یہاں رہتے تھے، ان کا انتقال ہوگیا ہے، اور ان کی تجہیز و تکفین وغیرہ کا انتظام آپ ہی کرنا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے جیسے ہی نام سنا "سیدنا ابوذر، سیدنا ابوذرؓ" کہتے ہوئے اپنی اونٹنی سے کود پڑے، قافلہ وہیں رُک گیا۔ حضرت ابوذرؓ نے ایک پیام ان آنے والوں کو یہ بھی دیا تھا کہ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہو، جو کبھی کسی حکومتی عہدے پر نہ رہا ہو، اور اسکے پاس میرے کفن کیلئے کپڑا ہو، تو وہ کپڑا میرے کفن کیلئے دیدیا جائے اور مجھے اسی میں کفنایا جائے، ورنہ میری اسی چادر میں مجھے کفنایا جائے۔ ان محترم بیوی نے یہ پیام بھی پہنچادیا، اللہ کی شان گیارہ، بارہ آدمیوں کے اس قافلے میں صرف ایک انصاری نوجوان ایسے تھے جو اس شرط پر پورے اُترتے تھے، اور وہ کبھی کسی حکومتی عہدے پر نہیں رہے تھے، انھوں نے کہا کہ میں اپنے احرام کیلئے یہ دو چادریں لیکر گھر سے چلا تھا، ان کا سوت بھی میری ماں نے اپنے ہاتھ سے کاتا تھا، بہرحال انھوں نے وہ چادریں پیش کردیں، اور وہی حضرت ابوذر غفاریؓ کا کفن بنیں، روایات میں آگے یہ بھی ہے کہ تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر حضرت ابن مسعودؓ مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، تو حضرت ابوذر غفاریؓ کے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، اور امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچادیا۔

بس اسی ایک واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کس درجہ کا یقین و اذعان حاصل تھا۔

میرے محترم بزرگو اور دینی بھائیو!

یہی ایمان و یقین اصل دولت ہے، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص میراث ہے، یہی دین کی روح ہے، یہی چیز ہے جو آدمی کو نفس کی اور اغراض کی غلامی سے نکال کر اللہ کا اور صرف اللہ کا بندہ بنادیتی ہے، اور پھر اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے، اور اسکے بعد دین کے راستہ کی ہر مشکل اس کیلئے آسان ہوجاتی ہے، صحابۂ کرامؓ کا خاص سرمایہ اور اُن کا اصل جوہر یہی یقین تھا، اور یہی ان کی اصل طاقت تھی، پھر اس وقت سے لیکر اب تک جتنے خاصانِ اُمت اور اکابر دین گذرے ہیں ان کا اصل سرمایہ بھی یہی ایمان و یقین تھا،

اُور جیسا کہ میں نے عرض کیا، بس یہی اصل دولت ہے، اُور ہمارے پاس اگر یہ نہیں ہے بلکہ صرف عقیدہ ہے، اُور کچھ اعمال ہیں، تو اسلام کا ایک درجہ تو حاصل ہے، لیکن مقامِ ایمان نصیب نہیں ہے، اُور یہ اُن بدویوں والا حال ہے، جن کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ[۱]

میرے محترم بزرگو اُور بھائیو!

اسکے بعد، میں ذرہ برابر تو اضع و انکسار کے بغیر بالکل سچائی سے عرض کرتا ہوں کہ جب میں اپنا جائزہ لیتا ہوں، تو اپنا حال یہی پاتا ہوں کہ ایمان و یقین کا یہ مقام اُور حال مجھے نصیب نہیں ہے، ہاں الحمدللہ اسلام کا درجہ نصیب ہے (اُور یہ بھی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ کفر و انکار نہیں ہے، الحاد نہیں ہے، تشکیک نہیں ہے، اسلامی عقیدہ نصیب ہے، کچھ ٹوٹے پھوٹے اسلامی اعمال بھی نصیب ہیں، لیکن یقین و اذعان کی وہ اصل دولت جس کا نام ایمان ہے، وہ مجھے حاصل نہیں ہے) اُور دینی و اخروی نقطۂ نگاہ سے یہ میرا بہت بڑا خسارہ ہے ——— میں آپ سے سچائی سے کہتا ہوں کہ اگرچہ میں کوئی دولت مند آدمی نہیں ہوں، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے مجھے زندگی میں وہ آرام و سکون حاصل ہے، جو بہت سے دولت مندوں کو شاید حاصل نہ ہو اسی طرح بغیر کسی اہلیت اُور استحقاق کے آپ جیسے بلند مرتبہ حضرات بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اسی طرح مجھ پر اللہ تعالیٰ کے اُور بھی بے حد و حساب احسانات ہیں، اُور اس لحاظ سے میری یہ دنیوی زندگی گویا کامیاب زندگی ہے، لیکن میں اپنے مالک کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس حقیقتِ ایمان اُور دولتِ یقین کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے میری زندگی دراصل بڑے خسارے کی زندگی ہے، اُور اگر میں اسی محرومی کی حالت میں دنیا سے چلا گیا، تو سخت ناکام جاؤں گا، اسلئے اپنی ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت اُور اپنے کاموں میں سب سے بڑا کام میں یہی سمجھتا ہوں کہ کسی طرح یقین و ایمان کی اس دولت کو حاصل کروں،

---

[۱] یہ بدوی لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اے پیغمبر! آپ ان سے کہئے کہ تم کو ایمان کا مقام ابھی حاصل نہیں ہوا ہے (بلکہ تمہاری موجودہ حالت بس اسلام والی حالت ہے، اسلئے ایمان کا دعویٰ نہ کرو) بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، اُور دینِ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں، اُور ایمان جس حقیقت کا نام ہے وہ ابھی تمہارے دلوں میں نہیں اُتری ہے۔ ۱۲

اس کے لئے میں آپ سے دُعا کا بھی طالب ہوں۔

اسکے بعد میں آپ حضرات کی خدمت میں صفائی سے یہ بھی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر آپ حضرات نے کبھی اس نقطۂ نظر سے اپنا جائزہ نہ لیا ہو، تو ضرور یہ جائزہ لے کر دیکھیں، میرا خیال ہے کہ جائزہ کے بعد آپ میں سے بھی بہت سے حضرات اپنا حال کچھ میرا سا ہی پائیں گے، اور یہ حال خواہ ہم میں سے کسی کا ہو، ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے، اور ہم میں سے جو کوئی اس حالت میں اس دُنیا سے چلا جائے وہ بڑے خسارہ میں ہے۔

سیّدنا حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم اسی دولت کو عام کرنے تشریف لائے تھے، اور قرآن مجید کی دعوت اور اس کا پیام ہمارے لئے یہی ہے: "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا" (اے ایمان لانے والو! سچے "مومن" بن جاؤ، اور حقیقتِ ایمان حاصل کرنے کی کوشش کرو)۔

اسکے بعد میرے اور آپ کے سامنے سوال آتا ہے، کہ یقین و ایمان کی یہ دولت کس طرح حاصل کی جائے؟ ــــــ میں عرض کر چکا ہوں، کہ میں خود اس دولت کا سرمایہ دار نہیں ہوں، بلکہ طالب اور متمنّی ہوں، لیکن چونکہ اللہ کے صاحبِ یقین بندوں کو دیکھا ہے، اور اُن سے اُن کے تجربات سُنے ہیں، اور اگلوں کے کچھ حالات کتابوں میں پڑھے ہیں، اسلئے اس سلسلہ میں بھی ایک مختصر بات عرض کرتا ہوں، شاید اللہ کا کوئی بندہ وہ فائدہ اٹھا سکے جو اپنی بے عملی اور شومیٔ قسمت سے میں خود نہیں اُٹھا سکا۔

میرے بزرگو اور دوستو!

اللہ تعالیٰ کی ایک کریمانہ سنّت یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ جس کو یقین کی یہ دولت ابھی نصیب نہیں ہے مگر وہ اس کا طالب ہے، تو اگر وہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری والی اہلِ یقین کی سی زندگی گذارنے لگے، اور اللہ کے دین کے راستہ میں اور اسکی رضا طلبی میں اپنی خواہشات اور اپنے مال و جان کو اخلاص کے ساتھ اصحابِ یقین کی طرح قربان کرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ اُس کو اس دولت سے محروم نہیں رکھتے، اسی طرح طلبِ صادق کیساتھ کسی صاحبِ یقین بندہ کی صحبت اس مقصد کیلئے ہزاروں برس کی مجرّب اکسیر ہے، اور ہماری یہ دُنیا ایسے بندوں سے ابھی خالی نہیں ہوئی ہے ــــــ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ حضرات کو اپنی اس ضرورت کا صحیح احساس اور صادق طلب، اور اسکی سچی بھینی عطا فرمائے، اور جس راستہ پر چلنے سے یہ دولت ملتی ہے، اس پر چلنے کی توفیق دے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین

قسط چہارم
آخری قسط

حدیث پرویز

از، عتیق الرحمن سنبھلی

(سلسلہ کیلئے دیکھئے الفرقان بابتہ ربیع الاول ۹ھ)

الائمۃ من قریش سقیفۂ بنی ساعدہ کی تاریخی روداد میں جو چند در چند پہلو پرویز صاحب نے ذخیرۂ حدیث پر اعتراضات کے نکالے تھے ہم ان میں سے ایک کے سوا سب سے فارغ ہو چکے ہیں۔ وہ ایک پہلو جو تشنۂ کلام ہے، بقول پرویز صاحب کے تاریخ کا یہ بیان ہے کہ

"جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا، تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے، اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ "الائمۃ من قریش" خلافت قریش ہی میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔"

اس پر پرویز صاحب کا اعتراض یہ ہے، جو آپ پڑھ چکے ہیں کہ:۔

"یہ حدیث متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے، لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل اور متواتر نسل اور خون کے تمام امتیازات مٹا کر مساوات انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسول یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی؟ یہ ایک روایت

قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار و مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کرلیا، یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسولؐ اور رسول کے صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کرجاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔"

جہاں تک "تاریخ کے اس بیان" کا تعلق ہے اسکی صحت تسلیم کرنے میں تو ہمیں بعض وجوہ سے اشکال ہے، جیساکہ ہم پہلے اپنے موقع پر اشارۃً اس کا اظہار کرچکے ہیں۔[1] لیکن یہ ہمیں بہرحال تسلیم ہے کہ "الائمۃ من قریش" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اس لئے پرویز صاحب کا اعتراض علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے، اور ہمیں اُس پر غور کرنا چاہیئے۔

پرویز صاحب کے اعتراض کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ کو ارشاد رسول تسلیم کرنے سے انھیں اس خیال کی بنا پر انکار ہے کہ اس سے نسل و خون کے امتیازات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور مساوات انسانیہ اور تکریم آدمیت کی جو تعلیم قرآن دیتا رہا اور خود حضور عمر بھر اس پر عامل رہے یہ اس کے خلاف ہے ــــــ لیکن یہ پرویز صاحب کا محض مفروضہ یا ان کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ اولاً تو اس ارشاد کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو امامت عامہ کے لئے نامزد فرمارہے ہوں، بلکہ اسکی حیثیت اسکے آگے کے الفاظ (یعنی پوری حدیث) کو مدنظر رکھتے ہوئے، پیشین گوئی کے انداز میں ایک دورخی تنبیہ کی سی ہے کہ ایک طرف قریش اس منصب کے شرائط کو ملحوظ رکھیں، دوسری طرف باقی لوگ اس منصب کے معاملہ میں قریش سے لاحاصل مزاحمت نہ کریں۔ پوری حدیث یوں ہے:-

---

[1] اس سلسلہ میں تیسری قسط میں ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ واقعہ کی روداد جو صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

الائمۃ من قریش (ما عملوا	ائمہ قریش ہی میں سے ہوتے رہیں گے،
ثلاث) اذا احکموا عدلوا	جب تک کہ ان میں تین باتیں رہیں گی ،
واذا عاھدوا وفوا	ایک یہ کہ وہ فیصلوں میں انصاف کرتے
وان استرحموا رحموا	ہوں۔ عہد کے پابند ہوں ، سوم یہ کہ رحم
فمن لم یفعل ذلک	کے موقع پر رحم کریں۔ پس جو ان میں سے
منھم فعلیہ لعنۃ اللہ	ایسا نہیں کرے گا ، اس پر اللہ کی اُس
والملائکۃ والناس	کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت
اجمعین لایقبل منھم	ہوگی ۔ اور کوئی چیز انھیں اس انجام سے
صرفٌ ولاعدلٌ	نہ بچا سکے گی ۔

بتائیے حدیث کے ان پورے الفاظ کو دیکھتے ہوئے کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "الائمۃ من قریش" کا مطلب حکومت کے لئے قریش کی نامزدگی ہے ـــــ لیکن اگر کسی طرح یہ مان بھی لیا جائے کہ ان الفاظ کا مطلب قریش کی نامزدگی ہی ہے ، تب بھی اس سے نسل و خون کے امتیازات کو تسلیم کرنا اور مساواتِ انسانیہ کے اصول کو نظر انداز کرنا اس وقت لازم آسکتا تھا جب کہ قریش کو صرف قرشیت کی بنا پر بلا کسی زائد شـــرط کے حکومت کے لیے نامزد کیا جاتا ، اور بلا کسی شرط کے امامت ان کا حصہ قرار دی جاتی ۔ لیکن یہاں تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ تین تین شرطیں لگی ہوئی ہیں کہ ان کو اگر وہ کھو دیں تو باوجود قرشیت کے ان کا حصہ امامت اور خلافت نہیں بلکہ اللہ کی ، اُسکے فرشتوں کی اور تمام بنی آدم کی لعنت ہے ۔!

ذرا غور تو فرمایئے اگر " الائمۃ من قریش " میں قریش کی نامزدگی نسل پرستی کے اصول اور بین الانسان تفریقات و امتیازات کے تخیل کی حامل ٹھیرائی جائے تو ان اگلے الفاظ کے کیا معنیٰ رہجاتے ہیں جن میں قریش کے استحقاق امامت کو بعض خاص اعمال واوصاف کے ساتھ مشروط کیا جا رہا ہے ، اور کہا جا رہا ہے کہ قریش ہزار قریش ہوا کریں لیکن اسلام میں اُن کی امامت اسی وقت تک چل سکتی ہے جب تک ان میں عدل گستری ، عہد کی پابندی اور رحم پروری کے اوصاف رہیں ۔ کہیں کہا جا رہا ہے کہ جب تک وہ اللہ کی اطاعت اور اسکے

دین پر قائم رہیں (ما اطاعوا اللہ واستقاموا علیٰ امرہ) کہیں کہا جا رہا ہے کہ جب تک وہ دین کو قائم رکھیں ـــــ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا جا رہا ہے کہ جب وہ یہ شرائط پورے نہ کریں تو مسلمانوں کی امامت کے بجائے ان کا حصہ اللہ کی، اسکے ملائکہ کی اور تمام بنی آدم کی لعنت ہے۔

دوسری حدیث میں اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:-

یا معشر قریش فانکم اھل	اے جماعتِ قریش! بے شک تمھیں کو اس
ھٰذا الامر مالم تعصوا اللہ	امت کی سربراہی کا کام انجام دینا ہے
فاذا عصیتموہ بعث الیکم	جبتک کہ تم اللہ کی نافرمانی نہ کرنے لگو بس جب
من یلحاکم کما یلحیٰ ھٰذا	تم اُسکی نافرمانی کی روش اختیار کروگے تو وہ
القضیب ـــــ لقضیب	تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا، جو تمھیں اس
فی یدہٖ۔	طرح ادھیڑ کر رکھدینگے جس طرح دیکھو یہ شاخ
	جو میرے ہاتھ میں ہو، ادھیڑی جاتی ہے۔

تعالیٰ اللہ! ـــــ کہ

یاروں نے بُت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا

جو حدیثیں نسلی برتری کا بت چکنا چور کئے دے رہی ہیں، اور جن کا منشا ہی یہ ہے کہ قریش کہیں قرشیت کے بھلاوے میں نہ رہ جائیں اور یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ امامت وسیادت جو ان کے نصیب میں آ رہی ہے انکی قرشیت کی بنا پر اور اس بنا پر ہے کہ اللہ کو انکی نسلی نسبت کی بنا پر اُن سے کوئی خاص پیار ہے۔ تعالیٰ اللہ! کہ انھیں حدیثوں کے ایک ٹکڑے میں نسل پرستی کی بو سونگھی جا رہی ہے اور ناموس رسالت کی حفاظت کا روپ بھر کر کہا جا رہا ہے کہ

" یہ کبھی رسولُ اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟"

ـــــ دہائی دی جا رہی ہے کہ :-

" ہماری تاریخ اس روایت کو رسولُ اللہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکر نے انصار و مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حقِ خلافت کے لیے بطور دلیل پیش کیا اور سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری

تاریخ ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسول اور رسول کے صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا۔"

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

"الائمۃ من قریش" کیوں؟ عجیب معاملہ ہے کہ کہیں "الائمۃ من قریش" کو قرآن کی بنیادی تعلیمات اور رسول اکرم کے اُسوۂ حسنہ کے خلاف قرار دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ حدیث کا متفق علیہ ذخیرہ بھی مشکوک ہے، تو کہیں اس بنیاد پر یہ فتنہ پرور اصول وضع کرنے کی سعی فرمائی جارہی ہے کہ دین کے اصولوں میں عملی ضروریات کے لحاظ سے ترک و استثنار کا عمل بھی کیا جاسکتا ہے! اس لئے ہم آج یہ چاہتے ہیں کہ اس حدیث کی حقیقت اور اس کا راز اچھی طرح واضح کردیں تاکہ لوگوں کے دماغ جو نت نئی تحقیقات و انکشافات سے پریشان ہو رہے ہیں، سکون پالیں اور اس قسم کی شکوک اور اصول آفرینیاں آئندہ اُن کے انتشار ذہنی کا باعث نہ بن سکیں۔

یہ دونوں کوششیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا اس دعوے پر مبنی ہیں کہ "الائمۃ من قریش" ایک دستوری قرار داد، ایک فیصلہ اور نامزدگی کا ایک فرمان ہے ——— ہم نے اس دعوے کو رد کرتے ہوئے ابھی کہا تھا کہ اولاً تو یہ سب کچھ نہیں، یہ ایک پیشین گوئی ہے، اگرچہ محض برائے پیشین گوئی نہیں، بلکہ ایک بامقصد پیشین گوئی ہے۔ یعنی اس مستقبل قریب کے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قریش اور دوسرے لوگوں کو دو مختلف باتوں پر تنبیہ کرنا مقصود ہے، لیکن اگر کسی طرح مان بھی لیا جائے کہ یہ قریش کی امامت کا ایک فرمان ہے اور دستوری فیصلہ ہے تب بھی اس کا قریش کی قرشیت سے کوئی تعلق نہیں، ورنہ حدیث میں اسکے بعد کے تمام الفاظ بے معنیٰ ہوں گے ——— یہی بات ہم نے جولائی اور اگست ۱۹۶۸ء کے الفرقان میں بہت تفصیل کے ساتھ ان صاحب کے جواب میں لکھی تھی جو حدیث الائمۃ من قریش کو قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر کی تعلیم مساوات کے خلاف قرار دے کر اس سے

دین کے اصولوں میں حکمتِ عملی کے ماتحت ترک واستثنار کے جواز کا اصول ثابت فرمارہے تھے،
جہاں تک اس مضمون کی جملہ حدیثوں کے سیاق اور الفاظ کا تعلق ہے، ہم نے ایک ایک حدیث
کی تحلیل کرکے بتایا تھا کہ سیاق اور الفاظ سے سراسر ہماری تائید ہوتی ہے، ان صاحب سے
اسکے جواب میں تو بجز اسکے اور کچھ بنا نہیں کہ انھوں نے بعض بزرگوں کی عبارتیں پیش کردیں
کہ دیکھو فلاں بھی اسکو امر اور حکم ہی مانتے ہیں، اور فلاں بھی اور فلاں بھی۔ اور تم ایک نرالے
فاضل وقت آئے ہو کہ ایک نئی بات پیدا کررہے ہو! ــــ گویا بعینہ وہی روتیہ جس سے
انھیں ہمیشہ چڑ تھی کہ وہ تو دلیل سے ایک بات کہیں اور اس کا جواب بزرگوں کے اقوال
سے دیا جائے ــــــ البتہ ایک اعتراض انھوں نے ہماری اس بات پر (کہ اگر یہ ایک
نامزدگی اور قرار داد تھی بھی تو قرشیت کی بنا پر نہیں بلکہ قریش کی اہلیت کی بنا پر تھی) یہ کیا
تھا کہ اہلیت کی بنیاد پر بھی کسی ایک قبیلے اور ایک خاندان کو حکمرانی کے لئے نامزد کرنا اصولِ
مساوات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قریش سے باہر کا کوئی
آدمی کتنا ہی اہل کیوں نہ ہو اس منصب پر نہیں آسکتا، اس لئے کہ وہ قریشی نہیں ہے ــــ

ہم سمجھتے ہیں کہ پرویز صاحب بھی زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکیں گے وہ یہی ہوگی،
اس لیے ہم اس سلسلہ میں ایک فیصلہ کن بات کہہ دینا چاہتے ہیں، جس کے بعد کسی قیل و قال
کی گنجائش نہ رہے۔

بہت سی باتیں اپنا ایک خاص پس منظر رکھتی ہیں جس کو نظر انداز کر دیجئے تو بات الجھ جائے گی۔
اور پس منظر کے ساتھ دیکھئے تو اس میں کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوگی۔ ان زیر بحث احادیث کا
بھی یہی حال ہے کہ ان کا ایک خاص پس منظر ہے جس کو ملحوظ رکھنے پر ان میں مساوات و عدمِ
مساوات اور قبائلی تفریق و امتیاز کی کوئی بحث پیدا نہیں ہوتی۔

احادیثِ امامت قریش کا پس منظر | یہ معلوم ہے کہ قریش بنی اسمٰعیل میں سے ہیں، اور بنی اسمٰعیل
کا معاملہ یہ ہے کہ ان کو عام امتِ محمدی میں ایک مخصوص
مقام حاصل ہے، جس کے یہ دو خاص امتیازات ہیں:۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اوّلاً بنی اسمٰعیل کی طرف ہے۔ اور اسکے بعد جمیع دنیائے عرب و عجم کی طرف آپ کی بعثت میں بنی اسمٰعیل اعضاء و جوارح کی حیثیت سے آپکے شریک ہیں۔

۲۔ بنی اسمٰعیل جس دین (ملت ابراہیمی) سے انتساب رکھتے اور نسلاً بعد نسلٍ اسکے وارث تھے اسکو اسلام نے نظامِ عقائد و اعمال میں مادۂ اصلیہ کی حیثیت حاصل ہے۔ انھیں کے ملی شعائر انھیں کی عادات اور انھیں کے رسوم و رواج اور مصالح مالوفات و معروفات سے کہنا چاہیئے کہ اسلامی دین و شریعت کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے۔

ان دونوں باتوں پر قرآن اور زبان رسالت ناطق ہے! ـــــ کس طرح؟ ـــــ یہ آپ:۔ ہمارے بجائے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے سمجھئے۔

- -

۱۔ شاہ صاحبؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں باب "الحاجۃ الی دینٍ ینسخ الادیان" (تمام دینوں کو منسوخ کرنے والے دین کی ضرورت) کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:۔

ولما انفرز کل قوم بملۃ	اور جب ہر قوم نے اپنی ایک الگ ملت ٹھرائی۔
وانتحلوا سننا وطرقا	اور کچھ خاص طور طریقے ہر ایک نے اپنا لئے۔
وناضلوا دونها بألسنتهم	پھر ان کی حمایت میں ان کا تعصب جدال و
وقاتلوا علیها بأسنتهم	قتال کے رنگ میں ڈھل گیا اور ساتھ ساتھ
ووقع فیهم الجور اما لقیام	یہ بھی ہوا کہ ان میں حقیقت دین سے انحراف
من لا یستحق اقامۃ الملۃ	اور زیغ رونما ہونے لگا۔ خواہ اس وجہ
بها اولاختلاط الشرائع	سے ان کی پیشوائی نا اہلوں کے ہاتھ میں
الابتداعیۃ ودسها	چلی گئی، یا اس وجہ سے کہ کچھ من گھڑت
فیها اولتهاون حملۃ	باتیں ایجاد ہو کر اصل دین میں مل گئیں یا
الملۃ فاهملوا کثیرا ما ینبغی	اس لیے کہ حاملین ملت نے سہل انگاری
فلم تبق الا دمنۃ لم تتکلم	اختیار کی اور اپنے بعض فرائض انھوں نے

من اهل اديان وملل… رادٍ في ولاية كل ملة أختها وأنكرت عليها وقاتلتها واختفى الحق، مست الحاجة الى امام راشد يعامل مع الملل معاملة الخليفة الراشد مع الملوك الجائرة ……… وهذا الامام الذي يجمع الامم على ملة واحدة يحتاج الى اصول اخرى غير الاصول المذكورة فيما سبق — منها ان يدعو قوما الى السنة الراشدة ويزكيهم ويصلح شانهم ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه فيجاهد اهل الارض ويفرقهم في الآفاق وهو قوله تعالى "كنتم خير امة اخرجت للناس"۔

ترک کردیئے۔ الغرض اصل دین کا نام نشان تک مٹ گیا ——— اور ہر ملت کو دوسری ملت پر کیچڑ اچھالنے، برا بھلا کہنے اور اس سے جنگ آزما ہونے کے سوا کوئی کام نہ رہا۔ اور پھر قدرتی طور پر حق کا چہرہ چھپ کر رہ گیا، تو ضرورت ہوئی کہ ایک امام حق شناس و حق شعار پیدا ہو۔ اور ان تمام ملتوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو ایک خلیفۂ راشد بگڑے ہوئے اور ستم پیشہ ملوک و سلاطین کے ساتھ کرتا ہے …… یہ امام جسے تمام قوموں کو ایک ملت پر لاکر جمع کرنا ہے اپنے کارِ منصبی کے لئے ان اصولوں کے علاوہ کچھ دوسرے اصولوں کا بھی محتاج ہے جو سابق میں بیان ہوئے ہیں۔

ان خاص اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ امام ایک خاص قوم کو راہِ مستقیم کی دعوت دے۔ اور (ہمہ تن ان میں مشغول ہوکر) اُن کا پورا پورا تزکیہ اور پوری پوری اصلاح کرے، پھر ان کو اپنا دست و بازو بناکر اپنی کوششوں اور محنتوں کا رُخ تمام اہلِ ارض کی طرف پھیر دے اور اپنے ان رفقاء کو عالم میں پھیلا دے۔ یہی حقیقت ہے۔ اللہ کے ارشاد "کنتم خیر اُمّۃٍ اُخرجت للناس" کی۔

۲۔ "نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص" کے باب میں تحریر فرماتے ہیں:-

واذا اقتضت الحکمة الالٰھیة ان یبعث الی الخلق واحداً من المفھمین[له] فیجعله سبباً لخروج الناس من الظلمات الی النور وفرض اللّٰہ علیٰ عبادہٖ ان یُسلموا وجوھھم وقلوبھم لهٗ وتاَکّدَ فی الملاء الاعلیٰ الرضا عمن انقادلهٗ وانضمّ الیه واللعن علیٰ من خالفهٗ وناواہ فاخبر الناس بذالك والزمھم طاعتهٗ فھو النبیٌ

واعظم الانبیاء شاٗناً من لهٗ نوع آخر من البعثة ایضاً وذٰلكَ ان یکون مراد اللّٰہ تعالیٰ فیه ان یکون سبباً لخروج الناس من الظلماتِ الی النور وَ اَن یکونَ قومه خیراُمّةٍ اُخرجت للناسِ فیکون بعثهٗ یتناول بعثاً آخر

اور جب حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہو کہ مفہمین[له] کے طبقے میں سے کسی ایک کو مخلوق کی طرف مبعوث کر کے اسے لوگوں کے ظلمتوں سے نور کی طرف نکل کر آسنہ کا ذریعہ بنائے. اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر لازم کرئے کہ اپنے چہرے (سر) اور اپنے دل اسکے لئے جھکا دیں۔ اور ملأ اعلیٰ میں ان لوگوں کے لیے رضامندی ثبت ہو جائے جو جھک کر اس مبعوث کا دامن پکڑ لیں اور ان لوگوں کے لیے لعنت ثبت ہو جائے جو اسکی مخالفت پر کربستہ ہوں. پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی خبر دے، اور مبعوث کی اطاعت ان پر لازم کرئے تو یہی نبی ہے۔

اور سب سے بلند مرتبہ نبی وہ ہے جسے اس عام قسم کی بعثت کے علاوہ ایک اور خاص قسم کی بعثت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس بعثت در بعثت کے معاملہ کی تشریح یوں ہے کہ ایک تو اللہ خود اس نبی کو مبعوث فرمائے کہ وہ لوگوں کے ظلمات سے نور کی طرف نکل کر آنے کا ذریعہ بنے. دوسرے

[له] المفہمون کے اس طبقہ کے لیے شاہ ولی اللہ صاحب کی اصطلاح ہے جس میں سے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں۔

والی الاول وقعت الاشارۃ فی قولہ تعالیٰ ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم الآیۃ والی الثانی فی قولہ تعالیٰ "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم "فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین۔"

(ایضاً ص)

یہ کہ اسکی خاص قوم خیر امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لیے اٹھائی جائے۔ پس اس طرح اس (نبی اعظم) کی بعثت اپنے اندر ایک دوسری بعثت لیے ہوتی ہے۔ (یہ ایک ایسی حقیقت ہو جو قرآن سے ثابت ہو) چنانچہ پہلی قسم کی بعثت کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ "ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم" اور دوسری طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "(اے میرے اصحاب) تم آسانی پیدا کرنے کے لیے مبعوث کیے گئے ہو سختی اور تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں!"

(۳) "دینِ اسلام اور دین یہودیت و نصرانیت میں اختلاف کے وجوہ و اسباب" پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ومنھا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث بعثۃ تتضمن بعثۃ اخریٰ فالاولیٰ انما کانت الیٰ بنی اسمٰعیل وھو قولہ تعالیٰ "ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم"

اس اختلاف کا ایک سبب یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکے بعد دیگرے دو بعثتوں کے جامع تھے۔ آپ کی پہلی بعثت خاص بنی اسمٰعیل کی طرف تھی۔ جیساکہ ارشاد الٰہی ہے کہ "وہی خدائے عزیز و حکیم ہے جس نے مبعوث فرمایا امیین میں ایک

وقولہ تعالیٰ "لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ" وهذه البعثة تستوجب أن يكون مادة شريعته ما عندهم من الشعائر وسنن العبادات ووجوه الارتفاقات اذ الشرع هو اصلاح ما عندهم لا تكليفهم بما لا يعرفونه اصلاً ونظيره قوله تعالىٰ "قرآنًا عربيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ" وقوله تعالىٰ "لَوْ جَعَلْنَاهُ قرآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ" وقوله تعالىٰ "وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ" والثانية كانت الى جميع اهل الارض عامة بالارتفاق الرابع.... ....فحصل له بحسب هذا الكمال احكام اخرى غير احكامه. التوراة

(صـ ۱۲۲-۱۲۳ ایضاً)

رسول انھیں میں سے" الخ۔ نیز جیسا کہ اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ "تا (اے نبی) تو ڈر کی بات بتائے اس قوم کو جس کے بارے میں کوئی بتانے والا نہیں آیا اور اس بنا پر وہ غافل ہیں"

اور اس بعثت کا تقاضہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا مادۂ اصلیہ وہ شعائرِ عبادات کی وہ شکلیں اور ارتفاقات کے وہ طریقے ہی ہوتے جو بنی اسمٰعیل میں مروج تھے۔ اسلئے کہ شرع نام ہے انھیں چیزوں کی اصلاح کا، جو لوگ اختیار کئے ہوئے ہوں۔ نہ کہ اُن باتوں کے عائد کئے جانے کا جن سے وہ قطعاً ناآشنا ہوں!

—— اور یہ بات اِن آیاتِ قرآنی سے بھی جانی جا سکتی ہے جو مسئلہ زیرِ بحث میں نظیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فرمایا گیا ہے "ہم نے یہ قرآن عربی میں اُتارا ہے تاکہ تم سمجھ سکو" ——— "اگر ہم یہ قرآن کسی عجمی زبان میں اتار دیتے تو کہا جاتا کہ اسکی آیات ہمارے لیے (ہماری زبان میں) واضح کیوں نہیں کی گئیں خوب ہے یہ بات کہ یہ عجمی زبان ہو درانحالیکہ رسول عربی ہے!" —— اور ہم نے نہیں بھیجا کبھی کوئی رسول مگر اسکی قوم کی زبان میں پیغام دے کر!"

(باقی ترجمہ دوسرے صفحہ پر)

(یہ آنحضرتؐ کی پہلی بعثت ہوئی۔) دوسری بعثت آپ کی روئے زمین کے تمام باشندوں کی طرف تھی جس کا خاص مقصد دنیا میں امن وامان اور خلافت راشدہ کا قیام تھا پس اس کمال کے باعث آپ کی شریعت کچھ ایسے احکام پر بھی مشتمل ہوئی جن سے تورات خالی تھی۔[۱]

شاہ ولی اللہؒ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بہت واضح اور مدلّل طور پر سامنے آجاتی ہے کہ — عام امت محمدیؐ میں بنو اسمٰعیل کو ایک مخصوص مقام حاصل ہے، جس کے یہ دو خاص امتیازات ہیں

(۱) یہ کہ ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اولاً بنو اسمٰعیلؑ کی طرف ہے۔ اور اسکے بعد تمام اہل ارض کی طرف آپؐ کی بعثت میں، بنو اسمٰعیل اعضاء وجوارح کی حیثیت سے آپ کے شریک ہیں۔

(۲) یہ کہ ——— بنو اسمٰعیل جس دین (ملت ابراہیمی) کے نام لیوا تھے اسلام کے نظام عقائد واعمال میں اسکو بنیادی مادہ کی حیثیت حاصل تھی۔[۲]

اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اب اسی کے اندر کی ایک دوسری حقیقت کو نظر میں لائیے!۔

---

[۱] یہاں جس بحث میں شاہ صاحب نے حضور کی دوسری بعثت کا ذکر فرمایا ہے اس بحث میں اس دوسری بعثت کا یہ پہلو ذکر کرنے کی ضرورت چونکہ نہیں تھی کہ اس بعثت میں بنی اسمٰعیل بھی اعضاء وجوارح کی حیثیت سے آپکے شریک تھے، اسی لیے شاہ صاحب یہاں اسکے ذکر سے خاموش رہے ہیں۔ ورنہ اس بعثتِ ثانیہ کا پورا نقشہ یہی ہے جسے شاہ صاحب کی سابقہ دونوں عبارتیں واضح کر چکی ہیں۔ فَتَنَبَّہْ!

[۲] بنو اسمٰعیل کا یہ دوسرا امتیاز خاص طور پر ایسی ظاہر و باہر حقیقت ہے کہ اسکو منوانے کے لیے قرآن کے کسی نص صریح کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کسی کو یہ کمی محسوس ہوتی ہو کہ شاہ صاحب نے اس پر قرآن کا کوئی صریح بیان نہیں پیش کیا۔ تو ہم اسکے لئے سورۂ حج کے ان الفاظ کا حوالہ دے سکتے ہیں کہ ارشاد ہوا ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ أَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْم۔ (اور اللہ نے نہیں رکھی ہے دین میں تمہارے لیے کوئی تنگی۔ بلکہ استوار کیا ہو اس کو تمہارے باپ ابراہیم کی ملت پر)

______ اور وہ یہ کہ

عام امتِ محمدیؐ کے اندر بنی اسمٰعیل کو جو خاص حیثیت عامۃً حاصل تھی وہ واقعہ کے اعتبار سے، بنی اسمٰعیل کے اندر قریش کو خاصۃً حاصل ہے ______ قریش کا قبیلہ، بنو اسمٰعیل کی وہ شاخ ہے جو تمام بنی اسمٰعیل میں ہمارے بیان کردہ امتیازات کا سب سے بڑھ کر اور سب سے اول درجہ پر حامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کا سب سے پہلا مخاطب یہی قبیلہ بنا۔ اس لئے کہ یہ خود آپ کا قبیلہ تھا۔ اسی قبیلے سے آپ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اٹھے ۔۔ پھر قدرتی طور پر وہی آپ کی تلاوت و تعلیم اور تربیت و تزکیہ کا سب سے پہلا حلقہ بنے، وہی آپ کے لائے ہوئے دین کی اشاعت کے کام میں سب سے پہلے درجہ پر شریک ہوئے اور انھیں کے پیروں چل کر آپ کی دعوت اِدھر اُدھر بڑھی ______ پھر قریش ہی کی زبان وہ ٹکسالی زبان تھی جس میں دینِ حق کی تعلیمات نازل ہوئیں ______ اور قریش ہی اُن شعائر و سنن اور ان عادات و طُرق کے نمائندہ تھے جو اس زمانہ میں دین ابراہیمی کے بچے کھچے نقوش تھے۔ قریش ہی ملت ابراہیمی کے اُس مرکز ______ خانہ کعبہ ______ کے متولی تھے جو ان شعائر و سنن اور عادات و اطوار کا مرجع تھا۔ اور انھیں کے حصہ میں اپنے باپ اسمٰعیلؑ کی جانشینی آئی ہوئی تھی۔ غرض وہی تھے جو، تمام عرب ہی میں نہیں بنو اسمٰعیل کے درمیان بھی، دین ابراہیمی پر اتھارٹی (سند) اور اُس کے سب سے زیادہ معتبر حامل و وارث تھے!

یہ ہے احادیثِ امامت قریش کا وہ پس منظر جس پر متنبہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ان احادیث کو نسلی تفریق و امتیاز کا حامل ٹھہرا کر ان کا سرے سے انکار کر ڈالتا ہے۔ اور کوئی اس مفروضہ "تفریق و امتیاز" کو عملی ضروریات کے ماتحت استثنا آت کے قبیل سے ٹھہرا کر ان احادیث سے یہ نظریہ ثابت کرنے لگتا ہے کہ اسلامی تحریک کا کوئی قائد حکمت عملی کے طور پر دین کے قطعی اصولوں میں بھی حسب ضرورت استثنا آت کر سکتا ہے!

حرف مطلب | ذرا غور فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے قائم کئے ہوئے دینی نظام کی سربراہی اور پیشوائی کے لئے ______ جسے اصطلاح میں خلافت اور امامت سے تعبیر کیا جاتا ہے ______ اس جماعت اور اُس گروہ سے زیادہ کون موزوں اور کون حقدار ہو سکتا تھا، جسے اللہ نے

امت محمدی کی اُس ممتاز نسل میں بھی اوّلیت اور اقدمیت کا شرف بخشا جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوّلاً مبعوث فرمائے گئے، اور جسے باقی تمام دنیا کی طرف آپ کی بعثت میں اعضاء وجوارح کی حیثیت سے آپ کا شریک بنایا گیا تھا؟ کون اس امانت کا حق اُس جماعت اور اُس گروہ سے بہتر طور پر ادا کر سکتا تھا جسے رسول کی دعوت کا اوّلین مخاطب بننے اور اس دعوت کے مؤمنین اولین فراہم کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، جسے سب سے پہلے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپؐ کی تلاوت آیات اور تعلیم وتزکیہ سے مستفیض ہو ـــــــ اور اس طرح جس کی مدتِ فیضیابی اور تمام خوش نصیبوں سے ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی ـــــــ جسے سب سے پہلے درجہ پر یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اُس کے افراد آپؐ کی دعوت کے سب سے پہلے خادم اور آپؐ کے سب سے پہلے رفیق کار و شریک حال و ہمدم و دمساز بنے؟ اور کون اس امانت کا حق اس جماعت اور اس گروہ سے بہتر طور پر ادا کر سکتا اور اس سے بڑھ کر دین کا رمز آشنا ہو سکتا تھا جس کی خاص زبان میں قرآن نازل ہوا اور جس کی خاص زبان میں مشکوٰۃ نبوت سے احادیث صادر ہوئیں، اور جو اُن عادات وشرائع، اُن شعائر وسُنن کا نائندہ حامل و وارث اور ان میں مرجع و سند کی حیثیت رکھتا تھا جن سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام عقائد واعمال میں مادّہ اصلیہ کا کام لیا گیا تھا؟ ـــــــ اور کون دین کو قائم رکھنے کی اس ذمہ داری کو اُس گروہ اور اس جماعت سے زیادہ دلچسپی اور طبعی رغبت کے ساتھ اُٹھا سکتا تھا جس کے لیے یہ دین اپنی اصلیت کے لحاظ سے اس کا آبائی دین ہو۔ اور پھر اُسے اپنے آبائی دینی نظام میں عرصہ سے مرکزیت بھی حاصل چلی آرہی ہو اور (اپنے اعتقاد کے مطابق) اس دینی نظام کی اقامت، کا کام وہ گہری دلچسپی کے ساتھ انجام دیتا آرہا ہو؟

پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے اور ایک فرمان کی حیثیت سے آپ کا یہ ارشاد ہمارے سامنے آتا ہے کہ اسلامی نظام کی سربراہی میرے بعد قریش میں رہے گی۔ اس نظام کے متولی قریش ہی ہوں گے۔ اور انہی کے لئے اس نظام میں مرکزیت اور پیشوائی کا مقام مخصوص رہے گا۔ الّا یہ کہ وہ ایسا ایسا کریں۔ تو یہاں کیا موقع اور محل ہے کہ مساوات وعدم مساوات کی بحث اٹھائی جائے اور اس فیصلہ و فرمان کا رشتہ نسل ونسب کے امتیازات سے جوڑا جائے؟ یہ اگر فیصلہ و فرمان تھا تو قریش کی قرشیت سے اس کا کیا واسطہ؟ اس کا مدار تو تمام تر وہ دوسرے امتیازات تھے جو تقدیر ا

حکمت الٰہی سے قریش کے نصیب میں آگئے تھے۔ اور جن کے قریش کے پلّے میں ہوتے ہوئے، کوئی وجہ نہیں تھی کہ اسلامی نظام کی امامت کے معاملہ میں قریش اور غیر قریش کو برابر کر دیا جاتا۔ اور امت کو یہ ہدایت دینے میں تکلف کیا جاتا کہ قریش، جو تاریخی طور پر اس کردار (خلافتِ نبوت) کے لیے تیار ہوئے ہیں، اس کردار کی ادائیگی انھیں کا خاص حصّہ جانی جائے اور اس میں اُن سے کوئی مناقشہ نہ کیا جائے! ——— خصوصاً جبکہ ان قابل لحاظ امور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت بھی جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی کہ

الناس تبعٌ لقریش. صالحهم تبعٌ لصالحهم وشرارهم تبعٌ لشرارهم۔	سارے لوگ مجموعی طور پر قریش ہی کے تابع ہیں. جو صالح ہیں وہ صالح قریشیوں کے تابع ہیں. اور جو بد ہیں وہ ان کے بدوں کے !

شاہ ولی اللہؒ کی تائید یہ توجیہ کوئی خالصۃً ہماری اپج نہیں بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب جیسی مسلّم شخصیت کے ہاں بھی ہمیں ارشادِ "الائمۃ من قریش" کی فی الجملہ یہی توجیہ ملتی ہے. شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

والسبب المقتضی لهذا	اور اس ارشاد کا موجب یہ تھا کہ وہ (دین)
اَنَّ الحق الّذی اظهرهٗ	حق جو اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
الله علی لسانِ نبیّه صلی الله	کی زبان پر ظاہر فرمایا، وہ قریش کی زبان
علیه وسلم انما جاء بلسان	میں آیا اور اُن کی عادات کے سانچے
قریش وفی عاداتهم وکان	میں رونما ہوا تھا احکام و ضوابط میں
اکثر ما تعین من المقادیر	جو حدیں اور مقداریں متعین
والحدود ما هو عندهمْ	ہوئیں وہ زیادہ تر وہی تھیں جو اُن
وکان المعدّ لکثیرٍ من الاحکام	میں معروف تھیں، اور اکثر
ما هو فیهم فهم اقوم به	احکام کا مادّہ وہی چیزیں تھیں
واکثر الناس	جو ان میں مروج تھیں۔ پس وہی

تمسکا بذلك۔ الخ	قدرتی طور پر اُس کو سب سے زیادہ
(حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم	قائم رکھنے والے اور سب سے زیادہ
ص۱۴۹ بحث خلافت)	مضبوطی سے اس کو تھامنے والے ہوسکتے تھے۔

اور اسی بات کو ایک دوسری جگہ دوسرے عنوان سے تحریر فرماتے ہوئے تو شاہ صاحب صرف ایک فقرے میں اس رمز آشنائی کا حق ادا کر گئے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

ولیس التکحل فی العینین	مصنوعی سرمگینی قدرتی سرمگینی کے
کالکحل۔	برابر نہیں ہوسکتی۔

(جلد اول ص۱۱۹۔ باب الحاجۃ الی دین
ینسخ الادیان)

ہم تو سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ نے قریش کے جن امتیازات کی طرف اشارہ کیا ہے، صرف یہی امتیازات یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ حضورؐ نے اگر اپنی خلافت کے لیے قریش کو نامزد فرمایا تو بجا فرمایا، اور اس میں نسلی و قبائلی تفریق و امتیاز کا کوئی دخل نہیں ـــــ چہ جائیکہ ہم ان تمام امتیازات کو نظر میں رکھیں جن کی تفصیل ہم نے اوپر کی!

یہ کلام اس تقدیر پر تھا کہ "الائمۃ من القریش" ایک فیصلہ و فرمان نبوی ہو! ـــــ لیکن ہمارے خیال میں اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فرمان نہیں بلکہ الٰہی تقدیر و حکمت کا ایک فیصلہ تھا جو زبانِ رسالت پر ایک خاص مقصد سے جاری ہوا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے قرآن کی حسب ذیل چند آیات شاید مفید ہوں۔

۱۔ ارشاد ہوا ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ	اور جب آزمایا ابراہیم کو اُس کے رب نے چند
بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي	باتوں سے اور اس نے پورا کیا ان باتوں کو،
جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ	تو فرمایا پروردگار نے کہ میں کروں گا تجھ کو

وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ
عَهْدِي الظَّالِمِينَ ٥
(البقرہ ع ۱۵)

لوگوں کا پیشوا ۔۔۔ کہا اور میری اولاد میں
سے بھی ! فرمایا نہیں پہونچتا ہے میرا
قرار ظالموں کو۔

۲۔ اس کے بعد متصلاً ہی حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی ایک دُعا شروع ہوتی ہے، جو کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے ان بزرگوں کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ٥ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا
أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ
رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ ۔ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ٥
(ایضاً)

اے رب ہمارے قبول فرما ہم سے بیشک تو
سننے اور جاننے والا ہے ۔۔۔ اور اے
رب ہمارے رکھ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
اور ہماری اولاد میں سے بھی بنا، ایک امت اپنی
فرمانبردار اور بتا ہم کو ہماری عبادت کے
طریقے۔ اور معاف فرما (ہمارے گناہوں کو)
کہ تو بڑا معاف فرمانے والا رحیم ہے۔ اور
اے رب تو اٹھا ان میں سے ایک رسول
انھیں میں کا کہ پڑھتا ہو اُن پر تیری آیتیں اور
سکھائے ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں اور
سنوارے اُن کے ظاہر و باطن کو۔ بیشک تو
بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

۳۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ
فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۔ مِلَّةَ
أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ
الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا

اور محنت کرو اللہ کی راہ میں جیسا حق ہو
اس کی راہ میں محنت کا۔ اُس نے پسند فرمایا
ہو تم کو ۔۔۔ اور نہیں رکھی ہو تمھارے
اوپر کوئی تنگی اور دقت دین میں۔ ملت
ہو تمھارے باپ ابراہیم کی۔ اسی نے رکھا

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ	تمہارا نام "مسلمین" پہلے بھی اور اس کتاب میں
وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ	بھی ——— کہ شہادت دینے والا ہو رسول
(الحج۔ ع ۹)	تمہارے اوپر اور تم ہو شہادت ساری
	دنیا پر۔

ان آیات میں معنوی لحاظ سے جو باہم ربط نظر آتا ہے، اُس کے پیش نظر اگر ہم ان کے مضامین کو ایک ترتیب میں پرو کر بیان کریں تو اس کی شکل یوں بنے گی کہ۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے خوش ہو کر فرمایا کہ

"میں بناؤں گا تجھے لوگوں کا پیشوا!"

(ب) اس پر حضرت ابراہیم نے عرض کی کہ

"اور میری اولاد میں سے بھی!"

(ج) جواب ملا کہ ——— ہاں یہ ہو سکتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ

"میرے قول و قرار میں ظالم (نا فرمان) ہرگز نہیں داخل ہو سکتے ہیں"

گویا یہ فیصلہ ہو گیا کہ اولاد ابراہیم میں جو فرماں بردار ہوں گے وہ اس امامت کے وارث ہوں گے۔

(د) اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی امامت کا نشان خانۂ کعبہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل سے تیار کرایا تو ان بزرگوں نے اس خدمت کی قبولیت کی دعا مانگتے ہوئے جناب باری میں درخواست پیش کی کہ۔

"اے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار رکھ ——— اور ہماری اولاد میں بھی ایک اُمت اپنی فرماں بردار بنا! ——— اور اپنا ایک رسول اُنھیں میں سے اُٹھا جو انھیں تعلیم دے اور اُن کا تزکیہ کرے!"

(ہ) اب جب وہ رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکر میں مبعوث ہو جاتا ہے۔ اور ان میں تعلیم و تزکیہ کا کام کر کے انھیں "اُمتِ مسلمہ" بنا لیتا ہے" اور ان کے ذریعہ دوسرے بھی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو کر اُمتِ مسلمہ کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس اُمتِ مسلمہ سے

خطاب کرکے فرماتا ہے۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو پھیلانے میں محنت کا حق ادا کرو۔ اس لیے کہ اللہ نے تمھیں کو اس منصب کی سعادت کے لیے منتخب فرمایا ہو کہ اللہ کا رسول تم پر اس دین کی شہادت ادا کرے۔ اور تم باقی ساری دُنیا پر شاہدِ حق بنو"

کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب میں اس وقت کے تمام فیض یافتگان نبوی آجاتے ہیں مگر اس بیچ میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔	اور نہیں رکھی اس نے تمھارے اوپر دین میں کوئی تنگی اور دقت۔ ملت ہے تمھارے باپ ابراہیم ہی کی۔ تو! اسی نے رکھا تمھارا نام مسلمین۔

——— یہ ابراہیم و اسمٰعیل کی اس دعا کو یاد دلاتا ہے جس میں فرمایا گیا تھا "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" اور پھر اس کا سلسلہ اس عہدِ الٰہی سے جُڑ جاتا ہو جس میں نسلِ اسمٰعیلی کی "اُمّتِ مسلمہ" کے لیے امامت و پیشوائی کا فیصلہ پنہاں تھا۔ اس طرح اس سے یہ بات نکلتی ہو (واللہ اعلم بالصواب) کہ گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم (امام العالمین) کی نیابت مجموعی طور پر ان سبھی مخاطبین کا حصہ ہو۔ مگر اس نیابت کا مظہرِ کامل خاص نسلِ اسمٰعیلی کے "مسلمین" ہی ہیں¹۔ جو قدرتی طور پر "ابیکم" کا اوّلین مخاطب اور "سمّٰکم المسلمین" کا اوّلین مصداق بنتے ہیں۔

یہ عمومی نیابت کی بات ہوئی جو "لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ" کے بعد "وتکونوا شھداء علی الناس" سے مستفاد ہوتی ہو۔ لیکن جب اس نیابت کا ایک خاص مظہر اسلام کی اصطلاحی امامت و خلافت بھی قرار پائی جو ظاہر ہو کہ کسی خاص شخص ہی میں مرکوز ہو کر وجود پذیر ہو سکتی ہو تو بنی اسمٰعیل کے لیے ثابت شدہ تمام امتیازات کا بدرجۂ اتم جامع ہوتے بلکہ ان کے مابین کچھ مزید امتیازات کا بھی حامل ہونے کی بنا پر (جن کی تفصیل ہم کر چکے ہیں)

---

¹ اور اس کے عقلی وجوہ بنی اسمٰعیل کے وہبی امتیازات ہیں جو حکمتِ الٰہیہ نے بنی اسمٰعیل کے حصہ میں ڈال دیے تھے۔

اُن کی قریشی شاخ ہی ہوسکتی تھی جس کے افراد میں یہ اصطلاحی "امامت و خلافت" مرکوز ہو کر وجود پذیر ہونی چاہیے تھی۔ اور استحقاق سے قطع نظر عملاً بھی نبی اسمٰعیل کی امامت و خلافت منعقد ہونے کی کوئی شکل اس کے سوا نہ تھی کہ یہ امامت امامتِ قریش کی شکل میں منعقد ہو۔۔۔۔ پس اس نقطۂ نظر سے یہ لازم آیا کہ نبی اسمٰعیل کی عمومی امامت کا الٰہی فیصلہ عملاً امامتِ قریش کے فیصلہ کو متضمن ہو۔

بس یہی معنیٰ ہیں ہمارے اس قول کے کہ "الائمۃ من قریش" جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فرمان نہیں تھا، بلکہ حقیقتاً یہ الٰہی تقدیر و حکمت کا ایک فیصلہ تھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر اس مقصد سے جاری ہوا کہ ایک طرف لوگوں کو بتا دیں کہ

لا یعادیھم (ای قریشاً) اَحَدٌ اِلّاَ کبّہٗ اللہ علی وجہہٖ

(اس معاملہ میں قریش سے کوئی منازعت نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ اس کو منھ کے بل گرا دے گا)

اور دوسری طرف خاص قریش کو جتا دیں کہ

یہ منصب قرشیت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے کہ قریش ہمیشہ قریش رہیں گے تو ہمیشہ ائمہ دین بھی رہیں گے، بلکہ یہ اقتبایت "ما اقاموا الدین" کی شرط کے ساتھ مشروط اور اس خاص زمانی قید کے ساتھ مقید و محدود ہے۔

چنانچہ آپ نے اور کھول کر فرمایا

فمن لم یفعل ذٰلک مِنھم فعلیہ لعنۃ اللہ وَالملائکۃ والناس اجمعین

(جو ان میں سے اس سے انحراف کرے گا اس کا حصہ لعنت ہو اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور تمام بنی آدم کی!)

۔۔۔۔۔۔ اور کھول کر فرمایا

فَاذا عصیتموہ بعث الیکم من یلحاکم کما یلحیٰ ھذا القضیب

(جب تم اللہ کی حکم عدولی کروگے تو وہ تم پر ایسے لوگ مسلط کرے گا جو تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے)

تنبیہ | ہم نے شروع کے الفاظ میں بھی اشارہ کر دیا تھا اور اب پھر اسی کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اپنے خیال کے مطابق "الائمۃ من قریش" کی اصل حقیقت بتاتے ہوئے ہم نے یہ جو آیاتِ قرآنی پیش کی ہیں ان کی نوعیت استدلال کی نہیں بلکہ محض ایک ذہنی انتقال ہے۔ ورنہ ہمارے اس خیال کی اصل بنیاد تو حدیث کا سیاق اور اس کے پورے الفاظ ہیں۔

فروری ۱۹۶۵ء

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

[illegible]

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مدیر
محمد منظور نعمانی

غیر ممالک سے		ہندوستان پاکستان سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ		سالانہ چندہ (بلکہ ہندستان) ۶ر
ہوائی خریداروں سے	فی کاپی	سالانہ چندہ (بلکہ پاکستان) ۷ر
سالانہ ... ۱۵ر	آٹھ آنے	ششماہی ... ۳ر

جلد ۲۷	بابتہ جمادی الاخری ۱۳۷۹ھ مطابق جنوری ۱۹۶۰ء	شمارہ (۶)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جنوری تک دفتر میں آجانی چاہیئے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائیگا

پاکستان کے خریدار { اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ، اسٹریلین بلڈنگ، لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

تاریخ اشاعت { رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۰ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یہ تو طے ہے، اور قرآن پر جس کا ایمان ہے وہ اس بارے میں ذرا شبہ نہیں کر سکتا کہ اسلام کا چراغ کسی کی پھونکوں سے بجھ جانے والا چراغ نہیں ہے ۔ جب تک ہم دیکھتے ہیں کہ آفتاب اپنی روش پر چل رہا ہے اور کارخانۂ حیات درہم برہم نہیں ہوا ہے، ہمیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ اسلام کی زندگی بھی ابھی باقی ہے اور کوئی طاقت رہتی دنیا تک اسکی زندگی کی صلاحیت ختم نہیں کر سکتی!

اسلام کی شمع اگر گل ہونے والی ہوتی تو اس وقت ہوتی جب وفاتِ نبویؐ کی خبر پاکر قریب قریب پوا عرب اسلام کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار کر اس ارادہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اسلام کو بھی موت کے آغوش میں سلادے ـــــــ اور اس طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ایک صدیق اکبرؓ کے علاوہ کسی مسلمان میں اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں نظر آتی تھی۔ ـــــــ جب مدینہ کے چاروں طرف باغیوں کے لشکر ایک آفت کی طرح جمع ہو رہے تھے اور جب ان کی خبریں پاکر مدینے کے ساکنوں کا حال وہ ہو رہا تھا جو بارش کی کسی سرد رات میں بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک سن سن کر، لوگ کہتے ہیں کہ بھیڑوں اور بکریوں کا ہوا کرتا ہے ـــــــ اسلام کی شمعِ حیات اگر گل ہونے والی ہوتی تو یہ وقت تھا جب یہ سانحہ ہو جانا چاہئے تھا مگر یہ نہیں ہونا تھا، نہیں ہوا۔ اور اسلام اس معرکۂ موت و حیات سے اس فاتحانہ شان کے ساتھ باہر نکلا کہ اسکے دوام کا جو فیصلہ فقط صحیفۂ آسمانی میں نقش تھا وہ اس معرکہ کے بعد جریدۂ عالم پر

ثبت ہو گیا۔ چنانچہ پھر نہ یورشِ تاتار اس نقشِ ثابت کو مٹا سکی اور نہ مسیحیوں کی صلیبی یلغار اپنے نشانہ کو پا سکی۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے جس فیصلہ نے تاریخِ اسلام میں یہ معجزات دکھائے، اس فیصلہ کی ضمانت اسلام کو آج بھی حاصل ہے اور سدا حاصل رہے گی۔ اور کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا کہ اسلام ایک قصۂ ماضی بن کر رہ جائے ـــــ مگر ہاں یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا ـــــ اور قدرتی طور پر ہونا ہی چاہیئے ـــــ کہ اسلام کے ماننے والے جب اسلام کی خدمت سے انحراف کرنے لگیں یا اس سے بھی آگے بڑھ اسلام کو اپنی زندگی سے خارج کرنے لگیں تو وہ غالب سے مغلوب بلکہ ایک ایسا اجنبی اور بے وقعت نظامِ حیات ہو جائے کہ جیسے دنیا میں کبھی اسکی کوئی آواز ہی نہیں تھی یا جیسے وہ بالکل ایک خارج از بحث امر ہے ـــــ اسلئے کہ اسلام کوئی خلا میں برپا ہونے والی چیز نہیں ہے، وہ انسانی زندگیوں میں ظہور پاتا ہے اور بظاہر اسباب انسانی کوششوں ہی کے ذریعہ بامِ عروج پر پہنچتا ہے۔

آج یہی صورت حال پیدا ہے کہ، اسلام کی طرف منسوب ہو کر مسلمان کہلانے والے نہ صرف اسلام کی خدمت اور اسکی راہ میں جد و جہد سے، وسیع پیمانہ پر، دستکش ہو چکے ہیں، بلکہ علاوہ عوام کی اس کثیر تعداد کے جو غفلت اور بے علمی کی وجہ سے عملاً اسلام سے بیگانہ نظر آتی ہے، ایک بڑی تعداد تو ایسی ہے جو وقت کے لادینی نظریات سے متأثر ہو کر اسلامی عقائد میں متزلزل ہو چکی ہے۔ پھر ایک خاصی تعداد ایسی ہے جو لادینی نظریات سے اس درجہ متأثر ہو چکی ہے کہ اسلامی عقائد سے بالکلیہ رشتہ کاٹ کر لادینی محاذ کی خیمہ برداری پر مطمئن ہو چکی ہے، اور ایک تعداد ایسی بھی ہے جو اسلام سے بیزاری کا اظہار تو نہیں کرتی مگر یا تو حقیقتاً اسکے اندر بیزاری ہے جس کی وجہ سے اس کا رویہ اسلام کش ہے۔ یا مفادات و اغراض کی پرستش ہے جو اس طبقہ کو ایسا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

اور یا نہ ذاتی اغراض ہیں نہ اسلام سے کوئی عناد و بیزاری بلکہ مسئلہ اس طبقہ کے سامنے صرف قومی مفاد اور قومی بھلائی کا ہے اور اس نقطۂ نظر سے وہ بدقسمتی سے بہت سی ایسی ہی باتوں کو مناسب سمجھتا ہے جو اسلام کے خلاف پڑجاتی ہیں ــــــــ یہی صورت حال ہے جس کی وجہ سے آج اسلام غالب کے بجائے مغلوب اور ایک ایسا اجنبی اور ناقابل التفات نظام حیات بنا ہوا ہے کہ جیسے دنیا نے کبھی اسکی برکتوں کا تجربہ ہی نہیں کیا، اور کبھی یہ ثابت ہی نہیں ہوا کہ زندگی کا فطری نظام، بس اسلامی نظام ہے۔

اللہ اللہ! کیا وقت اسلام پر آکر پڑا ہے کہ دنیائے اسلام کے قلب و جگر ـــــ عرب ــــــ میں عربوں کو عربیت اور قومیت کا وہ نشہ پلایا جا رہا ہے جس میں انھیں محمد رسول اللہ اور ابوجہل و ابولہب (اعداء اللہ) یکساں طور پر قابل تعظیم نظر آتے ہیں۔ یہ تحریک شام سے اٹھی تھی، اور جو پارٹی اسکی خدمت کیلئے وجود میں آئی تھی اسکے دستور میں کہا گیا تھا کہ

> "عرب قوم بلحاظ روح و ثقافت ایک اکائی ہے۔ اور اسکے افراد کے درمیان کی تمام موجودہ تفریقات محض عارضی ہیں، جو عربیت کے شعور کی بیداری سے خود بخود زائل ہو جائیں گی"[1]

اسی فکر کا منحوس سایہ جب اتحاد عربیت کے داعی مصری رہنما جمال عبدالناصر پر پڑا تو انھیں فراعنۂ مصر سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کوئی باک نہیں محسوس ہوا اور انکی زبان سے بے محابا سنایا گیا کہ:-

"نحنُ ابناءُ الفراعنة"

ہم فراعنہ کی اولاد ہیں

اور کچھ دن بعد ایک مصری چوک میں دیکھا گیا کہ ایک فرعون کا مجسمہ نصب ہو گیا۔

---

[1] اصل عبارت یہ ہے:- الامة العربية وحدة روحية وثقافية، وجميع الفوارق القائمة بين ابنائها عرضية زائفة، تزول بيقظة الوجدان العربي۔

اب یہی لے بڑھکر اس نقطے پر پہنچی ہے کہ

"ابوجہل و ابولہب وغیرہ کی یادگاریں قائم کی جانی چاہئیں"[1]

اس لئے کہ ان کا ایک تاریخی کردار ہے ـــــ اور وہ یہ کہ

"پیغمبر اسلام عرب تاریخ کے ایک ہیرو تھے۔ اُن کے مخالف سردارانِ قریش اگرچہ رجعت پسندانہ طرزِ فکر کے نمائندے تھے۔ مگر اپوزیشن کی حیثیت سے انھوں نے جو پارٹ ادا کیا اسکی بھی ایک تاریخی اہمیت ہے"

ہمارے درمیان کچھ موقر اشخاص تھے جو عرب قومیت کا نعرہ سنتے ہی چونک گئے تھے اور اس وقت سے وہ برابر اس تحریک کی رفتار پر نظر جمائے ہوئے تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ان کے دل اس تحریک کی نفرت سے کھٹکے ہوئے ہیں۔ ان سے اس طرح بے چینی نمایاں ہوتی تھی جیسے دنیائے اسلام سے کوئی بڑی مصیبت اٹھ رہی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اسلام کے خلاف ایک بغاوت اور ایک نیا ارتداد ہے ـــــ ہم سمجھتے تھے کہ یہ اُن کے تأثر کا مبالغہ اور احساس کی ضرورت سے زیادہ تیزی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس تحریک سے اسلام کی نفی نہیں لازم آتی اس کا رخ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ استعمار کے خلاف ہے ـــــ مگر ہمیں شہادت دینی چاہیئے کہ ہم نے غلط سمجھا تھا اور ان بزرگوں کی بصیرت نے صحیح انکشاف کیا تھا جو اس تحریک میں ایک نئی ارتدادی لہر دیکھ رہے تھے، بے شک یہ ایک نئی قسم کی ارتدادی لہر ہے جو پرانے قسم کے تمام ارتدادی طوفانوں سے زیادہ ہلاکت خیز ہے، جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار نہیں کیا جاتا بلکہ آپ کو "عرب تاریخ کا ایک ہیرو" ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ جس کی شجاعت و سیاست سے عرب صدیوں کے لیے دنیا پر چھا گئے۔ اس کا قدرتی اور منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صنادید عرب جنھوں نے

---

[1] ۲۵ دسمبر کے روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) میں مولانا اکرم علی صاحب ملیح آبادی (مقیم مکہ مکرمہ) کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ عرب کے بعض اخبارات میں یہ تجویز آئی ہے۔

سب سے پہلے آپ کی مخالفت کا جھنڈا بلند کیا وہ اگرچہ آپ کے مقابلہ میں شکست کھا گئے لیکن اگر ان کی جنگ قدیم عرب روایات کے تحفظ کے لئے تھی، اور اس میں آن اور شان تھی، مردانگی اور بہادری تھی تو یہ لوگ بھی' بہادری کے ساتھ آن پر مرمٹنے کے لحاظ سے' عرب تاریخ کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ اور ان کے آپس کے اختلاف ونزاع سے قطع نظر" ابطالِ قومی" کی نمائش میں ان کو بھی محمد عربی کے پہلو بہ پہلو جگہ ملنی چاہیئے ـــــــ اور اس طرح قوم پرستی کا جذبہ ایک ہی دل میں محمد رسول اللہ اور ابوجہل وابولہب اعدا اللہ کی عظمت کو جمع کر دے سکتا ہے۔ جبکہ محمد رسول اللہ نے اس بات کو بھی گوارا کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اُن کی بیٹی اور ابوجہل عدوّ اللہ کی بیٹی ایک گھر میں جمع ہو جائیں!

یہ تجویز ـــــــ کہ ابوجہل وابولہب کی یادگاریں قائم کی جائیں ـــــ آج یقیناً صرف چند سرپھروں کی تجویز ہے۔ لیکن اب کچھ بعید نہیں رہا کہ یہ عملی جامہ بھی پہن لے، اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہ بھی ہو پائے تب بھی یہ' یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اور اسلام ضعف کی کس حالت میں پہنچ گیا ہے جب عرب میں یہ باتیں ہو سکتی ہیں تو پھر کہاں نہیں ہو سکتیں۔ اور کیونکر اطمینان کیا جا سکتا ہے! ـــــــ کیا ہم اس پر راضی ہیں کہ اسلام کے ضعف کے یہ نتائج ہمارے سامنے آئیں؟ اگر نہیں راضی ہیں۔ اور یقیناً نہیں راضی ہوں گے، تو ہم میں سے جس جس کو ایسے وقت کا آنا ناپسند ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ وقت دیکھنے کے لئے راضی نہیں ہے، اُس کا فرض ہے کہ اسلام کی نصرت وحمایت کے لیے کھڑا ہو جائے! ـــــــ جس وقت ابوجہل وابولہب اور ان کے اعوان وانصار اپنے زندہ وجود کے ساتھ اسلام سے برسرپیکار تھے، قرآن نے ندا دی تھی:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ ـ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ!	اے ایمان لانے والو! ہو جاؤ اللہ کے (دین کے) مددگار۔ جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہ کون ہے تم میں سے راہِ خدا میں میرا مددگار!

——— آج جبکہ ابوجہل وابولہب اور اُن کے ساتھ دفن کی جانے والی جاہلیت کو قومیت کا صور پھونک کر از سر نو زندہ کیا جا رہا ہے اسلام پھر اپنے وفاداروں کو اسی آواز میں پکار رہا ہے اور اپنے پیغمبر کا یہ ارشاد اسکے ہر نام لیوا کو یاد دلا رہا ہے

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِيْباً وَسَيَعُوْدُ　　اسلام کا دور اول غربت وکس مپرسی کا تھا

كَمَا بَدَءَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ　　ایک زمانہ آئے گا کہ اسلام پھر اسی حالت

میں لوٹ آئے گا۔ پس بشارت ہے ان کے لیے جو اسلام کی خاطر اسکے شریک حال ہو جائیں۔

قومیت کا یہ فتنہ ہو یا عصر حاضر کے دوسرے لادینی فتنے، ان سب کو اٹھانے والے اور انکو پھیلانے والے ہمارے مغرب زدہ افراد ہیں۔ اسلئے انکا مقابلہ، یوں تو ہم سب کو اپنی اپنی حد تک کرنا ہے مگر خاص طور پر یہ فکری معرکہ سر کرنے کی ذمہ داری ملت اسلامیہ کے ان صاحب ایمان افراد پر عائد ہوتی ہے جو جدید علوم میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اس معرکہ کو لڑنے کے سب سے زیادہ اہل وہی لوگ ہیں، انھیں کے پاس وہ ہتھیار ہیں جن سے باغی گروہ مسلح ہے اور وہی ان کے ہر ہر وار کا پوری طرح جواب دے سکتے ہیں ——— کیا وہ لوگ اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض سمجھیں گے؟ اور فکر فردا سے بے نیاز ہو کر اس معرکے میں اُتریں گے؟

بے شک اس طبقے کے بہت سے خوش نصیب ہیں جو اپنا فرض پہچان رہے ہیں مگر اس وقت ضرورت ایک فوج کی ہے جو اپنی ساری قوتیں اس معرکہ کی نذر کر دے۔ جو ایک سیلاب بن کر اُمنڈے اور سیل بغاوت کا منہ پھیر دے۔ ملت اسلامیہ بڑی وسیع ہے جب تک اس کے محافظوں کی ایک فوج کی فوج نہ ہوگی، غارتگروں کی غارتگری کا سدباب نہیں ہو سکتا۔

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ　　سمجھ لو! کہ تم میں کا ہر ایک نگراں ہے۔ اور

عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔　　ہر ایک اپنے دائرہ نگرانی کا جوابدہ!

خریداران الفرقان کی خدمت میں

دو گزارشیں

۱۔ نومبر اور دسمبر کا الفرقان ۱۵۔ ۱۵ دن کی تاخیر سے شائع ہوا جس سے خریداران کرام کو بہت تکلیف پہنچی۔ یہ دراصل بالکل مجبوری اور بے بسی کی بات تھی جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، تاہم ہم اپنے خریداروں سے معذرت خواہ ہیں ——— تاخیر تو جو کچھ بھی ہوئی لیکن رسالہ دونوں ماہ تمام خریداروں کو بھیجا گیا ہے جن کو نہ پہنچا ہو وہ دوبارہ طلب فرمالیں۔

جنوری کا یہ شمارہ خدا کے فضل سے وقت پر شائع ہو رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ آئندہ بھی پابندی وقت برقرار رہے گی۔

۲۔ بہت سے خریدار اسلامی مہینوں کے لحاظ سے محسوس کرتے ہیں کہ الفرقان ایک ماہ لیٹ چل رہا ہے، اور اس پر انہیں شکایت ہوتی ہے، لیکن یہ دراصل کوئی قابل شکایت بات نہیں ہے الفرقان کی اشاعت دراصل اسلامی مہینوں کے حساب سے شروع ہوئی تھی۔ اور اسلامی سال ہی پر اس کی ایک جلد تمام ہوتی ہے۔ اسی لئے عربی مہینے رسالہ پر درج کئے جاتے ہیں ——— لیکن رسالہ کی اشاعت ڈاکخانہ کے قواعد کے لحاظ سے انگریزی مہینوں کے حساب سے ہونا ضروری۔ اور سب جانتے ہیں کہ انگریزی اور اسلامی سال کے درمیان ہر تین سال بعد مہینوں کی مطابقت بدل جاتی ہے۔ اس لیے یہ محسوس ہوتا ہے کہ الفرقان لیٹ ہے۔ مگر وہ دراصل لیٹ نہیں ہوتا، خریداروں کو چاہیئے کہ وہ انگریزی مہینوں کو پیش نظر رکھیں ———

خطبۂ صدارت

صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس بستی (یوپی)

منعقدہ ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء و یکم جنوری ۱۹۶۰ء

(از، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

حضرات! ـــــــــــــــ

ایک سپاہی و رضاکار کے لئے اگر ایسے اعزاز و منصب کے قبول کرنے کے لیے جو آپ اپنے اس رفیق کو عطا فرما رہے ہیں، کوئی جواز ہو سکتا ہے، تو صرف یہ کہ اس کو اسکے ذریعہ اپنی آواز کے زیادہ وسیع اور اپنی دعوت کے زیادہ وسیع بننے کی توقع ہو، یہ توقع بعض اوقات بعض جسارتوں کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتی ہے، اس توقع پر اسلامی معاشرہ کا ایک معمولی فرد خانۂ خدا کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ کر اذان دینے کی جرأت کرتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کا حُسنِ التفات اور میری مخلصانہ گذارشات اس جسارت کے لیے جو میری زندگی کا ایک اتفاقی واقعہ ہے، وجہ جواز بن جائے گی۔

ع　اُمید ہست کہ بیگانگیٔ عرفی را
　　بدوستی سخنہائے آشنا بخشد

حضرات! آپ معاف فرمائیں، مجھے کہانی ذرا دور سے شروع کرنی ہوگی، ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جد و جہد کرنے کا سب سے بڑا محرک اور سب سے طاقتور اور گہرا جذبہ یہ تھا کہ اس غیر ملکی اقتدار کی موجودگی میں وہ فضا اور ماحول میسر نہیں، جس میں ہندوستانی اپنے اپنے عقیدہ اپنے اپنے جذبات و روایات اور اپنی قومی خصوصیات کے ساتھ نشو ونما اور ترقی حاصل کر سکیں اور انکی آئندہ نسلیں اپنے عقیدہ، مسلکِ زندگی اور قومی مزاج کی حامل ہوں، اور انکی نہ صرف معاشی و مادی، بلکہ روحانی اخلاقی اور ذہنی امنگیں پوری ہو سکیں، جو زندگی کی حقیقی لذت اور آزادی کا صحیح انعام ہیں، انگریزی حکومت نے اگرچہ براہِ راست اس ملک کی آبادی کے عقیدہ اور تہذیب و معاشرت میں مداخلت نہیں کی تھی، اسکا نصابِ تعلیم

بھی غیر دینی اور سیکولر تھا جس میں کسی قوم کی تہذیب، کسی دور کے فلسفے اور کسی مذہب کی الٰہیات کی تعلیم نہ تھی، اور مسیحیت کی مقدس شخصیتوں کو اس میں اجاگر نہیں کیا گیا تھا، اس دور حکومت میں آبادی کے ہر عنصر کو مذہبی آزادی حاصل تھی، اور اس کا پرسنل لا بھی محفوظ تھا، ایک بے لاگ مورخ کی حیثیت سے ہم کو ان حقائق کا اعتراف کرنا چاہیے، لیکن ان تمام ظاہری انتظامات وتحفظات کے باوجود غیر ملکی حکومت اس ماحول اور فضا کے پیدا کرنے سے بصرت قاصر تھی اس ... ارج تھی جو ایک قوم یا آبادی کے مختلف عناصر کے آزادانہ نشوونما ترقی کے لئے ضروری ہے، ایک غیر ملکی حکومت میں دراصل ان امنگوں کی تکمیل ناممکن ہے، جن کے سہارے قومیں زندہ رہتی ہیں، جن کی خاطر وہ جد وجہد کرتی ہیں اور جن کی راہ میں انکو ہر مشکل آسان، ہر تلخ شیریں اور ہر زیاں نفع معلوم ہوتا ہے، اسکی موجودگی میں اس مسلک زندگی پر قائم رہنا مشکل ہے، جو ایک صاحب شعور وصاحب مقصد قوم کو زندگی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

یہ تھا وہ احساس جس نے انگریزی حکومت سے گلوخلاصی حاصل کرنے اور ملک کو آزاد کرنے پر اُبھارا، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انکی جدوجہد کا محرک یہی جذبہ اور یہی توقع تھی، اور کسی جدوجہد میں ان کے لیے جب ہی کشش اور معنویت پیدا ہوسکتی ہے جب ان کو اسکے نتیجہ میں اپنے عقیدہ اور مسلک زندگی کی آزادی، اپنی اخلاقی قدروں کا تحفظ اور اپنی ذہنی وروحانی امنگوں کی تکمیل کا سامان نظر آئے، اسکے بغیر ایک خالص اسلامی آبادی کے ملک کی آزادی اور کسی مسلمان سلطنت کا قیام بھی ایک لفظ بے معنی اور ایک سعی لاحاصل ہے۔

جنگ آزادی کے رہنماؤں نے اس حقیقت کا بار بار اعلان کیا، اور اطمینان دلایا تھا، اور آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان کے آزاد دستور نے اس کا پورا تحفظ کیا، ہندوستان نے اپنے لئے "غیر دینی" طرز حکومت انتخاب کر کے اس فیصلہ پر مہر لگا دی، اور اعلان کر دیا، کہ اس ملک کے نظام حکومت میں کسی قسم کی مذہبی سیاسیت یا کسی قسم کا لسانی وثقافتی "سامراج" نہیں ہوگا، یہاں ملک کے مختلف عناصر کو اپنے اپنے عقیدہ ومسلک کی نہ صرف آزادی حاصل ہوگی، بلکہ اسکے مطابق اس کو نشوونما حاصل کرنے اور اپنی آئندہ نسلوں کو تربیت دینے کی آزادی

مواقع بھی حاصل ہوں گے، یہاں کوئی ایسا ماحول قائم نہیں ہونے دیا جائے گا جس میں ملک کی آبادی کا کوئی عنصر یہ محسوس کرے کہ وہ کسی دوسرے عنصر کے زیر اقتدار ہے، اور جس سے اسکو اپنی ذلت و غلامی کا احساس ہو، اور وہ یہ سمجھے کہ وہ اس ملک کے نظم و نسق میں برابر کا شریک نہیں، یہاں کوئی ایسا نظام تعلیم نافذ نہیں ہوگا، جس سے کسی فرقہ یا جماعت کے عقائد و جذبات کو ٹھیس لگتی ہو، اسکی فکری اور اعتقادی بنیادیں متزلزل ہوں، اور اسکے بنیادی معتقدات و مسلمات سے تصادم ہوتا ہو، یہاں آبادی کے کسی ایک عنصر (خواہ وہ کتنا بڑا اور اہم عنصر ہو) کے مقدسات و اعتقادات اور فلسفہ کو معیار بنا کر دوسرے عناصر پر مسلط نہیں کیا جائے گا، یہاں حکومت کی سطح اور پیمانہ پر کوئی ایسا علمی کام یا ادارہ کا قیام نہیں ہوگا جس سے صرف ایک عنصر کی قومی خود داری کو تقویت ہو، اور دوسرے عناصر اس سے یہ محسوس کریں کہ انھوں نے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا، اور انکا اس ملک میں کوئی کارنامہ نہیں ہے، اور اس سے ان کو اپنے ماضی سے نفرت اور مستقبل سے مایوسی ہو، اور وہ احساس کمتری کا شکار ہوں، جو ملک کی متوازن ترقی کے لیے سخت مضرت رساں ہے، غرض یہ کہ حکومت اپنے رویہ اور مسلک اور اپنے وسائل و ذرائع، اپنی اعانت و سرپرستی، اپنے نظام تعلیم اور اپنے پورے اثرات سے کام لے کر ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش کرے گی جس میں آبادی کا ہر حصہ اور ملک کا ہر فرقہ پوری خوش دلی، گرمجوشی، اعتماد و عزت نفس، قلبی اطمینان، دماغی سکون اور روحانی قوت کے ساتھ اس ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکے، اور اس کو آزادی و خود اختیاری کی ایسی فضا حاصل ہو جس میں وہ ہر قسم کی اندرونی کشاکش سے آزاد ہو کر اس ملک کو چار چاند لگائے، غیر مذہبی یا سیکولر حکومت کا لفظ اگر دیانت داری و خلوص اور ارادہ و شعور کے ساتھ بولا جاتا ہے، تو وہ اپنے ساتھ یہ سارے لوازم و شرائط رکھتا ہے، اور اس سے یہ خوشگوار نتائج نکلنے ضروری ہیں۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کو ایک ایسی صورت حال سے سابقہ پڑا جس کی قطعاً توقع نہ تھی، اور جو اس ملک کے حالات اور دستور سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتی، یہاں بعض ریاستوں میں ایک ایسا نصاب تعلیم جاری کیا گیا جس میں کھلے طریقے پر ایسے مذہبی تصورات اور روایات کی نمائندگی ہے، جس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی حس مجروح ہوتی ہے، بلکہ وہ

ان کے بنیادی اعتقادات و مسلمات سے متصادم ہے، اس فلسفہ و مذہبی تصورات و روایات کو ہم ہندو علم الاصنام یا ہندو میتھالوجی کے علاوہ کسی لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کر سکتے، ہم سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی اور ان کا پورا نظام فکر عقیدۂ توحید پر قائم ہے، خدا کی ذات و صفات کا وہ تصور جو پیغمبروں نے تعلیم کیا، کائنات و مخلوقات کے متعلق وہ عقیدہ جو ان کو خدا کا مخلوق و مملوک اور اس کائنات کے نظم و نسق میں بے اختیار اور غیر موثر بتاتا ہے، خدا کی تنزیہ و تقدیس، اس کا بے چون و بے چگوں ہونا، ہر قسم کے حلول و اتحاد سے پاک ہونا، پیغمبروں کا خاص تصور انکی بندگی و بشریت کا عقیدہ، مخلوق کا خالق سے جدا ہونا، غرض ساری اسلامی دینیات اور نظامِ عقائد اس سے نہ صرف مختلف، بلکہ متصادم ہے، جو ہماری ہندی اُردو نصاب کی کتابوں میں مختلف کہانیوں مذہبی شخصیتوں کے تعارف اور اخلاقی اسباق میں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرات!

آپکے علم و معلومات پر کسی قسم کی بے اعتمادی کے بغیر میں ضروری سمجھتا ہوں، کہ کم سے کم اس نصاب کے کسی ایک جز اور مرحلہ کی چند جھلکیاں پیش کر دوں جس سے آپ میں وہ حضرات جو محکمۂ تعلیم اور اسکے نصاب و نظام سے قریبی اور عملی تعلق نہیں رکھتے اندازہ کر سکیں، کہ اچانک اس ملک کے مسلمان اور آبادی کے دوسرے عناصر جو اپنا خاص عقیدہ و مسلک رکھتے ہیں کیسی نازک صورت سے دوچار ہو گئے ہیں۔

ہم اس نمونہ کے لئے بیسک ریڈروں کو انتخاب کرتے ہیں، جن میں قدرتی طور پر بنیادی باتیں عام انسانیت یا نیچرل سائنس کے متعلق ہونی چاہئیں، اسلئے کہ ان کے ذریعہ سے کمسن بچہ کا علمی و شعوری طور پر اپنی گرد و پیش کی دُنیا سے پہلا تعارف ہوتا ہے، مگر کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بالکل لحاظ نہیں کیا گیا، ان کے مضامین سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ ایک مخصوص مذہب کے عقائد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

بیسک ریڈر نمبر ۳ پہلے دُعا سے شروع ہوتی ہے، کتاب کے دوسرے سبق کا عنوان ہے، "سعادت مند لڑکا گنیش"۔ اس میں گنیش جی کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، اس سبق میں گنیش جی کو ایک تاریخی انسان کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک دیوتا کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، سبق

اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"ہندوستان کی پرانی کہانیوں میں ایک کہانی بہت دلچسپ ہے، کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں دیوتاؤں کی ایک مجلس میں یہ سوال ہوا کہ اچھے کاموں میں کس دیوتا کی سب سے پہلے پرستش ہونی چاہیئے، سب دیوتا اپنی اپنی پرستش پہلے چاہتے تھے، اس لیے آپس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، برہما سب سے بڑے دیوتا تھے، اسلئے سب دیوتا انکی بات مانتے تھے۔ برہما نے سب دیوتاؤں کی بات سن کر کہا:۔ جو دیوتا زمین کا چکر سب سے پہلے لگا آئے گا اسی کی پرستش سب سے پہلے ہوا کرے گی۔ پھر کیا تھا، سب دیوتا اپنی اپنی سواریاں لے کر تیزی سے دوڑے، اندرا اپنے اراوت ہاتھی پر، سورج اپنے رتھ پر اور کمار اپنے مور پر"

اس عبارت سے اندازہ ہو جائے گا، کہ کیسی تعلیم دی جارہی ہے یا پوجا سکھائی جارہی ہے سبق کے آخر میں بچوں کے لیے سوالات ہیں، اس میں پہلا سوال یہ ہے:۔ "گنیش جی کی پرستش سب سے پہلے کیوں ہوتی ہے؟"

کتاب کا چوتھا سبق ہے:۔ "پرمود گاؤں میں" اس سبق کا آخری پیراگراف یہ ہے:۔

"پرمود کے ساتھی اسے گاؤں کے ان مقامات پر بھی لے گئے، جہاں گاؤں کے رہنے والے صبح شام پوجا کرتے، بھجن گاتے، اور کیرتن کرتے تھے، پرمود نے دیکھا کہ گاؤں کے چاروں طرف چار مندر ہیں، ایک میں شیو جی کی مورت ہے اور دوسرے میں سیتا رام کی، تیسرے میں رادھا کرشن کی مورت ہے، اور چوتھے میں ہنومان جی کی، اس گاؤں میں ایک مسجد بھی دیکھی (اس مسجد میں کیا ہوتا تھا، اس کا کوئی تذکرہ نہیں) پرمود عبادت کی ان جگہوں پر جاتا، اور وہاں اچھی اچھی باتیں سنکر بہت خوش ہوتا، مندر کا پجاری اسے تبرک دیتا، اور وہ تبرک پاکر خوش خوش گھر لوٹ آتا"

اسکے بعد پرہلاد، بہادر ابھیمنو، دھرو وغیرہ کے قصے، مہابھارت اور رامائن کی کہانی ہے، پرہلاد اور دھرو کے تاریخی واقعات نہیں ہیں، بلکہ ہندو میتھالوجی درج ہے۔

اسی طرح بیباک ریڈر نمبر ۴ کا پانچواں سبق ملاحظہ ہو، اس کا عنوان ہے :۔ " بھارت کے تین سنت " اسکے صفحہ ۱۹ پر ہے :۔

" ایسے ہی سنت مہاپربھو چیتنیہ دیو بھی تھے، ان کی پیدائش بنگال میں ندیا نامی گاؤں میں ہوئی تھی، وہ سری کرشن کے بڑے بھگت تھے، ان کے کیرتن اور نصیحتوں میں بڑی دلکشی تھی، ایک دن جب چیتنیہ دیو نصیحت کر رہے تھے، دو آدمیوں نے انھیں گھڑے کے ٹکڑوں سے مارا، ان کا سر پھٹ گیا، اور خون کی دھار بہنے لگی، لیکن انھیں غصہ نہیں آیا، وہ پیار کے ساتھ آگے بڑھے، اور ان دونوں کو گلے سے لگا کر کہا :۔ تم لوگ تو سب سے زیادہ رحم اور نصیحت کے مستحق ہو، کیوں کہ دوسروں کی نسبت تم لوگوں کو اسکی زیادہ ضرورت ہے۔ چیتنیہ دیو کا پریم دیکھ کر یہ دونوں جو مسلمان تھے ان کے قدموں پر گر پڑے، اور ان کے چیلے ہو گئے۔ "

اس " معصوم " کہانی میں ایک مسلمان کا جو کردار دکھایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ بچوں کے ذہن میں ان کا کیا تخیل پیدا کرے گا، اور باہمی الفت و اعتماد کا باعث ہوگا، یا نفرت وخوف کا، اسی کتاب میں مہارانا پرتاپ کا تذکرہ و تعارف جس انداز سے کرایا گیا ہے، اس سے نہ صرف ان کی عظمت اور حب الوطنی، بلکہ مغلوں کی حقارت، ان کی بزدلی اور ان کی ملک دشمنی ثابت ہوتی ہے۔

بیباک ریڈر نمبر ۵ کا دوسرا سبق جس کا عنوان " گنگا " ہے، پہلے پیراگراف میں ہے :۔

" بھارت کے لوگ گنگا کو بہت مقدس مانتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ گنگا وشنو بھگوان کے پیروں سے نکل کر شیو جی کی جٹا میں، اور پھر وہاں سے ہمالیہ پہاڑ پر آئی، برہما نے راجہ بھاگیرتھ کی عبادت سے خوش ہو کر ہر جاندار کی نجات کے لیے گنگا کو زمین پر بھیجا، یہ مانا جاتا ہے کہ گنگا لوگوں کے گناہوں کو دھو دیتی ہے۔ "

ظاہر ہے کہ یہ خالص ہندو عقیدہ کی تعلیم ہے، جس کو ایک ایسے نصابِ تعلیم میں جس کو مختلف مذاہب کے بچے پڑھنے پر مجبور رہیں، لکھنا نا روا اور نا مناسب ہے۔

درجہ ۶ سے درجہ ۸ تک کتابوں کا ایک خاص سلسلہ جس کا نام " ہمارے پورورج" (رہنمائے اسلاف) ہے' پڑھایا جاتا ہے، اس میں بھی ایک مخصوص مذہب کے نامور اشخاص کے حالات درج ہیں ان کتابوں میں کہیں بھی حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور دیگر اکابر اور مسلمان مشاہیر ہند کے قصے نہیں ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی سرزمین میں انسانیت اور روحانیت کو بلند کیا، اکبر اور دارا شکوہ کو بھی اس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اور ان کے متعلق ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن سے ایک غیر متعصب مؤرخ اور محقق کو اتفاق نہیں ہو سکتا۔

اس صورت حال کے دو قدرتی نتیجے ہیں، یا تو مسلمان بچہ ان سبقوں اور واقعات کو یقین کرتا ہوا پڑھے، جس کی ایک کمسن بچے سے توقع ہے، اور جو ایک نصاب تعلیم کا فطری حق ہے اور اُستادوں کی کامیابی کی شرط ہے، اس کا اسکے سوا کوئی نتیجہ نہیں، کہ وہ اپنے معاشرے سے منقطع اور اپنے مذہب سے منحرف ہو جائے، ظاہر ہے کہ مسلمان اپنی آئندہ نسل کے اس ذہنی و دینی ارتداد کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتے، وہ اگر کسی معنیٰ میں بھی مسلمان ہیں، تو جہالت و ناخواندگی کو ایسے علم پر' اور فقر و افلاس کو ایسی معاشی ترقی پر ہزار بار ترجیح دیں گے، جس کے لیے یہ ارتداد ضروری ہو۔

دوسرا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بچہ اپنے گھر کی تربیت' اپنے والدین کی تلقین، کسی خارجی تعلیم کے اثر، یا اپنی فطرت سلیم سے ان تعلیمات و واقعات کو جو اس کو اسکے مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں غلط، خلافِ واقعہ اور مضحکہ انگیز سمجھے، تو یہ اگرچہ اسکے مذہب کی قوت اور اسکی فطرت کی سلامتی کی بڑی دلیل ہے، مگر ایک نظام تعلیم کی بڑی ناکامیابی ہے کہ وہ بچہ کے اندر یقین و اعتماد پیدا نہیں کر سکتا، اور اسکو ذہنی کش مکش میں مبتلا کرتا ہے، کسی حکومت اور محکمہ تعلیم کے لیے یہ جائز نہیں، کہ وہ مال اور وقت کو اس طرح ضائع کرے۔

ایک ایسی قوم جو کسی ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہے، جو مساویانہ طریقہ پر حکومت کے ٹیکس ادا کرتی ہے، جو اس ملک کی قوت و عسکر کا ایک اہم عنصر ہے' اور

جس سے اسکے سکولر ملک ہونے کی لاج قائم ہے، اس کا اخلاقی و فطری حق رکھتی ہے کہ اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرے، اور ملک میں رائے عامہ کو اس ناانصافی کے خلاف بیدار و منظم کرے، اس ملک کے ساتھ بہت بڑی وفاداری اور صحیح حب الوطنی یہ ہے کہ اس مصنوعی صورت حال کو جو بعض ریاستوں کی غلط اندیشی سے قائم ہوگئی ہے، اور جو ملک میں ایک دماغی بے چینی اور ذہنی انتشار و کشمکش پیدا کر رہی ہے، جلد تبدیل کیا جائے، مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سنجیدہ و معقول طریقے پر یہ مطالبہ کیا جائے گا، اور اسکو سیاسی اغراض کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا، تو ملک کے ہر محب وطن اور ہر معقولیت پسند انسان کو اس سے ہمدردی ہوگی، اور جو مخلص و سنجیدہ جماعت اس کو لے کر کھڑی ہوگی، اسکو بلا تفریق مذہب و ملت پورے ملک کی اخلاقی تائید اور ہمدردی حاصل ہوگی۔

حضرات!

اس ملک کا ضمیر زندہ اور بیدار ہے، اس نے مختلف مواقع پر اپنی اخلاقی جرأت و معقولیت کا ثبوت دیا ہے، لیکن ہمیں اس واقعہ کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہم ابھی تک معاملہ کی سنگینی ذہن نشین نہیں کر سکے ہیں، اور ہم نے رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے (جو کسی ملک کی سب سے بڑی طاقت اور درحقیقت اقتدار اعلیٰ ہے) کوئی کام نہیں کیا ہے، اگر خدانخواستہ اس ملک کے کسی حصہ میں آبادی کے کسی عنصر پر بلا وجہ دست درازی ہوتی ہو، اور کوئی شریف آدمی اپنی عزت و ناموس کو وہاں محفوظ نہ پا سکے، تو کیا اس کا امکان ہے کہ عرصہ تک یہ صورت حال قائم رہے، اور ملک کا ضمیر اسکے خلاف چیخ نہ اٹھے، اور اس ملک کی روح اسکے خلاف صف آرا نہ ہو جائے، آپ کو بتانا چاہیئے تھا کہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے زیر بحث مسئلہ اس سے زیادہ اہم اور معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہے، مسلمان کے نزدیک اسکے عقائد اور اس کا مسلک زندگی، اسکے جسم و جان اور اسکی عزت و ناموس سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ اگر آپ یہ ثابت اور واضح کر دینگے کہ موجودہ نصاب تعلیم ان عقائد اور ان عزیز حقائق کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا ہے، تو وہ سب آپ کی تائید کے لیے جمع ہو جائیں گے جو کسی قوم کے معابد و مقدسات اور اسکی عزت و ناموس پر حملہ برداشت نہیں کرتے، اور یقین فرمائیے کہ ان شریف النفس اور نیک طینت انسانوں کی اس ملک

میں بہت بڑی تعداد ہے اور وہی اس ملک کی قوت و عزت کا سرچشمہ ہیں۔

اگر خدانخواستہ آپ کسی وجہ سے اس اخلاقی حس اور ضمیر کو حرکت میں نہ لاسکے تو پھر آپ کے لیے ایک راستہ یہ ہے، کہ آپ اس ملک کی عدالتِ عالیہ کے انصاف کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ابھی تک واقعات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی عدالت مقامی حالات و تاثرات و قومی تعصبات سے آزاد ہے، اور ایسی اخلاقی جرأت رکھتی ہے کہ ریاستوں اور بااثر جماعتوں کے خلاف بھی اسکو اپنا فیصلہ صادر کرنے میں تامل نہیں ہوتا، ہمیں امید ہے کہ اگر ہم اپنا مطالبہ قوت اور معقولیت کے ساتھ پیش کرینگے، اور اس ملک کے دستور کے تحفظ کا مطالبہ کرینگے تو ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا، اس کا عملی طریقہ کیا ہو، اس کو آپ کی مجلسِ عاملہ یا مجلسِ شوریٰ طے کرسکتی ہے۔

حضرات!

نصابِ تعلیم اور ملک کی ثقافت و ادبیات کا ایک اور پہلو ہے، جسے ہم کو ایک دوسرے طریقے پر سوچنے کی ضرورت ہے، اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت و تہذیب کا ایک دور گزرا ہے جو چھ سات سو برس کی طویل مدت ہے، یہ ہندوستان کی تہذیب و ترقی کا ایک شاندار دور ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ سے خارج کرنا اس ملک کے ساتھ بڑی ناانصافی اور وطن دشمنی ہے۔ اس دور میں ملک کی ترقی و شادابی کے بہت سے ایسے کام ہوئے جن سے ہمارا ملک ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہے اور صدیوں تک فائدہ اٹھائے گا۔ اس زمانہ کے بہت سے نقش ایسے ہیں جو ہمارے ملک کی خوبصورتی اور ناموری کا باعث ہیں، اس دور میں سلاطین و وزراء کے حلقہ میں بھی، اور شعراء و ادباء کی محفل میں بھی، اور فقراء و صوفیاء کے دائرہ میں بھی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں، جن پر ساری دنیا اور پوری انسانیت کے سامنے اس ملک کو فخر کرنے کا حق ہے اور جن سے ساری دنیا میں اس ملک کی عظمت قائم ہے، ہم ان کی سیرت و محاسن اخلاق پیش کرکے اور ان کے کارناموں اور حالات سے نئی نسل کی تعلیم و تربیت، اسکی سیرت کی تشکیل، اور اسکے کردار کی تعمیر میں بڑی مدد لے سکتے ہیں، اور ہندوستان کی تاریخی عظمت کے دائرہ میں وسعت اور تنوع پیدا کرسکتے ہیں، دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں ان کی تاریخ ہماری

عزت و ناموری کا باعث ہو سکتی ہے، یہ ہماری قابلِ فخر ملکیت ہے جس سے ہم کو کسی طرح دست بردار نہیں ہونا چاہیئے، اس طویل انسانی تاریخ میں ہم کو کئی "تاج محل" اور "قطب مینار" ملتے ہیں جو ہمارے ملک کی سربلندی اور زیب و زینت کا باعث ہیں، اور جن کو دکھا کر ہم اپنے مدارس میں احساس جمال اور شوقِ کمال پیدا کر سکتے ہیں، یہ ہمارے ملک کے خمیر سے تیار ہوئے اور ہمارے ہی ملک کا جزو بن کر رہے ہے، علاء الدین خلجی کی بلند ہمتی اور آئین سازی، فیروز تغلق کی شرافتِ نفس اور نیک طبیعتی، شیر شاہ سوری کا بے نظیر پنج سالہ کارنامۂ حکومت اور رنگ زیب کی قوت ارادی اور قوت برداشت، محمود بیگڑہ کی انتظامی قابلیت اور رفاہ عامہ کا ذوق، مظفر حلیم کی انصاف پسندی اور پاکبازی، عبدالرحیم خانخاناں اور عبدالعزیز آصف کی جامعیت اور علمی و عملی کمالات کی رنگارنگی، محمود گاواں کی قابلیت اور اسکے عالمگیر تعلقات، حضرت محبوب الٰہیؒ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا فقر و استغنا، امیر خسرو کی ذہانت اور شاعری، ٹیپو سلطان کی مردانگی اور جذبۂ حریت، وہ کمالات ہیں، جو ہندوستان کے لیے سرمایۂ صد ہزار نازش و افتخار، اور نوجوانوں میں عزم و ہمت اور انکی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی عجیب و غریب طاقت رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہندوستان کی سرزمین نے اپنے اس دور میں ایسے جلیل القدر فاضل باکمال مصنف، اور بلند پایہ محقق پیدا کیے، جنھوں نے اس وقت کی پوری متمدن دنیا کے ذہن پر اپنی بلندی و انفرادیت کا نقش قائم کر دیا، اور ساری علمی دنیا میں ہندوستان کا پایہ بلند کر دیا، آج بھی مشرق وسطیٰ اور ترکستان میں وہ تعارف کا ذریعہ اور یورپ میں ہندوستان کی عظمت کا باعث ہیں، ان میں سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے بعض ایسی تصنیفات پیش کیں، جو اپنے موضوع پر اس وقت تک بے نظیر سمجھی جاتی ہیں، اور جن سے سب ممالک کے علماء و محققین بھی حیرت زدہ ہیں، دسویں صدی کے مشہور گجراتی عالم شیخ محمد طاہر پٹنی کی مجمع بحار الانوار، گیارھویں صدی ہجری کے مشہور مصلح شیخ احمد فاروقی سرہندی کے خطوط کا مجموعہ "مکتوبات"، بارھویں صدی کے شمالی ہندوستان کے ایک عالم شیخ محمد اعلیٰ تھانوی کی تصنیف "کشاف اصطلاحات الفنون" اور اسی صدی کے مشہور عالم اور پیشوا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ"، پھر تیرھویں صدی

کے عربی کے ادیب سید مرتضیٰ بلگرامی کی "تاج العروس" وہ تصنیفات ہیں، جن کو عرب و ایرانی اور ترکستانی فضلاء بھی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ان سے استفادہ کرتے ہیں، پھر دہلی کے ولی اللّٰہی خانوادے، اور لکھنؤ کے فرنگی محلی خاندان نے اپنی ذہانت و علمی قابلیت سے ایک زمانہ میں بنگال سے لے کر بخارا اور سمرقند اور شیراز و اصفہان تک اپنے درس و علم کا سکہ چلایا ہے، ہم کس جرم میں اپنی انسانی عظمت، اپنی روحانی بلندی اور اپنی علمی پیشوائی کے اس درخشاں ورق کو ہندوستان کی قومی تاریخ سے خارج کرتے ہیں، اور کس قصور میں اپنے نوجوانوں کو ان کے کارناموں کی واقفیت سے محروم رکھتے ہیں، آج ہندوستان میں اس دور کو نظر انداز کرنے کا یا اس کو حقیر دکھانے کا عمومی رجحان پایا جاتا ہے، آج کہیں ہماری جدید تاریخوں میں اور ہمارے نصابِ تعلیم کی کتابوں میں اس کا شایانِ شان تذکرہ اور اسکی بلند و منفرد شخصیتوں کا تعارف نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حب الوطنی ہمارے نیشنلزم میں ابھی بہت کمی اور خامی ہے، ہم سچے محب وطن اور ملک دوست اس وقت تک نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اس ملک کی ساری اچھی حسین اور مفید چیزوں پر فخر کرنا، اور انکی حفاظت کرنا، اور انکو زندہ رکھنا اپنا فرض نہ سمجھیں، ہندوستانی کینہ کی ان شخصیتوں کو کیوں خارج کیا جائے، جن کا خمیر اسی سرزمین سے اٹھا، اور جنہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس ملک کو زرخیز بنانے میں صرف کیں اور پھر اسی سرزمین میں آسودۂ خاک ہیں، اور ہم جن کی ہمت و بصیرت سے اپنی زندگی کا چراغ جلا سکتے، اور اسکی لَو بڑھا سکتے ہیں، اور دنیا کی بزم کمال میں اونچی جگہ پا سکتے ہیں، محب وطن شاعر نے کہا تھا۔ ؎

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
حب وطن از ملک سلیماں خوشتر

لیکن یہاں تو پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا جا رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جا رہا ہے، یا ان پر سیاہی پھیری جا رہی ہے، اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلاء پیدا کیا جا رہا ہے جو صدیوں کو محیط ہے، ہمارا

فرض ہے کہ ہم ہندوستان کے اس دَور کو نمایاں اور ان کارناموں کو اجاگر کریں، ہم ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں حصّہ لیں، ہم مطالبہ کریں کہ جدید تعلیم و نصاب تعلیم میں عہد قدیم کی تاریخی شخصیتوں کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کی اُن تاریخی شخصیتوں کو بھی جگہ دی جائے جو ہندوستان کے لیے قابلِ فخر اور نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید ہیں، اور جن سے ناواقفیت ایک بڑا نقص اور محرومی کی بات ہے۔

حضرات!

ہمارا ملک اس وقت ایک عبوری دَور سے گزر رہا ہے جس میں جذبات عقل پر، فرقہ پرستی حب الوطنی پر، تنگ نظری وسیع النظری پر، اور نسلی و لسانی تعصبات انسان دوستی پر غالب ہیں، لیکن یہ دَور زیادہ دن قائم نہیں رہے گا، اسلئے کہ اس میں قائم و باقی رہنے کی صلاحیت نہیں، سیاسی شعور کی بیداری دنیا کے حالات کی رفتار، علم کی اشاعت زمانہ کا امتداد خود بخود دماغوں کی اصلاح کرے گا۔ اور ان میں وسعتِ نظر اور حقیقت پسندی پیدا کر دے گا، اور جذبات پر عقل، فرقہ پرستی پر حب الوطنی اور نسلی و لسانی تعصبات پر ملکی اتحاد، خلائق دوستی اور اقدارِ عالیہ کی محبت اور قدر غالب آجائے گی، اور نہ صرف ایک ملک بلکہ پوری دنیا کے اچھے انسانوں، اور اچھے کارناموں کو اپنی ملکیت و دولت سمجھا جائے گا، اور ان پر فخر کرنا سکھا جائے گا۔ اس وقت ہندوستان کی آبادی کے مختلف عناصر کے جذبات و روایات کا احترام اور انکی امنگوں کی تکمیل کا سامان کیا جائے گا، اور ایک ایسی فضا پیدا ہوگی جس میں یہ سب عناصر جماعتیں زیادہ سے زیادہ خوش دلی اور گرم جوشی کے ساتھ ہر ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں گی، اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اور اپنے نقطۂ نظر سے ملک کی طاقتوں کا اظہار کرسکیں گی۔[1]

لیکن ہم اس وقت کے انتظار میں، (جب حکومت کو اپنے فرض کا پورا احساس ہو جائے) نہیں رہ سکتے، قوموں کی زندگی میں چند برس کی مدت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس عرصہ میں

---

[1] اس دور کا آغاز کچھ دور نہیں ہے، خود ہمارے محکمۂ تعلیم میں نصاب کے اس نقص کا احساس پیدا ہو چلا ہے، اور اسکے ازالہ کی کوشش کا بھی آغاز ہو گیا ہے — ۱۲

ایک پوری نسل تیار ہو جاتی ہے، ہم کو اپنی جد و جہد جاری رکھنی چاہیئے، یہ جد و جہد دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے، ایک حصہ جس کا تعلق حکومت سے ہے، یہ حصہ بھی ناگزیر ہے، ہم کو حکومت سے بہت واضح و پر زور طریقے پر مطالبہ کرنا چاہیئے کہ سرکاری نصاب تعلیم اور نظام تعلیم مکمل طور پر سیکولر ہو، اور حکومت اسکے نفاذ میں پورے خلوص و جرأت سے کام لے، ہم کو اس پر بھی اعتراض نہیں کہ وہ انگریزوں کے دور حکومت کی طرح بالکل غیر جانب دار ہو، اور خالص "دنیاوی" ہو جائے جس میں کسی مخصوص مذہب یا تہذیب کی نمائندگی اور وکالت نہ ہو، اور اگر حکومت مسلسل تجربوں سے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ نصابی کتابوں میں اخلاقی و تاریخی عنصر ضروری ہے، تو اس بارہ میں وہ پوری فراخ دلی اور وسیع النظری سے کام لے، اور دینی تعلیمات، اخلاقی اسباق اور تاریخی شخصیات میں کسی ایک فرقہ و تہذیب کی تعلیمات یا شخصیات پر اکتفا نہ کرے، بلکہ سب فرقوں کی نمائندگی کی کوشش کرے، اور ہر فرقہ کی نمائندہ اور مؤثر و محبوب شخصیتوں کا انتخاب کرے اور ہندوستان کے کسی دور و تہذیب کو نظر انداز کیے بغیر پوری بے تعصبی اور فراخ دلی سے ہندوستان کی نمائندگی ہو، اس انتخاب اور نمائندگی میں اس فرقہ کے مستند اہلِ علم و اہلِ نظر کا اطمینان و اتفاق ضروری ہے، اور اس بارے میں انھیں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھنا پڑے گا، ہندوستان کے کثیر التعداد مذاہب اور گوناگوں تہذیبوں کے پیشِ نظر یہ کام نہایت نازک اور دشوار ہے اور یہ راہ بڑی خارزار ہے، اسکے لئے بڑی وسیع نظر، بڑی صائب رائے، اور بڑی وسعت قلب کی ضرورت ہے، اور مجھے اس میں بہت شبہ ہے کہ واضعین نصاب بغیر کسی فرقہ کی شکایت یا آزردگی کے اپنا یہ کام انجام دے سکیں گے، اسلئے حکومت کے لیئے آسان اور مامون راستہ یہ تھا، کہ وہ اپنے دستوری اعلان کے مطابق اپنے نصاب و نظام تعلیم کو سکولر رکھتی، اور مختلف فرقوں کو اسکی گنجائش و سہولتیں دیتی، کہ وہ اپنے بچوں کو ضروری مذہبی تعلیمات اور تاریخی معلومات سے آشنا کرنے کا انتظام کریں۔

نیز ایک ایسے ملک میں جو اپنے رقبہ میں بجائے ایک ملک کے ایک برّ کوچک اور اپنی آبادی کے لحاظ سے دنیا کے آباد ترین ملکوں میں ہے، کسی حکومت کو اپنے انتظامات پر انحصار اور اصرار نہیں کرنا چاہیئے، یہاں انگریزوں کے عہد سے پہلے نجی مکاتب اور مدارس

کا ایک جال بچھا ہوا تھا، ان سے علم کی اشاعت اور ملک کو شائستہ و تعلیمیافتہ بنانے میں جو مدد ملی اسکا انگریز مورخین نے بھی اعتراف کیا ہے، ہماری گزشتہ نسل جو شائستگی اور انسانیت میں شاید ہم سے بڑھی ہوئی ہے، انھیں مکاتب و مدارس کی فیض یافتہ ہے، انگریزوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں ان مکاتب و مدارس کو برقرار رکھا، اور بعض اوقات انکی ہمت افزائی کی، ہم کو حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیئے، کہ وہ پھر ان مکاتب و مدارس کی ہمت افزائی کرے، جو ضروری شہری مضامین کی تعلیم کا بندوبست کریں، اور ملک کے تعلیمی معیار پر پورے اتریں، حکومت کو (اگر وہ اس بات کے لئے فکرمند اور حریص ہے، کہ ملک کی آبادی کا زیادہ سے زیادہ حصہ خواندہ و تعلیم یافتہ بن جائے) ان مکاتب کو تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہونا چاہیئے، یہ اس کا بہت بڑا مالی بار ہلکا کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اور بالکل ممکن ہے کہ بعض اوقات اساتذہ کی قوتِ عمل ذوقِ علم، اور عقیدہ و مقصد اُن سرکاری اسکولوں سے بہتر نتائج پیدا کرسکے، جہاں کے اساتذہ اکثر اوقات صرف ملازمانہ ذہنیت رکھتے ہیں، اور صرف ضوابط کے پابند اور دعوت و خدمت کی رُوح سے خالی ہیں۔

دوسرا حصہ وہ ہے جو خود ہم سے متعلق ہے، اور اسکے بارے میں ہم خدا اور اس کے بندوں اور اپنی آئندہ نسلوں کے سامنے جوابدہ ہیں، ہم اپنی پہلی جدوجہد میں پورے طور پر کامیاب ہو جائیں اور نصابِ تعلیم حقیقی معنی میں غیر مذہبی و سکولر ہو جائے، پھر بھی ہمیں اپنے بچوں کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کرنا ہوگا، مسلمانوں کا ملّی وجود اسی پر منحصر ہے، کہ انکی ہر نسل نہ صرف صحیح العقیدہ بلکہ راسخ العقیدہ ہو، نہ صرف مذہب کی عامل بلکہ اسلام کی دعوت و پیغام کی حامل ہو، وہ نہ صرف جاہلیت اور اسکے افکار و عقائد و تصوّرات سے غیر متفق ہو، بلکہ ان سے متنفر ہو، اس کا فکر صحیح، اس کا شعور بیدار، اسکے اخلاق صالح، اور اس کا عمل مکمل ہو، وہ خلافِ اسلام فلسفوں اور دعوتوں، نفس کی ترغیبات، اور زمانہ کے اثرات کا مقابلہ کرسکے، اور اس میں خیر امت بننے کی صلاحیت ہو۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسی ملت کو جس کی زندگی کا اتنا بلند معیار ہو، ایک ایسے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور زمانہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا، جس میں

اسکی تکمیل کا نہ صرف یہ کہ سامان نہیں، بلکہ بعض اوقات ان مقاصد سے متصادم ہے، اس کے لیے مسلمانوں کو ایسا ہی انتظام کرنا ہوگا جیسے ان کو اپنی نمازوں اور دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے معابد و مساجد اور روح و جسم کے رشتے کو برقرار رکھنے کیلئے ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا پڑتا ہے، اور اس سلسلے میں وہ کسی حکومت کی امداد کا انتظار نہیں کرتے، اسکے لئے ان کو مساجد میں وعظ و تلقین، گھروں میں اصلاح و تربیت اور مکتبوں اور مدرسوں میں دینی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا، اس کیلئے اُن کو سارے ملک میں صباحی و شبینہ مکاتب کا ایک ایسا جال بچھا دینا ہوگا جس سے کوئی قریہ اور کوئی محلہ محروم نہ رہے۔

اس سلسلے میں قدرتاً دو کام اور ضروری ہیں، ایک ایسے نصاب کی ترتیب، جو بچوں کی دینی ضروریات اور ضروری معلومات پر حاوی ہو، بہترین تعلیمی اصول اور تجربات اور بچوں کی نفسیات کے مطابق لکھا گیا ہو، اور مسلمانوں کی اکثریت کے لیے قابلِ قبول ہو، دوسری ضرورت اساتذہ کی فراہمی اور ان کی تربیت کی ہے، جو اس نصاب کو کامیابی، دلچسپی اور ذوق و خلوص کے ساتھ پڑھا سکیں۔

حضرات!

ان عزیز مقاصد کے لیے جن پر ہماری ملی زندگی کا انحصار ہے، اور جن پر یہ فیصلہ معلق ہے، کہ ہماری آئندہ نسل اسلام پر قائم رہے گی یا خدانخواستہ اس نعمت سے محروم کردی جائے گی۔ ہم کو اپنے عزم اور قوتِ ارادی کا ثبوت دینا ہوگا، جن کے بغیر قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں، ادارے ارادوں کے تابع ہیں، اور وسائل و ذخائر عزم اور فیصلوں اور سچی خواہش کے، ہمیں اپنی پہلی کوشش میں ذرا بھی کمی کیے بغیر اپنی ساری طاقتیں اس محاذ پر لگا دینی چاہئیں۔ ضلع بستی اور گورکھپور میں ایک شخص کی کوشش اور مقصد کے عشق نے بیسیوں اداروں کا کام کیا، اور ہمیں اس نئے تجربہ سے آشنا کیا ہے کہ ایک شخص کا عزم اور اسکی حکمتِ عملی کس طرح عمومی چندہ سے بے نیاز ہوکر سیکڑوں مدرسوں کو چلا سکتی ہے، اور کس طرح چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبات اپنے بچوں کی تعلیم میں خودکفیل ہوسکتے ہیں، خدا کے فضل سے ابھی بیسیوں مقامات پر ایسے صاحبِ عزم و صاحبِ درد مسلمان موجود ہیں جو اگر اس مہم کو لے کر کھڑے ہو جائیں، اور اسکو اپنی زندگی کا

مقصد بنائیں، اور اسکو اعلیٰ درجہ کی عبادت اور دینی خدمت تصور کریں (جس میں کسی صاحب فہم کے نزدیک کسی شبہ کی گنجائش نہیں) تو یہ مسئلہ جو اس وقت لاینحل معلوم ہوتا ہے بہت آسانی کے ساتھ حل ہو جائے، لیکن شرط اوّل عزم اور شرط ثانی نظم ہے، اور ان دونوں کی موجودگی ہر شکل کو آسان اور ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔

حضرات!

قوموں کے اجتماعی فیصلوں نے دنیا کے نقشے اور قوموں کی تقدیریں بدل دی ہیں، آج جس چیز کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے، اور جو تمام موانع اور رکاوٹوں پر غالب آ سکتی ہے، اور جس کے سامنے حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی، وہ ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ہر تعلیم پر مقدم رکھیں گے، اور بغیر اس ضروری دینی تعلیم کے جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے کو، اپنے پیغمبرؐ کو، اور اپنے عقیدہ اور فرائض دینی کو پہچان سکیں، خالص دنیاوی یا معاشی تعلیم دلانا گناہ اور اپنے مذہب سے بغاوت سمجھیں گے، اگر ہمارا یہ فیصلہ ہو اور ہم اس میں سچے ہیں، تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ترغیب، کوئی مصلحت، کوئی تعزیر، ہم کو اس صراط مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی، اور ہماری نسلوں کو اسلام کی نعمت سے محروم نہیں کر سکتی، اور اگر ہمارا یہ فیصلہ نہیں، تو حکومت کی کوئی رعایت، کوئی استثناء، کوئی تحفظ، کوئی انتظام ہم کو اس فساد و الحاد، اور اس انحراف و ارتداد سے بچا نہیں سکتا جسکی طرف دنیا تیزی سے بڑھ رہی ہے، جو قومیں اپنے بارے میں خود فیصلہ نہ کر سکیں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، اور جو قومیں خود فیصلہ کر لیں انکے فیصلہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

عام انسانی تاریخ اور خاص طور پر اسلامی تاریخ اس کے لیے شہادتیں فراہم کرتی ہے اور قرآن مجید اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی کسی قوم کے حالات میں اس وقت تک تبدیلی نہیں فرماتا جب تک وہ قوم اپنے حالات میں خود تبدیلی پیدا نہ کرے۔ ان اللّٰہ لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔

حضرات!

آخر میں میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس اہم موضوع اور اس اہم ترین مسئلہ پر (جس پر مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ہے) اپنے ناچیز خیالات پیش کرنے کی سعادت اور عزت عطا کی، اور اس مقدس فریضہ کے ادا کرنے کا شرف اور اسکا اجر حاصل کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

قسط نمبر ۵

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(از: مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۴۷) قلیج اللہ[1] ابن قلیج محمد خاں کے نام

(افسانح)

..... اے فرزند! دنیا محلِ آزمائش و امتحان ہے۔ اس کے ظاہر کو رنگ برنگ کی باطل ٹیپ ٹاپ سے مزین اور اسکی صورت کو وہمی خال و خط اور زلف و خد سے آراستہ کر دیا گیا ہے ـــ دنیا دیکھنے میں شیریں اور تر و تازہ نظر آتی ہے لیکن فی الحقیقت یہ ایک مردار ہے جس کو عطر آلود کر دیا گیا ہے۔ ایک کوڑی گھر ہے جو مکھیوں اور کیڑوں سے پر ہے۔ ایک سراب ہے جو "آب نما" ہے۔ ایک شکر ہے جو زہر میں ملی ہوئی ہے ـــ اس کا باطن سراسر خراب و ابتر ہے۔ اس گندگی کے باوجود اس کا معاملہ اپنے لوگوں سے انتہائی برا ہے۔ اس دنیا کا فریفتہ (درحقیقت) دیوانہ اور جادو زدہ ہے۔ اسکی محبت میں جو گرفتار ہے وہ مجنوں اور فریب خوردہ ہے ـــ جو شخص اسکے ظاہر پر لٹو ہوا وہ ابدی خسارے کے داغ سے داغدار ہو گیا اور جس نے اسکی (ظاہری) حلاوت و طراوت پر (للچائی ہوئی) نظر ڈالی سرمدی ندامت اسکے حصے میں آئی۔

---

[1] مولانا قلیج محمد خاں گورنر پنجاب و کابل (عہد اکبری) کے صاحبزادے تھے انکے مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے۔

سرور کائنات حبیب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

ما الدنیا و الآخرۃ الا ضرتان ان رضیت احد اھما سخطت الاخریٰ

(دنیا اور آخرت دونوں آپس میں سوتن سوتن ہیں انمیں سے ایک اگر راضی ہوئی تو دوسری ناراض ہوگئی)

بنابریں جس نے دنیا کو راضی کیا آخرت اس سے غصے میں رہی ناچار وہ آخرت سے بے نصیب رہا، اللہ تعالےٰ ہم کو اور تم کو دنیا اور اہل دنیا کی محبت سے محفوظ رکھے ——

اے فرزند! جانتے ہو دنیا کس کو کہتے ہیں؟ (جو چیز بھی اللہ تعالیٰ سے تم کو باز رکھے وہ دنیا ہے) —— پس زن و فرزند، مال و جاہ و ریاست (اگر یہ خدا سے غافل کردیں) نیز لہو و لعب اور لایعنی اشیاء میں مشغولیت یہ سب چیزیں داخلِ دنیا ہیں —— جو علوم آخرت میں کام آنے والے نہیں وہ بھی دنیا ہی ہیں —— اگر علوم نجوم و منطق اور ہندسہ و حساب اور ان جیسے دیگر عقلی علوم کی تحصیل آخرت میں کارآمد ہوتی تو تمام فلاسفہ اہلِ نجات ہوتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بندے سے اللہ تعالےٰ کی روگردانی کی علامت یہ ہے کہ بندہ لایعنی مشاغل میں مشغول ہو۔

ے ہرچہ جز عشق خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جاں کندن است

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ علم نجوم، اوقات صلوٰۃ کی پہچان کے لیے درکار ہے۔ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ علم نجوم کی تحصیل کے بغیر معرفت اوقات حاصل ہی نہیں ہوسکتی بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ علم نجوم بھی معرفت کا ایک طریقہ ہے (علم نجوم ہی پر معرفت اوقات موقوف نہیں ہے) چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو علم نجوم سے خبردار نہیں لیکن اوقات صلوٰۃ کو عالمان نجوم سے بہتر پہچانتے ہیں —— قریب قریب یہی بات، علم منطق اور علم حساب وغیرہ علوم عقلیہ کی تحصیل کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بعض علوم شرعیہ میں درکار ہیں (یعنی علوم شرعیہ کلیۃً ان علوم کے محتاج نہیں البتہ ایک طریقۂ معرفت یہ علوم عقلیہ بھی ہیں) —— بہرحال بہت سے حیلوں کے بعد۔ ان علومِ عقلیہ میں مشغول رہنے کا جواز نکلتا ہے، بشرطیکہ علوم عقلیہ کے پڑھنے سے سوائے معرفت احکامِ شرعیہ اور تقویتِ ادلۂ کلامیہ کے اور کوئی مقصد نہ ہو اور اگر

دوسرا کوئی مقصد ہوگا تو ہرگز جائز نہیں ـــــــ ذرا غور کرو کہ اگر کسی امر مباح کے اختیار کرنے سے امور واجبہ کا فوت ہونا لازم آتا ہو تو وہ امر مباح، دائرۂ اباحت سے نکل جاتا ہے یا نہیں؟ ـــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان علوم عقلیہ میں (بغیر نیت صحیح و بغیر ضرورت) مشغول رہنا علوم شرعیہ میں مشغول رہنے کو فوت کر دیتا ہے۔

اے فرزند! تم کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی عنایت سے ابتدائے جوانی میں توفیق توبہ نصیب کی تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک درویش کے ہاتھ بیعت کرایا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ شیطان و نفس کے مقابلے میں تم کو اس توبہ پر استقامت حاصل ہوئی ہوگی یا نہیں؟۔ (بظاہر) استقامت مشکل نظر آتی ہے ـــــــ اسلئے کہ نوجوانی کا عالم ہے اسباب دنیوی سب کے سب موجود ہیں اور ہمنشین زیادہ تر نامناسب اور ناموافق ہیں۔

ہمہ اندر زمن تو ایں است ——— کہ تو طفلی و خانہ رنگیں است

اے فرزند! (نصیحت) "فضول مباحات" سے اجتناب کرنا چاہیئے اور (ضروری) مباحات میں بھی بقدر ضرورت پر اکتفا کیا جائے اور وہ بھی اس نیت سے کہ وظائف بندگی اطمینان سے ادا ہو جائیں ـــــ مثلاً خوراک سے مقصود یہ ہے کہ طاعات کی ادائیگی پر قوت و طاقت حاصل ہو جائے ـــــ پوشاک کا مقصد یہ ہے کہ قابل پوشیدگی حصّۂ جسم کی پوشیدگی اور گرمی و سردی کا بچاؤ ہو جائے اسی پر تمام مباحات ضروریہ کو قیاس کرلو۔ اکابر نقشبندیہ نے عزیمت پر عمل کرنا پسندیدہ قرار دیا ہے اور رخصت سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے ـــــــ "عزائم" میں سے یہ بھی ہے کہ بقدر ضرورت پر اکتفا کیا جائے۔ اور اگر یہ دولت میسر نہ آئے تو کم ازکم اتنا تو ہو کہ دائرۂ مباحات (امور جائزہ) سے قدم باہر نہ رکھا جائے اور محرمات و مشتبہات تک نہ پہونچا جائے ـــــــ امور مباحات سے پورے طریقے پر لطف اندوز ہونے کو تو خود اللہ تعالےٰ نے ہی اپنے کمال کرم سے جائز قرار دیدیا ہے اور دائرہ عیش و تنعم کو بہت وسیع کر دیا ہے (پھر کیا ضرورت ہے کہ اس کے آگے قدم بڑھا کر داد عیش و تنعم دی جائے) ـــــ اب ظاہری تنعمات سے قطع نظر کر کے دیکھو کہ کونسا عیش اس عیش کے مساوی ہے کہ مولیٰ اپنے بندے کے افعال و کردار سے راضی ہو اور

سرور کائنات حبیب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

ماالدنیا والآخرۃ الاضرتان ان رضت احدٰھما سخطت الاخریٰ

(دنیا اور آخرت دونوں آپس میں سوتن سوتن ہیں انمیں سے ایک اگر راضی ہوئی تو دوسری ناراض ہوگی)

بنابریں جس نے دنیا کو راضی کیا آخرت اس سے غصے میں رہی ناچار وہ آخرت سے بے نصیب رہا، اللہ تعالےٰ ہم کو اور تم کو دنیا اور اہل دنیا کی محبت سے محفوظ رکھے ——

اے فرزند! جانتے ہو دنیا کس کو کہتے ہیں ؟ (جو چیز بھی اللہ تعالیٰ سے تم کو باز رکھے وہ دنیا ہے) —— پس زن و فرزند، مال و جاہ و ریاست (اگر یہ خدا سے غافل کر دیں) نیز لہو و لعب اور لایعنی اشیاء میں مشغولیت یہ سب چیزیں داخلِ دنیا ہیں —— جو علوم آخرت میں کام آنے والے نہیں وہ بھی دنیاوی ہی ہیں —— اگر علوم نجوم و منطق اور ہندسہ وحساب اور ان جیسے دیگر عقلی علوم کی تحصیل آخرت میں کارآمد ہوتی تو تمام فلاسفہ اہلِ نجات ہوتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بندے سے اللہ تعالےٰ کی روگردانی کی علامت یہ ہے کہ بندہ لایعنی مشاغل میں مشغول ہو۔

ھ ہرچہ جز عشق خدائے احسن است   گر شکر خوردن بود جاں کندن است

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ علم نجوم، اوقات صلوٰۃ کی پہچان کے لیے درکار ہے۔ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ علمِ نجوم کی تحصیل کے بغیر معرفتِ اوقات حاصل ہی نہیں ہوسکتی بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ علم نجوم بھی معرفت کا ایک طریقہ ہے (علم نجوم ہی پر معرفت اوقات موقوف نہیں ہے) چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو علم نجوم سے خبردار نہیں لیکن اوقات صلوٰۃ کو عالمان نجوم سے بہتر پہچانتے ہیں —— قریب قریب یہی بات، علم منطق اور علم حساب وغیرہ علوم عقلیہ کی تحصیل کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بعض علومِ شرعیہ میں درکار ہیں (یعنی علوم شرعیہ کلیتہً ان علوم کے محتاج نہیں البتہ ایک طریقۂ معرفت یہ علوم عقلیہ بھی ہیں) —— بہرحال بہت سے حیلوں کے بعد، ان علومِ عقلیہ میں مشغول رہنے کا جواز نکلتا ہے، بشرطیکہ علوم عقلیہ کے پڑھنے سے سوائے معرفت احکامِ شرعیہ اور تقویتِ ادلۂ کلامیہ کے اور کوئی مقصد نہ ہو اور اگر

دوسرا کوئی مقصد ہوگا تو ہرگز جائز نہیں ـــــ ذرا غور کرو کہ اگر کسی امر مباح کے اختیار کرنے سے امور واجبہ کا فوت ہونا لازم آتا ہو تو وہ امر مباح، دائرۂ اباحت سے نکل جاتا ہے یا نہیں؟ ـــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان علوم عقلیہ میں (بغیر نیت صحیح و بغیر ضرورت) مشغول رہنا علوم شرعیہ میں مشغول رہنے کو فوت کر دیتا ہے۔

اے فرزند! تم کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی عنایت سے ابتدائے جوانی میں توفیق توبہ نصیب کی تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک درویش کے ہاتھ بیعت کرایا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ شیطان و نفس کے مقابلے میں تم کو اس توبہ پر استقامت حاصل ہوئی ہوگی یا نہیں؟۔ (بظاہر) استقامت مشکل نظر آتی ہے ـــــ اسلئے کہ نوجوانی کا عالم ہے اسباب دنیوی سب کے سب موجود ہیں اور ہم نشین زیادہ تر نامناسب اور ناموافق ہیں۔

ہمہ اندر زمن تو ایں است ـــ کہ تو طفلی و خانہ رنگیں است

اے فرزند! (نصیحت) "فضول مباحات" سے اجتناب کرنا چاہیئے اور (ضروری) مباحات میں بھی بقدر ضرورت پر اکتفا کیا جائے اور وہ بھی اس نیت سے کہ وظائف بندگی اطمینان سے ادا ہو جائیں ـــــ مثلاً خوراک سے مقصود یہ ہے کہ طاعات کی ادائیگی پر قوت و طاقت حاصل ہو جائے ـــــ پوشاک کا مقصد یہ ہے کہ قابل پوشیدگی حصۂ جسم کی پوشیدگی اور گرمی و سردی کا بچاؤ ہو جائے اسی پر تمام مباحات ضروریہ کو قیاس کر لو۔ اکابر نقشبندیہ نے عزیمت پر عمل کرنا پسندیدہ قرار دیا ہے اور رخصت سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے ـــــ "عزائم" میں سے یہ بھی ہے کہ بقدر ضرورت پر اکتفا کیا جائے۔ اور اگر یہ دولت میسر نہ آئے تو کم از کم اتنا تو ہو کہ دائرۂ مباحات (امور جائزہ) سے قدم باہر نہ رکھا جائے اور محرمات و مشتبہات تک نہ پہونچا جائے ـــــ امور مباحات سے پورے طریقے پر لطف اندوز ہونے کو تو خود اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے کمال کرم سے جائز قرار دیدیا ہے اور دائرہ عیش و تنعم کو بہت وسیع کر دیا ہے (پھر کیا ضرورت ہے کہ اس کے آگے قدم بڑھا کر داد عیش و تنعم دی جائے) ـــــ اب ظاہری نعمات سے قطع نظر کر کے دیکھو کہ کونسا عیش اس عیش کے مساوی ہے کہ مولیٰ اپنے بندے کے افعال و کردار سے راضی ہو اور

کونسی کلفت اس کے برابر ہے کہ اس کا مولیٰ اسکے اعمال سے ناراض ہو ـــــ جنت میں جو اللہ کی رضا حاصل ہوگی وہ جنت سے بہتر ہے اور دوزخ میں اسکی ناراضگی دوزخ سے بدتر ہے۔ بندہ اپنے مولیٰ کے حکم کا محکوم ہے اس کو یوں ہی اسکی مرضی پر مہمل نہیں چھوڑ دیا گیا ہے ـــــ فکر کرنا چاہیئے اور عقل دوراندیش کو کام میں لانا چاہیئے ورنہ کل بروز قیامت سوائے ندامت وخسارت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا ـــــ کام کا وقت جوانی کا زمانہ ہے ـــــ جوانمرد وہ ہے جو جوانی کو بیکار ضائع نہ کرے اور فرصت کو غنیمت سمجھے ـــــ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان کو بڑھاپے کے زمانے تک زندہ نہ رکھا جائے اور اگر بڑھاپے تک زندہ بھی رہا تو اطمینان میسر نہ ہوگا اور اطمینان میسر ہو بھی جائے، تو ضعف وسستی کا زمانہ اس سے کچھ (کارخیر) نہیں کرا سکتا۔

یہ وقت جب کہ تمام اسباب جمعیت قلب میسر ہیں اور والدین کا سایہ بھی جو کہ منجملہ انعامات حق ہے ـــــ موجود ہے ـــ کہ غم معیشت سب ان کے سر پر ہے ـــــ فرصت کا وقت ہے ـــــ اور قوت واستطاعت کا زمانہ ہے ـــــ کس عذر کی بنا پر آج کو کل پر ٹالا جائے اور تاخیر کی جائے...... ہاں اگر دنیائے دنی کے کاموں کو کل پہ ٹال دو اور آج اعمال آخرت میں مشغول ہو جاؤ تو یہ بات بہت ہی اچھی ہوگی جیسا کہ اس کا برعکس بُرا ہے ـــــ

اس وقت جب کہ آغاز جوانی میں نفس وشیطان کا غلبہ ہے ـــــ تھوڑے سے عمل کا وہ اعتبار ہوگا جو عدم غلبۂ دشمن کے وقت بڑے سے بڑے عمل کا نہ ہوگا ـــــ سپاہیوں کو دیکھو کہ غلبۂ اعداد کے وقت ان کی ادنیٰ بھاگ دوڑ کتنی معتبر اور قابل وقعت ہوتی ہے اور امن کے زمانے میں ان کی جد وجہد کا یہ مرتبہ نہیں ہوتا۔

اے فرزند! انسان جو کہ خلاصۂ موجودات ہے ـــــ اسکی پیدائش کا مقصد نہ تو لہو ولعب ہے اور نہ کھانا اور سونا ہے ـــــ اسکی پیدائش کا مقصد تو وظائف بندگی کو ادا کرنا نیز جناب قدس میں ذلت وانکسار، عجز وافتقار اور دوام التجا وتضرع ہے، وہ عبادت جس کو شریعت محمدیہ نے بتایا ہے اور جس کی ادائیگی میں خود بندوں کی منفعتیں

اور مصلحتیں پنہاں ہیں ـــ اللہ رب العزت کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ـــ اس کو بجان و دل ممنون ہو کر بجا لانا چاہیئے اور پورے جذبۂ اطاعت کے ساتھ اوامر کو ادا کرنے اور نواہی سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیئے ـــ اللہ تعالےٰ باوجودیکہ غنی مطلق ہے پھر بھی اس نے اوامر و نواہی کے ذریعے بندوں کو سرفراز فرمایا ہے ـــ ہم محتاجوں کو اس نعمت کا پورے طریقے پر شکر کرنا چاہیئے اور ممنونیت کے ساتھ احکام کی فرمانبرداری کرنا چاہیئے۔

آنعزیز کو معلوم ہے کہ دنیا والوں میں سے کوئی ایسا شخص جس کو شوکت و جاہ حاصل ہے ـــ کسی زیردست کو کسی خدمت پر سرفراز کر دیتا ہے تو اگرچہ اس خدمت سے خود صاحب شوکت شخص کو بھی فائدہ ہے لیکن وہ زیردست اس کے حکم کو کتنا عزیز رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک عظیم المرتبہ شخص نے اس خدمت کا حکم دیا ہے اسی بنا پر پوری ممنونیت کے ساتھ کام کرتا ہے ـــ تعجب ہے کہ عظمتِ خداوندی اس صاحبِ شوکت شخص کی عظمت سے بھی نظروں میں کم ہے (اسی وجہ سے تو) اللہ تعالےٰ کے احکام کی بجا آوری میں کچھ بھی کوشش نہیں ہوتی۔ ـــ شرم کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو خوابِ خرگوش سے باہر لانا چاہیئے ـــ

اوامر خداوندی کا نہ بجا لانا دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ بات ہے کہ شریعت نے جو اطلاعات دی ہیں ان کو جھوٹ جانتے ہیں اور باور نہیں کرتے یا یہ ہے کہ عظمتِ حکم الٰہی دنیا والوں کی عظمت سے نظر میں کم ہے ـــ غور کرو کہ یہ دونوں باتیں کتنی بُری ہیں۔

اے فرزند! ایک ایسا شخص جس کی دروغ گوئی کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے، آکر کہتا ہے کہ دشمن کی فوج پورے غلبے کے ساتھ فلاں قوم پر شب خون مارے گی، یہ سُن کر اس قوم کے عقلاء اپنی حفاظت کے درپے ہو کر اس بلا کے دفعیہ کی فکر کرتے ہیں ـــ حالانکہ جانتے ہیں کہ خبر دینے والا دروغ گوئی کے ساتھ متہم ہے ـــ مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ توہم خطرہ کے وقت بھی نزدِ عقلاء بچاؤ کا انتظام ضروری ہے ـــ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے اہتمام کے ساتھ عذابِ اخروی کی خبر دی ہے اس خبر سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ اگر متاثر ہوتے تو اس عذاب کے دور کرنے کی کوشش کرتے ـــ اور کمال یہ ہے کہ اس عذاب کے دور کرنے کا علاج بھی مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معلوم کئے ہوئے

۔ بھلا یہ کونسا ایمان ہے کہ مخبرِ صادق کی خبر کو اس مخبرِ کاذب کی خبر کے برابر بھی نہ رکھا گیا
ں نے شب خون کی جھوٹی خبر دی تھی)۔

یاد رکھو صورتِ اسلام نجات نہیں دے گی یقین پیدا کرنا چاہیئے ۔۔۔ یقین کہاں ہے؟
ن چھوڑ ظن بلکہ وہم بھی نہیں ہے ورنہ عقلاً تو خطروں کے وقت وہم کا بھی اعتبار کر لیتے ہیں۔
قسم کی ایک بات اور سنو ۔۔۔ حق تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے واللّٰہ بصیرٌ بما تعملون
ر تعالیٰ تمھارے اعمال کو دیکھنے والا ہے) ۔۔۔ اس ارشاد کے باوجود، اعمالِ قبیحہ کئے جا رہے
۔ اگر کسی حقیر سے حقیر آدمی کے متعلق بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ ان اعمال قبیحہ کو دیکھ رہا ہے تو اسکے
نے بُرے کام نہیں کریں گے لامحالہ اس بات سے تو یہ سمجھا جائے گا کہ (ناعاقبت اندیش
ں) خبرِ حق کا یقین و اعتبار نہیں کرتے ۔۔۔ اب بتاؤ کہ اس قسم کا کردار ایمان ہے یا کفر؟۔

آنفرزند پر لازم ہے کہ از سرِ نو تجدیدِ ایمان کریں ۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
۔۔۔ جدّدوا ایمانکم بقولِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ۔۔۔ (اپنے ایمان کو کلمۂ طیبہ کے
لیے تازہ کرو) لہٰذا اللہ کی غیر پسندیدہ باتوں سے دوبارہ خالص توبہ کرو ۔۔۔ اللہ نے جن
وں کی نہی فرمائی ہے اور جن کو حرام قرار دیا ہے ان سے علٰحدہ رہو۔ پانچ وقت کی نماز
ہو ۔ اگر تہجد میسّر ہو جائے تو زہے سعادت ۔۔۔ ادائے زکوٰۃ بھی ارکانِ اسلام میں
ہے، زکوٰۃ بھی نکالو ۔۔۔ وہ طریقہ جس سے زکوٰۃ کی ادائیگی بسہولت ہو جاتی ہے یہ ہے
پنے مال میں سے جو حقِ فقراء ہے (چالیسواں حصّہ) اس کو سالانہ جدا کر لیا جائے اور اسکو
اۃ کی نیت سے محفوظ رکھ کر سال بھر تک مصارفِ زکوٰۃ میں صرف کیا جائے، اس
رت میں ہر مرتبہ ادائے زکوٰۃ کی نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی ایک مرتبہ نیتِ زکوٰۃ
، مال کا جدا کرنا کافی ہوگا ۔۔۔ ویسے تو فقراء و مستحقین پر بہتیرا خرچ کرتے ہوں گے، لیکن
کہ نیت زکوٰۃ نہیں ہوتی اسلئے زکوٰۃ میں وہ رقم محسوب نہ ہوگی ۔۔۔ اور جو صورت لکھی گئی
، اس میں زکوٰۃ بھی اپنے ذمے سے اُتر جائے گی اور بے اندازہ خرچ سے بھی چھٹکارا ہو جائے
اگر بالفرض اس قدر رقمِ زکوٰۃ سال بھر میں فقراء پر خرچ نہ ہوئی اور کچھ باقی رہ گئی تو اس
کو بھی اپنے مال سے جُدا رکھیں ۔۔۔ ہر سال یہی طریقہ عمل میں لائیں ۔۔۔ جب مالِ فقراء

جدا کر لیا جاتا ہے، تو اگر آج اسکی ادائیگی کی توفیق نہ ہوئی تو شاید کل کو توفیق ہو جائے۔

اے فرزند! چونکہ نفسِ انسانی بالذات انتہائی بخیل اور احکام الٰہی کی بجاآوری میں سرکش واقع ہوا ہے اسلئے ضرورت کی بنا پر بات پورے اہتمام سے کہی جارہی ہے ورنہ اموال واملاک سب اللہ کے ہیں کسی کی کیا مجال کہ ان اموال کی زکوٰۃ دینے میں دیر لگائے ___ زکوٰۃ پوری شکر گزاری کے ساتھ ادا کرنا چاہئیے۔ اسی طرح تمام عبادات میں کسی طرح پر اپنے آپ کو معاف نہ رکھا جائے ___ بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں بھی سعیٔ بلیغ کرنا چاہئیے اور کوشش کرنا چاہئیے کہ کسی کا حق اپنے ذمے نہ رہ جائے ___ دنیا میں بندوں کا حق ادا کرنا آسان ہے یہاں ملائمت اور خوشامد سے بھی کام چل جائے گا اور آخرت میں بڑی مشکل آپڑے گی کوئی تدبیر نہ ہو سکے گی۔

احکام شرعیہ کو علماء آخرت سے دریافت کرنا چاہئیے ان کی بات میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے، شاید ان کے انفاس کی برکت سے عمل کی توفیق ہو جائے ___ علماء دنیا سے ___ جنھوں نے علم کو وسیلۂ مال وجاہ بنا رکھا ہے ___ دور رہنا چاہئیے ___ البتہ اگر تقویٰ شعار علماء نہ مل سکیں تو پھر مجبوراً ان علماء دنیا سے معلوم کر لیا جائے ___ وہاں (لاہور میں) حاجی محمد اترہ علماء دیندار میں سے ہیں اور میاں شیخ علی اترہ خود تم سے واقف ہیں غرض یہ دونوں بزرگ اس علاقے میں غنیمت ہیں مسائل شرعیہ کی تفتیش میں ان کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے ___...... چونکہ تم عقیدت کے ساتھ فقراء کی جانب توجہ رکھتے ہو اس مناسبت سے دل کی اکثر اوقات تمھاری طرف توجہ رہتی ہے وہی توجہ اس گفتگو کا باعث ہوئی ہے ___ میں جانتا ہوں کہ ان نصیحتوں اور مسئلوں میں سے اکثر تمھارے کانوں پر پہلے ہی پڑ چکے ہوں گے لیکن مقصود عمل ہے نہ کہ محض علم ___ وہ بیمار جو اپنے مرض کی دوا کا علم رکھتا ہے جب تک اس دوا کو استعمال نہ کرے گا صحت نہیں پائے گا۔ فقط دوا کا علم اس کو فائدہ نہیں پہونچائے گا...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ___

إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَالِمٌ لَمْ يَنْفَعْهُ اللّٰهُ بِعِلْمِهٖ

(قیامت کے دن اس عالم کو زیادہ عذاب ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہیں پہونچایا۔)

مکتوب (۴۷) مرزا بدیع الزماں کے نام —
(نصائح)

مکتوب گرامی وارد ہوا، اللہ کا شکر ہے کہ اس خط سے محبت فقراء مفہوم ہوئی جو کہ در اصل سرمایۂ سعادت ہے...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں دھم قوم لایشقی جلیسھم (یہ وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین محروم و بدنصیب نہیں رہتا ہے) —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم — فقراء مہاجرین کے ذریعے فتح کی دعا اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بہت سے پراگندہ بال ایسے ہیں جو دروازوں سے تو دھکّے دے کر نکال دیئے جاتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک اتنے عزیز ہیں کہ اگر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو پورا کردے۔"

سعادت آثارا! تم نے ایک فقرہ اپنے خط میں میرے متعلق یہ لکھا تھا "خدیو نشاتین" (مالک دوجہاں) یاد رکھو یہ وہ صفت ہے جو حضرت واجب الوجود کے ساتھ مخصوص ہے جس کی شان بہت بڑا ہے۔ عبد مملوک کسی چیز پر بھی قادر نہیں —— اسکی کیا مجال کہ کسی طریقے سے اپنے مالک کے ساتھ شارکت ڈھونڈھے اور راہ خداوندی پر دوڑے — علی الخصوص عالم آخرت میں کہ وہاں مالکیت وملکیت، کیا باعتبار حقیقت اور کیا باعتبار مجاز حضرت مالک یوم الدین (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ مخصوص ہے۔ حضرت حق جل مجدہٗ بروز قیامت ندا دیں گے — لمن الملک الیوم (آج کس کی بادشاہت ہے؟) —— اور خود ہی جواب میں فرمائیں گے — للہ الواحد القہار یعنی آج اللہ واحد قہار کی بادشاہت وحکومت ہے — بندوں کو اس دن سوائے ہول ودہشت اور سوائے حسرت وندامت کچھ متحقق ومتصور نہ ہوگا اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اس دن کی شدت اور غایت اضطراب خلائق کی خبر ان الفاظ میں دیتا ہے۔ اِنَّ زلزلۃَ الساعۃِ شیٌٔ عظیم یوم ترونھا تذھل کلّ مرضعۃٍ عما ارضعت وتضع کلُّ ذاتِ حملٍ حملَھا وتری الناس سُکاریٰ وما ھم بسکاریٰ ولکنّ عذاب اللّٰہِ شدید —— (بے شک قیامت کا زلزلہ بڑا بھاری زلزلہ ہوگا جس دن دودھ پلانے والی دودھ پلانا بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ مست ہیں حالانکہ وہ مست نہ ہوں گے، لیکن

اللہ کا عذاب ہی شدید ہے)

دراں روز کز فعل پرسند و قول — اولوالعزم را دل بلرزد ز ہول

بجائے کہ دہشت برند انبیاء — تو عذر گنہ را چہ داری بیا

بقیہ دو نصیحتیں یہ ہیں:-

(۱) صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع نہایت ضروری ہے اس لئے کہ نجات اسکے بغیر محال ہے۔

(۲) زیبا لکشہائے دنیا کی طرف التفات نہ ہو اور اسکے وجود و عدم کا اعتبار بھی نہ کیا جائے اسلئے کہ دنیا اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اللہ کے یہاں اسکی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے پس یہی مناسب ہے کہ اس کا عدم اسکے وجود سے بہتر ہو ۔۔۔ دنیا کی بے وفائی اور زوال پذیری کا قصہ مشہور ہے بلکہ آنکھوں دیکھا ہے پس ان دنیا داروں سے عبرت حاصل کرو جو اس دنیا سے گزر چکے ہیں ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی توفیق دے۔۔۔

مکتوب (۷۶) (مولانا) قلیج محمد خاں (اندجانی) کے نام۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- ما اٰتٰکم الرسول فخذ وہ وما نہاکم عنہ فانتھوا (رسول جس چیز کو دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو) (اس آیت کے پیش نظر) مدار نجات دو باتوں پر ہوا (۱) اوامر کی بجا آوری (۲) نواہی سے باز رہنا ۔۔۔ اور ان دونوں جزوں میں جزو اخیر زیادہ اہم ہے کہ ورع و تقویٰ اسی کا نام ہے ۔۔۔ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرتؐ کے سامنے ایک شخص کی عبادت و ریاضت کا ذکر کیا گیا اور دوسرے شخص کے تقویٰ کا ۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تقویٰ کی برابر کوئی چیز نہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تمھارے دین کا مدار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے ۔۔۔ انسان کی فرشتوں پر جو فضیلت ہے وہ اسی جزو اخیر کی بنا پر ہے اور مدارج قرب کی ترقی بھی اسی جزو سے ہوتی ہے اسلئے کہ ملائکہ پہلے جزو میں شریک ہیں لیکن ان میں ترقی مفقود ہے پس رعایت جزو اخیر (ورع و تقویٰ) اسلام کے اعلیٰ ترین مقاصد

میں سے ہے ـــــ اور اِس جزو کی رعایت جس کا مدار حرام باتوں سے بچنے پر ہے پورے طریقے پر اِس وقت میسر ہوسکتی ہے کہ فضولِ مباحات سے پرہیز کیا جائے اور مباحاتِ ضروریہ پر اکتفا کیا جائے اسلئے کہ ارتکاب مباحات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دینا، امورِ مشتبہات تک پہونچا دے گا اور مشتبہ، حرام کے قریب ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من حام حول الحمیٰ یوشك ان یقع فیہ (جس نے چرایا اپنے جانوروں کو شاہی سبزہ زار کے آس پاس قریب ہے کہ چرلئے وہ اسکے اندر یعنی وہ جانور شاہی چراگاہ میں داخل ہوجائینگے جوکہ ممنوع ہے)، پس کمالِ تقویٰ کے حصول کے لیے مباحات پر بقدر ضرورت اکتفا ضروری ہوا اور وہ بھی ادائے وظائف بندگی کی نیت سے مشروط ہوکر ـــــ ورنہ (بغیر نیت کے) اس قدر بھی وبال ہے اور قلیل بھی حکمِ کثیر رکھتا ہے۔ اور چونکہ فضولِ مباحات سے پورے طریقے پر بچنا خصوصاً اس زمانے میں بہت ہی کم ہے لہٰذا ایسا تو ہو کہ محرمات سے اجتناب کو لازم کرکے حتیٰ الامکان فضول مباحات کے دائرہ ارتکاب کو تنگ تر کر دیا جائے اور فضولِ مباحات کے (کبھی کبھار) ارتکاب کے بعد ہمیشہ استغفار اور التجا وتضرع ہونا چاہیئے ممکن ہے اِس سے بھی وہی نتیجہ پیدا ہوجائے جو فضولِ مباحات سے کلیتہً پرہیز سے ہوتا...... ایک درویش کا قول ہے کہ مجھے عاصیوں کا انکسار عبادت گزاروں کی جدوجہد سے زیادہ پسند ہے۔ ـــــ

محرمات سے بچنا دو قسم پر ہے ایک قسم حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے دوسری قسم حقوق عباد سے، ان میں سے دوسری قسم کی رعایت بہت ضروری ہے اللہ تعالیٰ تو غنیٔ مطلق اور ارحم الراحمین ہے اور بندے نقراء ومحتاج ہیں اور بالذات بخیل ولئیم ـــــ (اس لیے ان کے حقوق کی ادائیگی ضرور ہونا چاہیئے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ـــ جس کسی پر اپنے بھائی کا کسی قسم کا کوئی حق ہو اس کو چاہیئے کہ دنیا ہی میں اس کو معاف کرالے اس دن کے آنے سے پہلے کہ اس کے پاس کوئی دینار درہم نہ ہوگا اگر اسکے پاس کوئی عمل صالح ہوگا تو اس حق کے بقدر اس عمل کو لے لیا جائے گا اور اسکے پاس حسنات نہ ہوں گے تو حقدار کے گناہ لے کر اس پر لاد دیئے جائیں گے ـــــ آپؐ نے صحابہ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ جانتے ہو مفلس کون ہے۔؟

صحابہ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں نہ مال و متاع فرمایا نہیں میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ (سب اعمال حسنہ) لے کر آیا۔ لیکن اس حال میں کہ کسی کو گالی دی تھی کسی پر تہمت دھری تھی، کسی کا مال غصب کر لیا تھا کسی کا خون بہا دیا تھا کسی کو زدو کوب کیا تھا پس ان سب آدمیوں کو اس شخص کے حسنات دیدیئے جائیں گے اور جب حسنات ختم ہو جائیں گے تو ان لوگوں کی خطائیں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی پھر اس کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا...... آخر میں اس امر کا بھی شکریہ ادا کر دوں کہ آپکے وجود سے بلدۂ معظمہ لاہور میں بہت سے احکام شرعیہ اس نازک دور میں رواج پذیر ہیں اور آپکے ذریعے اس مقام پر تقویت دین اور ترویج ملت حاصل ہے۔ یہ شہر لاہور فقیر کے نزدیک تمام بلاد ہندوستان کے لیے "قطب ارشاد" جیسا ہے اس شہر کی خیر و برکت تمام بلاد ہندوستان میں جاری و ساری ہوتی ہے اگر اس جگہ دین کی ترویج و اشاعت ہے تو تمام مقامات پر ترویج و اشاعت متحقق ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا ناصر و مویدہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ مخالفان اسلام پر غالب اور دین حق پر قائم رہے گا۔ وہ شخص جو اسکی امداد ترک کرے گا اسکو نقصان نہ پہونچا سکے گا۔ یہاں تک کہ آئے گی قیامت اور وہ اسی حال پر ہوگا، چونکہ آپ کو حضرت معرفت پناہی قبلہ گاہی (خواجہ باقی باللہؒ) سے رشتۂ محبت تھا اس لیے یہ چند کلمات لکھے گئے زیادہ لکھنا طول کا باعث ہے۔

مکتوب (۹۷) جباری خاں کے نام۔

(شریعت غرّا جامع ہے تمام شرائع سابقہ کی)

.... یہ امر ثابت اور مقرر شدہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات اسمائی و صفاتی کے جامع ہیں اور بر سبیل اعتدال ان سب کمالات کے مظہر ہیں اور جو کتاب آپ پر نازل ہوئی ہے وہ ان تمام کتب سماوی کا خلاصہ ہے جو انبیاء علیہم السلام پر اتریں، نیز جو شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی وہ بھی تمام شرائع سابقہ کا زبدہ و خلاصہ ہے۔ جن اعمال کا یہ شریعت حقہ مطالبہ کرتی ہے وہ اعمال پچھلی شریعتوں

کے اعمال بلکہ ملائکہ کے اعمال سے بھی منتخب ہیں اس لیے کہ بعض ملائکہ فقط رکوع کے مامور ہیں اور بعض فقط سجدے کے اور بعض محض قیام کے اور ایسے ہی امم سابقہ میں بعض امتیں صبح کی نماز کی مامور تھیں بعض دوسری نمازوں کی ـــــ اس شریعت میں امم سابقہ اور ملائکہ مقربین کے اعمال کا خلاصہ منتخب کر کے ان منتخب اعمال کا حکم دیا گیا ہے پس اس شریعت کی تصدیق کرنا اور اسکے تقاضے کے مطابق عمل کرنا درحقیقت تمام شرائع کی تصدیق کرنا اور تمام شرائع کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے ایسے ہی اس شریعت کی تکذیب اور اس پر عمل نہ کرنا بھی تمام شریعتوں کی تکذیب اور انکے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہونا ہے ـــــ یہی حال ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کا کہ انکی رسالت کا منکر ہونا، جمیع کمالاتِ اسمائی و صفاتی کا انکار کرنا ہے اور ان کی تصدیق کرنا تمام کمالات اسمائی و صفاتی کی تصدیق کرنا ہے، لہٰذا اس شریعت کا اور آنحضرتؐ کا جھٹلانے والا، لامحالہ بدترین امم قرار دیا جائے گا..............

مکتوب (۸۰) میرزا فتح اللہ حکیم[۱] کے نام ـــــ

(اس بیان میں کہ تہتر فرقوں میں فرقۂ اہل سنت وجماعت فرقۂ ناجیہ ہے)

.... (یوں تو) تہتر فرقوں میں سے ہر فرقہ اتباع شریعت کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی نجات پر یقین رکھتا ہے (خود قرآن میں ہے) کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (ہر گروہ اور پارٹی خوش ہے اس چیز پر جو اسکے پاس ہے)

.... لیکن (نجات یافتہ ہونے کی) وہ دلیل و نشانی جس کو پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] حکیم فتح اللہ شیرازی ـــ شیراز کے رہنے والے تھے اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے اور انعامات واکرامات سے نوازے گئے مدت تک ہندوستان میں مقیم رہ کر اپنے وطن کو چلے گئے اور شیراز ہی میں وفات پائی۔ کلام اللہ کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ مفتی عبدالسلام لاہوری (جو کہ ملا عبدالسلام دیوی کے استاذ تھے) کے استاذ تھے ـــــ حسب قولِ مؤلف تاریخ جدولیہ شیعی مذہب تھے۔ بعد کو غالباً حضرت مجددؒ کی برکت سے اصلاحِ عقائد کر لی تھی ـــ اسی بنا پر مکتوب (۸۵) میں ان کو نماز پنجوقتہ باجماعت کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۵ و تاریخ جدولیہ)

نے ارشاد فرمایا ہے، یہ ہے کہ " فرقۂ ناجیہ وہ ہے جو اس طریقے پر ہو جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں " یہ فرما دینا بظاہر کافی ہوتا کہ " جس طریقے پر میں ہوں " مگر اصحاب کا ذکر بھی اپنے ساتھ فرمایا اسکی وجہ یہ قرار دی جاسکتی ہے کہ سب جان لیں کہ میرا طریقہ وہی ہے جو میرے اصحاب کا ہے لہذا طریق نجات صحابہ کی ہی اتباع کے ساتھ متعلق ہوگا ـــــ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) معلوم ہوا کہ اطاعتِ رسول ہی عین اطاعتِ حق ہے۔ آنحضرت کی اطاعت کے خلاف جو کچھ ہے وہ اللہ کی نافرمانبرداری ہے ـــــ جو لوگ اطاعتِ خدا کو اطاعتِ رسول کا منافی و مخالف تصور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی اطلاع اس طرح دیتا ہے۔

یریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نومن ببعضٍ ونکفر ببعضٍ ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولٰئک ھم الکٰفرون حقا ـــ (جو لوگ چاہتے کہ تفرقہ کریں اللہ کے درمیان اور اسکے پیغمبروں کے درمیان (اطاعت کے معاملے میں) اور جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں بعض پیغمبروں پر اور بعض کا ہم انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی درمیانی راستہ (من مانا) نکال لیں وہ لوگ یقیناً حالتِ کفر میں ہیں)

اسی طرح میں جس بارے میں لکھ رہا ہوں (اس کو سمجھو کہ) اتباع سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنا اور ساتھ ہی اتباعِ طریقِ اصحابؓ کی مخالفت کرنا یہ باطل دعویٰ ہے ـــــ بلکہ ایسی اتباع تو درحقیقت رسولؐ کی نافرمانی ہوگی پس نجات کی اس صورت میں کیا گنجائش رہی؟ ویحسبون انھم علی شیٔ الا انھم ھم الکاذبون (وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم کسی حقیقت پر ہیں (مگر) آگاہ رہو کہ وہ لوگ جھوٹے ہیں) ـــ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فرقہ جس نے اتباعِ صحابۂ رسولؐ کو لازم قرار دیا ہے وہ فرقۂ اہل سنت وجماعت ہے ـــ اللہ انکی سعی کو کامیاب فرمائے ـــــ لہذا فرقۂ ناجیہ بھی ہوا ـــ جو لوگ اصحابِ پیغمبرؐ پر طعن کرتے ہیں جیسے شیعہ اور خوارج ـــــ وہ خود صحابہ کی اتباع سے محروم ہیں اور معتزلہ بیچارے تو اُن کے مقابلے میں نئی پیداوار ہیں انکا پیشوا واصل بن عطا حضرت

امام حسن بصریؒ کا شاگرد تھا ایمان و کفر کے درمیان "واسطہ" کی شاخ تجویز کرنے کی وجہ سے استاذ سے جدا ہو گیا حضرت بصریؒ نے اسکے متعلق فرمایا تھا اعتزل عنا ــــ یعنی واصل ہم سے جدا ہو گیا (معتزلہ کی یہی وجہ تسمیہ بھی ہے) ــــ بقیہ فرقوں کو بھی ان ہی پر قیاس کرلو ــــ صحابہؓ پر طعن کرنا درحقیقت پیغمبرؐ پر طعن کرنا ہے جس نے رسولؐ کے صحابہ کی تعظیم و توقیر نہ کی وہ رسولؐ پر ایمان لایا ہی کب ؟ ــــ اگر اصحابِ نبیؐ میں کوئی خباثت تھی تو نعوذ باللہ یہ بات پیغمبرؐ تک پہونچے گی ــــ اللہ ہمیں ایسے برے اعتقاد سے بچائے ــــ علاوہ ازیں جو احکام شرعیہ قرآن و احادیث کی راہ سے ہم تک پہونچے ہیں وہ صحابہؓ کے توسط اور ذریعے سے ہی تو پہونچے ہیں، صحابہؓ قابل طعن ہوں گے تو انھوں نے جو چیزیں نقل کی ہیں وہ بھی قابل طعن ہونگی اور یہ بات کسی ایک کے ساتھ یا چند کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کل کے کل صحابہؓ عدالت، صدق اور تبلیغ میں مساوی ہیں ــــ پس ان میں سے کسی پر طعن و تبرا کرنا دین پر طعن کرنا ہے، اللہ اس جرأتِ بیجا سے پناہ میں رکھے ــــ اور اگر طعن و لعنت کرنے والے یوں کہیں کہ ہم بھی بعض اصحاب کی تابعداری کرتے ہیں اور یہ کیا ضروری ہے کہ تمام اصحابؓ کے تابع ہوں سب کی تابعداری ممکن بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان کی رایوں اور طریقوں میں اختلاف ہے ــــ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ بعض صحابہؓ کی پیروی اس وقت کارآمد ہوسکتی ہے جب کہ باقی صحابہؓ میں سے کسی کا انکار اسکے ساتھ ساتھ نہ ہو اور اگر کسی کا بھی انکار ہوا تو کسی کی بھی تابعداری متحقق نہ ہو گی ــــ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ حضرت امیر علیؓ بن ابی طالب نے خلفاء ثلثہ کی تعظیم و توقیر کی ہے اور اُن کو مقتدیٰ جان کر اُن سے بیعت کی ہے، لہذا خلفاء ثلثہ سے انکار کی صورت میں حضرت امیرؓ کی تابعداری کا دعویٰ محض غلط ہے، بلکہ خلفاء ثلثہ سے انکار فی الحقیقت حضرت امیرؓ سے انکار اور اُن کے اقوال صریح اور اُنکے اعمال کا رد کرنا ہے ــــ رہا احتمالِ تقیہ، سو وہ حضرت علی شیر خداؓ کے بارے میں کرنا سُبکی عقل کی بات ہے ــــ عقل صحیح ہرگز یہ بات تجویز نہیں کرتی کہ شیر خدا، باوجود کمالِ معرفت و شجاعت (تقریباً) تیس سال خلفاء ثلثہ کا بغض اپنے سینے میں چھپائے رہیں اور جو بات دل میں تھی اسکے برخلاف ظاہر کریں اور (نعوذ باللہ) منافقانہ انداز میں

اُن سے ملتے جلتے رہیں ـــــــ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم کے اندر بھی اس قسم کے نفاق کا تصور نہیں کیا جا سکتا (چہ جائیکہ اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب)

غور کرو اس قسم کی باتوں سے حضرت امیرؓ کی طرف کس طرح مغلوبیت اور فریب دہی کی نسبت کی جا رہی ہے اور اگر بفرضِ محال شیرِ خدا (حضرت علیؓ) کے بارے میں تقیہ تجویز کر بھی لیا جائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابِ ثلٰثہ کی عزت و توقیر کی ہے اور شروع سے آخر تک انکو قابل عزت قرار دیتے رہے ہیں ـــ اس مقام پر تو "تقیہ" کی کچھ بھی گنجائش نہیں نکلتی ـــــ پیغمبر پر تبلیغ واجب ہے انکی شان اقدس تک "تقیہ" کو راستہ دینا زندیقیت کی منزل پر پہونچا تا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے "اے رسول آپ اس بات کی تبلیغ کیجیے جو آپ پر نازل کی گئی ہے آپکے رب کی طرف سے"۔ الخ ......

یہ بات مُسلّم ہے کہ نبی کا خطا پر مقرر رکھنا جائز نہیں ہے ورنہ اسکی شریعت کے اندر خلل پیدا ہوتا ہے ـــــ پس جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خلفاء کی تعظیم و توقیر ہی ظاہر ہوئی اسکے خلاف کوئی بات ظاہر نہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کی تعظیم و توقیر کرنا خطا سے محفوظ تھا اور یہ تعظیم و توقیر زوال پانے والی نہیں ہے غیر فانی ہے ـــــ

اب میں اصل سخن کی طرف متوجہ ہو کر معترضین کے اعتراض کا جواب وضاحت سے دیتا ہوں کہ تمام صحابہؓ کی تابعداری اصول دین میں لازم ہے اور صحابہ اصول میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے اگر انکا اختلاف ثابت ہے تو وہ فروع میں ہے۔ اب جو بھی ان میں سے کسی پر طعن کرنے والا ہے وہ سب کی تابعداری سے محروم ہے ـــ صحابہ آپس میں اصول کے اندر متفق ہیں لیکن ان اکابرین سے انکار کی نحوست خود منکرین کو اختلاف میں ڈال دیتی ہے اور اتفاق سے باہر لے آتی ہے بلکہ کسی شخصیت کا انکار آپ کی بات کے انکار تک پہونچا دیتا ہے۔ دیکھو تمام صحابہ شریعت کے مبلغ ہیں ان میں سے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ ہم تک پہونچا ہے۔ قرآن کو بھی ہر ایک صحابی سے ایک یا ایک سے زیادہ آیتیں لے لے کر جمع کیا گیا ہے، پس کسی ایک صحابی کا انکار اس آیت سے انکار ہے جو اس سے پہونچی تھی ـــــ اس سے واضح ہو گیا کہ منکرِ بعض صحابہ کے لیے جمیع شریعت پر عملدرآمد

میسر نہیں ہے اب نجات اور فلاح کہاں ؟ ——— اللہ تعالیٰ فرماتا ہے افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذٰلک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (کیا تم بعض حصہ کتاب پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو پس تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اسکی سزا اسکے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں ذلت اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب)....
پس سوچنا چاہیئے کہ ان اکابر (صحابہ) کا انکار قرآن کے انکار تک پہونچتا ہے، نپاہ بخدا۔ ——— ایک شخص نے اہلِ تشیع کے ایک مجتہد سے سوال کیا کہ "قرآن حضرت عثمانؓ کا جمع کیا ہوا ہے اسکے حق میں کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ "میں قرآن کے انکار میں مصلحت نہیں دیکھتا اس کا انکار ہوا تو دین درہم برہم ہو جائے گا"۔ ———
علاوہ ازیں ایک عقل سلیم رکھنے والا ہرگز یہ بات کبھی جائز قرار نہیں دے سکتا ہے کہ صحابہؓ آنسرور آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے دن ایک امر باطل پر اجتماع کرلیں ———
ظاہر ہے کہ رحلت رسول اکرمؐ کے وقت ۳۳ ہزار صحابہؓ حاضر تھے انھوں نے اپنی رغبت اور خوشی سے حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے ان تمام کثیر التعداد صحابہ کا ضلالت وگمراہی پر جمع ہو جانا محالات سے ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت سب کی سب ضلالت وگمراہی پر جمع نہیں ہوگی اور حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ سے جو توقف بیعت میں ابتداءً واقع ہوا اسکی وجہ یہ تھی کہ مشورے میں حضرت امیرؓ کو بلایا نہیں گیا تھا جیسا کہ حضرت امیرؓ نے فرمایا ہے کہ "ہم کو غصہ صرف اس بات پر آیا تھا کہ ہم مشورہ میں طلب نہیں کئے گئے۔ ویسے ہم جانتے ہیں کہ بے شک ابوبکرؓ ہم سب سے افضل وبہتر ہیں"۔ اور حضرت امیرؓ کا مشورے میں نہ بلانا بھی کسی مصلحت پر مبنی ہوگا مثلاً اہل بیت نبویؐ کی تسلی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صدمے میں حضرت علیؓ کی موجودگی میں بھی اسی طرح کی اور مصلحتیں بھی ہوسکتی ہیں ——— اور جو اختلاف درمیانِ اصحاب واقع ہوا ہے وہ ہوائے نفسانی کی بنا پر نہ تھا اسلئے کہ ان کے نفوس کا تزکیہ (آنحضرتؐ کے فیض صحبت سے) ہو چکا تھا۔ ان کے نفوس، نفوس مطمئنہ بن چکے تھے ———

_____ اُن کی خواہشات تابعِ شریعت ہو گئی تھیں _____ اُن کا اختلاف "اجتہاد" پر اور "اعلائے حق" پر مبنی تھا لہٰذا ان میں جو خطا پر بھی ہو گا اسکو بھی ایک درجہ ثواب کا اللہ کے یہاں حاصل ہے؛ اور جو حق پر تھا اسکے لئے دو درجے ثواب کے ہیں _____

پس زبان کو ان کے بُرا بھلا کہنے سے باز رکھنا چاہیئے اور سب صحابہؓ کو نیکی سے یاد کرنا چاہیئے ....

مکتوب (۸۱) لالہ بیگ[1] کے نام۔ (ترغیب بر ترویج اسلام)

اللہ تعالیٰ ہماری اور تمھاری حمیت اسلامی میں ترقی عطا کرے _____

غربت اسلام ایک صدی سے رونما ہے ۔ اہلِ کفر بلادِ اسلام میں کھلّم کھلّا احکام کفر کے رائج ہونے پر ہی راضی نہیں ہیں بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل ہو جائیں اور "مسلمانان" اور "مسلمانی" کا کوئی نشان ظاہر نہ ہو اور نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شعارِ اسلام کا اظہار کرتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔

.... (اب جہانگیر کی سلطنت کا آغاز ہے) اگر ابتداءِ بادشاہت میں مسلمانی رواج پا گئی اور مسلمانوں نے کوئی حیثیت پیدا کر لی تو فبہا ورنہ توقف کی صورت میں مسلمانوں کا مسئلہ بڑا مشکل ہو جائے گا _____ الغیاث الغیاث ثم الغیاث الغیاث _____

دیکھا چاہیئے کون نصیبہ ور اس سعادت سے سعادت مند ہوتا ہے اور کون شاہباز اس دولت کو حاصل کرتا ہے۔

مکتوب (۸۵) میرزا فتح اللہ حکیم کے نام ـــ (نماز با جماعت کی ترغیب میں)

.... آدمی کو جس طرح درستیٔ اعتقاد کے بغیر چارہ نہیں، اعمالِ صالحہ کی ادائیگی کے بغیر بھی چارہ نہیں ہے۔ اور جامع ترین عبادت اور مقرب ترین اطاعت نماز کا ادا کرنا ہے۔

---

[1] ان کا باز بہادر اور جہانگیر قلی خاں خطاب تھا جہانگیر کے اعاظم امراء میں سے تھے ۱۰۱۶ھ میں بنگالہ میں فوت ہوئے۔ تاریخ محمدی قلمی رضا لائبریری رامپور میں ۱۰۱۶ھ کے ماتحت ان کے متعلق یہ عبارت ہے۔ لالہ بیگ مخاطب بباز بہادر ثم بجہانگیر قلی خاں از اعاظم امراء و غلامان خاص جہانگیر بادشاہ ـــ آخر ہائے سال در بنگالہ فوت شد ـــ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الصلوٰۃ عماد الدین فمن اقامہا فقد اقام الدین ومن ترکہا فقد ھدم الدین ۔۔۔ (نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو چھوڑا اس نے دین کو ڈھا دیا) ۔۔۔ اور جس کسی کو نماز کی مواظبت و پابندی نصیب ہوتی ہے اس کو فحشاء اور منکر سے بھی محفوظ رکھا جاتا ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر ۔۔ (بے شک نماز فحش اور بری بات سے منع کرتی ہے) یہ آیت میری بات کی تائید کر رہی ہے ۔۔۔ اگر نماز بے حیائی اور برائی سے نہیں بچا رہی تو سمجھو کہ صورت نماز ہے حقیقت نماز نہیں ہے ۔۔۔ مگر جس وقت تک حقیقت حاصل نہ ہو جائے صورت کو بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے ۔۔۔ اگر کل نہ مل سکے تو کل کو چھوڑا بھی نہ جائے اکرم الاکرمین (حق تعالیٰ) اگر صورت نماز ہی کا (حقیقت جیسا) اعتبار کر لے تو اسکی شان سے یہ بھی بعید نہیں پس تم پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کو ادا کرو اس لئے کہ یہ نماز سبب نجات وفلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔۔ قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوٰتھم خٰشعون (فلاح یاب و کامیاب ہو گئے وہ بندے جو کہ اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع کرنے والے ہیں) ....

انتخاب

مولانا آزاد کی زندگی کا اہم موڑ

معاصر "ایشیا" (لاہور) کے مدیر ملک نصر اللہ خان عزیز کے مسلسل مقالہ "زندگانی گزرگاہوں میں" سے۔

.... وہ ایک با اصول اور صاحب استقامت آدمی تھے۔ جس اصول کو صحیح سمجھتے تھے اُس پر پوری محکمی کے ساتھ جم جاتے تھے۔ بلند کردار لوگوں کا قاعدہ ہے کہ آپ ان کو دلیل سے قائل کر کے ان کی رائے بدلنے پر آمادہ کر سکتے ہیں مگر جبر و قوت اور دباؤ سے ان کو ایک انچ ہٹنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا ابوالکلام ایسے ہی آدمی تھے۔ جس زمانے میں وہ کانگرس کے صدر تھے اور اُن کے فکر و فہم کے محور پر کانگرس کی پالیسی گھوم رہی تھی وہ لاہور تشریف لائے تھے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم بقید حیات تھے۔ لٹن روڈ پر ایک کوٹھی میں وہ مقیم تھے۔ مولانا ابوالکلام کے اعزاز میں ایک عصرانہ کانگرسی مسلمانوں نے دیا۔ میں اس وقت کانگرس کو ترک کر کے جماعت اسلامی میں داخل ہو چکا تھا، مگر پرانے مراسم کی وجہ سے اس قسم کی صحبتوں میں مجھے بھی یاد کر لیا جاتا تھا۔ یوں بھی میرے مراسم تمام کانگرسی مسلمانوں سے برقرار تھے۔ مسلک کے اختلاف کے باوجود میں ہر دائرۂ عمل کے لوگوں سے ایک اخبار نویس کی حیثیت سے تعلقات قائم رکھتا ہوں، چنانچہ اس موقع پر میں بھی ایک تماشائی کے طور پر موجود تھا۔

اُس زمانے میں تشکیک مسلمانوں کے سامنے یہ سوال اُبھر کر آ گیا تھا کہ انھیں بہر حال مسلمانوں کے جذبات و حسیات کا لحاظ کرنا چاہیے۔ اور ان کو کانگرس اور ہندوؤں سے جو شکایات ہیں اُن کی حمایت کر کے اپنی

طرف مائل کرنا چاہیے۔ لیکن مولانا ابوالکلام کا طرزِ عمل اس معاملے میں حوصلہ افزا نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے لیے جو اصول و مقاصد اور طریق کار متعین کر لیے تھے انھیں وہ مذاقِ عوام کی قربانگاہ پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے کہ اس وقت کانگرسی علماء کے پنجاب میں سرخیل تھے مولانا سے عرض کیا کہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کرنے کے لیے اپنی کم آمیزی میں کمی کریں۔ مولانا نے ساری بات سن کے اپنے انداز خاص میں ایک آہ بھری اور کہا

> میرے بھائی میں اصولوں کا آدمی ہوں، اگر کسی شخص کو میری رائے سے اتفاق ہے تو میں اس کا شکر گزار ہوں، اگر نہیں تو کوئی شکایت نہیں، کوئی شکایت نہیں، کوئی شکایت نہیں۔

مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ جس بات پر زور دینا چاہتے تھے اس کو تین مرتبہ دہراتے تھے، اور "کوئی شکایت نہیں" کا جملہ انھوں نے تین مرتبہ دُہرایا اور اپنی طبیعت کے استغنار کا نقشہ کھینچ دیا۔ اور محسوس کرا دیا کہ قوم میں محبوبیت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے طرزِ عمل میں تغیر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مسلمانوں کی قیادت کے معاملے میں مولانا کی مشہور ناکامی کی اصل وجہ ان کا یہی طرزِ عمل تھا۔ اب رہا ان کا اصولی معاملہ تو اس باب میں اُن کی ذہنی اُفتاد وہ تھی جو انھوں نے گفتگو کے وقت بطور نصیحت کے ظاہر کی۔ یعنی آدمی جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے متعلق اُصول طے کر لے کہ وہ یہ کام کیا کر رہا ہے۔ پھر جب تک وہ اس اصول کی صحت کا قائل رہے اس کی جزئیات و تفصیلات میں اس اصول کی خلاف ورزی نہ کرے، اور یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس اصول کی غلطی واضح ہونے پر وہ از سرِ نو غور کرے اور اسے بدل کر دوسری راہِ عمل معین کرے۔ مگر جب تک اصول کی صحت مسلّم ہے یہ جائز نہیں کہ اس پر عمل کے دوران کسی خارجی مؤثر کی وجہ سے اصول کی خلاف ورزی کی جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے میرے نزدیک الہلال میں جو دعوت دی تھی اور اس دعوت کے لیے انھوں نے جو طریق کار اختیار کیا تھا، تحریک خلافت کے دوران میں انھوں نے اس پر از سرِ نو غور کیا اور سوچا کہ کیا اس غرض کے لیے صرف مسلمانوں کو مخاطب کرنا مفید اور کارآمد ہے۔ کیا صرف مسلمانوں کو اسلام کی اپیل پر بیدار اور منظم کر کے ملک کو آزاد کرایا جا سکتا ہے؟ کیا مسلمان اس اپیل پر لبیک کہہ سکتے

ہیں۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں مسلمانوں کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں بمقام لاہور جمعیت علمائے ہند کا جو سالانہ اجلاس ان کی صدارت میں منعقد ہوا تھا وہ ان کے سیاسی فکر کی حد فاصل تھا۔ یہاں سے انھوں نے اپنے گزشتہ پروگرام کو ختم اور نئے پروگرام کو شروع کیا۔

اس اجلاس تک مولانا کی کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں کو ان کی اپنی لیڈر شپ میں منظم کیا جائے ان کا قافلہ اور کل قافلہ سالار خود مسلمانوں میں سے ہو اور انھیں اسلامی اصولوں پر منظم کرکے تحریک آزادی میں جھونکا جائے، چنانچہ اس اجلاس میں انھوں نے ایک پروگرام پیش کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان ایک امیر کے ہاتھ پر جمع ہو جائیں۔ خلافتی مسلمانوں کی اکثریت خود مولانا کو امارت کا منصب سونپنے کے لیے تیار تھی۔ لیکن حنفی علماء کا ایک متشدد گروہ، ان کی "وہابیت" کو گوارا کرنے کے لیے مطلق آمادہ نہ ہوا اور امارت شرعیہ کی اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی۔ اس موقع پر مسلمانوں کے مختلف فقہی گروہوں کے مزاج و طبیعت کا جو مظاہرہ ہوا اس نے مولانا آزاد کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ تنہا مسلمانوں کی سیاسی اور دینی تنظیم کرکے آزادی کی جنگ لڑی جا سکتی ہے یا نہیں اور غالباً ان کو الہلال میں اپنے وہ فقرے یاد آگئے جو انھوں نے مسلمانان ہند کے جمود، بے حسی، سرکار پرستی اور آزادی کی راہ میں ان کے سنگ گراں ہونے کے متعلق لکھے تھے اور جنھیں میں اوپر بجنسہ درج کر چکا ہوں۔ انھوں نے اپنی منزل مقصود — جہاد حریت — اور اس تک پہونچنے کے پروگرام پر از سر نو غور کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ مسلمانوں کی کسی فرقہ وار جمعیت پر اپنا وقت اور اپنی قوت صرف کرنے کے بجائے اسے مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے پر صرف کیا جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو خود مسلمانوں سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام صلاحیتیں کانگرس کی تحریک آزادی کو کامیاب کرنے کے لیے وقف کر دی جائیں۔

الہلال کی "اسلامی دعوت" ان کے جہاد حریت اور احیائے ملت کا پروگرام تھی۔ جب یہ پروگرام انھیں جہادِ حریت کے لیے مفید معلوم نہ ہوا تو انھوں نے دوسرا پروگرام اختیار کر لیا اور اس پروگرام کے اصولوں اور تقاضوں کو پوری دقت سے پورا کیا۔

جب ضمیر جاگتا ہے ....!

کراچی کی ایک عدالت جمی ہوئی تھی۔ فاضل مجسٹریٹ مقدمات کا فیصلہ کر رہے تھے کہ جانی

نامی ایک نوجوان کمرۂ عدالت میں داخل ہوا۔ ایک چاقو مجسٹریٹ کی میز پر رکھا اور عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس کے گناہوں کی داستان سُنے۔ فاضل مجسٹریٹ نے نوجوان پر نظر ڈالی وہ تقریباً پچیس برس کا ایک جسیم شحیم نوجوان تھا۔ آنکھیں سُتی ہوئی اور پریشان تھیں جیسے انھیں کئی روز سے سونا نصیب نہ ہوا ہو۔ وضع و ہیئت سے وہ ایک عادی مجرم نظر آتا تھا لیکن چہرے سے ندامت اور اضطراب کے آثار ہویدا تھے۔ فاضل مجسٹریٹ نے پروقار لہجے میں کہا —— کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ —

اس نے اپنی داستان سناتے ہوئے کہا —— میں ایک گنہگار مجرم ہوں، میں نے بے شمار مظلوموں کو شکار بنا کر ان کا خون چوسا ہے، لیکن اب میرا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔ میں اپنے گناہوں پر سخت نادم و شرمسار ہوں اور عدالت سے میری مؤدبانہ التجا ہے کہ میرے ان ہاتھوں کو کٹوا دے جن سے میں ان مکروہ کاموں میں حصہ لیتا رہا ہوں، یا مجھے گولی مار دے، جانی نے عدالت کو مزید بتایا کہ میں نے بہت سے جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور ان کی پاداش میں کئی بار جیل جاچکا ہوں۔ گزشتہ جون میں میں آخری بار جیل سے رہا ہوا تھا۔ رہا ہونے کے بعد میں نے اپنا دھندا پھر شروع کر دیا۔ کوئی پانچ روز پہلے کی بات ہے میں نے ایک آدمی کی جیب کاٹی اور نیپیئر روڈ پر جا کر اس رقم کو شراب وکباب میں اڑا دیا۔ وہاں سے میں کسی اور شکار کی تلاش میں دوبارہ بی مارکیٹ گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ میں نے ان لوگوں کے درمیان دیکھا کہ وہی شخص زار و قطار رو رہا تھا جس کی میں نے کچھ دیر پہلے جیب کاٹی تھی۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میرا بچہ مر گیا ہے، اس کی لاش گھر پہ پڑی ہے۔ میں اپنے بچے کا کفن خریدنے آیا تھا، لیکن کسی نے میری جیب سے ۲۵ روپے نکال لیے۔ اب مردہ بچے کی تجہیز و تکفین کیسے ہو گی؟ اس مظلوم شخص کی یہ کیفیت دیکھ کر میرا دل بھر آیا، میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ چنانچہ میں اس شخص کے پاؤں پر گر پڑا، میں نے اس کو بتایا کہ وہ بدبخت میں ہی ہوں جس نے تمھاری جیب کاٹی تھی، اس سے معافی مانگی اور التجا کی کہ مجھے جو چاہے سزا دے لے۔ لیکن اس بندۂ خدا نے صبر سے کام لیا۔ مجھے معاف کر دیا اور لوگوں سے بھی کہا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کریں۔ اس کی یہی سزا کافی ہے۔ اس مردِ خدا نے مجھے دعا بھی دی کہ جا خدا تیرا بھلا کرے گا۔ جانے کو تو میں اپنے گھر چلا گیا، لیکن میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ مجھے کسی طرح چین نہیں آ رہا ہے، میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے، چار راتوں سے تو میں بالکل نہیں سو سکا ہوں۔ نہ کچھ کھانے ہی کو جی چاہتا ہے۔ اور اب میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا ملنی چاہیے۔ اسی صورت میں مجھے چین آئے گا۔

میں اپنے لیے یہی سزا تجویز کرتا ہوں کہ میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جائیں یا مجھے گولی مار دی جائے۔

جانی اپنی داستان سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، داستان ختم ہو جانے کے بعد فاضل مجسٹریٹ نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

پولیس تو جانی کے خلاف مقدمہ دائر کرے گی اور مروّجہ قوانین کے تحت اسے کسی عدالت سے چند سال کی سزا ہو جائے گی جو جانی کی اپنی تجویز کردہ سزا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوگی لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ نہیں ہے کہ اسے کتنی سزا ملتی ہے، بلکہ یہ ہے کہ ضمیر جب بیدار ہوتا ہے تو وہ انسان کے اندر کتنا زبردست انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہی شخص جو جرائم میں ڈوب کر اور سزاؤں پر سزائیں کاٹ کر بھی احساس نہیں کر پاتا کہ وہ کیسی ملامت آمیز اور شرمناک زندگی گزار رہا ہے، بندگانِ خدا کے لیے اس کا وجود کس قدر باعثِ اذیت بن چکا ہے۔ لوگ اس کے ہاتھوں کس طرح دکھ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن جوں ہی ایک واقعے سے اس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے اس کی وہی زندگی جسے گناہوں کی گندگیوں میں ڈوب کر بھی وہ عیش و مسرت کے نغموں میں مست گزار رہا تھا اس پر اجیرن ہو جاتی ہے۔ راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے دنوں کا چین جاتا رہتا ہے، کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اس کا ضمیر اس سے بار بار کہتا ہے کہ تجھے اپنے گناہوں کی سزا ملنی چاہیے پوری کی پوری سزا اور بالآخر اسے عدالت کے کٹہرے میں کشاں کشاں لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ جرم کرنے کے بعد فرار ہو جانے کا عادی تھا اور پکڑے جانے پر عدالتوں میں جھوٹ بول کر، جرم سے انکار کر کے اور اپنی بے گناہی کا ثبوت دے کر قانون کے شکنجے سے چھوٹ جانے کی کوشش کیا کرتا تھا، اب خود بخود عدالت میں حاضر ہو جاتا ہے، اپنے گناہوں کا خود اقرار کرتا ہے اور اپنی سزا خود تجویز کرتا ہے۔ جن جرائم سے اسے قانون باز نہ رکھ سکا تھا، عدالتوں کے فیصلے اور جیلوں کی سزائیں نہ روک سکی تھیں بلکہ ہر سزا کے بعد ذوقِ جرم میں اور اضافہ ہو جاتا تھا ضمیر کی ایک ملامت اسے ان سے روک دیتی ہے اور اس کی زندگی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

ضمیر کو قرآن پاک اور احادیث میں قلب کے نام سے پکارا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا ہی حقیقت ایمان افروز حدیث ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ سنورا رہے تو سارا جسم سنورا رہتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور وہ قلب ہے ضمیر جب اصلاح یافتہ ہوتا ہے تو انسان کے اعمال، افعال، سیرت و کردار سبھی اصلاح یافتہ ہوتے ہیں لیکن جب ضمیر بگڑا ہوتا ہے تو کوئی بھی سزا اور خوف اس کی سیرت و کردار کو بگاڑنے سے نہیں روک سکتا۔

(ایشیا لاہور)

تعارف و تبصرہ

انوار مصابیح بجواب رکعات تراویح

از مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی۔ صفحات ۳۲۸، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر ... ... قیمت ۲/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ مولانا نذیر احمد رحمانی، دار الاقامہ ۱۶/۵ پانڈے حویلی بنارس

رکعاتِ تراویح کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ جناب مولانا ابو المآثر حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے قلم سے ادھر کچھ دن ہوئے نکلا تھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ فاروقِ اعظم رضؓ کے عہد سے لے کر آج سے کوئی سو برس پہلے تک تمام دنیائے اسلام میں تراویح کی بیس یا بیس سے زائد رکعات ہی کا معمول رہا ہو۔ بیس سے کم کہیں نہیں پڑھی گئیں۔ قریباً صرف سو سال سے (جب کہ اہلحدیث مسلک ہندوستان میں پیدا ہوا ہے) بیس رکعت سے کم کی بات سننے میں آئی ہے، انوار مصابیح اسی رسالہ کا اہلحدیث حضرات کی طرف سے جواب ہو۔ جس میں مولانا اعظمی کے تمام دعووں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے ـــــ اور کوئی شبہ نہیں کہ فاضل مصنف نے اپنے مسلک کے دفاع کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے جواب میں متانت اور عالمانہ وقار کی بڑی کمی ہے۔

> "اہلحدیث کی انہی گرفتوں سے جان بچا کر نکل بھاگنے کے لیے "علامہ" مئوی نے حضرت طلق بن علیؓ کے اس واقعہ کی تفصیلات ذکر نہیں کی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان کی یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ آخر ہم نے ان کو اپنی گرفت میں لے ہی لیا۔ دیکھیں اب کس طرح وہ اپنی گلو خلاصی کرتے ہیں۔" (ص ۹۰)

اس عبارت میں کتنا ہلکا پن اور وقار و متانت کی کتنی کمی ہے!

رکعات تراویح کے ناشر نے مولانا اعظمی کے نام کے ساتھ "علامۂ کبیر" اور "محدث شہیر"

کے القاب لکھ دیے تھے، ان کو مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی نے ہر جگہ اسی طرح کاے ز " " لگاکر مولانا اعظمی کے استخفاف اور تضحیک کے لیے استعمال کیا ہو جس طرح منقولہ عبارت میں "علامہ" کا لفظ نظر آتا ہے ـــــ اس انداز جدال کو کس طرح اہلِ علم دین کے شایانِ شان کہا جاسکتا ہے؟

زمانہ کیا تقاضے کر رہا ہے اور ہمارے علماء ابھی تک ان فروعی نزاعات ہی سے اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ نہ صرف ذرا ذرا سے مسائل پر تین تین سو صفحات کی کتابیں لکھ ڈالتے ہیں، بلکہ انداز بحث بھی ایسا اختیار کرتے ہیں کہ اختلافات علمی حدود سے نکل کر جذباتی دائرہ میں جا پہونچا ہے۔ حد یہ ہے کہ اہلحدیث نقطۂ نظر سے نفس بیس رکعات پڑھنا قابلِ اعتراض نہیں، بلکہ نقطۂ اختلاف صرف یہ ہے کہ آٹھ سے جو اوپر ہیں وہ سنت سمجھ کر پڑھی جائیں یا نفل، مگر اس ذرا سے اختلاف پر نہ صرف ایک ضخیم بحث مرتب ہوگئی ہے بلکہ ایسے ایسے جذباتی نشتر اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ

"حنفی مذہب بھی کیا یتیم مذہب ہے کہ اس غریب کا سہارا یا تو کوئی ضعیف حدیث ہو یا کوئی کمزور توجیہ۔" (ص ۶۳)

کیا نتیجہ ہوگا ان نشتروں کا، سوائے اس کے کہ اُمتِ مسلمہ جسے آج ان تمام چھوٹے چھوٹے اختلافات سے بالاتر ہوکر اسلام کے لیے ایک ہوکر کھڑے ہوجانے کی ضرورت ہے اس کے علماء آپس میں شدید بیزاری کے ساتھ قلمی جنگ میں جُٹے رہیں۔ اور ناتربیت یافتہ عوام مسجد مسجد اور محلے محلے سر پھٹول کریں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تراویح کی رکعات کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں جس پر گفتگو کی جائے۔ لیکن یہ کسی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اس مسئلے پر تین تین سو صفحے سیاہ کیے جائیں اور اس انداز سے کیے جائیں کہ فریقِ مخالف پر حقیقت کھلنے کے بجائے اُس کا دل غبار کدورت سے اَٹ جائے ـــــ خدا نہ کرے کہ یہ جھگڑا اور آگے چلے اور کوئی حنفی یہ ارادہ کرنے لگے کہ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ ہمارے اس دور کے ایک مجتہدانہ انداز رکھنے والے مفسر قرآن گزرے ہیں انھیں اللہ نے اپنی کتاب سے ایسا شغف عطا فرمایا تھا کہ ان کی قریب قریب ساری عمر تدبر قرآن کے لیے وقف رہی اور اس کے نتیجہ میں وہ قرآن کی ایک خاص نہج پر بڑی خدمت انجام دے گئے۔ مولانا مرحوم کے کچھ خاص نتائج فکر تھے جن کے ماتحت انھوں نے اپنی تفسیر نظام القرآن لکھی۔ زیر تبصرہ تینوں رسالے ان کی اسی تفسیر کے مقدمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اول تو اپنے نام ہی سے نظام القرآن کا مقدمہ ہے۔ باقی دو کو بھی مصنف نے اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۱۔ مقدمۂ تفسیر نظام القرآن میں اولاً ان دو اصولوں کی توضیح کی گئی ہے جن پر مولانا کے پورے تفسیری کام کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد ایسی سولہ باتیں بطور مقدمات بیان کی گئی ہیں جن پر مطلع ہوئے بغیر آدمی مولانا کے نزدیک، قرآن کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا ــــــ ہو سکتا ہے کہ یہ مقدمات سب کے سب یا ان کا اکثر جز ..... کسی کے نزدیک قابل قبول نہ ہوں، مگر اس میں ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن فہمی کی کٹھن راہ میں سعی کرنے والے ان چند اوراق کو اپنے لیے مجموعی طور پر بے حد کار آمد پائیں گے۔

۲۔ قرآن میں قسموں کی بحث بہت ہی اہم مباحث میں سے ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس باب میں بھی اپنا اصولی خیال بطور ایک مقدمہ کے، ایک الگ رسالہ میں تحریر فرما دیا ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ بحث کر کے اس کو مدلل کیا ہے۔ اسی رسالہ کا نام اقسام القرآن ہے۔ اس کے متعلق بھی ہمارا خیال یہی ہے کہ خواہ کسی کو اس کے مندرجات سے پوری طرح اتفاق نہ ہو مگر اس کی افادیت سے شاید کسی کو بھی انکار نہ ہو سکے گا۔

۳۔ "ذبیح اللہ" کی حیثیت سے ہم سب قطعیت کے ساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جانتے ہیں، مگر اہل تورات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند حضرت اسحٰق کو "ذبیح" کا مصداق قرار دیتے ہیں، اور ہمارے بعض مفسرین بھی اسی طرف چلے گئے ہیں ــــــ واضح رہے کہ قرآن میں ذبح کا واقعہ حضرت اسمٰعیل کے نام کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے۔ مولانا فراہیؒ کی نظر میں بعض وجوہ سے اس مسئلہ کی بڑی اہمیت تھی۔ اور تفسیر کا دامن اس تفصیلی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، جو مولانا اس مسئلہ کو آخری حد تک صاف کرنے کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس مسئلہ پر بھی ایک

مستقل رسالہ تحریر فرمایا اور اس کو بھی اپنی تفسیر کا مقدمہ بنا دیا تاکہ موقع پر مختصر بات کہہ کر اسی کا حوالہ دیا جا سکے۔ یہی تیسرا رسالہ "ذبیح کون ہے" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اس میں مولانا نے تمام مالۂ و ماعلیہ سے بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ "ذبیح" قطعی طور پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔

مولانا فراہی عربی ہی میں لکھنے کے عادی تھے۔ چنانچہ یہ تینوں رسالے بھی اصلاً عربی ہی میں تھے لیکن ہمارے سامنے اصل نہیں بلکہ ان کا اردو ترجمہ ہو، جو مولانا فراہی کے فاضل شاگرد مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے کیا ہے۔ غلط نہیں ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ترجمہ کی صحت اور مصنف کے مطالب کے تحفظ کے لیے مولانا اصلاحی کا نام بہت بڑی ضمانت ہے۔ ترجمہ میں ترجمہ پن پیدا نہ ہونے دینے کے لیے مولانا اصلاحی کی مشاقی ہی یوں کیا کم تھی۔ مگر یہاں اس وصف کے ساتھ ایک چیز یہ اور بھی مل گئی ہے کہ مترجم، مصنف کے علوم و معارف کے بذاتِ خود "امین" بھی ہیں۔ چنانچہ ترجمہ من و عن اصل تصنیف ہی معلوم ہوتا ہے۔ جستہ جستہ مطالعہ میں صرف ایک مقام پر ایک لفظ ایسا نظر آیا جس سے ترجمہ کی بو آئی۔ ورنہ شاید تینوں رسالے پورے کے پورے پڑھ جانے پر بھی محض عبارت سے اس کا پتہ چلنا مشکل ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔

دائرۂ حمیدیہ نے ان تراجم کی اشاعت کر کے بہت قابلِ تحسین کام کیا ہے۔ کتابت، طباعت، اور کاغذ کا معیار بھی اچھا ہے۔ بلکہ اس معیار کو دیکھتے ہوئے قیمت کم کہی جانی چاہیے۔ ہم عربی مدارس کے فضلاء اور منتہی طلباء سے ان کتابوں کے مطالعہ کی پرزور اور پر خلوص سفارش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ دائرۂ حمیدیہ مولانا فراہی کی باقی کتابوں کے تراجم بھی شائع کرے گا۔

۵ے یہ مقام رسالہ نمبر ۲ کا صفحہ ۳۳ (سطر ۱ و ۲) ہے "...... فی الجملہ اس مسئلہ سے لوگوں کو اُنس ہو جائے"۔ غالباً مولانا کا ذہن متنبہ نہیں ہوا ورنہ وہ بڑی آسانی سے "لوگوں کو اُنس ہو جائے" کے بجائے "لوگ مانوس ہو جائیں" کر سکتے تھے۔

۱۔ اصلاح الرسوم۔ مولانا تھانویؒ کی مشہور کتاب ہے جو مدتوں سے چھپ رہی ہے اور اس میں اُن تمام قبیح اخلاق و عادات، رسوم و رواج اور افعال و اطوار کے شرعی احکام اور اُن کی قباحتیں بیان کی گئی ہیں جو مسلمانوں میں فی زمانہ رائج ہیں اور اُن کے خسران دنیا و آخرت کا موجب بن رہی ہیں۔ جن لوگوں کو اپنے دین کی فکر ہے، اُنھیں ضرور اس کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ صحیح معنیٰ میں "حکیم الامت" تھے۔ اُمت کے دینی امراض کے معاملہ میں اُن کی نظر بڑی تیز اور باریک بین تھی۔ انھوں نے ایک ایک بڑے اور چھوٹے بگاڑ پر انگلی رکھی اور اس کی اصلاح کی صورت تجویز فرمائی۔ خدا غریقِ رحمت کرے وہ اپنا کام کر گئے۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج مولانا مرحوم کے مسلک کی نمائندگی کرنے والے بعض علماء اپنے قول و عمل سے بعض اُن رسوم کو سندِ جواز بلکہ سندِ استحباب عطا کرتے نظر آتے ہیں جن کو مولانا نے اپنی اس کتاب میں قطعاً ناجائز ٹھہرایا ہے ــــــ مثلاً محافلِ میلاد کے بارے میں جواز و عدمِ جواز کی صورتیں بیان کرتے ہوئے مولاناؒ نے لکھا ہے۔

"وہ محفل جس میں قیود غیر مشروعہ موجود ہوں جو کہ اپنی ذات میں بھی قبیح و معصیت ہیں۔ مثلاً روایات موضوعہ خلاف واقعہ بیان کی جاویں ...... یا حدِ ضرورت سے زیادہ اس میں روشنی، فرش و آرائشِ مکان وغیرہ کا تکلف کیا جاوے یا لوگوں کو جمع کرنے کا اہتمام بہت مبالغہ سے کیا جاوے کہ اس قدر اہتمام نماز و جماعت و وعظ کے لیے بھی نہ ہوتا ہو۔ یا نثر یا نظم میں حضرت حق تعالیٰ شانہٗ یا حضرات انبیاء علیہم السلام یا حضرات ملائکہ علیہم السلام کی توہین، گستاخی، صراحتہً یا اشارۃً کی جاوے، اس مجمع میں جانے سے نماز یا جماعت فوت ہو جاوے یا وقت تنگ ہو جاوے یا اس کا قوی احتمال ہو، یا بانیٔ مجلس کی نیت شہرت و تفاخر کی ہو، یا رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں حاضر و ناظر جانا جاوے یا اور کوئی امر اسی قسم کا خلافِ شرع اس میں پایا جاوے یہ وہ صورت ہے جو اکثر عوام و جہلاء میں شائع و ذائع ہے اور شرعاً بالکل ناجائز و گناہ ہے۔"

(ص ۱۲۱-۱۲۲)

ہم بڑے رنج و افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ دیوبند کی نمائندگی کرنے والے بعض حضرات

اس قسم کی مجلسوں میں نہ صرف شرح صدر کے ساتھ تقریر کرنے آجاتے ہیں، بلکہ اُن کو موجب ثواب بھی بتا جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر مولانا تھانویؒ کی کتابیں کیا اثر ڈال سکیں گی؟۔

۲۔ یہ رسالہ "المھند علی المفند مع المصدقات" کے نام سے عرصہ سے شائع و ذائع ہے۔ اس میں علمائے حرمین کے استفسارات پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ (مہاجر مدنی) کے قلم سے علمائے دیوبند کے عقائد بیان ہوئے ہیں۔ یہ استفسار اس بنا پر کیا گیا تھا کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے حرمین جاکر وہاں کے علماء کو علماءِ دیوبند کے خلاف بھڑکایا تھا۔ علمائے حرمین اور عالم اسلامی کے دوسرے فاضل علماء نے علمائے دیوبند کی اس توضیح کو قبول کرکے ان عقائد کی تصدیق کی۔ یہ تصدیقات بھی رسالہ کا جزو ہیں ـــــــ بریلوی حضرات کا یہ پروپگنڈا آج تک جاری ہے۔ جس کسی کو ضرورت محسوس ہو کہ وہ اس پروپگنڈہ کی اصلیت معلوم کرے اُسے یہ رسالہ دیکھنا چاہیے اور پھر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔

یہ رسالہ اصلاً عربی میں تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ اردو ترجمہ بھی اس میں رہتا تھا۔ اب جدید ناشر نے اس کا صرف اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ شروع میں (غالباً) جدید ناشر نے جو دیباچہ لکھا ہے اس کی زبان میں بڑی گرمی اور تلخی ہے ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے۔

۳۔ یہ رسالہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سو مکاتیب (مع ترجمہ) پر مشتمل ہے۔ حضرت مجددؒ نے شرک و بدعت کے خلاف جو جہاد کیا ہے اُس سے انشاء اللہ ہر دور میں فائدہ اٹھایا جائے گا۔ جناب شیخ عبدالکریم صاحب نے (جو حضرت مجددؒ سے سلسلہ کا تعلق رکھتے ہیں) اسی غرض سے مکاتیب کا یہ ایک محدود سا انتخاب شائع کیا ہے تاکہ لوگ شرک و توحید کی حقیقت کو سمجھیں اور بدعات و منکرات سے مجتنب ہوں ـــــــ ترجمہ مجموعی لحاظ سے اچھا اور صاف ہو۔ لیکن جگہ جگہ ایسے مقامات بھی آتے ہیں جو نظر ثانی کی گنجائش ظاہر کرتے ہیں۔ بعض جگہ ترجمہ میں بات صاف نہیں ادا ہوئی ہے۔ بعض جگہ غلطی محسوس ہوتی ہے مگر کوئی ایسی غلطی نہیں جو ترجمہ کے مطلوبہ اثر میں مزاحم ہو۔

جناب ناشر نے مکتوبات اور صاحب مکتوبات کا تعارف کراتے ہوئے بعض تنقیدی اور تنبیہی باتیں بے ضرورت لکھ دی ہیں۔ یا اگر کوئی ضرورت بھی رہی ہو تو اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ یہی باتیں اس سے اچھے انداز میں کہی جا سکتی تھیں۔

زیارۃ القبور | از مولانا سید بادشاہ گل صاحب ۔ شائع کردہ دارالتصنیف جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور ۔ پاکستان ۔ صفحات ۱۱۶ ، قیمت -/-/۱/

مولانا سید بادشاہ گل صاحب پاکستان میں مسلک دیوبند کے نمائندہ حضرات میں سے ہیں ۔ ان کی اس کتاب کا موضوع زیارت قبور کے احکام و آداب کا بیان ہے ۔ ذیل میں سماع موتیٰ ، کرامات اولیاء ، حیات انبیاء و شہداء ، اور توسل وغیرہ کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں ۔ کتاب کے آخر میں بعض علماء دیوبند کی تقریظات و تصدیقات بھی شامل ہیں ۔

التوسل مع مسئلہ حیات النبیؐ | از مولانا مشتاق احمد صاحب مرحوم ، صفحات ۶۶ قیمت -/-/۹ شائع کردہ ، مکتبۂ تبلیغ الاسلام ، اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ سے توسل جائز ہے یا نہیں ؟ اس رسالہ کا موضوع توسل کا جواز ثابت کرنا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں آنحضرتؐ کی حیات بعد الممات کی نوعیت بھی واضح کی گئی ہو ۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اس رسالہ کے مضامین کی تصدیق کی ہے ۔

۱۔ سہل تجوید
۲۔ سراج البلاغت
} از جناب ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ صاحب حسینی پروفیسر فارسی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۔ صفحات علی الترتیب ۴۷ — ۱۶۰ ۔ قیمت اول پر درج نہیں ۔ دوم -/-/۲/

ملنے کا پتہ (جو صرف اول پر درج ہے) الحاج قاری عبد الرحیم صاحب استاد دار القرأت الدینیات الکلیمیہ ..... قریب گیٹ محکمۂ طبیہ ، بازار نور الامراء ، حیدرآباد دکن ۔

۱۔ اس کتاب پر تبصرہ الفرقان میں اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے ۔ اس وقت اس کا چوتھا اڈیشن زیر تبصرہ ہے جس میں خاصے اضافے اور ترمیم و نظر ثانی کا عمل بھی ہوا ہے ۔ ہماری رائے میں مبتدیوں کی تجوید کی تعلیم کے لیے یہ اردو میں بہت کامیاب کوشش ہے ۔ طریق تفہیم میں آسانی کی بہت رعایت کی گئی ہے ۔ ہر سبق کے آخر میں مشقی سوالات ہیں ۔

۲۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی تالیف سراج البلاغت کا دوسرا حصہ ہے ۔ جس کا موضوع علم بدیع ہو ۔ اس میں اختصار کے ساتھ ساتھ عربی ، اردو اور فارسی تینوں زبانوں سے کلام (نظم و نثر) دونوں کے

صنائع و بدائع کی مثالیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ ہائی اسکول سے لے کر بیک وقت ایم۔ اے تک کے کلاسوں کے لیے لکھی گئی ہے اور تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ شروع میں ایک فہرست دے دی گئی ہے کہ فلاں فلاں صنائع کا بیان فلاں فلاں جماعتوں کے لیے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کوشش پر تبصرہ کوئی صاحبِ فن ہی کرسکتا ہے۔

زاد الطالبین (عربی) | از مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب برنی۔ صفحات ۵۶۔ سائز کلاں قیمت -/۱/- کتاب ملنے کا پتہ:- (۱) دارالاشاعت اسلامیہ ۸۲ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ ۱۲

(۲) جامع قرآنیہ، لال باغ، ڈھاکہ۔ پاکستان۔

کتاب کا پورا نام ہے "زاد الطالبین من کلام رسول رب العالمین"۔ کتاب کا مقصد اصلاً درس نظامی کے مبتدی طلبا کو عربی ادب کی تعلیم دینا ہے۔ مگر اس کے لیے مؤلف نے راستہ یہ اختیار کیا ہو کہ احادیثِ نبوی کا ایک آسان اور مختصر مجموعہ مرتب کر دیا ہے، کہ ادب کا ادب آئے اور دین کا دین، یعنی ہم خرما و ہم ثواب۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں وہ چھوٹے چھوٹے پُرمغز ارشادات نبوی ہیں جنھیں جوامع الکلم کہا جاتا ہے۔ ان کو مؤلف نے نحوی قواعد کے عنوانات کے تحت جمع کیا ہے جس سے بہت سے قواعد کی مشق بھی ہوجاتی ہے۔

۱۔ فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ | از مولانا حامد علی صاحب، ایڈیٹر "زندگی" صفحات ۳۲ قیمت ۲۰ نئے پیسے

۲۔ حقیقت کی تلاش | " جناب صدر الدین خاں صاحب " ۶۰ " ۵۰ "

۳۔ اسلام ایک عظیم جدوجہد | " " " " " ۳۲ " ۳۲ "

۴۔ عام معلومات (حصہ چہارم) | " سید منظور الحسن ہاشمی بی اے " ۱۲۸ " ۱/۳۰

۵۔ ہمارے نغمے (اول و دوم) | " افضل حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ قیمت حصہ اول ۲۰/- حصہ دوم ایضاً

۶۔ پیاری نظمیں (اول و دوم) | " " " " " -/۲۵ " ایضاً

۷۔ ہماری سواریاں (۱۔ موٹر ۲۔ ریل گاڑی) | " سید منظور الحسن ہاشمی " ۱ ۲۱/- ۲ ایضاً

شائع کردہ۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ رام پور (یو۔ پی)

۱۔ گذشتہ سال ہندوستان میں نام نہاد فرقہ وارانہ فسادات (اور در حقیقت مسلمانوں پر ظلم و تعدی) کا

جو ایک سلسلہ سا چلا تھا، یہ پمفلٹ اسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ اس میں اکثریت، حکومت اور مسلمانوں سب ہی سے صاف صاف باتیں کی گئی ہیں، اور خاص طور سے مسلمانوں کے سامنے وہ باتیں پیش کی گئی ہیں جو انھیں اس مصیبت سے نکال سکتی ہیں۔

۲۔ وحیدالدین خاں صاحب جماعت اسلامی ہند کے بہت اچھے اور مفکرانہ انداز کے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے قلم سے پچھلے چند ہی سالوں کے اندر متعدد فکر انگیز مقالات نکل چکے ہیں "حقیقت کی تلاش" بھی ان کا ایک ایسا ہی مقالہ ہے جس میں انھوں نے "ہم کیا ہیں؟ اور یہ کائنات کیا ہے؟" کے بنیادی انسانی سوالات اٹھا کر پہلے سائنس کے جوابات اور اس کے نتائج تحقیق کا جائزہ لیا ہے اور پھر اس کی کمزوریاں واضح کرتے ہوئے اُن جوابات کی حقانیت ثابت کی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں ملتے ہیں۔

۳۔ یہ بھی وحیدالدین خاں صاحب ہی کا ایک مقالہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام دراصل ایک جدوجہد ہے آخرت میں کامیابی کے حصول کی۔ اور اس جدوجہد کے اہم اجزا ہیں ایمان، ہجرت اور جہاد۔ آخرت کے ماننے والوں کو اس مقالہ سے مستفید ہونا چاہیے۔

۴۔ یہ جماعت اسلامی ہند کے مرتب کردہ ابتدائی نصاب تعلیم کا ایک جزو ہے جس میں طلباء کے جسم، سیرت کی اور نظری ماحول کے متعلق عام معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اسے ہم نیچرل سائنس کی ایک ایسی کتاب کہہ سکتے ہیں جو طلباء کو خدا اور رسول سے دور کرنے کے بجائے قریب کرتی ہے۔ ہماری نظر میں جماعت اسلامی ہند کی یہ تعلیمی کاوشیں بہت قابل قدر ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنی ان نصابی کتابوں کو کسی بھی قسم کی جماعتی چھاپ سے بالکل الگ رکھنے کی کوشش کرتے۔ پیش نظر کتاب میں تو ایسی کوئی چیز نہیں ہے مگر بعض دوسری کتابوں میں، بقدر قلیل سہی، خاص جماعتی ذہن کی چھاپ کہیں کہیں پڑ گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے بچوں کے ذہن کو جماعت اسلامی اور اس کے فکری رہنماؤں سے مانوس ہوتا پسند نہیں کرتے ــــ اور اُن کی تعداد غیر معمولی ہے ــــ وہ اس نصاب سے احتراز کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں کو یہ بات گوارا نہ ہونی چاہیے۔

۵۔ یہ ذرا بڑے بچوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کے لیے نظم کی کتاب ہے۔ جو دو حصوں میں ہے

نظمیں مفید اور دلچسپ ہیں۔

۶۔ یہ چھوٹے بچوں کے لیے نظم کی کتابیں ہیں، ننھی منی اور آسان۔

۷-۸۔ یہ چھوٹے بچوں کے لیے معلوماتی ریڈرس کے سلسلے کی دو کتابیں ہیں باتصویر اور رنگین۔ ان میں سے ایک میں بچوں کو موٹر کی کہانی سنائی گئی ہے جس میں موٹر کی ایجاد کی سرگزشت اور اسکے منافع بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری اسی طرح ریل گاڑی سے متعلق ہے۔ معلومات کے ساتھ ساتھ بچوں میں اسلامی ذہن اُبھارنے کی کوشش بھی ان کہانیوں میں حکمت کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی ہے۔

نئے کردار | از مائل خیرآبادی۔ ناشر: مکتبۂ فردوس۔ ہمایوں باغ کانپور۔
صفحات ۱۰۲، قیمت ۱/-/-

یہ چند اصلاحی انداز کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ فنی اعتبار سے دلچسپی ڈھونڈھنے والوں کو تو شاید اس میں کامیابی نہ ہوگی اور نہ فنی چابکدستیوں سے پیدا ہونے والا تأثر یہ افسانے دے سکیں گے البتہ اصلاحی مقصد کے لحاظ سے ان کی قدر کی جاسکتی ہے۔

صدائے بازگشت | از ڈاکٹر زین العابدین صاحب قدوائی بیکس بھیاردی۔ صفحات ۱۹۲
قیمت درج نہیں، ناشر: ملک دین محمد اینڈ سنز، اشاعت منزل بل روڈ، لاہور

ڈاکٹر زین العابدین صاحب قدوائی بھیاردی (ثم لکھنوی) کی شاعری کی عمر پچاس سال سے کم نہیں ہے۔ لیکن ان کی شاعری محض تسکینِ ذوق کے لیے ہے اسلئے ان کی طبیعت نے کبھی اسکی اشاعت کا تقاضہ نہیں کیا۔ اور اتنی لمبی مدت سے شعر گوئی کے باوجود بجز ان کے حلقۂ احباب کے معدودے چند ہی لوگ ہوں گے جو ان کے شعری ذوق سے واقف ہوں۔ یہ ان کے صاحبزادے (مقیم کراچی) کی دلچسپی کا طفیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام (غزلیات) کا ایک مجموعہ جو اب تک ضائع ہونے سے بچا رہ گیا تھا مطبوعہ دیوان کی شکل میں محفوظ ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ کسی خاص مقصد اور کسی خاص جذبے کے ماتحت فکر سخن نہیں کرتے۔ اسلیے ان کے اشعار کو بجز وارداتِ قلبی کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ واردات جب اشعار کے روپ میں ڈھلتے ہیں تو کیا رنگ لاتے ہیں، اس کا اندازہ ان چند اشعار سے کیجیے۔

٭ دل بستگی کا اب کوئی ساماں نہیں رہا — بتلاؤ کیا کریں کہ گریباں نہیں رہا
وحشت کے ساتھ ساتھ بڑھی وسعتِ نظر — اب تو جنوں بقید بیاباں نہیں رہا

٭ مانا کہ تم نے طور پہ جلوہ دکھا دیا — لیکن نظر کو محو تماشا بنا دیا
تکمیلِ ذوقِ جلوہ گری کے خیال سے — اک خود نمانے دل سا مجھے آئینہ دیا

٭ کچھ پتہ دے دے کہ اک عمر بھٹکتے گزری — راستہ بھول گیا ہوں ترے کاشانے کا

٭ کسی نے کیا اتنا رنگیں اشارہ — ہوا دامنِ صبر پھر پارہ پارہ
بنا سر سے پا تک میں رشکِ گلستاں — مجھے جوشِ وحشت نے اتنا سنوارا

٭ ادھر سوئے چمن دیکھا اُدھر بجلی چمک اٹھی — یہ صورت ہو تو باز آئے بنائے آشیاں سے ہم

٭ شوق کی بیقراریاں دل کی یہ آہ و زاریاں — آخر شب کا یہ سکوت اور تمھیں خبر نہیں

٭ رونے کو روئے لیکن نہ سمجھے — رحمت چھپی ہے دامانِ تر میں

٭ ترا نام لینے سے اے جانِ تمکیں — اضافہ سا ہے لذتِ جانکنی میں

٭ زلف بکھرا کے تو کچھ اور نکھر جاتے ہیں — تم جتنا وہ بگڑتے ہیں سنور جاتے ہیں

٭ اے عندلیب تھم جا چلتے ہیں ساتھ ہم بھی — تو گل کو ڈھونڈھتی ہے ہم دل کو ڈھونڈتے ہیں

٭ گردشِ آسماں سے دور حلقۂ بزم ناز ہو — مجھ سا جنوں پرست ہو تم سا جنوں نواز ہو
دیکھو جدھر اُدھر ہیں بت سارا جہاں ہے بتکدہ — کیسے ہو سجدۂ نیاز کیسے ادا نماز ہو

٭ مجھے جستجو تھی جس کی وہ ملا تو گم ہوا میں — یہ جہانِ آرزو بھی ہے عجیب فریب خانہ
غمِ زندگی سے مل کر جو تمام عمر رویا — اُسے موت بھی نہ پوچھے نہ ہے گردشِ زمانہ

ان اشعار کے انتخاب میں تبصرہ نگار کی پسندیدگی کا نقطۂ نظر ضرور کارفرما ہے مگر وہ نقدِ شعر کی کوئی خاص صلاحیت نہ رکھنے کے باوجود وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اہلِ نظر اس انتخاب کو کس نظر سے دیکھیں گے لیکن ایک غزل کے یہ شعر تو شاید کسی سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

٭ غم رہے جانِ مبتلا جائے — اک بلا ٹھیرے اک بلا جائے
نکہتِ زلف گر صبا لائے — دل کو شاید قرار آجائے
کیسے تسکینِ قلبِ مضطر ہو — جب نظر مل کے تھرتھرا جائے

کیوں کریں انتظار موسم گل ۔ مسکرا دو بہار آ جائے

دیوان کے شروع میں مولانا اقبال سہیل اور ڈاکٹر حفیظ سید وغیرہ کے قلم سے تعارف و تبصرہ اور تقریظ و تنقید وغیرہ کی رسم ادا ہوئی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ سید نے کچھ تنقیدی پہلو بھی ابھارے ہیں۔ مگر مجموعی حاصل ان تحریروں کا داد و تحسین ہی ہے۔ اور یہ ایک گمنام شاعر کے لیے بڑی سند ہے۔ ڈاکٹر حفیظ سید صاحب نے بیکس کی غزلوں میں جا بجا جگر کا رنگ بتاتے ہوئے لکھا ہے

> "مگر جگر کی "آئی ادئی"، "اُف وہ نازک کلائیاں توبہ" والی نسائیت اور کھل کھیلنے والے رنگ سے ان کا کلام پاک ہے ...... اور جہاں تک متانت کا سوال ہے وہ یقیناً جگر سے زیادہ پائی جاتی ہے۔" (ص۶۵)

ہم سمجھتے ہیں کہ سید صاحب کی رائے قابل تنقید ہی نہیں قابل تردید تھی۔ یہ بات "کل کے" جگر کے متعلق صحیح ہوگی۔ مگر ۱۹۳۸ء میں (جبکہ حفیظ سید صاحب یہ الفاظ لکھ رہے تھے) جگر اس رنگ سے نکل کر بہت دور جا چکے تھے۔ اور ہر روز دور سے دور تر ہی ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ آج "معاملہ بندی اور عاشقانہ مضامین" کے باوصف ان کا کلام متانت کی اس سطح پر ہے کہ جہاں وہ رند مشربوں اور ثقاہت پرستوں کی پسندیدگی کا سنگم بن گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیسے سید صاحب نے یہ لکھ ڈالا۔ اور کیسے بیکس صاحب نے اس کو بلا تنقید شائع کر دیا۔

صحیفۂ ہمام بن منبہؒ

کہا جاتا ہے کہ حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سو برس بعد قلمبند کی گئی ہیں لہذا اُن کا کوئی اعتبار نہیں۔ "صحیفۂ ہمام بن منبہ" کی اشاعت نے اس پر فریب اعتراض کا بھی قلع قمع کر دیا ہے۔ حضرت ہمام بن منبہؒ مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیا تھا، لیکن یہ کتاب اب تک منظر عام پر نہیں آئی تھی صرف اس کا تذکرہ حدیث کی کتابوں میں ملتا تھا۔ ہمارے زمانہ کے مشہور اسلامی محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس کا ایک نسخہ کسی طرح ڈھونڈھ نکالا اور پھر اس کو مع ترجمہ اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کر دیا۔ انمول تحفہ۔ قیمت ۔ -/-/۲

ترجمان السنہ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مقیم مدینہ طیبہ۔

یہ احادیث کا ایک جدید مجموعہ ہے جسے حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ایک خاص ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ حدیث کی اس نئی خدمت کا چند لفظوں میں تعارف نہیں کرایا جا سکتا ہے۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کی اتنی بلند پایہ خدمت اردو تو کیا شاید عربی میں بھی اب تک نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک پورا اسلامی کتب خانہ ہے اور کسی تعلیم یافتہ مسلمان کو خواہ وہ جدید تعلیم کا حامل ہو یا قدیم تعلیم کا اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اب تک تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

جلد اول :- مجلد -/-/۱۲ - غیر مجلد -/-/۱۰

جلد دوم :- مجلد -/-/۱۱ غیر مجلد -/-/۹

جلد سوم :- مجلد -/-/۱۲ غیر مجلد -/-/۱۰

علم الحدیث

از مولانا عبد اللہ انصاری۔ باوجود مختصر ہونے کے اپنے موضوع پر نہایت مفید کتاب جس میں حدیث کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شبہات کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ قیمت -/۴/۱

تدوین حدیث

از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔ تدوین حدیث کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ صحیح احادیث کا جو ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقہ پر پہونچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں۔ قیمت مجلد -/-/٦

تاریخ و سیرت

رحمت عالمؐ

سیرت نگار نبوی مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے سیرت کی مشہور و مقبول اور آسان کتاب جو خاص طور سے اسکولی طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ قیمت ۔ ۱۲/۱

سیرت پاک

از مولانا بشیر محمد شارق دہلوی۔ مصنف گو مشہور و معروف نہیں ہیں مگر کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سیرت پر اس سے زیادہ کامیاب کتاب شاید ہی اس وقت کوئی اور ہو۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس قیمت ۴/۱

صدیق اکبرؓ

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا شبلی کی الفاروق کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبر کا جو خلا محسوس ہوتا تھا مولانا اکبر آبادی کی اس کتاب نے اس کو کما حقہ پر کر دیا ہے۔ قیمت -/۵

تاریخ دعوت و عزیمت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ خلافت راشدہ کے بعد اسلام کی وہ حقیقی دعوت اور اس کی نصرت حمایت کے لیے کون کون سی اہم شخصیتیں کس کس وقت میدان میں آئیں اور انھوں نے کیا کیا کارنامے کس کس نہج سے انجام دیے۔ یہ اس کتاب کا موضوع ہے — جلد اول پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک۔ جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہؒ نیز ان کے تلامذہ کی خدمات اور حالات کے بیان میں۔

قیمت علی الترتیب ۔ -/۴ ۔ ٦/٨/٠

تاریخ ملت

شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ قیمت مکمل سٹ (گیارہ حصوں میں)

غیر مجلد -/٨/۳۱ ۔ مجلد -/-/۳۴

الگ الگ۔

حصہ اول (نبی عربیؐ) -/٨/۱۔ حصہ دوم (خلافت راشدہ) -/٨/۲۔ سوم (خلافت بنو امیہ) -/٨/۲۔ چہارم (خلافت ہسپانیہ) -/۲۔ پنجم (خلافت عباسیہ اول) ۳/۱۲۔ ششم (خلافت عباسیہ دوم) -/۱۲/۳

ہفتم (تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ) -/۴/۳ ہشتم (خلافت عثمانیہ) -/۴/۳، نہم (تاریخ صقلیہ) -/۱۲/۱، دہم (سلاطین ہند اول) -/۸/۳۔ یازدہم (سلاطین ہند دوم) -/۸/۳

تاریخ اسلام پر ایک نظر

از مولوی محمد عبدالرحمٰن خان ایم۔اے ـــــ اسلام کے مختلف دوروں اور خلافت و حکومت کے مختلف اسلامی سلسلوں کی جامع و مختصر تاریخ

غیر مجلد قیمت -/۶ - مجلد -/۸/۶

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی مشہور و معروف تحریک اور اس کے خصوصاً اس دور کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں جو مشہد بالاکوٹ کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔ ـــــ قیمت -/۸/۲

تاریخ مشائخ چشت

از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ سلسلۂ چشتیہ کی نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ۔ نیز تصوف اور خاص کر چشتی سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں۔

قیمت غیر مجلد -/۱۲، مجلد -/۱۳

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخ موصوف ہندوستان کی نہایت اہم علمی و دینی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی سوانح کی کمی کو اس تحقیقی کتاب نے پورا کر دیا ہے (ایضاً از پروفیسر نظامی)

قیمت مجلد -/-/۷

سوانح قاسمی

یعنی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا مفصل تذکرہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے قلم سے تین جلدوں میں

قیمت ہر سہ جلد کامل -/۸/۱۵

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے۔ عجیب و غریب حالات، دل میں اتر جانے والا انداز بیان۔ اور دیکھنے کے قابل کتابت و طباعت، غرض ہر لحاظ سے ایک پسندیدہ کتاب۔ قیمت مع جلد صرف -/۸/۲

حکیم الامت

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

یہ حضرت تھانویؒ کا قابل دید تذکرہ ہے۔ آپ کو اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔

قیمت ـــــ -/۸/۸

سفرنامہ ابن بطوطہ

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان سیاح شیخ ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامہ کا ملخص۔ اردو ترجمہ از جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ۔ جس سے دنیا کے سینکڑوں ملکوں کے مستند حالات معلوم ہوتے ہیں۔

قیمت مجلد ـــ -/۸/۲

دہلی اور اس کے اطراف انیسویں صدی کے آخر میں

(از مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ)

یہ فاضل مؤلف کا ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے جس سے دہلی اور اس کے آس پاس کے شہروں کے بارے میں آج سے ۵۰ سال پہلے کی نہایت مفید علمی و دینی اور ثقافتی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مجلد قیمت -/-/۲

تاریخ دیوبند

قصبۂ دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخ۔ از سید محبوب رضوی صاحب، قیمت مجلد -/-/۲

سیاست و حکومت

رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے جو آپ کے علم و بصیرت میں بیش بہا اضافہ کرے گی۔ مجلد قیمت -/۷

عہد نبوی کے میدان جنگ جس میں غزوات نبوی پر فن حرب (جنگی سائنس) کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ متعدد نقشے بھی شامل کتاب ہیں۔ ایضاً از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ قیمت ۱/۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات یعنی شاہان عالم عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں سے آپ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات، ان کے پس منظر اور نتائج۔ از سید محبوب رضوی۔ قیمت مجلد ۲/۴

اسلام کا نظام حکومت اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی، اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہے۔ طرز تحریر زمانہ حال کی قانونی زبان سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ قیمت غیر مجلد -/۶ مجلد -/۷

مسلمانوں کا نظم مملکت یہ دراصل ایک مصری فاضل کی کتاب "النظم الاسلامیہ" کا اردو ترجمہ ہے اسکے مطالعہ سے مسلمانوں کے نظام حکومت و مملکت کی ایک صاف محققانہ تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ قیمت غیر مجلد -/۴ مجلد -/۵

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی زبردست علمی انہماک کے باوجود امام اعظمؒ اپنے زمانہ کی ریاست کے نیک و بد سے بے تعلق نہیں رہے تھے — مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی یہ کتاب آپ کی زندگی کے سیاسی پہلو کی مکمل روداد بیان کرتی ہے —
قیمت مجلد -/۱۲

مختلف موضوعات پر قابل مطالعہ کتابیں

خطبات مدراس سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے آٹھ خطبے۔ جن کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ دائمی اور عالمگیر نمونہ عمل صرف سیرت محمدیؐ ہی ہو سکتی ہے۔ قیمت ۳/۸

مقالات احسانی تصوف اور مشائخ تصوف سے متعلق مولانا گیلانیؒ کے قابل دید مقالات و مضامین کا مجموعہ۔ قیمت مجلد ۶/۸

اسلام کا زرعی نظام اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔ قیمت غیر مجلد -/۴ مجلد -/۵

اسلام کا نظام عفت و عصمت اسلام نے پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کے جو اصول مقرر کئے ہیں انکی تفصیل اور ان کی حکمت اس کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ قیمت ۔/۴

اسلام کا نظام مساجد اسلام کے نظام میں ساجد کا کیا مقام ہے اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں اور اس کے بارہ میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ قیمت ۸/۳

غلامانِ اسلام از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ــــ یہ کتاب غلاموں پر اسلام کے احسانات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ قیمت مجلد ۸/۶

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات از جناب مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ موضوع نام سے ظاہر ہے دو جلدیں قیمت (مکمل) ۱۲/۵

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ مسلمانوں میں نام نہاد سیکڑوں فرقوں کے وجود کی محققانہ تردید، اور اس افسانہ تراشی کے اسباب۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔ مجلد قیمت ۸/۱

تاریخ علم فقہ از مفتی عمیم الاحسان صاحب (ڈھاکہ یونیورسٹی) قیمت مجلد ۱/

بدعت کیا ہے چند نہایت مفید مقالات کا مجموعہ جو "فاران" کراچی کے "توحید نمبر" میں شائع ہوئے تھے قیمت ۔/۲

اخلاق اور فلسفہ اخلاق از ــــ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری فلسفہائے اخلاق اور انواع اخلاق پر سیر حاصل بحث، نیز اسلام کے ابواب اخلاق کی دل پذیر تشریح۔ قیمت مجلد ۸/۷، غیر مجلد ۸/۶

مسلمانوں کا عروج وزوال از، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ــــ مسلمانوں کے حیرت انگیز عروج اور عبرت انگیز زوال کی داستان تاریخ کی روشنی میں۔ قیمت مجلد ۔/۵ غیر مجلد ۔/۴

سفرنامہ حجاز از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ قیمت ۔/۵

حج کا مسنون طریقہ حجاج کے لیے کارآمد کتاب۔ از، مولانا سعید احمد صاحب مفتی مظاہر علوم سہارنپور۔ قیمت ۴/۱

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا راز ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اقرار اور ایک اہم فیصلہ اور معاہدہ ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے [illegible] میں اس کی [illegible]

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے [illegible] ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرة

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارہ الفرقان

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (بسکۂ ہندستان) [illegible]
سالانہ چندہ (بسکۂ پاکستان) [illegible]
ششماہی [illegible]

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ [illegible]

جلد ۲۷ | بابت ماہ رجب ۱۳۷۹ھ مطابق فروری ۱۹۶۰ء | شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو. براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائیگا. وی پی میں آپ کے کچھ آنے نامۂ صرف ہونگے اور رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا. چندہ یا کوئی دوسری اطلاع زیادہ سے زیادہ ۲۰ فروری تک پہنچ جانی چاہیے۔

پاکستانی خریدار } اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت } رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۰ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تک کسی صاحب کو نہ ملے، تو مطلع فرمائیں انکی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔ شکایت پر دوسرا رسالہ آئندہ ماہ کے رسالے کے ساتھ بھیجا جائیگا. جلدی ہو تو براہ کرم ۱۲ نئے پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :۔ **دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ**

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت ہند نے ملک کے تعلیمی اداروں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم دیئے جانے کے مسئلے پر ایک کمیٹی مقرر کی تھی، اس نے حال ہی میں اپنی رپورٹ پیش کی ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:-

"تعلیمی دنیا میں اور سماج میں مجموعی طور پر جو صورت حال ہے اور جس کے نتیجہ میں وسیع پیمانہ پر گڑبڑ ہے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ عوام پر سے مذہب کا اثر بتدریج ختم ہو رہا ہے۔"

اس نتیجہ پر پہنچ کر کمیٹی نے زور دیا ہے کہ

"تعلیمی اداروں میں اخلاقی اور روحانی قدروں کی تعلیم کا خاص طور سے انتظام کیا جانا چاہیئے۔" نیز کہا ہے کہ "اس قسم کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لئے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ مختلف مذاہب کے لیڈروں کے حالات زندگی کا ہمدردی کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا جائے۔"

رپورٹ میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "کسی بھی تعلیمی اسکیم میں طالب علم کے گھر کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔" اور اس بنا پر مشورہ دیا گیا ہے کہ "عوامی پیمانہ پر ہمارے گھر کی خامیاں اور وہاں کی نفسیاتی فضا پر توجہ دینا چاہیئے اور وہ طریقے بتانے چاہئیں جن کے ذریعہ یہ خامیاں دور کی جا سکیں[1]۔"

[1] قومی آواز لکھنؤ ۲۹ جنوری ۱۹۷۰ء

پہلے ہی دن مان لیجئے یا تجربات کی چٹانوں سے سر پھوڑ کر مانیئے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مذہب کی گرفت اگر انسانوں پر سے ڈھیلی ہوتی ہے اور اخلاقی و روحانی قدریں کمزور پڑتی ہیں تو انسان انسان بن کر نہیں رہ سکتا اور دنیا اپنی ساری مادی ترقیوں کے باوجود اندر کے امن و اطمینان اور باطنی پاکیزگی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

یہ ہماری خالص اس دنیاوی زندگی کے نقطۂ نظر کی بات ہے جو ہمیں مذہب اور اخلاقی قدروں کے استحکام کی ضرورت ماننے پر مجبور کرتی ہے، لیکن جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے بھی قائل ہیں، اور ایمان رکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا اصل دور وہی ہے۔ انکی نظر میں تو دراصل مذہبی سانچے میں ڈھلی ہوئی اور روحانی اقدار سے ہم آہنگ زندگی ہی کو اس دنیا میں سب سے زیادہ اہم اور قابل فکر چیز ہونا چاہیئے۔

کس قدر حیران کن صورت حال ہے کہ نوع انسانی کا جو گروہ آخرت کا سب سے زیادہ واضح، زندہ، موثر اور طاقتور تصور رکھتا ہے، اور جس کا ظہور ہی دنیا کے پردہ پر اس غرض سے ہوا تھا کہ دنیا کو جھنجھوڑ کر آخرت فراموشی سے نکالے اور پھر قیامت تک اپنے قول و عمل سے آخرت کا تصور زندہ رکھنے میں لگا رہے اسکا یہ حال ہو کہ آج اگر کسی ملک کے نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم کا کوئی خانہ نہیں ہے تو وہ عملاً بے فکری کے ساتھ اس بات پر راضی ہے کہ اسکی نئی نسل اپنے مذہب کی تعلیم سے بیگانہ رہ جائے، بلکہ وہ اس سے آگے بڑھکر اس بات پر بھی راضی ہے کہ اگر اسکے بچوں کو کوئی ایسی تعلیم ملتی ہے جو انکی آخرت کو یقینی طور پر خراب کرکے رکھ دے تو ملتی رہے۔

آج دس سال سے ہمارے ملک کے سرکاری اور نیم سرکاری نظام تعلیم میں ہمارے بچوں کو ایسی تعلیم دی جارہی ہے جس میں نہ صرف انکی مذہبیات کا کوئی خانہ نہیں بلکہ الٹے ایسی چیزیں ہیں جو انکے حق میں گمراہ کن مذہبی تعلیم کے مرادف ہیں۔ اور جو اگر انھیں صنم پرست نہیں تو اوہام پرست ضرور بنا کر رکھدینگی ـــــ ہم یہ مطالبہ نہیں کرسکتے کہ ان سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں ہمارے بچوں کو ہمارے مذہب اور ہمارے عقائد کی تعلیم دیجائے، لیکن دو باتیں تو ہم کرسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم قطعیت اور

پوری سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کریں کہ ان درسیات کو ہم کسی طرح اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے گوارا نہیں کرینگے جن سے ہمارے بچوں کے سادہ ذہنوں پر صنم پرستی اور وہم پرستی کے نقوش قائم ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ہم اپنے بچوں کو خواندہ بنانا ضروری سمجھتے ہیں اور اسکے لئے مجبور ہیں کہ سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں بچوں کو بھیجیں اور اسکا ضروری خرچ برداشت کریں اسی طرح ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا خود انتظام کریں اور اسکا ضروری خرچ برداشت کریں۔

صوبہ یوپی میں نئی مسلمانوں کے مختلف مکاتب کے اہل الرائے اور نمائندگان نے دسمبر کی آخری تاریخوں میں ایک جگہ جمع ہو کر اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور صوبہ کے مسلمانوں کو (بلکہ در اصل تمام ملک کے مسلمانوں کو) آواز دی ہے کہ وہ ان دونوں کاموں کے لئے خصوصاً آخری کام کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کمربستہ ہو جائیں۔ اس اجتماع میں اس تحریک کو عملاً برپا کرنے کے لئے ایک کونسل بنا دی گئی تھی جس کا پہلا اجلاس اس ماہ (شعبان۔ فروری) کے وسط میں ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس اجلاس کے بعد عملی کام شروع ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جب کام شروع ہوگا تو اور مسئلوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم مسئلہ کل وقتی یا شبینہ و صباحی مکاتب کے لئے ضروری سرمایہ کا آئے گا ——— اس بات کو سوچ کر ہمارا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ یہ مہینہ (یعنی شعبان کا مہینہ) وہ مہینہ ہے جس میں مسلمان لاکھوں روپیہ آتش بازی کی نذر کرتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم میں کا ہر صاحب احساس اور صاحب شعور اپنی اپنی جگہ کھڑا ہو جائے اور یہی روپیہ جو آتش بازی کا شوق کرنے والے یا اپنے بچوں کے اس شوق پر خرچ کرنے والے مسلمان شعبان کے دوسرے ہفتے میں کچھ نکال کر رکھ دیں گے، ان سے مانگا جائے کہ وہ اس اہم دینی ضرورت کے لیے جو ہر ہر مسلمان گھر کی فوری ضرورت ہے، اللہ کے نام پر پھینک دیں؟ ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہوگی اور اسی طرح ایک اچھا سرمایہ دینی تعلیمی تحریک کے پہلے ہی مرحلہ میں جمع ہو جائے گا۔

ہم اپنی یہ تجویز صوبائی دینی تعلیمی کونسل کے ارکان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ اس سے اتفاق کریں تو ابھی وقت ہے کہ وہ یہ (شب براتی) چندہ جمع کئے جانے کی مناسب عملی شکل تجویز کر کے قوم کے نام اپیل شائع کریں۔

معارف الحدیث

(مُسلسل)

قضاءِ حاجت کے بعض احکام و آداب :-

[مندرجہ ذیل احادیث کے مطالعہ کے وقت اب سے چودہ سو برس پہلے کے عرب کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی عادات اور اُس دور کے تمدن کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔]

(۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا اللَّاعِنَيْنِ قَالُوا وَمَا اللَّاعِنَانِ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ أَوْ فِي ظِلِّهِمْ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لعنت کا سبب بننے والی دو باتوں سے بچو، صحابہ نے عرض کیا کہ حضرت! وہ دو باتیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ایک یہ کہ آدمی لوگوں کے راستہ میں قضاء حاجت کرے اور دوسرے یہ کہ اُن کے سایہ کی جگہ میں ایسا کرے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ لوگ جس راستہ پر چلتے ہوں یا سایہ کی جس جگہ میں آرام کرنے کے لئے بیٹھتے ہوں اگر کوئی گنوار آدمی وہاں قضائے حاجت کرے گا تو لوگوں کو اس سے اذیت اور تکلیف پہنچے گی اور وہ اسکو برا بھلا کہیں گے اور لعنت کرینگے لہذا ایسی باتوں سے بچنا چاہیے — اور سنن ابی داؤد میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی ایک حدیث

مروی ہے اس میں راستے اور سایہ کے علاوہ ایک تیسری جگہ موارد کا بھی ذکر ہے جس سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں پانی کا کوئی انتظام ہو اور اسکی وجہ سے لوگ وہاں آتے جاتے ہوں۔ اصل مقصد حضور کی اس ہدایت کا بس یہ ہے کہ اگر گھر سے باہر جنگل وغیرہ میں ضرورت پیش آجائے تو ایسی جگہ تلاش کرنی چاہیئے جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہو اور ان کے لئے باعث تکلیف نہ بنے۔

(۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ الْبَرَازَ انْطَلَقَ حَتَّى لَا يَرَاهُ أَحَدٌ ـــــ (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب آپ کو قضائے حاجت کے لئے باہر جانا ہوتا تو اتنی دور اور ایسی جگہ تشریف لے جاتے کہ کسی کی نظر آپ پر نہ پڑ سکتی ـــــ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں شرم و حیا اور شرافت کا جو مادہ ودیعت رکھا ہے اس کا تقاضا ہے کہ انسان اسکی کوشش کرے کہ اپنی اس قسم کی بشری ضرورتیں اس طرح پوری کرے کہ کوئی آنکھ اس کو نہ دیکھے، اگرچہ اس کے لئے اس کو دور سے دور جانے کی تکلیف اٹھانی پڑے یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا اور یہی آپ کی تعلیم تھی۔

(۱۰) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ فِي مُسْتَحَمِّهِ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ أَوْ يَتَوَضَّأُ فِيْهِ فَإِنَّ عَامَّةَ الْوَسْوَاسِ مِنْهُ ـــــ (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ تم میں سے کوئی ہرگز ایسا نہ کرے کہ اپنے غسل خانہ میں پہلے پیشاب کرے پھر اس میں غسل یا وضو کرے کیونکہ اکثر وسوسے اسی سے پیدا ہوتے ہیں ـــ

ـــــــــ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا بہت ہی غلط اور بڑی بے تمیزی کی بات ہے کہ آدمی اپنے غسل کرنے کی جگہ میں پہلے پیشاب کرے اور پھر وہیں غسل یا وضو کرے، ایسا کرنے کا ایک برا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے پیشاب کی چھینٹوں کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں ـــــ اس آخری جملے

یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا تعلق اسی صورت سے ہو جب غسل خانہ میں پیشاب کے بعد غسل یا وضو کرنے سے ناپاک جگہ کی چھینٹوں کے اپنے اوپر پڑنے کا اندیشہ ہو ورنہ اگر غسلخانے کی بناوٹ ایسی ہے کہ اس میں پیشاب کے لئے الگ جگہ بنی ہوئی ہے یا اس کا فرش ایسا بنایا گیا ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد پانی بہا دینے سے اس کی پوری صفائی اور طہارت ہو جاتی ہے تو پھر اس کا حکم یہ نہیں ہے۔

(۱۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَرْجِسَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِي جُحْرٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی کبھی ہرگز کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرے۔

(تشریح) جنگل میں اور اسی طرح گھروں میں جو سوراخ ہوتے ہیں وہ عموماً حشرات الارض کے ہوتے ہیں اگر کوئی گنوار آدمی یا نادان بچہ کسی سوراخ میں پیشاب کرے تو ایک تو اس میں رہنے والے حشرات الارض کو بے ضرورت اور بے فائدہ تکلیف ہوگی دوسرے یہ بھی خطرہ ہو کہ وہ سوراخ سانپ، بچھو جیسی کسی زہریلی چیز کا ہو اور وہ اچانک نکل کر کاٹ لے۔ ایسے واقعات بکثرت نقل بھی کئے گئے ہیں۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جو امت کے ہر طبقہ کے لئے اصل مربی اور معلم ہیں) سوراخ میں پیشاب کرنے سے ان ہی وجوہ سے بتاکید منع فرمایا ہے۔

(۱۲) عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ فَاِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْخَلَاءَ فَلْيَقُلْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قضائے حاجت کے ان مقامات میں خبیث مخلوق شیاطین وغیرہ رہتے ہیں پس تم میں سے کوئی جب بیت الخلا جاوے تو چاہیئے کہ پہلے یہ دعا کرے کہ میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں خبیثوں سے اور خبیثنیوں سے۔ (سنن ابی داؤد و سنن ابن ماجہ)

(تشریح) جس طرح ملٰئکہ کو طہارت و نظافت اور ذکر اللہ سے اور نجاست کے مقامات سے

خاص مناسبت ہو اور وہیں ان کا جی لگتا ہے اسی طرح شیاطین جیسی خبیث مخلوقات کو گندگیوں سے اور گندے مقامات سے خاص مناسبت ہے اور وہی انکے مراکز اور دلچسپی کے مقامات ہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ تعلیم دی کہ قضائے حاجت کی مجبوری سے جب کسی کو ان گندے مقامات میں جانا ہو تو پہلے وہاں رہنے والے خبیثوں اور خبیثنیوں کے شر سے اللہ سے پناہ مانگے اسکے بعد وہاں قدم رکھے ــــــ ہم عوام کا حال یہ ہے کہ نہ ذکر و عبادت کے مقامات میں ہم فرشتوں کی آمد اور ان کا نزول محسوس کرتے ہیں اور نہ گندے مقامات پر ہمیں شیاطین کے وجود کا احساس ہوتا ہے لیکن صادق و مصدوق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی خبر دی ہے اور اللہ کے بعض بندے اسکے خاص فضل سے ان حقیقتوں کو کبھی کبھی خود بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں اور اس سے ان کے ایمان میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔

(۱۳) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ "غُفْرَانَكَ" (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب آپ حاجت سے فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر آتے تو اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے "غُفْرَانَكَ" (اے اللہ تیری پوری مغفرت کا طالب و سائل ہوں)۔

(تشریح) قضاء حاجت سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی اس مغفرت طلبی کی متعدد توجیہیں کی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ لطیف اور دل کو لگنے والی توجیہ اس عاجز کے نزدیک یہ ہے کہ انسان کے پیٹ میں جو گندہ فضلہ ہوتا ہے وہ ہر انسان کے لئے ایک قسم کے انقباض اور گرانی کا باعث ہوتا ہے اور اگر وہ وقت پر خارج نہ ہو تو اس سے طرح طرح کی تکلیفیں اور بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اگر طبعی تقاضے کے مطابق پوری طرح خارج ہو جائے تو آدمی ایک ہلکاپن اور ایک خاص قسم کا انشراح محسوس کرتا ہے اور اسکا تجربہ ہر انسان کو ہوتا ہے ــــــ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ صحیح احساس رکھنے والے عارفین کے لئے بالکل یہی حال گناہوں کا ہے وہ ہر طبعی انقباض اور دنیا کے ہر اندرونی اور بیرونی بوجھ اور ہر گرانی سے زیادہ گناہوں کے بوجھ اور انکی گرانی اور اذیت کو محسوس کرتے ہیں اور گناہوں کے بارے اپنی پیٹھ کے ہلکا ہونے کی فکر ان کو بالکل (باقی صفحہ ۲۲ پر)

تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(از: مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی)

مکتوب (۸۹) میرزا اصل جان کے نام (تعزیت)

.... آدمی کو کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے) کے بموجب موت سے مفر نہیں ـــ اس شخص کی خوشحالی وخوش نصیبی یقینی ہے جس نے عمر دراز پاکر اعمالِ خیر کا زیادہ ذخیرہ جمع کیا ـــ یہی موت ہے جس کے ذریعے مشتاقوں کو تسلی دیتے ہیں، اور اسی موت کو دوست کی دوست سے ملاقات کا وسیلہ بناتے ہیں ـــ مَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا آرزومند ہے پس بے شک اللہ کی ملاقات کا وقت آنے والا ہے) ـــ ہاں وہ پسماندگان اور باقی ماندگان جن کو ان واصلانِ حق کی صحبت سے دوری ہو جائے ان کا حال خراب وابتر ہوتا ہے ـــ تمہارے ولی نعمت کی شخصیت اس زمانے میں بہت ہی غنیمت تھی ـــ اب تم لوگوں پر لازم ہے کہ احسان کا بدلہ احسان سے دو اور دعا وصدقہ سے ہر وقت انکی مدد کرو ـــ (حدیث میں ہے کہ) مرنے والا، کسی ڈوبنے والے کی طرح، اپنے ماں، باپ بھائیوں اور دوستوں کی ملحقہ دعاؤں کے سہارے کا انتظار کرتا ہے ـــ یہ بھی چاہیئے کہ انکی موت سے اپنی موت کا دھیان ہو اور خود کو مرضیٔ حق کے سپرد کر کے حیاتِ دنیا کو

متاعِ فریب شمار کرو ـــــ اگر دنیا کے ٹھاٹ باٹ کی (اللہ کی نظر میں) کچھ بھی عزت ہوتی تو کفارِ بدکردار کو اس میں سے بال برابر بھی کچھ نہ دیا جاتا ـــ اللہ تعالےٰ ہمیں اور تمھیں ماسوی سے اعراض اور اپنی درگاہ کی طرف توجہ کی توفیق نصیب کرے بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۹۲) شیخ کبیر کے نام ـــــ (اطمینانِ قلب، ذکر سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ نظر واستدلال سے)

.... اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ ہوجاؤ کہ دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں) ـــــ (اس قولِ خداوندی کی رو سے) اطمینانِ قلب کی راہ، ذکر اللہ ہے نہ کہ نظر واستدلال۔ ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود ✕ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

ذکر کے ذریعے جنابِ قدس سے ایک گونہ مناسبت ہوجاتی ہے۔ (بندۂ حقیر کو) اگرچہ (اس جناب سے) کوئی مناسبت (فی الحقیقۃ) نہیں۔

ع۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

لیکن ایک قسم کا علاقہ، ذاکر و مذکور کے درمیان ضرور ہوجاتا ہے جو سببِ محبت بن جاتا ہے ـــــ جب محبت غالب ہوئی تو اطمینان ہی اطمینان ہے جب کام اطمینانِ قلب تک پہونچا تو دولت ابدی اس کو نقد مل گئی۔ ؎

ذکر گو ذکر تا ترا جان است ✕ پاکیٔ دل ز ذکرِ رحمٰن است

مکتوب (۹۳) سکندر خاں لودی کے نام۔

[تمام اوقات ذکرِ الٰہی میں صرف کئے جائیں]

جماعت سے نماز پنجگانہ کی ادائیگی اور سننِ موکدہ کی ادائیگی کے بعد اپنے اوقات کو ذکرِ الٰہی میں مصروف رکھنا چاہیئے ـــ کھانے پینے، سونے اور (بلا ضرورت) آنے جانے میں ہی اوقات کو مشغول نہ رکھا جائے ـــــ طریقۂ ذکر تم کو تبلادیا گیا ہے اسی طریقے پر ذکر کرو ـــــ اگر جمعیتِ قلب میں کمی محسوس ہوتی ہو تو اوّل اس کا

سبب متعین کرنا چاہیئے، بعد ازاں اس سبب کی تلافی کی جائے ـــ التجا اور تضرع و زاری کے ساتھ، حضرتِ حق کی جانب متوجہ ہونا اور اسی سے دفع ظلمت کو طلب کرنا چاہیئے اور جس مرشد سے ذکر سیکھا ہے اُس کو وسیلہ بنایا جائے ...... والسلام

مکتوب (۹۴) خضر خاں لودی کے نام

[تصحیح عقائد اور اعمال صالحہ کے بغیر چارہ نہیں]

.... جو چیز ضروری اور لابدی ہے وہ یہ ہے کہ اولاً عقائد کی تصحیح بمطابق اہل سنت وجماعت ہونا نیز، فرائض، سنن، واجبات، مستحبات، حلال، حرام، مکروہ، اور مشتبہ کا علم حاصل کیا جائے پھر احکام فقہیہ کے بموجب، اعمال ادا کئے جائیں ـــ اعتقاد و عمل کے ان دو بازوں کے میسر آجانے کے بعد اگر توفیقِ خداوندی مدد فرمائے تو عالمِ حقیقت کی طرف پرواز ممکن ہے ـــ اور جب تک یہ دو بازو حاصل نہیں، عالمِ حقیقت کی طرف پرواز اور عالمِ حقیقت تک پہونچنا محال ہے

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفٰی

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں متابعتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت قدم رکھے،
والسلام

مکتوب (۹۶) محمد شریف کے نام (نصائح)

.... اے فرزند! آج جب کہ فرصت کا وقت ہے اور اسباب جمعیت سب حاصل ہیں (کارِ خیر میں) تاخیر اور ٹال مٹول کی گنجائش نہیں ہے۔ نوجوانی کے بہترین زمانے کو بہترین اعمال میں یعنی طاعت و عبادتِ مولیٰ میں صرف کرنا چاہیئے ـــ محرمات اور مشتبہاتِ شرعیہ سے پرہیز کر کے پانچ وقت کی نماز باجماعت اپنے اوپر لازم کرنا چاہیئے ـــ نصاب کی موجودگی میں زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی ضروریاتِ اسلام میں سے ہے اسکو بھی رغبت بلکہ جذبۂ احسان مندی کے ساتھ ادا کیا جائے ـــ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالِ کرم سے تمام دن رات میں (صرف) پانچ وقت ادائے عبادت

کے لئے مقرر فرمائے ہیں اور مال نامی اور جنگل میں چرنے والے جانوروں میں سے چالیسواں حصہ (تحقیقی یا تقریبی طور پر) فقراء کے لئے مقرر فرمایا ہے ـــــ اور مباحات کے تصرف کا میدان وسیع کر دیا ہے ـــــ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ رات دن کی ساٹھ گھڑی میں سے دو گھڑی بھی عبادت الٰہی میں مصروف نہ ہوں اور چالیس میں سے ایک حصہ بھی فقراء کو نہ دیا جائے اور "دائرۂ وسیعۂ مباحات" سے قدم باہر رکھ کر محرمات اور مشتبہات میں گامزنی کی جائے ـــــ ایام جوانی میں، کہ نفس امارہ کے تسلط اور شیطان لعین کی حکومت کا زمانہ ہے ـــــ عمل قلیل کو اجرِ کثیر کے مقابلے میں قبول کیا جاتا ہے ـــــ کل کو جب کہ بڑھاپے کی عمر آجائے گی، قوت میں کمی رونما ہوگی اور اسباب جمعیت قلب پراگندہ ہو جائینگے اس وقت سوائے ندامت اور پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا ـــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل کا موقع ہی نہ دیا جائے اور ندامت و پشیمانی جو کہ ایک قسم کی توبہ ہے میسّر نہ ہو سکے ـــــ عذاب ابدی اور عقوبت سرمدی جس کی خبر پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہو اور نافرمانی کرنے والوں کو اس سے ڈرایا ہے ـــــ سامنے ہے ـــــ شیطان آج "کرم پروردگار" کا فریب دے کر سستی میں ڈال رہا ہے اور عفوِ خداوندی کو بہانہ بنا کر ارتکاب معاصی کرا رہا ہے ـــــ خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا محل آزمائش ہے یہاں دوست اور دشمن دونوں کو ملا جلا رکھا گیا ہے، دونوں کو "مشمول رحمت" بنایا گیا ہے ـــ (ارشادِ باری تعالیٰ) رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے) سے اسکا پتہ چل رہا ہے (مگر) قیامت کے دن دشمن کو دوست سے جدا کر دینگے ـــــ آیۂ کریمہ وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (اے مجرمو! آج کے دن جدا ہو جاؤ) اس بات کا پتہ دے رہی ہے ـــــ قیامت میں قرعۂ رحمت "بنام دوستان" آئے گا اور دشمنوں کو مطلقاً محروم و ملعون کر دیا جائے گا ـــــ

فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ

(یقیناً میں اپنی رحمت کاملہ حصہ میں کروں گا، ان ہی بندوں کے جو کفر و معاصی سے پرہیز کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں) یہ آیت کریمہ حقیقت

کو واضح کررہی ہے ــــــــ الحاصل ـــ کرم و رحمت کو آخرت میں ابرار اور نیکوکار اہل اسلام کے ساتھ مخصوص رکھا ہے۔ یہ ضرور ہو کہ ایمان والوں کے لئے خاتمہ بالخیر ہونے کی صورت میں رحمت خداوندی سے حصہ ہے اگرچہ (اپنے اعمال بد کی پاداش میں) ایک زمانہ دراز تک عذاب دوزخ کو بھگت کر نجات پائیں ــــــ لیکن ظلمت معاصی اور احکام ساوی سے (مطلق و مسلسل) بے پروا ہی، نور ایمان کو سلامت لے جانے کا موقع کب دیتی ہے؟ علماء نے فرمایا ہے کہ صغیرہ پر اصرار کرنا کبیرہ تک اور کبیرہ پر اصرار کفر تک پہونچا دیتا ہے ــــــ پناہ بخدا ــــــ اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات کی توفیق عنایت فرمائے ـــ بحرمۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم .... والسلام

مکتوب (۹۸) عبدالقادر پسر شیخ زکریا کے نام ـــ

(خوش اخلاقی کی ترغیب میں)

.......چند احادیث نبوی جو تذکیر و وعظ کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ـــــ لکھی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان احادیث کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے ــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ لطف و نرمی کرنے والا ہے اور وہ لطف و نرمی کو پسند کرتا ہے ــــــ اور وہ نرمی پر جو عطا فرماتا ہے وہ سختی و درشتی پر اور نرمی کے علاوہ کسی چیز پر نہیں دیتا ـــــ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ اے عائشہ اپنے اوپر نرمی کو لازم کرلو ـــ سختی و درشتی اور گفتگو میں حد سے تجاوز کرنے سے باز رہو ـــ بے شک نرمی جس چیز میں پائی جاتی ہے اس کو آراستہ کر دیتی ہے اور جس چیز میں سے نکال لی جاتی ہے اس کو عیب دار کر دیتی ہے ــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو شخص نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ نیکی سے محروم کر دیا جاتا ہے ـــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے ـــ کہ میرے نزدیک تم میں زیادہ محبوب وہ ہے جو اخلاق میں زیادہ اچھا ہے ـــ اور یہ بھی فرمایا کہ جس کسی کو نرمی و ملائمت کا حصہ دیا گیا اسکو دنیا و آخرت کی نیکی دیدی گئی ــــــ اور یہ بھی فرمایا کہ حیا، ایمان کی شاخ ہے اور

ایمان والا بہشت میں جائے گا ـــــ بے حیائی اور بیہودہ گوئی بدی کی بات ہے اور بدی والا جہنم میں جائے گا ـــــ بے شک و شبہ خداوند کریم حد سے گزرنے والے بیہودہ گو کو دشمن رکھتا ہے ـــــ کیا میں تمھیں خبر نہ دوں کہ کون ہے وہ جو آتش دوزخ پر حرام ہے اور آتش دوزخ اس پر حرام ہے؟ ـــــ (سنو) ہر اس شخص پر آتش دوزخ حرام ہے جو آہستہ رو، نرم طبع، لطف و مہربانی کی وجہ سے لوگوں سے نزدیک اور نرم خو ہے ـــــ مسلمان (نرمی کے مواقع میں) نرم طبع اور مطیع ہوتے ہیں اس اونٹ کی طرح جس کی ناک میں مہار ڈال دی گئی ہو اس اونٹ کو جب کھینچا جاتا ہے مطیع ہو کر کھنچ جاتا ہے اور جب کسی پتھر پر بٹھاتے ہیں بیٹھ جاتا ہے ـــــ اور جو شخص غصے کو پی جائے حالانکہ غصے کے مطابق عملدرآمد کی قوت رکھتا تھا تو اللہ تعالیٰ اسکو قیامت کے دن تمام اولین اور آخرین کے مجمع میں بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کرے ـــــ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ـــــ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ـ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "غصہ مت کرنا" ـــــ اس شخص نے پھر کئی بار یہی عرض کیا کہ مجھے نصیحت کیجئے ـ آپ نے ہر مرتبہ یہی ارشاد فرمایا کہ "غصہ مت کرنا" ـــــ آپ نے فرمایا کیا میں تمھیں اہل بہشت کی خبر نہ دوں؟ (سنو) ہر ضعیف و حقیر سمجھا جانے والا شخص مگر (عند اللہ اس مرتبے کا) کہ جب وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم کو پورا کر دے ـــــ فرمایا کہ کیا میں خبر نہ دوں اہل دوزخ کی؟ ـــــ سنو ہر وہ شخص جو سخت مزاج، سخت گو جھگڑالو اور متکبر ہے ـــــ (آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ) جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اگر وہ کھڑا ہے پس اس کو بیٹھ جانا چاہیئے اس طریقے سے اگر غصہ چلا جائے تو بہتر ہے ورنہ کروٹ کے بل لیٹ جائے ـ فرمایا کہ غصہ کرنا ایمان کو اس طرح تباہ و برباد کر دیتا ہے جس طرح ایلوا، شہد کو خراب کر دیتا ہے ـــــ فرمایا ـــــ جس کسی نے اللہ کے واسطے تواضع اختیار کی اللہ نے اس کو اونچا کر دیا پس وہ تواضع و انکساری کرنے والا اپنے نزدیک حقیر ہے مگر لوگوں کی آنکھوں میں عظیم ہوتا ہے، اور جس کسی نے تکبر اختیار کیا اللہ نے اسکو حقیر و پست کر دیا پس وہ لوگوں کی آنکھوں میں حقیر ہے اور اپنے نزدیک بڑا بنا ہوا ہے حتیٰ کہ لوگوں کی نظروں میں وہ کتے اور سور سے بھی

زیادہ ذلیل ہوجاتا ہے ــــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے پروردگار تیرے نزدیک تیرے بندوں میں عزیز ترین کون ہے؟ فرمایا وہ شخص جس کو سزا دینے پر قدرت ہو اور معاف کردے (بیہقی) ــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو اپنی زبان کو قابو میں رکھے گا اللہ تعالیٰ اسکے عیب ڈھانپ لے گا اور جو کوئی اپنے غصّے کو پی جائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو دور رکھے گا اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے عذرخواہی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرمائے گا ــــــ یہ بھی فرمایا کہ ــــ جس کسی پر اپنے بھائی کا کوئی حق ہو، مثلاً کسی کی ہتک عزت کی ہو یا کچھ اور بے انصافی یا حق تلفی کی ہو، تو اس کو چاہیئے کہ آج ہی اس حق کو معاف کرائے ــــــ اس وقت سے پہلے جبکہ اسکے پاس دینار و درہم نہ ہوں گے، اگر اس کے پاس اعمال صالحہ ہوں گے تو ان میں سے اس ظلم کے بقدر لے لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہوں کا بوجھ اس ظالم پر ڈال دیا جائے گا ــــ نیز فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ــــــ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ مفلس وہ ہے جس کے پاس مال و متاع نہ ہو ــــ فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ (سب کچھ اعمال خیر) لے کر آئے گا مگر اس حال میں آئے گا کہ کسی کو گالی دی تھی، کسی پر تہمت دھری تھی، کسی کا مال، ناحق کھا لیا تھا کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو مارا پیٹا تھا ــــــ پس ان مظلوموں میں سے ہر ایک کو ظالم کے حسنات دیدیئے جائیں گے اگر اسکی نیکیاں ختم ہوگئیں اور ابھی پورے طریقے پر ادائیگی حقوق نہیں ہوئی تو ان مظلوموں کے گناہ لئے جائیں گے اور وہ گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور اس ظالم کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا ــــــ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو لکھا کہ مجھے کوئی وصیت لکھ کر بھیجئے ــــ حضرت عائشہؓ نے ارقام فرمایا ــــــ سلام ہو تم پر ــــ بعد سلام کے واضح ہو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس کسی نے لوگوں کی ناراضگی کا خیال نہ رکھتے ہوئے اللہ کی خوشنودی کو طلب کیا تو اللہ تعالیٰ

اسکی کارسازی کرے گا اور لوگوں کی ناراضگی و روگردانی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور جس کسی نے لوگوں کی خوشنودی طلب کی اور اللہ کی ناراضگی کا خیال نہ کیا تو پھر اللہ اسکو لوگوں کے سپرد کرے گا (مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اسکو اپنی مدد سے محروم کر کے اسی جیسے محتاج لوگوں کے سپرد فرما دے گا) ـــــ والسلام علیک"ـــــ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے صحیح فرمایا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم کو اور تم کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دے جن کی خبر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ـــــ..... ان احادیث کا مطلب سمجھ کر کوشش کرو کہ ان احادیث کے مطالبے اور تقاضے پر عمل میسر ہو جائے ـــــ "عقل دور اندیش" کو بروئے کار لانا چاہیئے ـــــ دنیا کی ظاہری تر و تازگی پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیئے ـــــ اگر دنیا میں (حقیقی) عزت و آبرو ہوتی تو کفار و دنیا دار ہی سب سے زیادہ عزت مآب ہوتے ـــــ دنیا کے ظاہری حال پر فریفتہ ہونا بیوقوفی کی نشانی ہے "فرصت چند روزہ" کو غنیمت سمجھتے ہوئے خدائے عز وجل کی مرضیات میں کوشاں رہنا چاہیئے ـــــ اور اللہ کی مخلوق پر احسان کرنا چاہیئے ـــــ اللہ کے حکم کی تعظیم اور مخلوق خدا پر احسان و شفقت یہ دونوں چیزیں نجاتِ اخروی کے لئے "اصلِ عظیم" ہیں ـــــ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ مطابقِ حقیقت ہے (نعوذ باللہ) خواہ مخواہ کی باتیں نہیں ہیں ـــــ خوابِ خرگوش کب تک طاری رہے گی؟ اس کا انجام رسوائی اور بے نوائی ہے اور رسوائی و بے نوائی بھی کیسی کچھ (جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا) ـــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم عبث پیدا کئے گئے ہو اور تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا نہیں ہے" ـــــ ہر چند میں جانتا ہوں کہ تمہارا زمانہ اس قسم کی باتوں کے سننے کا تقاضہ نہیں کرتا ـــــ آغازِ جوانی ہے پھر تنعماتِ دنیاوی سب میسر ہیں اور لوگوں پر حکومت و تسلط بھی حاصل ہے ـــــ لیکن تمہارے حال پر جو شفقت ہے وہ شفقت اس (ناصحانہ) گفتگو کا باعث بن رہی ہے ـــــ ابھی کچھ نہیں گیا ـــــ وقت توبہ موجود ہے ـــــ اطلاع کرنا ضروری تھی ـــــ

۴۔ درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

مکتوب (۱۰۰) ملا حسن کشمیری کے نام ـــــــ (ایک سوال کے جواب میں)

.... التفات نامۂ گرامی نے مشرف کیا از روئے کرم جو کچھ آپ نے ارقام فرمایا تھا وہ واضح ہوا، آپ نے لکھا تھا کہ شیخ عبد الکریم یمنی نے کہا ہے کہ "حق تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہے"۔

مخدوما! فقیر کو اس قسم کی باتیں سننے کی بالکل طاقت نہیں ہے میری رگ فاروقیت (ایسی باتوں سے) بے اختیار جوش میں آجاتی ہے اور تاویل وتوجیہ کا موقع نہیں دیتی۔ چاہے ایسی باتیں شیخ کبیر یمنیؒ کی ہوں یا شیخ اکبر شامیؒ کی ـــــــ ہمیں تو کلام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہے نہ کہ محی الدین عربیؒ، صدر الدین قونویؒ اور عبد الرزاق کاشیؒ کا کلام ـــــــ ہم کو نص (قرآن وحدیث) چاہیئے نہ کہ فص (فصوص الحکم کا کوئی باب) فتوحات مدنیہ (احادیث نبویہؐ) نے ہم کو فتوحات مکیہ (تصنیف شیخ اکبرؒ) سے بے نیاز کردیا ہے ـــــــ حق تعالیٰ نے خود اپنے کو علم غیب کے ساتھ موصوف کیا ہے اور خود کو عالم الغیب فرمایا ہے لہٰذا اس سے علم غیب کی نفی کرنا بہت ہی قبیح بات ہے اور فی الحقیقت یہ حق تعالیٰ کی (ایک گونہ) تکذیب ہے ـــــــ غیب کے کچھ اور معنی بیان کرنا بھی اس قول کی قباحت دور نہیں کرتا ـــــــ

.... منصورؒ نے اگر انا الحق کہا یا حضرت بایزید بسطامیؒ نے سبحانی کہا تو وہ اپنے قول میں غلبۂ حال کی بنا پر معذور ومغلوب ہیں ـــ لیکن وہ بات جو تم نے دریافت کی ہے "احوال" سے نہیں ہے اسکا تعلق علم سے ہے۔ .... اس قول میں کوئی سند معتبر نہیں اور اس مقام میں کوئی تاویل مقبول نہیں ـــــــ سکر والوں کے کلام کی تاویل کیجاتی ہے اور اس کو ظاہر سے پھیرا جاتا ہے نہ کسی اور کے کلام کو ـــــــ اگر اس کلام کے متکلم کا مقصود اس کلام سے یہ ہے کہ ملامت خلق حاصل ہو اور لوگ اس سے متنفر ہوں تو یہ بات بھی قبیح ہے ـــــــ ملامت خلق حاصل کرنے کے لئے تو اور بہت سے راستے ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ کوئی اپنے آپ کو سرحد کفر تک پہونچائے (اور پھر ملامت مول لے)

مکتوب (۱۰۲) ملا مظفر کے نام

[اس بیان میں کہ سودی قرض لینے میں فقط قدر زائد ہی حرام نہیں بلکہ کل رقم حرام ہے]

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ——— تم نے ایک دن یہ کہا تھا کہ سود فقط زیادتی کا نام ہے — مثلاً دس ٹکے کے عوض جو بارہ ٹکے دیے جائیں اس میں دو ٹکے کی زیادتی ہی حرام ہے ——— جب کتب فقہیہ کی طرف رجوع کیا گیا تو ظاہر ہوا کہ شریعت میں ہر وہ معاملہ جس میں زیادتی ہے وہ ربا ہے پس یہ (سودی قرضے کا) معاملہ ضرور حرام ہوگا اور حرام کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا جائے گا وہ بھی حرام ہوگا، لہٰذا وہ دس ٹکے بھی ربا اور حرام ہوں گے ——— کتاب جامع الرموز اور روایات کتاب ابراہیم شاہی کے بھیجنے سے مقصود اسی معنیٰ کا اظہار تھا ——— باقی رہی احتیاج کی بات سو مخدوم من! حرمت سود تو نص قطعی سے ثابت ہوئی ہے اور محتاج وغیر محتاج سب کو شامل ہے ——— یہاں پر محتاج کی تخصیص کر لینا اس حکم قطعی کے منسوخ قرار دینے کا مرادف ہے ——— رہی روایت قنیہ وہ اس درجے کی نہیں کہ حکم قطعی کو منسوخ کر ڈالے ——— مولانا جمال لاہوری جو علماء لاہور میں بڑے درجے کے عالم ہیں فرماتے تھے کہ بہت سی روایات قنیہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں اور کتب معتبرہ کے مخالف ہیں ——— اور اگر اس روایت کو تھوڑی دیر کے لئے صحیح مان بھی لیا جائے تو احتیاج کو اضطرار و مخمصہ کی منزل میں اتارنا چاہیے تاکہ اس حکم قطعی کا مخصص یہ دوسری آیت ہو جائے فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ الآیہ (جو شخص بھوک سے لاچار ہو جائے درآنحالیکہ کسی گناہ کی طرف مائل نہ ہو پس بخشنے والا خدا مہربان ہے) کیونکہ از روئے قوت آیت ہی آیت کے برابر ہو سکتی ہے ...... اور اگر محتاج کو عام کر دیا جائے (اضطرار کی قید نہ لگائی جائے) پھر تو کوئی صورت بھی حرمت ربا کی نہ نکل سکے گی اسلئے کہ جو بھی (اپنی جیب سے) زیادہ روپیہ دینا قبول کرتا ہے اسکی علت کوئی نہ کوئی احتیاج ضرور ہوتی ہے بے ضرورت کون اپنے ضرر و نقصان کا مرتکب ہوتا ہے ایسی صورت میں اللہ کے نازل کردہ حکم کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا ..... اور اگر علیٰ سبیل فرض المحال عموم احتیاج

کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی اس سودی روپئے سے کھانا پکانا اور لوگوں کو کھلانا داخلِ احتیاج ہرگز نہیں ہے کوئی ضرورت اس سے متعلق نہیں ہے ـــ ترکۂ میت میں احتیاجِ میت کو کفن تک محدود رکھا ہے اور ایصالِ ثواب کے لئے کھانا پکانا داخلِ احتیاجِ میت نہیں رکھا، حالانکہ میت کو صدقے کی بہت زیادہ احتیاج ہے ـــــ صورتِ متنازع فیہ میں غور کرو کہ قرض لینے والے سودی قرضے کے محتاج (درحقیقت) ہیں یا نہیں؟ اور احتیاج کی صورت میں وہ کھانا جو وہ کسی جماعت کے لئے پکاتے ہیں اس جماعت کو بھی وہ کھانا حلال ہے یا نہیں؟ جتھے داری اور پیشۂ سپاہ گری کو حیلۂ احتیاج بنانا اور سودی روپیہ اس بنا پر لے کر اسکو جائز و حلال جاننا دینداری سے بعید ہے ـــــ چاہیئے کہ شیوۂ امر معروف و نہی منکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جماعت کو جو اس بلا میں (سودی قرضہ لینے میں) مبتلا ہے منع اور مذکورہ حیلے کی غلطی سے آگاہ کیا جائے ـــ کیوں کوئی ایسا پیشہ اختیار کیا جائے جس میں اس قسم کی ممنوع باتوں کا ارتکاب کرنا پڑے ـــــ معیشت کی صورتیں اور بہت سی ہیں سپاہ گری پر ہی معاش موقوف نہیں ہے ـــ چونکہ تم صاحب صلاح و تقویٰ ہو اسلئے تم کو وہ روایت بھیجی گئی جس کی رو سے کھانے میں حلال و طیب کا خیال رکھنا ضروری ہے ـــ تم نے لکھا تھا کہ اس زمانے میں کوئی چیز "بے شبہ" والی نہیں ہے، ٹھیک ہے، لیکن جہاں تک ہوسکے شبہ سے بچنا تو چاہیئے .... حلال کو حلال جاننا اور حرام کو حرام جاننا ضروری چیز ہے، اس کا انکار کفر تک پہونچاتا ہے ـــ ظنیات میں ایسا نہیں ہے بہت سے امور حنفیہ کے نزدیک مباح ہیں اور شافعیہ اسکو مباح نہیں جانتے اور اسکا برعکس بھی ہے ـــ پس جس مسئلے میں گفتگو ہے اس میں اگر کوئی مشکوک محتاج کے لئے سودی قرضے کے حلال ہونے میں (حکم نص قطعی کو پیش نظر رکھ کر) توقف و تامّل کرے تو اسکی تضلیل نہیں ہونا چاہیئے اور اسکو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ حلّت کا قائل ہو جائے ـــــ بلکہ صحت و صواب اسی کی جانب راجح و متیقن ہے (جو سودی قرضے کی حرمت کا قائل ہے) اور اسکا مخالف خطرے میں ہے ـــ تمھارے دوستوں میں سے بعض نے بیان کیا ہے کہ ایک شن

نوٹ:۔ اس صفحہ کے بعد صفحہ ۲۰-۲۱-۲۲ کی ترتیب غلط ہو گئی ہے لہذا صفحات کے ہندسے دیکھ کر مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

بزرگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! عافیت کا کوئی دن نصیب فرما! ـــــ ایک شخص نے ان بزرگ سے دریافت کیا کہ آپ جس (اچھی) حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں کیا یہ "عافیت" نہیں ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرا مقصودِ دعا یہ ہے کہ کوئی ایک دن ہی ایسا میسر آجائے کہ صبح سے شام تک اللہ کی کوئی نافرمانی مجھ سے سرزد نہ ہو" ـــــ

مدت سے سرہند میں کوئی قاضی مقرر نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بعض احکام شرعیہ کے اجراء میں مشکل پیش آرہی ہے ....

مکتوب (۱۰۴) قاضیان قصبہ مستکن کے نام ـــــ (تعزیت)

مغفرت پناہی (مرحوم) کے انتقال سے جو مصیبت پہونچی ہے ہرچند کہ وہ بہت ہی شدید ہے لیکن مقامِ بندگی کے پیشِ نظر، فعلِ مولیٰ سے راضی ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں ـــــ (آدمی کو) دنیا میں رہنے کے لئے نہیں لایا گیا (نیک) کام کرنے کے لئے لایا گیا ہے ـــ لہٰذا کام کرنا چاہئے ـــ اور جو کوئی کام کر کے دنیا سے رخصت ہوا اس کے لئے کوئی خوف نہیں ہے، ایسا شخص (دراصل) بادشاہ ہے ـــــ "موت ایک پل ہے جو حبیب کو حبیب تک پہونچاتی ہے" ـــــ یہ مقولہ صوفیاء ایسے ہی (کامیاب) شخص کے حق میں ثابت ہے ـــــ غم مرنے کا نہیں ہے بلکہ مرنے والے کی فکر ہوتی ہے کہ اسکے ساتھ کیا معاملہ ہوگا ـــــ دعا، استغفار اور صدقہ سے میت کی امداد کرنا چاہئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ـــ میت قبر میں فریاد خواہ کی طرح ہوتی ہے اور اس دعا کی منتظر رہتی ہے جو اسکو باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے پہونچے ـــ جب دعا پہونچتی ہے تو میت کے لئے دنیا وما فیہا سے بہتر ہوتی ہے ـــ بے شک اللہ تعالیٰ زندوں کی دعا سے مُردوں پر پہاڑوں کی مانند رحمتیں نازل فرماتا ہے ـــ بے شک، مرنے والوں کے لئے زندوں کا خاص تحفہ ان کے لئے مغفرت کی دعا کرنا ہے۔

مکتوب (۱۰۵) حکیم عبد القادر کے نام ـــــ

[امراضِ قلبیہ کے ازالے کی تاکید میں]

اطباء کے نزدیک یہ بات مُسلّم ہے کہ مریض جب تک مرض سے صحت یاب نہ ہو، کوئی

غذا اسکو سود مند نہیں، چاہے مُرغ بریاں ہی کیوں نہ ہو بلکہ ایسی صورت میں غذا مرض کو تقویت دیتی ہے ع۔ "ہرچہ گیرد علتی علت شود"

لہٰذا اوّل مرض کے دور کرنے کی فکر کرتے ہیں بعد ازاں مناسب غذاؤں سے آہستہ آہستہ، اصلی قوت کی طرف لاتے ہیں ——— پس جس وقت تک کوئی آدمی مرضِ قلبی میں مبتلا ہے (جس کی طرف "فِی قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" الآیۃ میں اشارہ ہے) اسکی کوئی عبادت اور کوئی طاعت نفع مند نہیں ہے بلکہ مضر ہے ——— "بعض قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے" یہ مشہور حدیث ہے ——— "بعض روزے دار ایسے ہیں کہ اُن کے روزوں کا نتیجہ سوائے بھوک اور پیاس کے اور کچھ نہیں" یہ بھی صحیح حدیث ہے ——— امراضِ قلبیہ کے اطباء (مشائخ کرام) بھی اوّلاً مرض قلبی کے دور کرنے کا حکم کرتے ہیں .... پس "علماء اولی الالباب" اور "حکماء ذوی الابصار" پر اس مرض قلبی کے دور کرنے کی فکر لازم ہے۔

ع۔ درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

معارف الحدیث ص۸ کا بقیہ ——— ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ہم جیسے عام انسانوں کو پیٹ اور آنتوں سے گندے فُضلہ کے خارج ہوجانے کی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس بشری تقاضے سے فارغ ہوتے اور انسانی فطرت کے مطابق طبیعت ہلکی اور منشرح ہوتی تو مذکورہ بالا احساس کے مطابق اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ جس طرح تو نے اپنے کرم سے اس گندے فضلہ کو میرے جسم سے خارج کر کے میری طبیعت کو ہلکا کر دیا اور مجھے راحت وعافیت عطا فرمائی اسی طرح میرے گناہوں کی پوری پوری مغفرت فرما کر میری روح کو پاک صاف اور گناہوں کے بوجھ سے میری پیٹھ کو ہلکا کر دے۔

رہا یہ سوال کہ گناہوں سے معصوم ہونے کے باوجود اور "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ" کے قرآنی اعلان کے بعد بھی آپ اپنے گناہوں سے استغفار کیوں فرماتے تھے؟ تو اس کا جواب تفصیل سے ان شاء اللہ اپنے موقع پر "کتاب الصلوٰۃ" میں آئے گا۔

مولانا عبدالفتاح نے تمہارے سامنے کہا کہ "اگر بے سود قرض مل سکے تو بہتر ہے سودی قرض کوئی کیوں لیتا ہے"؟ تم نے (یہ سن کر) ان کو ڈانٹا اور کہا کہ "حلال سے انکار کرتے ہو؟" مخدوما! اس قسم کی باتیں حلال قطعی میں تو گنجائش رکھتی ہیں مگر یہ سودی قرضہ (بالفرض تمہارے خیال کے مطابق احتیاج کے حیلہ سے) اگر حلال بھی ہو تب بھی شک نہیں کہ اس کا ترک اولیٰ ہے ـــــ اہلِ تقویٰ "رخصت" کا حکم نہیں کرتے "عزیمت" کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ـــــ مفتیانِ لاہور نے (اس مسئلے میں) احتیاج کو دخل دیکر حلت کا حکم دیدیا ہے ـــــ احتیاج کا میدان تو بڑا وسیع ہے اگر وسعت دی جائے گی تو کوئی سود، سود نہیں رہے گا اور حرمتِ ربا کا حکم ـــــ (نعوذ باللہ) عبث قرار پاجائے گا جیساکہ اوپر گزر چکا ـــــ لیکن اس قدر تو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ دوسروں کو کھانا کھلانا احتیاج کی کونسی قسم ہے جو قرض لینے والے کو لاحق ہوتی ہے؟ ـــــ بہرحال دیہہ تقدیم قنیہ کی روایت بھی محتاج کے لئے سودی قرضہ لینے کو جائز قرار دیتی ہے نہ کہ دوسرے کو ـــــ اور اگر کوئی کہے کہ شاید کسی محتاج نے اِس کھانے کو کفارۂ یمین یا کفارۂ ظہار یا کفارۂ صوم کی نیت سے پکایا ہو اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس کفارے کی ادائیگی کا محتاج ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر (کوئی محتاج (کفارہ میں مساکین کو) کھانا کھلانے کی طاقت نہیں رکھتا تو (شریعت کا حکم یہ ہے کہ) وہ روزہ رکھے نہ یہ کہ سودی قرض لے (اور کھانا کھلائے) اور اگر اسی قسم کی اور کوئی احتیاج بھی نکل آئے تو تھوڑی سی توجہ سے برکتِ تقویٰ وہ احتیاج (بغیر سودی قرض کے) دور ہو جائے گی (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) ـــــ مَن یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجاً وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اسکے لئے کوئی مخلص نکالے گا اور ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں کا وہ گمان بھی نہیں رکھتا) .... والسلام علیکم وعلیٰ من اتبع الھدیٰ

مکتوب (۱۰۳) شیخ فریدی بخاریؒ کے نام ـــــ

[سرہند میں قاضی کے تقرر کے بارہ میں]

حق سبحانہ وتعالیٰ باعافیت رکھے ـــــ عافیت بھی وہ مانگتا ہوں جس کے لئے ایک

نبوّت کا کارنامہ

(از ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

(یہ مضمون ۱۹ دسمبر ۱۹۵۹ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی یونین میں شعبۂ دینیات کی دعوت پر پڑھ کر سنایا گیا ——)

"جس ماحول اور معاشرے کی ہمارے دماغوں اور ہماری ایجادوں نے تخلیق کی ہے وہ نہ تو ہمارے قد و قامت پر راست آرہا ہے اور نہ ہماری شکل و صورت کے مطابق ہے، ہم بڑے بدقسمت لوگ ہیں، ہم اخلاقی اور دماغی حیثیت سے برابر انحطاط و تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ جن انسانی جماعتوں اور قوموں میں صنعتی تمدن اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا ہے اور اپنے اوج شباب پر ہے، ان کے متعلق پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی بدقسمت جماعتیں اور قومیں ہیں جو کمزوری کا شکار ہوتی جا رہی ہیں اور جو دوسری بربریت اور وحشت تک دوسری نیم ترقی یافتہ قوموں سے پہلے واپس ہو جائیں گی لیکن اُن کو خود اس کا احساس نہیں، اسلئے کہ علم نے ان کے گرد جو دشمن انسانیت سرنگیں بچھا دی ہیں ان سے بچنے کا اُن کے پاس کوئی سامان نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ تہذیبوں کی طرح ہماری تہذیب نے بھی زندگی کے ایسے مخصوص حالات پیدا کر دیئے ہیں جنھوں نے خود زندگی کو ناممکن بنا دیا ہے، اور اسکے اسباب ابھی تک پورے طور پر واضح اور معیّن نہیں ہیں، وہ انتشار و افکار اور وہ بے چینی و اضطراب جس میں عصر حاضر کے بڑے بڑے شہروں کے باشندے

مبتلا ہیں، خود ان ہی کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی (Social)
نظاموں کا نتیجہ ہے، جمادات سے تعلق رکھنے والے علوم کی روز افزوں ترقی
اور انسان کی خود اپنے متعلق بڑھتی ہوئی ناواقفیت اور لاعلمی نے ہم کو یہ دن
دکھایا ہے؛"

"عصر حاضر کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ انسان اپنی اصل توجہ اور غور و
فکر کا مرکز اپنی ذات کو بنائے، اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کرے کہ موجودہ
اخلاقی اور دماغی انحطاط اور افلاس کا اصلی سبب کیا ہے؟ راحت و سہولت،
شان و شوکت، حسن و جمال، اور ہمارے تمدن کے پیچیدہ سے پیچیدہ ترین جانے
کا کیا حاصل ہے، اگر ہماری (اخلاقی و ذہنی) کمزوری ان وسائل سے پورا
فائدہ اٹھانے میں حائل ہے، سچی بات یہ ہے کہ اس طریقۂ زندگی کو حسین و جمیل
بنانے کی کوشش کو پیہم جاری رکھنا فعل عبث ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ
ہم اخلاقی حیثیت سے پست ہوتے چلے جائیں اور شریف قوموں کی بہترین
صفات دنیا کے پردے سے گم ہو جائیں، اس وقت کہیں زیادہ اہم اور مفید
کام یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ زیادہ تیز رفتار جہاز، زیادہ راحت بخش موٹریں،
زیادہ ارزاں ریڈیو سٹ اور زیادہ بہتر دوربینیں بنائیں، ہم اپنی توجہ
نفس انسانی اور ذاتِ انسانی پر مرکوز کریں، جس وقت ہم کو کوئی طیارہ کم
سے کم گھنٹوں میں یورپ یا چین پہونچا دیتا ہے تو اس سے ہم کون سی حقیقی ترقی
کا ثبوت دیتے ہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ پیداوار اور صنعتوں کا یہ بے مقصد
سلسلہ برابر جاری رہے یہاں تک کہ انسان ایسی چیزوں کی بڑی سے بڑی مقدار
کام میں لاتا رہے جن میں کوئی حقیقی فائدہ نہیں، اب اس بارہ میں ذرہ برابر
بھی شک نہیں رہا کہ میکانیک (MECHANIC) طبعیات (PHYSICS)
اور کیمیا (Chemistry) کے علوم ہم کو ذکاوت، اخلاقی نظام،
جسمانی صحت، اعصابی توازن، قلبی سکون اور امن و امان عطا کرنے سے

بالکل قاصر ہیں[1]۔"

حضرات! ان الفاظ میں ہماری اس صدی کے وسط میں ایک مغربی ماہر طب اور سائنسداں ڈاکٹر الکسس کارل (Alexes Carrell) نے (جس کی علمی خدمات اور غیر معمولی قابلیت کا اعتراف نوبل پرائز کے ذریعہ سے کیا گیا) اس اصل بیماری کی تشخیص کی ہے جس میں موجودہ مغربی تہذیب اور دنیا کی ذہنی قیادت مبتلا ہے، وہ یہ کہ انسانی توجہات اور کوششوں کا مرکز اور موضوع "انسان" کے بجائے یہ خارجی دنیا اور خود اسکے الفاظ میں جمادات اور اقبال کے الفاظ میں "برق و بخارات" کی دنیا[2] بن کر رہ گئی ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا نے ترقی کی اور انسان نے جس کے لئے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے اور جو مقصد کائنات ہے، کوئی ترقی نہیں کی، بلکہ وہ اپنی اندرونی صفات و کیفیات، اپنے اخلاق و اطوار، اور حقیقت انسانی کے اعتبار سے پست تر اور دور وحشت و بربریت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، ڈاکٹر الکسس کارل اور سی، ایم جوڈ[3] اور دوسرے مغربی مفکرین و ناقدین نے اپنی تصنیفات میں صنعتی اور اخلاقی ترقی کے جس عدم توازن کا مرثیہ پڑھا ہے اور اس بارے میں مغربی تہذیب اور اس کے قائدین و مفکرین کی جس کوتاہ نظری اور غلط اندیشی کے خلاف احتجاج کیا ہے، وہ دراصل اتنی سرسری اور سطحی نہیں ہے، جس کو ایک ذہنی لغزش اور ایک اتفاقی حادثہ سے تعبیر کیا جائے، دراصل یہ اس فکری قیادت Intellectual Leadership کا فطری خاصہ اور طبعی مزاج ہے جو خاص حالات و اسباب کی بنا پر کم سے کم دو صدیوں سے دنیا پر کلیتہً حاوی اور انسانی معاشرہ پر قابض و متصرف ہے، یہ اس تہذیب اور فکری قیادت کا بہترین جوہر اور کارنامہ ہے، اور کسی تہذیب کو اپنا جوہر دکھانے پر ملامت کرنا حق بجانب نہیں۔

---

[1] (Man the Unknown)

[2] جو قوم کہ فیضان سماوی سے ہے محروم ۔۔۔ حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

[3] ملاحظہ ہو اس کی تصنیفات Guide to Modern Wickedness
New Philosophy For Our Times

آپ کو درختوں میں سے بہتر سے بہتر درخت کے انتخاب کا ہر وقت حق ہے، آپ باغبان کو درخت لگانے سے روک بھی سکتے ہیں، آپ لگے ہوئے درخت کو کاٹ بھی سکتے ہیں جلا بھی سکتے ہیں، لیکن آپ کو حق نہیں کہ درخت سے اپنی فطرت اور نوع کے خلاف اور اپنی مرضی کے مطابق پھل دینے کا مطالبہ کریں اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو آپ اس کی شکایت کریں، تہذیب جدید نے اور دنیا کی اس فکری قیادت نے جس نے سترھویں صدی میں دنیا کا چارج لیا انسان کو ایک ترقی یافتہ حیوان فرض کرکے جس کا کسی غیبی سرچشمہ اور کسی بالاتر ہستی سے کوئی تعلق نہیں اور جس کے اندر صرف حیوانی تقاضے، جنسی احساسات اور برتری اور غلبہ واستعلا کی خواہش پائی جاتی ہے، کوشش شروع کی، اس نے زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کی اس انسان کا اس عالم خارجی سے زیادہ مستحکم اور وسیع تعلق پیدا ہو، اور وہ اسکی طاقتوں کو مسخر کرکے اپنی زندگی کا سفر زیادہ سے زیادہ سہل اور پُر راحت بنالے، اس نے اسکی ہر ایسی صلاحیت اور اسکے ہر ایسے شعبہ کو حقارت کے ساتھ نظرانداز کیا جو اس مقصد کے لئے کارآمد نہیں، بلکہ اس راستہ میں اسکے حارج ہونے کا اندیشہ ہے، اس نے اس کی روح کو، اسکے قلب کو اور اسکے لطیف احساسات کو نظرانداز بلکہ انکے وجود کا انکار کیا، جو انسان کی مادی ترقی اور معاشی ضروریات کے لحاظ سے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اپنی حیرت انگیز مادی فتوحات اور صنعتی ترقیات کے ساتھ ساتھ اپنے انسانی خصائص و فضائل میں سرعت کے ساتھ انحطاط و تنزل کے مدارج طے کرتا رہا، یہ دنیا آباد اور سرسبز و شاداب ہوتی رہی اور خود انسان کے اندر کی دنیا ویران ہوتی چلی گئی، وہ باہر فتوحات پر فتوحات حاصل کرتا رہا اور اندر شکست پر شکست کھاتا رہا، اس نے خشکی و تری پر قبضہ کیا، اور بڑے بڑے سرکشوں کو زیر کیا، لیکن نفس کی ادنیٰ ترغیب، اور گناہ کی ادنیٰ خواہش کے سامنے جم نہ سکا، اس کے معلومات روز افزوں ہیں لیکن اسی رفتار سے اس کا یقین متزلزل اور کمزور ہوتا جا رہا ہے، اسکے دماغ میں معلومات کا خزانہ ہے لیکن اسکے دل میں کوئی بات اتری ہوئی نہیں، وہ جانتا سب کچھ ہے لیکن عمل کسی پر کرنا نہیں چاہتا، سود و زیاں اور

نفع ونقصان کبھی اس طرح مشاہدہ میں نہیں آئے جیسے اس زمانہ میں آگئے، لیکن نفع کی رغبت اور نقصان سے وحشت اس کی طبیعت سے نکل گئی، طبعیات وریاضیات، ادب وفلسفہ، سیاست ومعاشیات اور اخلاق ونفسیات سب نے مل کر ایک ایسے مشینی انسان کی پرورش کی ہے جو یقین کی دولت، بے غرض محبت، بے لوث خدمت، عالمگیر جذبۂ ہمدردی وشفقت، احساس لطیف اور قطعاً کسی بالاتر حقیقت سے ناآشنا ہے، اس کا دماغ حقیقی معرفت سے، اس کا دل خلش سے، اس کا پہلو درد سے، اس کی آنکھیں اشکِ ندامت سے، اسکے دن تپش سے، اسکی راتیں گداز سے محروم ہیں، اس نے ایک ایسے معاشرہ کی تخلیق کی ہے، جس میں وجود صرف نفع ولذت کا تسلیم کیا جاتا ہے اور صرف اُن کے حصول کی کوشش بامعنی اور وقیع ہے، اس معاشرہ میں لطیف انسانی احساسات اور حقیقی انسانی فضائل وکمالات کا زوال قدرتی اور لازمی ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ اس دورِ قیادت میں زندگی اور علم کے ہر شعبہ میں بڑے باکمال اور مجتہدانہ قابلیت رکھنے والے (Genious) قسم کے انسان بڑی تعداد میں پیدا ہوئے، لیکن صدیوں پر صدیاں اور ملک کے ملک ایسے انسانوں کے وجود سے خالی نظر آتے ہیں جو حقیقی انسانیت کا نمونہ ہوں، جن کا ناقابلِ شکست یقین، جن کی ناقابلِ تحقیر محبت، جن کی غیر مشتبہ خلائق دوستی، جن کا اغراض وفوائد سے بالاتر خلوص، جن کے حسن وکمال کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے اور میزانِ عدل پر تلے ہوئے اخلاق ومعاملات، جن کی سچی روحانیت تاریک دلوں کو روشن کرے اور ہزاروں انسانوں کو راہِ راست پر لے آئے، تہذیب جدید اور دنیا کی نئی فکری قیادت نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور کوششیں اس کائنات کا راز معلوم کرنے اور اسکی طبعی طاقتوں کو مسخر کرنے اور آلات ووسائل کو پیدا کرنے پر صرف کیں، اس نے اپنی اس محنت کا انعام پایا، آج یہ دنیا انسان کے سامنے سرنگوں ہے، لیکن انسان اس کے مسلسل تغافل کا شکار ہوکر اخلاقی وروحانی انحطاط کے اس مقام پر پہونچ گیا ہے کہ تمدن وتہذیب اور صنعت وترقی کی یہ کشادہ وفراخ قبا اسکے نحیف ولاغر ومدقوق جسم پر چسپ نہیں ہورہی ہو، جس تناسب

ساتھ اسکو اپنے اخلاق، ضبطِ نفس، جذبہ خدمت، قوتِ ایثار، یقین و اعتماد میں ترقی کرنی چاہیئے تھی اس نے نہیں کی، بلکہ انسانیت کے میدان میں وہ پیچھے ہٹتا رہا، یہانتک کہ علوم کی ترقی اور انسان کی پستی اس مقام پر پہونچ گئی ہے کہ بقول مسٹر سی، ایم جوڈ "علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی لیکن ہم اسکو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کر رہے ہیں"

حضرات! اللہ تعالیٰ اپنی وحی و نبوت کے ذریعہ اپنے پیغمبروں کو انسانوں کی اصلاح و تکمیل پر مامور فرمایا اور ان حضرات نے اپنی دعوت و محنت کا موضوع انسان کو بنایا انبیاء علیہم السّلام کی بصیرت پر اللہ تعالیٰ نے یہ نکتہ فاش کیا کہ اس دنیا کی قسمت اور اسکی آبادی و ویرانی کا فیصلہ انسان پر معلّق ہے، اگر حقیقی انسان موجود ہے تو یہ دنیا اپنی سب ویرانیوں اور بے سروسامانیوں کے ساتھ آباد و معمور ہے، اور اگر حقیقی انسان موجود نہیں تو یہ دنیا اپنی ساری رونقوں اور اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ ایک ویرانہ اور خرابہ سے بہتر نہیں، اس دنیا کی بدقسمتی آلات و وسائل کی کمی اور فقدان سے نہیں، بلکہ اُن کے غلط استعمال سے ہے، دنیا کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اسکو انسان کی غلط اندیشی اور بے راہ روی نے تباہ کیا، آلات و وسائل نے اس تباہی اور ہلاکت خیزی میں صرف اضافہ کیا۔

پھر انسان اپنی عظمت، اپنی وسعت، اپنی مرکزیت اور اپنی حکیمانہ صنعت کے اعتبار سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اُسکو سعی و محنت اور توجہ و خدمت کا موضوع بنایا جائے، یہ کائنات بڑی پُراسرار، بڑی پُرعجائبات، بڑی حسین و جمیل، بڑی طویل و عریض ہے، لیکن انسان کی فطرت کے اسرار و عجائبات اسکے مخفی خزانوں اور دفینوں، اسکے قلب کی وسعتوں، اسکے دماغ کی بلند پروازیوں، اسکی روح کی بیتابیوں اور گرم جوشیوں، اسکی غیر مختتم تمناؤں اور ناآسودہ حوصلوں اور اس کی غیر محدود صلاحیتوں کے سامنے اسکی کوئی حقیقت نہیں، ایسی کئی دنیائیں اسکے قلب کی وسعتوں میں، اور یہ سارے سمندر اسکے دل کی گہرائیوں میں گم ہو جائیں پہاڑ

اس کے یقین کا، آگ اسکی محبت کے سوز کا، سمندر اسکے قطرۂ اشک کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اس کی حسن سیرت کے سامنے دنیا کا ہر حسن ماند ہے۔ اسکے عزم وارادہ کے آگے ہر طاقت سرنگوں ہے، اس انسان میں صحیح یقین، صحیح خواہش اور صحیح ملکات اور اخلاق کا پیدا کرنا اور اس سے خلافت الٰہی کا کام لینا نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔

ہر نبوت نے اپنے دور میں یہ کارنامہ انجام دیا اور ایسے افراد تیار کئے جنھوں نے اس دنیا کو نئی زندگی بخشی اور زندگی کو (جو انسان کی خود فراموشی اور غلط اندیشی سے) بے معنی ہوگئی تھی با معنی بنایا، نبوت کے ان کارناموں میں جو زندگی کی پیشانی پر درخشاں و تاباں ہیں سب سے روشن کارنامہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے جس کی سب سے زیادہ تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، مردم سازی وآدم گری کے اس کام میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامیابی عطا فرمائی، وہ آج تک کسی انسان کو حاصل نہیں ہوئی، آپ نے جس سطح سے تعمیر انسانیت کا کام شروع کیا، اس سطح سے کسی پیغمبر اور کسی مصلح اور کسی مربی کو شروع کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی، یہ وہ سطح تھی جہاں حیوانیت کی سرحد ختم ہوتی تھی اور انسانیت کی سرحد شروع ہوتی تھی، اور جس سطح پر آپنے اس کام کو پہونچایا اس سطح تک کبھی کبھی تعمیر انسانیت کا کام نہیں پہونچا تھا، جس طرح آپنے انسانیت کی انتہائی پستی سے کام شروع کیا، اسی طرح انسانیت کی آخری بلندی تک اس کام کو پہونچایا، آپکے تیار کئے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہو اور نوع انسانی کے شرف وافتخار کا باعث، انسانیت کے مرقع ہیں، بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑکر اس سے زیادہ حسین وجمیل، اس سے زیادہ دلکش ودل آویز تصویر نہیں ملتی جو اُن کی زندگی میں نظر آتی ہے، ان کا پختہ یقین، اُن کا گہرا علم، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، اُن کی بے نفسی وخدا ترسی، ان کی پاکبازی و پاکیزگی، اُن کی شفقت ورقت اور انکی شجاعت وجلادت، ان کا ذوق عبادت اور انکا شوق شہادت اُنکی شہسواری اور انکی شب زندہ داری، اُنکی سیم وزر سے بے پرواہی اور انکی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل اور اُن کا حسن انتظام، دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، نبوت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانی افراد تیار کئے، ان میں سے ایک ایک فرد ایسا تھا جو

اگر تاریخ شہادت نہ پیش کرتی اور دنیا اسکی تصدیق نہ کرتی تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا، لیکن وہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے، وہ ایک ایسا انسانی وجود تھا جسمیں نبوت کے اعجاز نے متضاد اوصاف وکمالات پیدا کر دئے تھے۔

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دل فریب، اسکی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اُس کے زمانے عجیب، اسکے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیٔ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اُس کا رحیق، تیغ ہے اسکی اصیل

یہ فرد جب تیار ہو گیا تو یہ بندگی کے ہر محاذ پر کارآمد مستعد اور قیمتی ثابت ہوا اور جو خدمت اُس کے سپرد کی گئی اس نے اپنی اہلیت وصلاحیت اور اپنی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری اور اپنے ذوق عمل اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا، اس کو اگر فیصلہ اور ثالثی کا کام سپرد کیا گیا تو وہ بہترین قاضی اور لائق ترین جج ثابت ہوا، جس نے ترازو کے تول فیصلہ کیا۔ وہ اگر فوجوں کا سپہ سالار اور قائد مقرر ہوا تو اُس نے اپنی جنگی قابلیت بیدار مغزی اور شجاعت اور مرحمت کا ثبوت دیا، اگر فوجوں کی کمان اسکے حوالہ کر دی گئی تو ایک مستعد اور کارگزار اور ایک جری اور جانباز سپاہی ثابت ہوا اور اگر اسکو فوجوں

. . . .

. . . .

کی قیادت کے منصب علیا سے معزول کر دیا گیا تو اسکی پیشانی پر ناراضگی کی ایک شکن اور اسکی زبان پر شکایت کا ایک حرف نہیں آیا اور لوگوں نے اس کی مستعدی اور جوش و نشاط میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا، اگر وہ نوکروں کا آقا اور محکمہ کا افسر تھا تو ایک فراخدل اور شفیق آقا اور ایک خیر خواہ اور محبت کرنے والا بزرگ خاندان اور اگر وہ مزدور و اجیر تھا تو وہ ایک فرض شناس و مستعد مزدور تھا جس کو اپنی مزدوری کے اضافہ سے زیادہ کام کے اضافہ کی فکر تھی وہ فرد اگر فقیر تھا تو فقیرِ صابر و قانع اور اگر غنی تھا تو غنی شاکر اور محسن، وہ اگر عالم تھا تو علم کو عام کرنے اور لوگوں کو خدا کا راستہ بتلانے کا حریص اور اپنے علم کی تقسیم میں فیاض، اور اگر طالب علم تھا تو علم صحیح کے حصول کا شائق اور اسکو اعلیٰ درجہ کی عبادت سمجھ کر اسکی طلب میں منہمک اور اسکے لئے بڑی سے بڑی محنت اور بڑی سے بڑی خدمت کرنے والا تھا، اور اگر وہ کسی شہر کا حاکم تھا تو راتوں کو پہرہ دینے والا، اور دن کو انصاف کرنے والا تھا، غرض یہ فرد انسانی معاشرہ کے جس مقام اور جس محاذ پر تھا نگینہ کی طرح جڑا ہوا تھا۔

دنیا کی سب سے زیادہ نازک اور خطرناک ذمہ داری (حکومت) جب اُسکے سپرد ہوئی تو اس نے زہد و فقر اور ایثار و قربانی اور جفاکشی و سادگی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی اور ابھی تک اُسکے تحیر میں کوئی کمی نہیں، آئیے ہمارے ساتھ خلافتِ راشدہ کے ان واقعات کو پڑھ لیجئے، عہد صدیقی کا مورخ لکھتا ہے:-

"ایک روز حضرت ابوبکرؓ کی بیوی نے شیرینی کی فرمائش کی، جواب دیا میرے پاس کچھ نہیں، انھوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں خرچ روزمرہ میں سے کچھ دام بچا کر جمع کر لوں، فرمایا جمع کرو، کچھ روز میں چند پیسے جمع ہو گئے، تو حضرت ابوبکر کو دیئے کہ شیرینی لا دو، پیسے لے کر کہا معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں لہٰذا بیت المال کا حق ہے، چنانچہ وہ پیسے خزانے میں جمع کر دیئے اور اسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا" [۵]

---

[۵] سیرۃ الصدیق مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

آپ نے بہت سی مملکتوں کے بادشاہوں اور بہت سی جمہوریتوں کے سربراہوں کے سرکاری دوروں کی روداد سُنی ہوگی اور اُن کے شاہانہ تزک واحتشام اور کروفر کا تماشا دیکھا ہوگا۔ چھٹی صدی مسیحی کے سب سے بڑے طاقتور فرمانروا حضرت عمرؓ کے سرکاری دورہ (سفر شام) کی روداد مورخ کی زبان سے سنئے، مولانا شبلی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف الفاروق میں ۱۶ھ کے سفر بیت المقدس کا حال بیان کرتے ہوئے مستند عربی تاریخوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

"ناظرین کو انتظار ہوگا کہ فاروق اعظم کا سفر اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا کس سروسامان سے ہوگا؟ لیکن یہاں نقارہ و نوبت، خدم وحشم، لاؤ لشکر ایک طرف، معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا، سواری میں گھوڑا تھا اور چند مہاجرین و انصار ساتھ تھے، تاہم جہاں یہ آواز پہونچتی تھی کہ فاروق اعظم نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے زمین دہل جاتی تھی۔"

جابیہ میں دیر تک قیام رہا اور بیت المقدس کا معاہدہ بھی یہیں لکھا گیا..... معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا۔ گھوڑا جو سواری میں تھا اُسکے سُم گھس کر تمام ہوگئے تھے اور رُک رُک کر قدم رکھتا تھا، حضرت عمر یہ دیکھ کر اتر پڑے، لوگوں نے ترکی نسل کا ایک عمدہ گھوڑا حاضر کیا، گھوڑا شوخ اور چالاک تھا، حضرت عمر سوار ہوئے تو اُلیل کرنے لگا، فرمایا کمبخت یہ غرور کی چال تونے کہاں سیکھی؟ یہ کہہ کر اتر پڑے اور پیادہ پا چلے، بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابوعبیدہ اور سرداران فوج استقبال کو آئے، حضرت عمر کا لباس اور سروسامان جس معمولی حیثیت کا تھا اُسکو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے، چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ قیمتی پوشاک حاضر کی، حضرت عمر نے فرمایا کہ "خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے"[1]

[1] الفاروق ص ۱۰۵-۱۰۶

دوسرے سفرِ شام (۱۷ھ) کا حال بھی سن لیجئے:۔

"حضرت عمر نے شام کا قصد کیا، حضرت علی کو مدینہ کی حکومت دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے، یرفا اُن کا غلام اور بہت سے صحابہ ساتھ تھے، ایلہ کے قریب پہونچے کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی اور خود اسکے اونٹ پر سوار ہو لئے، راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے پوچھتے تھے کہ امیرالمومنین کہاں ہیں؟ فرماتے کہ تمہارے آگے، اسی حیثیت سے ایلہ میں آئے اور یہاں دو ایک روز قیام کیا، گزی کا کرتہ جو زیب بدن تھا کجاوے کی رگڑ کھا کر پیچھے سے پھٹ گیا تھا، مرمت کے لئے ایلہ کے پادری کے حوالہ کیا، اس نے خود اپنے ہاتھ سے پیوند لگائے اور اُس کے ساتھ ایک نیا کرتہ تیار کرکے پیش کیا، حضرت عمر نے اپنا کرتہ پہن لیا اور کہا اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے" [۱]

خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کی سیرت کے مختلف پہلو اور ان کے محاسنِ اخلاق کتابوں میں متفرق و منتشر موجود ہیں ان سب کو جمع کرکے آپ اپنے ذہن میں ایک فرد کی مکمل زندگی اور پوری تصویر تیار کر سکتے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے ان میں سے ایک (سیدنا علی بن ابی طالب) کا پورا اخلاقی سراپا اور انکی زندگی کی تصویر ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، اسکو پڑھیئے اور دیکھیئے کہ ایک انسان کی سیرت و اخلاق کی اس سے زیادہ حسین و دلکش تصویر کیا ہو سکتی ہے اور نبوت نے اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی مردم سازی کیمیاگری کے کیسے یادگار نمونے چھوڑے ہیں، اُنکی خدمت میں شب و روز رہنے والے ایک رفیق ضرار بن ضمرہ اس طرح اُن کی تصویر کھینچتے ہیں:۔

"بڑے بلند نظر، بڑے عالی ہمت، بڑے طاقتور، جچی تُلی گفتگو فرماتے، حق و انصاف کے مطابق فیصلہ فرماتے، زبان و دہن سے علم کا چشمہ اُبلتا، ہر ہر ادا سے حکمت ٹپکتی، دنیا اور بہارِ دنیا سے وحشت تھی، رات اور رات کی تاریکی میں خوش رہتے، آنکھیں پُر آب، ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے رفتارِ زمانہ پر متعجب، نفس سے ہر وقت مخاطب، کپڑا وہ مرغوب جو موٹا

---

[۱] الفاروق ص۲۱۳

چھوٹا ہو، غذا وہ مرغوب جو غریبانہ اور سادہ ہو، کوئی امتیازی شان پسند نہیں کرتے تھے، جماعت کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے، ہم سوال کرتے تو جواب دیتے، ہم حاضر خدمت ہوتے تو سلام و مزاج پرسی میں پہل کرتے، ہم مدعو کرتے تو دعوت قبول فرماتے، لیکن اس قرب و مساوات کے باوجود رعب کا یہ عالم تھا کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور سلسلۂ سخن کا آغاز کرنا مشکل ہوتا، اگر کبھی مسکراتے تو دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے، دیندار دل کی عزت، اور مساکین سے محبت کرتے تھے، لیکن اس تواضع و مسکنت کے باوجود کسی طاقتور اور دولتمند کی مجال نہ تھی کہ اُن سے کوئی غلط فیصلہ کرالے یا اُن سے کوئی رعایت حاصل کرلے، اور کمزور کو ہر وقت ان کے عدل و انصاف کا بھروسہ تھا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اُن کو ایک شب ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے اپنی ظلمت کے پردے ڈال دئیے تھے اور ستارے ڈھل چلے تھے، آپ اپنی مسجد کی محراب میں کھڑے تھے، داڑھی مٹھی میں تھی، اس طرح تڑپ رہے تھے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو، اس طرح رو رہے تھے، جیسے دل پر چوٹ لگی ہو، اس وقت میرے کانوں میں اُن کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں" اے دنیا! اے دنیا! کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے اور مجھے بہکانے کی ہمت کی ہے، مایوس ہوجا کسی اور کو فریب دے، میں نے تو تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیرا عیش بے حقیقت، تیرا خطرہ زبردست، ہائے زاد راہ کس قدر کم ہے، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے"[1]

نبوت کا یہ کارنامہ زمانۂ بعثت اور پہلی صدی ہجری کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کی

---

[1] صفۃ الصفوہ ابن جوزی ج ۱

تعلیمات آپ نے اور آپکے صحابۂ کرام نے زندگی کے جو نمونے چھوڑے تھے وہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں اور وسیع عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ہر شعبۂ زندگی اور ہر صنف کمال میں ایسے "عظیم انسان" پیدا کرتے رہے جن کی انسانی بلندی شک و شبہ اور اختلافات سے بالاتر ہے۔ اس لازوال "مدرسۂ نبوت" کے فضلاء اور تربیت یافتہ (جنھوں نے صرف اسی مدرسہ سے انسانیت و اخلاق اور خدا شناسی اور انسان دوستی کا سبق لیا تھا) اپنے اپنے زمانہ کی زیب و زینت اور انسانیت کے شرف و عزت کا باعث ہیں، کسی مورخ اور کسی بڑے سے بڑے مصنف اور محقق کی یہ طاقت نہیں کہ ان لاکھوں اہل یقین اور اہل معرفت کے ناموں کی صرف فہرست بھی پیش کر سکے جو اس تعلیم کے اثر سے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر پیدا ہوتے رہے، پھر اُن کے مکارم اخلاق، انکی بلند انسانیت، اُن کے روحانی کمالات کا احاطہ تو کسی طرح ممکن نہیں، اُن کے حالات کو (جو کچھ بھی تاریخ محفوظ کر سکی ہے) پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ خاکی انسان روحانی ترقی، نفس کی پاکیزگی حوصلہ کی بلندی، انسان کی ہمدردی، طبیعت کی فیاضی، ایثار و قربانی، دولت دنیا سے بے نیازی، سلاطین وقت سے بے خوفی، خدا شناسی و خدا دانی اور غیبی حقیقتوں پر ایمان و یقین کے ان حدود اور ان بلندیوں تک بھی پہونچ سکتا ہے ؟ انکے یقین نے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو یقین سے بھر دیا، اُن کے عشق نے لاکھوں انسانوں کے سینوں کو عشق کی حرارت اور سوز سے گرم و روشن کر دیا، ان کے اخلاق نے خونخوار دشمنوں کو جاں نثار اور لاکھوں حیوان صفت انسانوں کو حقیقی انسان بنا دیا، انکی صحبت اور اُن کے فیض و تاثیر نے خدا طلبی اور خدا ترسی اور انسان دوستی کا عام ذوق پیدا کر دیا، ہمارا ملک ہندوستان اس بارے میں بڑا خوش نصیب ہے کہ وہ اپنے آغوش میں بکثرت ایسے مردان خدا کو لئے ہوئے ہے جنھوں نے اپنے عہد میں انسانیت کو بلند اور انسان کا نام روشن کیا تھا۔

بادشاہوں کی صف میں بھی جو کشورستانی اور ملک گیری اور عیش کوشی کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے اس تعلیم نے ایسے درویش صفت اور زاہد سیرت بادشاہ پیدا کئے

جنھوں نے زہد و ایثار کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر تارک الدنیا درویشوں و گوشہ نشین فقیروں کے یہاں بھی ملنا مشکل ہے، تاریخ اسلام کے ہر دور اور عالم اسلام کے ہر گوشہ میں ایسی شخصیتیں ملتی ہیں کہ بقول اقبال ؎

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب

سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

"مدرسۂ نبوت" کے ان فیض یافتہ سلاطین میں جن کی فہرست طویل ہے آپ صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال پڑھیں چھٹی صدی ہجری میں ــــــ مشرق وسطی کے اس سب سے بڑے حکمراں (جو کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک حکومت کرتا تھا)، کے متعلق اس کا سکریٹری قاضی ابن شداد شہادت دیتا ہے:۔

"زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اسلئے کہ انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو، انکی ساری دولت صدقات و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف سینتالیس درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد وملکیت، کوئی مکان، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، انکی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی انکی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا"[1]

انسانی بلندی، شرافت نفس، عالی حوصلگی کے اعتبار سے بھی سلطان تاریخ کے عظیم ترین انسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر عیسائی فاتحین کے برخلاف (جنھوں نے ظلم و سفاکی کی ایک نظیر قائم کردی تھی) سلطان نے جس شفقت و مرحمت اور جس احسان و فیاضی کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے

---

[1] النوادر السلطانیہ

اس کا سب سے بڑا مغربی سوانح نگار (سٹینلی لین پول لکھتا ہے:۔

"اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان، اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل شخص تھا۔"[۱]

آپ نے جہاں مشرق وسطیٰ کے ایک عظیم مسلمان حکمران کے احسان و فیاضی کا واقعہ سنا، خود اپنے ملک کے ایک مسلمان بادشاہ کا واقعہ بھی سنتے چلئے جو خلوص و فیاضی، ایثار اور بلند حوصلگی کا ایک اور نمونہ ہے، یہ دسویں صدی ہجری کے ایک طاقتور فرمانروا مظفر حلیم سلطان گجرات (م ۹۳۲) کا واقعہ ہے کہ جس نے محمود شاہ خلجی کی مدد کے لئے (جو غاصبوں کے ہاتھوں تخت و تاج سے محروم ہو گیا تھا اور اسکی سلطنت پر اسکے نمک خواروں نے قبضہ کر لیا تھا) مانڈو پر حملہ کیا تھا اور اسکو فتح کر لیا تھا، واقعہ مورخ گجرات کی زبان سے سنیئے:۔

"تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر حلیم ...... اندر داخل ہوا اور امرائے ہمرکاب نے شاہانِ مالوہ کے سامان تجمل اور خزائن و دفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی سرسبزی و شادابی پر اطلاع پائی تو انھوں نے جسارت کر کے مظفر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار جرار درجۂ شہادت کو پہونچ چکے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک کو اسی بادشاہ کے حوالہ کر دیا جائے جس کی سوء تدبیری سے مندلی رائے نے اس پر قابو پا لیا تھا۔ بادشاہ نے یہ سنتے ہی سر موقوف کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت فرمائی کہ

---

[۱] سلطان صلاح الدین ص ۲۰۵

اس کے ہمرکاب لوگوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ جانے دے، محمود نے باصرار تمام اس بات کی التجا کی کہ بادشاہ چند روز قلعہ کے اندر آرام فرمائیں، مگر مظفر شاہ نے اس التجا کو قبول نہ فرمایا اور وجہ کو خود ظاہر کیا کہ میں نے یہ جہاد و غزا محض خدا وند برحق کی رضامندی حاصل کرنے کو کیا تھا، مجھکو امراء کی تقریر سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا کوئی خطرہ فاسد میرے دل میں پیدا ہو اور میرا خلوص نیت برباد ہو جائے، میں نے محمود پر کچھ احسان نہیں کیا، بلکہ محمود کا مجھ پر احسان ہے کہ اسکی وجہ سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔[1]

میں نہیں کہتا کہ سارے سلاطین، و فرمانروا جو اسلامی عہد میں گزرے وہ نور الدین و صلاح الدین، ناصر الدین محمود اور سلطان مظفر حلیم کا نمونہ تھے، لیکن آپ کو جن فرمانرواؤں میں انسانی بلندی، خدا ترسی، فقر و زہد، ایثار و قربانی اور شفقت و رحمت کی یہ شان نظر آتی ہے اور ان میں سے جو اپنے زمانہ کی سطح سے بلند، بادشاہوں کی روایات سے الگ اور زمانہ سے نرالے دکھائی دیتے ہیں وہ صرف نبوت کے فیض، اور دینی جذبہ کا نتیجہ ہیں، آپ اگر انکی زندگی اور ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرینگے تو آپ کو اس کا سراغ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی کہ ان سب کا تعلق و اتصال (تعلیم و تربیت، تعلق و محبت اتباع و اطاعت کے ذریعہ سے) اسی ایک سرچشمۂ ہدایت سے تھا جس نے ہر دور میں عظیم ترین انسان پیدا کئے، خواہ ان کا زمانہ کتنا دور رہو، دراصل یہ سب اسی درسگاہ نبوت کے فیض یافتہ ہیں جس نے تعمیر انسانیت کا کام سب سے وسیع پیمانہ پر اور سب سے اعلیٰ سطح پر انجام دیا اور جس کا فیض اب بھی انسانیت کے چراغ کو روشن کئے ہوئے ہے، اور جہاں کہیں روشنی ہے اسی ایک چراغ کا پرتو ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

---

[1] یادایام بحوالہ مرآۃ سکندری۔

حضرات! ہماری جدید تہذیب اور ہماری موجودہ فکری قیادت معاشرۂ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے، وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتی ہے، وہ خلا میں سفر کرنے کے لئے محفوظ و سریع السیر آلات مہیا کر سکتی ہے، وہ انسان کو چاند اور سیاروں پر پہونچا سکتی ہے، وہ ذراتی طاقت سے بڑے بڑے کام لے سکتی ہے، وہ ملک سے غریبی کو دور کر سکتی ہے، وہ علم و ہنر کو آخری نقطۂ عروج پر پہونچا سکتی ہے، وہ پوری کی پوری قوم اور ایک ملک کی آبادی کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے، اسکی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں لیکن وہ صالح اور صاحب یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے، اور یہی اسکی سب سے بڑی ناکامی اور بدقسمتی ہے اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع و برباد ہو رہی ہیں، اور ساری انسانی دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے، اور اب اس کا سائنس اور علم پر سے بھی اعتقاد اٹھ رہا ہے، اندیشہ ہے کہ دنیا میں ایک شدید ردعمل کی تحریک اور علم و تمدن کے خلاف بغاوت کے دور کا آغاز نہ ہو جائے، فاسد افراد نے معصوم اور صالح وسائل و ذرائع کو بھی فاسد بلکہ آلۂ فساد و تخریب بنا دیا ہے، جدید تمدن کا سفینہ موجوں کی تاب نہیں رکھتا، اس کا ہر تختہ گھن کھایا ہوا اور دیمک کا چاٹا ہوا ہے، فاسد و کمزور تختوں سے کوئی صالح اور مضبوط سفینہ تیار نہیں ہو سکتا، یہ بالکل مغالطہ اور خام خیالی ہے کہ فاسد تختے علیحدہ علیحدہ فاسد، کمزور اور ناقابل اعتماد ہیں، لیکن جب ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے، اور ان سے کوئی سفینہ تیار کیا جائے تو انکی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور وہ صالح بن جاتے ہیں، رہزن اور چور علیحدہ علیحدہ تو رہزن اور چور ہیں، لیکن جب وہ اپنی جماعت بنالیں تو وہ پاسبانوں اور ذمہ دار انسانوں کی ایک مقدس جماعت ہے، نئی فکری قیادت نے جو افراد دنیا کو عطا کئے ہیں وہ ایمان و یقین سے خالی، ضمیر انسانی سے محروم، حاسۂ اخلاقی سے محروم، محبت اور خلوص کے مفہوم سے نا آشنا، انسانیت کے شرف و احترام سے غافل ہیں، وہ یا تو لذت و عشرت کے فلسفہ سے واقف ہیں یا صرف قوم پرستی اور وطن دوستی کے مفہوم سے آشنا ہیں، اس نوعیت اور صلاحیت کے افراد خواہ جمہوری نظام کے سربراہ ہوں یا

اشتراکی نظام کے ذمہ دار بھی کوئی صالح معاشرہ، پرامن ماحول اور خداترس و پاکباز سوسائٹی قائم نہیں کرسکتے، اور ان پر خدا کی مخلوق اور انسانی کنبہ کی قسمت کے بارے میں کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اس دنیا میں صالح ترین افراد اور صالح ترین معاشرہ صرف نبوت نے تیار کیا ہے، اور اسی کے پاس قلب کو بدلنے اور گرمانے، نفس کو جھکانے اور دبانے، نیکی و پاکبازی کی محبت اور گناہ اور بدی سے نفرت پیدا کرنے، مال و زر، ملک و سلطنت، عزت و وجاہت اور ریاست و تفوق کی سحر انگیز ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور وہی افراد جو ان صلاحیتوں کے مالک ہوں، دنیا کو ہلاکت سے اور تہذیب جدید کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔

نبوت نے دنیا کو سائنس نہیں دیا، ایجادیں نہیں عطا کیں، اسکو نہ اس کا دعویٰ ہے نہ ایسا نہ کرنے پر شرمندگی اور معذرت، اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو افراد عطا کئے جو خود صحیح راستے پر چل سکتے ہیں اور دنیا کو چلا سکتے ہیں، اور ہر اچھی چیز سے خود نفع اٹھا سکتے اور دوسروں کو پہونچا سکتے ہیں، اور جو ہر قوت اور نعمت کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی کے مقصد سے واقف اور اپنے پیدا کرنے والے سے آشنا ہیں اور اسکی ذات سے استفادہ کرنے اور اس سے مزید نعمتیں حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، انھیں کا وجود انسانیت کا اصل سرمایہ اور انھیں کی تربیت نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔

حقیقی کامیابی اور اس کا راستہ

(حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کی ایک تقریر سے مستفاد)

(جن حضرات کو کسی تبلیغی اجتماع میں مولانا موصوف کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہو انکو ضرور اسکا اندازہ ہوگا کہ ان تقریر ایک خاص غیر معمولی کیفیت اور مضامین اور تعبیر کی ندرت کی وجہ سے مولانا کی کسی تقریر کو قلمبند کر کے .... ذمہ داری کے ساتھ پیش کرنا کتنا مشکل کام ہے۔
گذشتہ مہینہ دسمبر میں بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں مولانا کی ایک تقریر کے نوٹ ہمارے ایک دوست محمد تقی صاحب فاروقی نے لئے تھے۔ موصوف نے ان ہی نوٹوں سے یہ تقریر مرتب کر کے الفرقان میں اشاعت کیلئے دی ہے۔
ہمارے نزدیک اسکی حیثیت یہی ہو کہ یہ "حضرت مولانا کی تقریر سے مستفاد" ہو ۔ —— مدیر)

خطبہ مسنونہ کے بعد:۔

میرے بھائیو اور دوستو! ہم اور آپ جو اس سردی کے زمانے میں دور دراز سے اپنے سارے مشاغل چھوڑ کر جمع ہوئے ہیں تو خالی بات کرنے یا سننے کے لئے نہیں جمع ہوئے ہیں، بلکہ ہمیں اس حقیقت پر غور کرنا ہے کہ اس دنیا میں جو محنتیں ہم انسان کر رہے ہیں، اور جس طریقہ سے کر رہے ہیں انکا نتیجہ کامیابی ہے یا ناکامیابی؟ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سمجھنے کی توفیق دیدیں کہ صحیح محنت کیا ہے اور اسکا کیا طریقہ ہو؟ تو یہ اجتماع ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس صحیح محنت اور اسکے صحیح طریقہ کو استعمال کریں۔

دنیا میں سارے انسان محنت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور سب یہی چاہتے ہیں کہ اپنی محنتوں میں کامیاب ہوں، لیکن اس نکتہ پر غور نہیں کیا جاتا کہ حقیقی کامیابی کیا ہے جس کے لئے ہمیں محنتیں کرنی چاہئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں جو تقاضے رکھے ہیں انکا ہمیشہ ہمیشہ پورا ہوتے رہنا اصل کامیابی ہے، لیکن یہ کامیابی ہر محنت کرنے والے کو نصیب نہیں ہوتی، اسکے لئے صحیح محنت شرط ہے،

اس لئے محنت کرنے سے پہلے اسکی تحقیق کرلینا ضروری ہے کہ صحیح محنت کیا ہے اور غلط محنت کیا ہے؟ غلط محنت سے بچکر صحیح محنت کرنے سے ہی کامیابی ہوسکتی ہے غلط محنت خواہ کتنی ہی کی جائے اور بظاہر کامیابیوں کے کیسے ہی شاندار خواب نظر آئیں لیکن اسکا آخری انجام ناکامیابی ہے، اور صحیح محنت چاہے تھوڑی ہی کیوں نہ ہو وہ یقیناً کامیابی تک پہونچانے والی ہے۔

محنت، انسان اپنے ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، زبان اور کان اور دل و دماغ سے کرتا ہے اور ہر وقت کرتا رہتا ہے، جتنے قسم کے انسان دنیا میں موجود ہیں انکو اپنے ان اعضاء کے صحیح یا غلط استعمال اور اپنی قوتوں کے صحیح یا غلط صرف کرنے سے کامیابی یا ناکامیابی ملتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکثر انسان اپنی محنت کو صحیح کرنے کی فکر کے بجائے دوسروں کی دیکھا دیکھی محض محنت کرتے ہیں، اور انکی احمقانہ محنتوں کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کبوتر اپنی کابک یا ڈھابلی کے نیچے کے خانہ سے کبھی اوپر کے خانے میں جا بیٹھتے ہیں اور کبھی اوپر کے خانہ سے نیچے کے خانہ میں آجاتے ہیں۔ اور اپنی اس محنت کے نتیجے میں وہ اپنی اسی کابک کی دنیا میں نیچے اوپر ہوتے رہتے ہیں ــــ اسی طرح دنیا کے اکثر انسان بس دولت یا عہدوں میں ترقی اور بلندی کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور بس اسی کو اپنی کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جس طرح ایک کبوتر اپنی کابک کے اوپر والے خانہ میں جا بیٹھنے کے بعد بھی کبوتر ہی رہتا ہے اور اسکی غذا اور زندگی موت وغیرہ کا قانون وہی رہے گا جو عام کبوتروں کا ہے، اسی طرح انسان دولت یا عہدوں میں ترقی کر کے عام انسانوں کی طرح کا ایک انسان ہی رہے گا اور انسانوں کے لئے دکھ سکھ اور موت و حیات کے جو قدرتی ضابطے مقرر ہیں انہی میں جکڑا رہے گا۔ یعنی بیماری اور پریشانی، مصیبت اور بے آرامی، رنج و غم اور بالآخر موت سے نجات نہیں پاسکے گا۔ حالانکہ انسان جیسی اعلیٰ و اشرف مخلوق کیلئے صحیح محنت وہی ہوسکتی ہے جو ان ناگواریوں سے قطعی نجات دلادے اور دائمی عیش و سکون تک پہونچادے، بس ہمیں اور آپکو اسی محنت کو دریافت کرنا اور اسی کو اپنانا چاہیئے۔

میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ایک ضابطۂ عمل مقرر کیا ہے اور پیغمبروں کے ذریعہ بتایا ہے کہ جس کا عمل اس ضابطہ کے مطابق اور اللہ کو راضی کرنے والا ہوگا وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوگا خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک قوم، اور چاہے وہ کسی حال میں ہو،

یعنی غریب ہو یا امیر، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا اور خواہ وہ دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، اگر اس نے اپنے عمل اور اپنی محنت کا موضوع اور مقصد اللہ کی رضا کو قرار دے کر اسکے مقرر کئے ہوئے ضابطۂ عمل کا اپنے کو پابند بنا لیا ہے تو اسکے نتیجے میں وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

قرآن شریف میں جا بجا اعمال کے نتائج کا ذکر ہے اور اُن قوموں کا انجام بتلایا گیا ہے جو دنیا میں سارے مادی اسباب وسائل رکھتے ہوئے بھی اپنے اعمال کی خرابی کے نتیجے میں تباہ و برباد ہوئیں اور اُن لوگوں کا بھی ذکر ہے جن کے پاس اسباب و ذرائع کچھ بھی نہیں تھے لیکن اپنے اعمال کی نیکی اور اپنی صحیح محنتوں سے دنیا میں بھی کامیاب اور سربلند ہوئے اور آخرت میں بھی انکی کامیابی یقینی ہے۔ غرضکہ تمام دنیا کے انسان بحیثیت انسان کے اللہ کے نزدیک ایک صف میں ہیں جن کے عمل اچھے ہیں وہی کامیاب، اور جن کے عمل خراب ہیں وہ ناکامیاب ہونیوالے ہیں۔

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ کامیابی نیک اعمال پر منحصر ہے نہ کہ اسباب و ذرائع پر، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارے عمل نیک اور کامیابی تک پہونچانے والے کیسے بن سکتے ہیں؟

اسکے لئے دو چیزیں شرط ہیں، اول یہ کہ ہمارے عمل اور محنت کا موضوع و مقصد صحیح اور اعلیٰ ہو، اور دوسرے یہ کہ اس محنت اور عمل کا طریقہ بھی صحیح ہو۔ پس اگر انسان اپنی محنت کا مقصد اور موضوع اس دنیا میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل بنائے گا تو گویا اس نے اپنے فانی اور پست وجود کو مقصود بنا یا، اور اسکے وجود کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ناپاک قطرے سے وہ بنا ہے اور جو کچھ استعداد اور کمالات اپنے اندر دیکھتا ہے ـــــــ اور وہی دراصل انسان کا امتیاز ہے ـــــــ اسکی بھی اللہ تعالیٰ کے کمالات کے سامنے کچھ حقیقت اور حیثیت نہیں۔ اگر انسانی وجود کا مقابلہ حق تعالیٰ کی ذات عالی سے کیا جائے تو انسان کی ذات اپنے مادی جسم اور دل و دماغ کی ساری صلاحیتوں اور اپنے تمام بشری کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے مقابلہ میں اس قدر پست اور ہیچ ہے کہ گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط کے مقابلہ میں انسان بالکل بے علم ہے، اسکی قدرت کاملہ کے سامنے بالکل عاجز اور بے بس ہے، اسکی شان بصیری کے مقابلہ میں گویا بالکل اندھا ہے، اسکی سماعت کے مقابلہ

میں گویا بالکل بہرا ہے، پس اگر انسان جو اپنے اصل مادّہ کے لحاظ سے گندہ اور ناپاک اور اپنی قوتوں کے لحاظ سے اس قدر ضعیف ہے اپنے ہی نفس کو اپنا مقصود بنا لے تو گویا اسکا مقصد اندھا، بہرا گونگا۔ بے عقل اور کمزور ہوگا اور اسکی کامیابی بھی اُس کے اس مقصد کی مناسبت سے سراب کی طرح محض ایک دھوکا اور انتہائی پست اور در اصل ناکامیابی ہوگی، لیکن اگر انسان اپنا مقصدِ زندگی رضائے الٰہی کو بناتا ہے اور اپنی محنت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کرتا ہے تو وہ اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت قوت والا، بحید دیکھنے والا، بے انتہا سننے والا اور نہایت علم کا حامل بنتا ہے اور اسکے اس اعلیٰ مقصد کے لحاظ سے اسکی کامیابی بھی بے مثال اور ابدی اور اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

خدا کو اپنا مقصود بنانے اور خدا کو پانے کے لئے انسان کو اپنے اندر سے خرابیوں کو نکالنا اور اچھائیوں کو اختیار کرنا ہوگا، ناپاکی کو نکالنے اور پاکی حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی ہوگی، شرک وجہالت اور تمام رذائل اور عیوب کو اپنے اندر سے نکالنے اور انکی جگہ توحید ومعرفت اور محاسنِ اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے جد وجہد کرنی پڑے گی، جو انسان جس حد تک اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرے گا وہ اسی قدر کامیاب ہوتا جائے گا اور اسکی روح پاک اور مصفّا اور معطّر ہوگی، اور جو اپنے نفس اور اپنی ذات کو مقصود بنائے گا وہ دنیا میں اپنے ذلیل وحقیر اور غلط مقصد کی وجہ سے فتنہ وفساد، ظلم وستم، اور ساری بد اخلاقیوں اور غلط کاریوں پر محنت کرے گا اور آخر کار جہنم میں جائے گا۔

اسلئے سب سے پہلا مسئلہ صحیح مقصد کا تعین ہے اور سب سے اعلیٰ مقصد "لا الٰہ الّا اللہ" ہے۔ یعنی یہ کہ صرف اللہ کو اپنا مقصود بنایا جائے اور اسی کے راضی کرنے پر محنت کی جائے، یہی وہ پاک بلند اور نورانی مقصد ہے جس کو اختیار کر کے ہماری محنت اور ہمارے عمل پاک بلند نورانی اور کامیابی تک پہونچانے والے ہوں گے۔

دوسرا مسئلہ محنت کے راستہ اور طریقہ کا ہے، اگر مقصد صحیح متعین کرنے کے بعد محنت کا راستہ بھی صحیح اختیار کیا گیا تو کامیابی بھی یقینی اور اعلیٰ ہوگی، اور اگر خدا سے ناآشنا، خداوندی قوانین سے جاہل دنیا کی تقلید میں محنت کا راستہ غلط اختیار کر لیا گیا تو اصل کامیابی کبھی حاصل

نہ ہوگی، آپ یوں سمجھئے کہ اگر مٹی کو ساری دنیا والے سونا کہنے لگیں اور اسکو سونے کی جگہ استعمال بھی کرنے لگیں تو وہ سونا نہیں بنجائے گی اسی طرح اللہ کے نزدیک جو دنیا کی حقیقت ہو یعنی ایک مچھر کے پَر برابر بھی وہ نہیں ہے ——— اور سارے انبیاء اور اولیاء نے دنیا کو اسی نظر سے دیکھا ہے ——— تو اگر انسان مادّی ذرائع اور دنیاوی وسائل کو کامیابی کا راستہ سمجھ کر انھیں پر محنت کرے تو اصل کامیابی تک ہرگز نہیں پہونچ سکے گا، انسان چاہے چاند اور سورج تک پہونچ جائے یا اسکے قدموں کے نیچے چاند اور سورج آجائیں لیکن اللہ کو نہیں پا سکتا، چاہے دنیا کی ساری دولت اور سارا سامان لٹا دے لیکن اس راستہ سے اللہ کو نہیں پا سکتا، بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو ہی اختیار کر کے خدا کو پا سکتا ہے۔ اس طریقہ کا ایک ایک عمل اگرچہ وہ ادنیٰ اور چھوٹا ہی ہو دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے مثلاً صرف ایک دفعہ اللہ کا نام اگر حضورؐ کے بتائے ہوئے طریقہ سے لیا جائے تو ساری دنیا سے زیادہ قیمتی ہے۔ پس اگر ہمارا مقصد صحیح اور درست ہو اور اسکے حصول کے لئے طریقۂ محمدی اختیار کیا جائے اور اسی پر محنت کی جائے تو فلاح دارین نصیب ہو سکتی ہے۔

طریقۂ محمدی کیا ہے؟ راضی برضائے الٰہی ہونا، اگر ہماری خواہش پوری ہو تو الحمدللہ اور اگر پوری نہ ہو تو انا للہ، اگر پیٹ بھرے تو اللہ کا احسان سمجھنا اور اگر بھوکا رہنا پڑے تو اسی پر راضی رہنا، کیونکہ ہمارا مقصدِ حیات روٹی نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی ذات اور اسکی رضا طلبی ہے، پس جس حال میں جو اسکی رضا ہو وہی ہمارا مقصد ہے، اگر یہ طریقہ ہم اختیار کرلیں تو ہر حال میں اللہ کو پائیں گے، فقیر اور بھوکے ہوں تب بھی، مال دار اور پیٹ بھرے ہوں تب بھی، تندرست ہوں تب بھی، بیمار ہوں تب بھی۔

حضورؐ کے بتلائے ہوئے طریقوں اور انسانی زندگی کے نقشوں میں کیا فرق ہے؟

انسانوں کا طریقہ لینا اور خدا کا طریقہ دینا ہے۔ یعنی انسان اپنی زندگی کے لئے چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق کو دیتے ہیں لیتے نہیں، انسان جب اپنے طریقہ پر دنیا لینے اور حاصل کرنے کی دھن میں لگ جاتا ہے تو وہ آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں جن کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی، ہر شخص لینے والا، ہر طبقہ لینے والا، ہر گروہ کا موضوع و مقصد بنا ہی لینا

بن جاتا ہے، اسکے نتیجہ میں فتنہ و فساد، ظلم و ستم، غارتگری و خونریزی، چوری ڈکیتی، رشوت اور بد دیانتی اور اس طرح کی ساری بداخلاقیوں کا سیلاب آجاتا ہے، حاکم اپنے محکوموں سے، قومیں دوسری قوموں سے، یہاں تک کہ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے غرض کہ ہر انسان ہر وقت لینے ہی کی بات سوچتا ہے اور حق و ناحق اور حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، کوئی کسی کا سچا ہمدرد اور کوئی کسی کی مصیبت میں خلوص سے رونے والا باقی نہیں رہتا، انفرادی جرائم اور حکومتوں کے انقلابات اور خونریزیوں اور خوف و دہشت کا ایسا دور دورہ ہوتا ہے کہ زندگی ایک مصیبت بن جاتی ہے جس کا نقشہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، حضورؐ نے فرمایا تھا، ایک زمانہ میں ظاہر کے دوست، دلوں کے اندر دشمن ہوں گے آج عام حالت یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی خوشحالی اور ہر طبقہ کی فلاح و بہبود کا راز یہ بتلایا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ سکھلایا کہ انسانوں سے لینے کی خواہش کی بجائے ہم اللہ سے لینے کی عادت ڈالیں، انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ زیادہ لینے کے واسطے تھوڑا دینے پر تیار ہوجاتا ہے، اسی کو تجارت کہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بالکل ہماری فطرت کے مطابق حکم دیا کہ تمھارے پاس جو تھوڑا سا ہے وہ دوسرے انسانوں پر خرچ کرو اور ہمارے لامتناہی خزانے لینے والے بنو، اس سلسلہ میں فضائل کی جو احادیث بیان کی گئی ہیں ان میں وعدے فرمائے گئے ہیں کہ اگر تم نے بھوکے کو روٹی کھلائی تو ہم اسکے بدلہ زمین آسمان سے زیادہ وسیع جنت عطا فرمائیں گے، اسی طرح کسی روتے ہوئے کے آنسو پونچھنے اور ننگے انسان کو کپڑا دیکر اسکی ستر پوشی کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ان میں سے ایک ایک عمل کے بدلہ زمین و آسمان سے بڑی جنت ملے گی۔

اللہ تعالیٰ انسان کے ان ہاتھوں کو جو اسکے حضور اٹھتے ہیں غیر اللہ کے سامنے پھیلوا کر ذلیل و ناپاک کرانا نہیں چاہتے، انکی غیرت کے خلاف ہے کہ انکے در کا بھکاری کسی دوسرے دروازہ پر سائل بن کر جائے، اسی لئے اللہ کے سوا دوسروں سے مانگنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اسی پر زور دیا گیا ہے کہ خالق سے لینے والے اور مخلوق کو دینے والے بنو، سود کو اسی لئے حرام کیا گیا کہ

اس سے لینے والی ذہنیت ختم ہوتی ہے، قرض میں مہلت دینے کی فضیلت میں فرمایا گیا کہ جتنی مدت تک مہلت دو گے صدقہ میں شمار ہوگا، الغرض ہر شعبۂ زندگی میں اسی طریقہ کو اختیار کرنے یعنی مخلوق کو نفع پہونچانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اللہ سے لینے کے طریقہ کا نام "طاعت" اور مخلوق کو دینے کا نام "اخلاق" ہے، اطاعت وفرمانبرداری کا حکم اسی لئے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطایا اور بخششوں کا ذریعہ ہے ورنہ سارے انبیاء واولیاء اور سارے مخلوق کی اطاعت وعبادت اور حمد وثنا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی شان میں بال برابر اضافہ نہیں ہوتا اور نہ اسکو ذرہ برابر نفع پہنچتا ہے۔

حضورؐ نے خالق سے لینے اور مخلوق کو دینے والی زندگی کا ایک مکمل نظام عطا فرمایا ہے، جس کو اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تمہارا محب اور تمہیں انکا محبوب بنا دینگے اور تمہیں وہ مقبولیت اور وہ رفعت وعظمت عطا ہوگی جس کا خود تمہیں وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔

اس طریقہ کو اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے چار باتیں ضروری ہیں:-

ایک اپنی ذات کو پہچاننا، دوسرے کائنات کو پہچاننا، تیسرے اللہ تعالیٰ کو پہچاننا۔ چوتھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ یقین پیدا کرنا ضروری ہے کہ ساری مخلوق میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی ذات کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں، اور ہر چیز پر خدا کا اور صرف خدا کا قبضہ ہے وہ جس چیز کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے اور اس سے جو اثرات اور نتائج پیدا کرنا چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ اگر دولت اور ساز وسامان والوں کو ناکامیاب اور انکے مقابلہ میں غریبوں اور تہی دستوں کو کامیاب کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اگر اکثریت کو ناکامیاب اور اس کے مقابلہ میں اقلیت کو کامیاب بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے آگ سے پانی کا اور پانی سے آگ کا کام لے سکتا ہے۔

اسی طرح کائنات کے بارے میں یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ وہ اللہ کے تابع فرمان ہے اور اللہ تعالیٰ اسکے کسی قانون کے بالکل پابند نہیں، اور اس پر ہر طرح کے تصرف کی اسکو قدرت حاصل ہے۔

اسی طرح اپنے بارے میں یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ میرا علم اور میری سمجھ بالکل ناقص

اور نارسا ہے اور صحیح اور سچا اور کامل اور حقیقی علم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعہ عطا کیا گیا ہے۔

حضورؐ کے بارے میں یہ ایمان و یقین ضروری ہے کہ اب صرف آپ کے طریقہ ہی سے انسان خدا کے خزانوں سے لامحدود استفادہ کر سکتا ہے، اور اسکے خلاف راستہ اختیار کر کے کائنات کے سارے خزانے ساتھ ہونے کے باوجود خدا کی ذات سے ایک ذرہ حاصل نہیں کر سکتا، اس علم و یقین اور طریقۂ محمدی کی پیروی کے ساتھ ہر عمل خواہ وہ رفع حاجت کرنا ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اسکی ذات عالی سے استفادہ کا ذریعہ بنجاتا ہے۔

ان چار باتوں سے ابتدائی مناسبت پیدا کرنے کے لئے ہمارے طریقۂ کار میں (جس کا نام تبلیغ مشہور ہو گیا ہے) یکسوئی کے ساتھ چار مہینے کی مشق ضروری ہے، اسی کی ہم سب کو دعوت دیتے ہیں۔

تعارف و تبصرہ

سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

از جناب محمد اجمل خاں صاحب

کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر، صفحات ۵۱۲

قیمت مجلد، بارہ روپے

ملنے کا پتہ:- (۱) عبدالقدیر الاعظم عباسی، محلہ کشن گنج، دہلی ۶

(۲) مکتبۂ بیت الحکمت، اردو بازار، لاہور (پاکستان)

تعارف - جناب محمد اجمل خاں صاحب اس کتاب کے ابتدائی صفحات (حرف اول) میں لکھتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ قرآن کے بغیر سیرت اور سیرت کے بغیر قرآن کا سمجھنا بہت ہی دشوار کام ہے ان دونوں کو جمع کرنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کو الگ الگ مدون کر کے اور آنحضرتؐ کی زندگی کے مختلف ادوار قائم کر کے دونوں کو ایک ساتھ تاریخی ترتیب سے بیان کیا جائے۔"

(صٓ)

موصوف نے اپنی اس ضخیم تالیف کے ذریعہ یہی کام انجام دینے کی کوشش کی ہے اور اس کے خاص فائدے کے طور پر لکھا ہے کہ

"اب مسلمانوں پر واضح ہو جائے گا کہ خوش عقیدہ مؤرخوں اور تفسیر بالرائے کرنے والے مفسروں نے اسلام کے روشن چہرے پر پس منظر اسلام (یعنی تاریخ تمدن انسانی) کی کج فہمی اور ترتیب نزول قرآن پر عدم توجہ کی وجہ سے کتنے پردے ڈال دیئے تھے۔"

اس معرکہ آرا کتاب کا ترتیبی نقشہ یوں ہے۔

۱۔ ایک طویل مقدمہ، جو تین بڑے بڑے ابواب اور کئی فصلوں پر ۱۲۲ صفحات کی ضخامت میں پھیلا

ہوا ہو۔ اس میں پس منظر اسلام یا تاریخ تمدن انسانی کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

۲۔ سیرت قرآنیہ مکیہ۔ جس میں آنحضرت کی مکی زندگی اور مکی قرآن کے پانچ دور قائم کرکے اسے پانچ فصلوں میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ پانچ فصلیں اور پانچ دور یہ ہیں۔

محمدؐ الامام۔ محمدؐ المنذر والمزکیؐ، محمدؐ المذکر والمبشر والہادی۔ محمدؐ المرسل، رسولؐ اللہ الی العالمین۔

۳۔ سیرت قرآنیہ مدنیہ۔ اس میں مدنی قرآن اور آنحضرت کی مدنی زندگی کو مزید پانچ ادوار میں تقسیم کرکے مزید پانچ فصلیں قائم کی گئی ہیں۔

امیر العالمین۔ سیدؐ المجاہدین، خاتمؐ النبیین، محسنؐ المفتوحین، رحمۃؐ للعالمین۔

۴۔ حرف آخر۔ یعنی سیرت نبویہ قرآنیہ کا خلاصہ اور دنیا کو اس کا پیغام۔

۵۔ پیغام محمدی کی مشکلات پر نظر ثانی قرآن کی روشنی میں ــــ یعنی قرآن اور سیرت کو تاریخی ترتیب سے نہ دیکھنے کے نتیجہ میں جو غلط فہمیاں پیغام محمدی کے سلسلہ میں پیدا ہوئی ہیں ان کی فہرست اور ان کا ازالہ ــــ یہ وہی چیز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤلف نے "حرف اول" میں کہا تھا کہ "اب مسلمانوں پر واضح ہو جائے گا کہ" الخ

تبصرہ۔ کوئی شبہ نہیں کہ جناب اجمل خاں صاحب کو پانچسو صفحے کی ضخامت کی اپنے طرز کی یہ پہلی کتاب تیار کرنے میں بڑی دماغ سوزی اور بے نہایت کاوش کرنا پڑی ہوگی۔ اور ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ کتاب کا مطالعہ قرآن فہمی کے بارے میں ایک ایسے انداز فکر کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اگر اس سے اعتدال کے ساتھ کام لیا جائے تو قرآنی مشکلات کے حل میں یقیناً مفید ہوگا۔ لیکن کتاب کا یہ رخ کہ عموماً بلا کسی سند حجت کے بالکل قطعی انداز کی باتیں لکھی گئی ہیں، جہاں کتاب کو ظن و تخمین کا پشتارہ بنا کر رکھ دیتا ہے وہیں یہ خطرناک راہ بھی لوگوں کے لیے کھول دیتا ہے کہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر جو کچھ چاہیں قرآن اور اس کی تعلیمات کے بارے میں سمجھ کر بیٹھ جائیں۔

ٹھیک ہے کہ قرآن تئیس سال کی مدت میں نجماً نجماً نازل ہوا تھا۔ اور آج قرآن کی آیتیں اور سورتیں جس ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں نزول میں اُن کی یہ ترتیب نہ تھی۔ لیکن اولاً تو آپ کے پاس وہ کون سی تاریخی دستاویز ہے جس کی بنیاد پر آپ کل آیات قرآن کے متعلق نقشہ کھینچ کر ہمیں بتادیں کہ ان کی ترتیب نزول یوں ہے ــــ بے شک کچھ خارجی شہادتیں (روایات) ہیں جن سے کچھ حصہ کی

ترتیب نزول پر روشنی پڑتی ہے اور کہیں کہیں داخلی شہادتیں بھی ایسی واضح ہیں کہ ہم کچھ تعین کر سکتے ہیں۔ پھر بھی قرآن کا اکثر حصہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں ہم وثوق کے ساتھ نزولی تقدم و تاخر کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں قرآن فہمی کو بہ ترتیب نزول قرآن کے مطالعہ پر موقوف قرار دینے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس معاملہ میں قیاس آرائی پر بے جا اعتماد کرنے کو تیار نہ ہوں وہ تشکیک و ارتیاب کے مرض میں مبتلا ہو جائیں۔ اور جو لوگ قیاس آرائی کا راستہ قبول کر لیں وہ اپنے نتائج افکار سے اختلاف امت کا ایک نیا اکھاڑا ایجاد دیں......

....

ثانیاً جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ سورتوں کی تدوین اور ان کی آیات کی ترتیب توقیفی ہے (یعنی ہر ہر سورۃ میں جو آیتیں ہیں اور وہ جس ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں یہ سب بحکم خداوندی ہے) اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترتیب و تدوین کرائی ہے درانحالیکہ یہ ترتیب بہت سی جگہ تنزیلی ترتیب سے مطابقت نہیں رکھتی جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں قرآن کا فہم اس کے بہ ترتیب نزول مطالعہ پر موقوف نہیں تھا —— تب پھر کیا حیثیت رہ جاتی ہے کسی کے اس نظریہ کے کہ جب تک قرآن کا مطالعہ اس کی تاریخی ترتیب کے ساتھ نہ کیا جائے اس کی تعلیمات کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا؟

اگر سورتوں کی توقیفی ترکیب اور (ان کی آیات کی باہمی) ترتیب قرآن فہمی کے راستہ میں کوئی مشکل نہیں ڈالتی تو پھر یہ ارشاد بھی بالکل بے جا ہے کہ

> "اسلامی تعلیم کے ساتھ سب سے بڑی مشکل کی بنیاد ۳۵ھ سے پڑی۔ جبکہ سرکاری حکم سے قرآن کی ترتیب ایک خاص انداز پر متعین کر دی گئی۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کی مخالفت کے باوجود یہی ترتیب مفسروں کے لئے باقی رہ گئی" (ص۱۲)

لیکن اگر آپ ۳۵ھ نے سرکاری حکم کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

> "اگر قرآن کی خدائی ترتیب باقی رہتی تو کوئی یہ نہ کہتا کہ قرآن تفسیر بالرائے کرنے والوں کی منطق کا محتاج ہے اور انسانی سوسائٹی کو عقل و شوری یعنی جمہوریت سے محروم کر کے پھر پروہتوں یا فقیہوں کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا ہے" (ایضاً)

تو پھر "خدائی ترتیب" کو اس الزام سے الگ رکھنے کی بات سراسر تکلف ہے اس لیے کہ سورتوں کی ترکیب اور ان کے اجزاء (آیات) کی ترتیب بھی خدائی ترکیب و ترتیب ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ "سورۂ بقرہ کے چالیس رکوعوں کو" جو بقول آپ کے "آنحضرت کی دس سالہ حیات مدنی زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں" ہمارے سامنے ایک بالکل مسلسل تنزیل کے انداز میں یکجا رکھ دیا گیا ہے اور جو کوئی کہنے والا قرآن کی موجودہ (عثمانی) ترتیب پر کہہ سکتا ہے وہ اس پر بھی بلا کسی فرق کے کہہ سکتا ہے کہ۔

"قرآن تفسیر بالرائے کرنے والوں کی منطق کا محتاج ہے اور انسانی سوسائٹی کو۔۔۔

۔۔۔۔ پھر پروہتوں یا فقیہوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔"

موجودہ ترتیب کے نتیجہ میں قرآن پروہتوں یا فقیہوں کا محتاج ہو گیا ہے یا نہیں کہ وہ اپنی منطق بگھار کر تفسیر بالرائے کریں؛ اس بحث میں ہم یہاں پڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن ذرا ان "قدامت پرست" اور "ترتیب نزول سے بے خبر" مفسروں کے مقابلہ میں جنھوں نے "دنیا کے تمام قدامت پرستوں کے دستور کے مطابق" "پیغمبر کی تعلیم کو وہ معنیٰ پہنائے جو خود ان کے دلوں میں بسے ہوئے تھے" اور "اسلام کے روشن چہرے پر پردے ڈال دیئے" جناب اجمل صاحب خود اپنے ان چند تفسیری نمونوں پر غور فرمائیں کہ ان میں تفسیر بالرائے کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ اور اس اصول تفسیر کو قبول کیے جانے کے بعد انسانی سوسائٹی قرآن کے معاملہ میں کلیتہً آپ جیسے چند باخبر حضرات کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے یا نہیں؟

ا۔ سورۂ القریش کی تفسیر میں ارشاد ہے۔

"اب آپ نے اپنی خداداد بلاغت اور بنو سعد کی فصاحت کے ساتھ اس طرح مخاطب کیا:۔ دنیا کو جنگ نے تباہ کر رکھا ہے۔ تجارت ختم ہو چکی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہ جاڑے اور گرمی کے سفر رجب اور ذی الحجہ کے بعد متعین کیے تھے جن کی وجہ سے بھوک اور خوف دور ہوتا تھا وہ بھی بند ہو رہے ہیں۔ روم اور ایران کی لڑائیوں نے رستے بند کر دیے ہیں۔ حاجی اور تاجر نہیں آتے۔ تمھاری یہ حالت ہے کہ تم زمانے کے ساتھ نہیں بدلتے۔ حاجیوں کی لوٹ کھسوٹ جاری ہے۔ وہ اگرچہ اپنا کھانا کپڑا لاتے ہیں لیکن تم نے یہ قاعدہ بنا دیا ہے کہ کھانا لیں تو تم سے خرید کر لیں اور طواف کعبہ کریں تو تم سے کپڑے

کرایہ پر مانگیں۔ ورنہ بھوکے رہیں اور ننگے رہ کر طواف کریں۔ دولتمندوں کی یہ حالت ہو کہ تکاثر کرتے کرتے قبر میں چلے جاتے ہیں اور نہ مسافروں کی مدد کرتے ہیں نہ مفلسوں کو عاریتہً بھی کوئی چیز دینا پسند کرتے ہیں۔"

بیچ میں یہ بتا کر کہ ابولہب اور امرأۃ ابولہب کی ہنگامہ آرائی سے جلسہ درہم برہم ہو گیا، فرماتے ہیں۔

"جو لوگ بیچ رہے تھے اُن سے المنذر نے فرمایا کہ جو بھوک اور خوف مکہ والوں پر طاری ہو اس سے بچنے کا واحد علاج یہ ہو کہ بہت سے دیوتاؤں اور آقاؤں کی غلامی ختم کی جائے اور سب مل کر اس رب کی عبودیت اور غلامی کا اظہار کریں جس نے سب کو بنایا ہے .... اگر ہم سب میں اتحاد ہو جائے اور سب انسانوں کو برابر سمجھیں تو ذرا شک نہیں کہ ہم ترقی کریں گے اور ہمارے ذاتی عقل و عمل آزاد ہو کر تخلیقی کاموں میں لگ جائیں گے۔ غلام اپنی زندگی سے مایوس ہیں۔ آقا اپنی تجارتی کساد بازاری سے پریشان ہیں۔ لیکن اگر وہ سب متحد ہو جائیں تو مایوسی امید سے بدل جائے گی اور وہ رب (آقا) جو ہمارا خالق ہو ہمیں ایسے رستے پر ڈال دے گا کہ ہم دنیا میں کسی قوم سے پیچھے نہ رہیں گے۔"

ص ۱۵۱، ۱۵۰

ذرا القریش کے الفاظ پڑھیے۔ (لایلاف قریش ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف) اور پھر غور کیجیے کہ الفاظ کی کن تہوں میں یہ مضامین پنہاں ہیں جو سورۃ کے پس منظر پر نظر ڈالتے ہی چمک اُٹھتے ہیں؟

ص ۱۹۱ پر سورۂ الحاقہ کے مضامین کا بیان ہو رہا ہے۔

"..... دیکھو اگرچہ تمھارے اعمال حد درجہ خراب ہو گئے ہیں، لیکن اگر اب بھی باز آ جاؤ گے تو نینویٰ والوں کی طرح تم بھی بچ سکتے ہو۔ ذوالنون (حضرت یونس) کا قصہ تم جانتے ہو وہ اس شہر کو عذاب سنانے گئے تھے۔ مگر جب لوگوں نے غلط روی کو چھوڑ دیا تو عذاب الٰہی ٹل گیا ان کی تجارت پھر چمک اٹھی اور غلام بھی آزاد ہو کر زیادہ محنت سے قومی دولت کو بڑھانے لگے۔"

یہ عبارت "الحاقہ" کے عنوان کے ماتحت ہو لیکن آخر میں حوالہ (القمر) ہو۔ مگر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نہ اس مضمون کی کوئی سطر الحاقہ میں ہو اور نہ القمر میں۔

آگے اسی صفحہ پر عنوان ہو "سورۃ القمر۔ دلیل بعث بعد الموت"۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

"تم یہ دلیل مانگتے ہو کہ خالق کائنات کس طرح مرے کو زندہ کرے گا، یہ دلیل تو خود اپنے اندر ڈھونڈھ سکتے ہو، دیکھو ہر سال کس طرح کھیتی مرتی ہو اور دوبارہ خدا بارش برساتا ہو۔ اور وہ زندہ ہو جاتی ہے۔" (القمر)

دس بار پڑھ جائیے۔ مگر سورۃ القمر میں اس مضمون کے الفاظ آپ کو شروع سے آخر تک کہیں نہیں ملیں گے۔

تفسیر بالرائے کے لیے بھی الفاظ کا کچھ نہ کچھ سہارا تو چاہیے یہ تو نری تصنیف ہو۔ کیا جناب اجمل خاں صاحب اس بات سے انکار فرمائیں گے کہ اگر قرآنی الفاظ کے صحیح مطالب اس انداز کے ہوتے ہیں (جن کا الفاظ سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا)، تب تو آج ساری دنیا قرآن کو سمجھنے میں تنہا ان کی ذات کے رحم و کرم پر ہے۔ (باقی آئندہ)

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ادارۂ الفرقان
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

کُتب خانۂ الفرقان کی مطبُوعات

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں، اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ در حقیقت انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پُر تاثیر ہے، کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ ۳۶ پونڈ چکنا مجلد ۲/۸/۰ قسم دوم کاغذ ۲۴ پونڈ چکنا غیر مجلد ۱/۱۲/۰

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپے ۳/۰/۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۲/۰/۰

آسان حج یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت .... صرف ۰/۸/۰

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۰/۱۲/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے

قیمت ۰/۱۲/۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر پر ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۰/۹/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۰/۹/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۱/۸/۰

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت ۱/۰/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے تابعین کا فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۸/۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۱/۸/۰

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ .... قیمت ۱/۰/۰

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید منظر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے ...... قیمت ۰/۱۰/۰

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ

فی کاپی آٹھ آنے

ہندستان و پاکستان سے	غیر ممالک سے
سالانہ چندہ (بسکۂ ہندستان) ۵/	سالانہ چندہ ۔۔۔۔ اشلنگ
سالانہ چندہ (بسکۂ پاکستان) ۶/	اعزازی خریداروں سے
ششماہی ۳/	سالانہ ۱۵/

جلد ۲۷	بابتہ ماہ شعبان ۱۳۷۹ھ ، مارچ سنہ ۱۹۶۰ عیسوی	شمارہ ۸،۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو تو

اسکا مطلب یہ ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا، وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے اور رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۸ مارچ تک پہونچ جانی چاہیئے۔

پاکستانی حضرات } اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجیں۔

تاریخ اشاعت } رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۵ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں انکی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں ــــ شکایت پر دوسرا رسالہ آئندہ ماہ کے رسالے کے ساتھ بھیجا جائے گا۔ جلدی ہو تو براہ کرم ۱۲ نئے پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- **دفتر الفرقان ، کچہری روڈ ، لکھنؤ**

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ ماہ ان صفحات میں حکومت ہند کی مقرر کردہ اُس کمیٹی کی رپورٹ کا ذکر آیا تھا جو روحانی اور اخلاقی تعلیم کی ضرورت اور اسکے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کے جو چند خاص اجزا تذکرہ میں آئے تھے ان میں سے ایک کی مناسبت سے عنان قلم ایک خاص سمت میں مڑ گئی تھی۔ اور باقی اجزا صرف ذکر ہی میں آکر رہ گئے تھے۔ آئیے اس تشنگی کو آج کی صحبت میں دور کیا جائے۔

کمیٹی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ:۔

"تعلیمی دنیا میں اور سماج میں مجموعی طور پر جو صورت حال ہے اور جس کے نتیجہ میں وسیع پیمانہ پر گڑ بڑ ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ عوام پر سے مذہب کا اثر بتدریج ختم ہو رہا ہے"

اور اسی خیال کے ماتحت علاوہ اخلاقی اور روحانی قدروں کی تعلیم پر زور دینے کے یہ مشورہ بھی بڑی اہمیت کے ساتھ دیا گیا تھا کہ:۔

"اس قسم کی اخلاقی اور روحانی تعلیم میں اس بات کی ضرورت ہے کہ مختلف مذاہب کے عظیم رہنماؤں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تعلیمات کا ہمدردانہ تقابلی مطالعہ کیا جائے"

علاوہ ازیں یہ کہ

"کسی بھی تعلیمی اسکیم میں طالب علم کے گھر کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے، ہمارے گھروں کی خامیاں اور وہاں کی نفسیاتی فضا پر توجہ دی جانی چاہیئے، اور وہ طریقے بتانے چاہئیں جن کے ذریعہ سے یہ خامیاں دور کی جا سکیں۔"

اسی ضمن میں رپورٹ کا ایک اور خاص ٹکڑا جو اُس وقت ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا یہ بھی تھا کہ:-

"اچھا اخلاق سکھانے اور ادب و احترام اور انکسار کے اوصاف کو ــــ جن کی ہمارے ملک میں اشد ضرورت ہے ــــ فروغ دینے پر خاص توجہ دی جانی چاہیئے، اور شمالی ہندوستان کے مسلم مولویوں جیسے اساتذہ سے صحیح اخلاق سیکھنے کے روایتی طریقوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔"

مذکرہ کمیٹی کی اس رپورٹ اور ان سفارشات کو ہم موجودہ فضا میں، ایک بڑی بے باکانہ جرأت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کمیٹی نے ــ مجرد مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے اہتمام کا مشورہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کا یہ ڈھنگ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ ایسی تعلیم میں بھی مذاہب کے عظیم رہنماؤں کی زندگیوں اور انکی تعلیمات کا خلاصہ اور ہمدردانہ تقابلی مطالعہ شامل ہونا چاہیئے۔ کمیٹی نے یہ بات پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم کے تمام ہی مدارج کے بارے میں کہی ہے۔ جبکہ آج حال یہ ہے کہ ملک بھر میں پرائمری تعلیم کو صرف ایک مذہب کے رہنماؤں کے حالات زندگی اور انکی تعلیمات کا آئینہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور بعد کے مراحل میں جو کچھ تقابلی مطالعہ کا عنصر شامل کیا گیا ہے اُس کا رنگ بعض مذاہب کے ساتھ ہمدردانہ کے بجائے کھُلا کھُلا معاندانہ ہے۔ جس کی ایک مثال یو، پی کے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کلاسز میں پڑھائی جانے والی کتاب "دشو کراتی کی لہریں" ہے۔ جس کے ایک سبق میں اسلام اور عیسائیت کا تقابل کرتے ہوئے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اس درجہ دریدہ دہنی اور گندہ ذہنی کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ اُسے عناد کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب پر حال ہی میں یو، پی اسمبلی میں سوال ہوا تو وزیر تعلیم نے ارشاد فرمایا کہ "یہ کتاب

انہی قابلِ اعتراض حصوں کی وجہ سے سنہ ۷۵ء میں نصاب سے خارج کر دی گئی تھی اور بازار سے اسکی تمام کاپیاں واپس لے لی گئی تھیں۔ اور اب یہ قابلِ اعتراض اجزاء حذف کر کے دوبارہ سنہ ۷۶ء کے امتحانات کے لئے منظور کی گئی ہے"۔ــــــ لیکن جیسا کہ وزیر موصوف کو اسمبلی ہی میں بتایا گیا، واقعہ یہ ہے کہ کتاب میں یہ قابلِ اعتراض اجزاء آج بھی موجود ہیں۔ اور انھیں اجزاء کے ساتھ یہ کتاب پڑھائی جا رہی ہے۔

اب تک ہم گنہگار ہی کہتے آ رہے تھے ــــــ اور اسی لئے شاید یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہو رہی تھی ــــــ کہ نصابی کتابوں کا یہ رُخ نہایت خطرناک ہے۔ اس میں سوال مسلم اقلیت کی حق تلفی اور دل آزاری ہی کا نہیں، ملک کی پوری نئی نسل کی ذہنی تعمیر اور تخریب کا بھی ہے ــــــ لیکن اب تو محکمۂ تعلیم کے کارپردازوں، ٹیکسٹ بک کمیٹیوں اور تعلیمی بورڈوں کے معزز ممبروں کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ کہ اب یہ چیخ پکار صرف مسلم اقلیت کے "سرپھروں" ہی کی نہیں ہے، بلکہ سری پرکاش، جی، سی، چیٹرجی اور بی، این کرپاں جیسے اکثریت کے معتمد دانشوروں کی آواز بھی اس آواز میں آملی ہے ــــــ اس آواز کو مسلم سرپھروں کے علاوہ صرف ان غیر مسلم دانشوروں کی آواز بھی نہ سمجھئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس ملک کے ضمیر کی آواز ہے اور اس آواز کو گوش انداز کرنے کا نتیجہ اسکے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم ملک کو ایک بڑے اخلاقی اور روحانی سرمایہ سے محروم کر دیں۔

کمیٹی نے ایک دوسری بڑی قابلِ توجہ بات یہ کہی ہے کہ "کسی تعلیمی اسکیم میں طالب علم کے گھر کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے"ــــــ غور کیجئے تو یہ انتہائی بیش قیمت نکتہ ہے۔ ہر انسان کا پہلا مدرسہ اس کا گھر ہے۔ گھر کی فضا اگر درست نہ ہو تو اچھی سے اچھی تعلیم کے اثرات کا پروان پانا اور طالب علم کی زندگی میں داخل ہونا عام طور پر بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اسکے برعکس اگر گھر کی فضا میں اخلاقی اور روحانی اقدار کی پرورش کا سامان ہے تو پھر زیادہ اچھی تعلیم نہ پانے والے طالب علم کی زندگی پر بھی ان اقدار کا اثر قائم ہو سکتا ہے۔

گھر کے بعد سماج اور سوسائٹی کا درجہ آتا ہے۔ یہ بھی انسان کے کردار کی تشکیل میں بڑا مؤثر عامل ہے۔ عام سماج اور سوسائٹی پر اگر اخلاقی اور روحانی اقدار کی حکمرانی نہیں ہے تو پھر اس خراب

ماحول میں محض اچھی تعلیم کے بل بوتے پر مشکل ہی سے کوئی پاک دامن رہ سکتا ہے۔ لیکن معاشرہ کا حال اگر اخلاقی اور روحانی نقطۂ نظر سے اچھا ہو تو تعلیم کے بغیر بھی انسان کا یہ فطری جوہر چمک سکتا ہے۔

ہمارے اس دور کی بہت بڑی مصیبت یہ ہے کہ مادہ پرستی اور نفس پروری کے غلبہ نے ایک طرف روحانی اور اخلاقی اقدار کا دیوالہ نکال کر رکھ دیا ہے، ساری سرگرمیوں کا محور اور تمام توانائیوں کا مصرف دولت کی تحصیل اور نفسانیت کی تسکین ہے۔ اور اس جنون کے ہاتھوں اخلاق اور روحانی اقدار کی قبا بری طرح تار تار ہو رہی ہے۔ تحصیل دولت اور تسکین نفس کے اس جنون نے زندگی کی ہر سمت اور ماحول کے ہر خانہ کو ایسے اسباب و وسائل سے بھر دیا ہے کہ اخلاقی و روحانی اقدار کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں رہ گیا ہے۔ بازار ان اخلاق و روحانیت کش اسباب و وسائل سے پٹے پڑے ہیں۔ محلّوں پر ان کی یلغار ہے، تعلیمی اداروں پر ان کا نرغہ ہے اور گھروں کی فضا ان کے زہر سے مسموم ہو چکی ہے۔ دوسری طرف جن لوگوں کے ہاتھوں میں زندگی کی قیادت ہے انھیں ان چیزوں کے سدباب سے کوئی سروکار نہیں۔ مادی پہلو سے تو وہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں بھی دخل اندازی کے ٹھیکیدار بنتے ہیں، اشیاء میں ملاوٹ تو نہیں ہو رہی ہے، بازار میں کوئی سواری فلاں جانب کے بجائے فلاں جانب تو نہیں چل رہی ہے اور چوراہے کو کوئی سواری غلط سائڈ سے کراس کر کے ایکسیڈنٹ کا خطرہ تو نہیں پیدا کر رہی ہے؟ یہ تمام چیزیں انکی دخل اندازی کے دائرہ میں آتی ہیں، لیکن اسی چوراہے پر اور اسی بازار میں اگر کوئی گندے سے گندہ ریکارڈ بج رہا ہے اور اخلاقی و روحانی قدروں کی دھجیاں بکھر رہی ہیں تو انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں اور ان کے کارندوں کے پاس اس معاملہ میں کوئی ہدایت نہیں۔

یہ ہے اس وقت کا نقشہ، لیکن اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں اپنی نئی نسلوں کو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے سنوارنے کی ضرورت ہے تو ملک کے ارباب قیادت کو اس معاملہ میں اپنا رویّہ بدلنا ہوگا اور جو باتیں تمام اہل مذاہب کے نزدیک متفقہ طور پر غلط اور قابل انسداد و اصلاح ہیں، انکے انسداد اور انکی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا، ورنہ جیسا کہ مذکرہ کمیٹی کے ارکان بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں محض کسی تعلیمی اسکیم کے ذریعہ نئی نسل کو اخلاق و روحانیت سے آراستہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی نکتہ کو ہم مسلمان، اس وسیع مسئلہ سے ہٹ کر، اس وقت کے اپنے ایک خاص مسئلہ میں بھی

استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں میں جو تعلیم ہماری زیر تعلیم نسل کو اس وقت مل رہی ہے جو ہمارے مذہبی نقطۂ نظر سے بہت غلط اثرات اس نسل پر ڈالنے والی ہے۔ با مستقبل میں یہ تعلیم آئین کی سکولر روح کے مطابق ان غلط اثرات سے پاک بھی کر دی جائے تب بھی بہرحال وہ اس نسل کو اپنے مذہب سے واقفیت اور وابستگی کا سامان نہیں بہم پہنچا سکے گی۔ پس اس نسل کے مذہبی تحفظ اور اسکی مذہبی پختگی کی کیا صورت ہے؟ —— اس مسئلہ کا صحیح حل بھی دراصل یہی ہے کہ ہم اس مقصد کے لئے کسی تعلیمی اسکیم کے ساتھ ساتھ اپنے گھر اور ماحول کی فضا کو مذہبی بنانے کی سعی بھی ملحوظ رکھیں —— یہی وہ شکل ہے جس کے ذریعہ ہم اس مسئلہ پر پوری طرح قابو پا سکتے ہیں، ورنہ گھر اور ماحول کی فضا کے مسئلہ سے غافل رہ کر کوئی پائیدار کامیابی پیش نظر مسئلہ کے حل میں حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ضرورت ہے کہ جہاں ایک طرف ہم کوئی دینی تعلیمی اسکیم لے کر چلیں وہاں ہم پوری توجہ گھروں کے اندر اور باہر دین کے احیا پر بھی دیں۔ اور جو کوششیں اس ضمن میں ملک کے اندر ہو رہی ہیں اُن میں کسی نہ کسی کے ساتھ تعاون کا عملی فیصلہ کریں۔

انگریزوں کے دم قدم کی نحوست سے خالص غیر دینی انگریزی تعلیم کی وقعت اور دینی تعلیم کی حقارت کی جو رَو ہم مسلمانوں میں چلی تھی اور آج تک چلی آ رہی ہے اُس نے دینی تعلیم کے علمبردار مولوی "ملّاؤں" اور اُن کے روایتی طرزِ تعلیم و تربیت کی ناقدری اور بے وقعتی کو بھی انتہا کو پہنچا دیا تھا۔ لیکن جس طرح سونے کے کسی پرت کو کوئی بھیڑ کی بھیڑ مل کر پیتل کہنے لگے تو اس سے اسکی ذاتی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا اور ایک نہ ایک دن اس جم غفیر کی ابلہ فریبی کا پردہ چاک ہو کر رہتا ہے۔ اسی طرح متذکرہ کمیٹی کی سفارشات کا یہ ٹکڑا شاید آج ہم میں سے بہت سوں کی آنکھیں کھول دے کہ

"شمالی ہندوستان کے مسلم مولویوں جیسے اساتذہ سے صحیح اخلاق سیکھنے کے روایتی طریقوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔"

۱۹۳۶ء میں صوبوں میں جب کانگریس منسٹری بنی تھی تو کانگریس کے باپو مہاتما گاندھی

کانگریسی وزراء کو نصیحت کے لئے آئیڈیل حکمرانوں کی حیثیت سے جن حکمرانوں کا بلا شرکت غیرے نام لینے پر مجبور ہوئے تھے وہ ابوبکر و عمر تھے ــــــــ رضی اللہ عنہما ــــــــ ٹھیک اسی طرح حکومت ہند کی قائم کردہ یہ اخلاقی اور روحانی تعلیم سے متعلق کمیٹی جس کے چار میں سے تین ممبران خالص غیر مسلم ہیں، صحیح اخلاق اور اعلیٰ انسانی اوصاف سکھانے والے اساتذہ کے طبقہ کی حیثیت سے "مسلم مولویوں" کے علاوہ کسی طبقہ کا اور اُن کے روایتی طریقہ کے علاوہ کسی اور طریقہ کا نام اپنی سفارش میں نہیں لا سکی۔

کوئی مانے یا نہ مانے، یہ برکت ہے مشکوٰۃ نبوت محمدی (علیٰ صاحبہا الف تحیۃ وسلام) سے اخذ فیض اور نور محمدی کے اتباع کی! ــــــ ابوبکر و عمر نے بھی اپنا چراغ وہیں سے جلایا تھا ــــ جن کو تنہا منارۂ نور کی حیثیت سے پیش کرنے پر گاندھی جی بھی مجبور ہوئے۔ اور ہند کے مسلم مولویوں نے بھی اسی چراغ کی نورانی کرنوں سے اپنا وہ "روایتی طریق" بنایا تھا جس کی طرف آج ہند کے معتمد دانشوروں کی انگلیاں بے اختیار اُٹھ گئی ہیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

معارف الحدیث

(مسلسل)

وضو اور اس کی برکات :-

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ جن سلیم الفطرت انسانوں کی روحانیت بہیمیت سے مغلوب نہیں ہوئی ہے وہ حدث کی حالت میں ـــــ یعنی جب پیشاب پاخانے جیسے کسی سبب سے اُن کا وضو ٹوٹ جاتا ہے ـــــ تو اپنے باطن میں وہ ایک گونہ ظلمت وکدورت اور ایک طرح کی گندگی محسوس کرتے ہیں۔ (اور اصل حدث دراصل یہی کیفیت ہے) اور شریعت اسلامی نے اسی کے ازالہ کے لئے وضو مقرر فرمایا ہے ـــــ جن بندوں نے بہیمیت کے سفلی تقاضوں سے مغلوب ہو کر اپنے لطیف روحانی احساسات کو فنا نہیں کر دیا ہے وہ حدث کی حالت میں اس باطنی گندگی اور ظلمت وکدورت کو بھی محسوس کرتے ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ وضو سے یہ کیفیت زائل ہو کر ایک روحانی پاکیزگی و نورانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وضو کا اصل مقصد و موضوع تو یہی ہے اور اسی وجہ سے اس کو نماز یعنی بارگاہ الٰہی کی خاص حضوری کی لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُس میں اپنے فضل سے اسکے علاوہ بھی بہت سی برکات رکھی ہیں ـــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح امت کو وضو کا طریقہ اور اسکے متعلق احکام بتلائے ہیں اسی طرح آپ نے اُسکے فضائل و برکات بھی بیان فرمائے ہیں۔ پہلے چند حدیثیں اسی سلسلہ کی پڑھ لی جائیں۔

(۳۱) عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِهٖ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے وضو کیا اور (بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق) خوب اچھی طرح وضو کیا تو اس کے سارے جسم سے اسکے گناہ نکل جائیں گے یہاں تک کہ اسکے ناخنوں کے نیچے سے بھی ——

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے مطابق باطنی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے آداب وغیرہ کی رعایت کے ساتھ اچھی طرح وضو کرے گا تو اس سے صرف اعضائے وضو کی میل کچیل اور حدث والی باطنی ناپاکی ہی دور نہ ہو گی بلکہ اسکی برکت سے اس کے سارے جسم کے گناہوں کی ناپاکی بھی نکل جائے گی اور وہ شخص حدث سے پاک ہونے کے علاوہ گناہوں سے بھی پاک صاف ہو جائے گا —— آگے آنے والی بعض حدیثوں سے اسکی مزید تفصیل معلوم ہو گی ——

(۱۵) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ أَوِ الْمُؤْمِنُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَ مِنْ وَجْهِهِ كُلُّ خَطِيْئَةٍ نَظَرَ إِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيْئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَ كُلُّ خَطِيْئَةٍ مَشَتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوْبِ —— (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلم بندہ وضو کرتا ہے اور اس میں اپنے چہرہ کو دھوتا ہے اور اس پر پانی ڈالتا ہے تو پانی کے ساتھ اسکے چہرہ سے وہ سارے گناہ نکل جاتے ہیں (اور گویا دھل جاتے ہیں) جو آنکھ سے ہوئے تھے، اسکے بعد جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ اسکے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں اور دھل جاتے ہیں جو اسکے ہاتھوں سے ہوئے، اسکے بعد جب وہ اپنے پاؤں دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ اسکے پاؤں سے خارج ہو جاتے ہیں جو اسکے پاؤں سے ہوئے اور جن کے لئے

اُسکے پاؤں استعمال ہوئے یہاں تک کہ وضو سے فارغ ہونے کے ساتھ وہ گناہوں سے
بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے ـــــــ (صحیح مسلم)

(تشریح) یہاں چند باتیں وضاحت طلب ہیں۔

(۱) مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں وضو کے پانی کے ساتھ گناہوں کے جسم سے نکل جانے اور دُھل جانے کا ذکر ہے، حالانکہ گناہ میل کچیل اور ظاہری نجاست جیسی کوئی چیز نہیں ہے جو پانی کے ساتھ نکل جائے اور دُھل جائے ـــــ بعض شارحین نے اسکی توجیہ میں کہا ہے کہ گناہوں کے نکل جانے کا مطلب صرف معافی اور بخشش ہے ـــــ اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا ہے کہ بندہ جو گناہ جس عضو سے کرتا ہے اُس کا ظلمانی اثر اور اسکی نحوست پہلے اُس عضو میں اور پھر اُس شخص کے دل میں قائم ہو جاتی ہے پھر جب اللہ کے حکم سے اور اپنے کو پاک کرنے کے لئے وہ بندہ سنن و آداب کے مطابق وضو کرتا ہے تو جس جس عضو سے اُس نے گناہ کئے ہوتے ہیں اور گناہوں کے جو گندے اثرات اور جو ظلمتیں اُسکے اعضا اور اُسکے قلب میں قائم ہو چکی ہوتی ہیں، وضو کے پانی کے ساتھ وہ سب دُھل جاتی اور زائل ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکی معافی اور مغفرت بھی ہو جاتی ہے ـــــ یہی دوسری توجیہ اس عاجز کے نزدیک حدیث کے الفاظ سے زیادہ قریب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم ـــــ

(۲) حضرت ابوہریرہ والی اس حدیث میں چہرہ کے دھونے کے ساتھ صرف آنکھوں کے گناہوں کے دُھل جانے اور نکل جانے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ چہرہ میں آنکھوں کے علاوہ ناک اور زبان و دہن بھی ہیں اور بعضے گناہوں کا تعلق انہی سے ہوتا ہے ـــــ اسکا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اعضاء وضو کا استیعاب نہیں فرمایا ہے، بطور تمثیل کے آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کا ذکر فرما دیا ہے ـــــ اس مضمون کی ایک دوسری حدیث میں (جس کو امام مالکؒ اور امام نسائیؒ نے عبداللہ الصنابحی سے روایت کیا ہے) اس سے زیادہ تفصیل ہے۔ اس میں کلی اور ناک کے پانی (مضمضہ و استنشاق) کے ساتھ زبان و دہن اور ناک کے گناہوں کے نکل جانے اور دُھل جانے کا اور اسی طرح کانوں کے مسح کے ساتھ کانوں کے گناہ نکل جانے کا بھی ذکر ہے۔

(۳) نیک اعمال کی یہ تاثیر کہ وہ گناہوں کو مٹاتے اور اُنکے داغ دھبوں کو دھو ڈالتے ہیں، قرآن مجید میں بھی مذکور ہے ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ الحسنٰتِ یُذہِبنَ السَّیِّاٰت" (ھود ع ۱۰)، یعنی

نیک اعمال گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اور احادیث میں خاص خاص اعمال حسنہ کا نام لے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ فلاں نیک عمل گناہوں کو مٹا دیتا ہے، فلاں نیک عمل گناہوں کو معاف کرا دیتا ہے، فلاں نیک عمل گناہوں کا کفارہ بن جاتا، اس قسم کی بعض حدیثیں اس سلسلہ میں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آئندہ بھی مختلف ابواب میں آئینگی۔ ان میں سے بعض حدیثوں میں حضور نے یہ تصریح بھی فرمائی ہے کہ ان نیک اعمال کی برکت سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، اسی بنا پر اہل حق اہل السنۃ اسکے قائل ہیں کہ اعمال حسنہ سے صرف صغائر ہی کی تطہیر ہوتی ہے، قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے۔

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (النساء ۵۶)

اگر تم کبائر منہیات (بڑے بڑے گناہوں) سے بچتے رہوگے تو تمھاری (معمولی) برائیاں اور غلطیاں ہم تم سے دفع کر دیں گے۔

الغرض مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں وضو کی برکت سے جن گناہوں کے نکل جانے اور دھل جانے کا ذکر ہے اُن سے مراد صغائر ہی ہیں، کبائر کا معاملہ بہت سنگین ہے، اگر شامت نفس سے کبھی کسی کبیرہ میں ابتلا ہو جائے تو اسکے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ بھی کرنی چاہیئے۔

(۱۶) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبْلِغُ أَوْ فَيُسْبِغُ الْوُضُوءَ ثُمَّ يَقُولُ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةِ يَدْخُلُهَا مِنْ أَيِّهَا شَاءَ ۔۔۔۔۔۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک سلسلہ کلام میں) فرمایا جو کوئی تم میں سے وضو کرے (اور پورے آداب کے ساتھ خوب اچھی طرح) اور مکمل وضو کرے، پھر وضو کے بعد کہے" اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ" تو لازمی طور پر اُس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے وہ جس دروازہ سے بھی چاہے گا جنت میں جا سکے گا۔

(تشریح) وضو کرنے سے بظاہر صرف اعضاء وضو کی صفائی ہوتی ہے اس لئے مومن بندہ وضو کرنے کے بعد محسوس کرتا ہے کہ میں نے حکم کی تعمیل میں اعضاء وضو تو دھولئے اور ظاہری طہارت اور

صفائی کرلی لیکن اصل گندگی تو ایمان کی کمزوری، اخلاص کی کمی اور اعمال کی خرابی کی گندگی ہے اسی احساس کے تحت وہ کلمۂ شہادت پڑھ کے ایمان کی تجدید اور اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پیروی کا گویا نئے سرے سے عہد کرتا ہے۔ اسکے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی کامل مغفرت کا فیصلہ ہوجاتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا اسکے لئے جنت کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔

امام مسلم ہی نے ایک دوسری روایت میں اسی موقع پر کلمہ شہادت کے الفاظ یہ بھی نقل کئے ہیں۔

"اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله ــــ

نیز اسی حدیث کی ترمذی کی روایت میں اس کلمۂ شہادت کے بعد "اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين" کا بھی اضافہ ہے۔

(۱۷) عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمَّتِيْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يُّطِيْلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ ــــــــــ (رواه البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے امتی قیامت کے دن بلائے جائیں گے تو وضو کے اثر سے اُن کے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن اور منور ہوں گے، پس تم میں سے جو کوئی اپنی وہ روشنی اور نورانیت بڑھا سکے اور مکمل کرسکے تو ایسا ضرور کرے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) وضو کا اثر اس دنیا میں تو اتنا ہی ہوتا ہے کہ چہرے اور ہاتھ پاؤں کی دھلائی صفائی ہوجاتی ہے اور اہل ذوق و معرفت کو ایک خاص قسم کی روحانی نشاط و انبساط کی کیفیت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں (اور اسکے علاوہ بھی متعدد حدیثوں میں) فرمایا ہے۔ قیامت میں وضو کا ایک مبارک اثر یہ بھی ظاہر ہوگا کہ وضو کرنے والے آپکے امتیوں کے چہرے اور ہاتھ پاؤں وہاں روشن اور تاباں ہوں گے اور یہ آپکی امت کا وہاں امتیازی نشان ہوگا۔ پھر جس کا وضو جتنا کامل و مکمل ہوگا اُسکی یہ نورانیت اور تابانی اتنی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوگی، اسی لئے حدیث کے آخر میں حضور نے فرمایا ہے کہ جس سے ہوسکے وہ اپنی اس نورانیت کو مکمل کرنے کی امکانی کوشش کرتا رہے جس کی صورت یہی ہے کہ وضو ہمیشہ فکر اور اہتمام کے ساتھ مکمل کیا کرے اور آداب کی پوری نگہداشت رکھے۔

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ:۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۱۰۷) محمد صادق کشمیری کے نام

(چند سوالوں کے جوابات)

...... تمہارا پہلا سوال یہ تھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اولیاء متقدمین سے کرامات و خوارق بہت ظاہر ہوتے تھے اور موجودہ زمانے کے بزرگوں سے کم ظاہر ہوتے ہیں؟ اگر اس سوال کا مقصد اس زمانے کے بزرگوں کی نفی ہے ـــــ ان کے خوارق کی کمی کی وجہ سے ـــــ جیسا کہ مضمونِ عبارت سے واضح ہے تو اللہ تعالیٰ شیطان کی (پُر فریب) آرزوؤں سے پناہ میں رکھے ـــــ (دیکھو) ظہورِ کرامات نہ تو ارکانِ ولایت سے ہے نہ شرائطِ ولایت سے ـــ بخلاف معجزۂ نبی کے کہ وہ شرائطِ مقامِ نبوت سے ہے ـــــ ویسے کرامات کا ظہور اولیاء اللہ سے بہت کچھ ہے...... لیکن کثرتِ ظہورِ کرامات، افضلیت کی دلیل نہیں ہے ـــــ افضلیت کے لئے درجاتِ قُربِ الٰہی کا اعتبار ہے ـــــ ہوسکتا ہے کہ ایک "ولیِ اقرب" سے ظہورِ خوارق کم ہو اور ایک "ولیِ ابعد" سے زیادہ ـــــ چنانچہ اس امت کے اولیاء سے جو کرامات ظاہر ہوئی ہیں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس کا سواں حصہ بھی ظاہر نہیں ہوا، حالانکہ اولیاء میں بڑے سے بڑا ولی کسی ادنیٰ صحابی کے مرتبے کو بھی نہیں پہونچ سکتا ـــــ فقط ظہورِ کرامات و خوارق پر نظر رکھنا کوتاہ نظری کی بات ہے،

اور" استعدادِ تقلیدی" میں کمی کی علامت ہے ـــــ فیوض نبوت و ولایت کو قبول کرنے کے لائق وہ لوگ ہیں جن کی قوت نظر پر " استعدادِ تقلیدی" کا غلبہ ہے ـــــ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قوتِ استعدادِ تقلیدی کی بنا پر ـــــ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے میں ـــــ دلیل کے محتاج نہیں ہوئے ـــــ اور ابوجہل لعین قصورِ استعدادِ تقلیدی کی وجہ سے ـــــ باوجود بہت سی آیاتِ بینہ اور معجزات باہرہ کے ـــــ تصدیقِ نبوت کی دولت سے مشرف نہ ہو سکا ـــــ حضرت حق سبحانہٗ ان بے دولتوں (استعدادِ تقلیدی سے محروموں) کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا حَتّٰى اِذَا جَاءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔

(اگر یہ کفار دیکھیں سارے معجزے تب بھی ایمان نہ لائیں ان پر، یہاں تک کہ جب آئیں وہ مکابرہ کرتے ہوئے اور آپ سے کہیں کہ نہیں ہے یہ مگر قصہ ہائے اولین)

علاوہ ازیں اکثر اولیاء متقدمین سے ظہورِ خوارق تمام عمر میں پانچ چھ مرتبہ سے زیادہ منقول نہیں ـــــ حضرت جنید بغدادیؒ ـــــ سید الطائفہ ہیں ـــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن سے دس کرامات بھی نقل ہوئی ہوں ـــــ حضرت حق جل مجدہٗ نے اپنے کلیم (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کے متعلق ان الفاظ میں خبر دی ہے ـــــ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيَاتٍ بَيِّنَاتٍ (ہم نے موسیٰ کو نو نمایاں معجزے عطا کئے)

...... سوال دوم یہ تھا کہ طالبانِ صادق کے کشف و شہود میں القاءِ شیطان کو دخل ہے یا نہیں؟ اگر دخل ہے تو پھر کشفِ شیطانی کی کیفیت کس طرح واضح ہوگی اور اگر کشف میں القاءِ شیطان کا دخل نہیں ہے تو پھر الہامات میں جو بعض غلطیاں ہوتی ہیں اس کا کیا سبب ہے؟ ـــــ اس کا جواب یہ ہے ـــــ (واللہ اعلم بالصواب) ـــــ کہ کوئی بھی القاءِ شیطانی سے محفوظ نہیں ہے۔ جب کہ انبیاء میں یہ متصور و متحقق ہے تو پھر اولیاء میں تو بدرجہ اولیٰ ہوگا ـــــ طالبِ صادق بیچارہ کس شمار میں ہے ـــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ

انبیاء علیہم السلام کو اس القاء پر تنبیہ کر دیتے ہیں اور باطل کو حق سے جدا کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ آیت اسی حقیقت پر دلالت کر رہی ہے۔

فَيَنسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس بات کو جو القاء شیطانی سے تعلق رکھتی ہے پھر اللہ محکم و مضبوط کر دیتا ہے اپنی آیات کو)۔

—— اولیاء کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُن کو القاء شیطانی پر تنبہ ہو ہی جائے —— ولی تو نبی کا تابعدار ہوتا ہے وہ جو بات نبی کے قول و فعل کے خلاف پائے گا اس کو خود رد کر دے گا اور اس بات کو باطل سمجھے گا —— ہاں ایسی صورت میں جس میں شریعت نبی ساکت ہو اور اس مسئلے میں اثبات و نفی کا کوئی حکم شریعت میں نہ ہو تو حق و باطل کا امتیاز مشکل ہوتا ہے اسلئے کہ الہام کا تعلق ظن سے ہے لیکن اس عدم امتیاز کی صورت میں بھی ولی کی ولایت میں کوئی نقص نہیں آتا کیونکہ اوامر کی شریعت اور اتباع نبی نجات دارین کی مستقل ضامن ہے —— …… یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ غلطی کشف فقط القاء شیطانی پر موقوف نہیں ہے بلکہ قوت متخیلہ میں اکثر احکام غیر صادقہ بھی ایک صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ شیطان کا وہاں کوئی دخل ہی نہیں ہوتا —— اسی قبیل سے ہے یہ کہ خواب میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں اور بعض ایسے احکام اخذ کر لیتے ہیں کہ درحقیقت اُن احکام کے خلاف کرنا ضروری ہوتا ہے —— یہاں القاء شیطانی تو متصور نہیں اسلئے کہ علماء کا مختار قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں شیطان کسی طرح متشکل نہیں ہو سکتا، پس اس صورت میں سوائے تصرفِ متخیلہ کے کہ غیر واقع کو واقع کر دکھا دیتی ہے اور کچھ نہیں ہوگا۔

سوال سوم یہ تھا کہ جب تصرفِ کرامات، اور تاثیراتِ استدراج دیکھنے میں یکساں ہیں تو مبتدی کیسے پہچانے کہ یہ شخص ولی صاحب کرامت ہے اور یہ شخص محض مدعی اور صاحبِ استدراج ہے؟ —— اس کا جواب یہ ہے —— واللہ اعلم بالصواب —— کہ طالبِ مبتدی کے پاس اس کا فرق کرنے کے لئے دلیل واضح موجود ہے اور وہ اس کا وجدانِ صحیح ہے —— اگر اپنے دل کو اسکی صحبت میں اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ پائے گا،

جان لے گا کہ وہ ولی صاحب کرامات ہے اور اگر اسکے برخلاف محسوس کرے گا، معلوم کریگا کہ وہ صاحب استدراج ہے ـــــ یہ حقیقت اگر پوشیدہ ہوتی ہے تو عوام الناس پر پوشیدہ ہوتی ہے نہ کہ طالبوں پر ـــــ اور عوام پر اس حقیقت کا پوشیدہ رہنا نز دِ خواص، معتبر نہیں ہے کیونکہ اس کا سبب مرض قلبی اور غشاوہ بصری ہے ـــ عوام سے تو بہت سی ایسی باتیں پردۂ خفا میں ہیں کہ انکا جاننا اس فرق کے جاننے سے کبھی زیادہ ضروری ہے .... یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ خوارق فقط احیاء و اماتت میں منحصر نہیں ہیں، علوم و معارفِ الٰہامیہ بھی بزرگ ترین نشانیوں اور بلند ترین کرامتوں میں سے ہیں۔ اسی بنا پر معجزۂ قرآنی باقی تمام معجزات سے اقوی وابقیٰ ہے ....

مکتوب (۱۰۸) میاں سید احمد بجواری کے نام ـــــ

(نبوت، ولایت سے افضل ہے)

.... بعض مشائخ نے حالت سُکر میں کہا ہے کہ" ولایت، نبوت سے افضل ہے" اور بعض نے اس ولایت سے ولایتِ نبی مراد لی ہے تاکہ نبی پر ولی کی افضلیت کا وہم رفع ہو جائے ـــ لیکن فی الحقیقت بات برعکس ہے (یعنی نبوت افضل ہے ولایت سے) اس لئے کہ نبوت نبی اسکی ولایت سے افضل ہوتی ہے ـــــ مقام ولایت میں، دلی تنگیٔ سینہ کی بنا پر، مخلوق کی طرف توجہ نہیں کر سکتا اور مقام نبوت میں کشادگیٔ سینہ کی وجہ سے نہ تو، توجہ حق، مانع توجہ خلق ہوتی ہے اور نہ توجہ خلق، مانع توجہ حق ـــــ نبوت میں یہ نہیں ہے کہ صرف مخلوق کی طرف رُخ ہو اور نہ اس بنا پر ولایت کو جو رد بحق رکھتی ہے ـــ اس پر ترجیح دی جائے ـــ پناہ بخدا ـــــ فقط " رد بخلق" ہونا مرتبۂ عوام ہے۔ شانِ نبوت اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے ـــ اس معنیٰ کو سمجھنا ارباب سُکر کے لئے دشوار ہے ـــ مستقیم الاحوال اکابر اس حرفت سے ممتاز ہیں ....

مکتوب (۱۱۲) شیخ عبدالجلیل[1] تھانیسری ثم جونپوری کے نام ـــ

(عقائد اہل سنت وجماعت، ضروری ہیں، احوال و مواجید ضروری نہیں)

حق سبحانہ ہم مفلسوں کو اہل حق کے (اہل سنت وجماعت کے) عقائد سے نواز کر،

---

[1] عبدالجلیل ابن شمس الدین ابن نور الدین الصدیقی ـــ آپ کا اونچے درجے کے علماء میں (باقی ۵۲ پر)

اعمال پسندیدہ کی توفیق مرحمت فرمائے اور وہ احوال جو اِن اعمال کے ثمرات ہیں عطا فرماکر کلیتہً اپنی جانب کشش مرحمت فرمائے۔ ع

کار این است وغیر ایں ہمہ ہیچ

جو احوال ومواجید اس فرقۂ ناجیہ (اہل سنت وجماعت) کے معتقدات کے بغیر میسر ہوں انکو ہم استدراج کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ ان میں خرابی ہی خرابی ہے ــــ البتہ اس فرقۂ ناجیہ کی اتباع کے ساتھ ساتھ جو عطا کریں اس کے لئے ہم شکر بجا لاتے ہیں ـــ اگر عقائد صحیحہ عنایت کردیئے جائیں اور کچھ بھی احوال ومواجید نہ دیئے جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں ہم اس پر راضی ہیں ــــ بعض مشائخ قدس اللہ اسرارہم سے جو غلبۂ حال اور سُکر کی وجہ سے اہل حق کی رائے کے خلاف، علوم ومعارف، ظاہر ہوئے ہیں، چونکہ وہ باتیں کشف پر مبنی ہیں اسلئے وہ معذور ہیں۔ امید ہے کہ بروز قیامت ان سے کچھ مواخذہ نہ ہوگا ــــ وہ حضرات، مجتہدِ مخطی کا حکم رکھتے ہیں کہ اسکی خطا بھی ایک اجر رکھتی ہے ــــ لیکن حق، بجانب علمائے اہلِ حق ہے ــ اللہ انکی سعی کو مشکور کرے ــ اسلئے کہ ان کے علوم، مشکواۃ نبوت سے ماخوذ ہیں جو وحیٔ قطعی سے تائید حاصل کئے ہوئے ہیں اور ان بعض حضرات صوفیا کی دلیل کشف والہام ہے (اور ظاہر ہے کہ) کشف والہام میں خطا کو دخل ہوسکتا ہے ــــ

(بقیہ حاشیہ صلا) میں شمار تھا اپنے والد سے علم حاصل کیا تھا اور علامہ محمود بن محمد جونپوریؒ صاحب شمس بازغہ سے اور شیخ محمد رشید بن مصطفےٰ العثمانی جونپوریؒ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ بعد فراغت درس وافادہ میں مشغول ہوگئے ــ طریقت میں شیخ عبدالجلیل لکھنویؒ اور شیخ عزیز الحق دہلویؒ سے بیعت تھے۔ تمام عمر قناعت کے ساتھ تدریس میں گذار دی ۸ رشوال ۱۱۰۰ھ میں جونپور میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے ــــ کمانی تجلی نور ـــ (ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد ۵) اگر مکتوب الیہ یہی بزرگ ہیں تو ان کو سرنامہ جونپوری سے پہلے تھانیسری لکھنے کی وجہ نہ معلوم ہوسکی ـــ ان کے والد مولانا شمس الدین بھی تھانیسر میں نہیں بلکہ موضع بردنہ مضافات جونپور میں پیدا ہوئے تھے سکونتی حیثیت سے بھی تھانیسر سے کوئی تعلق ان کا یا ان کے والد کا معلوم نہیں ہوا، واللہ اعلم بالصواب ـــ

کشف والہام کے صحیح ہونے کے لئے علمائے اہل سنت کے علوم کسوٹی ہیں (کشف والہام ان علوم کے مطابق ہیں تو صحیح ہیں) اگر سرمو مخالف ہیں تو دائرۂ صحت سے باہر ہیں ......

مکتوب (۱۴۱) صوفی قربان کے نام

(متابعت سنت کی ترغیب میں)

حق سبحانہ وتعالیٰ ہم مفلسان بے سروسامان کو سید اولین و آخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت اتباع سے مشرف کرے۔ اللہ تعالیٰ آنحضرت ہی کے طفیل میں اپنے کمالات اسمائی و صفاتی کو ظہور میں لایا ہے اور اس نے آنحضرتؐ کو بہترین جمیع کائنات بنا کر پیدا کیا ہے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام ــــــ اللہ تعالیٰ متابعت سنت رسولؐ پر استقامت نصیب فرمائے ــــ اس متابعت مرضیہ کا ایک ذرہ تمام "تلذذات دنیاوی" اور "تنعمات اخروی" سے کہیں زیادہ بہتر ہے ــــ فضیلت، متابعت سنت کے ساتھ متعلق ہے اور بزرگی، احکام شریعت محمدیؐ سے مربوط ہے ــــ مثلاً دوپہر کا سونا اگر اتباع سنت کی رو سے واقع ہو تو کروڑوں راتوں کی اُن شب بیداریوں سے افضل و اعلیٰ ہے جو متابعت کے ساتھ نہ ہوں ــــ اسی طرح عید الفطر کے دن روزہ نہ رکھنا، کہ شریعت مصطفویؐ نے اسی کا حکم فرمایا ہے، ابدالآباد تک مسلسل ایسے روزے رکھنے سے افضل ہے جو شریعت سے ماخوذ نہ ہوں ــــ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن نماز فجر جماعت کے ساتھ ادا کر کے مقتدیوں پر نظر ڈالی تو ایک شخص کو نہ پایا ــــ اسکے متعلق دریافت فرمایا ــــ حاضرین نے عرض کیا کہ وہ شخص تمام رات عبادت کرتا ہے شاید اس وقت آنکھ لگ گئی ہو ــــ امیر المومنینؓ نے فرمایا کہ اگر وہ تمام رات سوتا اور صبح کی نماز جماعت سے ادا کر لیتا تو (تمام رات جاگ کر نفلی عبادت سے) بہتر ہوتا ــــ

اہل باطل نے ریاضات و مجاہدات بہت کچھ کئے ہیں لیکن چونکہ وہ موافق سنت نہیں ہیں اس لیے بے وقعت ہیں ــــ اگر کوئی اجر اُن ریاضات شاقہ پر مرتب بھی ہوتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ دنیا کا کچھ نفع ہوتا ہے ــــ تمام دنیا ہی کون سی حیثیت رکھتی ہے کہ اُس کے تھوڑے سے منافع کا اعتبار کیا جائے ــــ ان لوگوں کی مثال خاکروب کی سی ہے کہ اسکی محنت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اجرت سب سے کم ــــ تابعین شریعت کی مثال ایسی ہے

جیساکہ الماس کے ذریعے جواہر نفیسہ میں کاریگری کرنے والے، کہ ان کا کام کم اور اجرت بہت زیادہ ہوتی ہے ــــ (موافق سنت) ایک ساعت کا عمل، ہوسکتا ہے کہ برابری ایک لاکھ برس کے نیک عمل کے برابر ہو ــــ وجہ یہ ہے کہ جو عمل بموافقت شریعت واقع ہوتا ہے وہ پسندیدۂ حق تعالیٰ ہوتا ہے اور خلاف شریعت عمل ناپسندیدۂ حق ہے ــــ پس غیر پسندیدگی کی صورت میں ثواب کی کیا امید ہوسکتی ہے بلکہ سزا کا ڈر ہوتا ہے ــــ اس حقیقت کی عالم مجاز میں بھی نظیر موجود ہے تھوڑی سی توجہ سے بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے ...... خلاصہ یہ ہو کہ تمام سعادتوں کا سرمایہ، متابعتِ سنت ہے اور تمام فسادات کا ہیولیٰ، مخالفتِ سنت و شریعت ہے ــــ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو متابعتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت قدم رکھے ــــ

مکتوب (۱۲۰) میر محمد[1] نعمان بدخشیؒ کے نام

(ترغیب صحبتِ ارباب جمعیت میں)

شاید کہ میر صاحب ہم کو بھول گئے کہ کبھی سلام و پیام سے بھی یاد نہیں کرتے ــــ ......

---

[1] آپ کے والد کا نام سید شمس الدین یحییٰ تھا بیر بزرگ کے نام سے مشہور تھے اور مشاہیر بدخشاں وماوراءالنہر میں شمار کئے جاتے تھے ــــ ان کا مولد و مدفن، کشم ہے جو کہ بدخشاں کے مضافات سے ہو ــــ آپ (میر محمد نعمانؒ) ۹۹۷ھ میں سمرقند کے اندر پیدا ہوئے ــــ حضرت امام اعظم نعمان بن ثابتؒ کے منامی ارشاد کے مطابق آپ کا نام ان کے نام پر نعمان رکھا گیا ــــ آپ میں بچپن ہی سے آثار درویشی نمایاں تھے ــــ آغاز شباب میں امیر عبید اللہ بلخی عشقیؒ کے پاس بلخ پہونچکر فیض حاصل کیا بعدہٗ ہندوستان تشریف لائے اور بعض درویشوں سے اذکار کی تعلیم حاصل کی حتیٰ کہ حضرت خواجہ محمد باقیؒ کی خدمت میں دہلی آئے اور طریقۂ نقشبندیہ میں منسلک ہوگئے۔ حضرت خواجہؒ نے جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کو بیعت و ارشاد کی اجازت دی اور اپنی حیات ہی میں اپنے تمام اصحاب کو آپکے سپرد کر دیا تو میر محمد نعمانؒ سے بھی فرمایا کہ ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھنا۔ حضرت خواجہؒ کے وصال بعد حضرت مجددؒ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرکے سرہند لے گئے ــــ مدتوں سرہند میں مقیم رہ کر دولتِ خلافت سے سرفراز ہوئے ــــ آپ کو برہان پور بھیجا گیا ــــ عرصے تک برہان پور رہے پھر آگرہ آگئے وہیں ۱۰ / صفر المظفر ۱۰۵۸ھ کو وفات پائی ــــ ماخوذ از زبدۃ المقامات و تذکرۃ العابدین۔

مہلت عمر کم ہے — اس کو اہم ترین کام میں صرف کرنا چاہیئے — اور وہ صحبت ارباب جمعیت ہے — صحبت نیک سے بہتر کوئی چیز نہیں — دیکھو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحبت ہی کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ سب سے افضل ہیں — چاہے وہ اویس قرنیؒ یا عمر ابن عبد العزیزؒ ہی کیوں نہ ہوں — حالاں کہ یہ دونوں بزرگ نہایت درجات و غایت کمالات کو پہونچے ہوئے تھے مگر صحبت نبویؐ سے تو مشرف نہ تھے — بے شک صحبت نبویؐ کی برکت سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطاء اجتہادی اویس قرنیؒ اور عمر ابن عبد العزیزؒ کے صواب سے بہتر ہے اور حضرت عمرو ابن العاصؓ کا سہو ان دونوں کے صحو سے اچھا ہے اس لئے کہ صحابہؓ کا ایمان بہ برکت صحبت اقدس، شہودی ہو گیا تھا — دیدار رسول، حضور فرشتہ، شہود وحی اور معائنۂ معجزات کی بنا پر — صحابہؓ کے علاوہ یہ کمالات جو کہ تمام کمالات کی اصل ہیں — اوروں کو حاصل نہیں — اگر اویس قرنیؒ فضیلت صحبت نبویؐ کو اس حیثیت کے ساتھ جان جاتے تو صحبت نبویؐ سے اُن کے لئے کوئی امر مانع نہ ہوتا اور اس فضیلت پر وہ کسی چیز کو ترجیح نہ دیتے — "اللہ اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے چھانٹ لیتا ہے"۔

؎ سکندر را نمی بخشند آبے — بزور و زر میسر نیست ایں کار

اے اللہ اگرچہ تو نے ہم کو صحابہؓ کے زمانے میں پیدا نہیں کیا مگر ہم کو قیامت میں اُن کے ہی زمرے میں محشور کرنا — بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۱۲۳) مولانا طاہر بدخشیؒ کے نام

[اس بیان میں کہ جو نفلی عبادت کسی فرض کو فوت کرنے وہ لایعنی میں داخل ہے اگرچہ وہ نفلی حج ہی کیوں نہ ہو۔]

اے برادر! حدیث میں آیا ہے کہ بندے سے اللہ کی روگردانی کی علامت بندے کا لایعنی میں مشغول ہونا ہے — کسی نفل میں اس طرح مشغول ہونا کہ اس سے کسی فرض

لے شروع میں آپ فوج میں ملازم تھے — ایک مبارک خواب سے متاثر ہو کر (باقی حاشیہ صہ ۲۱ پر)

سے روگردانی ہوتی ہو لایعنی میں داخل ہے ــــ لہٰذا انسان پر اپنے حالات کی تفتیش لازم ہے تاکہ معلوم ہو کہ اُس کا اشتغال کس چیز میں ہے۔ نفل میں یا فرض میں ــــ ایک نفلی حج کے لئے کئی ممنوعات کا مرتکب ہونا کیا درست ہوگا؟ اچھی طرح غور کریں ــــ صاحب عقل کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔

والسّلام علیکم وعلیٰ رفقائکم ــــ

مکتوب (۱۲۷) ملا صفر احمد رومی کے نام ــــ

[اس بیان میں کہ خدمت والدین ہر چند حسنات میں سے ہے لیکن وصول مطلوب حقیقی کے مقابلے میں کچھ نہیں]

مکتوب مرغوب پہونچا ــــ تم نے یہاں آنے کے بارے میں توقف کا عذر (خدمت والدین) پیش کیا ہے ــــ وہ صحیح ہے اور اس سلسلے میں جو بھی زیادہ سے زیادہ ہو سکے کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو ان کی زیادہ خدمت کرنے کے بعد بھی کوتاہ عمل سمجھنا چاہیئے ــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ــــ "ہم نے حکم دیا انسان کو اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنے کا اُسکی ماں نے اُس کو بدشواری اپنے شکم میں اٹھایا ہے اور بدشواری اُس کو جنا ہے" ــــ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) فوج کی ملازمت ترک کر کے وادیٔ درویشی میں قدم رکھا اور مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں ہوئے ایک شیخ دشت کی خدمت میں پہونچے تو انھوں نے فرمایا کہ تم نقشبندی معلوم ہوتے ہو اور دہلی و لاہور کی طرف اشارہ کیا چنانچہ آپ ہندوستان کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا نام شہرہ تھا اس لیے دہلی کا قصد کیا لیکن قسمت کی بات کہ آپ کے دہلی پہونچنے کے چند دن پہلے حضرت خواجہؒ وصال فرما چکے تھے ــــ ہادی توفیق نے آپ کو حضرت خواجہؒ کے جانشین حقیقی حضرت مجدد کی خدمت میں پہونچا دیا چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور کافی عرصہ خانقاہ سرہند میں قیام کر کے فیوض و برکات حاصل کئے۔ حضرتؒ نے آپ کو تعلیم طریقت کی اجازت دینے کے بعد جونپور روانہ کیا ــــ جونپور ہی میں ۱۰۴۷ھ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

(زبدۃ المقامات و نزہۃ الخواطر جلد ۵)

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ——— "میری شکر گذاری کر اور اپنے والدین کی بھی شکر گذاری کر" ——— لیکن اس تمام اہمیت کے باوجود اس بات کا بھی یقین ہونا چاہیئے کہ یہ سب کچھ مطلب حقیقی تک پہونچنے کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے ....

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جاں کندن است

اللہ تعالیٰ کا حق، تمام خلائق کے حقوق پر مقدم ہے ——— خلائق کی خدمت بھی اللہ ہی کے حکم کی بجا آوری ہے۔ ورنہ کس کی مجال تھی کہ اللہ کی اطاعت کے سوا دوسرے کی خدمت میں مشغول ہوتا ——— پس مخلوق کی خدمات بحکم خداوندی کی بنا پر منجملہ خدمات حق ہیں ——— لیکن خدمت خدمت میں فرق ہوتا ہے ——— (ایک معنی کر) کھیتی کرنے والے اور ہل چلانیوالے بھی خدمت بادشاہ ہی کرتے ہیں ——— لیکن "خدمت مقربان" کا اور ہی مقام ہے ——— اس موقع پر زراعت و کاشتکاری کا نام لینا بھی سخت برا ہے ——— ہر کام کی اجرت اس کام کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے ——— کاشتکار تمام دن ہل چلانے کے بعد تھوڑی سی اجرت حاصل کرتا ہے اور مقرب شاہی ایک ساعت میں لاکھوں روپیوں کا مستحق ہوجاتا ہے ——— اور اسکے باوجود ان لاکھوں سے اس کو تعلق خاطر نہیں ہوتا وہ بدستور ربا بند شاہ ہی رہتا ہے اور بس ——— .... والسلام

مکتوب (۱۲۸) خواجہ محمد مقیم کے نام ———

[بلند ہمتی کی ترغیب]

خواجہ محمد مقیم "دورافتادگان" کو فراموش نہ کریں اور اُن کو اپنے سے دور نہ جانیں۔ المرءُ مع من احبّ ——— (آدمی جس سے محبت کرتا ہے اُسی کے ساتھ ہوتا ہے ——— مقصود تحریر یہ ہے کہ ——— راہ سلوک، انتہائی طویل راہ ہے نیز مقصود، انتہائی بلندی پر ہے اور ہمتیں انتہا درجے کی کوتاہ ہیں ——— ...... (اس راہ میں) درمیانی منزلیں جو آتی ہیں وہ مانند "سراب مطلب نما" ہیں ——— بناءً بریں ——— انسان درمیان کو انتہا سمجھ کر غیر مقصد کو مقصد سمجھ بیٹھتا ہے اور "چوں" کو "بیچوں" تصور کرتا ہے (بالآخر) مطلب حقیقی تک پہونچنے سے باز رہتا ہے ——— ہمت کو بلند رکھنا چاہیئے، کسی "حاصل" پر قناعت

نہ کرے (قرب خدا کو) وراء الوراء میں ڈھونڈھنا چاہئیے ۔۔ اس قسم کی ہمت کا حاصل ہونا شیخ مقتدا کی توجہ سے وابستہ ہے اور اسکی توجہ مرید مقتدی کی محبت اور اخلاص کے بقدر ہوتی ہے ـــــ ـــ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ـــ

مکتوب (۱۳۲) ـــ مولانا محمد صدیق بدخشی[1] کے نام ـــ

[صحبت ارباب دولت سے اجتناب اور صحبت فقرا کی ترغیب میں]

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

اے برادر! بظاہر تم صحبت فقراء سے دلتنگ ہوگئے ہو کہ مجلس اغنیاء کو اختیار کر لیا ہے۔ تم نے یہ بہت برا کیا ہے ـــــ اگر آج تمھاری آنکھ بند ہے تو کل کو روز قیامت آنکھ کھل جائے گی اور سوائے ندامت کے کچھ فائدہ نہ ہوگا ـــــ خبر کرنا شرط ہے ـــــ

اے بوالہوس (انسان) تیرا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ مجلس اغنیاء میں جمعیت دل دیں یا نہ دیں ـــ اگر جمعیت دل دیں تو برا ہے اور اگر نہ دیں تو یہ اس سے برا ہے جمعیت دل دیدیں تو یہ استدراج ہے ـــ پناہ بخدا ـــ (اور اگر نہ دیں تو خسر الدنیا والآخرہ

---

[1] آپ کشم (علاقہ بدخشاں) کے رہنے والے تھے۔ ایام جوانی میں ہندوستان تشریف لائے چونکہ شعر و شاعری میں دستگاہ رکھتے تھے اس لئے عبدالرحیم خانخاناں کی صحبت اختیار کی اسی زمانے میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے بیعت ہو کر سلسلۂ نقشبندیہ میں شامل ہو گئے ـــ جوش جوانی کے ساتھ شعر گوئی کے مشغلے نے آپ کو حضرت خواجہؒ کی زندگی میں ترقی روحانی حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ حضرت خواجہؒ کے وصال کے بعد آپ حضرت مجددؒ کی خدمت میں آئے اور کامیاب ہوئے۔ آپ حضرت مجددؒ کے خلفاء میں سے ہیں ـــ آپ نے ہی مبداء و معاد کو حضرت مجددؒ کی بیاض خاص سے نقل کر کے جمع کیا ہے۔ آپکے نام حضرت مجددؒ کے مکتوبات کثیر تعداد میں ہیں ـــ ۱۰۵۰ھ میں دہلی کے اندر وفات پائی اور مقبرہ خواجہ باقی باللہؒ میں دفن ہوئے۔ (ماخوذ از زبدۃ المقامات و نزہۃ الخواطر جلد ۵)

کا مصداق ہے ــــــ (سنو) فقراء کے دروازے کی خاک ردی، اغنیاء کے یہاں کی صدر نشینی سے بہتر ہے ــــــ یہ بات آج تمہاری عقل میں آئے یا نہ آئے ــ آخر کار سمجھ میں آجائے گی اور اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا ــــــ تم کو عمدہ کھانوں کی آرزو اور لباس فاخر کی تمنا نے اس بلا میں لا ڈالا ہے ــــــ ابھی کچھ نہیں گیا ہے ــــ اصلی کام کی فکر کرو اور جو چیز حق تعالیٰ (کے قرب) سے روکے اس کو دشمن سمجھ کر اس سے بھاگو اور پرہیز کرو ــــــ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ــــــ [(راہ خدا سے روکنے والی) تمہاری بیویاں اور تمہاری اولاد تمہارے دشمن ہیں ان سے پرہیز کرو] یہ نص قاطع ہے ــــــ مجھے حقوق صحبت نے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ ایک مرتبہ تم کو نصیحت کی جائے اب تم اس پر عمل کرو یا نہ کرو (تمہیں اختیار ہے) ــــــ

تمہاری زیادہ طلبی کو دیکھ کر میں پہلے ہی سے سمجھتا تھا کہ اس طرح فقیری پر استقامت دشوار ہے ــــــ وقد کان ما خِفتُ ان یکونا ٭ اِنّا الی اللہ راجعونا (یعنی متحقق ہوگیا وہ جس سے میں ڈرتا تھا ــــــ بے شک ہم سب اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ــ میں تمہاری فطرت و استعداد سے اچھی توقع رکھتا تھا مگر تم نے جوہر نفیس کو گندگی میں ڈال دیا ــ ــــــ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ــــــ

مکتوب (۱۴۴) مولانا محمد صدیق بدخشی کے نام ــــــ

(کار نیک میں تاخیر نہ ہونا چاہیئے)

حضرت حق تعالیٰ مدارج قرب بے اندازہ عنایت فرمائے ــ بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ــــــ محبت آثارا! الوقتُ سیفٌ قاطعٌ (وقت کاٹنے والی تلوار ہے) [مقولہ صوفیا ہے] معلوم نہیں کل تک مہلت دیں یا نہ دیں امر اہم کو آج کر لینا چاہیئے اور غیر اہم کو کل پر ٹالنا چاہیئے ــــــ عقل کا حکم یہی ہے ــــــ عقل معاش کا نہیں بلکہ عقل معاد کا حکم ــــــ اس سے زیادہ کیا لکھا جائے ــــــ

. . . .

مکتوب (۱۳۶) مولانا محمد صدیق بدخشی کے نام

(تحصیل مطلوب حقیقی میں تاخیر نہ کی جائے)

مکتوب مرغوب پہونچا ـــــ چونکہ قاصد (رمضان کے) عشرۂ متبرکہ کے آخر میں پہونچا تھا لہٰذا رمضان کے گذرجانے کے بعد جواب لکھا (عبدالرحیم) خانخاناں اور خواجہ عبداللہ کے خطوط کے جوابات بھی لکھ کر بھیجے گئے ہیں ـــــ تم اُن کو بھی پڑھ لوگے ـــــ اس مرتبہ تمہارا لشکر میں جانا فقیر کی سمجھ میں نہیں آتا ـــ نہ معلوم کیا حکمت و راز ہے ـ والامر عنداللہ سبحانہ ـــــ حضرت حق سبحانہ نے کمال کرم سے تم کو روزی عطا فرمائی ہے اُسی کو غنیمت جان کر اپنے اصلی کام کی فکر د ....

مکتوب (۱۳۷) حاجی خضر افغان[1] کے نام

(نماز کی عظمت شان کے بیان میں)

مکتوب مرغوب پہونچا ـــ مضمون واضح ہوا ـ عبادت میں لذت یابی اور اسکی ادائیگی میں کلفت کا نہ ہونا اللہ کے بڑے انعامات میں سے ہے ـــ خصوصاً ادائے صلوٰۃ میں مذکورہ بالاابات غیر منتہی کو میسر نہیں ہے ـــــ علی الخصوص ادائے صلوٰۃ فرض میں ـــــ اس لئے کہ ابتداء میں (غیر منتہی کو بھی کسی قدر) صلوٰۃ نافلہ کی ادائیگی سے لذت یاب کر دیا جاتا ہے، لیکن "نہایت النہایت" میں یہ نسبت فرائض سے متعلق ہوجاتی ہے ...... منتہی کے نزدیک ادائے فرض بڑی اہم چیز ہوتی ہے ـ

ع ـــ این کار دولت است کنوں تا کرا رسد

---

[1] آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مخصوص خلفاء میں سے ہیں ـــــ کثیر التعداد اشخاص آپکے فیوض سے متمتع ہوئے ـــــ اکثر راتوں کو گریہ وزاری کرنا آپ کا شغل تھا ـــ مسکین طبع اور منکسر المزاج تھے ـــ تلاوت واذکار اور نوافل میں ان کے اوقات مشغول رہتے تھے قصبۂ بہلول پور میں جو کہ مضافات سرہند سے ہے سکونت رکھتے تھے ـــــ آپ نے سنہ ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی ـ

(زبدۃ المقامات، وخزینۃ الاصفیاء)

یہ بھی جاننا چاہیے کہ وہ لذت جو عین ادائے صلوٰۃ میں حاصل ہوتی ہے نفس کا اس میں کچھ حصہ نہیں ہے۔ اس لذت یابی کے عالم میں، نفس' نالہ و فغاں کے اندر مشغول ہوتا ہو ——— سبحان اللہ (نماز کا بھی) کیا مرتبہ ہے ———

ع ——— هنيئاً لِاَرْبابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهَا (ارباب نعمت کو انکی نعمتیں مبارک ہوں) ہم جیسے بوالہوسوں کو تو اس قسم کی باتیں بیان کرنا ہی باغنیمت ہے۔

ع ——— بارے بہ ہیچ خاطرِ خود شادمی کنم

یہ بھی واضح ہو کہ دنیا میں نماز کا وہ درجہ ہے جو آخرت میں دیدار باری تعالیٰ کا ہے ——— دنیا میں نہایت قرب' نماز کے اندر ہے اور آخرت میں نہایت قرب' اللہ کے دیدار کے وقت ہوگا ——— اور یہ بھی جان لو کہ تمام عبادات' نماز کے لیے وسیلہ ہیں اور نماز' مقاصد میں سے ہے ——— ———

والسلام والاکرام

خطبۂ صدارت

ضلع دینی تعلیمی کانفرنس سیتاپور (یوپی)

منعقدہ ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء

(از، عتیق الرحمٰن سنبھلی)

خطبہ مسنونہ کے بعد۔ ــــــــ

حضرات!

حسن ظن اچھی چیز ہے. مگر بے قید نہیں! ـــ آپ نے اپنی اس کانفرنس کی صدارت کے لئے جس پر نہ صرف آپ کے ضلع کی دینی تعلیمی تحریک کی رہنمائی کا انحصار ہے، بلکہ جس کے اسٹیج پر حسن اتفاق سے میسر کتنے ہی اکابر اور اہل علم و دانش رونق افروز ہیں، مجھ فرومایہ کا انتخاب کر کے اپنے حُسنِ ظن کو بڑی آزمائش میں ڈالا ہے. خدا آپ کے حُسنِ ظن کی لاج رکھے، اور میری نااہلی آپ کو اپنے اس انتخاب پر شرمندگی کا موقع نہ دے۔

می تواند کہ دہد اشک مرا حُسنِ قبول
آنکہ دُر ساختہ است قطرۂ بارانی را

حضرات!

ہمارے اس اجتماع کا موضوع ہمارے بچّوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ اور اسکی کیا اہمیت ہے۔ اور پھر اس اہمیت کے کیا تقاضے ہیں؟ یہ ہیں وہ نقاط جو اس مسئلہ پر غور و فکر کے سلسلہ میں روشنی میں آنے چاہئیں۔

مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے، یعنی انگریزوں کے دورِ حکومت اور ہمارے عہدِ ذلّت میں، اگرچہ سرکاری مدارس کے نصاب میں کسی مذہب کی تعلیم کا کوئی

خانہ نہیں تھا، مگر ان مدارس میں ایسی چیزیں بھی نہیں پڑھائی جاتی تھیں جن سے بچہ کے ذہن کی سادہ لوح پر اپنے آبائی مذہب سے مختلف مذہبی عقائد نقش ہوجائیں۔ اور ان کی فطرت کسی دوسرے مذہبی رنگ میں رنگ جائے۔ ملک جب آزاد ہوا اور بدیسیوں کی غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے پھینک کر ہم اپنے ملک میں خود اپنی حکومت کی منزل پر آئے۔ تو اس نئے دور کا آغاز ملک کے ارباب حل وعقد نے سکولرزم کے فیصلے سے کیا۔ جس سے ملکی زندگی کے ان تمام شعبوں کی طرح جو حکومت کے دخل و تصرف سے تعلق رکھتے تھے، تعلیمی شعبے کے بارے میں بھی یہ بات گویا قطعاً طے ہوگئی کہ یہ شعبہ کسی بھی مذہب کی مخصوص چھاپ سے آزاد رہے گا، اور حکومت اس شعبہ کے نظام میں کسی مذہبی نظام فکر کے ساتھ جانبدارانہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرے گی ـــــــ دوسرے الفاظ میں ملک کے سرکاری نظام تعلیم کی وہی روش برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا جس پر اسے انگریزوں نے ڈالا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ نظام تعلیم کے اس منفی پہلو کے بارے میں سابقہ بدیسی حکومت سے ہم آہنگی کے باوجود ایک قومی حکومت اپنے نظام تعلیم کے مثبت پہلوؤں میں ایک بدیسی اور سامراجی حکومت کے قدم بقدم نہیں چل سکتی تھی۔ انگریزوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستانیوں کے بچے اپنے آباؤ و اجداد، اپنے قومی ابطال، اپنی تاریخ و روایات، اپنے مذہبی رجال اور اپنی تہذیبی خصوصیات سے واقف ہوں۔ چنانچہ اُن کے دَور کے سرکاری مدارس کی درسیات اس نوع کے اسباق سے قریب قریب خالی رہتی تھیں۔ لیکن ایک قومی حکومت اس رویہ کو اپنانے کی بات ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ بلکہ وہ مجرم ہوتی، اگر ایسا سوچتی اور نصاب تعلیم کا یہ نہج برقرار رکھنے کا فیصلہ کرتی۔

کل کی بدیسی حکومت اور آج کی قومی حکومت کے نقطۂ نظر کا یہی وہ بنیادی فرق تھا جس کی رو سے ضروری ہوا کہ ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری مدارس کی درسیات میں مذکورہ بالا نوع کے اسباق کو بھی سمویا جائے۔ اور ایک بنیادی کوتاہی جو ہمارے نصاب تعلیم میں انگریزی حکومت کے دور میں چلی آرہی تھی اسکی تلافی کی جائے۔

حضرات!

یہ فیصلہ اور اسکے تحت وہ عملی رویہ جو ہمارے دستور حکومت کے سکولر مزاج کے مطابق ہوتا ہمارے لئے یا کسی دوسرے ہندوستانی باشندے کے لئے ذرا بھی قابل اعتراض اور باعث احتجاج نہ تھا۔ ہمارے نزدیک یہ بات نہایت معقول اور ایک قومی حکومت کے فرائض میں شامل تھی کہ ملک کا محکمہ تعلیم اپنے جاری کردہ نصاب و درسیات میں مملکت کے بچوں کو ملک کی مذہبی اور ثقافتی تاریخ و روایات، اسکے تہذیبی اطوار و خصوصیات اور اسکے ماضی کی تمام اہم اور قابل ذکر شخصیات سے روشناس کرانے کی ضرورت کو ملحوظ رکھتا۔ ہم خوشی سے اس بات کے لئے تیار تھے کہ ہمارے بچے (یعنی مسلمان بچے) خاص دینی مذہبی اور ثقافتی تاریخ و روایات اپنی تہذیبی خصوصیات اور اپنے اکابر و اسلاف کے پہلو بہ پہلو اپنے ملک کے تمام دوسرے مذہبی اور ثقافتی سرمایے، اس کے دوسرے تمام مذہبی اور تہذیبی گروہوں کی خصوصیات اور تمام دوسرے فرقوں کے اکابر و اسلاف سے بھی واقف ہوں۔

ہمارے نزدیک یہ ہماری مشترک ملکی زندگی کی بڑی ضرورت تھی۔ باہمی ناواقفیت کے حجابات نے ہم (اہل ہند) کو بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ ہم ہرگز نہیں اس بات کے خواہش مند ہو سکتے تھے کہ ناآشنائی اور ناواقفی کے یہ پردے سدا پڑے رہیں اور ہندوستان کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے والے مختلف فرقے صحیح معلومات کے بجائے محض مزعومات و مظنونات کی بنیادوں پر باہم معاملات اور ایک دوسرے کے متعلق تصورات کے خاکے متعین کریں۔

یہ تھا ہمارا موقف قومی عہد کے اس فیصلہ کے بارے میں جو سابق نظام تعلیم کے ایک زبردست خلا کو پُر کرنے کے لئے کیا گیا، اور اس فیصلہ کے بموجب کسی بھی اس عملی رویّہ کے بارے میں جو دستور کے سکولر مزاج کے مطابق اختیار کیا جاتا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ملک کے نئے عہد کے اس تقاضے کو عملی جامہ پہنانے کی جو شکل ملک کی مختلف ریاستوں کے ارباب اقتدار نے اختیار کی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ اسکے مقابلہ میں ہم یہ موقف برقرار رکھ سکیں۔

حضرات! یہاں اس کا موقع نہیں کہ میں دوسری ریاستوں کی ابتدائی درسیات کا بھی جائزہ لوں۔ میں اس وقت آپکے سامنے صرف اپنی ریاست (یوپی) کے سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں پڑھائی جانے والی ابتدائی درجات کی کتابوں کا ایک جائزہ پیش کروں گا۔ اور اجازت چاہوں گا کہ اس معاملہ میں ذرا تفصیل سے کام لوں۔

پرائمری درجات میں پانچ بیک ریڈریں ہیں۔ میں ان پانچوں ہی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ان سب میں مشترک طور پر محض ورق گردانی ہی سے جو پہلی بات سامنے آتی ہو وہ یہ ہو کہ سبقوں کی مناسبت سے جو پچاسوں انسانی تصویریں اور تصویری خاکے (اسکیچ) ان میں دیئے گئے ہیں ان میں مشکل سے ایک دو کا استثناء ہوسکتا ہے باقی سب پر اکثریتی فرقہ کے تہذیبی خط و خال اسکی معاشرت کے انداز اور اسکے تصورات کی مخصوص چھاپ لگی ہوئی ہو۔

اس ظاہری منظر کے بعد اسباق اور اُن کے مضامین کا جائزہ لیجئے تو اوّلاً تو پانچوں کی پانچوں کتابیں مسلمانوں کی تہذیب ان کی عادات و روایات، اُن کے علمی، دینی، ادبی اور تمدنی آثار اور قابل فخر ہندوستانی اسلاف کی نمائندگی سے یکسر عاری ہیں، اور اسکے برعکس ہندو تہذیب، اُن کی عادات و روایات، ان کے آثار اور ان کے اسلاف و ابطال کو اس قدر دل کھول کر نمائندگی دے گئی ہے کہ غلط نہ ہوگا، اگر اس پر "ضرورت سے زائد" کا اطلاق کیا جائے ـــــ ثانیاً ان کا نہ صرف سادہ اور تاریخی بیان کیا گیا ہے بلکہ ایک تو ہندو مایتھالوجی کا اتنا بھاری عنصر اس میں شامل ہے جو ـــ اگر ہوسکتا ہے تو ـــ صرف ہندو بچوں کے لئے ہی مناسب ہوسکتا ہے، دوسرے، پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ خالص ہندو معتقدات و تصورات اور رسوم و روایات کو، ہر پڑھنے والا بچہ تمام ہی اہل ہند کے معتقدات اور سب ہی کی مشترک رسوم و روایات سمجھے۔ اور پھر اسکے نتیجہ میں قدرتی طور پر خود بھی ان اعتقادات اور ان رسوم و روایات کا پرستار بنجائے۔ اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ اسباق کے ذریعہ اس تلقین میں جو کمی رہ سکتی تھی وہ بعض تصاویر سے پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ اجمالی اشارات تھے، آئیے اب میں آپ کو ان کی تفصیل میں لے چلتا ہوں۔

یہ بیک ریڈر ملا ہے۔ اس میں تین سبقوں کے ذریعہ آپ کا بچہ شری رام چندر جی، سیتا جی، بھرت اور شری کرشن جی سے واقف ہوتا ہے۔ اپنے کسی بزرگ کے نام تک سے اسکے کان اور اسکی زبان آشنا نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں شری کرشن جی کی واقفیت اُسے ان کی زندگی کے کسی سادہ واقعہ یا اخلاقی قصہ سے نہیں بلکہ ایک ایسے قصہ سے کرائی جاتی ہے جس میں وہ ایک مافوق البشر ہستی نظر آتے ہیں۔

یہ ریڈر ملا ہے، اس میں بھی مسلمان بچہ اپنے کسی بزرگ کا نام نہیں سنتا۔ البتہ سبق ۱۶ "سیتا کا سوئمبر" میں وہ رام چندر جی اور سیتا جی وغیرہ کا تذکرہ ایک بار پھر پڑھتا ہے، اور سبق ۲۰ میں ویرارجن سے ابتدائی واقفیت حاصل کرتا ہے، اسی کتاب میں ایک سبق تاریخی آثار مقامات سے متعلق بھی ہے۔ اس کا عنوان ہے "ہماری دو مشہور جگہیں" اور نمبر ہے ۲۵۔ اس سبق میں اجودھیا اور متھرا اور یہاں کے منادر کا شوق انگیز تذکرہ ہے۔

یہ لیجئے اب تیسری کتاب اٹھا کر دیکھئے۔ اسکے اٹھائیس ۲۸ سبقوں میں سے پورے بارہ ۱۲ سبق ہندو اوتاروں، ہیروؤں، راجاؤں اور رہنماؤں، ہندو تاریخ کی حکایتوں اور ان کے مقدس آثار و مقامات کی نذر ہوئے ہیں۔ اسکے برعکس مسلم تاریخ کا کوئی ورق ان کی کسی تہذیبی روایت۔ ان کے کسی بزرگ اور کسی مذہبی یا تمدنی نقش کو اس کتاب میں بار نہیں ملا ہے لیکن کتاب کا جو انتہائی خطرناک پہلو ہے وہ ابھی آپکے سامنے نہیں آیا ہے۔ اس کا اندازہ ان اسباق کی کچھ تفصیل سے کیجئے۔

سبق ۲ ہے۔ "سعادت مند لڑکا گنیش" اس سبق کا مقصد نہایت معصوم اور مقدس ہے۔ یعنی والدین کی عزت کا جذبہ پیدا کرنا۔ مگر یہ کام دیوتاؤں کی ایک کہانی کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ کہانی (جو مصوّر ہے) یوں بیان کی گئی ہے کہ

"پرانے زمانے میں دیوتاؤں کی ایک مجلس میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اچھے

کاموں میں کس دیوتا کی سب سے پہلے پرستش ہونی چاہیئے۔ سب دیوتا اپنی اپنی پرستش پہلے چاہتے تھے۔ اسلئے آپس میں کوئی فیصلہ نہو سکا۔ برہما سب سے بڑے دیوتا تھے۔ اسلئے سب دیوتا ان کی بات مانتے تھے۔ برہما نے دیوتاؤں کی بات سن کر کہا "جو دیوتا زمین کا چکر سب سے پہلے لگا آئے گا اسی کی پرستش سب سے پہلے ہوا کریگی"۔ پھر کیا تھا سب دیوتا اپنی اپنی سواریاں لے کر تیزی سے دوڑے۔ اندر اپنے ایراوت ہاتھی پر، سورج اپنے رتھ پر، اور کمار مور پر"۔

آگے بتایا گیا ہے کہ چوتھے دیوتا گنیش جی تھے انکی سواری میں چوہا تھا، انھوں نے سوچا کہ اس سواری سے یہ کام کیسے ہو سکے گا لہذا یہ ترکیب کی کہ چوہے پر بیٹھ کر اپنے ماں باپ کے سات چکر لگا لئے۔ اور برہما جی نے انھیں کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ ماں باپ دنیا میں سب سے بڑی چیز ہیں۔

آپ اندازہ کیجئے کہ اس کہانی سے ایک اخلاقی سبق کے ساتھ ساتھ کتنے دیوتا بھی آپکے بچے کے دل میں بیٹھ سکتے ہیں۔ اور الوہیت کے کیسے تصور کو اسکے دماغ میں بس جانے کا موقع مل جاتا ہے۔

پانچواں سبق ہے "پرہلاد" یہ بھی ایک کہانی ہے کہ پرہلاد ایک راجہ کا لڑکا تھا۔ وہ فطرتاً عبادت گزار تھا مگر اسکا باپ اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا اُسنے سمجھا کر اور ڈرا کر طریقے سے پرہلاد کو اس گردش سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اور پرہلاد جب کسی طرح باز نہ آیا تو آخر کار مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ کئی ترکیبیں کیں مگر پرہلاد خدا کی مدد سے ہر بار صاف بچ گیا۔ آخری تدبیر ایک کھمبے سے باندھ کر تلوار سے قتل کر دینے کی کی۔ اس موقع پر باپ بیٹے میں کچھ سوال جواب ہوئے۔ ایک جواب پر غصہ سے باپ نے کھمبے پر گھونسا مارا۔ اس پر کھمبے میں سے ایک خوفناک آواز پیدا ہوئی آواز کے ساتھ ہی کھمبا پھاڑ کر نرسنگھ جی ظاہر ہو گئے (جو ایک ایسے دیوتا ہیں جن کا آدھا دھڑ شیر کا اور آدھا آدمی کا ہے) اور انھوں نے اپنے پنجوں سے راجہ کا پیٹ پھاڑ کر مار ڈالا ـــــ اس واقعہ کی تصویر بھی اپنے موقع پر دی گئی ہے۔

اس سبق کا مقصد بھی بیشک خدا پرستی میں بھروسہ پیدا کرنا ہے۔ مگر کس طرح؟ کہ بچے

کے دل میں نرسنگھ جی نام کے ایک دیوتا کی خدائی بھی بیٹھ جائے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ کسی مصیبت کے وقت وہ انکی دُہائی بھی دے۔

سبق ۲۶ ہے "ہمارے دو مشہور شہر"۔ یعنی کاشی اور پریاگ (مزید تشریح کے لئے سمجھ لیجئے بنارس اور الہ آباد) اس سبق میں بلا تفریق مذہب وملت بتایا گیا ہے کہ

"ہندوستان کی جنتا انھیں اپنا متبرک مقام سمجھتی ہے۔" (ص۵۶)

حضرات!

مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ اس رام کہانی سے اُکتا نہ چلے ہوں لیکن میرا احساس یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت کے سرسرے اور اجمالی تذکرہ سے اسکی پوری اہمیت سامنے نہیں آسکتی۔ اسلئے کہانی کو اختتام تک پہنچانے میں میرا ساتھ دیں۔ اور اب اختتام کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ اب ہم چوتھی کتاب پر آچکے ہیں۔

میں نے جو کچھ اجمالی اشارات پانچوں بیک ریڈروں کے بارے میں شروع کئے تھے انکی روشنی میں اگر تفصیلات ڈھونڈی جائیں تو اس کتاب میں بھی کافی باتیں قابل ذکر نکل آئیں گی، مگر میں اب ان تفصیلات کو زیادہ طول نہیں دوں گا اور چوتھی کتاب کے صرف دو سبقوں کا تذکرہ کروں گا۔

اس کتاب کا پانچواں سبق ہے "بھارت کے تین سنت"۔ اس ہندوستان میں اگر سینکڑوں سادھو، سنیاسی اور رشی پیدا ہوئے ہیں تو مسلمان صوفیوں اور درویشوں کی بھی یہاں کمی نہیں رہی ہے۔ مگر "تین سنتوں" کے اس زمرہ میں کوئی ایک بھی مسلمان شامل نہیں ہے۔ گویا خدا رسیدہ اور لائق عقیدت بزرگوں کی حیثیت سے اگر آپ کا بچہ واقف ہو تو غیر مسلم حضرات ہی سے ہو مسلمان بزرگوں کی اُسے ہوا بھی نہ لگے۔

اس کتاب کا چودھواں سبق ہے "رام اور سگریو کی دوستی" یہ نظم کے پیرایہ میں ہے اسکے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ جو ہنومان جی اور رام چندر جی سے متعلق ہیں۔

تب سری ہنومان جی بھگو ان کو پہچان کے
عفو کے طالب ہوئے قدموں پہ فوراً گر پڑے

اس میں بھگوان کا لفظ رام چندر جی کے متعلق بولا گیا ہے ـــــ اب اگلا شعر سنیئے:۔
ہنومان جی کی زبانی کہلوایا جا رہا ہے۔

۵ـ بولے بابا نے بھلا دادیہ یا نادان کو
جو فقط انساں سمجھ بیٹھا تھا میں بھگوان کو

یہ ہے وہ سبق ـــــ رام چندر جی کو بھگوان سمجھنے کا سبق ـــــ جو آپکے بچوں کو اِن کتابوں سے مل رہا ہے۔ اور اس پر مزید ـــــ سبق کے ختم پر یہ ہدایت بھی درج ہے کہ
"بچو! تم میں سے ایک طالب علم سگریو۔ ایک ہنومان ایک رام اور ایک لکشمن بنے۔ اور پھر تم لوگ اس نظم کا ناٹک کر و۔"

اب لیجئے یہ پانچویں کتاب ہے۔ اس کا پہلا سبق ہے "بچے کی دعا" یہ اقبال کی مشہور دُعا ہے۔ "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" الخ ـــــ اس میں تو ظاہر ہے کیا کوئی ایسی بات ہوسکتی تھی۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے:۔

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

یہاں یہ اندیشہ حقیقت بن گیا ہے۔ بائیں ہاتھ کے صفحہ پر یہ دعا ہے تو داہنے ہاتھ والے صفحہ پر اسکے ساتھ ہی ایک پکتری دی گئی ہے جس میں سورج نکل رہا ہے اور ایک بچہ اسکے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے صورت دعا بنا کھڑا ہے ـــــ گویا یہ ہے دعا کا عملی طریقہ ـ اقبال کی اس التجا کا مصرف!

دوسرا سبق ہے "گنگا"۔ اس کا پہلا پیرا یہ ہے:۔
"گنگا بھارت ماتا کا گہنا ہے۔ بھارت کی قدیم مقدس کتابوں اور ویدوں میں اسکی بڑائی اور بزرگی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، بھارت کے لوگ گنگا کو بہت مقدس مانتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ گنگا وشنو بھگوان کے پیروں سے نکل کر شیو جی کی جٹا میں اور پھر وہاں سے ہمالیہ پہاڑ پر آئی۔ برہلنے راجہ بھاگیرت

کی ریاضت سے خوش ہوکر ہر جاندار کی نجات کے لئے گنگا کو زمین پر بھیجا۔
یہ عقیدہ ہے کہ گنگا لوگوں کے گناہوں کو دھو دیتی ہے"

حضرات! یہ ہے آپ کے بچوں کی موجودہ اسکولی تعلیم کی تصویر! جو ہر صاحب فکر و شعور مسلمان کی آنکھوں میں بالکل قریبی مستقبل کا یہ نقشہ کھینچ دیتی ہے کہ ہمارے جو بچے محض سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں کی یہ تعلیم حاصل کرینگے وہ اپنے تہذیبی ورثہ اور ماضی کے ترکہ سے قطعاً نابلد رہیں گے۔ انھیں قطعاً پتہ نہیں ہوگا کہ انکی مذہبی اور تہذیبی روایات کیا ہیں؟ مسلمانوں کی معاشرت کیسی ہوتی ہے؟ انکا اپنا رنگ ڈھنگ کیا ہے؟ اور کیا تصورات ایک مسلمان کے اس کائنات اور اسکے خالق کے بارے میں ہونے چاہئیں؟ ــــ اسکے برعکس انکے اذہان ہندو دیومالا کے اوہام و عجائبات سے مانوس ہوں گے۔ دیوی دیوتاؤں کے نام انکی زبانوں پر چڑھے ہوں گے۔ غیر اسلامی تہذیب و معاشرت کے بہت سے اجزا غیر شعوری طور پر انکی زندگی کا جزو بنے ملیں گے۔ ہم انکی زبانوں سے "گنگاجی" کی قسمیں بھی سنیں گے۔ ہم انھیں "مورتیوں" سے دلچسپی لیتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔ مصیبت اور حاجت کے وقت کرشن جی اور نرسنگھ جی کو پکارتے ہوئے بھی پائیں گے۔ اور خدانخواستہ کہیں نہیں اس راہ کی یہ آخری منزل بھی ہمیں دیکھنی پڑے گی کہ ع

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

بزرگو اور دوستو! یہ ہے پیش نظر مسئلہ کی نوعیت ہے! ــــــــ اسکے بعد، مجھے اپنے تمہیدی کلمات کی رو سے' بتانا تھا کہ یہ مسئلہ ہمارے لئے کیا اور کس کس پہلو سے اہمیت رکھتا ہو۔ مگر کیا مسئلہ کی اس نوعیت کے سامنے آنے کے بعد بھی مجھے بتانا پڑے گا کہ ہمارے لئے اسکی اہمیت کے کیا پہلو اور اس کا کیا درجہ ہے؟ میرے خیال میں تو مجھے اب اس باب میں ایک حرف بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسئلہ اگر صرف اتنا ہی ہوتا کہ آپکے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں انکے دین کی تعلیم نہیں مل رہی ہے۔ تب بھی اسکے لائق اعتنا ہونے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لئے کہ یہ ہر مسلمان باپ اور سرپرست کا دینی فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کرے۔ لیکن یہاں تو مسئلہ صرف اتنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس منفی رُخ کے ساتھ ساتھ

مسئلہ کا یہ انتہائی خطرناک مثبت رُخ بھی موجود ہے کہ جو تعلیم آج صوبہ کے سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں بچوں کو دی جارہی ہے وہ اسلام سے ایک قطعاً مختلف مذہبی اور تہذیبی راستہ پر ڈالدینے والی ہے۔ ضروری نہیں کہ اسکے بعد بچہ اسلام سے صراحۃً منحرف ہوجائے۔ لیکن اگر یہ ضروری ہو کہ آم کے پودوں پر آم لگیں اور بیری کے درخت پر بیر پھلیں تو پھر یہ بھی یقینی ہے کہ یہ تعلیم کچھ ایسے تہذیبی اور معاشرتی خدوخال آپ کی نئی نسل کی زندگی پر اُبھارے جن کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرات! اسلام میں بڑی وسعت ہے۔ اسلام ایک عالمی اور دائمی مذہب ہے، اور اسکی اسی عالمگیری اور ابدیت کا تقاضہ ہے کہ اُسکے مزاج میں وسعت ہو۔ وہ کسی خاص جغرافیائی تہذیب و معاشرت میں خود کو بند نہیں کرتا۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہے اور ہر ملک اُس کا اپنا ملک ہے۔ وہ ہر ملک کی تہذیب و معاشرت اور قوموں کے عادات و خصائل کے صالح عناصر کو سند جواز عطا کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ لیکن پروردگار عالم کی توحید جو اس کا اصل اصول ہے، اسکے معاملہ میں اُس کا مزاج بڑا نازک اور بڑا احساس ہے۔ تہذیب و معاشرت کا کوئی ایسا سانچہ جو اس بنیادی عقیدے کو گزند پہنچاتا ہو اور جس کا فکری پس منظر اِس اصول سے ٹکراتا ہو، اسکو روا رکھنے کا اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی قائل نہیں۔ انسانوں کی مختلف فطری خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام جس قدر وسیع دائرہ اباحت کا روادار ہے، اپنے اس بنیادی اصول کی حفاظت میں وہ اسی قدر بے لوچ اور بے لاگ ہے وہ اپنے حلقہ بگوشوں پر حد درجہ باریک بینی سے ان تمام راستوں کو بند کرتا ہے جو انھیں کسی درجہ میں بھی شرک سے مانوس کرتے ہوں۔ اس لئے وہ کسی ایسی تہذیب و معاشرت کے آداب اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جن کا خمیر کسی مشرکانہ نظام فکر سے تیار ہوا ہو!

حضرات!

یہ ہے پیش نظر مسئلہ کی اہمیت جسے میں نے اظہار و بیان سے زیادہ آپکے فہم و ادراک پر چھوڑنا مناسب سمجھا ہے۔ اور مجھے آپکے ایمانی شعور و ادراک پر اعتماد ہے کہ مسئلہ کی اہمیت کا کوئی گوشہ آپ پر مخفی نہ رہ گیا ہوگا ــــ اسکے بعد آپ کو سوچنا ہے کہ مسئلہ کی یہ اہمیت

آپ سے کیا تقاضے کرتی ہے!

میرے خیال میں اس مرحلہ پر بھی کسی لمبی چوڑی تقریر کی حاجت نہیں ہے۔ مسئلہ کی اہمیت اگر آپنے سمجھ لی تو تقاضے آپ پر مخفی نہیں رہ سکتے۔ اس کا سب سے اعلیٰ تقاضہ تو یہ ہے جسے یقیناً آپ کا ایمانی جذبہ میری زبان پر آنے سے پہلے ہی آپکے سامنے لاچکا ہوگا کہ آپ ایسی تعلیم کو دور سے سلام کریں، اور اگر کرنا پڑے تو ـــــ ایسی خواندگی پر اپنے بچوں کی ناخواندگی کو ترجیح دیں! ـــــ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ایک جذباتی بات ہوگی۔ اور آج کی دنیا کے حقائق اور زندگی کی ضروریات کے دباؤ کے آگے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گی۔ اسکے ساتھ میں اس تلخ حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ آج ہم عمومی طور پر جس دینی اور ایمانی حال میں ہیں اس حال میں یہ جذباتی فیصلہ چند لمحوں کے لئے بھی قوم کا اجتماعی فیصلہ نہیں ہو سکتا، درانحالیکہ یہ ایک ایسی نوعیت کا فیصلہ ہے کہ اسکے بطن سے جو پھر بڑے بڑے مطالبات ابھرتے ہیں انکی تکمیل اور ان کے بار کا تحمل اگر کیا جا سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جبکہ اس کو ایک مضبوط پر جوش اور مکمل اجتماعی فیصلہ کا مقام حاصل ہو ـــــ ایسی صورت میں مناسب نہ ہوگا کہ میں آپکے سامنے اس اجتماع میں، جو ایک اجتماعی لائحہ عمل تلاش کرنے کے لئے منعقد ہوا ہے، اس طرح کے کسی فیصلہ کا مشورہ پیش کروں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں آپ یا تو سب سے اعلیٰ تقاضہ کو بروئے کار لانے کا تہیہ کریں اور یا پھر کچھ بھی نہ کریں۔ اسکے ماسوا بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور مسئلہ کے دینی اور ایمانی تقاضوں کو حالات اور امکانات کا لحاظ رکھ کر کچھ دوسرے فیصلوں سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے ـــــ

بستی کی صوبائی دینی کانفرنس نے آج سے ڈیڑھ ماہ پیشتر ان فیصلوں اور ممکنہ عملی راہوں کی طرف آپ کی بہت واضح رہنمائی کی ہے۔ اور آپکے ضلع ہی کے کچھ فرض شناس اور باہمت افراد برسوں سے اپنے عملی تجربات کے ذریعہ آپ کو راہِ عمل دکھلانے میں لگے ہوئے ہیں ـــــ آپ عزم و ارادہ کے ساتھ بڑھ کر ان کا ہاتھ بٹالیں اور تعاون کی ہر صورت کو بروئے کار لے آئیں تو آپ دیکھیں گے کہ کتنا بڑا مسئلہ کس آسانی سے قابو میں آگیا ہے۔ اور

کس طرح آپ نے اپنے بچوں کے دین و ایمان کو ایک عظیم آزمائش سے صاف نکال لیا ہو۔

حضرات! — میں اس موقع پر آپ کی اجازت سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔
بستی کی صوبائی کانفرنس جس کی بیش قیمت رہنمائی اور امید آفریں صدائے "برخیز" کے لئے ہم سب ممنون ہیں۔ اسکے ردِعمل کے طور پر ملک کے پریس میں کچھ ایسی چیزیں آئی ہیں جو یا تو اس دینی تعلیمی تحریک کی نوعیت اور اسکے پس منظر کو غلط نگاہ سے دیکھنے کا نتیجہ ہیں، اور یا ان کا مقصد اس تحریک کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا ہے۔ جہاں تک مشکلات پیدا کرنے کا سوال ہے، میں اس موقع پر صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس طریقہ سے ہمارا راستہ نہیں روکا جا سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ملک کا دستور ہمیں کیا حقوق دیتا ہے، اور کن سرگرمیوں کے لئے ہمیں آئین ہند میں کامل آزادی کی ضمانت حاصل ہے۔
اسی کے ساتھ ہم ملک کی جنگ آزادی کی تاریخ کے اُن اوراق کو بھی کسی کی کوششوں اور پردہ داریوں سے بھلا دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، جن پر مسلمان مجاہدوں نے اپنے خون کے قطروں اور بے پناہ مصائب انگیزیوں سے قیامت تک کے لئے اپنے نام ثبت کر دیے ہیں۔ اور اسکے ساتھ ہم اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ ان مسلمان مجاہدوں اور شہیدوں میں غالب اکثریت ہمارے علماء و مشائخ اور ان کے متوسلین کی تھی۔ جن کے لئے دین سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی اور چیز نہیں تھی! —
— کیا ہم مان سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنا خون پسینہ اسلئے بہایا تھا کہ آزادی کے محبوب سایہ میں انکی قوم کے بچوں کو ایسی تعلیم ملے جس کے بعد ان کا مسلمان رہنا مشکل ہو جائے اور وہ یہاں کی اکثریت کے مذہبی اور تہذیبی رنگ میں رنگ لئے جائیں؟
الغرض ہم جو کچھ کرنے اُٹھے ہیں وہ ہمارا آئینی اور تاریخی حق ہے جسے نہ کوئی جھٹلا سکتا ہے اور نہ اس پر اصرار کرنے سے ہمیں باز رکھا جا سکتا ہے!
لیکن اگر یہ ردِعمل ہماری اس تحریک کی نوعیت اور اسکے پس منظر کے بارے میں کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے تو آج یہ بات ریاست کے ہر باشندے کو معلوم ہو جانی چاہیئے کہ

ہماری اس تحریک کا تعلق محض مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کی فکر سے ہے۔ اور اس فکر میں جو تشویش اور بے چینی کا عنصر نظر آرہا ہے وہ نتیجہ ہے موجودہ سرکاری درسیات کی اُس نوعیت کا جس کو میں نے پوری وضاحت سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ اگر حکومت اپنی درسیات میں دستور کی سکولر اسپرٹ کو ملحوظ رکھتی تو اس فکر کا سادہ سا محرک صرف یہی ہوتا کہ سرکاری نظام تعلیم ہمارے بچوں کی دینی تعلیم کا کفیل نہیں ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا کسی فرقہ کا اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا نظام قائم کرنے کی جدوجہد کرنا کوئی قابل اعتراض بات ہے؟ غالباً اسکے جواب میں تو کوئی شخص بھی "ہاں" نہیں کہہ سکتا! ــــ اچھا تو پھر یہ بتایا جائے کہ سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں پڑھائی جانے والی موجودہ کتابوں کو کوئی شخص سچائی کے ساتھ دستور کی سکولر اسپرٹ کا حامل کہہ سکتا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان میں ایک خاص مذہب اور ایک خاص تہذیب کا رنگ چڑھا ہوا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بہت سی باتیں جو خاص ایک فرقہ کے مذہب اور اسکی تہذیب سے تعلق رکھتی ہیں، اُن کا بیان اِن کتابوں میں ایسے عام بلکہ تلقین آمیز پیرایہ میں کیا گیا ہے کہ ہر مذہب و ملت کے بچوں کے سادہ دل و دماغ میں اُن کا بس جانا ناگزیر ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اِن کتابوں میں عام اخلاقی باتیں سکھانے کے لئے خاص طور سے صرف ایک فرقہ کے مذہبی بزرگوں کی زندگی اور ایک فرقہ کی تاریخی اور غیر تاریخی روایات کو پیش کیا گیا ہے، کیا یہ یک طرفہ عقیدت پیدا کرنے کی کوشش نہیں ہے؟ ــــ اور کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ صرف مذہبی اخلاقی اور اصلاحی باتوں ہی میں نہیں سیاسی کارناموں میں بھی صرف ایک ہی فرقہ کو نمائندگی دی گئی ہے۔ اور دوسروں کو قطعاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ (اسکی سب سے بڑی مثال بیسک ریڈر ۵ کا اٹھارہواں سبق "آزادی کی پہلی لڑائی" ہے۔ جس میں ایک مسلمان ہیرو کا نام نہیں آتا حالانکہ اس لڑائی کی تو قیادت انھیں کے ہاتھ تھی!) ــــ اچھا اور ایک آخری سوال مجھے اور کرنے دیجئے کہ کیا ان کتابوں کے بعض اسباق سے، لکھنے والے کی فرقہ وارانہ جذباتیت صاف صاف نہیں ٹپک رہی ہے؟ اگر کسی کو نہیں معلوم ہے تو میں کہوں گا کہ

بیسک ریڈر نمبر ۵ کا پندرھواں سبق "مہارانا پرتاپ" پڑھ لیا جائے ــــ اور اسکے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھی جائے کہ ان ریڈروں کی تالیف کسی اور نے نہیں خود یو۔پی کے "ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات نے فرمائی ہے۔

کیا ان چیزوں پر تشویش اور ان کی اصلاح کے مطالبہ پر بھڑکنا کوئی معقول بات ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی ٹھنڈے دل سے سوچنے والا اس تشویش اور اس مطالبہ کی مخالفت کبھی نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے ابھی غور نہیں کیا ہے ورنہ ہر معقول پسند اور محب وطن کا ضمیر پکار اٹھے گا کہ یہ مطالبہ صد فی صد حق بجانب ہے۔ اور اسکی مخالفت وطن دوستی نہیں وطن دشمنی ہے۔ اس لئے کہ یہ مطالبہ ملک کے عین مفاد کے حق میں ہے۔ سرکاری درسیات کی یہ صورت درحقیقت حکومت کی ایک نہایت خطرناک بے تدبیری ہے جس کے مضر نتائج سے ہم ملک کو بچانا چاہتے ہیں۔ حکومت نے اپنی اس روش سے ایک فرقہ کے سوا ملک کے تمام دوسرے فرقوں کو شکایت کا موقع دیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اسکی صورت حال میں جب کوئی شکایت کیجاتی ہے تو معاملہ میں بڑی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ساری احتیاطوں کے باوجود اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ جس فرقہ کے ساتھ جانبداری کا رویہ اختیار کیا گیا ہے کہیں ہماری شکایت اس کی ناگواری طبع کا باعث نہ ہو جائے۔ ملک کے باشندوں کے باہمی تعلقات کو اس طرح آزمائش میں ڈالنا، آپ اندازہ کیجئے کہ کس درجہ کی بے تدبیری ہے۔ اور اس کی اصلاح کا مطالبہ کسقدر ضروری اور لابدی!

حضرات میں نے آپ کا کافی وقت لیا۔ میں اپنے ان ناچیز خیالات کے لیے آپکے سمع والتفات کا شکرگزار ہوں ــــ خدا اس اجتماع کو برکت دے اور سود مند بنا۔

نعم المولیٰ ونعم النصیر

اخلاقی توحید

(از مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

باسمہ سبحانہ

توحید وہ دولت بے بہا ہے جس کے خزینہ دار ہونے کا دعویٰ تقریباً دنیا کے ہر مذہب کو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جوہر تابندہ صرف اسلام کے خزانۂ عامرہ میں پایا جاتا ہے، دوسرے مذاہب کے یہاں صرف اس کا نام ہے حقیقت نہیں ہے۔

اسلامی توحید مسلم کی پوری زندگی پر حکمراں ہوتی ہے۔ اور کسی مقام پر بھی شرک کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتی۔ انسانی زندگی کے تین ہی بڑے شعبے ہیں۔ اعتقادات، اعمال اور اخلاق۔ توحید ان تینوں کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (البقرۃ)

ہم اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے بہتر رنگ عطا فرمانے والا کون ہے اور ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

چند سطروں میں اخلاقی توحید کا تعارف مقصود ہے جس کی طرف سے عام طور پر غفلت ہے۔ اور ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ زندگی کا یہ شعبہ بہت سے مسلمانوں نے شرک کے حوالہ کر دیا ہے۔ لیکن اظہار مدعا سے پہلے اخلاقی توحید کا مفہوم واضح کر دینا ضروری ہے۔

اخلاقی توحید کا مفہوم

ایک سعادت مند بیٹا اپنے باپ کی عزت و توقیر کرتا ہے اور اس کے ساتھ ادب کا برتاؤ کرتا ہے لیکن اگر یہ سعادت اس کی

عادت ہے تو بار بار اس کو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پیش آتی کہ یہ میرا باپ ہے اس لیے اس کا ادب لازم ہے، مگر ایک ناہنجار بیٹا اگر باپ کے ساتھ ادب کا برتاؤ کرنا چاہے تو اسے ہر مرحلہ پر استدلال کا سہارا لینا پڑے گا اور وہ بار بار یہ سوچ کر کہ یہ میرا باپ ہے اس کی ناگوار باتوں کے لیے اپنے قوت برداشت کو بیدار کرے گا۔ دونوں حالتوں کا فرق بالکل واضح ہے اور اخلاق و عادات کی حقیقت پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب کسی کام کا میلان ہمارے نفس کا ایک وصف لازم بن جاتا ہے تو اسی کو خُلق یا عادت کہتے ہیں۔ یہ "میلان" یا "رجحان" ہر ارادی فعل کے لیے لازم ہے، یہی قوت ارادی کو بیدار و مستعد کرتا ہے اور ارادے کو عمل پر ابھارتا ہے۔ یہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، پسندیدہ بھی اور ناپسندیدہ بھی۔ لیکن اس کی قوت و طاقت اور زندگی پر اس کے اثرات کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "خُلق" (یا اردو میں لفظ اخلاق) کی حقیقت سے کسی نہ کسی درجہ میں اکثر اشخاص واقف ہیں۔ عام محاورہ ہے کہ فلاں شخص خوش اخلاق ہے یعنی اس کی عادت یہ ہے کہ دوسروں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتا ہے اور انھیں راحت پہونچانے کی کوشش کرنا اس کی عادت میں داخل ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا طبعی میلان و رجحان یہی ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو تجزیۂ حقیقت کی کلید ہے۔

مذکورۂ بالا مثالوں میں آپ اس بیٹے کو جو باپ کا ادب کرتا ہے سعادت مند کیوں کہتے ہیں؟ وہ شخص جو دوسروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے "خوش اخلاق" کے لقب کا کیوں مستحق ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ ایک سعادت مند بیٹا باپ سے برتاؤ کے متعلق جن صحیح اصول و ضوابط کا یقین و اعتقاد رکھتا ہے اس کا میلان بھی انھیں کے مطابق اور انھیں سے ہم آہنگ ہے، بخلاف اس کے بے ادب بیٹا اس مطابقت سے محروم ہے۔ اسی طرح خوش اخلاق انسان کا میلان بھی اس کے مخصوص عقیدے کے مطابق ہے اور بد اخلاق اس سے خالی ہے، یہی وجہ ہے کہ بے ادب بیٹا اگر بتکلف باپ کا ادب کرنا چاہے تو اسے بار بار اس حقیقت کا استحضار کرنا پڑتا ہے کہ یہ میرا باپ ہے۔

اخلاقی توحید کا مفہوم اس بیان کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہیں۔ لیس کمثلہ شیئ ــــــــ ان کے مثل کوئی شے نہیں ہے۔ ذات و صفات دونوں اعتبار سے وہ یگانہ اور یکتا ہیں۔ ان کے جو حقوق ہیں وہ کسی کے بھی نہیں ہو سکتے اگر ہمارے نفسی میلانات یا بالفاظ دیگر اخلاق بھی اسی عقیدے کے مطابق ہیں تو یہیں اخلاقی توحید

حاصل ہو ورنہ نہیں، دوسرے عنوان سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر یقین نفس انسانی میں کوئی نہ کوئی میلان پیدا کرتا ہو، مثلاً اگر آپ کسی دوا کے متعلق یقین رکھتے ہیں کہ وہ فلاں مرض کے لیے بہت مفید ہو، اور آپ کو اس کی ضرورت بھی ہو تو یقیناً آپ کے دل میں اسے حاصل کرنے کا میلان و رجحان پیدا ہوگا۔ یہ ایک سیدھی سادھی روزمرہ کی مثال ہو، اسی سے سمجھ لیجئے کہ عقیدۂ توحید سے بھی نفس میں کچھ میلانات و رجحانات کا پیدا ہونا لازم ہو۔ یہی رجحانات و میلانات جب نفس کی ایک صفت لازم یا عام فہم الفاظ میں عادت بن جائیں تو انھیں کا نام توحیدی اخلاق رکھا جائے گا اور جس شخص کو یہ حاصل ہوں وہ اخلاقی توحید کے مرتبہ پر فائز سمجھا جائے گا۔ گویا "اخلاقی توحید" شجرۂ توحید کی شاخوں کا نام ہو۔ اگر یہ نہ ہوں تو یہ درخت ناقص کہا جائے گا۔

قلم نے ایک منزل طے کر لی اور عنوان مضمون کا مفہوم اب وضاحت طلب نہیں رہا۔ آئندہ سطریں بتائیں گی کہ عقیدۂ توحید ہم سے خاص طور پر کن اخلاق کا مطالبہ کرتا ہے اور ایک مُوحّد کے نفس کو کن اخلاق سے مزین ہونا چاہیے۔

توکّل علی اللہ

انسان وجدانی اور فطری طریقے سے اپنی کمزوری اور احتیاج کا شعور رکھتا ہے۔ کون ہے جسے اپنی بقا کے لیے غذا، لباس، مکان وغیرہ کی ضرورت و احتیاج محسوس ہوتی ہو؟ زندگی انھیں اشیا تک محدود نہیں ہو اور ان کے علاوہ بکثرت احتیاجات انسان کے ضعف کا اعلان کرتی رہتی ہیں۔ ایک طرف یہ کمزوری کہ بیک وقت سیکڑوں اسباب بقا کی حاجت، دوسری طرف بقا بلکہ خلود و بقائے دوام کی فطری خواہش۔ اگر انسان دوسرے پر بھروسہ نہ کرے تو کیا کرے؟ جو وجدان ضعف و کمزوری کا احساس کرتا ہو وہی اس میلان اعتماد کی اطلاع بھی دیتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کا ایک تقاضہ ہو جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن سوال یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی اور اس کے لوازم و حاجات کے متعلق کس پر اعتماد کرے؟ توحید کا تقاضا ہے کہ یہ اعتماد اللہ اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک پر ہونا چاہیے۔ قرآن مجید کا حکم ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ　　اہل ایمان کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ　　اس حیّ (زندہ) پر بھروسہ کیجئے جسے موت نہیں آسکتی۔

تیسری جگہ توکّل علی اللہ کو ایمان کے لوازم میں شمار فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ　　مومن تو درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہے) کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

شرک فی التوکّل سے صاف صاف منع فرمایا گیا ہے۔

أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا　　میرے سوا کسی دوسرے کو کارساز نہ بنانا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "توکّل" کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس لفظ کا شرعی مفہوم کیا ہے؟ سطور ذیل کا مقصد اسی چیز کی وضاحت ہے۔

آپ اپنے مقدمہ میں کسی شخص کو "وکیل" بناتے ہیں تو اپنے اس فعل کا کیا مطلب سمجھتے ہیں؟ یہی نا کہ آپنے اپنا مقدمہ اس کے سپرد کردیا ہے اس پر اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ اس کی پیروی حسن و خوبی کے ساتھ کرے گا اور آپ کو فتح دلائے گا، توکّل کے معنی بھی کسی کو وکیل بنا دینے کے ہیں۔ یعنی اپنے کسی کام کو کسی شخص کے سپرد کردینا اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ آپ کا کام آپ کے مقصد کے مطابق کردے گا۔ تفویض و توکّل میں یہی فرق ہے کہ توکّل میں آپ یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ کام آپ کی منشا و مرضی کے مطابق ہوگا اور تفویض میں آپ کام جس شخص کے سپرد کرتے ہیں اسے اختیار دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے کام کو انجام دے خواہ آپ کی مرضی کے مطابق ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ کام کرے یا نہ کرے۔ گویا آپ مرضی و خواہش سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور خود مقصد برآری پر اصرار بھی نہیں کرتے۔

توکّل کی یہ لغوی تشریح ہے لیکن اصل چیز جس کا سراغ لگانا ہے وہ اس کے شرعی معنی ہیں جن کے اعتبار سے ہمیں توحید فی التوکّل کا حکم دیا گیا ہے اور شرک فی التوکّل سے منع فرمایا گیا ہے۔ لغوی معنی کی

تشریح کے بعد یہ منزل کچھ دور نہیں رہ جاتی۔ بات صاف ہو کہ قرآن و حدیث کا مطالبہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنے ہر کام کو اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں اور اس اعتماد کے ساتھ سپرد کریں کہ قادرِ مطلق ہی اس کام کو ہماری مصلحت و مرضی کے مطابق تکمیل تک پہونچائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے پر اس قسم کا بھروسہ و اعتماد رکھنا شرک میں داخل ہو۔

یہاں تک تو مسئلہ بالکل صاف ہو۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہو جو بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بن گیا ہو۔ سوال یہ ہو کہ اگر غیر اللہ پر اعتماد و بھروسہ کرنا اور اس کے ساتھ اپنا کوئی کام اس کے سپرد کرنا شرک ہو تو دنیا میں شاید کوئی موحد نہ نکلے۔ ہم والدین پر اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ ہماری خیر خواہی کریں گے۔ اولاد پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری خدمت کرے گی۔ دوست احباب کے وعدوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس ہماری پوری زندگی کا نظام باہمی اعتماد و بھروسہ پر موقوف ہو۔ اگر یہ شرک ہو تو اس شرک سے احتراز نا ممکن ہو؟۔

جس طرح سوال سادہ ہو اسی طرح جواب بھی کسی فلسفیانہ فکر کا محتاج نہیں ہو۔ اگر ہم غور کریں تو ہمارے ذہن کے جس گوشہ میں یہ سوال موجود ہوتا ہو اسی گوشہ میں اس کا جواب بھی موجود ہوتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ والدین، اولاد، وکیل، حاکم وغیرہ پر بالکل اسی طرح کا اعتماد کرتے ہیں جس طرح کا اعتماد آپ حق تعالیٰ پر کرتے ہیں؟ دونوں کی نوعیت ایک ہوتی ہو یا دونوں میں کچھ فرق ہوتا ہو؟ اپنے وجدان سے پوچھیئے تو وہ پوری قوت کے ساتھ یکسانیت کی تردید کرے گا اور صاف صاف بتلائے گا کہ دونوں کی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ ایک طبیب کے پاس علاج کے لیے جاتے ہیں۔ اس کی حذاقت و مہارت کے آپ قائل ہیں۔ تشخیص میں بھی اسے لاثانی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے نزدیک شفا و صحت اسی کے اختیار میں ہو اور وہ بغیر کسی سبب کے آپ کے مرض کو زائل کر سکتا ہے؟ یا بغیر کسی ذریعہ کو اختیار کیے ہوئے آپ کے مرض کی تشخیص کر سکتا ہو؟ فرض کیجئے کہ وہ نبض دیکھ کر مرض اور اسبابِ مرض کی تہ تک پہونچ جاتا ہے لیکن اگر اس کی انگلیوں کی حس زائل ہو جائے تو بھی اس کی نباضی پر آپ کو اعتماد رہے گا؟ یا جو دوا اس نے تجویز کی ہو وہ آپ کو میسر نہ ہو سکے تو بھی آپ کو صحت و شفا کے متعلق اطمینان رہے گا؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ طبیب جو کچھ نفع پہونچاتا ہے وہ اسباب و ذرائع

کی معرفت پہونچاتا ہے۔ وہ بھی اسباب کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح ہم۔ اس میں نفع رسانی کی کوئی ایسی غیبی قوت نہیں ہے جو اسباب سے بالاتر ہو۔ اسی مثال کے متعلق میں ایک بات اور پوچھتا ہوں، فرض کیجیے کہ طبیب نے تشخیص بھی کر لی اور دوا بھی بہت مفید تجویز کر دی اور میسر بھی ہو گئی۔ گویا صحت و شفا کے سب اسباب جمع ہو گئے اور معالج پر اعتماد کے سب شرائط پورے ہو گئے۔ اب ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر ذرا اپنے دل سے پوچھیے کہ اسے مکمل اطمینان حاصل ہو گیا یا نہیں؟ آپ ایمان رکھتے ہیں اس لیے یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ ان سب اطمینان بخش باتوں کے باوجود آپ کو اپنی صحت کا اتنا یقین نہیں ہو سکتا جتنا آفتاب دیکھ کر دن ہونے کا۔ آپ کا ایمان ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور بغیر ان کی مشیت کے ایک ذرّہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ تشخیص کی صحت، دوا کی شفا بخشی، ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم و مشیت پر موقوف ہے۔ اگر انھوں نے میری شفا کا ارادہ نہ فرمایا تو طبیب کی ساری کوششیں رائگاں ہو جائیں گی۔

ابھی دل کی بسر ختم نہیں ہوئی، یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جب آپ اللہ پر توکل کرتے ہیں تو دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ آپ پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوئی تو کوئی طاقت و قوت شفا سے مانع نہیں ہو سکتی۔ اور یہ نعمت حاصل ہو کے رہے گی خواہ ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں۔ آپ خوب سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسباب کے محتاج نہیں ہیں، کام ہونے کے لیے محض ان کی مشیت کافی ہے، جو ہماری عقل و فہم سے بالاتر ہے۔

توکل مفروض اشکال حل ہو چکا اور جواب سے یہ حکم شرعی بھی واضح ہو گیا کہ توکل کا ایک درجہ ہر مسلمان پر فرض عین ہے یعنی ایمان کی سلامتی کے لیے عقیدے کے درجہ میں ہر مسلمان کو اتنا سمجھنا ضروری ہے کہ بغیر مشیت الٰہی سب اسباب بیکار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں یہ قدرت و طاقت نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ارادے سے بلا واسطہ اسباب کسی کو نفع یا نقصان پہونچا سکے۔ یہ قدرت نہ انبیاء میں ہے نہ اولیاء میں نہ فرشتوں میں اور نہ جنوں میں۔ نہ اور کسی مخلوق میں۔ اسی طرح اسباب خواہ روحانی ہوں یا مادی اپنی تاثیر میں مشیت الٰہی کے محتاج ہیں، بغیر مشیت الٰہی کے اسباب و اشخاص سب بیکار ہیں، کسی کا بھی کوئی اثر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

یہ تو اعتقاد ہوا، مگر توکل اعتقاد کا نام تو نہیں ہے وہ تو نفس کا ایک خاص میلان ہے جو

اس عقیدہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو اور اس کی عادت بن جاتا ہو اس اعتبار سے فرض توکل کا درجہ یہ ہوگا کہ نفس اسباب پر نظر کر کے اسقدر مطمئن نہ ہو کہ مخالف احتمال نظر سے بالکل اوجھل ہو جائے۔ مخالف اسباب سے کلیتہً مایوس بھی نہ ہو جائے اور مخالف اسباب سے کلیتہً مطمئن بھی نہ ہو۔ بیشک اسباب کو دیکھ کر انسان طبعی طور پر پُر امید یا نا امید ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے بچنا اس کے اختیار سے باہر ہو۔ لیکن اگر اس کا ایمان و عقیدہ قوی ہو تو وہ اس طبعی کیفیت پر اتنا اثر ضرور ڈالے گا کہ اس کی امید یا ناامیدی میں کم از کم ایک فی صدی کی کمی یقیناً ہو جائے گی۔

اس درجہ کا ادراک آسان نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات اچھے اچھے صاحبان بصیرت بھی اپنے نفس میں اسے دیکھنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ البتہ عملی آثار و نتائج کے آئینہ میں اس کا روئے روشن دیکھا جا سکتا ہے۔ جو مسلمان اس دولت بے بہا کا خزینہ دار ہوتا ہو اس کی عملی زندگی میں مندرجۂ ذیل آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

(۱) کسی مقصد کے حصول کے لیے خواہ جائز وسائل و اسباب مفقود ہی کیوں نہ ہوں مگر وہ ایسے اسباب و ذرائع کو استعمال نہیں کرتا جو شریعت اسلامیہ میں ممنوع اور ناجائز ہیں۔

(۲) ماسوی اللہ کے سامنے اپنی احتیاج کا اظہار اس طرح نہیں کرتا جس طرح حق تعالیٰ کے سامنے کرتا ہو۔ مثلاً مزاروں پر چڑھاوے نہیں چڑھاتا، انھیں سجدے نہیں کرتا، اولیا، انبیاء وغیرہ سے دعائیں نہیں مانگتا۔ ان کے نام کا وظیفہ نہیں پڑھتا۔ خلاصہ یہ کہ اس قسم کے سب مشرکانہ افعال سے پرہیز کرتا ہو۔ عمل کی یہ پاکیزگی و پختگی اور شرک سے پاکی توکل کا ثمرہ ہوتا ہو جو اس عقیدہ کی ایک شاخ پُر ثمر ہے۔ کہ نفع و ضرر کا اختیار کلّی صرف اسی قادر مطلق کو ہو جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز ہے۔ اسباب مادیہ کی طرح اسباب روحانیہ بھی مشیت الٰہی کے تابع ہیں اور بغیر مشیت الٰہی ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

توکل مستحب

جس توکل کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہو وہ ہر مسلمان پر فرض عین اور ایمان کا اولین تقاضہ ہو۔ لیکن ایک درجہ اس سے بلند بھی ہے جسے ہم توکل مستحب کہہ سکتے ہیں، جو خوش نصیب اس درجہ پر فائز ہوتا ہے اس کی نظر ثاقب اسباب کے پردوں کو پار کر لیتی ہو اور براہ راست مسبب الاسباب تک پہونچتی ہے۔ وہ حوادث کو علل و اسباب کی روشنی میں نہیں دیکھتا، بلکہ مالک حقیقی

کی مشیت کا نتیجہ سمجھتا ہو۔ اور اسباب کو صرف مشیتِ الٰہی کی علامتیں سمجھتا ہے۔

جو نفس پاکیزہ توکّل کے اس بلند درجہ پر فائز ہو جاتا ہو اس کی عملی زندگی میں مندرجۂ ذیل علامتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

(۱) اسباب کو بحیثیت اسباب کے اختیار کرنا اس کے نزدیک ایک قسم کا شرک ہوتا ہے۔ بلکہ وہ انھیں اختیار یا ترک کرنے میں احکام شرعی کا پابند ہوتا ہو یعنی جن اسباب کے متعلق شریعت حکم دیتی ہے کہ انھیں اختیار کرو انھیں اختیار کرتا ہو جن کے ترک کرنے کا حکم دیتی ہے انھیں ترک کرتا ہو، جن کے بارے میں شریعت اختیار دیتی ہو کہ ان کا اختیار کرنا یا نہ کرنا بندے کی مرضی پر منحصر ہو، اُن میں دیکھتا ہو کہ کس شق پر عمل کرنے سے آخرت کا نفع زیادہ ہو۔ جسے آخرت میں زیادہ نافع دیکھتا ہے اس کو اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ تیسری قسم کے متعلق بزرگانِ دین کے حالات مختلف ملتے ہیں۔ بعض نے انھیں اختیار فرمایا ہو اور بعض نے ترکِ اسباب کو اختیار فرمایا ہے۔ دونو قسم کے حضرات متوکل ہیں۔ مظاہر توکل مختلف ہیں۔

بات کچھ مزید توضیح چاہتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں "خلق" کی قدرت وطاقت نہیں ہو اگر سب مخلوقاتِ الٰہی انسان، جن، ملائک، انبیاء، اولیاء وغیرہ مل کر بھی ایک ذرّہ یا اس سے بھی حقیر شے پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ مگر سنت اللہ یہی ہو کہ بعض حوادث کے بعد بعض حوادث کو پیدا فرماتے ہیں۔ یہ چیز جب بار بار مشاہدے میں آتی ہے تو انسان ان کے درمیان علت ومعلول کا رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ اور پہلے حادثہ کے بعد دوسرے کا منتظر رہتا ہے۔ لیکن حقیقت پر نظر کیجیے تو اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ملے گی کہ فلاں حادثہ فلاں حادثہ کی علت ہو یا دوسرے الفاظ میں حوادث کے درمیان علت ومعلول کا تعلق ہے۔ آگ لکڑی کو جلاتی ہے، پانی آگ کو بجھاتا ہے کس قدر غیر مدلّل دعوے ہیں۔ جو بات ہم اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں وہ صرف اتنی ہو کہ جب آگ اور لکڑی یا آگ اور پانی میں اتصال پیدا ہوتا ہو تو ایک نیا حادثہ ظاہر ہوتا ہو جسے جلنا یا بجھنا کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ اس حادثہ کی علت آگ یا پانی ہے؟۔ اس آسمان کے نیچے آپ کو اس کی کوئی دلیل نہیں مل سکتی نہ اس دعوے کو کوئی بڑے سے بڑا فلسفی ثابت کر سکتا ہو۔ خلاصہ یہ کہ عالم کو سلسلۂ علل ومعلولات اور اسباب ومسببات کا مجموعہ کہنا ایک ایسا مہمل دعویٰ ہے جو عقلاً یا نقلاً کسی طرح

ثابت نہیں۔ عقلاً یہ عین ممکن ہو کہ ایک حادثہ کے بعد دوسرا حادثہ کسی تیسری چیز کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہو جو درحقیقت اس کی علت ہو۔ جیسے ریلوے گارڈ کے جھنڈی دکھانے اور ٹرین کے چلنے میں ایک اتصال ہونے کے باوجود علت و معلول کا ربط نہیں ہے بلکہ حقیقی علت انجن کا چلنا ہے۔

حقیقت سے بے خبر اور معرفت الٰہی سے محروم حوادث عالم میں باہم اتصال اور تعاقب دیکھ کر انھیں اسباب و مسببات کا سلسلہ سمجھ لیتے ہیں مگر مومن متوکل حقیقت شناس ہوتا ہو اس لیے ان میں ارادۂ الٰہی کے انوار کا مشاہدہ کرتا ہو۔ اور تعاقب و اتصال کو سنت اللہ سے تعبیر کرتا ہو۔ وہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہی ہے کہ فلاں حادثہ کے بعد فلاں حادثہ کو پیدا فرما دیتے ہیں۔ آگ جب لکڑی سے متصل ہوتی ہو تو خالقِ حقیقی "جلنے" کو پیدا فرما دیتے ہیں۔ پانی اور آگ کے اتصال کے بعد "بجھنے" کو خلعتِ وجود عطا فرماتے ہیں۔ حقیقی موثر ارادۂ الٰہی ہو نہ کہ آگ یا پانی۔ یہ اعتقاد تو ہر مسلمان کا ہوتا ہو۔ مگر جس کا دل توکل کے نور سے منور ہوتا ہو وہ اسے وجدان کی آنکھ سے دیکھتا ہو اور اسی طرح محسوس کرتا ہو جیسے بھوک اور پیاس کو۔

حقیقت حال تو سب حوادث میں ایک ہی ہے۔ مگر اس کا ظہور مختلف اشیاء میں مختلف لباسوں میں ہوتا ہو۔ سنت اللہ ایک مگر اس کے رنگ مختلف۔ کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اسباب کے بغیر مسبب کا وجود کبھی نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہو تو اسے ایک خرق عادت شے سمجھا جاتا ہو لیکن بعض امور میں یہ بات نہیں ہو۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر کھانا معدے میں پہونچائے ہوئے جسم کو غذا نہیں ملتی اور پانی پیے بغیر پیاس نہیں بجھتی۔ اس کے برخلاف رزق حلال اگرچہ عادتاً محنت و کوشش اور معاشی جد و جہد سے ملتا ہو مگر اللہ کے ایسے بندے بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جنھیں بے فکری کے ساتھ بغیر کسی محنت کوشش اور بے منت غیرے رزق حلال میسر ہو۔ قسم اول کے اسباب کا نام اسباب ضروریہ اور دوسری کا اسباب عادیہ رکھ دیجئے تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

جو چیزیں شرعاً واجب ہیں ان کے اسباب ضروریہ کا اختیار کرنا بھی واجب ہو۔ بلکہ جو مقاصد صرف مباح اور جائز ہیں انھیں حاصل کرنے کا ارادہ ہو تو ان کے اسباب ضروریہ کا اختیار کرنا بھی واجب ہو۔ بغیر استعمال اسباب ان کی تمنا کرنا سخت غلطی اور ایک قسم کا عُجب ہو جس کا ارتکاب کوئی عارف نہیں کر سکتا۔ اس تمنا کے معنی تو یہ ہیں کہ یہ شخص اپنی شخصیت اس قدر بلند سمجھتا ہے اور اپنی

ذات کو اسقدر مقرب بارگاہ الہی جانتا ہو کہ اپنے لیے سنت اللہ کی تبدیلی کا منتظر اور امیدوار ہو۔ ظاہر ہو کہ یہ عجیب دینداری کی ایک صورت ہو۔

اسباب عادیہ میں بھی تدرے تفصیل ہو جو مقاصد شرعاً واجب ہیں ان کے اسباب عادیہ کا اختیار کرنا بھی واجب ہو۔ مثلاً جو شخص اہل وعیال رکھتا ہو اور ان کے نفقہ کا شرعاً ذمہ دار ہو اس پر واجب ہو کہ رزق حلال کے اسباب اختیار کرے، محنت کرے، تجارت کرے یا اور کوئی مباح ذریعہ اختیار کرے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ اسباب کو ترک کر کے خانہ نشین یا مسجد نشین ہو جائے اور اہل وعیال کے نفقہ کے لیے محض فتوحات کا منتظر رہے۔ ہاں ایک صورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ یعنی جب اہل وعیال بھی توکل کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں تو ترک اسباب ان کی رضامندی کے ساتھ اس کے لیے بھی جائز ہوگا۔

یہ گفتگو تو ان مقاصد کے لیے ہو جو شرعاً واجب ہیں لیکن جو مقاصد شرعاً واجب نہیں ہیں اُن کے اسباب عادیہ کا اختیار کرنا یا نہ کرنا بندے کے اختیار میں ہو۔ اختیار و ترک دونوں اس کے لیے جائز ہیں۔ اس تفصیل کے بعد اس شخص کے طرز عمل کے متعلق رائے قائم کرنا بہت آسان ہو جو اسباب کو اختیار یا ترک کرنے میں صرف رضائے الہی پر نظر رکھتا ہو اور اسباب کو صرف علامات کا درجہ دیتا ہو، یعنی توکل کے مستحب درجہ پر فائز ہو۔ دو لفظوں میں اس کا طریقۂ زندگی بیان کیا جا سکتا ہو۔ جہاں اختیار اسباب شرعاً واجب ہو وہاں وہ ان کے اختیار کرنے کا حریص ہوتا ہو۔ جہاں جائز ہو وہاں غور کرتا ہو کہ رضائے الہی کس طرح زیادہ حاصل ہو سکتی ہو اختیار سے یا ترک سے۔ جو شق رضائے الہی میں زیادہ معاون ہوتی ہو اسی کو اختیار کرتا ہو۔ اسی اختیار و اختلاف نظر کی وجہ سے اللہ والوں کے طرز عمل میں باہم اختلاف نظر آتا ہو۔ ایک بندۂ صالح کا طریقہ یہ دیکھا جاتا ہو کہ وہ فکر معاش سے بالکل یکسو ہے۔ محض اللہ پر بھروسہ ہو اور اکتساب رزق کا فقدان، دوسرے بزرگ کی شان دوسری ہی دکھائی دیتی ہو۔ اکتساب معاش کو وہ لازم سمجھتے ہیں۔ نذرانے قبول کرنے سے اِبا کرتے ہیں، اور بظاہر ایک دنیادار کی طرح معاشی جد وجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ دونوں درحقیقت رضائے الہی کے جویا ہیں نظر و اجتہاد کے اختلاف نے دونوں کی عملی زندگی کو مختلف راستوں پر ڈال دیا ہو۔ قابل اعتراض نہ اِن کا طرز عمل ہو نہ اُن کا۔ دونوں صحیح راستہ پر ہیں۔ ایسی مثالیں آپ کو بکثرت مل جائیں گی۔

توکل کے دونوں درجے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں اپنی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ دونوں میں سے

کوئی درجہ آپ کو حاصل ہو یا نہیں؟ اگر خدانخواستہ نہیں تو اس کے حاصل کرنے میں دیر کیوں ہو؟ بسم اللہ اسی وقت سے عزم و ہمت کو قوی کیجئے اور اخلاقی شرک سے نجات حاصل کیجئے۔

خوف و رجا

انسان فطری طور پر خلود و بقا کا حریص ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ باقی رہے اسلئے جو چیز ایسی نظر آتی ہے جس سے اسکے وجود و زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو اس سے وہ ڈرتا ہے۔ اسی طرح جس چیز کے متعلق اسے خیال ہوتا ہے کہ اسکے وجود کے باقی رہنے میں معاون ہوگی یا فائدہ کا امیدوار رہتا ہے۔ خوف اور رجا یعنی ڈر اور امید بالکل فطری کیفیتیں ہیں۔ کوئی فرد بشر ان سے خالی نہیں ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے آدمی کو کس سے ڈرنا چاہیے اور کس سے امیدوار رہنا چاہیے؟

عقیدۂ توحید کی روشنی میں جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اللہ ہی سے ڈرنا چاہیے اور انہیں سے امید بھی رکھنا چاہیے۔ توحید کا عقیدہ ہمیں بتاتا ہے کہ نفع و نقصان صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نفع نقصان پہونچانے کا ادنیٰ سے ادنیٰ حقیقی اختیار حاصل نہیں ہے۔ حدیث کا مضمون ہے کہ اگر سارا عالم مل کر بھی کسی کو ذرہ برابر نفع یا نقصان پہونچانا چاہے تو بغیر مشیت الٰہی ہرگز نہیں پہونچا سکتا۔ اس یقین کے بعد اللہ کے علاوہ کسی سے ڈرنے یا امید رکھنے کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ توحید پر یقین کے معنی ہی یہ ہیں کہ خوف و رجا کا تعلق صرف اللہ سے ہو۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس ۔۔۔ ہمین است بنیاد توحید و بس

یہاں تک تو صرف عقلی و علمی گفتگو تھی اور ہر مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے خائف اور امیدوار نہ رہنا چاہیے لیکن توحید کا تقاضہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا اسکا مطالبہ یہ ہے کہ یہ چیز مومن کی عادت اور اس کا ایک خلق لازم بن جائے۔ وہ ہمیشہ اللہ کے غضب سے خائف اور اسکی رحمت کا امیدوار رہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا نہ اسے خوف ہو نہ کسی سے اسے کوئی امید۔ اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ صرف عقلی طور پر نہیں بلکہ حال و کیفیت کے درجہ میں اس مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کے سرتاج صحابۂ کرام کے متعلق قرآن مجید کی شہادت ہو کہ

الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ	یہ اہل ایمان ایسے ہیں کہ جب لوگوں نے
النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ	ان سے کہا کہ لوگ (کفار) تم پر حملہ کرنے
فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا	کے لیے جمع ہوئے ہیں تو ان کا ایمان اور
اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ.	زیادہ ہوگیا اور انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے
(آل عمران)	اللہ تعالیٰ کافی ہیں اور وہ بہت اچھے
	کارساز ہیں۔

یعنی کامیابی کی امید ہمیں صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو وہی ہمارے کارساز ہیں کسی دوسرے سے امید قائم کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہو۔

امید کے متعلق مسلمانوں کا یہ شعار ہونا چاہیے۔ خوف کے متعلق بھی کتاب الٰہی کی صراحت دیکھ لیجیے۔

وَإِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (بقرہ) اور صرف مجھ ہی سے ڈرو

اس حد تک تو مسئلہ بالکل بے غبار ہوگیا کہ عقیدۂ توحید کا تقاضہ اور قرآن مجید کا مطالبہ یہ ہو کہ بندہ صرف اللہ سے خائف ہو اور انھیں سے امیدوار رہے۔ لیکن اس کی عملی شکل کا چہرہ ابھی بے نقاب نہیں ہوا ہو۔ ہماری عملی زندگی کا حجاب اسے چھپائے ہوئے ہو۔ جب تک اس پردہ کو نہ اٹھایا جائے گا اس وقت تک یہ مسئلہ صاف نہیں ہوسکتا کہ اس تقاضے پر ہم عمل کیسے کریں اور اس عمل کو اپنی عادت کیسے بنالیں؟

سوال یہ ہو کہ ہم سانپ اور بچھو سے ڈرتے ہیں۔ قاتلوں اور ڈاکوؤں سے خائف ہوتے ہیں حاذق طبیب کے علاج سے امید شفا رکھتے ہیں۔ ہمدردوں اور عزیزوں سے ہمدردی و امداد کے امیدوار رہتے ہیں۔ کیا یہ سب باتیں توحید کے خلاف اور داخل شرک ہیں۔ اگر ہیں تو دنیا میں موحد کتنے گزرے ہیں؟ بڑے بڑے اولیاء اللہ و اتقیاء سے یہ امور ثابت ہیں۔ کس کی ہمت ہو کہ انھیں توحید کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دے؟ یہ اشکال بہت سے ذہنوں کو الجھن میں ڈال کر جادۂ استقامت سے منحرف کر دیتا ہے۔

حقیقت حال سے ناواقفیت اس اشکال کا سبب ہے، ورنہ بات الجھی ہوئی نہیں ہے۔ اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس پر عمل کرنا غیر ممکن ہو یا جس میں انسان کے فطری تقاضوں کو نظر انداز فرمایا گیا ہو۔ خوف اور رجا دونوں فطری جذبات ہیں اور یہ بھی بالکل طبعی وفطری چیز ہے کہ انسان مضر و مہلک چیزوں سے خائف ہوتا ہے اور مفید و مناسب چیزوں سے امید نفع رکھتا ہے۔ اسلام نے اس طبعی خوف و رجا سے ہرگز نہیں منع کیا ہے اس سے بچنا انسان کے اختیار سے باہر ہے اور اسلام صرف ان باتوں کے متعلق احکام دیتا ہے جو انسان کے اختیار میں داخل ہیں۔

غیر اللہ سے طبعی خوف یا طبعی امید ہرگز توحید کے خلاف نہیں ہے نہ اس میں کوئی شرک یا معصیت ہے جس خوف و رجا کا تعلق صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ سے ہونا چاہیے وہ عقلی خوف و رجا ہے ہم سانپ سے ڈرتے ہیں مگر عقلی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمیں نقصان پہنچانے کی کوئی قوت نہیں ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہوگی اس وقت تک یہ کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ دوا سے امید نفع ہوتی ہے مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ دوا میں کوئی تاثیر نہیں ہے۔ اس کی تاثیر محض خالق کائنات کی مشیت کی تابع ہے۔ اگر حق تعالیٰ کا حکم ہوا تو فائدہ ہوگا ورنہ ہرگز نہ ہوگا۔ اس عقلی خوف و رجا کے بھی دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ جو ایمان کا جزو اور توحید کا ایک حصہ ہے یہ ہے کہ محض عقیدے کے طور پر ہم سمجھیں کہ جس چیز سے ہم خائف ہیں یا جس سے امیدوار ہیں اس میں ضرر و نفع کی کوئی قوت و طاقت نہیں ہے۔ جو کچھ ہوگا وہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوگا۔ یہ توحیدی خوف و رجا کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اگر معاذ اللہ کسی میں یہ بھی موجود نہیں ہے تو ایسا شخص شرک خالص میں مبتلا ہے اور توحید کے نور سے محروم ہے۔ دوسرا درجہ جو اس سے اعلیٰ و افضل ہے یہ ہے کہ انسان کا یہ عقلی عقیدہ اس کی ایک ذہنی و نفسی کیفیت و حالت بن جائے۔ عقیدۂ توحید کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ کیفیت اور یہ خُلق مومن کو حاصل ہو۔

عارفین جو اس مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں اگرچہ طبعی خوف و رجا سے خالی نہیں ہوتے لیکن وہ ایسے امور کو جن سے انسانی طبیعت میں غیر اختیاری طور پر خوف و امید کا اثر ہوتا ہے محض ارادۂ الٰہی کی علامتیں سمجھتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ریلوے گارڈ کا سبز جھنڈی دکھانا گاڑی چھوٹنے کی ایک علامت ہے نہ کہ اس کی علت۔ جس طرح ہری جھنڈی دیکھ کر مسافر جلد جلد گاڑی میں بیٹھنے

لگتے ہیں اور انھیں ترین چھوٹنے کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک صاحب عرفان جو توحید کے اس مرتبہ پر فائز ہوتا ہے غیر اللہ سے خوف و امید صرف اس لیے قائم کرتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ارادہ ضرر یا نفع کی علامتیں ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سانپ کا ڈسنے کے لیے دوڑنا بظاہر اس بات کی علامت ہے کہ شاید حق تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مجھے تکلیف میں مبتلا فرمانا چاہتے ہیں یا میری قوت مقابلہ و مقاومت سے کام لینا چاہتے ہیں۔ عین اس حالت میں بھی اس کی نظر حق تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے۔ اور انھیں کی رضا تلاش کرتا ہے بلکہ جب عرفان اور ترقی کرتا ہے تو اس طبعی خوف و رجا کا تعلق حق تعالیٰ کے امر تکوینی سے ہو جاتا ہے۔ ایسے حضرات خوفناک اشیاء سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں خوفناک بنایا ہے اور حق تعالیٰ کے امر تکوینی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان سے ڈرا جائے۔ اسی طرح وہ مفید چیزوں سے صرف اس لیے امید نفع رکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا امر تکوینی یہی ہے کہ ان سے طبعی امید رکھی جائے۔ ان کا طبعی خوف اور ان کی طبعی امید بھی بالکل مرضی الٰہی کے مطابق اور حکم الٰہی کی تعمیل ہوتی ہے چنانچہ جب امر الٰہی اس کے خلاف ہوتا ہے تو طبعی خوف اور طبعی امید دونوں چیزیں ان کے دل سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اژدہے سے خوف اور ہاں کی دعا دونوں چیزیں عین امر الٰہی کی تعمیل اور اپنی عبدیت و عاجزی کے اظہار کیلئے تھیں۔

اس درجہ کا دعویٰ کرنا تو بہت آسان ہے اور بہت سے اشخاص کو اپنے متعلق یہ غلط فہمی بھی ہوتی ہے کہ ہم اس درجہ پر فائز ہیں۔ لیکن امتحان و آزمائش کی کسوٹی کھرے، کھوٹے کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ امتحان کا موقع وہ ہوتا ہے جب شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کا مقابلہ طبعی خوف یا امید سے ہوتا ہے۔ وہ شخص جو خوف و رجا میں بھی موحد کامل ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر حکم الٰہی پر عمل کرتا ہے اور طبعی خوف یا امید کی ادنیٰ پرواہ بھی نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف جو شخص اس کیفیت سے محروم ہوتا ہے وہ طبعی خوف و امید سے مغلوب ہو کر حکم الٰہی پر عمل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ دنیاوی منفعتوں کی امید یا غیر اللہ کے خوف سے گناہوں اور ناجائز کاموں کا ارتکاب اس چیز کی یقینی علامت ہے کہ ایسا کرنے والا توحید کے اس درجہ سے محروم اور اخلاقی شرک میں مبتلا ہے۔

لیکن اس درجہ پر پہونچنا اتنا مشکل نہیں ہے جسقدر بظاہر نظر آتا ہے مشق اور محنت سے کامیابی یقینی ہے۔ امت مسلمہ نے اس کے عملی نمونے بہت بڑی تعداد میں پیش کیے ہیں۔ محمد بن قاسم کا واقعہ آپ نے سنا ہے؟

جب اس موحد اور اس کے ساتھیوں نے دریائے سندھ کی طوفان خیز موجوں میں اپنے گھوڑے ڈال دیے تھے اور دریا کے بگڑے ہوئے تیوروں سے ذرا بھی خائف نہ ہوئے۔ تاریخ اسلام میں ہزاروں لاکھوں واقعات اس قسم کے ملتے ہیں خصوصاً دورِ صحابہ کی نورانی تاریخ میں تو اس قسم کے واقعات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ اللہ کے مقبول بندوں نے بڑے بڑے جبّار اور صاحب سطوت حکام و سلاطین کے سامنے کلمۂ حق کہا ہے۔ اور نہ ان کی شوکت و قوت سے مرعوب ہوئے نہ ان کی عطا و بخشش کے امیدوار۔ آج بھی اہلِ ایمان میں ایسے افراد بڑی تعداد میں موجود ہیں جنھیں حکم شریعت پر عمل کرنے سے نہ کوئی خوف مانع ہوتا ہے نہ کوئی امید روکتی ہے۔ خوف و رجا میں محض عقلی توحید جو حالت و کیفیت کے درجہ میں نہ ہو ہرگز ایسے امتحانات میں ثابت قدم رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر مسلمان اس کیفیت کو اپنے نفس میں پیدا کرے یہ کیفیت عرفان الٰہی کی پہلی منزل اور ان کی بارگاہ میں قرب و مقبولیت کا پہلا درجہ ہے۔ یہی وہ مقام بلند ہے جہاں پہونچ کر مومن لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کے خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ فقط

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ملکیت و دیگر امور سے متعلق اعلان

فارم نمبر ۴ — دیکھو قاعدہ نمبر ۸

مقام اشاعت — لکھنؤ — وقفۂ اشاعت — ماہانہ

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر اور مالک کا نام — محمد منظور نعمانی

قومیت — ہندوستانی — پتہ — کچہری روڈ لکھنؤ

میں (محمد منظور نعمانی) بذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل صحیح ہیں

محمد منظور نعمانی — مورخہ ۱ مارچ ۱۹۶۷ء

تبصرہ

سیرتِ قرآنیہ

سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہم نے پوری کتاب میں اس قسم کی بیسیوں مثالوں پر نشانات لگائے ہیں۔ لیکن کہاں تک اس حکایت کو دراز کیا جائے۔ صرف دو مثالیں اور لیجئے!

۱۔ مؤلفِ سیرتِ قرآنیہ نے بہت سے مسائل میں اپنے خاص خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے ایک بحث "اعجازِ قرآن" کی بھی ہے۔ اس بارے میں موصوف کا قطعیت کے ساتھ خیال ہے کہ قرآن میں اعجازِ قرآن کا دعویٰ بایں معنیٰ نہیں کیا گیا ہے کہ منکرین ایسا کلام بنا کر نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس قبیل کی آیات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور اسی طرح دوسری کتب سماویہ منجانب اللہ ہونے کی حیثیت سے معجز ہیں — "یعنی منکرین خدا انھیں ہرگز خدا کی طرف سے نہیں مان سکتے، نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا رسولوں کو بھیجتا ہے۔ اگر ایسا کہہ دیں تو وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔" (ص۲۱)

"اعجازِ قرآن" کی اس تشریح کی منطق پر ذرا غور کیجئے۔ یہ خود کیا کم طرفہ تماشہ ہے کہ اسی پر بنیاد رکھ کر ص۱۹۳ پر "ختم الاحقاف۔ تحدّی برائے تورات و قرآن" کے تحت قرآن کی تحدّی (چیلنج) کا بیان یوں فرماتے ہیں کہ:

> "دیکھو یہ کلام اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جیسا کہ توراۃ ہے۔ یہ نیکوں کے لیے بشارت (انجیل) ہے اگر تم سچے ہو تو اسی طرح کی تعلیم بنا لاؤ۔ ہم نے پہلے بھی یہی تعلیم دی تھی (ائتونی بکتابٍ من قبل هذا اواثارةٍ من علمٍ ان کنتم صٰدقین)"

یہ بالکل اسی طرح کی تفسیر ہے جس طرح ایک سلسلۂ کلام میں یہ فرماتے ہوئے کہ "دین کی تفصیلات کے لیے دوسری کتب الٰہیہ موجود تھیں" قرآن کے ان الفاظ کو شاہد بنایا گیا ہے کہ "ما یُقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک" (ص۱۶۲)

عربی زبان کی رو سے قرآن کے خود ان الفاظ پر بھی غور کیجئے اور ان کے سیاق و سباق کو بھی دیکھئے تو حیرت ہو جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ قرآن فہمی کی کون سی قسم ہے جس میں نہ الفاظ سے کوئی مطلب ہے، نہ سیاق و سباق سے کوئی سروکار! اگر یہ قرآن کے تاریخی مطالعہ ہی کی روشنی ہے جو ان عجائب تک پہونچاتی ہو تو ہم نہایت ادب کے ساتھ جناب محمد اجمل خاں صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ تیرہ و شی نسخت گمراہ کن ہے انھیں اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، اور اگر یہ خطا تاریخی مطالعہ کی نہیں بلکہ قصہ یہ ہے کہ نہ تو خود قرآن کی زبان سے آشنا ہونے کی سعی فرمائی گئی ہے (جیسا کہ یہ دونوں مثالیں گواہی دے رہی ہیں)

اور نہ کسی دوسری زبان کے ذریعہ ہی خود قرآن کا مطالعہ فرمانے کی زحمت اٹھائی گئی ہو۔ (جیسا کہ مثال ۱۲ و ۱۳ سے یہ بات یقین کی حد تک ظاہر ہو رہی ہے) بلکہ صرف نولڈ کیے، ہرش فلڈ اور لین پول کی تحقیقات و تصنیفات کے مطالعہ پر اکتفا کر لیا گیا ہو۔ تو انھیں اپنی اس غیر ذمہ داری پر استغفار کرنا چاہیے۔

۲۔ سورۂ بقرہ کی آیت ہو "حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا الخ" ـــــ یہ اتفاق سے ایسے مقام پر واقع ہو جہاں آگے پیچھے طلاق کے مسائل کا بیان ہو رہا ہو۔ چنانچہ مؤلف سیرت قرآنیہ نے اپنے تاریخی مطالعہ سے کام لیتے ہوئے اس میں بھی طلاق سے متعلق ایک حکم نکال کر ترتیب کا ظاہری جھول نکال ڈالا ہو۔ جو ترتیب نزول سے بے خبر مفسرین کی تفسیروں میں اب تک چلا آرہا ہو۔ فرماتے ہیں

"صلوٰۃ وسطیٰ بقرہ ۳۱ ع | طلاق کے بعد بیوہ کو حسب دستور نفقہ ملنا چاہیے۔ یہ ہر مسلمان کے لیے صلوٰۃ وسطیٰ ہو یعنی عادلانہ فرض یا انصاف کی بات ہو جو غیر معمولی حالات میں (مثل جنگ یا مفلسی کے) ترک کیا جا سکتا ہو یا ترمیم ہو سکتا ہو۔ جس طرح جنگ کی حالت میں نماز کے احکام میں ترمیم ہوتی ہو (وسطیٰ بمعنی انصاف۔ بیچ کی راہ۔ اور صلوٰۃ بمعنی فرض)۔"

اس تفسیر بے نظیر سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہو کہ یہاں گویا اللہ تعالیٰ کو مطلقہ کے نان نفقہ کا حکم بیان کرنا تھا اور جنگ کی حالت میں نماز کا مسئلہ صرف بطور مثال اس حکم کی تفہیم کے لیے لایا گیا تھا! ـــ لیکن کوئی پوچھے کہ کیا آیت کا سیاق اس تفسیر سے مطابقت رکھتا ہو؟ کوئی عربی سمجھنے والا شخص ہو جو یہ کہہ دے کہ یہاں صلوٰۃ خوف کے حکم کا یہ سیاق کسی دوسرے حکم کی تفہیم و توضیح کے لیے ایک مثال کا سیاق ہو ـــ جناب اجمل خاں صاحب معاف فرمائیں۔ ہمیں اس موقع پر عرفی کا یہ ضرب المثل قول یاد آرہا ہو:

شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟

غریب ایسی ہی شعر فہمی پر جھلا کر تو یہ کہہ اٹھا تھا۔

صفحات کی تنگ دامانی ہمیں مزید ایسے مقامات کی نشاندہی کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن جناب مؤلف اگر طالب حق ہیں تو امید ہو کہ یہ چند اشارات ہی انھیں اپنے افکار پر نظر ثانی کا سامان بہم پہونچا سکتے ہیں۔

---

۵۹ ملاحظہ ہو تبصرہ کی پہلی قسط۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا مؤلف سیرت قرآنیہ کے تفسیری افکار سے متعلق تھا. لیکن کتاب ان جزوی تفسیری گمراہیوں کے علاوہ متعدد بنیادی فکری اور اعتقادی گمراہیاں بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہو اور ہمیں ذرا شبہ نہیں کہ یہ سب اُسی نقصہ کا نتیجہ ہو کہ مؤلف نے براہ راست قرآن کا مطالعہ کرنے کے بجائے مغربی مستشرقین پر تکیہ کیا ہو. کتاب کے "حرف اول" میں بعض مستشرقین سے استفادہ کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہو وہ اسی پر دال ہو. قرآن کے بارے میں اس کتاب کی سب سے عظیم گمراہی جسے مؤلف نے ان مستشرقین سے غیر معمولی تأثر کی بنا پر اس آسانی سے سپرد قلم کر دیا ہو کہ جیسے بالکل آنکھوں دیکھی حقیقت ہو، خود کتاب کے الفاظ میں یہ ہو کہ

"اس دنیا کی بھوک اور دُکھ سے نجات یا فراغت کاملہ دونوں کے متعلق رسول عربیؐ نے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر اور تاریخ کے گہرے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شاہی اور پروہتی ختم کی جائے اور عقل کی شہنشاہی قائم۔ یہ تصور خدا کے فضل و کرم سے اُن کے دل و دماغ پر بچپن سے چھایا گیا تھا. اور آخر کار چالیس سال کی عمر میں پہونچ کر وہ پاکیزہ افکار اُبل پڑے جو قرآن کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔"

(حرف اول صفحہ اول)

اس عبارت میں دراصل ایک گمراہی نہیں بلکہ "ظلماتٌ بعضہا فوقَ بعض" کا منظر ہو. اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہمارے تنقیدی اشارات کچھ ٹھکانے لگے ہیں تو ہم کوشش کریں گے کہ اس آخری مبحث اور اس جیسے دوسرے مباحث پر بھی کچھ کلام کریں، ورنہ یہ وقت کا محض ضیاع ہوگا کہ ہم ان چیزوں کو بھی اہمیت دیں۔

ماہ رحمت میں مطالعہ کیلئے کتابیں منتخب فرمائیے

تفسیر ابن کثیر اردو ۔ قرآن کی مایۂ ناز عربی تفسیر کا ترجمہ ۔ ۵ جلدیں ۔ مجلد ۵۵/-

صحیح بخاری شریف مکمل ۔ ۳ جلدوں میں مجلد ۳۴/-

موطا امام مالک مترجم ۔ بخاری شریف سے بھی پہلا مجموعہ حدیث ۔ (عربی اصل مع اردو ترجمہ) ۱۲/-

مشکوٰۃ شریف اردو ۔ دو جلدوں میں مکمل مجلد ۱۶/-

معارف الانوار مترجم ۔ بخاری اور مسلم کی ۲۲۷۲ قولی احادیث کا گرانقدر مجموعہ مع ترجمہ ۱۴/-

شمائل ترمذی ۔ مع اردو شرح ۔ از مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی ۔ غیر مجلد ۵/-

ترجمان السنۃ ۔ حدیث کا ایک جدید مجموعہ تمام تفصیلی مباحث کے ساتھ (از مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی) تین جلدیں ۲۹/۸ ۔ مجلد ۳۵/۸

لغات الحدیث اردو ۔ از مولانا وحید الزماں صاحب چھ جلدوں میں سے چار جلدیں اب تک طبع ہوئی ہیں ۔ فی جلد مجلد ۱۳/-

بستان المحدثین اردو ۔ محدثین اور کتب حدیث کا تعارف وتذکرہ ۔ از شاہ عبدالعزیز ۔ ۵/-

حصن حصین ۔ ماثورہ دعاؤں کا بے مثال مجموعہ مجلد ۸/-

کتاب الصلوٰۃ ۔ نماز کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کی قابل دید کتاب کا ترجمہ مجلد ۱/۸/-

علامات قیامت ۸/-

مختصر شعب الایمان ۱/-

مختصر فضائل نبوی ۱/-

بے نظیر علمی کتابیں

حجۃ اللہ البالغہ مترجم ۔ از حضرت شاہ ولی اللہؒ مترجمہ مولانا عبدالحق حقانی مکمل مجلد ۲ جلدیں ۲۰/-

مقدمہ ابن خلدون اردو ۔ مع تصاویر ونقشہ جات مجلد ۱۵/-

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۔ ایک عظیم اور تازہ کتاب ۔ مجلد ۱۲/- غیر مجلد ۱۱/-

تدوین حدیث ۔ مولانا گیلانیؒ کی بے نظیر کتاب مجلد ۹/۸

مقالات احسانی ۔ یعنی تصوف واحسان سے متعلق چند بسیط مضامین ۔ (از مولانا گیلانیؒ) مجلد ۹/۸

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ۔ از مولانا گیلانیؒ مجلد ۱۲/-

تحفۂ اثنا عشریہ ۔ شیعہ مذہب کے بارے میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مشہور کتاب کا ترجمہ ۔ مجلد ۱۲/-

نصیحۃ الشیعہ مکمل ۔ از مولانا احتشام الدین مرادآبادی قیمت ۵/۸

اصح السیر (سیرت نبوی) از مولانا عبدالرؤف صاحب دانا پوریؒ مجلد ۱۰/-

سفر حج کے لیے بہترین کتابیں

آپ حج کیسے کریں؟ مجلد ۲/-
(تعارف ٹائٹل صفحہ ۲ پر ملاحظہ ہو)

فضائل حج ——— ۳/۸

معلم الحجاج ——— ۳/۸

رفیق حج ——— ۱/۸

حج کا مسنون طریقہ ——— ۱/۴

تجلیات کعبہ ——— ۳/-

تجلیات مدینہ ——— ۲/۸

سفر حجاز از مولانا دریابادی ——— ۵/-

گلبانگ حرم ۔ شاعر حرم حمید صدیقی کا روح پرور مطبوعہ کلام ۳/۱۲

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

April & May 1960

بابت ماہ رمضان، شوال و ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ مطابق اپریل و مئی ۱۹۶۰ء

قیمت :- ایک روپیہ

سالانہ چندہ

ہندوستان سے -/5 (پانچ روپیہ)

پاکستان سے -/6 (چھ روپیہ)

غیر ممالک سے ــــ دس شلنگ

اہل پاکستان کیلئے ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ۔ آسٹریلین بلڈنگس لاہور

فہرست مضامین

اگر اِس دائرے میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدّتِ خریداری ختم ہوگئی ہے، براہِ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۳ مئی تک دفتر میں آجانی چاہیے، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا —— **پاکستان کے خریدار** اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں —— **تاریخ اشاعت** :- رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے، تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہئے، اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی !۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :-

دفتر الفرقان۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

نگاہِ اوّلیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفرقان کی یہ اشاعت تقریباً ۲ ماہ کے وقفے سے سامنے آرہی ہے۔ سابق اشاعت (مارچ ۶۰ء) میں اس وقفے کے متعلق اعلان کر دیا گیا تھا۔ مگر اعلان کسی نمایاں جگہ پر نہیں آسکا تھا، اسلئے بہت سے حضرات کی نظر سے غالباً نہیں گذرا۔ اور گذشتہ ماہ (اپریل) کے نصف سے رسالہ کی عدم وصولیابی کی شکایات آنی شروع ہوگئیں جبتک شکایتی خطوط کا اوسط کم رہا، اسوقت تک تو جواب دیکر رفع شکایات کی کوشش کی گئی، مگر جب ان خطوط کی کثرت ہونے لگی تو روزمرّہ کی دوسری مصروفیات نے جواب سے دستکشی پر مجبور کیا۔ ایسے حضرات جنکے خطوط کا جواب نہیں دیا جا سکا، امید ہے کہ ان سطروں سے انکی شکایت رفع ہوجائیگی۔

شمسی اور قمری مہینوں کا تفاوت ہر تین سال بعد الفرقان کو قمری مہینوں کے اعتبار سے ایک ماہ لیٹ دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس معاملہ میں بار بار وضاحت کے باوجود بعض حضرات اس قصہ کی اصلیت کو سمجھ نہیں پاتے ــــ علاوہ ازیں خود ہمیں بھی یہ بات بے تکی سی معلوم ہوتی ہے کہ واقعی مطابقت تو مثلاً شوال ۷۹ھ اور اپریل ۶۰ء کی ہے، مگر الفرقان میں "رمضان ۷۹ھ مطابق اپریل ۶۰ء" لکھا جائے، اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے، تو ہر تیسرے سال اس فرق میں ایک ماہ کے فرق کا اضافہ ہوتا رہے، اسلئے پہلے بھی یہ صورت اختیار کی جاچکی ہے اور اب پھر یہی کرنا پڑ رہا ہے کہ ۲ انگریزی مہینوں کو ۳ اسلامی مہینوں کے برابر قرار دیکر یہ اشاعت "بابت رمضان، شوال و ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ مطابق اپریل و مئی ۱۹۶۰ء" کی حیثیت سے پیش کیجا رہی ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ علامتی طور پر اس اشاعت میں ۲ ماہ کی واجبی ضخامت سے چند صفحات کا اضافہ ہوجائے، مگر بوجوہ ہم اس پر قادر نہ ہوسکے۔ انشاءاللہ آئندہ شمارے میں ان صفحات کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

شمسی اور قمری مہینوں کی مطابقت درست کرنے کی اس کارروائی کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ جن حضرات کے ذمہ گذشتہ سال مثلاً جون میں چندہ واجب الادا ہوا تھا، امسال اُن سے چندہ کا مطالبہ بجائے جون کے مئی ہی میں ہوجائے گا۔ اسلئے کہ چندہ کے معاملہ میں اعتبار قمری مہینوں کا ہے، اور رسال گذشتہ جس قمری مہینے (یعنی ذیقعدہ) کا پرچہ جون میں شائع ہوا تھا، امسال وہ مئی میں شائع ہورہا ہے ــــ پس خریدار حضرات اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ چندہ کے معاملہ میں اعتبار قمری

مہینوں کا ہے ـــــ ورنہ اُلجھن پیش آئے گی۔

محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید"، گذشتہ سال جولائی ہی میں ـــــ جبکہ وہ شائع ہوئی تھی ـــــ ہمارے پاس بغرض تبصرہ موصول ہوئی تھی، بہت دنوں تک تو ہمیں پڑھنے کا موقع ہی نہ مل سکا، لیکن جب اُسکے خلاف ہنگامہ آرائی ہوئی، اور لوگوں نے اظہارِ رائے کیلئے مختلف مقامات سے لکھا، تو اُس کے لئے وقت نکالنے کی کوشش کی گئی، لیکن اتنا وقت لگ گیا کہ ہنگامہ آرائی کا شباب گذر گیا، اور وقت کا تقاضا سَرد ہو گیا ـــــ اگرچہ لوگوں کے تقاضے ختم نہیں ہوئے۔ چنانچہ باوجود قصد کے اس پر تبصرہ کئی ماہ سے ٹلتا رہا، اور تقاضا کرنے والے حضرات کو ہم "اب" اور "جب" کے وعدوں پر برابر ٹالتے رہے۔ لیکن وہ شور و شغب والے ہنگامے ختم ہونے کے بعد اب اس کتاب کا ردِّ عمل باقاعدہ کتابی شکلوں میں نکلنا شروع ہوا ہے، اور اب تک جو کتابیں اس سلسلہ کی دیکھنے میں آئی ہیں، اُن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ مستقل ایک فتنہ کا دروازہ کُھل گیا ہے جس کا نوٹس لینا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم اس شمارے میں محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب پر مفصل تبصرہ دے رہے ہیں، اور آئندہ شمارے میں انشاء اللہ اسکے بعض جوابات پر اظہارِ رائے کیا جائے گا، اور اس تبصرہ میں اگر کوئی تشنگی رہ گئی ہے، تو وہ انشاء اللہ ان جوابی کتابوں پر تبصرے میں دُور ہو جائے گی ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں حق سمجھنے اور حق کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تقریباً دو ماہ ہوتے ہیں کہ کراچی کے ایک ماہنامہ نے اپنا سالنامہ شائع کیا ہے، جس کا ایک اہم باب "مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط" ہیں۔ ان ہی خطوط میں ایک خط مولانا مودودی بنام مولانا نعمانی ہے۔ یہ خط اس اہم خط و کتابت کی ایک کڑی ہے، جو ان دونوں حضرات کے مابین جماعتِ اسلامی کے ابتدائی دور میں جماعت کے مرکز "دار الاسلام" پٹھانکوٹ کے زمانۂ قیام میں ہوئی تھی، اور بالآخر جماعت سے مولانا نعمانی مدظلہم کی علیحدگی پر منتج ہوئی۔ مولانا نعمانی مدظلہم نے جب تک دینی مصلحت سمجھی اس خط و کتابت کو خود بھی راز میں رکھا، اور فریقِ ثانی کو بھی یہی مشورہ دیا[1]۔ چنانچہ تقریباً سولہ[2] سال تک یہ خط و کتابت ایک حد تک راز ہی میں رہی۔ کوئی دو[3] سال ہوتے ہیں جب مولانا نعمانی کا موقف بدلا، اور انھوں نے ایک دینی تقاضا سمجھ کر اس راز سے اس حد تک پردہ اُٹھا دیا کہ جماعتِ اسلامی کے سلسلہ میں اپنی پوری سرگذشت بیان کرتے ہوئے اس خط و کتابت کے بعض نقاط کا ذکر اپنی سرگذشت میں کیا۔

---

[1] اس خط و کتابت کے سلسلہ میں مولانا نعمانی مدظلہم نے کبھی کوئی بات مستقلاً نہیں ظاہر فرمائی، اسلئے لوگوں نے جو باتیں بھی اس سلسلہ میں مشہور کرنا چاہیں وہ مشہور ہوتی رہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ مودودی صاحب تو اس کی اشاعت چاہتے تھے، مگر نعمانی صاحب مانع ہوتے رہے۔ آج پہلی مرتبہ یہ حقیقت ظاہر کی جا رہی ہے کہ مولانا نعمانی کی رائے اگرچہ یہی تھی کہ اسکی اشاعت مناسب نہ ہوگی، لیکن اس خط و کتابت کے چند مہینے بعد ہی مولانا مودودی نے مولانا نعمانی سے اس کی اشاعت کی اجازت چاہی تھی تو مولانا مدظلہ نے یہ لکھ کر اس کی بخوشی اجازت دے دی تھی کہ میری رائے تو وہی ہے، لیکن آپ شائع کرنا چاہتے ہیں، تو اپنی ذمہ داری پر ایسا کر سکتے ہیں، میری طرف سے اجازت ہے۔

کراچی کے ماہنامہ مذکور کے اڈیٹر صاحب نے اپنے سالنامہ کی اشاعت سے پہلے مولانا نعمانی مدظلہم کو لکھا کہ چونکہ آپ کا موقف اس خط و کتابت کے اخفا، کے سلسلہ میں بدل چکا ہے، اور آپ نے خود اپنی سرگذشت میں اسکے بعض نقاط کا ذکر فرمایا ہے اسلئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنے سالنامہ میں مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط کے ذیل میں اس کو بھی شائع کر دیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ ایک اہم خط و کتابت بھی ہے، نیز آپ کے بیان کے بعد سے لوگ اس کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لئے بیچین بھی ہیں۔

یہ ماہنامہ اور اسکے اڈیٹر صاحب بھی چونکہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، اسلئے انھوں نے مولانا کو اس خط و کتابت کی اشاعت سے اپنی دلچسپی کے بارے میں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت بھی سمجھی تھی، کہ :— ع

"ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں"

مگر — تعجب تو نہیں — افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موصوف کی اس "ناطرفداری" کی حقیقت شاعری سے زیادہ نہیں نکلی۔ انھوں نے مولانا نعمانی کا اصل خط دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے[1]، مولانا مودودی کے خط کے مقابلہ میں (بقول خود) اس کی "مستند تلخیص" دی ہے۔ ہم نے اس "مستند تلخیص" کی بابت حضرت مولانا نعمانی مدظلہم سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نہایت ہی طرفدارانہ قسم کی "تلخیص" ہے، جس میں اُن کے موقف کو بُری طرح مسخ کیا گیا ہے۔

مسخ کی حقیقت تو خود مولانا کے بیان ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے، لیکن جہاں تک "غالب کی طرفداری" کا سوال ہے، اس کی شہادت خود اس تلخیص کی تمہیدی سطریں دے رہی ہیں، تعجب ہے کہ اڈیٹر صاحب نے اپنی طرفداری کی اس عریانی کو ذرا بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

ہم نے حضرت مولانا سے گذارش کی تھی کہ وہ ایک بیان کے ذریعہ اپنے خط کے اصل حقیقت کو واضح فرما دیں، مگر اپنی سرگذشت کی اشاعت اور اسکے بعد کی بعض وضاحتوں کے سلسلہ میں ان ناطرفدار حضرات کے مزاج کا جو تجربہ ہو چکا تھا اسکے پیش نظر موصوف نے کسی دوسرے تجربے سے معذوری ظاہر کی۔ تاہم راقم کی خواہش پر مولانا نے اس سلسلہ میں جو حقیقت واقعہ بیان فرمائی ہے، وہ اُن لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہاں درج کیجا رہی ہے جن کے خطوط مذکورہ سالنامہ کی اشاعت کے بعد سے راقم کو موصول ہوتے رہے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے مولانا نے اس "تلخیص" کو تلخیص نام دینے اور اس کی استنادی بنیاد کے بارے میں سوال اُٹھایا کہ جب ایک شخص کو اعتراف ہے کہ اصل خط اسکے سامنے نہیں ہے، تو آخر تلخیص کس چیز کی کی گئی ہے؟ اگر سُنی سُنائی باتوں یا مولانا مودودی کے جواب کی روشنی میں محض ذہانت سے یہ خلاصہ تیار کیا گیا ہے، تو اولاً تو اسکو "تلخیص" کا نام دینا فریب آمیزی ہے۔ دوم یہ کہ بغیر صاحب خط کی تصدیق کے یہ مستند کیسے ہو گئی؟

---

[1] اس خط کی نقل موصوف نے حضرت مولانا نعمانی سے بھی مانگی تھی، مگر مولانا نے یہ جواب دے دیا تھا، کہ :— لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں کئی بار انتقالِ مکانی کے سلسلے میں اس طرح کے اہم خطوط کا ایک پورا پیکٹ کہیں نظر سے مخفی ہو گیا ہے، اسلئے معذوری ہے۔

۲۔ کوئی بھی وہ شخص جس نے میرا خط پڑھا ہوتا اس پیرایۂ "تلخیص" کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جس سے کاتب کا اپنے بارے میں زعم و پندار اور مکتوب الیہ کی انتہائی تحقیر و تذلیل ٹپک رہی ہو۔

۳۔ خط کا اصل نقطہ اور بے اطمینانی کی اصل بنیاد اور پھر جماعت سے علیحدگی کی بنیاد صرف ایک بھی جسے تحریر میں لانا مناسب بھی نہیں تھا، علاوہ ازیں اس کی تفصیل مولانا مودودی کے علم میں بھی اس لیے اپنی مشکل ظاہر کرنے کے لیے نہایت مبہم الفاظ میں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا تھا۔ باقی جتنی باتیں اس تحریر میں آئی تھیں وہ سب اس تصریح کے ساتھ کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ مجھے بے تکلفی کے ساتھ کچھ کہنے کا موقع نہ ملے اسلیے بعض ضروری باتوں کی طرف اسی موقع پر اور توجہ دلاتا ہوں۔ اور ان کا پیرایۂ اظہار بھی ہرگز ہرگز تحقیر و تنقیص آمیز نہیں تھا بلکہ اس وقت کے خصوصی روابط کے مطابق معتمدانہ عبارت اور دوستانہ بے تکلفی کا!

ماہنامۂ مذکور کے مرتب صاحب نے اپنی مذکورہ "تلخیص" کی تمہیدی سطروں میں ایک چھینٹا یہ بھی اڑایا ہو کہ "مولانا منظور نعمانی صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جن کو (جماعت کے فیصلہ کے مطابق) اس مرکز (دارالاسلام) میں منتقل ہونا تھا۔ مولانا مودودی صاحب اس فیصلہ کے فوراً بعد دارالاسلام منتقل ہو گئے لیکن مولانا منظور صاحب نے منتقل کے بجائے صرف چند دن کے لیے مرکز میں قیام کیا" اتفاق سے راقم سطور بھی اس سفر میں مولانا مدظلہ کے ساتھ تھا اور اسوقت عمر کا سولھواں سال تھا جمعہ کا وہ دن اور اس دن کا وہ سماں آجتک اس کے حافظہ پر نقش ہو جب اسکے والدین نماز جمعہ کے معاً بعد بریلی کے اہل محلہ سے دو طرفہ آنسوؤں کے رقت انگیز منظر کے ساتھ بریلی کو گویا کہ ہمیشہ کیلیے چھوڑنے کا فیصلہ کر کے رخصت ہو رہے تھے[1] اس سلسلہ کی مزید تفصیل حضرت مولانا سے دریافت کرنے پر یہ معلوم ہوئی کہ روانگی اس حال میں ہوئی تھی کہ گھر کا قابل ذکر جتنی سامان فروخت کر دیا گیا تھا بہت سی چیزیں۔ فروخت کرنے کی نہیں تھیں ہمسایوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ کتب خانہ الفرقان کا اسٹاک بیل کر رکھدیا گیا تھا کہ عند الطلب فوراً روانہ ہو سکے۔

مدت قیام دارالاسلام کے بارے میں بھی میری یاد داشت نے مرتب صاحب کے بیان کی تردید کی احتیاطاً حضرت مولانا سے بھی رجوع کیا تو مولانا نے اچھی طرح حساب لگا کر بتایا کہ مدت قیام کسی طرح بھی ہفتے سے کم نہ تھی۔

---

[1] واضح رہے کہ والدۂ ماجدہ مرحومہ کیلیے اولاً کچھ دن وطن میں قیام کا فیصلہ ہوا تھا اس لیے وہ بریلی سے رخصت ہو کر وطن تشریف لے گئی تھیں۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

وضو اور اس کے برکات:-

[اس عنوان کے تحت چند حدیثیں پہلے درج ہو چکی ہیں باقی آج درج ہو رہی ہیں۔]

(۱۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَا یَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَایَا وَیَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَی الْمَكَارِهِ وَكَثْرَةُ الْخُطَا اِلَی الْمَسَاجِدِ وَانْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ ——— رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا میں تم کو وہ اعمال بتاؤں جن کی برکت سے اللہ گناہوں کو مٹاتا ہے اور درجے بلند فرماتا ہے؟ حاضرین صحابہ نے عرض کیا حضرت! ضرور بتلائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ (۱) تکلیف اور ناگواری کے باوجود پوری طرح کامل وضو کرنا۔ (۲) اور مسجدوں کی طرف قدم زیادہ پڑنا (۳) اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا، پس یہی ہے حقیقی رباط یہی ہے اصلی رباط۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین عملوں کی ترغیب دی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ان اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور درجوں میں ترقی ہوتی ہے، ایک یہ کہ وضو کرنے

ہیں اگر کسی وجہ سے تکلیف اور مشقت ہو تو اس کے باوجود وضو پورا پورا کیا جائے اور اس میں خلاف سنّت اختصار سے کام نہ لیا جائے۔ مثلاً سردی کا موسم ہو اور پانی ٹھنڈا ہو، یا پانی کم ہے جو پورا وضو سنّت کے مطابق کرنے اور ہر عضو کو تین تین دفعہ دھونے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ ایسا کرنے کے لیے پانی کچھ دور چل کر لانا پڑتا ہے تو ایسی صورتوں میں تکلیف اور مشقت اُٹھا کر سنت کے مطابق کامل وضو کرنا ایسا محبوب عمل ہے جس کی برکت سے بندے کو گناہوں سے پاک صاف کر دیا جاتا ہے اور اس کے درجے بلند کر دیے جاتے ہیں ـــــــ دوسرا عمل آپ نے بتایا "مسجد کی طرف قدموں کا زیادہ پڑنا" یعنی مسجد سے زیادہ تعلق رکھنا اور نماز کے لیے بار بار مسجد کی طرف جانا، اور ظاہر ہے کہ جس کا مکان مسجد سے جتنے زیادہ فاصلہ پر ہوگا اس کا حصہ اس سعادت میں اُسی حساب سے زیادہ ہوگا ـــــ اور تیسرا عمل آپ نے بتایا "ایک نماز ادا کرنے کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا اور دل کا اسی میں لگا رہنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندہ کا ہوگا جس کے دل کو نماز سے چین و سکون ملتا ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ" والی کیفیت کا کوئی ذرّہ جس کو نصیب ہوگا۔

حدیث کے آخر میں آپ نے فرمایا: "یہی حقیقی رباط ہے یہی اصلی رباط ہے" ـــــ رباط کے معروف معنی اسلامی سرحد پر پڑاؤ کے ہیں۔ دشمن کے حملہ سے حفاظت کے لیے جو مجاہدین سرحد پر متعین کر دیے جاتے ہیں ان کے وہاں پڑاؤ کو رباط کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بڑا عظیم الشان عمل ہے جس میں ہر وقت جان خطرہ میں رہتی ہے ـــــ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین اعمال کو غالباً اس لحاظ سے "رباط" فرمایا ہے کہ ان تینوں عملوں کا اہتمام شیطان کی غارتگری سے حفاظت کی بڑی محکم تدبیر ہے اور شیطانی حملوں سے اپنے ایمانوں کی حفاظت مقصدی لحاظ سے ملکی سرحدات کی حفاظت سے بھی اہم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱۹) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ خَيْرَ اَعْمَالِكُمُ الصَّلٰوةُ وَلَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوْءِ اِلَّا مُؤْمِنٌ ـــــــ رواہ مالک واحمد وابن ماجہ والدارمی

(ترجمہ) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ٹھیک ٹھیک چلو، صراط مستقیم پر قائم رہو، (لیکن چونکہ یہ استقامت بہت مشکل ہے اس لیے) تم اس پر پورا قابو ہرگز نہ پاسکوگے (لہٰذا ہمیشہ اپنے کو قصوروار اور خطاکار بھی سمجھتے رہو) اور اچھی طرح جان لو کہ تمہارے سارے اعمال میں سب سے بہتر عمل نماز ہے۔ (اس لیے اس کا سب سے زیادہ اہتمام کرو) اور وضو کی پوری پوری نگہداشت بس بندۂ مومن ہی کرسکتا ہے۔

(موطا امام مالک، مسند احمد، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(**تشریح**) وضو کی محافظت و نگہداشت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیشہ سنت کے مطابق اور آداب کی رعایت کے ساتھ کامل وضو کیا جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بندہ برابر باوضو رہے۔ شارحین نے یہ دونوں ہی مطلب بیان کیے ہیں۔ اور اس عاجز کے نزدیک محافظت کا لفظ ان دونوں ہی باتوں کو شامل ہے۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں "محافظت علی الوضوء" کو کمال ایمان کی نشانی اور اہل ایمان و یقین کا عمل بتایا ہے۔

(۲۰) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ عَلٰى طُهْرٍ كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ ـــــ رواہ الترمذی

(**ترجمہ**) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے طہارت کے باوجود (یعنی باوضو ہونے کے باوجود تازہ) وضو کیا اُس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی ـــــــــــ (جامع ترمذی)

(**تشریح**) اس ارشاد کا مقصد بظاہر یہ واضح کرنا ہے کہ باوضو ہونے کی حالت میں تازہ وضو کرنے کو فضول و عبث نہ سمجھا جائے، بلکہ یہ ایسی شئی ہے جس کے کرنے والے کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ پہلے وضو سے کوئی ایسی عبادت کرلی گئی ہو جس کے لیے وضو ضروری ہے، اس لیے اگر کسی نے وضو کیا اور ابھی وضو سے کوئی عبادت ادا نہیں کی اور نہ کوئی ایسا کام کیا جس کے بعد وضو کی تجدید مستحب ہوجاتی ہے تو ایسی صورت میں اس کو تازہ وضو نہیں کرنا چاہیے۔

ناقص وضو کرنے کے بُرے اثرات :-

(۲۱) عَنْ شُبَيْبِ بْنِ أَبِي رَوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى صَلٰوةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّوْمَ فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلّٰى قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ وَإِنَّمَا يُلَبِّسُ عَلَيْنَا الْقُرْاٰنَ أُولٰئِكَ۔

—————— رواہ النسائی

(ترجمہ) شُبیب بن ابی روح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کی ہو کہ حضور نے ایک دن فجر کی نماز پڑھی اور اس میں آپ نے سورۂ روم شروع کی تو آپ کو اس میں اشتباہ ہوگیا اور خلل پڑگیا، جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا بعض لوگوں کی یہ کیا حالت ہو کہ ہمارے ساتھ نماز میں شریک ہو جاتے ہیں اور طہارت (وضو وغیرہ) اچھی طرح نہیں کرتے، بس یہی لوگ ہمارے قرآن پڑھنے میں خلل ڈالتے ہیں۔

—————— (سنن نسائی)

(تشریح) معلوم ہوا کہ وضو وغیرہ طہارت اچھی طرح نہ کرنے کے برے اثرات دوسرے صاف قلوب پر بھی پڑتے ہیں اور پڑتے ہیں کہ ان کی وجہ سے قرآن مجید کی قرأت میں گڑبڑ ہو جاتی ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک و مطہر دوسرے لوگوں کی اس طرح کی کوتاہیوں سے اتنا متاثر ہوتا تھا تو پھر ہم عوام کس شمار و قطار میں ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے قلوب پر زنگ کی تہیں کی تہیں جم گئی ہیں اس لیے ہم کو ان چیزوں کا احساس نہیں ہوتا ـــــ اس حدیث سے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسانوں کے قلوب پر ساتھ والوں کی اچھی یا بُری کیفیات کا کس قدر اثر پڑتا ہے، اصحاب قلوب صوفیائے کرام نے اس حقیقت کو خوب سمجھا ہے۔

مسواک :-

طہارت و نظافت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں پر خاص

طور سے زور دیا ہو اور بڑی تاکید فرمائی ہو۔ ان میں سے ایک مسواک بھی ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ میری اُمت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنا ان پر لازم کر دیتا ــــــ مسواک کے جو طبی فوائد ہیں اور بہت سے امراض سے اس کی وجہ سے جو تحفظ ہوتا ہو آج کل کا ہر صاحب شعور اس سے کچھ نہ کچھ واقف ہو۔ لیکن دینی نقطۂ نگاہ سے اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ راضی کرنے والا عمل ہے۔ ــــ اس مختصر تمہید کے بعد مسواک کی ترغیب و تاکید کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات پڑھیے!

(۲۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وَسَلَّمَ "اَلسِّوَاكُ مُطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ" ــــــ رواه الشافعي واحمد والدارمي والنسائي و روى البخاري في صحيحه بلا اسناد۔

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مسواک منہ کو بہت زیادہ پاک صاف کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ خوش کرنے والی چیز ہے" ــــــ (مسند امام شافعی، مسند احمد، سنن دارمی، سنن نسائی۔ نیز صحیح بخاری میں امام بخاری نے بھی اس حدیث کو بلا اسناد یعنی تعلیقاً روایت کیا ہے۔)

(تشریح) کسی چیز میں حسن کے دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ حیاۃ دنیا کے لحاظ سے فائدہ مند اور عام انسانوں کے نزدیک پسندیدہ ہو، اور دوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبوب اور اجر اُخروی کا وسیلہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بتلایا ہے کہ مسواک میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں۔ اس سے منہ کی صفائی ہوتی ہے، گندے اور مضر مادے خارج ہو جاتے ہیں منہ کی بدبو زائل ہو جاتی ہے، یہ اس کے نقد دنیوی فوائد ہیں۔ اور دوسرا اُخروی اور ابدی نفع اس کا یہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونے کا بھی خاص وسیلہ ہے۔

(۲۳) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ ــ رواه البخاري

ومسلم، واللفظ لمسلم،

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری اُمت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حتمی امر کرتا" ــــ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مسواک کی محبوبیت اور اس کے عظیم فوائد دیکھتے ہوئے میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے ہر اُمتی کے لیے حکم جاری کر دوں کہ وہ ہر نماز کے وقت مسواک ضرور کیا کرے۔ لیکن ایسا حکم میں نے صرف اس خیال سے نہیں دیا کہ اس سے میری اُمت پر بہت بوجھ پڑ جائے گا اور ہر ایک کے لیے اس کی پابندی مشکل ہوگی ــــ غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی ترغیب و تاکید کا ایک عنوان ہے اور بلاشبہ بڑا مؤثر عنوان ہے۔

(فائدہ) اسی حدیث کی بعض روایات میں "عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ" کے بجائے "عِنْدَ كُلِّ وُضُوْءٍ" بھی وارد ہوا ہے[1]۔ اور مطلب دونوں کا قریب قریب ایک ہی ہے۔

(۲۴) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا جَاءَنِیْ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَطُّ اِلَّا اَمَرَنِیْ بِالسِّوَاكِ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ اُحْفِیَ مُقَدَّمَ فِیَّ ــــــــ رواہ احمد

(ترجمہ) حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے فرشتے جبرئیل جب بھی میرے پاس آئے ہر دفعہ انھوں نے مجھے مسواک کے لیے ضرور کہا، خطرہ ہے کہ (جبرئیل کی بار بار کی اس تاکید اور وصیت کی وجہ سے) میں اپنے منھ کے اگلے حصہ کو مسواک کرتے کرتے گھس نہ ڈالوں۔

(تشریح) مسواک کے بارہ میں حضرت جبرئیل کی بار بار یہ تاکید و وصیت دراصل اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے تھی اور اس کا خاص راز یہ تھا کہ جو ہستی اللہ تعالیٰ سے مخاطبہ اور مناجات میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہو اور اللہ کا فرشتہ جس کے پاس بار بار آتا ہو اور اللہ کے کلام کی تلاوت اور اس کی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم، باب السواک الرطب والیابس للصائم۔

طرف دعوت جس کا خاص وظیفہ ہو اُس کے لیے خاص طور سے ضروری ہے کہ وہ مسواک کا بہت زیادہ اہتمام کرے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔

(۲۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْقُدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ فَيَسْتَيْقِظُ إِلَّا يَتَسَوَّكُ قَبْلَ أَنْ يَتَوَضَّأَ ۔ (رواہ احمد و ابو داؤد)

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ دن یا رات میں جب بھی آپ سوتے تو اٹھنے کے بعد وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے۔ (مسند احمد، سنن ابی داؤد)

(۲۶) عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ ۔ (رواہ البخاری و مسلم)

(ترجمہ) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب رات کو آپ تہجد کے لیے اُٹھتے تو مسواک سے اپنے دہن مبارک کی خوب صفائی کرتے (اس کے بعد وضو فرماتے اور تہجد میں مشغول ہوتے)۔ (صحیح بخاری و مسلم)

(۲۷) عَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِئٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ بِأَيِّ شَيْءٍ كَانَ يَبْدَأُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ قَالَتْ بِالسِّوَاكِ ۔ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) شریح بن ہانی سے روایت ہو کہ میں نے اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر سے گھر میں تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے آپ مسواک فرماتے تھے۔

(تشریح) ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نیند سے جاگنے کے بعد، خاصکر رات کو تہجد کے لیے اٹھنے کے وقت پابندی اور اہتمام سے مسواک فرماتے تھے، اس کے

علاوہ باہر سے جب گھر میں تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے مسواک فرماتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسواک صرف وضو کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ سو کر اٹھنے کے بعد اور مسواک کیے زیادہ دیر گزرنے کے بعد اگر وضو کرنا نہ بھی ہو جب بھی مسواک کر لینی چاہیے ——— ہمارے علمائے کرام نے ان ہی احادیث کی بنا پر لکھا ہے کہ مسواک کرنا یوں تو ہر وقت میں مستحب اور باعث اجر و ثواب ہے لیکن پانچ موقعوں پر مسواک کی اہمیت زیادہ ہے ——— وضو میں، نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت (اگر وضو اور نماز کے درمیان زیادہ فصل ہو گیا ہو) اور قرآن مجید کی تلاوت کے لیے، اور سو کر اٹھنے کے وقت اور منہ میں بدبو پیدا ہو جانے، یا دانتوں کے رنگ میں تغیر آ جانے کے وقت ان کی صفائی کے لیے۔

(۲۸) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ اَلْحَیَاءُ وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاکُ وَالنِّکَاحُ۔

——— رواہ الترمذی

(ترجمہ) حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار چیزیں پیغمبروں کی سنتوں میں سے ہیں، ایک حیا، دوسرے خوشبو لگانا، تیسرے مسواک کرنا اور چوتھے نکاح کرنا۔ ——— (جامع ترمذی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ بتلا کر کہ یہ چاروں چیزیں اللہ کے پیغمبروں کی سنتیں اور ان کے معمولات میں سے ہیں اپنی امت کو ان کی ترغیب دی ہے اور بلاشبہ یہ بڑی مؤثر ترغیب ہے ——— حیا کے بارہ میں کتاب الاخلاق میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے نکاح کے بارہ میں انشاء اللہ کتاب النکاح میں لکھا جائے گا۔ تعطر یعنی خوشبو لگانا بڑی محبوب صفت ہے، انسان کے روحانی اور ملکوتی تقاضوں میں سے ہے۔ اس سے روح اور قلب کو ایک خاص نشاط حاصل ہوتی ہے، عبادت میں کیف اور ذوق پیدا ہوتا ہے اور اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی راحت پہونچتی ہے۔ اس لیے تمام انبیاء علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے سارے اچھے بندوں کی محبوب سنت ہے۔

(۲۹) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَۃِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْیَۃِ وَالسِّوَاکُ وَ

اِسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْاَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الْاِبِطِ وَ
حَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ، قَالَ زَكَرِيَّا قَالَ مُصْعَبُ وَ نَسِيْتُ
الْعَاشِرَةَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةُ ــــــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــ دس چیزیں ہیں جو امورِ فطرت میں سے ہیں۔ مونچھوں کا ترشوانا، داڑھی کا چھوڑنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی لے کر اس کی صفائی کرنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے جوڑوں کو (جن میں اکثر میل کچیل رہ جاتا ہے) اہتمام سے دھونا، بغل کے بال لینا، موئے زیر ناف کی صفائی کرنا، اور پانی سے استنجا کرنا ـــ حدیث کے راوی زکریا کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ مصعب نے بس یہی نو چیزیں ذکر کیں اور فرمایا کہ دسویں چیز بھول گیا ہوں، اور میرا گمان یہی ہے کہ وہ کُلّی کرنا ہے ــــ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں ان دس چیزوں کو "مِنَ الْفِطْرَةِ" یعنی امورِ فطرت میں سے کہا گیا ہے۔ بعض شارحینِ حدیث کی رائے یہ ہے کہ الفطرۃ سے مراد یہاں سنّتِ انبیاء یعنی پیغمبروں کا طریقہ ہے، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اسی حدیث کے مستخرج ابی عوانہ کی روایت میں فطرۃ کی جگہ سنت کا لفظ ہے، یعنی اس میں "عَشْرٌ مِنَ الفطرۃ" کے بجائے "عَشْرٌ مِنَ السنۃ" کے الفاظ ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کو الفطرہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے ـــ اس تشریح کی بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام نے جس طریقہ پر خود زندگی گزاری اور اپنی اپنی امتوں کو جس پر چلنے کی ہدایت کی اُس میں یہ دس باتیں شامل تھیں۔ گویا یہ دس چیزیں انبیاء علیہم السلام کی متفقہ تعلیم اور اُن کے مشترکہ معمولات سے ہی ہیں۔

بعض شارحین نے الفطرۃ سے دین فطرت یعنی دین اسلام مراد لیا ہے، قرآن مجید میں دین کو فطرت کہا گیا ہے، ارشاد ہے۔ "فَاَقِمْ[1] وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ

---

[1] پس سیدھا کرو اپنا رُخ سب طرف سے یکسو ہو کر دین حق کی طرف، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا، اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی نہیں، یہ دین ہے سیدھا پکا۔

عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ (الروم ع ۴) اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دس چیزیں دینِ فطرت یعنی اسلام کے اجزاء یا احکام میں سے ہیں۔

اور بعض شارحین نے الفطرۃ سے انسان کی اصل فطرت و جبلت ہی مراد لی ہے اس تشریح کی بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دس چیزیں انسان کی اس اصل فطرت کا تقاضا ہیں جو اللہ نے اُس کی بنائی ہے۔ گویا جس طرح انسان کی اصل فطرت یہ ہے کہ وہ ایمان اور نیکی اور طہارت و پاکیزگی کو پسند کرتا ہے، اور کفر اور فواحش و منکرات اور گندگی و ناپاکی کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح مذکورۂ بالا دس چیزیں ایسی ہیں کہ انسانی فطرت (اگر کسی خارجی اثر سے ماؤف اور فاسد نہ ہو چکی ہو) تو ان کو پسند ہی کرتی ہے اور حقیقت شناسوں کو یہ بات معلوم اور مسلّم ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو دین اور زندگی کا طریقہ لے کر آتے ہیں وہ در اصل انسانی فطرت کے تقاضوں ہی کی مستند اور منضبط تشریح ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ حدیث کے لفظ الفطرۃ کا مطلب خواہ سنتِ انبیاء ہو، خواہ دینِ فطرت اسلام ہو، اور خواہ انسان کی اصل فطرت و جبلت ہو، حدیث کا مدعا تینوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ یہ دس چیزیں انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے اُس متفقہ طریقۂ زندگی اور اس دین کے اجزاء و احکام میں سے ہیں جو در اصل انسان کی اصل فطرت و جبلت کا تقاضا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے خاص حکیمانہ طرز پر اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے جو چند سطریں لکھی ہیں ان کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ــــ فرماتے ہیں۔

"یہ دس عملی باتیں جو در اصل طہارت و نظافت کے باب سے تعلق رکھتی ہیں ملّتِ حنفیہ کے مؤسس و مورث حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ اور راہِ ابراہیمی طریقہ پر چلنے والی حنیفی اُمتوں میں عام طور سے ان کا رواج رہا ہے۔ اور ان پر ان کا عقیدہ بھی رہا ہے۔ قرنہا قرن تک وہ ان اعمال کی پابندی کرتے ہوئے جیتے اور مرتے رہے ہیں، اسی لیے ان کو فطرت کہا گیا ہے اور یہ ملّتِ حنیفی کے شعائر ہیں ــــ اور ہر ملت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ مقرر و معلوم شعائر ہوں اور وہ ایسے علانیہ ہوں جن سے اُس ملت والوں کو پہچانا جا سکے اور ان میں کوتاہی کرنے پر

ان سے مواخذہ کیا جاسکے تاکہ اس طرح کی فرمانبرداری اور نافرمانی احساس اور مشاہدہ کی گرفت میں آسکے، اور یہ بھی تریں حکمت ہے کہ شعائر ایسی چیزیں ہوں۔ جو نادر الوقوع نہ ہوں اور ان میں معتد بہ فوائد ہوں، اور لوگوں کے ذہن ان کو پوری طرح قبول کریں۔ اور ان دسؔ چیزوں میں یہ باتیں موجود ہیں ـــــ اس کے سمجھنے کے لیے ان چند باتوں پر غور کرنا چاہیے!

جسم انسانی کے بعض حصّوں میں پیدا ہونے والے بالوں کے بڑھنے سے پاکیزگی پسند اور لطیف مزاج آدمی کی سلیم فطرت اسی طرح منقبض اور مکدّر ہوتی ہے جس طرح کہ حدث سے یعنی کسی گندگی کے جسم سے خارج ہونے سے ہوا کرتی ہے۔ بغل میں اور ناف کے نیچے پیدا ہونے والے بالوں کا حال یہی ہے، اسی لیے ان کی صفائی سے سلیم الفطرت آدمی اپنے قلب و روح میں ایک نشاط و انشراح کی کیفیت محسوس کرتا ہے جیسے کہ یہ اس کی فطرت کا خاص تقاضا ہے۔ اور بالکل یہی حال ناخنوں کا بھی ہے ـــــ اور ڈاڑھی کی نوعیت یہ ہے کہ اس سے چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہوتی ہے اور وہ مردوں کے لیے شرف اور جمال ہے اور اُسی سے ان کی مردانہ ہیئت کی تکمیل ہوتی ہے، اور وہ سنّت انبیاء ہے اس لیے اُس کا رکھنا ضروری ہے[1]۔ اور اس کا صاف کرانا مجوس و ہنود وغیرہ اکثر غیر مسلم قوموں کا طریقہ ہے ـــــ نیز چونکہ بازاری قسم کے اور نیچی سطح کے لوگ عموماً ڈاڑھیاں نہیں رکھتے ہیں اس لیے ڈاڑھیاں نہ رکھنا گویا اپنے کو اُن ہی کی صفوں میں شامل کرنا ہے۔

اور مونچھوں کے بڑھانے اور لمبا رکھنے میں کھُلا ہوا ضرر یہ ہے کہ منھ تک بڑھی ہوئی ہوئی مونچھوں میں کھانے پینے کی چیزیں لگ جاتی ہیں اور ناک سے خارج ہونے والی رطوبت کا راستہ بھی وہی ہے اس لیے صفائی اور پاکیزگی کا تقاضا یہی ہے کہ

---

[1] دوسری مستند حدیثوں میں صاف صریح الفاظ میں ڈاڑھی رکھنے کا حکم بصیغۂ امر بھی وارد ہوا ہے جس سے فقہاء امت نے عام طور سے وجوب سمجھا ہے، لیکن کسی حدیث میں مقدار کی صراحت نہیں ہے، فقہاء کرام نے مختلف قرائن و شواہد سے یہ سمجھا ہے کہ ایک مشت کے بقدر رکھنا واجب ہے ۱۲۔

مونچھیں زیادہ بڑی نہ ہونے پائیں، اس واسطے مونچھوں کے ترشوانے کا حکم دیا گیا ہے۔
اور کُلّی اور پانی کے ذریعہ ناک کی صفائی، اور مسواک، اور پانی سے استنجا اور اہتمام
سے انگلیوں کے اُن جوڑوں کو دھونا جن میں میل کچیل رہ جاتی ہے، صفائی اور پاکیزگی
کے نقطۂ نظر سے ان سب چیزوں کی ضرورت و اہمیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں"
بعض اکابر علماء نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے یہ اصول معلوم ہوگیا کہ جسم کی صفائی اور اپنی ہئیت
اور صورت کی درستی اور ایسی ہر چیز کا ازالہ اور اس سے اجتناب جس سے گھن آئے اور کراہت پیدا
ہو احکام فطرت میں سے ہے اور طریقۂ انبیاء ہے ـــ اللہ تعالیٰ نے صورت کی تحسین کو اپنا خاص انعام و
احسان تبلایا ہے" وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ"

، اس حدیث کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان کے بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ
نے روایت کیا ہے۔ ان سے روایت کرنے والے طلق بن حبیب ہیں اور اُن سے روایت کرنے والے
مصعب بن شیبہ ہیں۔ ان کے شاگرد زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ انہی زکریا نے اپنے شیخ مصعب سے یہ
حدیث روایت کی ہے جس میں انھوں نے دس چیزوں میں سے نَو کو تو وثوق سے ذکر کیا اور دسویں کے
متعلق تبلایا کہ وہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہی البتہ میرا خیال ہے کہ وہ مضمضہ (کُلّی) کرنا تھا۔

(۳۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
تَفْضُلُ الصَّلٰوةُ الَّتِيْ يُسْتَاكُ لَهَا عَلَى الصَّلٰوةِ الَّتِيْ لَا يُسْتَاكُ لَهَا
سَبْعِيْنَ ضِعْفًا ـــــــــــ رواه البیہقی فی شعب الایمان

(**ترجمہ**) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلہ میں جو بلا
مسواک کے پڑھی جائے ستر گنی فضیلت رکھتی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(**تشریح**) پہلے بھی بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان اور محاورہ میں ستر (اور اسی
طرح بعض اور عدد بھی) مطلق کثرت اور بہتات کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ غالباً اس حدیث میں
بھی سبعین کا لفظ اس محاورہ کے مطابق کثرت اور بہتات ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر حدیث
کا مطلب یہ ہوگا کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی جائے وہ اس نماز کے مقابلہ میں جو بلا مسواک کے

پڑھی جائے بدرجہا اور بہت زیادہ افضل ہے۔ اور اگر سبعین سے مراد ستر کا خاص عدد ہو جب بھی کوئی استبعاد کی بات نہیں ہے۔

جب کوئی بندہ مالک الملک اور احکم الحاکمین کے دربار عالی کی حاضری اور نماز کے ذریعہ اس سے مخاطبت و مناجات کا ارادہ کرے اور یہ سمجھے کہ اس کی عظمت و کبریائی کا حق تو یہ ہے کہ مشک و گلاب سے اپنے دہن و زبان کو دھو کے اس کا نام نامی لیا جائے اور اس کے حضور میں کچھ عرض کیا جائے لیکن چونکہ اس مالک نے اپنی عنایت و رحمت سے صرف مسواک ہی کا حکم دیا ہے اس لیے میں مسواک کرتا ہوں۔ بہرحال جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اس احساس اور ادب کے اس جذبہ سے نماز کے لیے مسواک کرے تو وہ نماز اگر اس نماز کے مقابلہ میں جس کے لیے مسواک نہ کی گئی ہو ستر یا اس سے بھی زیادہ درجے افضل قرار دی جائے تو بالکل حق ہے۔ حقیقت تو یہ ہو

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

(**فائدہ**) مشکوٰۃ المصابیح میں حضرت عائشہ کی یہ حدیث صرف بیہقی کے حوالے سے نقل کی گئی ہو لیکن منذری نے ترغیب میں اس حدیث کو حضرت عائشہ ہی کی روایت سے خفیف لفظی فرق کے ساتھ درج کر کے لکھا ہے۔ رواہ احمد والبزار وابو یعلی وابن خزیمہ فی صحیحہ..... ورواہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد — اور قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث ابونعیم کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے اور دوسری حضرت جابر کی روایت سے نقل کی ہے اور پہلی کی سند کو جید اور دوسری کی سند کو صحیح کہا ہے۔

تجلّیاتِ مجدّدِ الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(از۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۱۳۸) شیخ بہاءالدین سرہندی کے نام :۔

(مذمّتِ دنیا میں)

فرزند ارشد! اس مبغوضہ دنیا سے خوش نہ ہوں، اور جنابِ قدس میں دوام توجہ کے سرمایے کو ہاتھ سے نہ دیں ـــــ (انسان کو) اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ کیا چیز فروخت کر رہا ہے، اور کیا خرید رہا ہے ـــــ آخرت کو دُنیا کا عوض قرار دینا، اور حق تعالیٰ سے روگردانی کرکے مخلوق میں پھنس جانا، اوّل نمبر کی بیوقوفی کی بات ہے ـــــ دنیا اور آخرت کا جمع کرنا، جمعِ اضداد کے قبیل سے ہے ...... ان دونوں ضدوں میں سے جس کسی ایک کو چاہے اختیار کرلے ...... (اگر خوب سمجھ لے کہ) عذابِ آخرت ابدی ہے، اور متاعِ دنیا قلیل ہے ـــــ دنیا مبغوضۂ حق تعالیٰ ہے اور آخرت، اللہ کی پسندیدہ ہے ـــــ ؎

عش ماشئت فانك میت

والزم ماشئت فانك مفارقه

(زندہ رہ جتنا چاہے ـــ تجھے موت ضرور آنی ہے ـــ جس چیز کو جی چاہے اُس کو لازم پکڑلے ـــ تجھ کو اُس چیز سے مفارقت ضروری ہے) ـــــ

زن و فرزند کے فکر کو چھوڑ کر اُن کی تدبیر و کارسازی کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا چاہئے، خود کو مُردہ تصوّر کرنا

اور تمام امور کو اللہ کے حوالے کرنا چاہئے ـــــ ان من ازواجکم واولادکم عدواً لکم فاحذروھم ـــــ نص قاطع ہے ـــــ اس کو کئی مرتبہ سُنا ہوگا ـــــ خوابِ خرگوش کب تک ؟ ـــــ ہوش میں آنا ضروری ہے ـــــ اہلِ دنیا کی صحبت اور اُن سے اختلاط، سمِ قاتل ہے ـــــ اس سمِ قاتل کا مارا ہوا موتِ ابدی میں گرفتار رہے گا ...... اُمراء کے دسترخوان کا لقمۂ چرب، مرضِ قلبی کو بڑھاتا ہے ـــــ الحذر، الحذر، الحذر ـــــ ـــــ

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

اہلِ دنیا کی صحبت سے اس سے بھی زیادہ بھاگو، جتنا شیر سے بھاگتے ہو، اسلئے کہ شیر پھاڑے گا تو زیادہ سے زیادہ موتِ دنیوی واقع ہوجائے گی جو آخرت میں مفید ہے۔ لیکن اختلاطِ ملوک، ہلاکِ ابدی اور خسارۂ سرمدی کا باعث ہے ـــــ اُن کی صحبت سے بچو، اُن کے لقمے سے پرہیز کرو ان کی محبت اور ان کی رویت سے حذر کرو ...... بات جو اتنے اہتمام سے کہی جارہی ہے، وہ اس بناء پر ہے، کہ میں جانتا ہوں کہ لقمۂ چرب اور صحبتِ ناجنس نے آن فرزند کے دل کو وعظ و نصیحت کے سمجھنے سے دُور کر دیا ہوگا، وہ صرف ایک یا دو باتوں سے متأثر نہ ہوگا ـــــ مکرر الحذر، الحذر، اُمراء کی صحبت سے، اور الحذر، الحذر ان کی رویت سے ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو اُس بات سے محفوظ رکھے جس سے ہمارا اور تمہارا رب راضی نہ ہو ـــــ بحرمۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۱۳۹) جعفر بیگ کے نام : ـــــ

(جو لوگ اہل اللہ پر طعن کرتے ہیں، اُنکی ہجو و مذمت کرنا شرعاً جائز ہے)

التفات نامۂ گرامی نے مشرف کیا ـــــ اللہ تم کو سلامت رکھے کہ احوالِ فقراء کا خیال رکھتے ہو اور حضور و غیبت کو یکساں سمجھتے ہو۔

مخدوما! ـــــ کفارِ قریش نے جب اپنی انتہائی بدبختی کے باعث، اہلِ اسلام کی ہجو و مذمت میں مبالغہ کیا، تو حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض شعرائے اسلام کو حکم دیا کہ کفارِ نگونسار کی ہجو کریں۔ (چنانچہ کفار کی مذمت کرنے والے) وہ شاعر (حضرت حسانؓ) آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو منبر پر بیٹھتے تھے، اور کفار کی ہجو میں برملا اشعار پڑھتے تھے ـــــ آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے تھے کہ روح القدس ان کے ساتھ ہے، جب تک یہ ہجو کفار کریں ـــــ ملامت وایذائے خلق، "مقتضیات عشق" سے ہیں ـــ اے اللہ! ہم کو اہلِ عشق سے بنا دے ـــ بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۱۴۰) محمد معصوم کابلی کے نام :ـــــــــ

(رنج و محنت، لوازم محبت سے ہیں)

محبت آثارا! ـــ رنج و محنت لوازم محبت سے ہیں ـــــ فقر، اختیار کرنے کیلئے درد وغم لابُد ہے ؎

غرض از عشق توام چاشنئ درد وغم است
ورنہ زیر فلک اسباب تنعم چہ کم است

دوست حقیقی، پراگندگی چاہتا ہے، تاکہ اُسکے غیر سے کلیۃً انقطاع حاصل ہو جائے ـــــــ مقامِ عشق میں، بے آرامی میں آرام، سوز میں ساز، بیقراری میں قرار، اور جراحت میں راحت ہے ـــــ اس مقام میں فراغت طلب کرنا، خود کو محنت میں ڈالنا ہے ـــ اپنے آپ کو پورے طریقہ سے محبوب حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیئے ـــ جو کچھ بھی اُس کی طرف سے آئے، انتہائی رضامندی کے ساتھ اس کو قبول کیا جائے ـــ جبیں تہیں نہ ہونا چاہیئے ـــــ یہی طریقۂ زندگی ہے ـــ جہاں تک ہو سکے استقامت اختیار کرو۔ ـ ـ ـ تمہاری مشغولیت باطن اچھی حالت میں تھی، لیکن وہ مشغولیت، قوی ہونے سے پہلے ہی ضعیف ہو گئی ـ ـ خیر غم نہیں ہے، اگر ان تردّدات سے تھوڑی سی خاطر جمع کر لیں، تو پہلے سے بہتر حالت ہو جائے گی ـ ـ ـ ـ ـ ـ والسلام۔

مکتوب (۱۴۱) مولانا محمد قلیج (لاہوری) کے نام :ـــــ ـــ

(محبت واخلاص بڑے درجے کی چیزیں ہیں)

حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ ترقیات نصیب کرے ـــ بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔ احوالِ قلبی کے متعلق کبھی نہ لکھا کہ کیا صورت ہے۔ اِس سلسلے میں کچھ لکھتے رہا کرو، کیونکہ یہ امر "موجب توجہ غائبانہ" ہوتا ہے ـــــ محبت واخلاص راہِ سلوک میں خاص مقام رکھتے ہیں ـــ اگر اسوقت ترقی مفہوم و محسوس نہیں ہوتی، تو کچھ غم نہیں ہے ـــــ جب اخلاص پر استقامت ہے، تو اُمید ہے کہ برسوں کا کام گھنٹوں میں حاصل ہو جائے گا ـ ـ ـ ـ ـ ـ والسلام۔

مکتوب (۱۴۲) مُلّا عبدالغفور سمرقندی کے نام :۔۔۔۔۔

مکتوب شریف جو از روئے التفات ارسال کیا تھا، پہنچا۔۔۔۔ فقراء سے محبت اور اس گروہ کی طرف توجہ، اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے۔۔۔۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اس پر مستقیم رکھے۔۔۔۔ جو طریقہ تم نے اخذ کیا تھا، اور جو کیفیت اُس سے حاصل ہوئی تھی (اب اُس کا کیا حال ہے؟) اُسکے متعلق کچھ ذکر نہیں کیا۔۔۔۔ خدا نہ کرے کہ اُس میں کوئی فتور آیا ہو۔۔۔۔ ع

یک چشم زدن خیالِ او پیشِ نظر

بہتر ز وصالِ خوبرویاں ہمہ عمر

۔۔۔۔جب کچھ لکھا کریں تو پہلے احوالِ باطن لکھا کریں، اِسلئے کہ احوالِ ظاہر بے احوالِ باطن مرتبۂ اعتبار سے ساقط ہوتے ہیں۔۔۔۔ ع

از ہرچہ میرود سخن دوست خوشتر است

اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو متابعتِ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت قدم رکھے۔۔۔۔ ع

"کار این است وغیر ایں ہمہ ہیچ"

مکتوب (۱۴۳) مولانا شمس کے نام :۔۔۔۔۔

(عالمِ جوانی کو لہو ولعب میں صرف نہ کیا جائے)

محبِ فقراء مولانا شمس کو خدا توفیق دے کہ موسم جوانی کو غنیمت جان کر اُس کو لہو ولعب میں صرف نہ کریں۔ ورنہ آخر کار سوائے ندامت وپشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور وہ ندامت وپشیمانی کچھ بھی فائدہ نہ دے گی۔ خبر شرط ہے۔۔۔ پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کریں۔۔۔ حلال وحرام میں امتیاز کریں۔ نجاتِ اخروی متابعتِ صاحبِ شریعت ہی میں ہے۔۔۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔ تلذذاتِ فانیہ اور تنعماتِ مہلکہ منظورِ نظر نہ رہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیقِ خیر دینے والا ہے۔۔۔۔

مکتوب (۱۴۶) شرف الدین حسین بدخشی کے نام :۔۔۔۔۔

(نصیحت)

مکتوبِ شرف الدین حسین موصول ہوا۔۔۔۔ اللہ کا شکر ہے کہ سعادتِ یادِ فقراء سے سعادت مند ہیں۔۔۔ جو سبق کہ حاصل کیا تھا اُس کی تکرار سے اپنا وقت معمور رکھیں، وقتِ فرصت کو

ضائع نہ کریں ــ ایسا نہ ہو کہ خانگی کروفر راہِ راست سے بھٹکا دے، اور زائل ہونے والا طمطراق بے حلاوت کردے ــــ ؎

ہمہ اندر زمن بتو این است
کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

کیا اچھی ہے یہ نعمت کہ اللہ تعالیٰ بندے کو عنفوانِ شباب میں توفیق توبہ نصیب فرمادے، اور اُس پر استقامت بخشے ــ کہا جاسکتا ہے کہ تمام دنیا کی نعمتیں اس ایک نعمت کے مقابلہ میں ایسی ہیں جیسے ایک دریائے عمیق کے مقابلہ میں شبنم ــ یہ نعمت، موجب رضائے الٰہی ہے اور رضائے الٰہی تمام دنیوی اور اخروی نعمتوں میں اونچا مقام رکھتی ہے ــ ورضوان من اللہ اکبر (اللہ تعالےٰ کی رضا سب سے بڑی چیز ہے) ــــ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات انمھا واکملھا۔

مکتوب (۱۴۸) مُلّا محمد صادق کابلی کے نام :ــــ
(نصیحت)

دو مکتوب پے در پے پہنچے ــ مکتوب اوّل نے حصول و سیرابی کی اطلاع اور مکتوب ثانی نے تشنگی و بے حاصلی کی خبر دی ــ الحمد للہ ــ اعتبار خاتمے اور آخری حالت کا ہے ــــ جو شخص سیراب ہو جائے وہ بے حاصل ہے، اور جس نے خود کو بے حاصل جانا وہ واصل ہے ــــ تم سے بار بار کہا گیا ہے کہ رُوحانیتِ مشائخ اور اُن کی امدادات سے دھوکے میں نہ پڑ جانا۔ درحقیقت مشائخ کی وہ صورتیں شیخ مقتدا کے لطائف ہوتے ہیں کہ وہ لطائف اُن کی صورتوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں ــ قبلۂ توجہ کے لئے وحدت شرط ہے ــ توجہ کو پراگندہ کرنا موجب بربادی ہے۔ ــ پناہ بخدا ــ دوسری بات جس کو مکرر اور تاکید کے ساتھ ہم نے تم سے کہا ہے یہ ہے، کہ کام مختصر رکھو، تاکہ جلدی سرانجام پا جائے ــ امر ضروری کو چھوڑ کر غیر ضروری اور بے فائدہ کام میں مشغول ہونا عقلِ دُور اندیش سے بہت بعید ہے ــ لیکن تم تو اپنی رائے کے معتقد ہو کسی کی بات تمھارے اوپر بہت کم اثر کرتی ہے ــ (خیر) تم جانو ــــ ع

"بر رسولاں بلاغ باشد و بس"

مکتوب (۱۴۹) مُلّا محمد صادق کابلی کے نام:—

[ہر چند مسبب الاسباب نے اشیاء کو اسباب پر مرتب کیا ہے، لیکن
یہ کیا ضروری ہے کہ سبب معیّن ہی پر نظر جمالی جائے—]

تعجب کی بات ہے کہ اخوی مولانا محمد صادق نے خود کو کلیۃً عالم اسباب کے اوپر چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چند مسبب الاسباب تعالیٰ و تقدس نے اشیاء کو اسباب پر مترتب فرمایا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ نظر سبب معیّن پر رکھی جائے — ع

گر دَرے بستہ شد اے دل دگرے بکشایند

اس قسم کی کوتاہ نظری (آخرت سے) بے مناسبتی کی خواہاں ہوتی ہے — تم جیسے لوگوں سے یہ بات بہت ہی قبیح ہے — کچھ دیر اپنے حال پر غور کرنا، اور اس برائی کو سمجھنا چاہیئے — لباس فقراء میں رہ کر اللہ کی ناپسندیدہ دنیا کی تحصیل میں یہ تلاش و جستجو بہت ہی بُری بات ہے — تعجب ہے کہ اس مکروہ (دنیا) کو تمھاری نظر میں کس قدر عمدہ کر دیا گیا ہے — امورِ ضروریہ کی تحصیل میں بقدرِ ضرورت کوشش کرنا چاہیئے — تمام ہمت کو اسی (دنیا طلبی) میں صرف کر دینا اور پوری عمر اسکے پیچھے گھُلا دینا محض بیوقوفی ہے — یہ مہلتِ چند روزہ بہت غنیمت ہے — ہزار افسوس اگر اس کو کوئی بے فائدہ کاموں میں صرف کردے — خبر شرط ہے — ع

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

لوگوں کے بُرا بھلا کہنے سے ملول نہ ہونا، جن باتوں کی تمھاری طرف نسبت کرتے ہیں، جبکہ وہ تمھارے اندر نہیں ہیں، تو کوئی غم کی بات نہیں — کس قدر عظیم دولت ہے یہ کہ لوگ کسی کو بُرا جانیں، اور وہ فی الحقیقت اچھا ہو — البتہ اگر اس کا برعکس ہو (یعنی لوگ اچھا جانیں اور درحقیقت بُرا ہو) تو یہ بات محلِ خطر ہے .... والسلام

مکتوب (۱۵۰) خواجہ محمد قاسم کے نام:—

(نصیحت)

خواجہ محمد قاسم کا التفات نامہ موصول ہو کر موجب فرحت ہوا — اوضاع دنیوی کی تنگی اور احوالِ صوری کے تفرق سے دل تنگ نہ ہوں، یہ باتیں دل تنگ ہونے کے لائق

نہیں ہیں، اسلئے کہ یہ دنیا فنا کے محل میں ہے ـــــ اللہ کی مرضیات میں زندگی بسر کرنا چاہئے ـــ پھر چاہے تنگی ہو یا فراخی ـــــ سوائے ذاتِ واجب الوجود کے اور کوئی اس قابل نہیں کہ اُس کو مطلوب بنایا جائے ـــــ خصوصاً تم جیسے (عالی حوصلہ) "مردم عزیز" کے لئے (یہ امر مذکور بہت ہی ضروری ہے) ـــــ پھر بھی اگر کسی خدمت یا کسی کام کی طرف مجھے اشارہ کریں، تو میں جذبۂ احسان مندی کے ساتھ اُس کے بارے میں سعی کروں گا ۔۔ ۔۔ ۔۔ والسلام

مکتوب (۱۵۲) بیادت پناہ شیخ فرید کے نام : ـــــــ

(اطاعتِ رسُولؐ عین اطاعتِ حق ہے)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :"من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" (جو رسُول کی اطاعت کرتا ہے، بیشک وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے) ـــــ (اس ارشاد میں) اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسُول کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے ـــــ معلوم ہوا کہ وہ اطاعتِ خدا ہی نہیں جو اطاعتِ رسُول کے بغیر ہو ـــــ اس حقیقت کو موکّد کرنے کے لئے کلمۂ قد لایا گیا، تاکہ کوئی نادان ان دونوں اطاعتوں میں جُدائی اور تفرقہ پیدا نہ کر سکے ـــــ اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے سکے ـــ جیسا کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :ـــ

"یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا" (جو لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان تفرقہ کریں، اور جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں بعض پر، اور نا معتقد ہوتے ہیں بعض کے، اور وہ چاہتے ہیں کہ کوئی درمیانی راہ اختیار کرلیں وہ لوگ یقیناً کافر ہیں) ـــــــــ

ہاں بعض مشائخ کبار قدس اللہ اسرارہم نے سُکر اور غلبۂ حال کی بناء پر ایسی باتیں کہی ہیں، جو ان دُو اطاعتوں کے بارے میں تفرقے کی اطلاع اور ایک کی محبت کو دوسرے کی محبت پر ترجیح دینے کی خبر دیتی ہیں ـــــ مثلاً یہ ایک حکایت نقل کی جاتی ہے، کہ :ـ سلطان محمود غزنوی اپنے ایامِ پادشاہت میں "خرقان" کے پاس اُترے، اور اپنی فرودگاہ سے اپنے وکلاء کو شیخ

ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں بھیجا، اور التماس کیا کہ حضرت شیخ اس کی (سلطان غزنوی کی) ملاقات کو آئیں، اور اپنے وکیلوں سے کہدیا تھا کہ اگر شیخ کی طرف سے میری ملاقات میں تامل و توقف محسوس کریں، تو یہ آیۂ کریمہ پڑھ دیں ــــــــ

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (اللہ کی اور اسکے رسولؐ کی، اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو) ــــــــ

چنانچہ جب وکلاء نے شیخ خرقانیؒ کی طرف سے ملاقاتِ شاہ میں توقف محسوس کیا، تو یہ آیت پڑھ دی، شیخؒ نے جواب دیا، کہ: "میں اطیعوا اللہ میں اتنا گرفتار ہوں کہ شرمندۂ اطیعوا الرسول ہوں۔ اطاعتِ اولی الامر تو اس سے آگے کی بات ہے" ــــ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ خرقانیؒ نے اطاعتِ حق کو اطاعتِ رسول کا غیر جانا ــ یہ بات (غلبۂ سُکر کی بناء پر ہے، اور) استقامت سے دُور ہے۔ مشائخِ مستقیم الاحوال اس قسم کی باتوں سے بچتے ہیں، اور شریعت، طریقت اور حقیقت کے تمام مدارج میں اطاعتِ حق کو اطاعتِ رسول ہی میں مضمر جانتے ہیں ــ اُس اطاعتِ حق کو، جو اطاعتِ رسول کے مخالف ہو، عین ضلالت سمجھتے ہیں ــــــــ

اسی طرح یہ حکایت بھی بیان کی جاتی ہے، کہ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کی مجلس منعقد تھی، ساداتِ خراسان کے ایک سید بھی اُس مجلس میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک مجذوبِ مغلوب الحال اُس مجلس میں آیا، حضرت شیخ ابوسعیدؒ نے اس مجذوب کو اُس سید پر (بسلسلۂ تعظیم) ترجیح دی، سید کو یہ بات ناگوار گذری تو شیخؒ نے فرمایا کہ تمھاری تعظیم بواسطۂ محبتِ رسولؐ ہے، اور اس مجذوب کی تعظیم بواسطۂ محبتِ حق ہے۔ اس قسم کا تفرقہ بھی اکابر مستقیم الاحوال تجویز نہیں کرتے ــ وہ محبتِ رسولؐ پر غلبۂ محبتِ حق کو ــــ سُکرِ حال کے قبیل سے سمجھتے ہیں ــ اور زائد بات جانتے ہیں ــ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مقامِ کمال میں جو کہ مرتبۂ ولایت ہے، محبتِ حق سبحانہ غالب ہوتی ہے، اور مقامِ تکمیل میں جو کہ مقامِ نبوت ہے ... محبتِ رسولؐ غالب ہوتی ہے ــــــــ

اللہ تعالیٰ ہم کو اطاعتِ رسولؐ پر (جو کہ عین اطاعتِ حق ہے) ثابت قدم رکھے۔

.. .. .. والسلام

ــــــــ

مکتوب (۱۵۲) شیخ مزمل اللہ[1] کے نام :

(نصیحت)

اللہ کا شکر ہے کہ وہ اپنے طالبوں کو اپنی طلب میں بیقرار و بے آرام رکھتا ہے، اور اس بے آرامی میں اُس آرام سے نجات بخشتا ہے جو اُسکے غیر کے ساتھ میسر ہو، مگر (سالک کو) پوری آزادی اغیار کی غلامی سے اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب فنائے کلّی سے مشرف ہو، نقوش ماسوی کو آئینۂ دل سے بالکل محو کر دے، کسی چیز سے علمی و حُبّی تعلق نہ رہے، اور سوائے اللہ تعالیٰ کے اُس کا کوئی مقصود و مطلوب نہ ہو۔ اسکے بغیر ایسا ہے جیساکہ درخت خاردار میں اُلجھنا..... (انسان) ہر چند (ماسویٰ) سے اپنی بے تعلقی کا گمان رکھے، مگر محض گمان شناختِ حقیقت میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا ۔۔۔ ع

این کار دولت است کنوں تا کرا رسد

جو شخص احوال و مقامات میں گرفتار رہے، وہ بھی "گرفتارِ غیر" ہے، اور باتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے.....
...... تمہاری غریب الوطنی کا زمانہ واقعی طویل ہو گیا ۔۔۔ فرصت کو غنیمت جانو ۔۔۔ احباب اگر اہل ہو چکے ہیں، تو اجازت میں کیوں توقف ہو، اور اگر نا اہل ہیں تو اجازت کی کیا ضرورت ہے

---

[1] آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے قدیم اور مقبول ترین مریدوں میں سے ہیں۔ سفر و حضر میں اکثر حضرتؒ کیساتھ رہتے، حُسنِ اخلاق اور مکارم اوصاف میں یگانہ اور انکسار و ایثار میں منفرد تھے۔ حضرتؒ کی تربیت سے ان کو جو کمالات حاصل ہوئے اُن کا تذکرہ حضرتؒ نے اپنے بعض اُن مکاتیب میں کیا ہے جو اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ کئے ہیں۔ سالہا سال فیضِ صحبت سے مستفیض ہونے کے بعد تعلیم طریقت کے مجاز ہوئے۔

آپ کی رفعتِ مرتبہ کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ نے ایک مکتوب میں آپ کی صحبت کو مغتنم اور آپ کے وجود کو کبریتِ احمر سے زیادہ عزیز فرمایا ہے۔

آپ نے ۱۰۲۶ھ میں اپنے مرشد کی حیات ہی میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ حضرتؒ کو آپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا، اور آپ کی رُوح کو دُعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب سے شاد کام فرمایا۔

(ماخوذ از زبدۃ المقامات)

(ابھی توقف کرنا چاہیئے) اللہ کی مرضی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ــــ اہلِ دنیا راضی ہوں یا نہ ہوں ــــ
اُن کی ناراضگی کا کچھ اعتبار نہیں ہے ــــ ع

طفیلِ دوست باشد ہر چہ باشد

فقط حق تعالیٰ کو مقصود سمجھنا چاہیئے۔ اس نقطے پر جو جمع ہو جائے جمع ہو جائے، نہ جمع ہو نہ ہو۔ ع

رخسارِ من اینجا و تو در گُل نگری

والسلام۔۔۔۔۔۔

مکتوب (۱۵۴) میاں شیخ مزمل کے نام :ــــــــ

(اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی)

اللہ تعالیٰ اپنی معیت میں رکھے، ایک لحظہ بھی اپنے غیر کے حوالے نہ کرے ــــ اے اللہ! ہم کو یک چشم زدن بلکہ اُس سے کم وقت میں بھی ہمارے نفسوں کے سپرد نہ کرنا، ورنہ ہم ہلاک ہو جائینگے۔

(انسان پر) جو بھی مصیبت ہے، وہ خواہشاتِ نفس میں گرفتاری کے باعث ہے۔ جب خود پرستی سے آزاد ہوا، ماسویٰ کی گرفتاری سے بھی آزاد ہو گیا ــــ اگر کوئی بُت پرستی کرتا ہے تو وہ بھی فی الحقیقت خود کو ہی پوجتا ہے ــــ (قرآن مجید میں ہے) : "افرأیت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ" (کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا)۔

از خود چو گذشتی ہمہ عیش است و خوشی

۔۔۔۔۔۔ جس طرح اپنی خودی سے گذرنا ضروری ہے، اپنے وجود میں سیر کرنا بھی لازم ہے، کیونکہ "یافت" اسی جگہ ہے، اپنے سے باہر "یافت" نہیں ــــ ؎

با تو در زیرِ گلیم است ہر چہ ہست
ہمچو نابینا مبر ہر سوئے دست

"سیرِ آفاقی" "بُعد در بُعد" ہے، اور "سیرِ انفسی" "قرب در قرب" ــــ اگر شہود ہے، تو اپنے میں، اگر معرفت ہے، تو اپنے میں، اگر حیرت ہے، تو اپنے میں ــــ "بیرونِ خود، کوئی قدم گاہ" نہیں ہے ــــ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی، ایسا نہ ہو کہ کوئی بیوقوف اس کلام سے حلول یا اتحاد والی بات سمجھ بیٹھے، اور ورطۂ گمراہی میں گر جائے ــــ ع

اینجا حلول کفر بود اتحاد ہم

یہ مقام جب تک حاصل نہ ہو، اس کا تفکر ممنوع ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ مرضیہ پر استقامت نصیب کرے۔

اپنے حالات لکھتے رہا کرو ـــــ اس (خط و کتابت) کو مرشد و مرید کے درمیان محبّت پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے ـــــ علائق صوریہ کے ہوتے ہوئے بھی آزاد رہو، اور ان علائق کے وجود و عدم کو مساوی جانو .... والسلام۔

مکتوب (۱۵۵) میاں شیخ مزمل کے نام :ـــــ

(نصیحت)

حق سبحانہ اپنے ساتھ رکھے ـــــ ؎

بعد از خدائے ہر چہ پرستند ہیچ نیست
بے دولت است آنکہ بہیچ اختیار کرد

ماہ جمادی الاولیٰ کے آغاز میں جمعہ کے دن "حضرت دہلی" کی زیارت سے مشرف ہوا ـــــ محمد صادق (میرا لڑکا) بھی میرے ہمراہ ہے ـــــ اگر خدا نے چاہا، تو چند روز دہلی میں رہ کر جلد متوجۂ وطن ہو جاؤں گا .... بیچارہ انسان کہاں جائے، وہ تو اپنی پیشانی کے بال حق تعالیٰ کے ہاتھ میں رکھتا ہے: "وَمَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ" (کوئی زمین پر چلنے والا نہیں، مگر حق تعالیٰ اُس کی پیشانی کے بال پکڑے ہوئے ہے۔ بیشک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے) ـــــ

گریز کا موقع ہی کہاں ہے؟ مگر یہ کہ خود ـــــ "ففرّوا الی اللہ" (اللہ کی طرف رجوع کرو)، فرمایا ہے ـــــ لہٰذا لامحالہ اُسی کی طرف رجوع کیا جائے ـــــ بہرحال اصل کو اصل جان کر، اور فرع کو طفیلی قرار دے کر اصل کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے ـــــ ؎

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است
گر شکر خوردن بود جاں کندن است

مکتوب (۱۵۶) میاں مزّمل کے نام :۔۔۔۔۔

(اہل اللہ کی صحبت کی ترغیب میں)

جو مکتوب قاضی زادہ جالندھر کے ہاتھ بھیجا تھا انھوں نے مجھے دہلی میں پہنچا دیا ۔۔۔۔ الحمد للہ کہ محبّتِ فقراء، نقدِ وقت رکھتے ہو ۔۔۔۔ "المرء مع من احب" کی رو سے تم فقراء کے ساتھ ہی ہو۔ ۔۔۔۔ ماہِ رجب (جس میں تم نے آنے کا وعدہ کیا ہے) بحسب زمان تو قریب ہے، لیکن (درحقیقت) بہت دُور ہے ۔۔۔۔ ؎

فراقِ دوست اگر اندک است اندک نیست

درونِ دیدہ اگر نیم موست بسیار است

مگر چونکہ تم نے یہ تجویز (ماہِ رجب میں آنے کی) اپنے اربابِ حقوق کی رعایت کی بناء پر کی ہے، لہٰذا ایسا ہی کرو ۔۔۔۔ فقیر بھی رجب تک شاید یہاں (دہلی) رہے گا ۔۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب ۔۔۔۔۔۔

بہرحال، عمرِ چند روزہ کو فقراء کے ساتھ گذارنا چاہئے ۔۔۔۔ "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ" (اپنے نفس کو اُن لوگوں کے ساتھ روکے رکھئے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اُس کی مرضی کو چاہتے ہیں)۔ یہ خود نصّ قاطع ہے ۔۔۔۔ یہ حکم حق سُبحانہٗ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیا ہے۔

ایک درویش فرماتے ہیں :۔۔۔۔ "الٰہی! تو نے یہ کیا عجیب معاملہ اپنے دوستوں کے بارے میں برتا ہے کہ جس نے ان کو پہچانا تجھ کو پایا، اور جب تک تجھے نہ پایا اُن کو نہ پہچانا" ۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں اس طائفۂ علیہ کی محبّت نصیب کرے ۔۔۔۔۔۔ والسلام۔

مکتوب (۱۵۷) حکیم عبدالوہاب کے نام :۔۔۔۔۔

(درویشوں کے پاس جانے کے آداب اور تصحیحِ عقائد کی تاکید)

تم دو مرتبہ (ہمارے یہاں) آئے، اور جلدی جلدی چلے گئے ۔۔۔۔ اس کا موقع ہی نہ ملا کہ ہماری طرف سے (کما حقہٗ) حقوقِ صحبت کو ادا کیا جاتا ۔۔۔۔ مُلاقات سے مقصود "افادہ" یا "استفادہ" ہے ۔۔۔۔ اگر کوئی مجلس ان دونوں باتوں سے خالی ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں۔

اہل اللہ کے پاس خالی ہو کر آنا چاہیئے، تاکہ بھر کر واپس جائے، اور اپنی ناداری و مفلسی کا اظہار اُن کے سامنے کرنا چاہیئے، تاکہ اُنھیں اُس پر رحم آجائے، اور راہ فیض کشادہ ہو ــــــ سیراب ہو کر آنا اور سیراب ہو کر جانا، اس میں کوئی لطف نہیں ــــــ سیراب اور بھرا ہوا ہو کر آنا کسی نہ کسی مرض کی وجہ سے ہوتا ہے، اور (درویشوں سے) یہ استغنا سرکشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا ہے، کہ "اوّل نیاز خستہ بعد ازاں توجہ خاطر شکستہ"۔ یعنی پہلے اہل اللہ کے سامنے نیازمندی کا اظہار ہو، اُسکے بعد اُن کی طرف سے خاطر شکستہ کے درست کرنے کی تدبیر ہوگی ــــــ پس توجہ حاصل کرنے کیلئے طالب کی نیازمندی و عاجزی شرط ہے۔

سعادت آثارا! ــــــ (اوّلاً) جو کچھ ہم پر اور تم پر لازم ہے وہ تصحیح عقائد ہے بمقتضائے کتاب و سنّت ــــــ اُس طور پر جس طور پر علمائے اہل حق نے کتاب و سنّت سے اُن عقائد کو سمجھا ہے، اور اخذ کیا ہے، اگر عقائد علمائے حق کے فہم کے مطابق نہ ہوں تو ہمارے تمھارے سمجھنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے، یوں تو ہر بدعتی اور گمراہ شخص اپنے احکام باطلہ کو کتاب و سنّت سے ہی خیال کرتا ہے، اور وہیں سے اخذ کرتا ہے، حالانکہ اُس کا گمان، حق کی شناخت کیلئے کچھ بھی نافع نہیں۔

دوسری بات...... احکام شرعیہ کا علم ہے...... یعنی حلال و حرام اور فرض و واجب کا علم۔

تیسری بات...... اس علم کے مطابق، عمل کرنا ہے۔

چوتھی بات...... تصفیہ و تزکیۂ نفس ہے، جو صوفیائے کرام کے ساتھ مخصوص ہے ــــــ پس جب تک تصحیح عقائد نہ کرلی جائے گی، احکام شرعیہ کا علم فائدہ نہ دے گا، اور جب تک یہ دونوں (یعنی تصحیح عقائد و علم احکام شرعیہ) متحقق نہ ہوجائیں، کوئی عمل، نافع نہ ہوگا، اور جب تک یہ تینوں باتیں میسر نہ آجائیں، حصول تصفیہ و تزکیہ محال ہے ــــــ ان چہار رکن اور اُن کے تکملات (مثلاً سنّت (وغیرہ) کہ فرض کی تکمیل کرتی ہے) کے بعد جو کچھ ہے وہ فضول اور دائرۂ لایعنی میں داخل ہے ــــــ (حدیث شریف میں ہے): "من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ"ــــــ یعنی آدمی کے حُسن اسلام سے ہے یہ بات کہ وہ لایعنی کو

ترک کردے ــــ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

مکتوب (۱۵۹) شرف الدین حسین بدخشی کے نام :ــــــ

(تعزیت میں)

اگرچہ آلام و مصائب بظاہر تلخ اور جسم کو تکلیف دینے والے ہوتے ہیں، لیکن بباطن شیریں اور "لذت بخش رُوح" ہیں ــــ جسم و رُوح آپس میں نقیض و ضد ہیں، ایک کی تکلیف دوسرے کیلئے لذت ہوتی ہے ــــ جو پست فطرت ان دونوں نقیضوں میں اور انکے لوازم میں تمیز نہیں کرسکتا، وہ بحث سے خارج ہے، اور لائق مخاطبت نہیں ہے ــــ "اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" (یہ لوگ چوپاؤں کی مانند ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ) ــــ ؎

آگہ از خویشتن چو نیست جنین

چہ خبر دارد از چناں و چنیں

جس کی رُوح نیچے اُتر کر مرتبۂ جسم میں آجائے ... وہ اس نکتے کو کیا سمجھ سکے گا جب تک رُوح اپنے اصلی ٹھکانے کی طرف رجعت نہ کرے گی ... اس معرفت کا جمال جلوہ گر نہ ہوگا ــ یہ دولت، وابستہ ہے اُس موت کے ساتھ جو اجل مسمیٰ کے آنے سے پہلے صورت پذیر ہوتی ہے ــ مشائخ طریقت قدس اللہ اسرارہم اس حالت کو فنا سے تعبیر کرتے ہیں ــــ ؎

خاک شو خاک تا بروید گل

کہ بجز خاک نیست مظہر کل

اور جو مرنے سے پہلے مقام فنا کو نہ پہنچا، اُس کو مصیبت زدہ سمجھنا چاہئے، اور اسکی ماتم پرسی کرنا چاہئے ......

تمہارے والد مرحوم کی خبر وفات ــــ جو کہ نیکنامی کے ساتھ مشہور تھے، اور امر معروف و نہیٔ منکر کا بڑا اہتمام رکھتے تھے ــــ تمام مسلمانوں کے لئے موجب رنج و غم ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن ــــ آنفرزند! شیوۂ صبر کو اختیار کرکے "پیش رفتگاں" کی صدقہ دعاء اور استغفار سے امداد و اعانت کریں، کیونکہ مُردوں کو زندوں کی امداد (ایصال ثواب) کی بہت ضرورت ہے (آگے اس مضمون کی حدیث ہے) ــــ باقی نصیحت یہ ہے کہ ذکر ہمیشہ

کرتے رہو، فکر (دین) کو لازم رکھو ـــ مہلت تھوڑی سی ہے، بہتر ہے کہ اس کو ضروری کاموں میں صرف کیا جائے ـــــــ والسلام۔

مکتوب (۱۶۲) خواجہ محمد صدیق بدخشی کے نام :ـــــــ

(فضیلت ماہِ مبارک رمضان اور اسکی قرآن سے مناسبت)

باسمہٖ سُبحانہٗ ـــــ شانِ کلامِ ربانی، جو کہ منجملہ ''شیونات ذاتیہ'' ہے ـــ تمام کمالاتِ ذاتی اور شیوناتِ صفاتی کی جامع ہے ـــ جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہوا ہے ـــ اور ماہ مبارک رمضان ''جامع جمیع خیرات و برکات'' ہے ـــ اور جو خیر و برکت بھی ہے، وہ ''حضرتِ ذات'' کی طرف سے عطا کی ہوئی ہے، اور اُسی کی شیونات کا نتیجہ ہے ...... پس اس ماہِ مُبارک کی تمام خیرات و برکات اُن کمالاتِ ذاتیہ کا نتیجہ ہیں، جن کی جامع، شانِ کلامِ ربانی ہے، اور قرآن مجید، اُس ''شانِ جامع'' کا ''حاصل تمام حقیقت'' ہے ـــ اسی لئے اس ماہِ مبارک کو قرآن مجید کے ساتھ مناسبتِ تام ہے ـــ قرآن، ''جامع جمیع کمالات'' اور یہ مہینہ ''جامع جمیع خیرات'' ہے ـــ اس ماہ کے خیرات، قرآن کے کمالات کے ہی نتائج و ثمرات ہیں ـــ یہی مناسبت اس مہینے میں نزولِ قرآن کا باعث ہوئی ـــــ چنانچہ ارشادِ باری ہے :ـــــــ

''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ'' (رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا) ....

اور شبِ قدر اس مہینے کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب ہے .... پس جو شخص یہ مہینہ ''جمعیت'' کیساتھ گذارے گا، اور اس کی خیرات و برکات سے بہرہ اندوز ہوگا، وہ تمام سال، جمعیت سے گذارے گا، اور خیر و برکت سے مالا مال ہوگا ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو اس ماہِ مبارک کے خیرات و برکات میسر کرے، اور اس میں سے بڑا حصہ نصیب کرے ـــــــ والسلام۔

"بیمۂ زندگی"

ممتاز علمائے مصر کی نظر میں

ترجمہ:- مولانا فضل الرحمٰن، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی، ایچ (علیگ)
(ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

"لواء الاسلام" قاہرہ کا ایک دینی، ثقافتی اور اجتماعی ماہنامہ ہے، جو ۱۲ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس ماہنامہ میں مصر کے بہترین علماء کے مقالے شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ کی طرف سے ایک مجلس مذاکرہ، اہم اسلامی مباحث پر گفتگو کرنے کے لئے ہر ماہ منعقد کی جاتی ہے، جس میں مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے علماء، بحث میں آزادانہ حصہ لیتے ہیں، اس تمام بحث کو ہر ماہ "ندوۃ لواء الاسلام" کے مستقل عنوان کے تحت، ماہنامہ میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ زیر نظر مباحثہ جو لواء الاسلام جلد ۹ نمبر ۱ بابت رجب ۱۳۷۴ھ مارچ ۱۹۵۵ء سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور رسالہ کے ص۶۵ سے ص۷۲ تک پھیلا ہوا ہے۔ بیمہ زندگی کے اہم موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ ترجمہ کی پیشکش کا بڑا مقصد، برصغیر ہند و پاک کے ماہرین شریعت اسلامیہ کے لئے فکر انگیزی کا سامان اور دوسرے حضرات کے لئے معلومات فراہم کرنا ہے، کیونکہ بیمہ کا موضوع دوسرے بہت سے جدید مسائل کے مانند، دینی نقطۂ نظر سے فنی انداز پر تشریح کے لحاظ سے ابھی تک بے حد تشنہ ہے۔ اگر برصغیر کے صاحبانِ علم بھی موجودہ سیاسی و معاشی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس سلسلہ میں شریعت اسلامیہ کا موقف واضح کرنے کی کوشش فرمائیں تو

شاید بہت سے لوگوں کے لئے رہنمائی کا باعث بن سکیں گے۔[1] مزید یہ کہ اگر ندوۃ لواء الاسلام کی طرح ماہانہ مباحثوں کے منعقد کرنے، اور ان کو شائع کرنے کا اقدام، ہندو پاک کے کسی مجلّہ کی طرف سے ہوسکے، تو یہ نہ صرف عامۃ مسلمین بلکہ دیگر اہل علم و فضل حضرات کیلئے جدید مسائل کے افہام و تفہیم کے نقطۂ نظر سے ایک مفید سلسلہ ثابت ہوسکے گا۔

(مترجم)

---

۸ رجمادی الآخر ۱۳۷۴ھ مطابق یکم فروری ۱۹۵۵ء بروز منگل بوقت شام ندوۃ لواء الاسلام کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے حصہ لیا:۔

احمد حمزہ۔ الحاج امین الحسینی مفتی فلسطین۔ محمد المفتی الجزائری۔ عبد العزیز علی۔ خطاب محمد۔ امین عز العرب۔ منصور رجب۔ صبری عابدین۔ محمد علی الحومانی۔ حنفی احمد۔ سلیمان العقاد۔ مصطفیٰ ربیع۔ یوسف الحدیدی۔ محمود سلیمان۔ مصطفیٰ زید۔ عبد الفتاح شلبی۔ محمد سابق ———— نیز اساتذہ عبد الوہاب خلاف۔ محمد البنا۔ محمد ابوزہرہ۔ عبد الوہاب حمودہ۔ عبد الحلیم بسیونی۔ محمد توفیق عربیہ۔ محمد کامل البنا۔ محمد علی شتا۔ ... ...

موضوع بحث "بیمۂ زندگی" تھا۔

بحث کا آغاز محمد کامل البنا نے کیا ——— آپ نے فرمایا:۔

ان کمپنیوں کے بارے میں مجلس کی کیا رائے ہے، جو لوگوں کے ساتھ اس شرط پر معاہدہ کرتی ہیں کہ

---

[1] اس سلسلے کی ایک کوشش نعیم صدیقی صاحب کا مقالہ بعنوان: "بیمۂ زندگی یا لائف انشورنس" (اسلامی نقطۂ نظر سے)" ہے، جو ترجمان القرآن لاہور مرتبہ سید ابو الاعلیٰ مودودی، جلد ۵۰، عدد ۴، بابتہ ماہ شوال ۱۳۷۷ھ / ماہ جولائی ۱۹۵۸ء ص۲۳۳، ص۲۴۵ میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے مسئلہ زیر بحث کا جائزہ معاشی و اسلامی نقطۂ نگاہ سے لینے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ از مولانا اشرف علی تھانوی جلد سوم ص۳۴ و ص۳۷ تا ص۳۹ وفتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد ۱ و ۲۔ امداد المفتیین باب الربوٰا والقمار ص۱۵۱۔

(مترجم)

وہ ایک معینہ رقم، ایک معینہ مقررہ مدت تک ان کمپنیوں کو ادا کرتے رہیں گے جس کے عوض میں ان لوگوں کی زندگی بیمہ شدہ سمجھی جائے گی، بایں معنی کہ اگر وہ بیمہ شدہ شخص اس مقررہ مدت تک بقید حیات رہتا ہے، تو وہ کمپنی اس کو، ورنہ اسکے انتقال ہوجانے کی صورت میں اس شخص کو جسے وہ بیمہ دار بحالت مرگ نامزد کردے ایک مقررہ رقم ادا کرے گی، یہ ادائیگی یک مشت بھی ہوسکتی ہے اور بالاقساط بھی۔ زندگی کے علاوہ یہ کمپنیاں حوادث مثلاً: قتل، آتشزدگی، ایکسیڈنٹ وغیرہ کے لئے بھی بیمہ کرتی ہیں۔

استاذ حنفی احمد:- سوال کی مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ بیمہ کار کمپنیاں عموماً بیمہ داروں یا بیمہ داری کے خواہش مند حضرات کو ایک معینہ فی صد سالانہ رقم بطور منافع ان اقساط کے عوض میں جو وہ کمپنی کو ادا کررہا ہے، پیش کرتی ہیں۔ اس صورت میں اقساط کی مجموعی مقدار، مقررشدہ مدت کے اندر اتنی ہوجاتی ہے جتنی اس کمپنی کو بیمہ دار کی موت یا مقررشدہ مدت کے اختتام کے بعد اس شخص کے نامزد کردہ یا اس شخص کو ادا کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بیمہ دار اس بات سے انکار کرتا ہے کہ ادا کردہ اقساط کی مالیت پر سالانہ منافع لے، تو اس صورت میں اُن اقساط کی مجموعی مالیت جو اسکے ذمہ واجب الادا ہیں، زر بیمہ سے کم رہتی ہے، بالفاظ دیگر یہ منافع اس بات کا معاوضہ ہوتا ہے کہ کمپنی اُن سالانہ اقساط پر یک دم تصرف کرنے کی مجاز ہو۔

استاذ امین عزالعرب:- اسی طرح بیمہ دار کو ایک مقررہ مدت گذرنے کے بعد یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ بیمہ کمپنی سے، بنکوں کے مقابلے میں، کم مقدار منافع پر قرض لے سکے۔

استاذ عبدالوہاب حمودہ:- پیش کردہ صورت حال گویا اس بات کو متقاضی ہے کہ بیمہ دار، ادا کردہ رقم سے زیادہ پر قبضہ کرنے کا حقدار ہوجاتا ہے۔

استاذ سلیمان العقاد:- بیمہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بیمہ دار، مدت بیمہ کے اختتام تک اقساط ادا کرتا رہے، اور زر بیمہ کی کل مقدار اتنی ہی ہو جتنی بغیر منافع کے مجموعی اقساط کی مقدار ہوتی ہے۔ اس بیمہ سے استفادہ صرف حالت مرگ میں ہوسکتا ہے۔

استاذ عبدالعزیز علی:- بعض کمپنیاں زندگی کے بیمہ دار کو اس کی ادا کردہ رقم پر ایک مقررہ منافع دینے کے بجائے اپنے عمومی منافع کے تناسب سے منافع ادا کرتی ہیں۔

الحاج یوسف الحدیدی:- بعض کمپنیوں کا طریقہ یہ ہے کہ بیمہ دار کے انتقال کے بعد

اسکے نامزد کردہ شخص کو پورا زرِ بیمہ یک مشت ادا کرنے کے بجائے، ایک طویل مقررہ مدت تک اس کو ماہانہ رقم ادا کرتی رہتی ہیں۔

استاذ عبد الوهاب خلاف :- بیمۂ زندگی (التامین علی الحیاۃ) کے نام سے مروجہ نظامِ کار کے متعلق اپنی معلومات کے پیشِ نظر میرا خیال یہ ہے، کہ :-

(۱) یہ نظامِ کار نہ تو زندگی کی کوئی ضمانت دیتا ہے اور نہ اس کا مقصود جان کی حفاظت، عمر میں اضافہ یا تقدیر کی مخالفت یا مقابلہ ہے، اس کی غرض و غایت، صرف آدمی کے آمدنی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا اور اسے جمع رکھنا ہے، تاکہ اس سے آہستہ آہستہ ایک ایسی رقم بن جائے جس سے قسط گذار، اگر اس کی زندگی، اُن اقساط کی ادائیگی کی تکمیل تک وفا کرے، خود منتفع ہو سکے، اور اگر اس کا پیمانۂ حیات، ادائیگی کی تکمیل سے قبل ہی لبریز ہو جاتا ہے، تو کوئی دوسرا نامزد کردہ شخص اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔ چنانچہ یہ صرف سرمایہ جمع کرنے کا ایک اختیاری معاملہ ہے جس کا منتہائے مقصود اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی اور مال کا کوئی حصہ پس انداز کر سکے تاکہ وہ سن رسیدگی کے وقت خود اُسکے، یا اس کی ناگہانی موت کی صورت میں اُسکے وارثین یا اُسکے مختارِ کار کے کام آسکے، اس نظامِ کار کو "تامین علی الحیاۃ" کے نام سے موسوم کرنا ہی سرے سے غلط ہے، کیونکہ یہ تو محض پس اندازی و اندوختگی اور قسط گذار اور اسکے ورثاء کیلئے زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا نظامِ کار ہے، جو لوگ اس پر یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تقدیر سے مفر نہیں، اور تقدیر کے آگے تدبیر کی نہیں چلتی، وہ اسکے غلط نام سے دھوکا کھا کر، اسکی حقیقت پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۲) یہ نظامِ کار، عقود جدیدہ میں سے ہے۔ قرآن و سنت میں اسکے بارے میں کوئی نص صریح قطعی موجود نہیں ہے، لہٰذا اس کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ صرف اجتہاد رہ جاتا ہے جسکی صورت یہ ہے کہ شریعت کے عمومی قواعد کو اس نظام پر منطبق کر کے دیکھا جائے، اور اس کو ایسی نظیر پر قیاس کیا جائے جس کے حکم کے بارے میں نص وارد ہوئی ہو، یا اس سے حاصل ہونیوالے مصالح اور اسکے ذریعے دفع ہونے والے مفاسد کا جائزہ لیا جائے، یا ان طریقوں کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ استعمال کیا جائے جو شریعت نے ایسے معاملات میں اجتہاد کرنے کے لئے مشروع کیا ہے، جن کے بارے میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو، ایسے تمام معاملات کے بارے میں، جو بیک وقت دینی اور دنیوی

دونوں نوعیتوں کے حامل ہیں، اور جن کے بارے میں شریعت میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو، اجتہاد کا اساسی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ ایسے سارے معاملات مباح ہیں، جو لوگوں کے لئے نفع محض کا سبب بنتے ہوں یا ان میں نفع و ضرر دونوں پائے جاتے ہوں، لیکن ان کا نفع ان کے ضرر سے زیادہ ہو، کیونکہ تشریع احکام سے شریعت کا مقصد، انسانوں کے لئے حصولِ مصالح اور دفع ضرر کے سوا کچھ نہیں، برخلاف اسکے جن معاملات کی نوعیت یہ ہو کہ ان پر ضرر محض، مترتب ہوتا ہو، یا ضرر و نفع دونوں مترتب ہوں لیکن ضرر ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہو تو وہ ناجائز ہیں۔ اس اصول کی بنیاد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "لاضرر ولاضرار"[1] ہے۔

(۳) بیمہ کاری کا نظام، دوسرے شرعی عقود کے مقابلہ میں، عقدِ مضاربت (جسے اکثر فقہاء قراض بھی کہتے ہیں) سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے، اسی کے تحت رکھے جانے کے لائق ہے، کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں مضاربت، منافع میں شرکت کے ایک ایسے عقد کو کہتے ہیں جس میں ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے، اور دوسری جانب سے محنت۔ صورت زیر بحث (بیمہ زندگی) میں سرمایہ ان قسط گذاروں کی جانب سے ہوتا ہے جو اقساط کی ادائیگی کرتے ہیں، اور محنت اس کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے جو اس سرمایہ کو کھپاتی ہے، اور منافع، کمپنی اور قسط گذاروں میں آپس کے معاہدہ کی رو سے تقسیم ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر دو اعتراض کئے جا سکتے ہیں :—

۱۔ مضاربت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ سرمایہ کار اور محنت کار کے درمیان منافع نسبت کی بنیاد پر طے ہو، اور دونوں میں سے کسی فریق کے لئے منافع کی کوئی معین مقدار مشروط نہ ہو، لیکن بیمہ کے معاملے میں قسط گذار کو فی صد کے حساب سے منافع کی ایک معین مقدار ملتی ہے، جس کی وجہ سے مضاربت صحیح نہیں رہتی۔

---

[1] اس حدیث کو ابنِ ماجہ اور دارقطنی وغیرہ نے بطورِ مسند اور امام مالک نے موطا میں بطور مرسل روایت کیا ہے ملاحظہ ہو:۔ سنن ابن ماجہ احکام ۱۷، موطا ا قضیۃ ۳۱، مسند احمد بن حنبل ۳۲۷/۵ تحقیق احمد محمد شاکر۔ مستدرک حاکم، دبیہقی و دارقطنی من حدیث ابی سعید الخدری۔ نیز الاشباہ والنظائر لابن نجیم مع شرح الحموی القاعدۃ الخامسۃ الضرر یزال —— (مترجم)

۲۔ کمپنی جو اس سرمایہ کو کھپاتی ہے، وہ اس بات کی پابند نہیں ہوتی کہ اس سرمایہ کو شریعت کے مباح کردہ مواقع میں یا جائز طریقوں سے ہی استعمال کرے، کیونکہ وہ جہاں اس سے تجارت کرتی ہے یا عمارات بناتی ہے، اور بہت سے دوسرے جائز کام کرتی ہے، وہاں وہ منافع پر قرض بھی دیتی ہے جو سودی کاروبار ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب، الاستاذ الامام محمد عبدہ کی سورۂ بقرہ کی آیاتِ ربا کی وہ تفسیر ہے، جس کی عبارت یہ ہے[1]:۔

"لا یدخل فی الربا المحرم بالنص الذی لا شك فی تحریمہ من یعطی آخر مالاً یستغلہ ویجعل لہ من کسبہ حظاً معیناً، لان مخالفۃ اقوال الفقہاء فی اشتراط ان یکون الربح نسبیاً لا تقضاء المصلحۃ ذلك لا شئ فیھا، وھذہ المعاملۃ نافعۃ للعامل ورب المال معاً، اما الربا المحرم ففیہ اضرار بواحد بلا ذنب غیر الاضطرار، ونفع لواحد بلا عمل، ولا یمکن ان یکون حکمھما فی عدل اللہ واحدا ولا یمکن ان یقول عاقل عادل ان النافع یساوی الضار فی حکمہ" (اس سود کے تحت جس کی حرمت منصوص اور شک و شبہ سے بالاتر ہے، یہ چیز داخل نہیں کہ ایک شخص کسی دوسرے کو پیداواری اغراض کے لئے سرمایہ دے اور اس شخص کی کمائی میں سے اپنے لئے ایک معینہ مقدار مقرر کرے، کیونکہ فقہاء کے ان اقوال کی مخالفت جن میں انھوں نے بربنائے مصلحت، مضاربت میں منافع کا از روئے نسبت طے ہونا شرط قرار دیا ہے، کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ وجہ یہ کہ اس معاملہ میں سرمایہ کار اور محنت کار دونوں ہی کا فائدہ ہوتا ہے، برخلاف حرام کردہ ربا کے کہ اس میں ایک فریق کو محض تنگدستی اور مجبوری کے جرم کی بناء پر ضرر پہنچتا ہے، اور دوسرے کو بلا کسی محنت کے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ان دونوں صورتوں کا حکم اللہ کے انصاف کے سامنے یکساں ہو، اور نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی عقل مند اور منصف مزاج یہ کہدے کہ نفع مند اور نقصان دہ چیزوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے)۔

---

[1] تفسیر المنار تالیف سید رشید رضا ۳/ ۱۱۶ طبعۃ ثانیہ۔ (مترجم)

مزید برآں یہ مسئلہ کہ منافع مقرر شدہ مقدار کی صورت میں طے نہ ہو، بلکہ از روئے نسبت طے کیا جائے، اجماعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس میں بعض فقہاء نے اختلاف کیا ہے[1]۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ منافع پر قرضہ لینے کی حرمت، سدِ ذریعہ[2] کی قبیل سے ہے اور یہ امر علماء کے نزدیک ثابت شدہ ہے کہ جو چیز سدِ ذریعہ کے طور پر حرام قرار دی جائے وہ حاجت کے وقت جائز ہو جاتی ہے۔ فقہاء کا قول ہے کہ حاجات بعض محظورات کو جائز کر دیتی ہیں۔ فقہاءِ حنفیہ میں سے صاحبِ الاشباہ والنظائر کا قول ہے: "ومن ذلك الافتاء بصحة بيع الوفاء[3] حين كثر الدين على اهل بخارى، وهكذا المصر، وسموه بيع الامانة وتجويز الاستقراض بالربح للمحتاج" (بیع الوفاء کی صحت کا فتویٰ جب کہ اہلِ بخاری پر قرض بہت زیادہ ہو گیا تھا، اسی قبیل سے ہے، اور ایسا ہی مصر میں بھی ہوا، اور اس کا نام بیع الامانہ رکھا گیا، اور محتاج کو منافع پر قرض لینے کا جواز بھی اسی قبیل سے ہے)۔

میری رائے یہ ہے کہ یہ نظامِ کار جس کا نام بیمۂ زندگی ہے، عقدِ مضاربت ہے اور عقدِ صحیح ہے جو چندہ گذاروں اور کمپنی دونوں کے لئے نفع بخش ہے، اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے کے لئے بھی اس میں نہ تو اضرار (نقصان پہنچانا، ضرر رسانی) لازم آتا ہے، اور نہ بغیر حق کے کسی کا مال کھا جانا،

---

[1] استاذ خلاف کی یہ رائے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں مختلف فیہ ہے، میرے نزدیک صحیح نہیں، مذاہبِ اربعہ کی معتبر کتب سے اس میں کسی اختلاف کا حال نہیں معلوم ہوتا۔ (مترجم)

[2] سدِ ذریعہ کی بحث کیلئے ملاحظہ ہو:۔ ارشاد الفحول للشوکانی ص۲۱۷ طبعۂ صبیح، الفروق للقرآنی جلد ۲ ص۳۹ تا ص۴۱ طبعۂ تونسیۃ ۱۳۰۲ھ، اعلام الموقعین لابن القیم جلد ۱ ص۲۰۳، التوسل والوسیلۃ لابن تیمیہ طبعۂ المنار ص۱۶۔

[3] بیع الوفاء کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو:۔ الجزء الاول من الفتاویٰ البزازیۃ طبع علی ہامش الفتاویٰ الہندیۃ، نوع فیما یتصل بالبیع الفاسد ص۴۰۵ تا ص۴۲۲ المطبعۃ الامیریۃ ۱۳۱۰ھ۔ بیع الوفاء کو بیع الامانۃ (زیلعی) اور الرہن المعاد (الملتقط) بھی کہتے ہیں۔ بیع الوفا کا ذکر تین مواضع میں آتا ہے، مثلاً البزازی نے البیع الفاسد میں، قاضی خاں نے خیار النقد میں، اور زیلعی نے الاکراہ میں ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بزازی نے آٹھ اقوال نقل کئے ہیں۔ (مترجم)

اور یہ درحقیقت اندوختگی، تعاون اور پس اندازی ہے تاکہ سن رسیدگی کے وقت چندہ گذار کے کام آئے اور اس کی مرگِ ناگہانی کی صورت میں، اسکے ورثاء کی صلاح کار کا سبب بنے۔ شریعت صرف نقصان دہ چیز کو حرام کرتی ہے، یا اس چیز کو جس کا نقصان اسکے فائدے سے زیادہ ہو، مختصر یہ کہ یہ ایک جائز تصرف ہے۔ اگر میری یہ رائے صحیح ہے تو محض توفیقِ ایزدی ہے، ورنہ بصورت دیگر عقل کی لغزشں۔

استاذ محمد البنا:۔ بیمہ کمپنیوں کے بارے میں مجلس کے سامنے جو سوال رکھا گیا ہے اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے، کہ:۔

(۱) یہ معاملہ ان عقود میں سے نہیں جو شریعتِ اسلامیہ کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچے ہیں، بلکہ ایک بالکل جدید عقد ہے جس کی نظیر اس سے قبل نہیں پائی جاتی، ایسے جدید عقود کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ اجتہاد کے علاوہ اور کچھ نہیں، جس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس کو کسی شرعی عقد سے ملحق کیا جائے، اور اگر غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ کسی عقد سے موافقت، یا مشابہت رکھتا ہے، اور کوئی ایسا جوہری اور بنیادی فرق، ان دونوں کے درمیان نہیں پایا جاتا جو حکم پر اثر انداز ہو سکے، تو اس کی اباحت کا حکم دے دیا جائے، ورنہ عدم اباحت کا۔

(۲) شریعتِ اسلامیہ میں پائے جانے والے عقود کا جائزہ لینے کے بعد، معلوم ہوتا ہے، کہ بیمہ کا عقد کسی ایسے عقد سے نہ ایسی مشابہت رکھتا ہے اور نہ موافقت، کہ جس سے اُن دونوں پر ایک ہی حکم کے اجراء کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بات دیکھ کر کہ عقد مضاربت میں ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے، اور دوسری جانب سے محنت اور ایسا ہی بیمہ میں ہوتا ہے، بعض حضرات نے بیمہ کو مضاربت سے ملحق کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم میں اس رائے کے خلاف ہوں، کیونکہ بیمہ اور مضاربت میں کئی جوہری فرق موجود ہیں۔ مضاربت کی شرط یہ ہے کہ منافع معین نہ کیا جائے، بلکہ ازروئے نسبت طے کیا جائے، یہ ایسا اساسی فرق ہے کہ اس سے کسی قیمت پر اعراض ممکن نہیں، اور نہ اس شرط کے بغیر ایک کا قیاس دوسرے پر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں الاستاذ الامام محمد عبدہ سے بھی نقل کیا گیا ہے، کہ انھوں نے منافع کی مقدار کے معین ہونے کو جائز قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ فقہاء کے وہ اقوال جن میں منافع کو ازروئے نسبت طے ہونا مضاربت کی شرط بتایا گیا ہے، بربنائے مصلحت ہیں، اور ان اقوال کی

مخالفت کوئی ایسی بات نہیں ہے تو یہ استاذ الامام کا ذاتی اجتہاد ہے، اور جیسا کہ قائل کو خود اقرار ہے، اقوالِ فقہاء کے قطعی خلاف ہے، تو عرض یہ ہے کہ استاذ امام کی مخالفت، بہ نسبت مختلف ادوار کے فقہاء کی ایک کثیر تعداد کی مخالفت کے آسان ہے۔ لیکن اگر استاذ الامام کے اس قول کو تسلیم کر بھی لیا جائے، تو بھی بات جہاں تھی وہیں رہتی ہے، اور بیمہ اور مضاربت کے درمیان، مشابہت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، کیونکہ جو شخص منافع کے معین کرنے کے جواز کا قائل ہو گیا، اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، کہ خسارہ کی تعیین کے وجوب کا بھی قائل ہو، کیونکہ یہ تو کسی حالت میں ممکن نہیں کہ کوئی اس بات کا قائل ہو کہ سرمایہ کار کو ہمیشہ فائدہ ہی ہونا چاہئے، حالانکہ بیمہ میں بیمہ دار پر اس نقصان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے، جو کمپنی کو لاحق ہو، اور یہ وہ چیز ہے جو بیمہ اور مضاربت میں شدید قسم کا فرق کر دیتی ہے۔

(۳) بیمہ کو مضاربت سے ملحق کرنے والے حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس پر صرف دو اعتراض وارد ہوتے ہیں، ایک منافع کا معین ہونا جس کا جواب شیخ محمد عبدہ کی تفسیر کے ذریعہ دیا گیا ہے، اور دوسرا یہ کہ جو کمپنی ان اموال میں تصرّف کرتی ہے اس کے لئے لازمی نہیں کہ وہ اسے شریعت کے جائز کردہ مواقع پر اور مباح طریقوں سے استعمال کرے، کیونکہ جہاں وہ تجارت، بنا، عمارات اور بہت سے جائز کام کرتی ہے وہیں وہ منافع پر قرض بھی دیتی ہے جو تعامل بالربا ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ منافع کی شرط پر قرض لینا، سدِ ذریعہ کے طور پر حرام کیا گیا ہے اور علماء کے نزدیک طے شدہ امر یہ ہے کہ سدِ ذریعہ کے طور پر جو چیز حرام کی جائے وہ حاجت کے وقت جائز ہو جاتی ہے، کیونکہ حاجات بعض محظورات کو جائز کر دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض نصوص کو بھی اس موقف کی تائید میں بجھ کر پیش کیا گیا۔ میری رائے میں ان نصوص کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کی تطبیق مسئلہ زیرِ بحث پر مشکوک ہے، کیونکہ اس رائے کے حامیین نے بیمہ اور مضاربت کے درمیان کے اس جوہری فرق کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی بناء پر ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرق یہ ہے کہ مضاربت میں اگر نقصان ہو تو وہ نقصان سرمایہ کار کو برداشت کرنا پڑتا ہے، برخلاف اسکے بیمہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، پھر یہ کہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار کا انتقال ہو جائے تو وارثین کو صرف اتنا ہی سرمایہ مل سکتا ہے، جو ان کے مورث نے محنت کار کے سپرد کیا ہے، برخلاف اسکے بیمہ میں اگر بیمہ دار کا انتقال ہو جائے تو اسکی موت کے بعد جس شخص کو زرِ بیمہ ملنے والا ہے، ایک بڑی رقم یعنی زرِ بیمہ کا حقدار قرار دیا جاتا ہے، یہ ایسا مخاطرہ ہے جس سے شارعِ اسلام نے روکا ہے، کیونکہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں، کیونکہ

بعض اشخاص تو ایسے نکلیں گے جنھوں نے آج بیمہ کرایا اور کل ان کے کسی وارث نے اس خطیر رقم پر قبضہ کرلیا، اور بعض ایسے اشخاص ہوں گے جو بیمہ کرانے کے ایک طویل مدت بعد اس رقم پر قبضہ کرنے کے حقدار ہوں گے۔ اس صورت کے متعلق یقینی طور سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کسی شرعی عقد میں وارد نہیں ہوئی۔ ان فروق کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا، قیاس باطل ہے، اور کوئی شخص اس عقد کے جواز کا قائل ہے تو اسے شریعت اسلامیہ کے کسی دوسرے عقد کے ساتھ اس کی مشابہت تلاش کرنا چاہئیے، لیکن میرا ذاتی خیال اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ایسے عقد شرعی کا، جو بیمہ سے مشابہت رکھتا ہو، ملنا محال ہے۔

(۴) خلاصۂ بحث یہ ہے کہ میری رائے میں بیمہ کا معاملہ شرعاً ناجائز ہے، پھر یہ کہ ایسا معاملہ جس میں علماء کی آراء اس حد تک مختلف ہوں، اسکے بارے میں زیادہ محتاط طرز عمل یہی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان:- دع ما یریبك الی مالا یریبك[1]" کے پیش نظر اس سے اجتناب کیا جائے، بہرحال میری یہ رائے اگر شارع کے مقصود کے موافق ہے، تو عنایت ایزدی ہے، اور اگر میں نادانستہ شریعت کی عطا کردہ وسعت کو تنگ کر رہا ہوں تو یہ میرا قصور ہے۔ مجھے اس رائے پر آمادہ کرنے والی چیز محض مشتبہات سے پرہیز کرنے کا جذبہ ہے، کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو مشتبہات سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے دین و آبرو کو صحیح و سلامت بچا لے جاتا ہے۔

استاذ صبری عابدین:- میں استاذ البنا کی تائید کرتا ہوں کہ بیمہ کو مضاربت سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے یہ میسر اور قمار سے زیادہ مشابہ ہے۔ کیوں؟ اسے یوں سمجھئے کہ ایک شخص پہلی قسط دس پونڈ کی ادا کرنے کے بعد، اگلے دن اس عالم فانی سے سدھار جاتا ہے، اور اس کی اولاد ایک ہزار پونڈ کمپنی سے وصول کرلیتی ہے۔ یہ آخر کس حق کے ذریعہ ہے، اور اس دستور اور قمار میں کون سا فرق ہے۔ سوالات کے متعلق استاذ حنفی احمد کی باتی معلوم ہوا کہ کمپنی بیمہ دار کو معینہ منافع بھی دیتی ہے، یہ منافع ربا ہے، اور ربوی معاملا بالاتفاق

---

[1] بخاری بیوع ۳؛ ترمذی، قیامۃ ۶۰؛ مسند احمد ۳/۱۵۳۔　　(مترجم)

ممنوع ہیں، لہٰذا میری رائے میں اس میں نہ صرف ربا کا شبہ ہے، بلکہ صریحی ربا ہے، ایسی چیز کو جائز قرار دینا جس کے بارے میں کوئی نص شرعی موجود نہ ہو، کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے کاروبار کی تمام تفاصیل معلوم کرنے سے پہلے بعجلت تمام اسکے جواز کا فیصلہ کر دیا جائے، ہم لوگوں کو ان تمام کارروائیوں کا پورا علم نہیں، جو یہ کمپنیاں عمل میں لاتی ہیں۔ ہمیں کمپنیوں کی شرائط میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جن میں ربا موجود ہے۔ نہ معلوم، استاذ خلاف کا ردّ عمل یہ معلوم کر کے، کہ ان شرائط میں صریحی ربا موجود ہے کیا ہوگا، پھر یہ سیدھی بات ہے کہ شرائط کا وضع کرنا اور عوام پر ان کا نافذ کرنا کمپنیوں کا حصہ ہوتا ہے، لہٰذا شریعت کے اس حق کی حفاظت کے پیش نظر، جو ہمارے پاس امانت ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں، کہ فتویٰ دینے میں ہم کو انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہئے، اور جب کہ یہ بات ہماری استطاعت سے باہر نہیں کہ کمپنیوں کی شرائط کو سامنے رکھ کر، بے لاگ فتویٰ صادر کریں، تو ایسا ہی کرنا بھی چاہئے۔

استاذ عبد الوہاب حمودہ :- میری رائے یہ ہے کہ اگر کچھ ایسی بیمہ کمپنیاں ہوں جو نفع آور قرضے نہ دیتی ہوں، اور نہ اپنے راس المال میں ایسے منافعوں کے ذریعہ اضافہ کرتی ہوں جو شریعت کی نظر میں ناجائز ہیں تو اس طرح کی بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہے اور فقہاء نے جو منافع کو نسبت کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی شرط لگائی ہے، اس سے محمد عبدہ کی رائے کے موافق صرف نظر کی جا سکتی ہے۔

استاذ منصور رجب :- بیمہ ان جدید معاملات میں سے ہے جو زمانہ کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اور جن کے بارے میں کوئی نص قطعی وارد نہیں ہوئی ہے۔ اصول فقہ کا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جس مسئلہ میں نص قطعی موجود نہ ہو، اس میں اجتہاد واجب ہے، معاملۂ زیر بحث میں اجتہاد دنیاوی مصلحت کی طرف راجح ہو رہا ہے، جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: "انتم اعلم باموردنیاکم"[۱] لہٰذا ایسے عقود کی اباحت سے کوئی شے مانع نہیں ہو سکتی، اگر ان میں کوئی یقینی مصلحت پائی جاتی ہو، بالخصوص جب اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے، کہ وہ خطرات جنھوں نے آج مسلمانوں کو چاروں طرف سے

---

[۱] ابن ماجہ، رہون باب تلقیح النخل ۱۵، مسند احمد ۶/۱۲۳، مسلم فضائل ۱۴۰۔　　(مترجم)

گھیر رکھا ہے، اور انھیں شدید ضرر میں مبتلا کر دیا ہے، امتِ مسلمہ کی مادی قوت کے وسائل سے اعراض کرنے کے نتیجہ میں رونما ہوئے ہیں، اور یہ یقینی بات ہے کہ بیمہ مغربی اقوام کے نزدیک مادی قوت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

الشیخ عبدالعلیم بسیونی :- استاذ خلاّف نے شیخ محمد عبدہ سے نقل کیا کہ مضاربت میں منافع کی عدم تحدید کی شرط فقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے، ورنہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ میں اس کی کوئی اصل نہیں ملتی، اور اسی وجہ سے انھوں نے فقہاء کے برخلاف اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ مضاربت میں نفع کو معین کر سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرط خود مضاربت کی طبیعت سے ماخوذ ہے کیونکہ مضاربت ایک تجارتی شرکت ہے، اور تجارت میں بالطبع کمائی، خسارہ اور منافع غیر محدود و غیر معین ہوتے ہیں، لہٰذا فقہاء نے منافع کی عدم تعیین کو شرط ٹھہرا کر، درحقیقت مضاربت کی طبیعت کو واضح و مؤکد کر دیا ہے۔ مضاربت و بیمہ کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت ایسی تجارتی شرکت ہے جس کی طبیعت میں کمائی، خسارہ اور غیر معین منافع ہے۔ برخلاف اسکے بیمہ میں خسارہ کا سوال ہی نہیں اُٹھتا، اس میں صرف منافع ہے، اور منافع بھی مقرر شدہ، اسلئے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بیمہ اور مضاربت کو ان کی طبیعت کے تضاد اور شرط کی مخالفت کے باوجود، شے واحد قرار دیا جائے، اسکے علاوہ یہ بات بھی ہرگز قابلِ قبول نہیں کہ مجتہدین کی رائے کو ترک کر دیا جائے، اور شیخ محمد عبدہٗ کی رائے اختیار کر لی جائے۔

استاذ کامل البنا :- میرے نزدیک بیمہ ناجائز ہے، اور حرام اور ربا ہی کی ایک قسم ہے۔

استاذ سلیمان العقاد :- بیمہ کی شرکت کا حکم معلوم کرنے کے لئے مضاربت اور مخاطرت کے فرقِ باہمی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اسکے بعد اگر بیمہ، مضاربت قرار پائے تو جائز ہے اور اگر مخاطرت ثابت ہو تو ناجائز۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بیمہ کی شرکت کا معاملہ، مخاطرت سے قطعاً علیحدہ ہے۔ بیمہ دار کا معاملہ تو واضح ہے۔ کمپنی کے بارے میں صورت یہ ہے کہ کمپنی بیمہ کے ذریعہ جمع کردہ اموال کو نفع آور کاموں میں لگاتی ہے۔ پھر حاصل شدہ منافع کے ایک حصّہ کا ان اموال میں اضافہ کرتی ہے، تاکہ اس طرح وہ رقم وجود میں آسکے، جو اسے بیمہ داروں کو ادا کرنا ہے۔ یہ بات

ناقابلِ تسلیم ہے کہ بیمہ دار بلاعوض کے رقم حاصل کرتا ہے، کیونکہ بیمہ کی شرکت کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسکے شرکت دار اپنے اموال کے ذریعہ ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں، اس طرح کہ بعض شرکت دار تو مدت مقررہ کے اختتام تک ادائیگی کرتے رہتے ہیں اور کمپنی اس سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگا کر کثیر منافع حاصل کرتی ہے اور اس میں سے ان لوگوں کو ادا کرتی ہے جو اختتامِ مُدّت تک ادائیگی نہیں کر پائے۔ اُن رقوم سے جو ان کمپنیوں کو ادا کیجاتی ہیں اور نفع آور اغراض میں کھپائی جاتی ہیں، فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کمپنی اپنی مرکزیت اور ساکھ قائم رکھنے کے لئے اس کا اعلان نہیں کرتی، اور اندر ہی اندر ٹھیک ٹھاک کر کے معین منافع ادا کرتی رہتی ہے، جس کی ادائیگی کی برداشت وہ اپنے کاروبار کی مختلف صورتوں اور نوعیتوں کے تحت، خسارہ اور نفع دونوں حالتوں میں کرلیتی ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے یقین ہے کہ بیمہ مضاربت ہی ہے، اور اس میں کسی فریق کے لئے مخاطرت نہیں ہے۔

استاذ عبدالعزیز علی:- میں استاذ محمد البنا کی رائے کی تائید کرتا ہوں۔

استاذ خطاب محمد:- میرا خیال ہے کہ زندگی کے بیمہ اور اشیاءِ تجارت و بحری حمل و نقل کے بیمہ کے درمیان خاص طور سے فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ دینی نقطۂ نظر سے شکوک و شبہات کی بنا پر، انسان بیمہ زندگی سے بچنے کی آزادانہ کوشش کر سکتا ہے، مگر بیمۂ نقل و حرکت ایسی چیز ہے جس پر اکثر تجار کو بحری نقل و حمل کی صورت میں مجبور ہونا پڑتا ہے، کیونکہ مروجہ دستور کے مطابق، مرسل الیہ ایسے مال کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جس کا بیمہ مال بھیجنے والے تاجر نے نہ کرالیا ہو، غالباً ایسی مجبوری کی صورت میں تاجر حضرات کیلئے شرعی مواخذہ سے بچنے کا معقول عذر موجود ہے۔

استاذ حنفی احمد:- بعض حضرات نے بیمہ کمپنی کی کچھ خاص صورتیں پیش کی ہیں تاکہ بیمہ کی اباحت و عدم اباحت کا حکم ایک مخصوص دائرے کے اندر بھی معلوم ہو جائے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر بھی درست ہے۔ اب تک بیمہ کی جتنی صورتیں پیش کی گئیں، ان میں سے کسی میں اسکی "واپسی" کی شرط کا ذکر نہیں کیا گیا یعنی اگر بیمہ دار، عقدِ بیمہ کو مدت کے اختتام سے پہلے ہی فسخ کرنا چاہے، تو جو رقم، اس شخص کو واپس اُدا کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اس شخص کی اُدا کردہ رقم سے

کم ہوتی ہے، اور اگر فسخ، سال بھر سے پہلے ہی ہو، تو اسے کچھ واپس نہیں ملتا، اور اس شخص کی ادا کردہ رقم کے بقایا سے باقی بیمہ دار مستفید ہوتے ہیں، اس صورتِ حال کے پیش نظر میں اسے نہایت اہم سمجھتا ہوں کہ بیمہ کی پالیسیاں مثلاً مصر بیمہ کمپنی کی پالیسیاں سامنے رکھی جائیں، بہت مناسب ہوتا اگر ادارہ لواء الاسلام، مصر بیمہ کمپنی کے کسی نمایندے کو اپنے اجتماع میں دعوتِ شرکت دیتا، کیونکہ یہ معاملہ بعض شرائط کی وضاحت و تشریح اور بعض ایسی اشیاء کی تحقیق و تفتیش، جو شرائط میں مصرح موجود نہیں ہے، چاہتا ہے۔ یہ مشورہ محض اس نقطۂ نظر سے ہے کہ موضوعِ بحث کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جاسکے، تاکہ ندوہ کے جواب کو ایک معتبر اور محترم حیثیت حاصل ہوسکے۔

استاذ مصطفیٰ زید:- حقیقت یہ ہے کہ اگر دو چیزیں نہ ہوتیں تو بیمہ کو مضاربت قرار دیا جاسکتا تھا، ایک یہ کہ مضاربت بالطبع نفع اور نقصان، دونوں میں اشتراک کی متقاضی ہے، اور بیمہ بالطبع نقصان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، دوسرے یہ کہ فقہاء کے نزدیک یہ بات مضاربت کی شرائط میں سے ہے کہ نفع از روئے نسبت طے ہو، اور غیر معین ہو۔ رہی یہ بات کہ بیمہ میں کسی کے اضرار کا کوئی پہلو نہیں، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ عقد کبھی تو بیمہ دار کو نقصان پہنچاتا ہے اور کبھی کمپنی کو، اگرچہ عملاً کمپنی کا نقصان ایک نہایت ہی نادر الوقوع صورت ہے، کیونکہ وہ مختلف شرائط کے ذریعہ اپنا تحفظ پہلے ہی کرلیتی ہے۔ بیمہ دار کا ضرر اس صورت میں ہوتا ہے کہ اگر وہ اقساط کی ادائیگی منقطع کردے تو کمپنی اسے یا تو بالکل کچھ واپس نہیں دیتی، یا اس کی ادا کردہ رقم سے کم واپس دیتی ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر مجھے ان لوگوں کی رائے سے اتفاق ہے جو بیمہ کو ناجائز بتاتے ہیں۔

استاذ محمد ابوزہرہ:- کچھ عرصہ ہوا، ایک مجلس، ایک اسلامی جمعیت کے دفتر میں منعقد ہوئی تھی جس میں مجھے یاد ہے کہ استاذ محترم خلاف نے بھی شرکت فرمائی تھی، اس مجلس میں ماہرین اقتصادیات نے بیمہ کمپنیوں کے متعلق کچھ بیان کیا تھا، اور بتایا تھا کہ بیمہ کی ابتداء اٹلی کے تاجرانِ بندرق کے درمیان ہوئی، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مالِ تجارت، سمندر میں ضائع ہوجاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگ دستی کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا حل یہ نکالا، کہ اگر کسی شخص کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہوجائے، تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک معین رقم ادا کریں، یہ چیز ترقی کرکے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی، کہ اس کا ہر شخص ایک مقررہ

رقم ادا کرے۔ اسکے بعد اس نظام میں مزید ترقی ہوئی، اور ملاحوں کی جان کا بھی جو بحری خطرات برداشت کرتے ہیں، بیمہ ہونے لگا، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ بیمہ کی حقیقت تعاونِ محض ہے۔

اگرچہ اس کی اصلیت تعاونِ محض تھی، لیکن اس کا انجام بھی ہر اُس ادارے کا سا ہوا، جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا، کہ یہودیوں نے اس تعاونی نظام کو بھی جس کی بنیاد، تعاون علی البر والتقویٰ تھا، ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا، جس میں قمار اور ربا، دونوں پائے جاتے ہیں، اس طرح تعاون علی البر والتقویٰ کا نظام، تعاون علی الاثم والعدوان کے نظام میں تبدیل ہو گیا۔

بہر حال اس وقت ہم بیمہ کی دوسری صورتوں کو چھوڑ کر صرف بیمۂ زندگی کو لیتے ہیں۔ زندگی کا بیمہ اپنی موجودہ صورت و وضع میں یا تو قمار ہوتا ہے، جب کہ مدتِ مقررہ کے اختتام کے قبل ہی بیمہ دار کی موت کی صورت میں اسکے ورثاء میں سے اسکے کسی نامزد کو بیمہ شدہ رقم ملتی ہے، یا ربا ہوتا ہے، اگر کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ رقم کو مع مزید منافع کے حاصل کرتا ہے۔ بہرحال ربا ہو یا قمار، اس معاملہ میں دو مزید خرابیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو مذاہبِ اربعہ کے کسی فقیہ کے نزدیک صحیح اور جائز نہیں۔ پہلی خرابی یہ کہ اس میں مصلحت غیر کی شرط (اشتراط المصلحۃ للغیر) پائی جاتی ہے، جسے فقہاء "صفقتان فی صفقۃ واحدۃ" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صفقتان فی صفقۃ واحدۃ کی ممانعت مروی ہے[1]۔ ممکن ہے اس خرابی سے یہ توجیہ کرکے کہ یہ حدیث، حالت زیر بحث پر مشتمل نہیں ہے، تساہل برت لیا جائے۔ لیکن قطع نظر اس سے دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر بیمہ دار کی وفات ہو جائے تو اس کی رقم، اس کے شرعی ورثاء کے بجائے اسکے نامزد کردہ شخص کو ملتی ہے، اور اس صورت میں اسلامی قانونِ وراثت کی صریحی مخالفت لازم آتی ہے، کیونکہ علمائے شریعت اسلامی کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ کسی آدمی کا تمام مال، خواہ وہ بالفعل اس کا کمایا ہوا ہو، خواہ وہ اس مال کے سببِ اکتساب کا

---

[1] دیکھئے نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ، کتاب البیوع باب البیع الفاسد، نیل الاوطار للشوکانی ۵/۱۲۔ رواہ ابوداؤد واحمد ونسائی وترمذی واخرجہ ایضاً الشافعی ومالک فی بلاغاتہ واورد الحافظ روایۃ ابن مسعود فی التلخیص وفی مجمع الزوائد واخرجہ ایضاً البزار والطبرانی فی الکبیر والاوسط وفی الباب عند الدارقطنی وابن عبدالبر۔ (مترجم)

مالک ہو، اگرچہ اس کسب کا ثمرہ اس کی موت کے بعد ہی ظاہر ہوا ہو، ترکہ سمجھا جائے گا، اور اس میں وراثت جاری ہوگی۔ اسی وجہ سے فقہاء کا قول ہے کہ مالِ متجدد جس کے ذریعہ وسببِ حصول کا کوئی شخص اپنی زندگی میں مالک تھا، اگرچہ اس کا اثر اس کی وفات کے بعد ہی کیوں نہ ظاہر ہوا ہو، ترکہ ہی شمار کیا جائے گا، مثلاً کسی شخص نے شکار کے واسطے جال لگایا، لیکن شکار اس شخص کی موت کے بعد جال میں پھنسا، تو فقہاء کے نزدیک اس قاعدے کے بموجب وہ ترکہ قرار دیا جائے گا، لہٰذا اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ وہ رقم اس شخص کی ملکیت ہوگی جس کو متوفی نامزد کردے تو شریعت کے قانونِ وراثت کی شرائط کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ اگر بیمہ کاری کا نظام باوجود ان مفاسد کے بہر حال کچھ فوائد پر مشتمل ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ بیمہ کاری کے ایک صحیح شرعی نظام کو یکجا جمع کیا جا سکے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے، وہ یہ کہ بیمہ کاری کے موجودہ نظام کو پھر انہی بنیادوں پر قائم کردیا جائے جن پر وہ پہلے کبھی قائم تھا۔ اس طرح کہ تعاونی کمپنیوں کی تکوین عمل میں لائی جائے، جو ان سارے امور کو انجام دیں جنھیں موجودہ بیمہ کاری کا نظام انجام دیتا ہے، اور جس کی بنیاد یہ ہو کہ جو رقم اس تعاون کو ادا کی جائے، وہ حالتِ وفات میں "قسط گذار" کے تمام ورثاء میں تقسیم کردی جائے۔

بیمہ کے عقود جو کمپنیوں اور افراد کے درمیان عمل میں آتے ہیں اُن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے، کہ آدمی چندہ گذاری کے ذریعے اس کمپنی کا ممبر ہو جاتا ہے، حالانکہ یہ قطعی غلط ہے، کیونکہ ان عقود میں ایک فریق کمپنی ہوتی ہے اور دوسرا فریق بیمہ دار ہوتا ہے، پھر یہ صورت کیسے ممکن ہے کہ بیمہ گذار کمپنی کا ممبر بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اسی کمپنی کے اندر ایک فریق تو وہ خود ہو اور دوسرا فریق کمپنی ہو۔

میری رائے یہ ہے کہ بیمہ کاری اپنی موجودہ صورت میں حرام ہے، اسکے اندر ربا، قمار، قانونِ وراثت سے بغاوت صفقتان فی صفقۃٍ سب ہی موجود ہیں، اگرچہ آخری جزو تطبیق کے نقطۂ نظر سے صرف احتمالی ہے یقینی نہیں۔

مجھے بعض محترم بزرگوں کی چند رایوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا، کہ بیمہ اور مضاربت یکساں ہیں، میں نے ہر چند غور وفکر کیا کہ میں بیمہ اور مضاربت کے

درمیان مشابہت معلوم کرسکوں، مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی مضاربت کی کئی خصوصیات ہیں :۔

(۱) ایک جانب سے سرمایہ ہو، اور دوسری جانب سے محنت، نفع دونوں فریقوں کے درمیان تقسیم ہو، اور نقصان سرمایہ کار کے ذمہ ہو، بیمہ کاری میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ اس میں راس المال صرف منافع کمانا ہے۔

(۲) منافع کی تقسیم نسبت کی بنیاد پر طے ہو۔ اگر ہم استاذ محمد عبدہ کی اس رائے کو تسلیم کر بھی لیں، جو معینہ منافع کو جائز بتاتی ہے، تو یہ بات محنت کار کے متعلق تو ایک حد تک معقول سمجھی جاسکتی ہے[۱] لیکن سرمایہ کار کے متعلق تو اسے کسی طرح معقول کہا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ برتقدیر مفروضہ یہ عقد، عقدِ اجارہ ہوگا[۲]، اور یہ بات کہ سرمایہ دار کو اجیر قرار دیا جائے، کسی طرح ممکن ہی نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سرمایہ کار کا حصہ، کسب (کمائی) میں فعلی قرار پائے گا[۳]، مگر جب کہ واقعتاً وہ کسب کرتا ہی نہیں، تو وہ یہ معینہ رقم کس چیز کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے؟ اور یہ صورت مضاربت کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟ کیا عقل و شرع کے نزدیک یہ بات کسی بھی درجہ میں معقول سمجھی جاسکتی ہے کہ محنت کار کی محنت کو سرے سے کالعدم قرار دے دیا جائے۔

(۳) مضاربت میں جب تک سرمایہ سے عملاً پیداواری نہ ہوجائے، اس کی حیثیت کسب یعنی کمائی کی ہوتی ہی نہیں ہے، اور بیمہ کی صورت میں جب بیمہ دار کا انتقال، کل سرمایہ کی ادائیگی سے قبل ہی ہوگیا، تو اس رقم کے حلال ہونے کی جو اسکے نامزدہ کو حاصل ہوگی، کیا صورت ہے؟ اور ایسے معاملہ کو مضاربت کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے۔

استاذ خلاف کی زبان سے یہ بات نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ بیمہ کا منافع،

---

[۱] یعنی محنت کار کی حیثیت بجائے مضارب کے اجیر کی ہو، اور یہ معینہ منافع اس کی اجرت سمجھی جائے۔

[۲] جس میں سرمایہ کار کی حیثیت اجیر کی، اور محنت کار کی مستاجر کی قرار پائے گی، اور معینہ منافع سرمایہ کار کے اجیر ہونے کی اجرت۔

[۳] بوجہ اجیر ہونے کے۔ (مترجم)

اس ربا کی قبیل سے ہے، جس کو سدِ ذریعہ کے طور پر حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ صورت زیر بحث میں منافع، قرض کی ادائیگی میں مہلت کے عوض میں ہے اور یہ صاف ربا النسیئہ ہے، اور ربا النسیئہ ہی ربا الجاہلیۃ ہے۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ قرض کی ادائیگی میں مہلت کے عوض قرض میں اضافہ اور زیادتی، ربا ہی کی ایک صورت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس ربا کے متعلق سوال کیا گیا جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، تو آپ نے جواب دیا: "ھو الزیادۃ فی الدین" (اس ربا کی حقیقت قرض پر اضافہ ہے) اس صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ منافع، سدِ ذریعہ کی حرمت کے قبیل سے ہے۔ جب یہ شئے خود ہی حرام لذاتہ ہے، تو اس سے بڑا اور کون سا جرم ہو سکتا ہے جس کا ذریعہ بننے کی وجہ سے اس کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اس موضوع بحث کا فیصلہ مجلس کی سابقہ نشست میں ہو چکا ہے، اور استاذ خلاف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ پچھلی بحث کے ختم ہو جانے کے بعد پھر نئے سرے سے اس کو شروع کر دیں۔

ابن نجیم صاحب الاشباہ والنظائر سے جو آنجناب نے نقل فرمایا تھا کہ انھوں نے بیع الوفاء کو سمرقند کے لوگوں کی حاجت کے پیش نظر جائز قرار دیا، اسکے جواب کا فقہ کے ہر طالب علم کو معلوم ہونا ضروری ہے، وہ یہ کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا وہ ربا پر مشتمل ہے، یا نہیں۔ جو لوگ اس کی حرمت کے قائل ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اس میں قطعی اور صریح ربا پایا جاتا ہے، بلکہ ان کی رائے میں اس میں شبہہ ربا ہے، جو ربا کے مانند ہی عمل کرتا ہے۔ بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ "دعوا الربا والریبۃ"[1]، دوسری طرف جو لوگ اسکے جواز کے قائل ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بیع ہے جس میں، خیارِ شرط، پایا جاتا ہے۔ امام زیلعی نے شرح کنز الدقائق میں یہی فیصلہ کیا ہے۔ فقہاء سمرقند نے اسکے جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے ان لوگوں کے قول کو اختیار کیا ہے جو اس سے ربا کی نفی کرتے ہیں۔

آنجناب کی یہ بات کہ حاجت مند کو منافع کی شرط پر قرض لینا جائز ہے۔ موضوع زیر بحث

---

[1] مسند احمد، مسند عمر حدیث ۲۴۶ ۱/۴۴۴، ابن ماجہ ۲/۲۱ ونقلہ ابن کثیر فی تفسیرہ ۲/۵۸ ونسبہ السیوطی ایضاً فی الدر المنثور، ۱/۳۶۵ لابن جریر وابن المنذر۔ (مترجم)

سے غیر متعلق ہے، کیونکہ گفتگو سود کھانے والے (آکل الربا) کے بارے میں ہے، نہ کہ سود کھلانیوالے (موکل الربا) کے بارے میں۔ یہ بات تو شرع اور عقل دونوں کے نزدیک طے شدہ ہے، کہ اگر قرض کے حاجت مند کو قرض لینے کی انتہائی شدید ضرورت ہے، اور وہ منافع کے بغیر قرض حاصل نہیں کر سکتا، تو اس کیلئے قرض لینا حالت اضطرار میں مردار کھانے کی طرح جائز ہے۔

کیا بیمہ کرانے والے لوگ بھی اسی طرح کے اضطرار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے دین اور فتاویٰ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے، اور ہم کو عوام الناس کے سامنے ایک ایسی بات کھنا زیبا نہیں جس میں حرام کو حلال کرنے کی صورت پیدا ہو جائے، اور اللہ کی یہ بات ہمارے اوپر صادق نہ ہو جائے۔

"ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا علی الله الکذب ان الذین یفترون علی الله الکذب لا یفلحون۔"

بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ یہ معاملہ امور دنیا سے تعلق رکھتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :- "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہو)۔ اس سلسلہ میں اس حدیث سے سند پکڑنا، ایسے ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو یہ چاہتے ہوں کہ دین کے احکام کو صرف عبادات کے مخصوص دائرہ تک محدود رکھ کر باقی جتنے فقہی احکام ہیں ان کو حلال و جائز قرار دیدیا جائے۔ اس حدیث کی حقیقی نوعیت کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ یہ حدیث ان لوگوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تابیر نخل (کھجور کا پیوند لگانے) کے بارے میں سوال کیا تھا۔ آپ نے ان کو اس فعل سے روکا، جس کے نتیجے میں اس سال پھل نہیں آئے۔ جب حضورؐ کو صورت حال سے مطلع کیا گیا، تو آپ نے فرمایا :- "انتم ادری بشئون دنیاکم" (تم اپنے دنیاوی حالات سے زیادہ واقف ہو) لہٰذا اس حدیث کا انطباق عام تشریعی امور کو چھوڑ کر، صناعت، زراعت اور تجارت کے (تجربی) امور پر کیا جائے گا۔ اس حدیث کے پیچھے پڑے رہنے والوں کے لئے مفید ہو گا کہ اس کے ساتھ ان احادیث کا شمار اور مطالعہ بھی کریں جو معاملات اور اسٹیٹ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور جن پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے، جب کہ اس حدیث کو زراعت، صناعت یا ایسے ہی دوسرے عام اور روزمرہ کے تجربی امور تک محدود رکھا جائے۔

مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی :- موضوع زیر بحث بہت بڑی اہمیت کا

حال ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ چند روز ہوئے ہندوستان کے ایک عالم نے بھی اس موضوع کے سلسلے میں مجھ سے رجوع کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ وسیع مطالعہ کا طالب تھا جس میں ہمارے پیش نظر بیمہ کی پالیسیاں اور شرائط بھی ہوتیں، تاکہ اس پر کافی و وافی بحث ہو سکتی۔

بہر حال معلوم ہوتا ہے ہم میں سے بعض حضرات نے اس کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ اپنی بحث میں ان صاحبان نے کافی گہرائی کا اظہار کیا، لیکن اسکے باوجود میں یہی کہوں گا کہ اس موضوع پر بحث و مطالعہ اور گہرائی کے ساتھ ہونا چاہئے۔

استاذ ابو زہرہ کی تقریر سے قبل میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہود اور ان کے اس نظام کے اُلٹ دینے کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ فلسطین میں قدس کے مقام پر ایک مقدمہ ایک عدالت کے سامنے پیش ہوا تھا، جس کا صدر اعلیٰ ایک انگریز تھا۔ یہ مقدمہ بیمہ ہی سے متعلق تھا، اور اس پر کافی بحث مباحثہ ہوا۔ معاملہ ایک یہودی کا تھا، جس نے ایک گودام کو آگ لگا کر بیمہ کمپنی سے زر بیمہ کا مطالبہ کیا تھا۔ تفتیش کے بعد بہت سی دھوکے بازیوں کا انکشاف ہوا، جس میں ایک یہ بھی تھی کہ یہودی نے ایک ماہر اندازکار (اکسپرٹ) کو رشوت دی تھی، جس کی وجہ سے اُسنے تلف شدہ مالیت کا اندازہ ایک لاکھ پونڈ پیش کیا تھا، حالانکہ اصل مالیت دس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ دوسری دھوکہ بازی یہ تھی کہ اس یہودی نے گودام کا بیمہ کرانے کے چند ماہ بعد خود اس میں آگ لگا دی تھی۔ جج نے فیصلہ دیتے وقت کہا: "مجھے بیمے کے ہر اُس مقدمہ پر شبہ ہوتا ہے، جس میں آتشزدگی اور یہودی دونوں ہوں۔" اور دعویٰ خارج کرکے یہودی کو حراست میں لے لیا۔ یہودی اخبارات میں اسکے متعلق بہت شور مچا، اور جج پر بہت سے الزامات لگائے گئے۔

جو بحث اس وقت ہوئی، اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بیمے کے معاملے میں تھوڑا بہت نہیں، بلکہ پورا پورا شبہ موجود ہے، اور حضورؐ کا یہ فرمان: دع ما یریبک الی ما لا یریبک ۔ ہمارے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے، کہ ہم احوط کو اختیار کریں، اور شکوک و شبہات سے پرہیز کریں۔ مسلمانوں نے اس قسم کے بہت سے معاملات میں انکی خوبیوں کے متعلق حُسنِ ظن کے ساتھ حصہ لیا، لیکن ان میں پوری طرح مبتلا ہو جانے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ

وہ محض سراب تھا۔ ان کمپنیوں کا غیر ملکی ہونا ہی ایک اچھے خاصے شبہے کی بات ہے، پھر ان غیر ملکی کمپنیوں کی موجودگی ہماری سرزمین پر موجودہ شبہ میں ڈالنے والی بات ہے، اور ہم سے احتیاط اور کافی غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان کمپنیوں کی تاسیس کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اپنے مصالح و فوائد کے پیش نظر قائم کی گئی ہیں، نہ کہ ہمارے مصالح و فوائد کے لئے۔ مزید برآں یہ کہ ان کمپنیوں کے نظام کار میں قمار، ربا، اضرار سبھی کچھ ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر میں احتیاط کا موقف اختیار کرنے کے بارے میں استاذ البنا کی تائید کرتا ہوں، اور اخیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا استاذ ابوزہرہ نے فرمایا میں اس سے قطعی متفق ہوں، کہ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ ایسی تعاونی کمپنیاں وجود میں آئیں، جو ہمارے مخصوص مصالح اور مفادات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہوں، اور ماہرین شریعت، اور ماہرین اقتصادیات پر مشتمل ہوں، تاکہ وہ اسلامی تعاونی کمپنیوں کے لئے ایسا نظام کار وجود میں لاسکیں، جو اسلامی روح کے موافق ہو، اور اس بیمہ کے موجودہ نظام میں جو فوائد پائے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ کرکے ان کو ہماری اقتصادیات اور شریعت کی باہمی ہم آہنگی کے اصول پر اس نظام میں رکھا جاسکے۔

استاذ ابوزھرہ:- میں اپنی طبیعت میں بیمہ کے خلاف شدید تنفر کا احساس پاتا ہوں، کیونکہ مجھے اس میں تحکم فی القدر کی بو آتی ہے، سوائے اسکے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آئندہ زمانہ کے لئے ایک احتیاطی تدبیر ہے، اور مستقبل کے لئے احتیاطی تدبیر کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ:-

> "انك ان تدع ورثتك اغنياء خير من ان تدعهم عالة يتكففون الناس[1]"۔ (تمہارا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو ایسا محتاج چھوڑو، کہ وہ لوگوں سے سوال کریں) "۔

علاوہ بریں ماہرین اقتصادیات کا شریعت اسلامیہ کے ماہرین سے، اس مقصد سے رجوع کرنا

---

[1] متفق علیہ، اخرجہ ایضا احمد والشافعی واصحاب السنن والبیہقی وصححہ الترمذی۔　　(مترجم)

زیبا نہیں، کہ وہ بیمہ کو حلال قرار دیدیں، یا حلت کے لئے کوئی حیلہ نکال دیں، انھیں بجائے اسکے یہ چاہئے کہ علماء سے رجوع کر کے حلال و حرام کی حدیں معلوم کریں، اور اسکے بعد اسے اپنا فریضہ سمجھیں، کہ غور و فکر کے بعد بیمہ کاری کا ایسا نظام ایجاد کریں، جو شریعت سے مطابقت و موافقت رکھتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ماہرینِ اقتصادیات کے لئے یہ کام ایسا کچھ دشوار نہیں ہے۔ خرابی در اصل یہ ہے کہ ہمارے ماہرینِ اقتصادیات، شریعتِ اسلامیہ سے کہیں بڑھ کر مغربی اقتصادیاتی اصولوں پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ ان حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جیسے ان کے زعم کے مطابق "ربا" سے مفر نہیں، ویسے ہی بیمہ سے بھی مفر نہیں۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ ہوتا ہے، کہ "اے ماہرینِ شریعت تمہارا فریضہ یہ ہے کہ شریعت میں زمانہ کے حالات کے موافق لچک کا سامان فراہم کرو، اور اپنی فکر میں وہ لچک پیدا کرو کہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ ہم تم سے فتاویٰ حاصل کریں" یا زیادہ صحیح طور سے یہ سمجھئے کہ یہ لوگ بجائے یہ سمجھنے کے کہ شریعت زمانہ کی محکوم نہیں، بلکہ اس پر حاکم ہے، اور حقیقی انسانی ارتقاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہو۔ یہ چاہتے ہیں کہ شریعت کو زمانہ کا غلام بنا دیں۔ ماہرینِ اقتصادیات کا فریضہ یہ ہے، کہ وہ پہلے خود شریعت کے حکم کے آگے گردن ڈال دیں، اور اسکے بعد بیمہ اور بینکنگ کا ایسا نظام تعمیر کریں، جو امتِ مسلمہ کے ہمراہ، شریعتِ اسلامیہ کے سائے میں پروان چڑھ سکے۔

میں ایسے علماء کا سخت ترین مخالف ہوں، جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اُن امور کی کھوج کریں، جو ان اقتصادیئین کی موافقت میں ہوں، جو اپنے علم الاقتصاد اور نظریات پر، شریعتِ اسلامیہ سے کہیں زیادہ ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ اپنی پاکیزہ و اعلیٰ شریعت کی محافظت کیلئے کافی ہے۔

دس کا وقت ہو چکا تھا، لہذا مجلس کی کارروائی
ختم کی گئی، اور حاضرین منتشر ہو گئے۔

بشکریہ "برہان"، دہلی

تصویر کا دوسرا رخ

(از جناب مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

"ثقافت" لاہور بابت مارچ ۱۹۶۰ء میں شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی کا ایک مضمون "اسلام اور مصوری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے پورا زور قلم اس امر کے ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے کہ مصوری کو شرعاً ناجائز کہنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تصویر کشی خواہ جاندار چیز کی ہو یا بے جان کی بالکل جائز اور مباح ہے۔ یہاں تک کہ مصوری کی ضرورتوں کی فہرست میں شاہ صاحب نے مفید فلموں کو بھی درج فرمایا ہے۔ گویا موسیقی کی سرپرستی سے فارغ ہو کر موصوف نے فلم انڈسٹری کی بھی سرپرستی فرمائی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو "صوفیت" کو صرف موسیقی سے مناسبت ہوتی تھی۔ مگر اس دور ارتقاء میں اس "ذوق" کا دائرہ بھی اور وسیع ہو گیا ہے اور فلمی زندگی بھی بارگاہ "صوفیت" میں بار پا رہی ہے۔

شاہ صاحب پر اگرچہ شوق تجدد کا شدید غلبہ ہے مگر صوفیانہ ذوق میں بھی ابھی خاصی زندگی باقی ہے۔ چنانچہ اس متجددانہ مضمون میں بھی موصوف نے ایک صوفیانہ نکتہ بیان فرمایا ہے اس کی لطافت کے پیش نظر جی چاہتا ہے کہ اسی کا تذکرہ پہلے کیا جائے۔ خلاصۂ ارشاد یہ ہے کہ خدائی صفات کو اپنے اندر جذب کرنا انسان کا نصب العین اور تخلقوا باخلاق اللہ کا مفہوم و مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مصور بھی ہے۔ اس لیے انسان کو بھی مصور بننا چاہیے۔

لیکن شاہ صاحب ذرا یہ بھی ارشاد فرما دیں کہ کیا وہ حق تعالیٰ کی صفت تکبّر کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی اجازت دیں گے؟ تکبّر بھی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ شاید

موصوف کے نزدیک انسان کو متکبر بھی ہونا چاہیے۔ موصوف کے اس صوفیانہ نکتہ کے بعد وہ سارا دفتر تصوف بے کار ہو جاتا ہے جس میں تواضع کی تعریف و توصیف میں صفحات کے صفحات سیاہ کیے گئے ہیں۔ موصوف کے نزدیک غالباً یہ بھی تکمیلِ انسانیت کے لیے ضروری ہوگا کہ اگر کسی کے ساتھ ایک مرتبہ احسان کرے تو کم از کم دس بیس مرتبہ احسان جتلائے تاکہ حق تعالیٰ کی صفتِ "منّان" کو اپنے اندر جذب کر سکے۔

ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر صفت "مصوّر" سے مشابہت پیدا کرنے کے لیے تصویر کشی ضروری چیز ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس کی ترغیب دینا چاہیے تھی۔ یہ عجیب بات ہو کہ جو "وصل" کے لیے آئے تھے انھوں نے اس بارے میں "فصل کردن" کا اظہار فرمایا یعنی "تصویری" کی تعریف و توصیف کے بجائے اس کی شدید مذمت فرمائی اور اس کی ترغیب دینے کے بجائے اس سے منع فرمایا، لیکن شاہ صاحب کے لیے اس سوال کا جواب آسان ہے۔ وہ حسبِ عادت اپنے مضمون کی سطور ذیل کی طرف اشارہ فرما دیں گے۔

"تصاویر کی ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دور بنیادی عقائد و اعمال کو پختہ کرنے کا تھا اور ساری توجہ اساسی مقاصد کی طرف لگی ہوئی تھی۔ وہاں آرٹ کے لیے کہاں گنجائش تھی"۔

گویا اسلام کے اس نقص کی تکمیل اور اسلامی آرٹ کی ترویج عنایتِ الٰہی نے ادارۂ ثقافت خصوصاً اس کے رکنِ خصوصی جناب شاہ صاحب کے حصہ میں رکھی تھی جو چودھویں صدی ہجری میں اس کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔ ممکن ہے کہ شاہ صاحب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ شکایت ہو کہ انھوں نے تخلقوا باخلاق اللّٰہ فرمانے کے باوجود فنِ مصوّری کی ذرہ برابر بھی ترغیب نہیں دی اور امت کو تیرہ سو برس سے زیادہ اس نعمتِ عظمٰی، اعلیٰ درجے کے آرٹ اور قربِ الٰہی کے اس اہم ذریعہ سے بے خبر و محروم رکھا۔

شاہ صاحب کے اس نکتۂ لطیفہ کی داد کو ہم نے سرفہرست پر اس لیے رکھا ہے کہ ناظرین ان کی ذہنیت سے متعارف ہو جائیں اور ان کے مضمون کی "بہار" کو اس "گلستان" پر قیاس کر کے سمجھ لیں۔

اس سلسلہ میں جی چاہتا ہے کہ شاہ صاحب کے ایک اور نکتۂ لطیفہ کی داد بھی دیتا چلوں۔ فرماتے ہیں۔

"تصویر کشیدہ کپڑے جو "قیمتی ہوتے ہوں گے اور معاشی لحاظ سے تصویر یہ گوارا ہی نہیں فرما سکتے تھے کہ کچھ لوگ تو پرتکلف قیمتی لباس پہنیں اور کچھ لوگ چیتھڑے لگائے پھریں۔"

اگر مضمون نگار متعارف نہ ہوتے تو ان جملوں کو پڑھ کر یہی خیال ہوتا کہ یہ سطریں کسی اشتراکی دماغ کی پیداوار ہیں جس پر مارکس کا مغالطہ انگیز طرز فکر چھایا ہوا ہے۔ جا و بے جا معاشی نقطۂ نظر کا استعمال خالص اشتراکی ذہنیت ہے جو اس دور میں بعض لوگوں پر غیر شعوری طریقہ سے مسلط ہو جاتی ہے۔ غور تو فرمائیے کہ اس نکتہ آفرینی کے وقت واقعات اور حقیقتوں سے کس طرح چشم پوشی فرمائی گئی ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں صحابۂ کرام کا لباس بالکل یکساں ہوتا تھا اس میں قیمت و زینت کے لحاظ سے کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ کیا اس مفروضہ کا کوئی ثبوت ہے؟ پھر یہ بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ پردے کو "سادہ" بنا دینے سے کون سی معاشی مساوات پیدا ہو گئی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار کپڑے کے اُخروی نقصانات بیان فرمانے پر کیوں اکتفا فرمایا؟ اس معاشی مقصد و علت کو کیوں نہیں بیان فرمایا؟ یہ کوئی ناقابلِ فہم بات تو نہ تھی یا اس نکتۂ لطیفہ کا سمجھنا صرف ادارۂ ثقافت کے لیے مخصوص ہو چکا تھا؟

معاشی نقطۂ نظر سے مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ تصویر دار کپڑا استعمال کرنے کی عام اجازت سے صنعتِ تصویر سازی ترقی کرتی اور بہت سے بے روزگاروں کے لیے ایک نیا ذریعۂ آمدنی مہیا ہو جاتا۔ معمولی سے عبوری دور کے بعد پوری قوم کی معاشی سطح میں کچھ نہ کچھ بلندی پیدا ہوتی۔ مصوّر کپڑے نسبتاً ارزاں ہو جاتے اور غربا بھی انھیں پہن سکتے۔ اس کے ساتھ یہ آرٹ ترقی کرتا۔ حق تعالیٰ کی صفتِ "مصوّر" کو "اپنے اندر جذب" کرنے کا "نصب العین" بھی پورا ہو جاتا اور اس "مبارک آرٹ" کو زندہ کرنے کے لیے" دورِ اسکندری" کی ایک خاص برکت یعنی" ادارۂ ثقافت" کے قیام کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔

شاہ صاحب کے طرز فکر کا یہ ایک مختصر تعارف ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پورے مضمون کے

مطالعے سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف کے ذہن پر معاشی مصلحت یعنی اس درجہ غالب مستولی ہے کہ مادی مصلحت یعنی تخلیہ پر مجبور ہو گئی ہو۔ یہی چیز کا اثر ہے کہ موصوف مغالطہ انگیزی میں بھی کوئی باک نہیں محسوس فرماتے۔ اس دعوے کی شہادت مضمون کی سطریں دے رہی ہیں۔

مغالطہ انگیزی کی پہلی کوشش تو موصوف نے خلط مبحث کر کے فرمائی ہے تصویر کے متعلق متعدد مسئلے ہیں جن کے احکام میں فرق ہو مگر مضمون نگار نے سب کو خلط ملط کر کے اس طرح دکھانے کی کوشش کی ہو کہ گویا سب مسائل یکساں ہیں۔ تصویر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مختلف مسائل سامنے آتے ہیں۔

(۱) تصویر کھینچنا یا کھینچوانا، (۲) پیشہ مصوری اختیار کرنا، (۳) تصویر کا اپنے پاس رکھنا (۴) ایسے مکان میں یا کپڑے پر یا ایسے کپڑے کو پہن کر یا تصویر کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا پھر ان صورتوں میں سے بعض کی تقسیم متعدد صورتوں کی طرف ہوتی ہے۔ مگر اس کی تفصیل یہاں بے ضرورت ہو۔ یہاں تو یہ دکھانا ہے کہ ان چاروں صورتوں کو شاہ صاحب نے مغالطہ دینے کے لیے ایک فرض کر لیا ہو اور ان کے شرعی احکام میں خلط ملط کر کے مقصد برآری کی کوشش فرمائی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ جاندار چیز کی تصویر اور بے جان چیز کی تصویر کے حکم میں بھی فرق ہے۔

مغالطہ انگیزی کی دوسری افسوس ناک کوشش موصوف نے اس طرح کی ہے کہ جواز و عدم جواز کی اہم اور مشہور فقہی تقسیم کو لفظیوں، کے حجاب میں مستور کر دیا ہے۔ جس شخص کو فقہ اسلامی سے ذرہ برابر بھی مناسبت ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ کسی چیز کا بضرورت جائز ہونا دوسری چیز ہے اور علی الاطلاق جواز بالکل دوسری شے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ موصوف کا دعویٰ تو یہ ہے کہ تصویر کھینچنا اور کھنچوانا علی الاطلاق جائز ہے، اور اسکی ممانعت محض بضرورت فرمائی گئی تھی۔ لیکن استدلال کرتے وقت طول فضول کے باوجود ایک دلیل بھی اپنے دعوے پر قائم نہیں فرما سکے۔ اگر ان کے دلائل کو صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو بھی تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ فوٹو کھنچوانا ضرورت شرعی پیش آنے پر

جائز ہے لیکن اس چیز کو ان کے دعوے سے کیا نسبت ؟ اور پیشہ مصوری کے جواز پر تو موصوف ایک دلیل بھی نہیں پیش کر سکے

وہ شخص جسے نفسیات سے ذرا بھی مس ہے مضمون دیکھ کر اندازہ کر لے گا کہ شاہ صاحب سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف تو ان پر شوق تجدد کا غلبہ ہے اور ذہن تہذیب جدید کی رنگینیوں سے مسحور اور اس کی ظاہری ترقیوں سے مرعوب ہو۔

دوسری طرف مدت مدید کا رفیق شفیق خرقۂ تصوف بھی اتارنا مشکل نظر آتا ہے اس پر تفقہ فی الدین سے محرومی ستم بالائے ستم ہے۔ گویا ان کی حالت یہ ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس ذہنی کش مکش نے مضمون کو خبط کر کے بعض اجزاء کو بعض سے دست و گریبان کر دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ موصوف یہ بیان فرمانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر رکھنے کی ممانعت بعض مخصوص اسباب کی بنا پر فرمائی تھی۔ وہ اسباب مفقود ہوں تو اس کے جواز میں کلام نہیں۔ اس موقع پر انھیں یہ دکھانا چاہیے کہ قرآن مجید یا حدیث میں انھیں اسباب کو عدم جواز کی علت قرار دیا گیا ہے لیکن موصوف نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، بلکہ بہت سے اسباب اپنی طرف سے محض ظن و تخمین سے بیان فرما دیے ہیں جن کی طرف قرآن و حدیث میں اشارہ بھی نہیں ملتا ہے، اس کے بعد مطمئن ہو گئے کہ ان کا دعویٰ ثابت ہو گیا حالانکہ جب تک ان اسباب کا علل کے درجہ میں ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ان کے معدوم ہونے سے زیر بحث مسئلہ میں جواز کا قائل ہونا صرف تفقہ سے محرومی کی دلیل ہے، یہی نہیں بلکہ شاہ صاحب نے ایک جملہ تحریر فرما کر خود ہی اپنے استدلال کی ساری عمارت منہدم فرما دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"تصویر سازی کا صحیح موقف صرف اسی قدر ہے اور تمام روایات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ صرف یہی ایک نقطۂ نگاہ

ہے۔ کہنے کی غرض صرف اس قدر ہے کہ جہاں حضور نے تصاویر کو شدت کے
ساتھ ناپسند فرمایا ہے وہاں یا تو تصاویر پرستی کا شائبہ ہونے کا خطرہ ہوگا
یا ایسی ہی کوئی اور وجہ ہوگی۔"

جب یہی ایک نقطۂ نگاہ نہیں ہے اور دوسرا نقطۂ نگاہ بھی ہو سکتا ہے تو یہ فتوئ جو اٰز علی الاطلاق کس بنیاد پر ہے؟ اور یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ اگر مقصد اچھا ہو تو تصویر کھینچنا جائز ہے؟ اس کے بعد اس جملہ نے "یا ایسی ہی کوئی اور وجہ ہوگی" تو دلیل کا آخری تسمہ قطع کر دیا۔ سیدھی سی بات ہو کہ جب آپ خود یہ سمجھتے ہیں کہ شارع کے نزدیک حکم کی کوئی ایسی علت بھی ہو سکتی ہے جو اب تک آپ نہیں سمجھ سکے ہیں تو آپ کو کیا حق ہے کہ اپنی اختراعی یا استنباط کی ہوئی (بزعم خود) علتوں پر حکم کا مدار رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے وہ "اور کوئی وجہ" جو غیر معلوم ہے آج بھی پائی جاتی ہو اور قیامت تک پائی جائے جس کی بنا پر تصویر رکھنا یا کھینچنا ناجائز ہو، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ آپ اپنی بیان کردہ (بقول خود) علتوں کا علت ہونا بھی نہیں ثابت کر سکتے۔ ان کا درجہ محض حکمت کا ثابت ہوتا ہے جس پر حکم کا مدار نہیں ہوتا ہے۔ حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے نہ کہ حکمت پر۔ ملاحظہ فرمائیے کہ شاہ صاحب نے اپنا باطل اور خلافِ شریعت دعوے ثابت کرنے کے لیے جو استدلال کا جال بڑی کد وکاوش سے بنا تھا، اس کے تار و پود خود ہی بکھیر دیئے "كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا"

شاہ صاحب نے ممانعت کی جو حدیثیں نقل کی ہیں انھیں دیکھ کر ہر سلیم الفہم شخص اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ جاندار چیز کی تصویر کھینچنا یا کھنچوانا یا ایسی اشیار کی مصوری کو اپنا پیشہ بنانا سخت گناہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بہت مبغوض کام ہے۔ مگر موصوف کے نزدیک وہ سب قابل رد ہیں اس لیے کہ ان میں "اضطراب" ہو اور وہ قرآن مجید سے متعارض ہو رہی ہیں۔ حق یہ ہے کہ حدیثوں میں تو کوئی اضطراب نہیں ہو، بلکہ یہ خود شاہ صاحب کے قلب کا اضطراب ہو جو احادیث کے آئینہ میں نظر آرہا ہو اور خود ان کے مضمون سے ظاہر ہو رہا ہو اسی طرح قرآن و حدیث میں تو کوئی تعارض نہیں ہو بلکہ باطل کی حمایت نے خود موصوف کے مضمون میں تعارض د

تناقض پیدا کر دیا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ شریعت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی جاندار کی تصویر کھینچنا یا کھنچوانا جائز ہے، متجددانہ تفقہ کا ایک لطیفہ ہے۔ اول تو "تمثال" کا لفظ جاندار کے ساتھ مخصوص ہونا اہلِ لغت کا متفقہ قول نہیں ہو. خود آپنے جو عبارت اقرب الموارد سے نقل فرمائی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہلِ لغت تمثال کو بھی صورت کے ہم معنیٰ اور جاندار و بے جان دونوں کے لیے عام سمجھتے ہیں، بعض تمثال صرف جاندار کی تصویر کو کہتے ہیں۔ آیتِ مندرجہ میں بعض علمار نے تمثال کو صورت ہی کے ہم معنیٰ لے کر فرمایا ہے کہ وہ لوگ بے جان چیزوں کے مجسمے بنایا کرتے تھے۔ اس احتمال کے بعد آپ کا استدلال کہاں صحیح رہا۔

لیکن اسے تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ "تماثیل" سے مراد جانداروں کے مجسمے ہیں. آپ کا دعویٰ محرومِ دلیل رہتا ہے۔ انبیار کا دین ایک تھا لیکن شرائع میں اختلاف ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شریعتِ سلیمانی (علیہ السلام) میں یہ چیز جائز ہو اور شریعتِ محمدیہ علیہا الف تحیۃ ...... میں ناجائز ہو۔ ہاں اگر ہماری شریعت میں اس کی ممانعت ثابت نہ ہوتی تو کسی نہ کسی درجہ میں استدلال کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی۔ احادیثِ ممانعت کے بعد تو اس کی ذرہ برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی، جس شخص کو فہمِ سلیم کا ذرہ برابر بھی حصہ ملا ہے وہ سمجھ سکتا ہو کہ اس موقع پر حدیث و قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہو. اگر قرآن مجید سے اس شریعت (شریعتِ محمدیہ) میں اس فعل کا جواز ثابت ہوتا اور حدیث سے اسی (شریعت) میں اس کا عدمِ جواز تو اس وقت تعارض کا وجود ہوتا، جب دونوں حکموں کے زمانے اور مواقع مختلف ہیں تو تعارض کے کیا معنی؟ جب تعارض ثابت نہیں تو احادیث کی تاویل کرنا بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے، گویا شاہ صاحب کا سارا استدلال ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہی چیز آفتاب سے زیادہ روشن ہو جاتی ہے جس کا اقرار احادیث کو دیکھ کر خود شاہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> "علامہ شامی کی اس تصریح سے واضح ہے کہ تصاویر حرام تو کسی صورت میں نہیں البتہ مکروہ تحریمی ہو سکتی ہیں۔"

صورت گری کا مکروہ تحریمی ہونا تو ثابت ہو ہی گیا جس کا مشروط اقرار بھی شاہ صاحب نے

فرمایا ہے، شرط یعنی رفع تعارض بلکہ عدم تعارض موجود ہونے کی وجہ سے یہ مشروط اقرار غیر مشروط ہوگیا۔ مگر موصوف کو اس پر بہت تعجب ہے کہ بعض لوگوں نے اسے حرام کیوں کہا ہو؟ حالانکہ حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم شاہ صاحب نے دیدہ و دانستہ اغماض برتا یا انھیں اس چیز سے واقفیت نہیں ہے کہ اجماع بھی دلیل قطعی ہے۔ جن لوگوں نے اسے حرام کہا ہو انھوں نے اجماع سے استدلال فرمایا ہے اور جن حضرات کے نزدیک اس سلسلہ میں ثبوت اجماع کے شرائط نہیں پورے ہو سکے انھوں نے مکروہ تحریمی کہنے پر اکتفا کیا ہے[۵]۔

شاہ صاحب کی ذہنی کش مکش اور مغالطہ انگیزی کی افسوسناک کوشش یہاں بھی رنگ لائی ہو اور موصوف نے اپنے اس استدلال کی عمارت بھی اپنے ہاتھ سے منہدم فرما دی ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق "تماثیل" بنوانے کے واقعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کوئی عجب نہیں کہ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہو کہ بیل گائے ہوں یا فرشتے یہ سب تمھارے خدام ہیں، معبود نہیں"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں ہو کہ عہد سلیمانی علیہ السلام میں جواز تماثیل سازی کی یہی علت ہو، لیکن عہد محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں یہ علت نہیں باقی رہی! اس احتمال کے بعد آیت سے اس کے جواز پر استدلال کرنے کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟

اجزاء مضمون کا یہ تعارض و تدافع شاہ صاحب کی ذہنی الجھن کا دوسرا نقش ہے۔ یہ تناقض بیان مضمون میں جا بجا نظر آئے گا، اس کی وجہ یہ ہو کہ انسان جب ایک غلط دعویٰ کر بیٹھتا ہے تو اسے نباہنے کے لیے اسے بہت سی غلط بیانیوں سے کام لینا پڑتا ہے اور دوسروں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے چبا چبا کر باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ خلاف حقیقت اختراعی باتوں کے ساتھ حافظہ پورے طور پر نباہ نہیں کر سکتا، نتیجہ تناقض بیان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھیے مضمون کے شروع میں شاہ صاحب نے بڑی چالاکی سے کام لینے کی کوشش فرمائی ہے، پہلے انھوں نے احادیث ممانعت کے خلاف علماء و مشائخ کا عمل پیش کیا۔ حاشیہ پر ایسے علماء و

---

[۵] بحر الرائق

مشائخ کی ایک فہرست دے دی جن کی تصویریں موجود ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان اکابر کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ناظر پر اولین اثر یہ پڑے کہ تصویر کشی کوئی معصیت نہیں ہے۔ اور ہے بھی تو بہت معمولی۔

فرماتے ہیں۔

> "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اندر روایات کا احترام بہت ہے۔ لیکن تصاویر کے بارے میں جو احکام ہیں اُن کو وہ معمولی کراہت سے زیادہ درجہ نہیں دیتے۔ بس خلافِ اولیٰ یا اس سے کچھ زیادہ سمجھتے ہیں۔"

تصاویر کے بارے میں احکام کا کیا مطلب ہے؟ کھینچنے، کھینچوانے، رکھنے، ان میں کس کام کے احکام مراد ہیں۔ یہ سب مبہم ہے۔ یہ ابہام موصوف نے قصداً باقی رکھا ہے تاکہ مغالطہ دے کر پیشۂ مصوری کے جواز پر بھی اسی سے استدلال کریں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

> "اگر کبھی شدت کا اظہار بھی ہوا تو اس خوف سے کہ کہیں عوام اس میں انہماک نہ پیدا کریں۔ ایسا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں، عوام کے لیے بعض

---

[۱] جن حضرات کا تذکرہ مضمون میں ہے اُن میں سے مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو راقم الحروف اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ تصویر کھینچنے اور کھینچوانے کو بالکل ناجائز اور معصیت سمجھتے تھے اور انھوں نے اپنی ایک تصویر بھی نہیں کھنچوائی ان کی جو تصویریں موجود ہیں وہ سب ان کی نادانستگی میں لی گئی ہیں۔ تصویر کھینچنے کا مروجہ طریقہ اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تصویر لینے میں دوسرے کی رضامندی کی کوئی احتیاج نہیں ہے اس کی بے خبری میں بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ احتمال قوی ہے کہ دوسرے حضرات کی تصویریں بھی ان کی رضامندی کے بغیر کھینچی گئی ہوں گی۔ اس کے علاوہ جب فوٹو کیمرہ ایجاد ہو کر ہندوستان میں پہونچا تو بعض علماء کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ ہاتھ کی تصویر اور کیمرہ کی تصویر میں فرق ہے۔ ممنوع اول ہے نہ کہ ثانی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور ان میں سے اکثر کا مسلک یہی ہو گیا کہ دونوں صورتوں میں حکم یکساں رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان حضرات میں سے بعض کے فوٹو اس دور غلط فہمی کے ہوں۔ لغزش کا احتمال تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ ان حضرات کا عمل سند تو ہر حال نہیں تھا لیکن اتنے احتمالات کے بعد تو اس کی قوت کچھ بھی نہیں باقی رہتی۔

اوقات "بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود کا اصول برتنا پڑتا ہے "

یہ تحریر فرما کر شاہ صاحب نے اپنی اس سند کو بھی چاک کر دیا جس کے ذریعہ مغالطہ دینے کی کوشش انھوں نے پہلے کی تھی۔ سوال یہ ہو کہ کیا مبینہ خوف "جسے آپ بھی بجا کہتے ہیں اب زائل ہو گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آپ اس کے جواز مطلق پر کیوں اس قدر مصر ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک عوام کی بے راہ روی اور معصیت کوشی کی ذمہ داری قبول کر لینا کوئی بات ہی نہیں ہو؟ حسب عادت شاہ صاحب نے مغالطہ دینے اور اس ذمہ داری کے وبال کو مٹانے کے لیے انہاک کا مبہم لفظ استعمال فرمایا ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ فوٹوگرافی کو اگر مطلقاً جائز قرار دے دیا جائے تو بس اتنا ہی خطرہ ہے کہ عوام الناس اس فن شریف میں زیادہ مشغول ہو جائیں گے یہ کونسی ایسی خرابی ہے جس کے لیے اس اسلامی آرٹ کو ترقی دینے کا ثواب عظیم نہ حاصل کیا جائے لیکن تھوڑی دور چل کر موصوف اسے بھول گئے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"جب یہ دور گذر گیا، معاشی حالت درست ہو گئی اور ہیرو ورشپ (اکابر پرستی) کا سودا دماغوں سے نکل گیا تو ممانعت کی شدت خود بخود ختم ہو گئی"

گویا آپ کے نزدیک اس آرٹ سے ممانعت کی ایک علت یہ بھی تھی کہ یہ "اکابر پرستی" یا بالفاظ دیگر شرک تک پہونچا سکتا ہو لیکن کیا آج یہ خطرہ نہیں ہو؟ یا آئندہ اس خطرے سے اطمینان کی کوئی دلیل آپ کے پاس ہے؟ آج مزار پرستی، پیر پرستی، قوم پرستی، لیڈر پرستی، نسل پرستی، وطن پرستی وغیرہ معلوم نہیں کتنی پرستشیں دنیا میں مروّج ہیں اور شرک کے بیسوں اقسام موجود ہیں۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تصویر کو بھی ان میں سے کسی پرستش کا ذریعہ نہ بنایا جائے گا، بلکہ اس کے بالکل برخلاف اس دور میں تو اس کا احتمال قوی تر ہے، کمالِ توحید سے اکثر عوام مسلمین کی محرومی شرک خفی کا رواج، پیر پرستی و گور پرستی تعزیہ پرستی وغیرہ کی ہلاک وباؤں کا زور و شور، احتمال نہیں اس کا یقین پیدا کرتا ہے کہ فن تصویر سازی میں مسلمانوں کا بے روک ٹوک ترقی کرنا عوام کی اخلاقی بے راہ روی میں اضافہ کرنے کے ساتھ انھیں شرک جلی میں مبتلا کر دے گا، شاہ صاحب تو معترف ہیں۔

"پیر محب اللہ المتوفی ۱۱۹۱ھ کی قلمی تصویر ہے جس کے ذریعہ وہاں کے

اصحاب سجادہ شغل برزخ فرماتے ہیں۔

شاہ صاحب کا اجتہاد جو کچھ بھی کہتا ہو، لیکن قرآن و حدیث کی نظر میں تو یہ "تصوری شغل برزخ" شرک صریح ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مصوری کے علی الاطلاق جواز سے شرک پھیلنے کا خطرہ نہیں ہے؟ شاہ صاحب پر شوق تجدد کا اس قدر غلبہ ہو کہ آپ نے نہایت بے باکی کے ساتھ اس ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہو اس میں ملائکہ رحمت نہیں آتے ایک اعتراض فرمادیا جس کا ماحصل یہ ہو کہ خانۂ کعبہ میں (قبل بعثت) بُت رکھے ہوئے تھے اس میں تو ملائکہ رحمت داخل ہوں، اور گھر میں تصویر کی وجہ سے نہ داخل ہوں۔ اعتراض اسقدر بے وزن ہو کہ اس کی طرف توجہ کو بھی نہیں جی چاہتا۔ مگر دو حرف اس خیال سے لکھے دیتا ہوں کہ کہیں کسی ناسمجھ کی گمراہی کا سبب نہ بن جائے۔ جس شخص کو ذرہ برابر بھی دین سے مناسبت ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ فرشتگانِ رحمت کا تصویر کی وجہ سے گھر میں نہ آنا تصویر رکھنے کا ایک وبال ہے جس میں تصویر رکھنے والا مبتلا ہوتا ہے، یہ ایک سزا ہے جو اسے اس کے عمل کی دی جاتی ہے، بیت اللہ تو کسی شخص کی ملکیت نہیں ہے جسے سزا دی جائے۔ دونوں کا فرق اسقدر واضح ہے کہ ذرا سی فہم دین رکھنے والا بھی اس اشکال سے دوچار نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ یہ ہے کہ موصوف نے خود ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ فرشتوں کا نہ آنا مخصوص حالات کی وجہ سے ہوگا۔ مگر وہ مخصوص حالات کیا تھے؟ اس کا کہیں ذکر نہیں اور آپ کو کیسے معلوم ہوا پھر کس آیت یا حدیث سے معلوم ہوا کہ انھیں مخصوص حالات کی وجہ سے یا انھیں مخصوص اشخاص کے لئے یہ حکم تھا۔ ان اہم باتوں میں سے کسی کا جواب مضمون میں نہ ملے گا۔ بس رجماً بالغیب اس طرح احکام لگا دیئے گئے ہیں گویا یہ سب دعاوی دلیل سے بے نیاز ہیں اور شاہ صاحب جو فرمادیں اسی کو آیت و حدیث سمجھ لیا جانا چاہیئے۔

کتا پالنے کے متعلق جو وعید حدیث میں آتی ہے اس پر بھی شاہ صاحب معترض ہیں۔ احادیث متعلقہ تصویر کی طرح اس حدیث میں بھی آپ نے اضافہ راوی کا شبہ ظاہر کر کے نہایت چالاکی کے ساتھ ثبوت احادیث کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی یہ کوشش بھی ناکام ہی رہے گی "قرآنی اسپرٹ" کا مبہم لفظ بھی موصوف کو کامیاب نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ وہ اپنے ابہام کی وجہ سے

بالکل بے معنی ہے۔ جس شخص کو قرآن و حدیث کی ذرہ برابر بھی سمجھ حاصل ہے وہ جان سکتا ہے کہ کتّے کے ذریعہ سے شکار کے جواز اور اس کے گھر میں رہنے سے ملائکہ رحمت کے نہ آنے میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اور نہیں تو ضرورتاً اور بلا ضرورت کا فرق تو بالکل ظاہر ہے مزید کہ کتا پالنے کی ممانعت پر کلب صید و کلب ماشیہ کو خود حدیث میں مستثنیٰ فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد اشکال کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ احادیث متعلق تصاویر میں شاہ صاحب نے تخالف کا بھی دعویٰ، بے دلیل کیا ہے۔ اس باطل دعویٰ کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔ ہم اس کے متعلق اتنا ہی کہتے ہیں کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شاہ صاحب نے مختلف مسائل متعلقہ تصویر میں خلط کر کے مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ شامی وغیرہ کتب فقہ سے یہ مسئلہ نقل کر کے کہ مصور کپڑے پر چند شرائط کے ساتھ نماز جائز ہو، تصویر کشی کے جواز پر استدلال کیا ہو حالانکہ یہ استدلال بالکل غلط اور بے محل ہے ضرورتاً ایسے کپڑے پر نماز کا جائز ہونا دوسری چیز ہے اور تصویر کھینچنا یا رکھنا بالکل دوسری شے مشہور مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص مغصوبہ زمین پر نماز پڑھے تو نماز ہو جائے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ کسی کی زمین غصب کر لینا بھی جائز ہے۔

عینی وغیرہ کے حوالے دے کر بھی شاہ صاحب نے دھوکا دیا ہے بلکہ خیانت بھی فرمائی ہے مثلاً عینی کی جس عبارت کا ترجمہ موصوف نے نقل فرمایا ہے اس میں "للضرورۃ" کی قید بھی ہے جسے موصوف نے قصداً حذف کر دیا کیوں کہ اسے ذکر کرنے کے بعد ان کے استدلال کی کوئی گنجائش ہی نہ رہ جاتی۔ اگر شاہ صاحب نے اس مسئلہ کے سلسلہ میں عینی شرح صحیح بخاری کا مطالعہ فرمایا ہے (جیسا کہ حوالہ دینے سے معلوم ہوتا ہے) تو یہ عبارت بھی ان کی نظر سے گذری ہو گی۔

وفی التوضیح قال اصحابنا	توضیح میں مذکور ہے کہ ہمارے اصحاب اور
وغیرهم تصویر صورة الحیوان	ان کے علاوہ دوسرے علما نے فرمایا ہے
حرام اشد التحریم وهو من	کہ ذی روح کی تصویر بنانا بالکل حرام ہے
الکبائر سواء صنعه لما	جس کی حرمت بہت سخت ہے اور وہ گناہ

یمتهن او بغیرہ فحرام بکل
حال لان فیہ مضاھاۃ لخلق
اللہ وسواءٌ کان فی ثوب
او بساط او دینار او فلس او
اناء او حائط
.... و بمعناہ قال جماعۃ العلماء
مالك و الثوری و ابو حنیفہ
وغیرھم
(عینی جلد دھم)

کبیرہ ہے خواہ وہ تصویر ایسے کام کے لئے
بنائی گئی ہو جس میں اس کی ذلت ہوتی
ہو یا اور کسی مقصد کے لئے ہر حالت میں
حرام ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی
صفت خلق میں شرکت کا دعوی پایا جاتا
ہے یہ حرمت ہر حال میں ہے خواہ وہ
کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار پیسے
برتن، دیوار وغیرہ میں۔
یہی قول جماعت علما، امام مالک، امام
ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے علاوہ
دوسرے علما کا ہے۔

اس عبارت کو سامنے رکھئے کہ شاہ صاحب کے حوالہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور اس کا صحیح مفہوم کیا نکلتا ہے۔ موصوف نے پہلی خیانت تو یہ فرمائی ہے کہ

اباح ما کان رقمًا[ے] فی
ثوب للضرورۃ

ضرورت (شرعی) کی وجہ سے کپڑے میں
جو نقش و نگار کی قسم کی) تصویر بنی ہو اس
کی اجازت دی ہے۔

للضرورۃ کا لفظ بھی ساقط کر دیا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ آپ تو اپنا دعوی بھی بھول گئے! ثابت تو کرنا ہے علی الاطلاق مصوری اور تصویر رکھنے کا جواز مگر ثبوت صرف اس کا پیش کرتے ہیں کہ کسی ضرورت (یعنی جو شریعت میں ضرورت سمجھی گئی ہو یہ نہیں کہ جسے شاہ صاحب ضرورت سمجھ لیں جو ایک قسم کی مجبوری ہے۔) کی وجہ سے اگر اس قسم کے کپڑے پہن لئے جائیں تو گناہ نہ ہو گا۔ کجا دعویٰ اور کجا دلیل دونوں میں کوئی تعلق بھی ہے؟ اور مصوری کا تو جواز بضرورت بھی

ے "رقم" کے معنی درحقیقت دھاریوں اور نقوش کے ہیں۔ جاندار کی تصویر اس میں داخل نہیں ہو (دیکھئے لسان العرب) لیکن میں نے اتمام حجت کے لیے ذی روح کی تصاویر کو بھی اس میں داخل مان لیا ہے۔

اور یہ نہیں ثابت ہوتا اس لئے کہ اس کا تعلق سرے سے مصوری سے ہے ہی نہیں۔

دوسری خیانت یہ فرمائی کہ اسی عبارت کا آخری حصہ چھوڑ دیا اور وہ یہ ہے۔

وبقی النهی فیما لا یمتهن — ایسی تصویر دار چیزوں کا رکھنا بدستور ممنوع رہا جو ذلیل نہیں سمجھی جاتیں۔

اقوال علما نقل کرنے میں بھی موصوف نے اسی قسم کی مغالطہ انگیزیوں سے کام لیا ہے۔ اس سے قطع نظر ایک بات اور بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ جمہور علماء کے قول کے سامنے شاذ اور انفرادی آراء کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ فقہ اسلامی اور اس کے اصول و قواعد سے جس شخص کو ذرہ برابر بھی مناسبت ہوگی وہ اس اصول کی تصدیق کریگا ایسی صورت میں اگر بالفرض واقعی بھی یہ ہوتا کہ یہ اقوال شاہ صاحب کے مؤید ہوتے تو بھی ان کی بنا پر فتویٰ دینا بالکل غلط اور خلاف اصول ہوتا۔ نہ کہ اس صورت میں جب کہ یہ موصوف کے دعوے کا ثبوت بن ہی نہیں سکتے انھیں نقل کرنا فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ اصول بھی یاد رکھئے کہ کسی مجتہد کا مسلک دوسری چیز ہے اور اس سے کوئی روایت دوسری چیز ہے۔ فتویٰ مسلک کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ روایت کی بنا پر۔

گڑیوں کے متعلق جواز کا قول نقل کرنے پر مجھے اس مریض کا لطیفہ یاد آگیا جس نے معالج سے فصد کے بعد لڈو کھانے کی اجازت حاصل کرکے ایک سیر نکتیوں کا ایک لڈو بنوا کر اس کا لطف بھی لیا تھا۔ استدلال کرنے والے گڑیوں کا نام سن کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ جاپانی گڑیوں کی طرح کی گڑیاں ہوتی ہوں گی جن کے ہاتھ پیر کان ناک سب انسان کی طرح بنے ہوں گے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں تو [illegible] سے بس ایسی مشابہت ہوتی تھی جیسے بعض درختوں کی شاخوں وغیرہ کو یا بعض پھلوں یا پھولوں کو کسی حیوان سے مشابہت ہوتی ہے۔ مثلاً گل نرگس کو آنکھ سے مشابہت ہوتی ہے۔ دور نبوی ﷺ کے مصنوعات کو بیسویں صدی کے مصنوعات پر قیاس کرنا دیدہ و دانستہ بے راہ روی اختیار کرنا ہے۔

مضمون کا خاتمہ "فلم" کے رنگین تذکرہ پر ہوا ہے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ساری خامہ فرسائی کا مقصد حقیقی یہی رنگین خاتمہ بالخیر تھا۔ مگر نتیجہ بہت دلچسپ نکالا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"چناں چہ مقصد اور نتائج کے لحاظ سے کسی فلم کے مضر یا مفید ہونے کا فیصلہ دیا جا سکتا ہے اور نفس فوٹوگرافی کے جواز و عدم جواز کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

فلم کی بحث تو شاہ صاحب نے یہاں چھیڑی نہیں ہے۔ یہ جملے تو صرف آئندہ اس کی سرپرستی کے متعلق وعدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن خط کشیدہ جملے کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ کون سا نیا انکشاف فرمایا ہے۔ کون کہتا ہے نفس فوٹوگرافی ممنوع ہے۔ بحث تو جاندار اشیا کی فوٹوگرافی کے متعلق ہے اس کا گناہ اور ممنوع ہونا ثابت ہے۔ اور اس میں بھی ضرورت شرعی کے وقت مثلاً پاسپورٹ، علاج، تشریح وغیرہ کے لئے، عام طور پر علما جواز کے قائل ہیں۔ بے جان اشیا کی تصویر بالاتفاق جائز ہے۔ آپ کو تو علی الاطلاق جواز ثابت کرنا تھا مگر اسے آپ ثابت نہیں کر سکے۔ اور نہ قیامت تک ثابت کر سکتے ہیں۔ پھر اس طول فضول سے سوا اضاعت وقت کے کیا حاصل ہوا۔

ایک ناقابلِ برداشت روش

از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند و ممبر پارلیمنٹ)

ذیل میں جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ایک پارلیمانی تقریر کی اخباری رپورٹ درج کیجا رہی ہے اس تقریر کی اہمیت یہ ہے کہ نصابی زہر سلانیوں پر پارلیمنٹ میں یہ پہلا کھلا احتجاج ہے۔ ہم اس ادائے فرض پر مولانا موصوف کو مُبارکباد پیش کرتے ہیں۔ یہ تقریر مارچ ۶۰ء کے اجلاس کی ہے —— (ادارہ)

محترم ڈپٹی اسپیکر صاحب

میں آج ایک خاص بات کی طرف محترم ایجوکیشن منسٹر صاحب کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان پچھلے چند برسوں میں اس بات کی طرف مختلف موقعوں پر پارلیامنٹ میں توجہ بھی دلائی گئی ہے، لیکن ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے، ہمارے کانسٹی ٹیوشن بننے کے بعد یہ بات بہت صاف کر دی گئی ہے کہ جہاں تک تعلیم اور شکشا کا تعلق ہے گورنمنٹ صرف سیکولرزم کے مطابق اور نیشنلزم کے مطابق کتابوں کے کورس کو اپنی تعلیم کے اندر جذب کرے گی، کسی کے مذہب اور کسی کے دھرم کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر نہیں ہے۔ یہ بات ہم نے بھی بہت ہی مفید سمجھی، اور یہ صحیح قدم ہے، جو کہ یقیناً تعلیم کے سلسلہ میں سیکولر اسٹیٹ میں ہونا چاہئے۔

لیکن بدقسمتی سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ذریعہ جو کتابیں پرائمری ایجوکیشن میں اور مڈل کی تعلیم میں ہندوستان کی مختلف اسٹیٹس میں جاری ہیں، ان میں یہ بات محسوس ہوتی ہے، بہت واضح طور پر کہ ان کتابوں میں کسی خاص انداز سے اس طرح کے بیان اور اس طرح کے مضمون لائے جاتے ہیں جس میں خاص طور پر مسلمانوں یا اسلام کے بارے میں جتنا بھی خلاف لکھا جا سکے لکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اگر یہ نہ بھی ہو، تو کم سے کم اس طریقہ سے لکھا جائے جس سے کسی ایک مذہب کا

پروپیگنڈا ہو، اور دوسرے مذاہب پر اس کا بُرا اثر ہو۔

اس بارے میں پچھلے برسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشن منسٹری کے سامنے اور ایجوکیشن منسٹر مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے سامنے بھی میں نے تقریباً ۲۵، ۳۰ کتابیں مختلف ریاستوں سے پیش کر کے ضبط کرائی تھیں۔ ان کی تحقیق کی تو معلوم ہوا، اور اسٹیٹ گورنمنٹوں نے بھی تسلیم کیا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح وہ کتابیں داخل کی گئیں، اور آخر کار وہ ضبط کی گئیں۔ لیکن ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہونے کے باوجود آج تک یہ سلسلہ برابر ایک سیلاب کے طریقے سے ہم دیکھ رہے ہیں، تعلیم میں اسکولوں کی کتابوں میں دانستہ یا نادانستہ جس طرح بھی ہو ایک سیلاب کی طرح کا سلسلہ جاری، اور کتابوں میں دونوں چیزیں برابر موجود ہیں۔ پچھلے زمانہ میں تقریباً ۶۵ کتابوں کے بارے میں ایک فہرست بنا کر بھی بھیجی گئی۔ ہم نے یہ بتایا کہ اس قسم کی کتابیں اس قابل نہیں ہیں جو کہ تعلیم میں رکھی جاسکیں، وہ بہت مضر ہیں، اور اس سے دوسرے مذاہب کی ہانی بھی ہوتی ہے، اور سیکولرزم اور نیشنلزم کے خلاف بھی ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ سیلاب کتا نظر نہیں آتا۔

جب ہم کبھی کبھی ایسی تقریریں کرتے ہیں تو کتابیں مانگی جاتی ہیں، ہم وہ کتابیں مہیا کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکمۂ تعلیم یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان چند کتابوں کے بارے میں شکایت تھی اور اسنے شکایت دُور کر دی۔ حالانکہ صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ صورتِ حال دو چار، دس بیس، یا پچیس کتابوں کو بیان کر دینے تک ہی نہیں۔ آج اگر کوئی کمیٹی بٹھلائی جائے، اور اس بارے میں اہمیت کے ساتھ تحقیقات کرائی جائے تو بلا مبالغہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس فیصدی کتابیں پرائمری اور مڈل تعلیم کے کورس میں اس قسم کی داخل ہیں جن میں سیکولرزم کے خلاف ایک خاص مذہب کا پروپیگنڈہ کسی طریقے سے ہے، یا کھلی ہوئی کسی دوسرے مذہب کی ہانی اور اسکے متعلق اس قسم کی توہین موجود ہے، چاہے وہ الہامی کتاب کے بارے میں ہو، مثلاً مسلمانوں کے قرآن یا پیغمبر صلعم کے بارے میں ہو، یا مسلمان بادشاہوں کے خاص واقعے کے بارے میں ہو۔

شری پرکاش ویر شاستری (گڑگاؤں) :۔ کوئی نمونہ پیش کیجیئے ؟۔

مولانا حفظ الرحمٰن :۔ میں نمونہ پیش کرنے کے لئے نہیں کھڑا ہوا ہوں، لیکن اس طرح کی ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہو چکی ہیں، اور ۶۵ کتابوں کی فہرست دی جا چکی ہے، نمونہ کی ذمہ داری میں نہیں

لے سکتا، لیکن اس کے لئے چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی تمام اسٹیٹوں میں تحقیقات کرائی جائے اور تقریباً ۵۰ فیصدی کتابیں ایسی کورس کے اندر ثابت نہ ہوں تو اس سے زیادہ جرم میرے خلاف یا میری ذمہ داری کے خلاف کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ میں یہاں پر کوئی دو چار کتابوں کا حوالہ نہیں دینا چاہتا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب کتابیں پیش کی گئیں۔ ان کے اقتباسات بھی پیش کئے۔ لیکن آج میں اس بیماری کو دق کے درجہ کی برابر سمجھ کر یہ گذارش کر رہا ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو خاص طور پر چیک کیا جائے۔

مختلف کانفرنسوں میں تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، وہ تجاویز مختلف انجمنوں جمعیۃ العلمائے ہند اور دوسری انجمنوں جیسے انجمن ترقی اردو کی طرف سے بھی آئی ہیں جن میں دو باتیں کہی گئی تھیں، ایک بات یہ کہ ایک سب کمیٹی ہو جو اس قسم کی کتابوں کو چیک کرے۔ ابھی ابھی "کرانتی کی لہریں" نام کی ایک کتاب ہم نے اپنے ایجوکیشن منسٹر محترم کو ۶ یا ۷ دن ہوئے دی تھی، انھوں نے خود ہی مجھ سے اقرار کیا کہ اسکے اندر بہت سخت اور قابل اعتراض مضمون اسلام کے خلاف ہیں، اور وہ کئی برسوں سے اتر پردیش میں پڑھائی جا رہی ہے۔

اس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے، لیکن کوئی بات آگے نہیں بڑھتی۔ اس طرح کے واقعات راجستھان میں، اس طرح کے واقعات بہار میں، اس طرح کے واقعات دوسری اسٹیٹوں میں برابر جاری ہیں، اسلئے میں تو دق کے درجہ کی بات کہہ رہا ہوں۔ لہٰذا اس بات کا لحاظ ہونا چاہیئے۔ آج مسلمان عوام کہتے ہیں اور ہم کو طعنہ دیتے ہیں کیوں صاحب یہ سیکولرزم ہے، یہ سیکولر اسٹیٹ کی کتابیں ہیں، جن میں کھل کر اسلام کے خلاف، قرآن کے خلاف، قومی اصول کے خلاف یہ باتیں موجود ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس تعلیمی سیکشن کو جو تعلیم کا ہی حصہ ہے، اس کو غالباً کسی ایک مذہب کے پروپیگنڈا کے تبلیغی ادارے کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

چیزیں سامنے آتیں بشرطیکہ ان کو اہمیت دی جاتی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے، کہ کہنے والا آدمی ہندو مسلمان کے نام سے کیمونلزم کی بات کہہ رہا ہے۔ ہمارے لئے بڑی مشکل ہے، ہماری جنتا جو کہتی ہے ان باتوں کو جب ہم یہاں کہتے ہیں، اور جب کتابیں دکھلاتے ہیں کہ ان کی معقولیت اور ان کے اعتراض صحیح ہیں، تو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ جب تقریریں گے، تو ہمیشہ

ہندو مسلمانوں کا سوال پیدا کریں گے، یا کمیونلزم کی باتیں کہیں گے، ہمارا تو وہی حال ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؂

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

یہ صورت حال بہت ناقابلِ برداشت ہے، اور تعلیم کے بارے میں تو بالکل ہی برداشت کے قابل نہیں ہے، اسلئے کہ تعلیم تو بچے کے دماغ کو شروع سے ہی ایک خاص طریقے پر کنٹرول کرنے کیلئے ہے، اگر یہ ملک سیکولر اسٹیٹ ہے، اور بجا طور پر اس کا فخر ہے تو ہر چیز کو سیکولر ہونا چاہئے اور تعلیم کے اندر جو سب سے زیادہ اہمیت کی چیز ہے، اگر ایک خاص مذہب یا دھرم کا پروپیگنڈہ ہو تبلیغی ادارے کی حیثیت سے، اور دوسرے کے مذہب کی توہین ہو، تو یہ چیز ناقابلِ برداشت ہے، اس کے لئے صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے، کہ کتابیں ٹھیک کیجئے۔

۵۰، ۶۰ کتابوں کو اگر ٹھیک کر دیا جائے گا تب بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اگر اس کی اہمیت سمجھی جائے اگر اس چیز کو محسوس کیا جاتا ہے، اگر ایک خاص نقطۂ نظر سے اس بات کو دیکھا جا سکتا ہے کہ اس سے خاص طور پر کچھ اقلیتوں کو تکلیف ہے، اور اس حیثیت سے محسوس کر کے اس کی چیکنگ کی جائے، تو ضرورت دو باتوں کی ہے، ایک ایسی کمیٹی ہو جو کہ اس چیز کو مختلف ریاستوں میں چیک کرے، اور اس قسم کی کتابیں جو ہوں، اُن سب کو خارج کرائے، اور ان کو کورس سے نکال دیا جائے، اور دوسرے یہ کہ آئندہ جو ہماری ٹیکسٹ بکس کمیٹی بنتی ہیں ان میں دو باتیں ہونی چاہئیں، یا تو یہ کہ جو مضمون اور جو چیز لکھا جائے، وہ اس مذہب کے آدمی سے لکھوایا جائے، اور اگر یہ بات مشکل ہے، تو ہمیں کوئی اس بات میں مشکل میں ڈالنا نہیں ہے۔

سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ ایک ہندو اگر اسلام پر کوئی ایک کتاب لکھے، تو وہ اتنا ماہر ہو کہ وہ اسلام ..... کے بارے میں بنیادی خیالات کیا ہیں ان کو تو جانتا ہو، وہ اتنا تو جانتا ہو کہ آخر اسلام کے، ہندو دھرم کے، عیسائی مذہب کے، یا سکھ دھرم کے آئیڈیاز کیا ہیں؟ اور اس مذہب کے جس کے بارے میں وہ کتاب لکھ رہا ہے اسکے کیا اصول ہیں؟ اگر اتنا بھی نہیں جانتا، تو یوں کتابیں لکھ دیتا، اور کچھ اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ اور کچھ مختلف کوششوں کے ذریعہ ان کتابوں کو کورس میں

شامل کرالینا کتنے بڑے افسوس کی بات ہے۔

ابھی پچھلے سال یہاں دہلی میں ایک کتاب اس قسم کی لکھی گئی، جب میں نے اس کی بابت مصنف صاحب سے جاکر بات چیت کی، تو یہ پایا کہ واقعی مصنف صاحب بہت سیدھے سادھے آدمی تھے اور ان کا مقصد اسلام کی توہین کرنا نہیں تھا۔ انھوں نے معذرت میں کہا کہ میں کیا کروں، مجھے اسلام مذہب کے بارے میں جو باتیں معلوم تھیں، وہ میں نے اس میں لکھ دی ہیں اور کوشش سے میری کتاب ٹکسٹ بک کی کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہوگئی۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کوئی بھی کتاب ایرا غیرا لکھ مارے، اور وہ یوں ہی مذاق کے طور پر ٹکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہوجایا کرے، ایسے شخص سے جو نہ ایکسپرٹ ہو، اور نہ جس میں تعلیمی مہارت ہو۔ اس طرح کتابیں لکھوانا کہاں تک واجب اور مناسب ہے۔ اسلئے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں اگر ایسو ماہر ہوں جو کہ کسی طرح کا تعصب نہ رکھتے ہوں اور جو کہ اس مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے ہوں، اُن کے ذریعے اس طرح کی کتابوں کو لکھوایا جائے، تو وہ بہتر طریقہ ہوسکتا ہے۔

لیکن میں چاہتا تو یہ ہوں کہ وہ کتابیں جو کہ ہمارے اسکولس میں ہوں، اُن میں سوائے نیشنلزم کے کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ بیشک مسلمانوں کے نبیوں کا ان میں ذکر ہو۔ بیشک بہتر سے بہتر جو ہمارے ہندوستان میں رشی منی گذرے ہیں، ان کا ذکر کرو اور تواریخ کی حیثیت سے ان کا ذکر کرو، لیکن ایسے آئیڈیاز نہ بیان کرو اور وہ طریقے نہ تبلاؤ..... جس سے ایک مذہب کا تصادم دوسرے مذہب سے ہوتا ہو، اور ایک مذہب کی توہین دوسرے مذہب کے ذریعہ ہوتی ہو، یہ کام ان مجلسوں کا ہے جو باہر مناظرے ہندو مسلمانوں کے، سکھ مسلمانوں کے، یا سکھ ہندوؤں کے کراکران کو آپس میں لڑاتی ہیں یہ کام ہمارا نہیں ہے، گورنمنٹ کا نہیں ہے، اور ایک سیکولر اسٹیٹ کا نہیں ہے، اس بناء پر میں بہت دکھ سے یہ بات کہنے کو تیار ہوں کہ اس چیز کو بہت ہی معمولی سمجھا جاتا ہے، اور وقتی تقریر کے ذریعہ یہ چیز ختم کردی جاتی ہے، اس پر خاص توجہ دینی چاہئے۔

مقصد اور راستہ کا تعین

از، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ

اجتماع بھوپال میں حضرت مولانا مدظلہ کی ارشاد فرمائی ہوئی تقریر کا خلاصہ ــــ
مرتبہ جناب ابوالمرغوب صاحب، معاصر تاج منزل بھوپال کے صفحات سے،
ذیلی سرخیوں کے اضافہ کے ساتھ ــــــــــــــــ ادارہ

بعد خطبۂ مسنونہ :-

ہم اور آپ جو مختلف مقامات سے اس سخت سردی کے موسم میں بھوپال کی اس عالیشان مسجد میں جمع ہوئے ہیں اس کا مقصد خالی تقریر کرنا یا سننا نہیں ہے۔

انسانی زندگی اور محنت ہماری زندگی میں محنت مشقت کا عام رواج ہے اور ہماری محنتیں مختلف مشاغل میں صرف ہو رہی ہیں، اس اجتماع میں ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہماری یہ محنتیں ہمیں کامیابی کی طرف لے جا رہی ہیں، یا ناکامی کی طرف، اپنی محنت کے رخ کو صحیح سمت موڑنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ساری کائنات محنت میں لگی ہوئی ہے، اور ہمیشہ لگی رہے گی، انسان کی فطرت میں محنت ودیعت کر دی گئی ہے، باری تعالیٰ کا کلام پاک میں ارشاد ہے "لقد خلقنا الانسان فی کبد" (ہم نے انسان کو محنت و مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔)

محنت کا مقصد اور کامیابی کا گر کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ محنت کامیابی کے حصول ہی کے لئے کی جاتی ہے، ناکام ہونے کے لئے کوئی محنت نہیں کرتا، انسانیت کا متحدہ موضوع و مقصد یہ ہے کہ کامیابی سے ہمکنار ہو اور ناکامی سے بچے۔ یہ بھی امر مسلمہ ہو کہ ہر محنت

کرنے والا کامیاب نہیں ہوتا، صرف وہ محنت کرنے والا کامیابی کی چوٹی پر پہونچتا ہے، جو حقیقتوں پر صحیح محنت کرتا ہے، اس میں کسی فرقہ اور تعداد کی قید نہیں، اکثریت و اقلیت، سرمایہ دار و فقیر، حاکم و محکوم، تخت نشین جو بھی محنت کے رخ کو صحیح کرلے گا کامیاب ہو جائے گا۔ محنت کرنے سے پہلے مقصد محنت و طریقۂ محنت کا تعین ضروری ہے، تھوڑی سی صحیح محنت بھی بہت سی غلط محنت سے بہتر نتائج مرتب کرنے والی ثابت ہوگی۔ اگر آج ہماری محنتوں کا رخ صحیح ہو جائے تو نہ صرف ہمیشگی کی کامیابی سے سرفراز ہو جائیں، بلکہ صدیوں تک ہماری نسلیں اس کامیابی کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوں۔

محنت کرنے والوں کی مختلف حالتیں اور انسانی وحدت

محنت کے مختلف خانے ہیں، اکثریت کا خانہ اقلیت کا خانہ، حکومت کا خانہ، محکومیت کا خانہ، دولت کا خانہ، غربت کا خانہ، عزت کا خانہ، ذلت کا خانہ، کاشتکاری کا خانہ، تجارت کا خانہ، ملازمت کا خانہ، وکالت کا خانہ، ڈاکٹری کا خانہ، انجینیری کا خانہ، غرض چیزوں کے مختلف خانے ہیں۔ تم خواہ کسی خانے میں بھی رہو، انسانیت کے خانے سے باہر نہیں ہو سکتے اور خدا کا ضابطہ و قانون ہر خانہ پر لاگو رہے گا۔

کامیابی و ناکامی کا ہمہ گیر خدائی ضابطہ

ان خانوں کے بنانے والے خدا نے ان سے کامیابی حاصل کرنے کے لئے محنت کے کچھ اصول و ضابطے مقرر کر دئیے ہیں۔ اگر ان کو ملحوظ رکھ کر محنت کی جائے گی، تو ان خانوں سے کامیابی نکلے گی اور اگر ان سے ہٹ کر محنت کی جائے گی تو انھیں خانوں سے ناکامی آئے گی۔ ان خانوں میں بالذات کامیابی و ناکامی نہیں ہے، وہ تو صرف ان خانوں کے پیدا کرنے والے کے خزانوں میں ہے۔ اگر خداوند قدوس کا پسندیدہ عمل کیا جائے گا، کامیابی آئے گی اور اگر ناپسندیدہ عمل کیا جائے گا، ناکامی و نامرادی سے سابقہ پڑے گا۔

اس میں حاکم و محکوم، اکثریت و اقلیت، عزت و ذلت، امیری و غریبی کسی پر انحصار نہیں ہے، قرآنی واقعات اس بات کے گواہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کی محنت کے رخ صحیح تھے، کامیاب

ہوگئے، اگرچہ اقلیت و محکومیت، ذلت و فقر میں تھے اور ان کے مخالف باوجود اکثریت، حاکمیت عزت و امارت کے خزانوں میں ہونے کے ناکام بنا دیئے گئے یہی حال تمام انبیاء کرام اور ان کے مخالفوں کا ہوا، غرض یہ کہ اعمال کی محنت کے صحیح ہونے پر کامیابی کا دار و مدار ہے۔

صحیح عملی محنت کے دو شرائط

اعمال کی صحیح محنت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک مقصد زندگی کا تعین اور دوسرے حصول مقصد کے راستہ کا تعین، زندگی کا مقصد خدا پرستی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا اتباع ہے۔ دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ وہی اعمال اختیار کئے جائیں، جو اللہ کو محبوب ہیں۔

مقصد زندگی کا تعین

بلند مقصد انسانی زندگی کو بلند کرتا ہے اور مقصد کی پستی انسان میں پستی پیدا کرتی ہے۔ اللہ رب العزت سب سے بلند ہیں، اگر ان کی رضا کو مقصد بنا کر محنت کی جائے گی انسان بلند ترین مقام پر پہونچ جائے گا۔ اور اگر خواہشاتِ نفسانی اور مادی چیزوں پر جان کھپائی جائے گی انسان پستی اور تنزل کے گڑھے میں جا گرے گا۔ انسان خداوند قدوس کے لامحدود خزانوں سے بھرپور حصہ پا سکتا ہے، اگر وہ یہ طے کر لے کہ اپنے اعمال کی درستگی اور پاکی کے راستہ کی محنت کو اپنانا ہے، مقصد کی بلندی اور اعمال کی درستگی جیسے جوہروں کو پیدا کرنے والے انسان کے تابع نظامِ عالم کو کر دیا جاتا ہے اور فرشتے تک ان کے پیروں تلے اپنے پر بچھانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ انسان کا وجود اپنی خلقت کے اعتبار سے گندہ ہے۔ اپنے وجود کو راحت و آرام پہونچانے کے نتیجے میں اچھے اخلاق و اعمال کا پیدا ہونا محال ہے، اپنے وجود کو مقصد بنانا ذلت و خواری کے گڑھے میں گرا دے گا، اسکے برعکس اپنے خدا کو پا لینے اور اسکی رضا کو حاصل کرنے کا مقصد بلند و اعلیٰ ہے اس پر محنت کرنے سے اعلیٰ پسندیدہ اعمال و اخلاق ظہور میں آئیں گے۔

راستہ کا تعین

دوسری ضروری چیز حصول مقصد کے راستہ کا تعین کرنا ہے، صحیح راستہ ہی مقصد کو پہونچائے گا، اپنے وجود، مادی اشیاء اور مال و دولت کے راستہ سے بلند مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا، اعمال کا جو راستہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا، اور جس کی آپ نے تلقین فرمائی وہ بلند راستہ ہے، حضور اکرم کے اعمال زندگی ہی اللہ کو پسند ہیں، حضور کا تبلایا ہوا چھوٹا سا عمل بھی سارے عالم پر بھاری پڑے گا۔ اللہ کی رضا کو مقصد بنا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو

اختیار کر لینے سے بڑی سے بڑی مصیبت بھی ہیچ معلوم ہوگی، خواہش پوری ہونے پر الحمد للہ اور اسکے ٹوٹنے پر انا للہ زبان سے نکلے گا اور دل اسکی تصدیق کرے گا۔

پیغام محمدی کا نچوڑ اس وقت ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اللہ نے کیا پیغام زندگی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں کو بھیجا، ایک رنگ اللہ کا ہے، دوسرا انسان کا، اللہ کا رنگ دینے کا ہے، اور انسان کا رنگ لینے کا۔ جب انسان اپنے رنگ میں رنگ جاتا ہے، خون خرابہ، فتنہ فساد، تباہی و بربادی پھیلتی ہے، حکومتیں انسانی رنگ میں رنگ کر یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کس طبقہ سے کس طرح لیا جائے انکی لینے کی حرص کسی طرح پوری نہیں ہوتی طرح طرح کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں، موت پر ٹیکس پیدائش پر ٹیکس، خوشی پر ٹیکس، غمی پر ٹیکس، خریدنے پر ٹیکس، فروختگی پر ٹیکس، مالدار پر ٹیکس، غریب پر ٹیکس، تاجر پر ٹیکس، کاشتکار پر ٹیکس، غرض ٹیکسوں کی ایسی ریل پیل ہوتی ہے کہ جینا دوبھر ہو جائے۔ دوسری طرف محکوم بھی اسی رنگ میں سوچتے ہیں۔ ہر ٹیکس سے بچنے کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں، غبن کئے جاتے ہیں۔ رشوتیں لی جاتی ہیں۔ چوریاں و ڈکیتیاں کی جاتی ہیں، غرض محکوم بھی انسانی رنگ میں رنگ کر لینے کی تدبیر سوچتا ہے اور اسکو عملی جامہ پہناتا ہے، نظام عالم اس انسانی رنگ کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جائے گا۔ حاکم و محکوم کی آپس کی ہمدردیاں ختم ہو جائیں گی، تعاون کا جذبہ فنا ہو جائے گا۔ یہ رنگ عداوت، نفرت، بغض و عناد کا بیج بو دے گا، آج یہی رنگ ہر طرف پھیلا ہوا ہے، امیر لینے پر، غریب لینے پر، دیسی لینے پر، پردیسی لینے پر، باپ لینے پر، بیٹا لینے پر، بیوی لینے پر، شوہر لینے پر تلا ہوا ہے، یہ جذبہ رذیل، حقیر اور ذلیل ہے، جو انسان کو پستی کے گڑھے میں اتار دے گا، اور اس دنیا کو جہنم بنا دے گا۔

مالک الملک نے فرمایا اے انسان تو لینے والا ہیں دینے والا، تو مجھ سے لے اپنے جیسے بے بس انسان کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا، اس سے لینے کی تمنا نہ کر، تیرے پاس بہت تھوڑا ہے اور میرے پاس لامحدود خزانے ہیں، تیرے پاس جو تھوڑا سا میں نے دیا ہے اسکو میری مخلوق پر لگا دے، اور پھر مجھ سے میرے لامتناہی خزانوں سے جتنا تیرا دل چاہے، لے لے، فقیروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے والا نہ بن، اللہ غنی سے لینے والا بن، تو دو روٹیاں میرے بھوکے بندے کو کھلا دے، اس زمین و آسمان سے بڑی جنت لے لے، اللہ کے رنگ میں رنگ جا پھر دنیا ہی

میں جنت کے مزے لوٹ لے۔ اپنے جیسے فقیر و حقیر انسان سے لینے کی حرص کرنا انسانیت کی توہین ہے۔

اس وقت ساری کائنات محنت میں لگی ہوئی ہے، لیکن محنت و کوشش کے باوجود دنیا فتنہ و فساد سے اس لئے بھر گئی ہے کہ انسانوں کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹ گئی ہے، مقصد کی پاکیزگی کے ساتھ ہی ساتھ سمت کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے، آج کی ترقی کا کمال یہ ہے کہ انسان کا خون اتنا چوس لیا جائے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مرجائے۔ لوٹ کھسوٹ کی یہ کشمکش ہر ایک طبقہ کے افراد میں موجود ہے، آجر و اجیر کا قضیہ ہو کہ سرمایہ اور محنت کی کشمکش، مزدور، کسان، متوسط طبقہ کے مسائل ہوں کہ حکومت کا بیرحمانہ حصول منفعت کا جذبہ، یہ انسانیت نہیں درندگی ہے۔ یہ سب خرابی اس وجہ سے ہے کہ سوچنے اور عمل کرنے کے انداز میں تبدیلی ہوگئی ہے، اگر یہ نقطۂ نظر عام ہوجائے کہ خالقِ کائنات سے لے کر اسکی مخلوق پر خرچ کرنا ہے، تو معاشرت، معیشت اور ریاست کی تمام خرابیاں دور ہوجائیں، کیونکہ خدا کے بہترین بندے ہی انسان کامل اور صحیح معنیٰ میں خادمِ خلق ہوتے ہیں۔

لینے کا تعلق خدا سے جوڑ اور دینے کا تعلق مخلوق سے، اسلام نے اپنی تعلیمات میں مخلوق کو نفع پہونچانے کا حکم دیا، اور زندگی کی ہر لائن میں خواہ وہ معاشرت ہو، تجارت ہو، زراعت ہو حصولِ نفع کو ممنوع قرار دیا، رشوت، غبن، چوری، ڈکیتی وغیرہ کو اسی لئے حرام قرار دیا گیا اور زکوٰۃ کو فرض کیا گیا، خالق سے لینے کا نام عبادت ہے اور مخلوق کو دینے کا نام اخلاق ہے، اگر تم خالق سے لینے والے اور مخلوق کو دینے والے بن جاؤ گے، خالق کو بھی پیارے ہو جاؤ گے، اور مخلوق کے بھی محبوب بن جاؤ گے۔

پیغام محمدی پر کاربند ہونے کے نتائج | کائنات کی ہر چیز پر خدا کا قبضہ ہے، وہ جس چیز کو جس طرح چاہیں استعمال کرکے تبلا دیتے ہیں، کائنات خدا کی محتاج ہے، خدا کائنات کے محتاج نہیں، اس کائنات میں بہت سی چیزیں انسان کے علم سے باہر ہیں خصوصیت سے ہر چیز کی روح انسان سے پوشیدہ ہے، خدا نے ہر چیز کو اسکی اصل اور نمونہ کے بغیر بنایا، خدا کے پاس ہر چیز کے لامحدود خزانے ہیں تمام خدا فراموش مخلوق اپنے خالق کے خزانوں سے بہت کم حاصل کرتی ہے، اسکے برعکس حضور اکرمؐ

والا ایک ایک عمل خدا سے بے انتہا دلوانے والا ہے جس نے مخلوق کو دینے والے اور خالق سے لینے والے اصول کو اپنایا، محبوب خلائق بن گیا۔

پیغام محمدی کو زندگی میں ڈھالنے کا واحد طریقہ

مقصد خدا کو بناؤ اور زندگی گزارنے کا طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھو، جس عمل میں حقیقی علم و یقین ذکر و اخلاص شامل ہو جائے گا۔ وہ عمل اللہ رب العزت کے یہاں مقبول قرار دیا جائے گا، ایمان ایک قلبی کیفیت کا نام ہے وہ گھر بیٹھے نہیں ملے گی، ایمان میں لذت، ذکر و فکر میں کیفیت، علم میں پختگی، اخلاص میں زیادتی، اخلاق میں نورانیت اس وقت پیدا ہوگی حب اللہ کی نسبت پر ان اعلیٰ صفات کے حصول کی طلب میں اپنی محبوبات اور خواہشات سے منھ موڑ کر اللہ کے دین پر محنت کرنے والے، اسکے لئے ذلتیں و مصیبتیں برداشت کرنے والے اس کے راستہ میں ٹھوکریں کھانے والے اور اسکی رضا کے لئے خوشامدیں کرنے والے بنو گے۔

ایک تجربہ

اگر زندگی میں یکبارگی تین چلے، ہر سال ایک چلہ اور ہر ماہ تین دن دینے والے بن جاؤ گے اور پابندی سے اپنے مقامی کاموں میں لگے رہو گے تو ان اعلیٰ صفات سے مناسبت پیدا ہو جائے گی۔ ان کی چاہت دل میں بیٹھ جائے گی، اور ایک دن وہ آئے گا کہ ان صفات کے حامل بن جاؤ گے، موت کا وقت معین کسی کو معلوم نہیں ہے، اس ناگہانی وقت سے پہلے پہلے ان صفات کے کرشاں بن جاؤ۔

چند دینی سوالات

مندرجہ ذیل سوالات معاصر صدق جدید کے توسط سے موصول ہوئے تھے اور مع جوابات صدق کی قریبی اشاعت میں شائع ہو چکے ہیں۔

دین اور عملی دینی زندگی کے چند سوال ذہن میں پیدا ہوئے ہیں، آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔

۱۔ فتنہ انکار حدیث کی جدید لہر کے بعد سے از سر نو تدوین حدیث کی مساعی بلیغ سے بقدر ظرف مطلع ہوا ہوں۔ کہیں یہ بھی پڑھا تھا کہ امام ترمذی کی کتاب کے علاوہ کسی قدیم حدیث کے مجموعے بخاری و مسلم وغیرہ میں احادیث کو مشہور، صحیح، مرفوع ضعیف وغیرہ قسموں میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔ اور ترمذی شریف میں بھی صرف سلسلۂ روایت کے قطع ہونے یا کسی راوی کے مشتبہ ہونے کی بنا پر بعض احادیث کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کسی حدیث کو جانچنے کے لئے لامحالہ اسماء الرجال اور ناقدین حدیث کی بحثوں کا سہارا لینا ہوگا۔ اور یہ عامیوں کے بس کی بات نہیں۔ اپنی حقیر رائے یہ ہے کہ اگر تدوین حدیث دیگر ضروری اور مفید طریقوں کے علاوہ اس طرح بھی ہو جائے کہ جملہ مشہور اور صحیح احادیث الگ کر کے لکھ دی جائیں جو بوقت ضرورت عالم و عامی سب کو ہدایت دے سکیں تو بڑا کام ہوگا۔ اس کام کے لئے کوئی دینی ادارہ یا حکومت پاکستان اگر ہر مسلک کے علمائے حدیث کا ایک بورڈ قائم کر کے اس نہج پر تدوین حدیث کرا دے تو بڑی خدمت ہو۔

اگر اس قسم کی تدوین پہلے ہو چکی ہو تو میری لاعلمی بلکہ جہل کو نظر انداز فرما کر کتاب سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ عرصے سے واقف ہوں کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے زکات دینا بند کر دیا ہے۔
ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلام میں یہ بات پھر نظر سے گذری کہ زکات اسلامی معاشرہ کے لئے کتنی اہم ہے۔ لیکن اس غیر اسلامی نظام میں کئی الجھنیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ حکومت یا معاشرے کی طرف سے کسی ضرورت مند فرد اور اسکے خاندان کی امداد کی عدم موجودگی میں مستقبل کے لئے بچانا آج زندگی کی جدوجہد کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ جن لوگوں کی مستقل آمدنیاں ہیں۔ وہ یقیناً ان میں سے زکات بغیر کسی بھی عذر کے دے سکتے ہیں۔ لیکن وہ رقم جو کسی آئندہ پیش آنے والی ناگزیر ضروریات مثلاً تعلیم اولاد یا امداد ورثہ بعد فوت وغیرہ کے لئے بچائی جارہی ہو۔ خود قومی اثاثہ کے مثل ہو جاتی ہے۔ اسکے بارے میں تأمل ہوتا ہے۔

دوسری صورت ان رقموں کی ہے جو کسی شخص کو اسکی ملازمت کے خاتمہ پر ریٹائرمنٹ فنڈ وغیرہ کی شکل میں ملتی ہیں اور جو اسکی زندگی کی آخری کمائی کا حکم رکھتی ہیں۔ اسکی نوعیت اور کیوں [illegible] ہے۔

تیسری قسم کی وہ رقمیں ہیں جو کسی بیوہ کو اسکے شوہر کے ترکہ میں ملتی ہیں اور جن پر اسے اپنی پوری زندگی گزارنی ہے۔

اپنی بے علمی کے باعث میں یہ بھی نہیں جانتا کہ مال الیتیم کی زکات کا کیا حکم ہے۔ اور اگر یہ مال مستثنیٰ ہے تو کیا مذکورہ بالا رقمیں اس قسم کی نہ ٹھہریں گی۔ مزید کہ کیا ایسی رقموں پر ایک بار زکات ادا کر دینا کافی ہو سکے گا؟

۳۔ موجودہ دور میں تقریباً ہر صاحب استطاعت فرد کو ڈاکخانہ سے اور زیادہ حیثیت والوں کو بینک سے روپے کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ کیا انکی دی ہوئی INTEREST کی رقم نفع ہی میں شمار ہوگی؟ مزید یہ کہ دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر بھی تقریباً تمام کاروبار بینک ہی کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ اسلامی حکومتیں بھی بینکوں کی سرپرستی پر خود کو مجبور پاتی ہیں۔ ایسی صورت میں سود کے متعلق شریعت کے احکام کو عملاً کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟ میرا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت خالص شریعت کو اپنا دستور بنائے تو بینکوں کے معاملے میں کیا کرے؟

.......م، ایس، سی ریسرچ اے (لکھنؤ یونیورسٹی)

جوابات

(از: محمد منظور نعمانی)

(۱) معلوم نہیں کس کتاب یا مضمون کے مطالعہ سے مستفسر صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو کہ حدیث کی کوئی کتاب ایسی مرتب نہیں ہوئی جس میں صرف صحیح احادیث ہی کو لیا گیا ہو ـــــــ اصل واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی مشہور و متداول کتابوں میں بھی متعدد ایسی کتابیں ہیں جن میں صرف صحیح روایات ہی کو لیا گیا ہے اور ان میں کسی حدیث کا ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ مؤلفِ کتاب کی تحقیق اور اسکے معیار کے مطابق یہ حدیث بالکل صحیح اور مقبول ہے اور جو شخص راویانِ حدیث کے احوال اور انکی جرح و تعدیل سے خود واقف نہ ہو وہ ان حدیثوں پر اعتماد کر سکتا ہے بلکہ یہ کتابیں اسی مقصد سے اور اسی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی ہیں۔

اس خصوصیت میں سب سے اوّل اور اعلیٰ درجہ صحیح بخاری شریف کا ہے اس کا معیارِ صحت اتنا بلند اور سخت ہے کہ بہت سے ائمہ حدیث نے اس کو غیر ضروری تشدد قرار دے کر اس سے اختلاف کیا ہے اسکے بعد دوسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے۔ اِن دونوں اماموں نے اس کا التزام کیا ہے کہ اپنی کتاب میں پوری سند کے ساتھ صرف اسی حدیث کو ذکر کرینگے جو اُن کے مقررہ معیار پر بالکل صحیح ہے۔

موطا امام مالکؒ کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی ہے ـــــــ باقی صحاح متداولہ میں سے سنن ابی داؤد کا حال بھی یہی ہے کہ جس روایات میں انھوں نے کوئی علت نہیں بتلائی وہ سب ان کے نزدیک صحیح یا حسن اور قابل قبول ہیں، اہل مکہ کے نام لکھے ہوئے اپنے خط میں خود انھوں نے اسکی تصریح کی ہے ـــــــ نیز یہی حال اور یہی درجہ سنن نسائی کا ہے۔ امام ترمذیؒ کا رویہ اپنی جامع میں یہ ہے کہ ہر حدیث کی نسری حیثیت کے بارہ میں قریب قریب بالالتزام وہ اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ صحیح ہے، حسن ہے، غریب ہے یا ضعیف ہے۔

حدیث کی مطبوعہ و متداول کتابوں میں مستدرک حاکم بھی ایسی ہی کتاب ہے جس میں

اسکے مؤلف امام ابوعبداللہ حاکم نے صرف ان ہی حدیثوں کو جمع کیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہیں اور ہر حدیث پر صراحۃً صحت کا حکم بھی لگایا ہے بلکہ اپنی خاص اصطلاح کے مطابق اس کا درجۂ صحت بھی بتلایا ہے۔ لیکن محققین کی عام رائے یہ ہے کہ ان سے حدیثوں کی تصحیح میں بہت تسامحات ہوئے ہیں (جس کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ کتاب انھوں نے عمر کے بالکل آخری حصہ میں مرتب کی تھی جبکہ ان کا حافظہ اور ان کا علمی تیقظ کبرسنی سے متاثر ہو چکا تھا اور ان کو نظر ثانی کا پورا وقت بھی نہیں ملا۔ واللہ اعلم۔) مگر حافظ ذہبی نے اس پوری کتاب پر تنقید کر کے اس کا تدارک کر دیا ہے اور اب اصحاب فن کی عام رائے یہ ہے کہ حافظ ذہبی نے امام حاکم کی تصحیح سے جہاں جہاں اختلاف کیا ہے اسکو مستثنیٰ کر کے باقی ساری حدیثیں جنکی تصحیح کے بارہ میں حافظ ذہبی نے حاکم سے اتفاق کیا ہے وہ صحیح و مقبول ہیں ——

(دائرۃ المعارف حیدرآباد نے مستدرک کو حافظ ذہبی کی تلخیص کے ساتھ ہی چھاپا ہے۔)

ان معروف و متداول کتابوں کے علاوہ خالص صحاح کے اور بھی بہت سے مجموعے ہیں۔ مثلاً صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابی عوانہ، صحیح ابن السکن حافظ ضیاء الدین مقدسی کی مختارہ۔ ان سب میں صرف صحیح حدیثوں ہی کو لیا گیا ہے —— لیکن صحاح کی جو کتابیں معروف و متداول ہیں جن تک رسائی بھی آسان ہے اور جن کی خدمتیں بھی کافی ہو چکی ہیں، ہماری ضرورت کے لئے وہ بھی بالکل کافی ہیں۔

(۳)

۳۔ زکوٰۃ کے بارہ میں مستفسر صاحب نے اپنی جن ذہنی الجھنوں کا ذکر کیا ہے میرے نزدیک ان سب کی بنیاد غالباً یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کو بس ایک خدائی ٹیکس سمجھ رہے ہیں جو حاجتمندوں کی حاجت براری کے لئے ہی دولتمندوں پر عائد کیا گیا ہے —— اگر زکوٰۃ کی حیثیت بس یہی ہوتی تو ان کی سب الجھنیں معقول اور قابل لحاظ ہوتیں —— لیکن زکوٰۃ کی اصل اور اولین حیثیت یہ ہے کہ وہ عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے، اور حاجتمندوں کی حاجت براری سے اہم اور مقدم مقصد اس کا انسان کے ایک مہلک ترین روحانی و اخلاقی مرض شحّ (یعنی مال کے ساتھ دولت پرستوں والی دلچسپی) کا علاج ہے اور دینی و اخروی

نقطۂ نظر سے یہ انسان کی اہم ترین ذاتی ضرورت ہے۔ پس جس طرح اپنی کسی اور ذاتی ضرورت مثلاً
لباس و طعام و دوا علاج کے لئے خرچ کرنے کے بارہ میں یہ سوالات نہیں پیدا ہوتے اسی طرح
زکوٰۃ کی اصل حقیقت معلوم کر لینے کے بعد ان میں سے کوئی الجھن بھی ذہن میں پیدا نہیں ہوگی۔
بلکہ اس بنیاد پر اسکے برعکس سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر زکوٰۃ کے لئے نصاب کی شرط کیوں لگائی
گئی؟ ـــــ لیکن ذرا سا غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو بیچارہ نصاب بھر کا
بھی مالک نہیں (جو مالیت کی بہت ہی معمولی بلکہ حقیر مقدار ہے) وہ تو فقیروں اور حاجتمندوں
کے اس طبقہ میں شامل ہے جن کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اس لئے ایسے لوگوں پر زکوٰۃ کے واجب ہونے
کے کوئی معنی نہیں تاہم شریعت میں ایسے لوگوں کو بھی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اپنی اس غربت
اور ناداری کے باوجود خود تکلیف اٹھا کر بھی دوسرے ضرورتمندوں کی مدد اور خدمت کریں
صحابۂ کرام میں بڑی تعداد ایسے ہی حضرات کی تھی جو خود غریب و نادار ہونے کے باوجود دوسرے
ضرورتمندوں پر خرچ کرتے تھے، حضرات انصار کے بارہ میں خود قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے
یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ (یعنی ان کا حال یہ ہے کہ وہ ضرورتمند اور
بھوکے ہونے کے باوجود اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورت اور بھوک کے مسئلہ کو اپنے
مقابلہ میں مقدم رکھتے ہیں اور اپنے کو بھوکا رکھ کے ان کو کھلاتے ہیں) دراصل زکوٰۃ و صدقات
اور انفاق فی سبیل اللہ کے لئے زیادہ دولتمندی کی ضرورت نہیں بلکہ خدا کے خوف، آخرت
کی فکر اور اللہ و رسول کی باتوں پر یقین کی ضرورت ہے۔ آج جو لوگ دولتمندی کے باوجود زکوٰۃ
نہیں دیتے اسکی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اُن کی ذاتی ضرورتوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا ہے بلکہ اسکی
اصل وجہ ایمان و یقین کا ضعف اور آخرت فراموشی ہے۔ اور مسلمانوں کی پوری دینی زندگی کی
ابتری کی جڑ بنیاد بس یہی ہے ـــــ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اگر دل کو ایمان و
یقین کی دولت نصیب نہ ہو اور آخرت میں اللہ کے حضور میں حاضری کی فکر سے دل خالی ہو
تو پھر نماز جیسی بے خرچ اور لذیذ و فرحت بخش عبادت بھی مشکل اور ناقابل عمل ہوتی ہے ـــــ
آج لاکھوں کروڑوں مسلمان کہلانے والے جو نمازیں نہیں پڑھ رہے ہیں سوچئے تو کہ ان کی
کیا مجبوری ہے کس نے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں؟ ـــــ مسلمانوں کے دینی مسئلہ

ہیں، ذاکر صاحبان کے لئے سوچنے کی بات بس یہ ہے کہ دل یقین و فکر کی جس دولت سے خالی ہوگئے ہیں اسکے پیدا کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔

۳۔ بینک کے کاروبار کے سلسلہ میں مختصر بات یہاں صرف اتنی ہی لکھی جاسکتی ہے کہ بینک کا سود اسی قسم کا ایک سود ہے جس کو اللہ و رسول نے ناجائز قرار دیا ہے اور موجودہ زمانہ میں اسکی حیثیت جو وبائے عام کی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اس سے بچنا بہت سوں کے لئے مشکل ہے، اس سے وہ ناجائز جائز نہیں ہوجاتا۔ (جس طرح کسی ایک ایسے ملک میں جانے والوں یا رہنے والوں کے لئے جہاں حلال ذبیحہ بالکل نہیں ہوتا، مردار کھانا حلال نہیں ہوجاتا) بہرحال شرعی مسئلہ یہی ہے۔ اسکے باوجود جن لوگوں کے حالات ایسے ہیں کہ بینکوں سے کاروبار ان کے لئے گویا ناگزیر ہے اور وہ حرام کی ناپاکی اور اسکے گناہ سے بھی محفوظ رہنا چاہتے ہیں، ان کو چاہیئے کہ کسی صاحب بصیرت عالم دین سے رجوع کریں اور اپنا تفصیلی مسئلہ سامنے رکھ کر مشورہ کریں انشاءاللہ کوئی راستہ نکل آئے گا (من یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً)

مستفسر صاحب نے اس سلسلہ میں موجودہ اسلامی حکومتوں کا بھی ذکر کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ حکومتیں چاہتیں تو آج کی دنیا میں بھی زندگی کے تمام مسائل کو اسلامی بنیادوں پر حل کر کے دنیا پر سب سے بڑا احسان کرسکتی تھیں لیکن جس طرح ہم آپکو اپنے بہت سے انفرادی اور ذاتی فرائض ادا کرنے کی توفیق نہیں ہو رہی ہے اسی طرح ہماری حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کو بھی اپنا یہ فرض ادا کرنے کی توفیق نہیں مل رہی ہے۔ دراصل ہم سب کا مشترک مرض اس وقت ضعف ایمان و یقین اور ایک طرح کا نفاق ہے، اگر یہ بیماری نہ ہو تو ہر حال اور ہر ماحول میں دین پر چلا سکتا ہے، اور جو جتنے ناموافق حالات میں اس راستہ پر چلے گا اتنا ہی زیادہ اجر کا مستحق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم بے توفیقوں کو توفیق دے۔

آخر میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اگر "اسلامی حکومتیں" آمادہ ہوں تو بینکوں کے موجودہ نظام کی جگہ اور اسکے متبادل ایسا نظام بآسانی بنایا جاسکتا ہے جس کی بنیاد باہمی نفع اندوزی اور خود غرضی والے سودی لین دین کے بجائے تعاون اور جائز تجارت پر ہو، بلکہ بہت سے حضرات نے اسکے خاکے مرتب کرکے مختلف اوقات میں شائع بھی کئے ہیں، لیکن یہ کام عملی حیثیت سے بھی مکمل اسوقت ہوسکتا ہے جب اسکے عمل میں آنے کی کوئی شکل دکھائی دے ——— والسلام

سُورج کی کرن

از جناب جشؔر رام پوری

رات کی پُرخوف تاریکی کا منظر الاماں ؂ معصیت سے جس طرح لبریز ہو سارا جہاں

ظلمتوں میں دہر کی سب روشنی کھوئی ہوئی ؂ فکرِ مُسلم کی طرح ساری فضا سوئی ہوئی

حُسن محوِ خواب، خالی عشق کا آغوش ہے ؂ ایک سنّاٹا سا طاری ہے جہاں خاموش ہے

عہدِ تاریکیوں کا گُل ہیں ہر گھر کے چراغ ؂ اس اندھیری رات میں سوتے نہیں اہلِ دماغ

ہے سکوتِ مرگ کے آغوش میں ہر اک زباں ؂ رہ گئی ہیں مٹ مٹا کر دہر کی بیداریاں

گونجتا ہے جب کسی کا نالۂ بے اختیار ؂ آسماں سے ٹوٹ کر گرتے ہیں تارے بار بار

تاک میں قزّاق پھرتے ہیں بنے برقِ غضب ؂ ہو نہ جائے یہ کہیں غفلت ہلاکت کا سبب

کج رَوی کو چھوڑ دے غفلت کی راہوں پر نہ جا ؂ ہے ترے ہی ہاتھ میں تو اپنی قسمت خود بنا

نشّۂ ماضی میں ہرگز حال سے غافل نہ ہو ؂ حال کی عشرت میں استقبال سے غافل نہ ہو

جاگ اب تو عیش پر نکبت کا ڈیرا ہو چکا ؂ لُٹ چکی تیری ہر اک طاقت سویرا ہو چکا

جاگ پچھلے قافلے بھی تجھ سے آگے بڑھ گئے ؂ بیٹھنے والے ترے قدموں میں سر پر چڑھ گئے

جاگ اب تو مٹ چکی عزّت بھی تیرے خواب سے ؂ جاگ اب تو لُٹ چکی دولت بھی تیرے خواب سے

تجکو اک دن جاگنا، پھر بھاگنے سے فائدہ؟ ؂ اپنی ہستی کو مٹا کر جاگنے سے فائدہ؟

جگمگا دے سعی و استقلال سے ہر انجمن
تو بنا، ان ظلمتوں کو بڑھ کے "سُورج کی کرن"

ایک بیش بہا علمی تحفہ

"الاتحاف"

(از، محمد منظور نعمانی)

حضرت استاذ مولانا سید محمد انور شاہ قدس سرہ جن کے وصال پر ابھی پورے تیس سال بھی نہیں گزرے ہیں، ان کے علمی مقام سے صرف وہی اہل علم کچھ واقف ہیں جنھیں ان کے قریب رہنے یا ان سے استفادہ کرنے کا کافی موقع ملا، ان کے خاص معاصر اور ان کے استاذ شریک حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ نے اپنی کتاب "فتح الملہم شرح صحیح مسلم" میں ان کے بارہ میں جو یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "لم تر العیون ولم یر ھو نفسہ مثلہ" (کہ نہ اس زمانے کے دوسرے لوگوں نے ان جیسا کوئی دیکھا اور نہ خود انھوں نے اپنے مثل کسی کو دیکھا) اس عاجز کے نزدیک یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے، حق یہ ہے کہ جنھوں نے نہیں دیکھا وہ آسانی سے یقین بھی نہیں کر سکتے کہ اس دور میں بھی کوئی ایسا متبحر عالم ہو سکتا ہے ——— حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اصل علمی خصوصیت تو ان کی جامعیت تھی، جس موضوع اور جس مسئلہ کے متعلق سوال کیا جاتا ایسا معلوم ہوتا کہ شاید یہی ان کی تحقیق و مطالعہ کا خاص موضوع ہے اور گویا ابھی اسکے مالہ وما علیہ کا مطالعہ فرما کر اور پوری تیاری فرما کر تشریف لائے ہیں۔ لیکن اس جامعیت کے باوجود فن حدیث میں ان کا اشتغال نسبتاً سب سے زیادہ تھا اور حدیث کے مطالعہ میں تقریباً تیس سال تک حدیث کے ساتھ فقہ حنفی کی تطبیق انکی توجہ کا خاص مرکز رہا اس لئے اس خاص پہلو سے ان کا مطالعہ بہت

وسیع اور اس دائرہ میں ان کا مقام بہت ہی بلند تھا۔ انکے اوقات کا بڑا حصہ کتابوں کے مطالعہ ہی میں صرف ہوتا تھا اور دستور یہ تھا کہ جہاں کوئی ایسی بات نظر پڑتی جس کے متعلق خیال ہوتا کہ فلاں اہم مسئلہ پر اس سے روشنی پڑتی ہے یا فلاں اشکال کے حل میں اس سے مدد مل سکتی ہے یا فلاں بات کی تردید یا تائید ہوتی ہے تو اسکو نوٹ فرماتے جاتے۔ لیکن چونکہ یہ نوٹ اپنے ہی واسطے لئے جاتے تھے اس لئے عموماً بس اشاروں ہی پر اکتفا فرماتے تھے ایسے نوٹوں کے کاغذات کی گڈیاں کی گڈیاں تھیں جو حضرت کے کمرے کے اوپر کے تختوں پر رکھی رہتی تھیں ایک دن اس عاجز کے سامنے ہی ان گڈیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ہماری ساری عمر کی محنت ہے لیکن ایسے حال میں ہے کہ دوسرا اس سے نفع نہیں اٹھا سکیں گے۔

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی مرحوم کی معرکۃ الآرا کتاب "آثار السنن" [۱] (جسکی تالیف میں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا مشورہ بھی شریک رہا تھا) اس میں جو مباحث اور مسائل آئے ہیں ان سے متعلق اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے خاص نتائج نوٹ کرنے کے لئے حضرت نے اسی کا اپنا مملوکہ نسخہ غالباً مخصوص فرما لیا تھا۔ ان مباحث کے متعلق جو چیز کہیں نظر سے گزرتی یا ذہن میں آتی آپ اسکو آثار السنن کی اسی بحث میں حاشیہ پر یا بین السطور میں بس اشارے کے طور پر نوٹ فرما دیتے۔ بعضے ایک ایک صفحے میں پچاسوں نوٹ اور پچاسوں حوالے ہیں، جو

---

[۱] اسی صدی ہجری کی لکھی ہوئی اس معرکۃ الآراء کتاب اور اسکے مصنف مولانا ظہیر احسن شوق نیموی مرحوم سے ہند و پاک کے علمی حلقے خوب واقف ہیں، مولانا مرحوم نے یہ کتاب اب سے قریباً ساٹھ ستر سال پہلے اس دور میں لکھنی شروع کی تھی جب ہندوستان میں جماعت اہل حدیث اور علماء احناف کے معرکے شباب پر تھے۔ علامہ مرحوم فن حدیث میں بڑی ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے اور حدیث کے ساتھ فقہ حنفی کی تطبیق حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح انکا بھی خاص موضوع تھا۔ وہ خالص محدثانہ انداز میں آثار السنن کے نام سے حدیث کی ایک ایسی جامع کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے جس کے مطالعہ سے فقہ حنفی کے بارے میں اطمینان ہو جائے کہ وہ حدیث نبوی کے خلاف نہیں ہے اس کتاب کے ابھی صرف دو ہی حصے مرتب ہو کر شائع ہونے پائے تھے کہ مولانا مرحوم کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔ (ان دو حصوں میں صرف کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ سے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حوالے نادر اور قلمی کتابوں کے ہیں ان میں تو بقدر ضرورت کتاب کی اصل عبارت حضرت نے لکھدی ہے اور جو ایسی کتابوں کے ہیں جن کا ملنا زیادہ مشکل نہیں ہے ان کے بس صفحے کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔

آثار السنن کا یہ نسخہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تبرکات میں محفوظ رہا، لیکن اگر یہ صرف حضرت کے وارثوں کے پاس محفوظ رہتا تو نہ عام اہل علم کو اسکی اطلاع ہوتی نہ ہر ایک اس سے استفادہ کرسکتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ہی کے تلامذہ میں سے اپنے ایک خوش نصیب بندے مولنا الحاج محمد ابن موسیٰ میاں (جوہانسبرگ جنوبی افریقہ) کو توفیق بخشی انھوں نے یہ نسخہ حاصل کر کے "مجلس علمی" کی طرف سے اسکے چند عکسی نسخے لندن میں ایک جدید طریقہ سے تیار کرائے اور ہندوستان و پاکستان کے چند مرکزی دینی اداروں اور حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق رکھنے والے چند اشخاص تک پہنچا دیئے۔ اللہ تعالیٰ انکی اس خدمت جلیلہ کو قبول فرمائے اور اپنے خزانۂ رحمت سے پوری پوری جزا ان کو عطا فرمائے۔

اسی عکسی نسخہ کا نام "الاتحاف لمذهب الاحناف" ہے، آثار السنن کے دونوں

(بقیہ حاشیہ صلا) متعلق حدیثیں آئی ہیں) ــــــــ فن حدیث میں بصیرت رکھنے والے علما احناف کا تو گویا اس پر اتفاق ہے کہ یہ کتاب تحقیق کا شاہکار اور اپنے موضوع و مقصد میں غیر معمولی درجہ میں کامیاب ہے۔ ہمارے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ اس کتابکے بڑے مداح اور اسکے مؤلف علامہ نیموی مرحوم کی مہارت فن اور وسعت نظر کے بہت معترف تھے۔ کتابکے آخر میں ان کے دو مدحیہ عربی قصیدے بھی چھپے ہوئے ہیں جن سے کتاب اور اسکے مصنف کے بارے میں ان کے احساسات و جذبات کا اندازہ کیا جاسکتا ہو راقم نے جیسا کہ اوپر لکھا ہے اس کتاب کی تالیف میں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا مشورہ بھی شریک رہا تھا اس عاجز نے اب سے ۳۵ سال پہلے درس ہی میں خود حضرت کی زبان سے اسکی پوری تفصیل سنی تھی اور افسوس ہوکہ اسکو نوٹ نہیں کیا تھا اس لئے صرف حافظہ ہی کی مدد سے اسکو ناظرین کے لئے حوالہ قلم کرتا ہوں، اگر کوئی غلطی ہو تو اسکی ذمہ داری میرے حافظہ پر ہے، بہرحال مجھے حضرت کے بیان کا جو خلاصہ اس سلسلہ میں یاد رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ:- (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حصے ایک ہی جلد میں جمع کر دیئے گئے ہیں، شروع میں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد یوسف بنوری (دامت فیوضہم) کے قلم سے اس عکسی کتاب "الاتحاف" کا تعارف ہے، آثار السنن کے حاشیہ پر اور بین السطور میں جو نوٹس ہیں وہ تو عموماً آثار السنن کے مباحث ہی سے متعلق ہیں لیکن شروع کے اور آخر کے سادہ اوراق کے سیکڑوں نوٹ دوسرے مختلف موضوعات و مسائل سے متعلق ہیں۔ اس ناچیز کا اندازہ ہے کہ شروع اور آخر کے چار پانچ ورقوں میں جو نوٹ اور حوالے ہیں اگر ان کو افادۂ عام کے لئے کوئی قاعدہ سے ایڈٹ کرے تو متوسط ضخامت کی ایک پوری کتاب صرف ان متفرق نوٹوں سے تیار ہو جائے گی —— پھر آثار السنن کے بعضے ایک ایک صفحہ پر جو نوٹ اور حوالے ہیں اگر تصنیفی زبان میں ان کو مرتب کیا جائے تو ایک ایک صفحہ کے نوٹوں اور حوالوں سے ایک ایک ضخیم رسالہ تیار ہو گا۔

یہاں اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان نوٹوں کی حیثیت حواشی کی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر

(بقیہ حاشیہ صـ۹۲) "مولانا نیموی مرحوم نے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو اس کا پہلا جز حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ) کی خدمت میں دیوبند بھیجا اور لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ جتنا جتنا میں لکھتا جاؤں آپ کی خدمت میں بھیجتا رہوں آپ اس میں جو ترمیم و اضافہ مناسب خیال فرمائیں وہ لکھ کر مجھے واپس کر دیا کریں اس طرح یہ کتاب زیادہ مکمل اور زیادہ مفید ہو جائیگی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ملاحظہ فرما کر یوں ہی واپس فرما دیا اور لکھ دیا کہ جس طرز پر آپ یہ کتاب لکھ رہے ہیں (یعنی خالص محدثانہ طرز پر) میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اپنے ایک عزیز دوست کا پتہ لکھتا ہوں آپ ان سے مراسلت کریں انشاء اللہ وہ اس سلسلہ میں آپ کو مفید مشورے دے سکیں گے، اور حضرت نے میرا پتہ انکو لکھ دیا — مولانا نیموی مرحوم نے اضافہ اور مشورہ کی فرمائش کے ساتھ کتاب کا وہی حصہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے گرامی نامہ کے ساتھ میرے پاس بھیجا، میں نے اس پر جو اضافے مناسب سمجھے کئے، جن کی مقدار اصل سے دو چند کے قریب تھی، لیکن میرے یہ اضافے زیادہ تر معنوی مباحث سے متعلق تھے، علل و اسانید سے متعلق مباحث میں اضافہ کی گنجائش ہی بہت کم تھی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

بس اشارے ہیں جو غالباً اپنے ہی لئے نوٹ کئے گئے تھے اس لئے ان سے استفادہ جتنا کچھ بھی کرسکتے ہیں صرف خواص اور وہ بھی بڑی محنت کے بعد ہی کرسکتے ہیں۔ ان چند عکسی نسخوں کے تیار ہوجانے کا بڑا فائدہ یہی ہے کہ یہ دولت ضیاع کے خطرہ سے انشاء اللہ محفوظ ہوگئی ـــ اب ضرورت ہے کہ اس خزانہ کو عام استفادہ کے لائق بنانے کی بھی کوشش کی جائے اس کار عظیم کی توقع حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے صرف حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری ہی سے کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے جیسا کہ اپنے "تعارف" میں تحریر فرمایا ہے حضرت استاذ قدس سرہ کی حیات میں اس سلسلہ میں کچھ کام کیا بھی تھا۔

مجلس علمی جوہانسبرگ جنوبی افریقہ کی طرف سے " الاتحاف" کے عکسی نسخے ہندوستان و پاکستان کے جن دینی اداروں اور جن حضرات اہل علم کو دیئے گئے ہیں انکی تفصیل جو ناچیز کو مجلس علمی کی طرف سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے۔

کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، کتب خانہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا سید انظر شاہ صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند، مجلس علمی سملک (ضلع سورت) مجلس علمی کراچی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری (کراچی) حضرت مولانا بدر عالم صاحب (مدینہ طیبہ) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی (مئو ضلع اعظم گڈھ)

راقم سطور ناچیز محمد منظور نعمانی کو بھی ایک نسخہ مرحمت فرمایا گیا ہے۔

یہ تفصیل یہاں اس لئے لکھ دی گئی ہے کہ جو صاحب علم کسی وقت " الاتحاف " سے استفادہ کرنا چاہیں انکے علم میں یہ رہے کہ اسکے نسخے کہاں کہاں موجود ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) مولانا نیموی مرحوم نے میرے یہ اضافے ملاحظہ فرما کر مجھے لکھا کہ میں یہ کتاب محدثین کے طرز پر لکھنا چاہتا ہوں اس لیے علل و اسانید سے متعلق آپ کے اضافے تو میں کتاب میں شامل کرلوں گا لیکن دوسری قسم کے اضافے میں نہ لے سکوں گا، اس کے بعد وہ اسکے اجزا برابر بھیجتے رہے اور میں اپنے مشورے لکھتا رہا۔

تعارف و تبصرہ

خلافتِ معاویہؓ و یزید | از جناب محمود احمد صاحب عباسی صفحات ۳۷۶ مجلد قیمت ۶/- روپئے ناشر خود مؤلف ہیں۔ پتہ:۔ کاشانہ محمود ۱/۲۶ بی ایریا لالوکھیت کراچی ۱۹

تقریباً ایک سال اس کتاب کی اشاعت کو ہوچکا ہے۔ اور ہندوستان و پاکستان میں اب کوئی گھر مشکل سے ایسا ہوگا جہاں اس کا چرچا نہ پہنچ چکا ہو۔ عام طور پر اس کتاب کو بری نظر سے دیکھا گیا اور بالآخر بات ضبطی تک پہنچ گئی ـــــــ

کتاب کا نام "خلافتِ معاویہ و یزید" ہے۔ جس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ حضرت معاویہؓ اور یزید کے عہد خلافت کا مکمل تذکرہ ہوگا۔ مگر دراصل عہد یزیدی کے ایک خاص واقعہ ــ واقعہ کربلا ــ اور اس کے پس منظر کی داستان ہے، اور اسکے علاوہ اگر اس میں مقصدی حیثیت سے کچھ اور ہے تو دوسرے درجہ پر یزید اور یزیدی عہد کے فضائل و مناقب۔

کتاب اب تک جس انداز میں بھی متعارف ہوئی ہو۔ مگر ہمارے نزدیک مؤلف کا اصل مطمح نظر اسکے سوا کچھ نہیں ہے، کہ بنی اُمیہ سے شروع ہونے والا عہد خلافت جو مشہور تاریخی روایات کی روشنی میں اپنے بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اسلامی تاریخ پر ایک افسوسناک اور وحشت انگیز دھبہ بن کر نمایاں ہوگیا ہے۔ اس سے متعلق روایات کو من وعن مان لینے کے بجائے حتی الامکان روایات کی تنقیح کی جائے، اور واقعات کی ایسی توجیہ کی جائے کہ وہ اسلامی تاریخ کے چہرے پر بدنما داغ بن کر نمایاں نہ رہیں۔

لیکن اسکے ساتھ ہماری رائے یہ بھی ہے کہ اس کام میں جس توازن کی ضرورت تھی عباسی صاحب اس توازن کو بالکل نہیں برت سکے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں انکی یہ کاوش ایک سخت قسم کے ردِّعمل کی سی صورت اختیار کرگئی ہے علاوہ ازیں موصوف اپنے مطمح نظر کی تحصیل کی خاطر بعض باتیں تصنیفی دیانتداری سے مختلف قسم کی

بھی کر گئے ہیں۔

کتاب تعارف و مقدمہ وغیرہ کے بعد" اموی خلافت کے پس منظر" کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔اس پس منظر کی ابتدا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس بیان میں شروع ہی سے عباسی صاحب کا رویہ حضرت علیؓ کے ساتھ منصفانہ نہیں رہا ہے۔ اور حضرت علی کی خلافت کے دور میں جو کشت وخون مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اور نظم خلافت میں جو ابتری رونما ہوگئی تھی اس کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کیا گیا ہو کہ سبائی مفسدوں کی دانستہ ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اسکی نا دانستہ یا مجبورانہ ذمہ داری تمام تر حضرت موصوف پر آ پڑتی ہے، یہ کس قدر زیادتی کی بات ہے؟ اسکا اندازہ اسلامی تاریخ کا ہر طالبعلم کر سکتا ہے! ـــــ اسکے علاوہ ایک دوسرا تأثر ان صفحات کے مطالعہ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ جتنے تھے وہ گویا سب کے سب سبائی تھے۔ اور حضرت علی ان سبائیوں کے ایک مجبور قسم کے آلۂ کار۔

اموی خلافت کا یہ پس منظر تیار کرنے میں، حقیقت یہ ہے کہ عباسی صاحب نے بڑی جانبدارانہ نظر بلکہ غیر دیانتدارانہ طریقوں تک سے کام لیا ہے اور انکی اس ردعمل والی غیر منصفانہ روش ہی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اب جو لوگ اس کتاب کے جواب میں کچھ لکھ رہے ہیں، وہ بھی ردعمل کی کیفیت ہی میں ڈوب کر لکھ رہے ہیں اور اس طرح صحابہ کے احترام اور انکے معاملات میں کفِّ لسان کا مسلک اس ردعمل کی چکی میں بری طرح پس رہا ہے۔

کتاب کی بسم اللہ ہی عباسی صاحب نے حضرت علی کے خلافت قبول کر لینے کے اقدام کو غیر عاقلانہ ظاہر کر کے کی ہے۔" حضرت عبداللہ بن عباس کا مشورہ نقل کرتے ہوئے کہ "آپ بیعت نہ لیں" لکھتے ہیں:

"مگر افسوس کہ حضرت موصوف نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا اور بیعت لے لی" صفحہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت علیؓ کی خلافت کا انعقاد ثابت کرتے ہوئے آپکے مخالفین حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کا عذر بیان کیا ہے کہ انکی مخالفت خطاء اجتہادی کے قبیل سے تھی۔ اور جن دلائل پر بنا کر کے ان حضرات نے مخالفت کا رویہ اختیار فرمایا تھا وہ فلاں فلاں تھے[1]۔ عباسی صاحب نے حد کر دی ہے کہ ان دلائل کو شاہ صاحب کی منشاء اور انکے موقف

---

[1] ازالۃ الخفاء مقصد دوم صفحہ ۲۷۹

کے بالکل برعکس، خود شاہ صاحب ہی کی طرف سے، حضرت علیؓ کے خلاف استعمال کیا ہے، کہ "اولاً تو حضرت علی کے لئے خلافت ہی قائم نہ ہوئی تھی اس لئے کہ اہل حل وعقد نے بیعت نہ کی تھی"۔ دوسرے یہ کہ "حضرت موصوف نے باوجود قدرت کے قاتلین عثمانؓ سے قصاص نہ لیا، بلکہ الٹے مانع ہوئے۔ نیز خطاء اجتہادی سے کام لیا" (ص۲۳) ـــــ حالانکہ یہ موقف شاہ صاحب کا اپنا ہرگز نہیں تھا۔ یہ دلائل انھوں نے محض عاصر مخالف جماعت کی طرف سے بطور نقل کے پیش کئے تھے۔ ورنہ انکا اپنا موقف تو اس سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک اہلسنت والجماعت کے مسلک کے مطابق مخالفین پر "مجتہد مخطی" کا حکم لگا رہے تھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اسی موقع پر صراحت فرما رہے تھے کہ "دلیل دیگر ارجح از وے بود"[۱] (حضرت علیؓ کے دلائل ان دلائل کے مقابلہ میں راجح تھے) اور اس لئے حق وصواب انھیں کی طرف تھا اور موقف انھیں کا صحیح تھا۔

ص۳۲ پر عباسی صاحب لکھتے ہیں :۔

"سبائیوں کی حرکات شنیعہ سے امت میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا، تمام عالم اسلام میں خلیفہ شہید کے مظلومانہ قتل سے اک آگ سی لگ گئی تھی اور ہر طرف سے انتقام انتقام کا نعرہ بلند ہوا تھا یہ صورت حال بہت حد تک سنبھل سکتی تھی اگر قصاص لینے کی تدبیر کیجاتی۔ مگر قصاص نہ لیا گیا"

آگے لکھتے ہیں :۔

"حضرت موصوف کی یہ خطائے اجتہادی تھی یا بے بسی اور مجبوری، نتیجہ یہ ہوا کہ بخلاف حضرات خلفاء ثلٰثہ جن کی بیعت پر تمام امت مجتمع تھی، اتحاد واتفاق تھا، کفار کے مقابلہ میں جہادی سرگرمیاں تھیں، بڑے بڑے ملک فتح ہوئے۔ مگر حضرت علی کے زمانہ میں نہ کوئی جہاد ہوا نہ کوئی ملک شہر فتح ہوا۔ نہ امت ان کی بیعت پر مجتمع ہوئی۔ آپس ہی میں تلوار چلتی رہی" ص۳۴

گویا اس سب کی ذمہ داری حضرت علی پر!

ص۳۸ پر لکھتے ہیں :۔

"سبائیوں کی من مانی حرکات دیکھ کر کہ جو چاہتے حضرت علی سے کرا لیتے ہیں۔ انکے بعض عزیز قریب بھی بیزار ہوگئے۔ حضرت علی کے برادر بزرگ حضرت عقیلؓ کی دوربین نگاہوں نے اس صورت حال

---

[۱] ازالۃ الخفاء ایضاً ص۲۷۹

کا جائزہ لے لیا تھا، اور سمجھ گئے تھے کہ اُن کے بھائی کے گرد و پیش جو لوگ سبائی پارٹی کے ہیں، وہ ملت کا بیڑا غرق کئے بغیر نہ رہیں گے۔"

حضرت علی کو چھوڑ کر حضرت معاویہ کے پاس حضرت عقیل کے چلے جانے کے جو وجوہات کتابوں میں مذکور ہیں اُن کو "دضاعین کے لطیفے اور پھبتیاں" قرار دے کر عباسی صاحب اس واقعہ کی یہ نئی توجیہ کرتے ہیں۔ اور پھر صفین کے میدان میں بھی حضرت عقیل کو حضرت معاویہ کی معیت میں دکھا کر فرماتے ہیں کہ:۔

"انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ وفاداری اسی میں سمجھی تھی کہ اُن کی سیاست پر جو لوگ مستولی ہیں وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں"۔ صث

اس طور پر عباسی صاحب یہ تاثر دینے کی کوشش کر گئے ہیں کہ حضرت معاویہ کا اقدام بالکل حق بجانب اور بہایت صحیح تھا اور ضرورت تھی کہ حضرت معاویہ حضرت علی کی مزاحمت کا اقدام کریں، ورنہ ملت کا بیڑا ہی غرق ہو جاتا ——— یہ کس قدر جانبدارانہ نقطۂ نگاہ، مسئلہ کا کس قدر غلط جائزہ اور کیسی دھاندلی ہے! کوئی وہ شخص جو مسئلہ کی تفصیلات کا مطالعہ کرے اس پر متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن عباسی صاحب نے معلوم کس اثر کے ماتحت حقائق سے بے نیازی کا یہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اور پھر انتہا کر دی ہے کہ اپنے اس جانبدارانہ نقطۂ نظر کی تائید خود حضرت علی کے "احساسات" سے کرانی چاہی ہے۔ واقعہ تحکیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس ثالثی سے سبائیوں کو (جو حضرت علی کے طرفدار تھے) اپنی موت نظر آتی تھی کیونکہ

"مسئلہ دیا صاف اور سادہ تھا کہ کوئی ثالث بھی اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ جنھوں نے خلیفۂ راشد کو ظلماً قتل کیا، نظام خلافت کی بے حرمتی کا ارتکاب کیا، سیاست علیہ پر اک لمحہ کے لئے بھی مستولی رہیں" (ص۱۲)

اور پھر حضرت علی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت علی کو بھی ثالثی کے تقرر کے ساتھ ہی اس کا بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ وہ منصب خلافت پر قائم نہیں رہ سکتے" (ص ایضاً)

دلیل کیا ہے؟ حضرت علی کا اس موقع پر یہ ارشاد کہ:۔

لو علمت أنّ الامر يكون هكذا ما خرجت۔ اذهب يا ابا موسىٰ	اگر میں جانتا کہ معاملہ یہ صورت اختیار کرے گا تو میں ہرگز (جنگ کے لئے) نہ نکلتا۔

فاحکم ولو بجز عنقی۔ (ص ایضاً)　　اچھا ابو موسیٰ جاؤ۔ اور فیصلہ کرو۔ خواہ فیصلہ میری گردن مار دینے ہی کا ہو۔

کیا مزے کی دلیل ہے جس میں دعوے کا کوئی ثبوت نہیں! اگر یہی دلیل تھی تو دعوے کی شکل شاید یہ زیادہ مناسب رہتی کہ " حضرت علی کو بھی .... اس کا بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ فیصلہ یقیناً (خاک بدہن گستاخ) انکے واجب القتل قرار دینے کا ہوگا "

غرض اس طور پر عباسی صاحب نے اُموی خلافت کا پس منظر تیار کیا ہے، اور کیا شبہ ہے کہ اس مرحلہ میں انھوں نے انصاف و دیانت اور توازن غرض ہر چیز کا خون کر دیا ہے، اور اس طرح اپنا مقدمہ بالکل بے ضرورت خود ہی خراب کر لیا ہے۔ حضرت معاویہ کی پوزیشن صاف کرنے اور انکی امارت جائز ثابت کرنے کے لئے ہرگز ضرورت نہ تھی کہ واقعات کو یہ رنگ دیا جاتا۔ اور اہلسنت و جماعت کے متفقہ مسلک سے انحراف کیا جاتا۔ اس مسلک میں پورا توازن اور ہر دو بزرگوں کے مرتبہ کی پوری پوری رعایت موجود تھی۔ عباسی صاحب کو چاہیئے تھا کہ گفتگو کا آغاز اپنے موضوع سے اس قدر دور جا کر نہ کرتے۔ گفتگو کا سلسلہ زیادہ سے زیادہ حضرت علیؓ کی شہادت سے شروع ہونا چاہیئے تھا۔ اس سے پیچھے جانے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

بہرحال عباسی صاحب نے ۱۰۱ صفحے کے اس خود ساختہ پس منظر سے گزرتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ حضرت معاویہؓ کی خلافت تک پہنچایا ہے۔ پس منظر کا بیان ختم ہونے کے بعد ضرورت تھی کہ " اُموی خلافت کے قیام " کا ایک نیا باب قائم کیا جاتا۔ مگر عباسی صاحب نے متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف ہونے کے باوجود پتہ نہیں یہ کون سا ڈھنگ اختیار کیا ہے کہ قریب قریب پوری کتاب پس منظر کے ہی تحت [illegible] حالانکہ تصنیفی سلیقہ اس طول و عرض میں پھیلے ہوئے مختلف مباحث کے لئے کتنے ہی الگ الگ ابواب چاہتا تھا۔ [illegible] پس منظر کے ذیل [illegible] حضرت معاویہ [illegible] حسن سلوک [illegible] اور پھر اس پر غضب یہ ہے کہ اس جہاد اور بشارت کے ذیل میں یزید کا جو ذکر آتا ہے تو حضرت معاویہ کا ذکر تو چھوٹ [illegible] پانچویں صفحے تک پہنچ جاتا ہے اور نہایت بے محل طور سے یزید کے فضائل و مناقب کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ الغرض کتاب کا یہ پہلو مؤلف کی کہنہ مشقی کے باوجود نہایت ہی نومشقانہ ہے اور بڑی اصلاح کا محتاج، لیکن ہمیں اس پہلو پر

زیادہ دیر ٹھہرنے کی فرصت نہیں ہے، ہم اسکو نظر انداز کرکے اب کتابچے ایک مختصر معنوی جائزہ کی طرف آنا چاہتے ہیں۔

ہم اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو یزید کے فسق و فجور پر عقیدہ کی طرح سے ایمان رکھتے ہیں، یا جن کے نزدیک حُبِ حسینؓ کا تقاضہ بغض یزید کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی شخص دیانتداری کے ساتھ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے کہ یزید ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھا تو ہمارے قلب و دماغ کو اس سے کوئی دھکا نہیں لگے گا اس لئے کہ ہم نہ فسقِ یزید کو بطور عقیدہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ حُبِ حسین کا کوئی لازمی تقاضہ، بلکہ سچ یہ ہے کہ ہمیں انتہائی خوشی ہوگی اس لئے کہ یہ تحقیق و ریسرچ ہماری تاریخ کا ایک غم انگیز دھبہ دور دور کردے گی ـــــــ عباسی صاحب نے اپنی اس کتاب میں یہی کوشش کی ہے، مگر ایک طرف تو آغاز کتاب میں اپنے دعادی پر ان کے پیش کردہ دلائل و شواہد کا جائزہ لینے سے جو حقیقت حال سامنے آئی ہے وہ حوالہ جات کی اصل سے مراجعت کئے بغیر اعتماد سے مانع ہے، دوسری طرف نفس اُن کے بعض بیانات ہی سے تحقیقی نقص کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ص۴۳۔۴۴ پر وہ اتنے دعوے کرتے ہیں۔ کہ امیر یزید اپنے زمانہ خلافت میں ہمیشہ جامع دمشق میں نماز پڑھاتے۔ خاص کر جمعہ و عیدین کی امامت کرتے۔ اور بعد ادائے نماز وہیں علمی مجلس منعقد کرتے۔ لیکن ثبوت میں جو ایک واقعہ کی روایت پیش کرتے ہیں اس سے نہ "ہمیشگی" ثابت ہوتی ہے اور نہ علمی مجالس کا انعقاد ــــ ص۵۱ پر خالد بن یزید کے علمی کمالات (کیمسٹری کی ایجاد) اور علمی شغف۔ (یونانی اور مصری کتابوں کے ذخائر کی فراہمی۔ دار الترجمہ کی تاسیس اور تصنیف وغیرہ) کا ذکر کرکے نتیجہ نکالتے ہیں کہ:۔

> "اولاد میں علم و فضل کے حصول کی اس درجہ خواہش اور تڑپ اپنے باپ ہی کی علمی مجالس اور گھر کے ماحول سے پیدا ہوئی جہاں اکثر قال اللہ و قال الرسول کی آوازیں آتیں کہ بقول کذا بین غنا و موسیقی کی"

حالانکہ اس نتیجہ کا کوئی جوڑ خالد کے مذکورہ اوصاف سے نہیں۔

مدینۃ النبیؐ سے اُنس بھی ایک اچھی ایمانی علامت اور ایک مومن کی عملی زندگی کے اچھے رجحانات کی غماز ہے۔ یزید کو اگر یہ سعادت باطنی حاصل تھی تو چشم ما روشن دل ما شاد، مگر اسکے لئے اس انداز کے

ثبوت یزید کی فضائل شماری میں آنکھیں بند کرکے محو ہونے کو ظاہر کرتے ہیں، کہ :-

" مدینہ طیبہ سے اُنس ومحبت ہی کی وجہ تھی کہ اپنی شریک زندگی کے لئے وہاں کی دو خواتین کو اپنے حبالۂ عقد میں لائے " (ص۵۳)

یہ دلائل نہیں نکات کہلاتے ہیں جو مجالس وعظ میں تو بہت خوب ہوتے ہیں، لیکن میدان تحقیق میں کام نہیں آتے۔

عباسی صاحب کا یہ رویہ تو یزید کے بارے میں ہے، لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں انکا ذہن بالکل دوسرے انداز پر کام کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آپ کے نام، ابو مخنف کی روایت سے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی ایک تحریر کا ذکر کرکے جس میں آپ کو " نورالاسلام " کے لفظ سے یاد کیا گیا تھا لکھتے ہیں :-

" طبری نے " نورالاسلام " کے بجائے " نورالارض " کے الفاظ لکھے ہیں، بہر کیف " نورالاسلام " کے لفظ ہوں یا " نورالارض " کے یہ فقرے ان راویوں کے وضعی ہیں اور خاص ذہنیت کے ترجمان " (ص۱۴۴)

اور پھر اسی بیزاری کے انداز میں مسلسل ڈھائی صفحے کی تقریر کرتے چلے جاتے ہیں، کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی ذمہ دار آدمی حضرت حسینؓ کو ان الفاظ سے یاد کرے " جو باعتبار معنیٰ ومطالب حقیقت سے قطعاً بعید ہیں " اور اس نری قیاس آرائی کے لئے دور دور سے بنیادیں تلاش کرکے لاتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے ہی مشتبہ راویوں سے وہ یزید اور اعوان یزید کو فائدہ پہنچانے والی ایسی تحریریں تک کو بے چون وچرا تسلیم کرالینا چاہتے ہیں، جن کے اندر وضعیت کی صریح شہادتیں موجود ہیں البدایہ والنہایہ وغیرہ میں مروان کا ایک خط منقول ہوا ہے جو روایت کے مطابق حضرت حسین کے قصد کوفہ کے بعد ابن زیاد کو لکھا گیا تھا۔ اس میں حضرت حسینؓ کا ذکر بڑی عظمت کے ساتھ کرکے ابن زیاد کو لکھا گیا تھا کہ :-

فایاک وان تھیج علی نفسك	خبردار! تم کوئی ایسا معاملہ نہ کر بیٹھنا جس کا مداوا
مالا یسدہ شیٔ ولا تنساہ العامۃ	نہ ہو سکے، جسے عوام کبھی بھلا نہ سکیں اور رہتی دنیا
ولا تدع ذکرہ آخر الدھر	تک جس کا ذکر نہ چھوڑیں۔

اس کو نقل کرکے عباسی صاحب لکھتے ہیں کہ "اس مکتوب کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ حضرت حسینؓ کی ذات سے حضرت مروانؓ کو کیسی کچھ الفت تھی اور کیسی آرزو کہ اس خطرناک سفر میں ان کا بال بیکا نہ ہونے پائے۔ یہ وہی مروانؓ ہیں جن کے متعلق وضاعین نے اتہام لگایا ہے کہ"[1] الخ۔ اس خط کے جو الفاظ اوپر نقل ہوئے ہیں بلا کسی خارجی شہادت کے اپنی وضعیت کا آپ ثبوت ہیں۔ مگر عباسی صاحب اس خط کی واقعیت میں خود شبہ رکھنے کے باوجود اسے مروان کی صفائی کے لئے پورے شرح صدر کیساتھ استعمال فرماتے ہیں حالانکہ یہی الفاظ اگر مروان کی صفائی کا فائدہ نہ دے رہے ہوتے اور صرف حضرت حسین کی مدح ہوتی تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہو کہ وہ حضرت عبداللہ بن جعفر کے خط کی طرح اس خط کی بھی دھجیاں بکھیر دینے میں پورا زور صرف کرتے اس لئے کہ اس خط کے مذکورہ الفاظ سے بھی حضرت حسینؓ کی قریب قریب وہی عظمت ظاہر ہوتی ہے جس پر عبداللہ بن جعفر کے مکتوب کے الفاظ دلالت کرتے تھے۔

غرض یہ ہے عباسی صاحب کا معاملہ کہ وہ یزید و اعوانہ کی فضیلت و مدح میں نہ صرف ہر رطب و یابس کو سر آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں، بلکہ واعظانہ نکات آفرینی تک سے دریغ نہیں کرتے لیکن سیدنا حسینؓ کی مدح و ستائش پر وہ اس طرح چیں بجبیں ہوتے ہیں جیسے ان کے گھر سے کچھ جا رہا ہے، اور دور از کار قیاس آرائیوں کا پورا زور صرف کرکے چاہتے ہیں کہ اس مدح و ستائش کا ایک ایک لفظ "حرف غلط" کی طرح مٹا دیں۔ ——— یہ بے توازنی اور انتہاپن ہی ہمارے نزدیک وہ اصولی معیار ہے جس پر حسین اور یزید کے قضیہ میں عباسی صاحب کی اس تحقیقی کاوش کو جانچا جاسکتا ہے۔ اور بغیر پوری کتاب پڑھے یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہو کہ عباسی صاحب کے پیش کردہ نتائج کس درجہ کے ہوں گے، ہمارے نزدیک عباسی صاحب کی یہ پوری کاوش اُن کی اس دو طرفہ متضاد قسم کی انتہاپسندی سے بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عباسی صاحب کی یہ تالیف یقیناً ایک مفید علمی خدمت ثابت ہوتی اور سنجیدہ لوگوں سے خراج تحسین ہی وصول کرتی۔

اس انتہاپسندی سے پوری کتاب کس طرح متاثر ہوئی ہے، اور اس نے کتاب کی تحقیقی حیثیت پر کیا اثر ڈالا ہے اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] صفحہ ۱۶۳

اس ذیل میں ایک اصولی بات تو یہ ہے کہ اپنے مقصد میں مزاحم ہونے والی جس تاریخی روایت پر بھی اس کو کوئی معقول جرح نہ کرسکے اُس کو بلا کسی دلیل کے وضعی کہہ کر بے دھڑک رد کر ڈالا ہے۔ یہ پوری کتاب میں پھیلا ہوا ایک عام رجحان ہے جس کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یوں بھی اس کتاب کے ہر ناقد نے شاید اس پہلو کو سب سے پہلے نمبر پر محسوس کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ادعائی روش کے بعد کتاب کا تحقیقی درجہ کیا رہ سکتا ہو؟

اسی طرح اس انتہا پسندی اور ذہنی جنبہ داری کے ماتحت مؤلف سے یہ بات بھی بکثرت صادر ہوئی ہو کہ اپنے دعووں کی دلیلوں میں وہ مخالف احتمالات کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ محض احتمالات اور ظنیات سے اس طرح استدلال فرما گئے ہیں جیسے استدلال کی بنیاد بالکل قطعی ہے ــــــ مثال کے طور پر حضرت محمد بن حنفیہؒ کے یزید سے بیعت کرنے، پھر بیعت پر مستقیم رہنے اور حضرت حسینؓ کا ساتھ نہ دینے کو وہ اس دعوے کا کھلا ہوا ثبوت قرار دیتے ہیں کہ:-

" وہ ...... اس خروج کو طلب خلافت کا ایک ایسا سیاسی مسئلہ سمجھتے تھے جو مقتضیات زمانہ اور احکام شرع کے اعتبار سے جائز اور مناسب نہ تھا " (ص۷۹-۸۰)

حالانکہ اس واقعہ میں اس دعوی کا ذرا بھی کھلا ہوا ثبوت نہیں، محض ایک احتمال ہے جس کو متعین کرنے والی عباسی صاحب نے کوئی دلیل نہیں پیش کی۔

اسی طرح حضرات صحابہؓ کا موقف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور اس کو بدیہی دلیل قرار دیتے ہیں کہ " نظام خلافت یا کردار خلیفہ میں کوئی ایسی خرابی اور خامی نہ تھی جو خلیفہ کے خلاف خروج کو جائز کر دے " (ص۸۱) حالانکہ دس پندرہ صفحے پیشتر ہی وہ ممانعت خروج کی وہ حدیثیں پیش کر کے آئے تھے جن میں نظام خلافت کے اندر خرابی یا کردار خلیفہ میں خامی دیکھنے کے باوجود خروج سے منع فرمایا گیا ہے۔ پس یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ خرابی اور خامی سب کچھ ہو مگر اُن احادیث کی بنا پر صحابہ کرام نے خروج سے اجتناب کیا ہو؟

بلکہ یہاں تک بھی ہوا ہے کہ جس واقعہ میں ان کی مفروضہ بنیاد کے احتمال و امکان کی بھی کوئی ادنیٰ گنجائش نہیں پائی جاتی وہاں بھی وہ پورے جزم و تیقن کے ساتھ اس مفروضہ کو واقعہ کی بنیاد ٹھہراتے ہیں اور پھر حسب مرضی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ حضرت حسینؓ کے ایک دوسرے بھائی حضرت عمر الاطراف کے متعلق یہ بیان کر کے کہ وہ بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ نہ گئے۔ نیز یہ کہ جب شہادت حسینؓ کی خبر آئی تو انھوں نے کہا کہ:-

انا الغلام الحازم ولو اخرج معھم لذھبت فی المعرکۃ وقُتلت۔ | میں ایک عقلمند و محتاط جوان ہوں اور اگر میں بھی ان کے ساتھ نکلتا تو لڑائی میں شریک ہوتا اور مارا جاتا۔

فرماتے ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ حضرت حسین کے یہ بھائی بھی ان کے خروج کو طلب حکومت وخلافت ہی کا ایسا اقدام سمجھتے تھے جو کسی طرح جائز ومناسب نہ تھا" (صنہ)

اس استدلال پر اگر کہا جائے کہ"...... ہرا ہی ہرا دکھائی دینے" والی مثل صادق آتی ہے تو بیجا نہیں ہوگا۔

حضرت عمر الاطراف کے مذکورہ الفاظ کے بعد تو اس "ظاہر ہے" کا ادنیٰ احتمال تک باقی نہیں رہتا لیکن عباسی صاحب ہیں کہ وہی" ظاہر ہے" کی ایک رٹ لگائے ہوئے ہیں۔

یہ اس عدم توازن اور انتہاپسندانہ افراط وتفریط کی چند مثالیں ہیں جس سے پوری کتاب متاثر نظر آتی ہے۔ استقصاء کیا جائے، تو ایسی مثالیں بڑی تعداد میں نکلیں گی۔ مگر اب ہم کتاب کے اہم مباحث پر من حیث البحث ایک نظر ڈالکر تبصرہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس نظر میں بھی ایسی کچھ مزید مثالیں خود بخود سامنے آئیں گی۔

کتاب کی سب سے اہم اور اصل بحث کربلا کا حادثۂ فاجعہ ہے۔ باقی سب اسکے متعلقات وتضمنات!۔۔۔

حادثہ کربلا کے سلسلہ میں مؤلف کے دو خاص دعوے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حادثہ یزید اور عمال یزید کے قصد وارادہ کے بغیر بالکل اتفاقی طور پر پیش آیا۔ دوم یہ کہ حادثہ سے قبل اور بعد کے مظالم کی تمام داستانیں وضعی ہیں۔

قبل حادثہ کے مظالم "منع آب" وغیرہ کی وضعیت ثابت کرنے کے لئے مؤلف نے تقریباً سو صفحے میں حسینی قافلہ کے سفر (از مکہ تا کربلا) پر بحث کی ہے۔ اس بحث سے مؤلف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حسینی قافلہ ۱۰ محرم سے پہلے کسی طرح کربلا میں نہیں پہنچ سکتا تھا، اور ۱۰ ہی محرم کو واقعہ پیش آیا ہے، پس اس طرح منع آب وغیرہ کے مظالم کی واقعیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہجاتی۔

ہمارا اپنا رجحان خود یہی ہے کہ یہ داستانیں گڑھی ہوئی ہیں حقیقت سے اُن کو کوئی واسطہ نہیں۔ مگر عباسی صاحب نے غیر معمولی موشگافیوں کے ذریعہ اس تردید کی جو بنیاد فراہم کی ہے ہمارے نزدیک وہ بڑی کمزور

اور خالص تحکم کا درجہ رکھتی ہے۔ عباسی صاحب کی موشگافی اور دیدہ ریزی کی داد نہ دینا تو ظلم ہوگا۔ بیشک اُن کی اس بحث سے "بال کی کھال نکال کر رکھدینے" کا بڑا ملکہ ظاہر ہوتا ہے، مگر ان کی اس محنت کا حاصل کچھ زیادہ وقیع اور مستحکم نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین کا سفر ۸ ذی الحجہ کو نہیں، ۱۰ ذی الحجہ کو شروع ہوا۔ انکی اس بحث میں اگرچہ کافی کلام کی گنجائش ہے، اور بحث فی نفسہ بہت کمزور ہے۔ تاہم یہ مان لینے کے بعد بھی کہ تاریخ روانگی ۱۰ ذی الحجہ ہی تھی، اس امر کی کوئی مضبوط دلیل ان کے پاس نظر نہیں آتی کہ ۱ محرم سے پہلے قافلہ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ حسابی فارمولے اور عام تجربات سب بجا، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس قافلہ کے حالات غیر معمولی اور خاص نوعیت کے تھے۔ اور غیر معمولی حالات میں عجلت پیش نظر رکھنے والے مسافر مہینوں کی مسافت ہفتوں میں اور ہفتوں کی دنوں میں طے کرڈالتے ہیں۔ ایسے واقعات ملتے ہیں اور خود اسلامی تاریخ میں حضرت خالد بن ولید کا شام کے علاقہ میں ایسا ہی ایک غیر معمولی اور حیران کن سفر بہت مشہور ہے۔ عباسی صاحب نے اگرچہ حسینی قافلہ کے غیر معمولی حالات کی بھی نفی کی کافی کوشش کی ہے، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ اور نہ یہ تسلیم کئے جانے کے قابل بات ہے۔ بلاشبہ غیر معمولی حالات تھے، اور اُنکی نفی کوشش میں داد تحقیق دینا ایک مہمل اور بے سود بات! کتنی اُلٹی بات ہے جو عباسی صاحب اس کوشش میں فرماگئے ہیں کہ:۔

> "عامل مکہ کے بھیجے ہوئے لوگ تو جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں پہلے ہی بے نیل و مرام لوٹ گئے تھے۔ اسکے پاس ایسی کونسی فوج تھی جس کے تعقب کا خوف وہراس غیر معمولی طریق سفر اختیار کرنے پر مجبور کردیتا" (ص ۱۴۱)

عامل مکہ کے قاصدوں کا ناکام لوٹ جانا تو ایک ہوشمند آدمی سے بذات خود اس کا متقاضی تھا کہ قطع سفر میں غیر معمولی عجلت کی جائے۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں آگے اور پیچھے دونوں طرف سے خطرہ بڑھ جانا قدرتی بات تھی۔ ۔ اگر گورنروں کے پاس فوجی کارروائی کی یا پکڑ دھکڑ کی قوت نہوتا تو گورنروں کی ایسی بے دست و پائی کو عباسی صاحب کے علاوہ کسی اور کا مان لینا مشکل ہے۔ عباسی صاحب اس قافلہ کے غیر معمولی حالات کی نفی کرکے نہ صرف عام قافلوں اور مسافروں پر اسکو قیاس کرلینا چاہتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر باربردار قافلوں کے حکم میں شامل کردینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس بحث میں سر رچرڈ ایف برٹن کے اس تجربہ کو شاہد بناتے ہیں کہ:۔

> "میں نے اس کا اندازہ لگایا ہے کہ حجازی اونٹ کی رفتار جو کارواں کی قطار میں بوجھ

لیا ہوا چل رہا ہو معمولی حالت کے تحت ایک گھنٹہ میں دو جغرافیائی میل ہوتی ہے۔" (ص۱۵۶)

بہرحال عباسی صاحب کی یہ دونوں کوششیں نہایت لاحاصل قسم کی ہیں۔ اس طرح کی زبردستی اور کھینچ تان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوا کرتی۔ پھر عباسی صاحب کی اس بحث میں ایک بڑا خلا بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضرت حسینؓ اور عمر بن سعد کے مابین جو گفتگوئیں مورخین نے نقل کی ہیں۔ پھر اسکے نتیجہ میں جو خط و کتابت عمر اور ابن زیاد کے درمیان ہونی بتائی گئی ہے یہ گفتگوئیں اور یہ خط و کتابت ضرور کچھ وقت چاہتی ہو عباسی صاحب کو اپنا دعویٰ ثابت کرنے کیلئے ضرورت تھی کہ وہ اس آبادی کے ذاتیا کو بھی وضعی ثابت کرتے مگر عباسی صاحب نہ صرف ان کو تسلیم کر گئے ہیں بلکہ اپنے بعض نتائج تحقیق کی بنا بھی ان پر رکھ گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص۲۰۱-۲۱۱) ایسی صورت میں نہ صرف اُن کی بحث میں ایک بڑا خلا رہجاتا ہے، بلکہ خود ان کے اپنے ہاتھوں ایک بڑا شگاف ان کے دعوے کے ثبوت میں پڑ گیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس بحث میں عباسی صاحب کی موشگافیوں سے ایک بڑا فائدہ یہ تو ضرور ہوا ہو کہ اس واقعہ کے سلسلہ میں روایات پر اندھا دھند اعتماد کی جڑیں ہل گئی ہیں، اور اسکی بڑی ضرورت تھی اسلئے کہ بقول امام غزالیؒ ان روایات کا تانا بانا تیار کرنے میں تعصب کی شدید دخل اندازی ہوئی ہے۔ لیکن اسکے جو خاص دعویٰ عباسی صاحب ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کا ثبوت ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ رہی اُنکی اصل غرض جو اس ساری اکھیڑ پچھاڑ سے ہے۔ یعنی مظالم قبل و توجہ کی تردید، اس کے لئے ہمارے نزدیک اسکی چنداں حاجت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ ان تمام دحشیانہ مظالم ماقبل و مابعد والی روایات کی تردید کے لئے انکی کتاب میں دوسرا کافی وشافی مواد موجود ہے۔ اور وہ سب انھیں کتابوں سے ماخوذ ہے، جہاں سے یہ مظالم کی داستانیں نکال کر لائی جاتی ہیں، مثلاً حضرت حسین کے بارے میں یزید کو حضرت معاویہ کی وصیت۔ مکہ کے زمانہ قیام میں حضرت حسین کے ساتھ یزید اور عامل یزید کا رویہ۔ پھر ابن زیاد کے نام یزید کا فرمان، اور یہ ناقابل انکار حقیقت کہ ابن زیاد کو حضرت حسین سے کوئی سابق پرخاش نہ تھی۔ پھر عمر بن سعد کی قرابت۔ اور قتال حسینؓ سے اسکے گریز کی کوشش۔ حضرت علی بن الحسینؓ کا یزید کے حق میں مدت العمر کا رویہ۔ اور پھر حادثہ کے بعد کی اہلبیت اور اموی خاندان کی وہ نئی نئی قرابتیں جن کی تفصیل مؤلف نے دی ہے۔ ان سب حقائق کے ہوتے ہوئے ایک غیر متعصب آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی ان خرافات پر کان نہیں دھر سکتا جو مظالم کے عنوان سے مشہور کی گئی ہیں۔ اور جن کا واحد مقصد اہلبیت کے سوا اُس وقت کی پوری اسلامی سوسائٹی کو بدنام کرنا ہے۔

دوسرا دعویٰ عباسی صاحب کا یہ تھا کہ کربلا کا حادثہ فاجعہ یزید اور عمال یزید کے قصد و ارادہ کے بغیر

بالکل اتفاقی طور پر پیش آیا۔ یہ دعویٰ اس حد تک تو ہمارے نزدیک مضبوط ہے کہ یزید کے قصد و ارادہ کو اس حادثہ میں کوئی دخل نہ تھا۔ اسلئے کہ اس کا کوئی ایسا حکم اور کوئی ایسا اشارہ ابتک ثابت نہیں کیا جا سکا ہے، دوسری طرف اس بات کے قوی قرائن بھی موجود ہیں کہ یزید کی یہ مرضی نہ رہی ہوگی۔ لیکن متعلقہ عمال عبیداللہ ابن زیاد اور عمر بن سعد کے بارے میں مؤلف کا دعویٰ ہمیں مضبوط نظر نہیں آتا۔ ان دونوں کی صفائی کی بنیاد مؤلف نے تمامتر اس دعوے پر رکھی ہے کہ ابن زیاد نے حسینی قافلہ سے صرف ہتھیار رکھوالینے کا حکم دیا تھا اور عمر بن سعد نے صرف اسی غرض سے ان کے گرد گھیرا ڈالا تھا، مگر حضرت حسینؓ کے کوفی سبائی ساتھیوں نے گھیرا ڈالنے والے سرکاری دستہ پر حملہ کر دیا۔ اور اسطرح بے وہم گمان آناً فاناً یہ حادثہ محزون پیش آگیا۔ مگر مؤلف اپنے دعوے کا کوئی اطمینان بخش ثبوت نہیں لاسکے ہیں۔ انھوں نے ایک تو "انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام" کے مقالہ نویسوں کا بیان اس باب میں پیش کیا ہے، لیکن جب تک اِن مقالہ نویسوں کی تحقیق کا ماٰخذ نہ معلوم ہو، انکا بیان قطعاً حجت نہیں۔ دوسرا ثبوت وہ یہ دیتے ہیں کہ قافلہ کے ۷۲ آدمیوں کے مقابلہ میں عمر بن سعد کے ۸۸ آدمی مارے گئے حالانکہ یہ جنگ آزمودہ سپاہی تھے اور وہ (قافلہ والے) نبرد آزمائی میں ناتجربہ کار۔ عباسی صاحب کے نزدیک یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ فوجی دستہ محض مدافعت کرتا رہا جنگ اس کا مقصود نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی جتنا بے جان ثبوت ہے ظاہر ہے۔ اور شاید عباسی صاحب کو یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے اس ثبوت کی جڑ پہلے ہی کاٹ آئے ہیں۔ صلاتہ پر وہ لکھ آئے ہیں کہ "عالم اسلام کا ہر فرد پوری طرح مسلح تھا اور اکثر وبیشتر ماہر حرب و ضرب"...... اور اس سے بھی آگے بڑھکر خاص اِن اہلِ قافلہ کی تو "دلیری اور شجاعت و شہامت" کا بھی وہ بڑے زور و شور سے اثبات کر آئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صلالہ)

غرض مؤلف نے یہ بالکل ایک نرالا دعویٰ کیا ہے، اور کم از کم ہمیں تو خوشی ہی ہو اگر یہ ثابت ہو جائے، گر مؤلف اس کا کوئی قابل اعتنا ثبوت نہیں فراہم کر سکے ہیں۔ اس لئے یہ دعویٰ محض دعویٰ ہے۔ اور ایسی حالت میں اس پر اصرار اموی حکومت اور اسکے کارپردازوں کی صفائی سے بیجا دلچسپی کا ثبوت!

اس بحث میں مؤلف کے ایک نکتہ کی تحسین سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے ایک غیر متعصب اور متیقظ طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عمر بن سعد کے مشورہ کو ابن زیاد نے بذات خود بنظر استحسان دیکھا تو شمر بن ذی الجوشن کے کہنے میں آکر یک لخت اُس نے

حضرت حسین کی شرائط پر بین بین مصالحت کا موقف کیوں بدل دیا عباسی صاحب نے ص۲۰۱ پر اسکی بڑی قرین قیاس توجیہ کی ہے جس سے گرہ بالکل کھل جاتی ہے۔ لیکن اسکے بعد حضرت حسین کے موقف کے بارے میں "استعجاب" کے جس عقدے میں عباسی صاحب الجھ گئے ہیں۔ اس کا حل ہم انھیں بتاتے ہیں کہ مسلم بن عقیلؓ کے حشر کے پیش نظر حضرت حسینؓ کو ابن زیاد کی طرف سے بے اطمینانی تھی، جس کا ذکر تاریخ طبری وغیرہ میں صراحۃً موجود ہے ـــــــــ اور خود کو اس پوزیشن میں رکھ کر دیکھئے تو بالکل بجا تھی۔

کتاب کی دوسری اہم بحث حضرت حسین اور یزید کے نزاع کی حقیقت اور اسکے شرعی محاکمہ کی ہے اس بحث میں بھی مؤلف نے حسب عادت بڑی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک طرف وہ یزید کی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے غیر ثابت شدہ دعووں سے اور عبارت آرائی و سخن پروری کے فن سے کام لیتے ہیں۔ دوسری طرف حضرت حسینؓ کا کیس کمزور کرنے کے لئے مرتبت ناشناس مستشرقین کا کندھا استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہر چند کہ موصوف نے اپنے غالباً کسی لفظ سے سیدنا حسینؓ کی براہ تنقیص کا ارتکاب نہیں کیا۔ لیکن مستشرقین کے نہایت ناشائستہ الفاظ بلا تنقید نقل کر کے انھوں نے خود کو ملوث کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے، اور اگر یہ "نقل کفر" کا ارتکاب ان سے نہ ہوا ہوتا تو حقیقت یہ ہے ان کی کتاب کی ضبطی کے مطالبہ میں کوئی جان نہ ہوتی۔

بہرحال اس نزاع میں وہ یزید کی پوزیشن "ولیعہدی" کے وقت سے مضبوط کرنا شروع کرتے ہیں اور یہیں سے افراط کا معاملہ شروع کر دیتے ہیں۔ ہم ان لوگوں میں ہیں جو ولایت عہد کی اس کارروائی پر حضرت معاویہؓ کو متہم کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ بایں معنی کہ اولاً تو یزید کو ولی العہد بنانے کی تجویز حضرت معاویہؓ کے بعض رفقاء کی طرف سے ہوئی تھی خود انکی طرف سے یہ تحریک نہیں تھی۔ ثانیاً کم از کم حضرت معاویہ کی زندگی میں یزید کے اندر کوئی فسق و فجور کے قبیل کی بات نہ تھی کہ انکو اس کارروائی پر متہم کیا جاسکے، لیکن مؤلف کا یہ بیان کہ:-

"جہاں تک یزید کی اہلیت و قابلیت کا سوال ہے ان کے عہد میں سب کے نزدیک مسلم تھی۔" (ص۳۲)

ایسی حالت میں کہ اسکے ثبوت میں بڑے جھول نظر آتے ہیں، بجز غلو اور افراط کے اور کچھ نہیں قرار

دیا جاسکتا۔

لیکن عباسی صاحب تو اس پر بھی بس نہیں کرتے اس سے بہت آگے جا کر کہتے ہیں:-

"امیر یزیدؒ کی ولیعہدی کی اس بیعت سے پہلے کبھی اس اہتمام سے بیعت نہیں لی گئی تھی کہ مملکت اسلامی کے گوشہ گوشہ سے بیعت کے لئے وفود آئے ہوں اور ہر علاقہ کے لوگوں نے بطیب خاطر اس طرح ایک ایسے قریشی نوجوان کی بیعت کی ہو جو اپنی صلاحیتوں اور خدمات ملّیہ کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے ملّت کا محبوب تھا۔

اتنا بڑا دعویٰ ——— ملت کی محبوبیت ——— اور ثبوت؟ کچھ بھی نہیں، بلکہ عباسی صاحب نے جوش کالت میں غور نہیں فرمایا کہ بیعت لئے جانے کے جس غیر معمولی اہتمام کا وہ ذکر فرما رہے ہیں، وہ تو اُلٹا اس محبوبیت ——— کے کچھ خلاف ہی ثبوت فراہم کرتا ہے ——— اور حقیقتاً اس اہتمام سے ——— جو واقعہ بھی ہو ——— یہی معلوم ہوتا ہے کہ بات "محبوبیت عام" کی تو کجا "مسئلہ اہلیت" کی بھی نہ تھی، لیکن حالات کا تقاضہ یہی تھا، اور اس تقاضے ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت معاویہ اور انکے اہل نظر معتمدین نے بہت سے افاضل کو چھوڑتے ہوئے ایک مفضول کو امام بنانے کا فیصلہ کیا ——— اور پھر ہر جائز طریقے سے اس فیصلہ کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔

اس نزاع میں یزید کی پوزیشن عباسی صاحب کے اٹھائے ہوئے ایک نکتہ سے بہت مضبوط ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ وہ اس کا کوئی مستند حوالہ بھی دیدیتے۔ مگر متعدد جگہ اس بات کو دہرانے کے باوجود انھوں نے کوئی متعین حوالہ نہیں دیا ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت حسینؓ یزید کی ولایت عہد کے بعد بھی حضرت معاویہ کے آخر دم تک حسب معمول ہر سال دمشق جاتے اور عزیزوں کی طرح حضرت معاویہ کے پاس مقیم ہوتے اور گرانقدر وظائف و عطایا حاصل کرتے رہے (ص ۲۲-۲۶) مزید برآں عباسی صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت حسین کے خروج سے پہلے تک اُن کے اور یزید کے تعلقات بہت خوشگوار اور اُنس و محبت کے رہے" (ص ۲۱) یہ بات تو یزید کی پوزیشن اور بھی زیادہ مضبوط کر دیتی تھی، لیکن وہی کمزوری ہو کہ عباسی صاحب حوالہ سے ساکت ہیں۔

اس باب میں عباسی صاحب کی اس اظہار حقیقت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا کہ

"ولایت عہد کے سلسلے میں کذابین نے یہ فضا پیدا کی ہے کہ گویا اس وقت صحابۂ کرام

میں صرف یہ پانچ بزرگ ذی حیثیت تھے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ .... عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ۔ ان کے علاوہ سب امت عوام الناس پر مشتمل تھی۔ حالانکہ اس زمانہ میں اور بھی بلند اور ممتاز ہستیاں .... معمر صحابہؓ کی بہ تعدادِ کثیر موجود تھیں" (ص۳۷)

واقعہ یہ ہے کہ بڑی حد تک اس غلط فہمی ہی نے (جو بڑھ کر اس حد تک پہنچ گئی کہ ان پانچ میں بھی صرف دو ہی ہستیاں نظر میں رہ گئیں) حسینؓ و یزید کے نزاع میں لوگوں کو حق و انصاف اور جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا ہے، ورنہ اگر اُس وقت کی واقعی فضا نظر میں ہوتی تو وہ غلو اور وہ افراط و تفریط نہ پیدا ہوتی جس کا نہایت شدید ردعمل ہمیں عباسی صاحب کی اس کتاب میں نظر آتا ہے ـــــ لیکن یہ بھی ہمارے نزدیک غلط فہمی اور لغزشِ فکر و نظر ہی ہے کہ اگر حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر سے بزرگ تر صحابہ بہ تعدادِ کثیر موجود تھے۔ اور وہ سب کے سب یزید کی بیعت پر متفق ہو گئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس معاملہ میں اختلاف کا کوئی شرعی حق ہی نہیں رہا، اور اکثریت کے مقابلہ میں اُنکا اختلاف "کوئی حیثیت ہی" نہیں رکھتا۔ عباسی صاحب نے اس دعوے کی حجت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مثال دیکر بڑی غلط فہمی اور اصول دین سے بڑی ناواقفی کا ثبوت دیا ہے۔ حضورؐ ہرگز ہرگز اکثریت کے اتباع پر مجبور نہیں تھے۔ جس واقعہ کی طرف عباسی صاحب نے اشارہ کیا ہے اس میں اکثریت کے مرضی کے اتباع کی یہ توجیہ ہرگز صحیح نہیں۔ اصل توجیہ کچھ اور ہے ـــــ بہرحال منصفانہ نظر سے کام لیا جائے تو مسئلہ میں صحیح موقف ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اُس وقت کسی بھی شخص کے لئے قضیہ زیر بحث میں اجتہادی اختلاف کی گنجائش تھی۔ قطع نظر اسکے کہ وہ اجتہاد خطا قرار پائے یا صواب۔ اس لئے کہ قضیہ میں کئی پہلو ایسے تھے کہ نیک نیتی کے ساتھ اور شرعاً درست سمجھ کر اختلاف اور پھر خروج کیا جا سکتا تھا۔

۱۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اس طرح کی ولایت عہد سے اسلامی خلافت میں قیصریت و کسرویت کی بنا پڑ جائے گی اس لئے اسکو تسلیم نہیں کیا جانا چاہیئے ـــ اور واقعتہً بنا پڑ بھی گئی

۲۔ خروج علی الامام سے ممانعت والی حدیثوں کے متعلق سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ اس امام کا حکم ہے کہ جس کی امامت کا انعقاد اسلام کے معروف اصولِ شوریٰ کی بنیاد پر ہو۔

۳۔ "ولایت عہد" کے سلسلہ میں مشورہ کی نوعیت چونکہ شوریٰ کے معروف اصول کی نہ تھی بلکہ

کنوینگ سے ملتی جلتی چیز تھی اس لئے سوچا جا سکتا تھا کہ اس طرح سے حاصل شدہ اتفاق کا حکم وہ نہیں ہے جو اصل طریق شوریٰ سے حاصل شدہ اتفاق کا ہے۔

ہمارا خیال ہے، اور حضرت حسینؓ کے لوازم صحابیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ــــ جو ہمارے عقیدہ کا جزو ہیں ــــ بجا طور پر خیال ہے کہ حضرت حسین کا خروج اسی طرح کی بنیادوں پر مبنی ایک اجتہادی فعل تھا۔ اور اس اجتہاد کے لئے گنجائش تھی، قطع نظر اسکے کہ یہ اجتہاد خطا رہا یا صواب!۔

کتاب میں ایک اہم بحث "خلافت راشدہ" کی بھی تھی، اور ہمارا ارادہ تھا کہ اس پر بھی قدرے تفصیل سے بات کی جائے، مگر اب ان صفحات کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ مختصراً ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں بھی مؤلف سخت غلو کا شکار ہوئے ہیں، اور ردعمل کے جذبہ میں بڑی ٹھوکریں انھوں نے کھائی ہیں۔ لیکن اس میں قصور تنہا انھیں کا نہیں ہے ان لوگوں کا بھی ہے جو حضرت معاویہ کے عہد حکومت کی ان برکتوں کو...... دانستہ یا نادانستہ بالکل فراموش کر دینا چاہتے ہیں جن کا اعتراف شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی خلافت راشدہ کے زمرہ سے ان کو الگ رکھنے کے باوجود کیا ہے۔

مؤلف تک ایک بات اور پہنچانی ضروری ہے، وہ یہ کہ عربی عبارتوں کے ترجمہ میں جا بجا اتنی فاحش غلطیاں ہیں (مثلاً ص۲۱، ص۳۲، ص۴۵، ص۶۱، ص۷۱ وغیرہا) کہ ان کے ہوتے ہوئے عربی کتابوں کا حوالہ ایک بے جا جرأت معلوم ہوتی ہے۔

اعلان

بہت سی کتابیں عرصہ دراز سے تبصرہ کے لئے رکھی ہوئی ہیں ان شاء اللہ آئندہ ماہ ان میں سے اکثر پر تبصرہ آ جائے گا ــــ

مرتّب

فہرست کتب
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ملاحظہ فرمالیجئے :-

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اردو میں لکھیئے، اور اگر ہوسکے تو انگریزی میں بھی لکھ دیجئے۔

(۲) اگر آپ ایک دو روپے کی کتابیں منگوائیں گے تو محصولڈاک کا بار بہت زیادہ پڑ جائے گا۔ اور اگر زیادہ منگوائیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوئینگے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے کم ہوجائیگا اور آپ نفع میں رہیں گے۔

(۳) اگر کتابیں زیادہ ہوں گی تو ہم آپ کی مزید کفایت کے خیال سے ریلوے کے ذریعہ بھیجنا پسند کرینگے اسلیے آپ براہ کرم کتابوں کا آرڈر دیتے وقت اپنا ریلوے اسٹیشن ضرور لکھیئے اور اردو کے ساتھ انگریزی حروف میں بھی لکھیئے۔

(۴) پہلی مرتبہ آرڈر دینے کی صورت میں کم وبیش بیس روپے کے آرڈر پر پانچ روپے رقم ضرور پیشگی بھیجئے۔

(۵) پارسل کھولنے پر اگر آپ کو کوئی بات قابل شکایت نظر آئے تو براہ کرم بدگمانی نہ کیجئے، ہمیں لکھیئے ہم آپ کی شکایت کی مناسب تلافی کرنا اپنا فرض سمجھیں گے اور اگر کوئی کتاب زائد چلی جائے یا بل کم ہو تو ہمیں مطلع کرنا اپنا فرض سمجھئے۔

پاکستانی احباب کے لیے مخصوص ہدایات :-

(۱) جو کتابیں ہماری مطبوعات منگوانی ہوں انکی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور ۸ آنے رجسٹری فیس فی پیکٹ کا اضافہ کرکے کل رقم ذریعہ منی آرڈر "ناظم ادارہ اصلاح وتبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور" کے نام روانہ کر دیجئے، اور ڈاک خانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیج دیجئے۔ یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو فوراً روانہ کرادی جائیں گی۔

(۲) دوسروں کی مطبوعات ہم سے طلب کرنا ہوں تو رقم بھیجنے سے پہلے ہم سے رجوع کیجئے۔

(۳) یاد رکھیئے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے تو ہندستان سے پاکستان جاسکتے ہیں لیکن ایک کتاب کے زیادہ نسخے نہیں جاسکتے۔

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات ایک نظر میں

اسلام کیا ہے؟ اردو ۸/ ۲ ہندی -/۳	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے مجلد -/۴	معارف الحدیث اول مجلد -/۵ غیر مجلد -/۴	معارف الحدیث دوم مجلد ۸/ ۵ غیر مجلد ۸/ ۴
دین و شریعت مجلد -/۳	حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ۸/ ۲ مجلد -/۳	ملفوظات حضرت مولانا الیاسؒ -/۸/ ۱	تذکرہ مجدد الف ثانیؒ مجلد -/۴
مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ زیر طبع	آپ حج کیسے کریں؟ مجلد -/۲	آسان حج -/۸/-	کلمہ طیبہ کی حقیقت -/۶/-
نماز کی حقیقت -/۱۲/-	برکات رمضان -/۱۲/-	انیس نسواں -/۱۰/-	دجالی فتنہ اور سورہ کہف ۸/ ۱
حکمت ولی اللہی -/۱	فیصلہ کن مناظرہ -/۱	شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور اہل بدعت کے الزامات ۸/ ۱	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ -/۶/-

دیگر اداروں کی خاص خاص مطبوعات

تفسیریں اور قرآن مجید سے متعلق دوسری کتابیں، اردو میں

تفسیر ابن کثیر اردو — حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کی تفسیر جو عربی تفسیروں میں بھی مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر وہ پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے پھر صحابۂ کرام، تابعین اور بعد کے ائمہ تفسیر کے ارشادات سے۔ یہ اس کا مکمل اردو ترجمہ ہے۔ پانچ ضخیم جلدیں ہیں قیمت مجلد مکمل سٹ -/۵۵

تفسیر ماجدی — جسے تاج کمپنی لاہور نے اپنے اعلیٰ معیار پر شائع کیا ہے۔ ۵ جلدیں تیار ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی جلد۔

ہدیہ فی جلد -/۱۲ روپے

قصص القرآن — قرآن مجید میں جو بصیرت افروز اور عبرت آموز واقعات و قصص بیان ہوئے ہیں ان کا مکمل مجموعہ ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ چار جلدوں میں۔ از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مجموعی صفحات ۱۷۴۴۔

جلد اول -/۷/۸ جلد دوم -/۴ جلد سوم ۸/ ۴ جلد چہارم -/۴ (مجلد کی قیمت میں فی جلد ایک روپیہ کا اضافہ)

قصص و مسائل	از مولانا دریابادی	-/۲
قرآنی شخصیتیں	" " "	۴/ ۲
جغرافیہ قرآنی	" " "	۴/ ۱
حیوانات قرآنی	" " "	-/۲

فہم قرآن — از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی جس میں قرآن فہمی کے اصولوں پر مدلل اور دلنشین بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۲۰۰

قیمت غیر مجلد ۴/ ۲

رہنمائے قرآن اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کو سمجھنے کے لیے اپنے انداز کی بالکل نئی کتاب ۱/-/-

تدوین قرآن از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ جس میں قرآن کریم کے تحفظ کو تاریخی طور پر اس طرح بے غبار کردیا ہو کہ اس کے بعد کوئی مغالطہ اور شک آخری آپ کو الجھن میں نہیں ڈال سکتی۔ قیمت مجلد ۱/۸/-

قرآن اور تعمیر سیرت ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کے ۲۰ نہایت مفید مقالات کا مجموعہ۔ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے پڑھنے کی چیز ہے۔ صفحات ۳۲۷ قیمت غیر مجلد ۵/-/۰

لغات القرآن (کامل) اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح، چھ جلدوں میں۔ جلد اول ۸/۴ جلد دوم ۵/- جلد سوم ۸/قم جلد چہارم ۶/- جلد پنجم ۶/۸ ششم ۸/۴ (مجلد کی قیمت میں فی جلد ایک روپیہ کا اضافہ)

کتب حدیث مترجم اور شروح احادیث اردو میں

مشکوٰۃ شریف اردو مشکوٰۃ شریعت کو بجا طور پر حدیث کے کتب خانہ کا خلاصہ کہا جاسکتا ہو، اس کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں۔ قیمت مکمل مجلد ۱۶/-

بخاری شریف اردو تین جلدوں میں، مجلد قیمت مکمل ۲۵/-

موطا امام مالک مترجم بخاری شریف سے بھی پہلا مستند مجموعۂ حدیث۔ قیمت ۱۲/-

نور المصابیح ترجمہ زجاجۃ المصابیح حیدرآباد کے مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ صاحب کے حنفی نقطۂ نظر سے مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر مرتب کردہ مجموعۂ حدیث (زجاجۃ المصابیح) کی جلد اول کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۴/-/-

شمائل ترمذی مع خصائل نبویؐ شمائل ترمذی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا اور آپ کے عادات و اطوار کا ایک روایتی مرقع ہو۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی شرح خصائل نبویؐ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۶/-

مشارق الانوار مترجم بخاری اور مسلم کی ۲۲۷۲ قولی احادیث کا گرانقدر اور مقبول و معروف مجموعہ۔ مجلد ۱۵/-

حصن حصین رسول پاکؐ سے منقول دعاؤں کا مستند اور مقبول مجموعہ۔ مجلد ۵/-

مختصر شعب الایمان اردو از امام بیہقی قیمت ۱/-

مختصر خصائل نبویؐ " ۱/-

لغات الحدیث اردو مشہور خادم حدیث مولانا وحیدالزماں صاحب کی مرتب کردہ لغات حدیث (عربی سے اردو) چھ جلدوں میں سے چار جلدیں۔ قیمت فی جلد مجلد ۱۲/-

صحیفہ ہمام بن منبہؒ حضرت ہمام بن منبہؒ مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کرلیا تھا لیکن یہ کتاب ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ ہمارے زمانہ کے مشہور اسلامی محقق ڈاکٹر وحیداللہ صاحب نے اس کتاب کا ایک نسخہ کسی طرح ڈھونڈھ نکالا اور پھر اس کو مع ترجمہ اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کردیا ہو۔ المنزل تحفہ قیمت ۳/۸

ترجمان السنہ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مدینہ طیبہ۔

یہ احادیث کا ایک جدید مجموعہ ہے جسے حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ایک خاص ترتیب پر مرتب کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک پورا اسلامی کتب خانہ ہے اور کسی تعلیم یافتہ مسلمان کو خواہ وہ جدید تعلیم کا حامل ہو یا قدیم تعلیم کا اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنا چاہیے اب تک تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ جلد اول -/۱۰ دوم -/۹ سوم -/۱۰ (مجلد کی قیمت میں فی جلد ایک روپیہ کا اضافہ)

علم الحدیث

از مولانا عبد اللہ العمادی۔ باوجود مختصر ہونے کے اپنے موضوع پر نہایت مفید کتاب ہے جس میں حدیث کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ قیمت ۱/۴/۰

تدوین حدیث

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح

تدوین حدیث کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ احادیث کا جو ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقہ پر پہونچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں قیمت مجلد ۶/۸

تاریخ وسیرت

اصح السیر

مولانا عبد الرؤف دانا پوری کی نہایت مستند سیرت نبوی مجلد -/۱۰

رسول اکرم کی سیاسی زندگی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب جیسے اسلامی محقق کے قلم سے ہوا۔ حضرت کی سیاسی بصیرت کے ایک ایک گوشے کو روشنی میں لاتی ہے۔ مجلد قیمت -/۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات ومعاہدات

یعنی شاہان عالم عرب کے حکمرانوں وقبائلی سرداروں سے آپ کی سیاسی خط وکتابت اور معاہدات۔

از سید محبوب رضوی

قیمت ۲/۴

عہد نبوی کے میدان جنگ

جس میں غزوات نبوی پر فن حرب (جنگی سائنس) کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے متعدد جنگی میدانوں کے نقشے بھی شامل کتاب ہیں۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب۔ ۱/۸/۰

سیرت پاک

از مولانا بشیر محمد شارق دہلوی مصنف گو مشہور ومعروف نہیں ہیں مگر کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سیرت پر اس سے زیادہ کامیاب کتاب شاید ہی اس وقت کوئی اور ہو۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس، قیمت ۱/۴

صدیق اکبر رض

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مولانا شبلی کی الفاروق کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبر کا جو خلا محسوس ہوتا تھا۔ مولانا اکبر آبادی کی اس کتاب نے اس کو کما حقہ پر کر دیا ہے۔ قیمت ۰/۴

حضرت عمر رض کے سرکاری خطوط

اسلامی تاریخ کا ایک نادر، نایاب اور ایک بیش بہا دستاویز جسے ایک ریسرچ اسکالر نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ ۴۰۰ سے اوپر خطوط ایک حصہ میں خالص اردو اور دوسرے حصہ میں عربی متن ہر قیمت پر خریدنے کے لائق۔ مجلد -/۱۲ غیر مجلد -/۱۱

معاویہ رض

مصری مصنف عمر ابو النصر کی تالیف کا ترجمہ۔ قیمت -/۲

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح۔ مجلد ۱۲/۰

تاریخ ملت

شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ عہد رسالت سے سلاطین ہند تک۔ قیمت مکمل سٹ (گیارہ حصوں میں) غیر مجلد ۳۱/۸، مجلد -/۳۴ الگ الگ حصے بھی مل سکتے ہیں۔

حیات انور

یعنی حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب رح کی حیات مبارکہ پران کے ایک تلامذہ کے گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ -/۴

تاریخ دعوت عزیمت
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، خلافت راشدہ

کے بعد اسلام کی حقیقی دعوت اور اس کی نصرت و حمایت کے لیے کون کون سی اہم شخصیتیں کس کس وقت میدان میں آئیں اور انھوں نے کیا کیا کارنامے کس کس رنج سے انجام دیئے۔ یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ جلد اول پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک، جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہؒ نیز ان کے تلامذہ کی خدمات و حالات کے بیان میں۔ قیمت علی الترتیب -/۶ ۔ ۶/۸

مقدمہ ابن خلدون
فلسفۂ تاریخ کے مؤسس اور عظیم اسلامی مورخ علامہ

ابن خلدون کی تاریخ کا شہرۂ آفاق مقدمہ جس کی عظمت آج تک کم نہیں ہو سکی ۔ اردو زبان میں مستقل نقشوں اور تصویروں سے مزین قیمت صرف -/۱۵

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک
جس میں حضرت

سید احمد شہیدؒ کی مشہور و معروف تحریک اور اس کے خصوصاً اس کے دور کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں جو مشہد بالاکوٹ کے بعد سے تعلق رکھتا ہو، مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم ...... قیمت ۲/۸

تاریخ مشائخ چشت
از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ سلسلۂ چشتیہ کی

نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ۔ نیز تصوف اور خاص کر چشتی سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں۔ قیمت غیر مجلد -/۱۲ مجلد -/۱۳

بستان المحدثین اردو
کتب حدیث کا تعارف اور محدثین کرام کا تذکرہ

حضرت شاہ عبدالعزیز کے قلم سے۔ مجلد -/۵

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی مرحوم
شیخ موصوف ہندستان کی

نہایت اہم علمی و دینی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی سوانح کی کمی کو اس تحقیقی کتاب نے پورا کردیا ہے۔ (ایضاً از پروفیسر نظامی)

قیمت مجلد -/۷

تذکرہ شیخ محمد طاہر پٹنی
ہندوستان کے جلیل القدر محدث کا تذکرہ۔

قیمت مجلد ۱/۸

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے عجیب و غریب حالات ۔ دل میں اتر جانے والا انداز بیان ۔ اور دیکھنے کے قابل کتابت و طباعت۔ غرض ہر لحاظ سے ایک پسندیدہ کتاب قیمت مع جلد صرف -/۲/۸

سفرنامۂ ابن بطوطہ
آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان سیاح

شیخ ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامہ کا ملخص اردو ترجمہ

قیمت مجلد ۲/۸

دہلی اور اس کے اطراف
از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ

یہ فاضل مؤلف کا ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے جس سے دہلی اور اس کے آس پاس کے شہروں کے بارے میں آج سے ۶۵ سال پہلے کی نہایت مفید علمی دینی اور ثقافتی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

قیمت -/-/۲

تاریخ دیوبند
قصبۂ دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخ۔ از سید محبوب رضوی صاحب ، قیمت مجلد -/۲

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات
ایک مفید تاریخی مطالعہ ۔ از خلیق احمد نظامی۔

قیمت -/۸

مختلف موضوعات پر قابل مطالعہ کتابیں

حجۃ اللہ البالغہ مترجم
شاہ ولی اللہ کی وہ لاثانی تصنیف جو اسلام کے پورے نظام کی گہری حکمتوں سے باخبر کرتی ہے۔ عربی متن مع ترجمہ دو جلدیں ، مجلد -/۲۰

الانکشاف عن مہمات التصوف
تصوف کی گہرائیاں جن پر سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے پردہ اٹھایا ہے قیمت مجلد ۱۰/۱۲

تحفۂ اثنا عشریہ
شیعہ مذہب پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی لاجواب کتاب ــــ قیمت ــــ مجلد ۱۲/- ــــ

نصیحۃ الشیعہ کامل
مولانا احتشام الدین مرادآبادی کی مشہور کتاب ــــ مجلد ــــ ۵/۸

مقالات احسانی
تصوف اور مشائخ تصوف سے متعلق مولانا گیلانیؒ کے قابل دید مقالات و مضامین کا مجموعہ مجلد ۲/۸

مکتوبات شیخ الاسلام
یعنی حضرت مولانا مدنیؒ کے گرانقدر مکتوبات۔ جلد اول ۶/- ، سوم ۴/۸ ، دوم آج کل نایاب ہے۔

ارشادات
یعنی حضرت مولانا مدنیؒ کے مقالات و خطبات اور تقریروں کا ایک مجموعہ ...... مجلد ...... قیمت ۳/۸

اسلام کا نظام حکومت
اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور سنت رسانیہ حکومت پیش کیا گیا ہے۔ طرز تحریر زمانۂ حال کی قانونی زبان سے بالکل مطابقت رکھتا ہے قیمت غیر مجلد ۶/- مجلد ۷/-

مسلمانوں کا نظم مملکت
یہ دراصل ایک مصری فاضل کی کتاب النظم الاسلامیہ کا اردو ترجمہ ہے۔

اسلام کا زرعی نظام
اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔
قیمت غیر مجلد ۲/۴ ، مجلد ۵/-

اسلام کا نظام عفت و عصمت
اسلام نے پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کی تفصیل اور ان کی حکمت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔
ــــ قیمت ...... ۲/- ــــ

اسلام کا نظام مساجد
اسلام کے نظام میں مساجد کا کیا مقام ہے اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں اور اس کے بارے میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ قیمت ۲/۸/-

غلامان اسلام
از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ یہ کتاب غلاموں پر اسلام کے احسانات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ مجلد ۶/۸

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات
از جناب مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دو جلدیں قیمت (مکمل) ۵/۱۲

امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی
اپنے موضوع پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا قابل دید مقالہ ۱۰/-

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ
مسلمانوں میں نام نہاد سینکڑوں فرقوں کے وجود کی محققانہ تردید اور اس افسانہ تراشی کے اسباب۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔ مجلد قیمت ۱/۸

تاریخ علم فقہ
از مفتی عمیم الاحسان صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی، قیمت مجلد ۱/۸

بدعت کیا ہے
چند نہایت مفید مقالات کا مجموعہ قیمت ۳/-

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق
از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مجلد ۶/۸ غیر مجلد ۶/-

مسلمانوں کا عروج و زوال
از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مجلد ۵/- غیر مجلد

تعلیم ترجمۂ قرآن کا نصاب

رحمانی قاعدہ (عربی) /۵/۶/
" " (اردو) /۵/۶/
مفتاح القرآن اول /۵/۶/
" " دوم /۶/۹/
مفتاح القرآن سوم ۱/۲
" " چہارم ۱/۴
" " پنجم ۱/۸
معلم القرآن ۱/۴

بچوں کا کامیاب اردو دینی نصاب

اچھا قاعدہ ۳ آنے
اللہ کے رسول ۶ " "
حضرت ابوبکرؓ ۶ " "
حضرت عمرؓ ۶ " "
حضرت عثمانؓ ۶ " "
حضرت علیؓ ۶ آنے
اچھی باتیں ۶ حصے کامل ۲/۱۵
اچھے قصے ۶ آنے
حضرت خدیجہؓ ۶ آنے
حضرت سودہؓ ۴ " "
آسان فقہ ۶ آنے

سفر حج کیلئے بہترین کتابیں

آپ حج کیسے کریں؟ ... مجلد ... ۲/-
(تعارف ٹائیٹل کے صفحہ ۲ پر ملاحظہ ہو)
احسان الحجاج ۴/-
فضائل حج ۳/۸
معلم الحجاج ۳/۱۲
رفیق حج ۱/۸
حج کا مسنون طریقہ ۱/۴
تجلیات کعبہ ۳/-
تجلیات مدینہ ۲/۸
سفر حجاز (از مولانا دریا بادی) ۵/-
گلبانگ حرم۔ (زائر حرم حمید صدیقی کا روح پرور کلام) ۲/۱۲

متفرق علمی و دینی کتابیں

فلسفہ کیا ہے (از ڈاکٹر میر ولی الدین) مجلد ۲/- غیر مجلد ۱/-
عروج و زوال کا الٰہی نظام ...... مجلد ۲/-
اسوۂ حسنہ ...... مجلد ... ۳/-
کتاب الصلوٰۃ (از امام احمد بن حنبلؒ) مجلد ۱/۸
علامات قیامت ...... /۸/-
سد باب ذریعہ (ایک فقہی بحث) /۲/-
مضامین مولانا احمد سعید دہلوی ۲/۸
محمد بن عبدالوہاب ۲/۸
علوم عرب غیر مسلموں کی نظر میں ۲/۸
مثالی حکومت ۱/۸
مصباح اللغات (عربی اردو ڈکشنری) ۱۲/-
اردو عربی ڈکشنری ۶/-
القاموس الجدید ۷/۸
آئینۂ نماز ...... -/۴/-
صلوٰۃ النساء ...... -/۴/-
نصیحۃ المسلمین ...... -/۵/-

ایک ضروری اعلان

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ کے متعلق خیال تھا کہ اپریل میں تیار ہو جائے گی اس لیے الگ فہرست میں دے دی گئی تھی جس کی بنا پر آرڈر موصول ہو رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ کاغذ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتاب ابھی تک تیار نہیں ہو سکی ہے۔ خدا نے چاہا تو آئندہ ماہ تک اشاعت ہو جائیگی اس وقت اعلان کیا جائے گا۔

ہندستان پاکستان سے
سالانہ ۶ر (بسکۂ ہندستان) ۶ر
سالانہ ۷ر (بسکۂ پاکستان) ۷ر

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ .... ۲۵ روپے

جلد ۲۷ | بابتہ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۹ھ مطابق جون سنہ ۱۹۶۰ء | شمارہ ۱۲

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جون تک دفتر میں آجانی چاہیے ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

نمبر خریداری:۔ خط و کتابت اور منی آرڈر پر اپنا نمبر خریداری لکھنا ہرگز نہ بھولیے۔

تاریخ اشاعت:۔ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

مقام اشاعت:۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دو تین مہینے سے متعدد مسائل سامنے تھے جن پر ضرورت اور طبیعت کا تقاضا تھا کہ ان (ادارتی) صفحات میں روشنی ڈالی جائے مگر نہ تو گزشتہ اشاعت میں (جو دو ماہ کے دقفہ سے ہوئی تھی) بعض موانع کی وجہ سے اس کا موقع ہو سکا اور نہ اس اشاعت ہی میں یہ تقاضا پورا ہو رہا ہے۔

الفرقان کی کسی اشاعت کے اس خلا کو کہ اس کے ادارتی صفحات کسی مفید گفتگو سے خالی رہیں، ہم خود ایک بڑا خلا محسوس کرتے ہیں اور بحمد اللہ یہ نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے ـــ اور کوئی فخر نہیں محض شکر کے طور پر کہتے ہیں کہ الفرقان کے ناظرین اسی وجہ سے الفرقان کے ادارتی صفحات سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس سلسلے کے اس وقت کے موانع میں ایک خاص مانع یہ ہے کہ راقم سطور کو گزشتہ چند ماہ سے الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے انتظامی امور میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑ رہا ہے۔ اس مصروفیت میں اس ماہ یوں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا کہ دفتر میں جو صاحب چند سال سے ان تمام امور کے اصل ذمہ دار تھے انھوں نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے وسط مئی میں یکایک نوٹس دے دیا کہ وہ صرف ایک ہفتہ اور کام کر سکیں گے، چارو ناچار اسی دن سے ساری ذمہ داریاں خود سنبھالنا پڑیں اور ہفتہ گزرنے پر وہ صاحب سبکدوش ہو گئے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ لکھنے لکھانے کا کام کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بمشکل چند صفحات اس ماہ لکھے جا سکے جن کا گزشتہ اشاعت میں وعدہ کر لیا گیا تھا۔ اسی پریشانی کی وجہ سے ایک دوسرا وعدہ کہ جون کی اشاعت میں برائے تبصرہ آئی کتابوں میں سے اکثر پر تبصرہ ہو جائے گا، نام کو بھی نہ پورا کیا جا سکا۔

بہرحال یہ صورت حال ہے جس کی وجہ سے یہ نگاہ اولیں کے صفحات ہماری طبیعت کے تقاضے اور ناظرین کی توقع کے خلاف خالی سے جا رہے ہیں۔ آیئے اس خلا کو بعض دوسری ضروری باتوں سے پُر کریں۔

الفرقان کی سینتیسویں جلد کا یہ آخری شمارہ ہے۔ ہمیں اب یہ یاد کرتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم نے ایک خاص سبب کے دو سال پیشتر کے وعدہ کو اس سال میں ضرور کسی نہ کسی وقت ایفا کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر "عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" کے سوا کچھ اور کہنے کا محل نہیں۔ جو خاص داعیہ تھا وہ بھی اس طویل التوا کی وجہ سے سرد ہو چکا۔ اور مواقع و امکانات کے پہلو میں کوئی خاص تبدیلی بھی ہوتی نظر نہیں آتی۔ بس فی الحال اس مسئلہ کو ختم سمجھنا چاہیے۔

قرآنی دعوت کا سلسلۂ مضمون ختم ہو جانے کے بعد سے برابر یہ خیال چل رہا ہے کہ اس سلسلہ کا بدل "قرآنی ہدایات و تعلیمات" پر کسی دوسرے سلسلۂ مضمون کو بننا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس کا جوشِ فیض بساقی ہر دم شباب پر ہے، اور جس سے فیض یابی کا شغل وقت کا سب سے اعلیٰ مصرف۔ پس بنامِ خدا یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ آئندہ شمارہ سے (جو اڑتیسویں جلد کا پہلا شمارہ ہوگا) ایک مستقل سلسلۂ مضمون اس قسم کا شروع ہوگا۔ وعلیہ التکلان۔

گزشتہ وعدہ کے مطابق اس شمارہ میں ۸ صفحے مقررہ صفحات سے زائد کر دیے گئے ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان زائد صفحات کی تعداد کچھ اور زیادہ ہو۔ مگر ہماری گورنمنٹ نے اخباری کاغذ کے کوٹہ میں اس قدر بخل سے کام لینا شروع کر دیا ہے کہ چند سال پہلے کی فیاضی کی بدولت ہی رسالہ کے کاغذ کا لگا بندھا خرچ پورا ہو رہا ہے، ورنہ موجودہ کوٹہ واقعی خرچ سے کم ہی ہوتا ہے جس کو دیکھتے ہوئے ایک ورق بھی زائد کرنے کی گنجائش تو کیا کچھ کم کرنے ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

براہ کرم دیکھ لیجیے کہ آپ کے رسالے کے پہلے صفحہ پر دائرہ ○ میں سرخ پنسل کا نشان تو نہیں لگا ہے، اگر لگا ہے اور آپ کا ارادہ خریداری جاری رکھنے کا ہے تو ممکن حد تک اپنا چندہ منی آرڈر سے بھیجنے کی کوشش فرمائیے۔ اس میں دفتر کے لیے بڑی سہولت ہے اور آپ کے حق میں کفایت۔

معارف الحدیث

(مُسَلسَل)

وضوء:-

طہارت کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو جو ہدایات دی ہیں اُن میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی حیثیت مستقل احکام کی ہے، جیسے استنجے کے احکام جسم کو اور کپڑوں کو پاک رکھنے کے احکام، پانی کی پاکی اور ناپاکی کے تفصیلی احکام وغیرہ وغیرہ — اور بعض وہ ہیں جن کی حیثیت شرائطِ نماز کی ہے — وضو کا حکم اسی قبیل سے ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ " إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۝ " ——

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ نماز جو اللہ تعالیٰ کی مقدس بارگاہ میں حاضری اور اس سے مخاطبت و مناجات کی ایک خاص الخاص شکل ہے، اس کے لیے باوضو ہونا شرط ہے، پس اگر کوئی شخص باوضو نہیں ہے (یعنی حدث کی حالت میں ہے، جس کی حقیقت پہلے بتائی جا چکی ہے) تو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کو وضو کر لینا چاہیے۔ دربارِ الٰہی کی اس "خاص حاضری" کا یہ لازمی ادب ہے، اس کے بغیر اس کی نماز ہرگز قبول نہیں ہوگی، اس سلسلہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیے!۔

(۳۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلٰوةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ — رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا وضو نہیں ہے اس کی نماز قبول نہیں ہوگی تاوقتیکہ وہ وضو نہ کرے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۳۲) عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتُقْبَلُ صَلٰوۃٌ بِغَیْرِ طُھُوْرٍ وَلَاصَدَقَۃٌ مِنْ غُلُوْلٍ ۔۔۔۔۔ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی نماز طہارت کے بغیر قبول نہیں ہو سکتی، اور نہ کوئی ایسا صدقہ قبول ہو سکتا ہے جو ناجائز طریقہ سے حاصل کیے ہوئے مال سے کیا جائے (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں "طُھُوْر" سے مراد وضو ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اوپر والی حدیث کا ہے، صرف الفاظ کا فرق ہے۔

(۳۳) عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِفْتَاحُ الصَّلٰوۃِ الطُّھُوْرُ وَتَحْرِیْمُھَا التَّکْبِیْرُ وَتَحْلِیْلُھَا التَّسْلِیْمُ ۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی ورواہ ابن ماجۃ وعن ابی سعید۔

(ترجمہ) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کی کنجی طہور (یعنی وضو) ہے، اور اس کی تحریم تکبیر ہے (یعنی اللہ اکبر کہہ کے آدمی نماز میں داخل ہو جاتا ہے، جس کے بعد بات چیت کرنے اور کھانے پینے جیسے جائز کام نماز کے ختم ہونے تک اس کے لیے حرام اور ناجائز ہو جاتے ہیں) اور اس کی تحلیل السلام علیکم کہنا ہے (یعنی نماز کے ختم پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے کے بعد وہ ساری باتیں آدمی کے لیے حلال اور جائز ہو جاتی ہیں جو نماز کی وجہ سے اس کے لیے حرام اور ناجائز ہو گئی تھیں)

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن دارمی —— اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے)

(۴۳) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ ——— رواہ احمد

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہور (یعنی وضو) ہے ——— رواہ احمد

(تشریح) ان دونوں حدیثوں میں طہور یعنی وضو کو نماز کی کنجی فرمایا گیا ہے۔ گویا جس طرح کوئی شخص کسی مقفل گھر میں کنجی سے اس کا تالا کھولے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اسی طرح بغیر وضو کے نماز میں داخلہ نہیں ہو سکتا ——— ان دونوں حدیثوں کی تعبیر میں اگرچہ کچھ فرق ہے لیکن حاصل اور مدعا سب کا یہی ہے کہ نماز کے قابل قبول ہونے کے لیے وضو شرط ہے۔ نماز چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری اور اس سے مخاطبت و مناجاۃ کی اعلیٰ اور انتہائی شکل ہے جس کے آگے اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ادب کا حق تو یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے سارے جسم کے غسل اور بالکل پاک صاف اچھا لباس پہننے کا حکم دیا جاتا۔ لیکن چونکہ اس پر عمل بہت مشکل ہوتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ازراہ کرم صرف اتنا ضروری قرار دیا کہ نماز پاک کپڑے پہن کر پڑھی جائے اور سارے جسم کے غسل کے بجائے بس وضو کر لیا جائے جس میں وہ سارے ظاہری اعضا دھل جاتے ہیں جو انسان کے جسم میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے وہی سارے جسم کے قائمقام قرار دیے جا سکتے ہیں۔ نیز ہاتھ پاؤں اور چہرہ اور سر ہی وہ اعضا ہیں جو عام طور پر لباس سے باہر رہتے ہیں، اس لیے وضو میں صرف انہی کے دھونے اور مسح کرنے کا حکم دیا گیا۔ علاوہ ازیں وضو نہ ہونے کی حالت میں طبیعت میں جو ایک خاص قسم کا روحانی تکدر اور انقباض ہوتا ہے اور وضو کرنے کے بعد انشراح و انبساط کی ایک خاص کیفیت اور ایک خاص طرح کی لطافت و نورانیت جو انسان کے باطن میں پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کے جن بندوں کو ان کیفیتوں کا احساس اور تجربہ ہوتا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ نماز کے لیے وضو کو لازمی شرط قرار دیے جانے کا اصل راز کیا ہے، باقی اتنی بات تو ہم سب عوام بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مقدس اور عالی بارگاہ میں حاضری کا یہ ادب ہے۔ اللہ کے جو بندے صرف اتنی بات سمجھ کر بھی وضو کریں گے انشاء اللہ وہ بھی اپنے وضو میں ایک خاص لذت و نورانیت محسوس کریں گے۔

وضو کا طریقہ :-

(۳۵) عَنْ عُثْمَانَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ فَاَفْرَغَ عَلٰى يَدَيْهِ ثَلٰثًا ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلٰثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى اِلَى الْمِرْفَقِ ثَلٰثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرٰى اِلَى الْمِرْفَقِ ثَلٰثًا ثُمَّ مَسَحَ بِرَاْسِهٖ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى ثَلٰثًا ثُمَّ الْيُسْرٰى ثَلٰثًا ثُمَّ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهٗ فِيْهِمَا بِشَيْءٍ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ـــــ رواہ البخاری ومسلم واللفظ للبخاری

(ترجمہ) روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک دن اس طرح وضو فرمایا کہ پہلے اپنے دونوں ہاتھوں پر تین دفعہ پانی ڈالا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی لے کر اس کو نکالا اور ناک کی صفائی کی، پھر تین دفعہ اپنا پورا چہرہ دھویا اس کے بعد داہنا ہاتھ کہنی تک تین دفعہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی تک تین دفعہ دھویا، اس کے بعد سر کا مسح کیا، پھر داہنا پاؤں تین دفعہ دھویا، پھر اسی طرح بایاں پاؤں تین دفعہ دھویا۔ (اس طرح پورا وضو کرنے کے بعد) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے بالکل میرے اس وضو کی طرح وضو فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ جس نے میرے اس وضو کے مطابق وضو کیا پھر دو رکعت نماز (دل کی پوری توجہ کے ساتھ) ایسی پڑھی جو حدیث نفس سے خالی رہی (یعنی دل نے اس میں ادھر ادھر کی باتیں نہیں سوچیں) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہوگئے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا جو طریقہ بتلایا ہے بلکہ عملاً کر کے دکھایا ہے یہی وضو کا اصل اور مسنون طریقہ ہے۔ البتہ اس میں کلی اور پانی سے ناک کی صفائی کے متعلق یہ نہیں بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے یہ

کے دھوئے لیکن بعض دوسری روایتوں میں تین تین دفعہ کی تصریح ہے[1]۔

آگے حدیث میں جو دو رکعتیں خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھنے کا ذکر ہے، ضروری نہیں ہے کہ وہ نفل ہی ہوں، بلکہ اگر کسی کو مسنون طریقہ پر وضو کرکے کوئی فرض یا سنت نماز بھی ایسی نصیب ہوگئی جو حدیث نفس سے یعنی ادھر ادھر کے خیالات سے خالی رہی تو انشاء اللہ حدیث کی موعودہ مغفرت اس کو بھی حاصل ہوگی۔

شارحین حدیث اور عارفین نے لکھا ہے کہ حدیث نفس یہ ہے کہ ادھر اُدھر کا کوئی خیال دل میں آئے اور دل اس میں مشغول ہو جائے، لیکن اگر کوئی خطرہ دل میں گزرے اور دل اس میں مشغول نہ ہو بلکہ اس کو ہٹانے اور دفع کرنے کی کوشش کرے تو وہ مضر نہیں ہے اور یہ چیز کاملین کو بھی پیش آتی ہے۔

(۳۶) عَنْ اَبِيْ حَيَّةَ قَالَ رَأَيْتُ عَلِيًّا تَوَضَّأَ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ حَتّٰى اَنْقَاهُمَا ثُمَّ مَضْمَضَ ثَلٰثًا وَاسْتَنْشَقَ ثَلٰثًا وَغَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلٰثًا وَذِرَاعَيْهِ ثَلٰثًا وَمَسَحَ مَرَّةً ثُمَّ غَسَلَ قَدَمَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَاَخَذَ فَضْلَ طَهُوْرِهٖ فَشَرِبَهٗ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ اَحْبَبْتُ اَنْ اُرِيَكُمْ كَيْفَ كَانَ طُهُوْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ الترمذی والنسائی)

(ترجمہ) ابوحیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا آپ نے وضو اس طرح فرمایا، پہلے اپنے دونوں ہاتھ اچھی طرح دھوئے یہاں تک کہ ان کو خوب صاف کر دیا، پھر تین دفعہ کلی کی، پھر تین دفعہ پانی ناک میں لے کر اس کی صفائی کی، پھر چہرے اور دونوں ہاتھوں کو تین تین دفعہ دھویا، پھر سر کا مسح ایک دفعہ کیا، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے، اس کے بعد آپ کھڑے ہوئے اور کھڑے ہی کھڑے آپ نے وضو کا بچا ہوا پانی پی لیا ——— حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس طرح پورا وضو کرکے دکھانے کے بعد فرمایا میں نے چاہا کہ تمہیں دکھلاؤں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو فرماتے تھے۔

---

[1] رواہ البغوی فی شرح السنۃ عن سفیان بن سلمۃ عن عثمان ——— زجاجۃ المصابیح۔

کرتے تھے۔　　　(جامع ترمذی، سنن نسائی)

(تشریح) جیسا کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی ان حدیثوں سے معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور سے وضو اسی طرح فرماتے تھے کہ دھونے والے اعضا کو تین تین دفعہ دھوتے تھے اور سر پر مسح ایک ہی دفعہ فرماتے تھے ۔۔۔ لیکن کبھی کبھی آپ نے ایسا بھی کیا ہے کہ دھوئے جانے والے اعضا کو بھی صرف ایک ہی ایک مرتبہ یا صرف دو ہی مرتبہ دھویا۔ اور ایسا آپ نے یہ بتلانے اور یہ دکھلانے کے لیے کیا کہ اس طرح بھی وضو ہو جاتا ہے، فقہا کی اصطلاح میں اس کو "بیان جواز" کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت پانی کی کمی کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا ہو۔ واللہ اعلم

(۴۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً مَرَّةً لَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا ۔۔۔۔ رواہ البخاری

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا ایک ایک مرتبہ (یعنی وضو میں دھوئے جانے والے اعضا کو آپ نے صرف ایک ایک دفعہ دھویا) اس سے زیادہ نہیں کیا۔　(صحیح بخاری)

(۴۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ۔۔۔۔ (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا دو دو مرتبہ (یعنی دھوئے جانے والے اعضا کو دو دو بار دھویا)　(صحیح بخاری)

(تشریح) ان دونوں حدیثوں میں اعضاء وضو کے صرف ایک ایک دفعہ یا دو دو دفعہ دھونے کا جو ذکر ہے جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ایسا آپ نے کبھی کبھی صرف یہ جتلانے اور دکھلانے کے لیے کیا تھا کہ اتنا کرنے سے بھی وضو ہو جاتا ہے، ورنہ عام عادت شریفہ یہی تھی کہ وضو میں آپ ہاتھ، منہ اور پاؤں کو تین تین دفعہ دھوتے تھے اور اسی کی دوسروں کو تعلیم دیتے تھے، اور وضو کا یہی افضل اور مسنون طریقہ ہے۔ مندرجہ ذیل دو حدیثوں سے یہ بات اور زیادہ صاف ہو جاتی ہے۔

(۳۹) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُهُ عَنِ الْوُضُوءِ فَأَرَاهُ ثَلٰثًا ثَلٰثًا ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا الْوُضُوءُ فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا فَقَدْ أَسَاءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ ـــــــ (رواہ النسائی وابن ماجہ وروی ابوداؤد معناہ)

(ترجمہ) عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی وضو کے بارے میں سوال کرتے ہوئے (یعنی وضو کا طریقہ پوچھتے ہوئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو تین تین دفعہ وضو کر کے دکھایا (یعنی ایسا وضو کر کے دکھایا جس میں آپ نے دھوئے جانے والے اعضا کو تین تین دفعہ دھویا) اس کے بعد آپ نے اس اعرابی سے فرمایا کہ وضو ایسے ہی کیا جاتا ہے، تو جس نے اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا تو اس نے برائی کی اور زیادتی کی اور ظلم کیا۔

(سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں اضافہ کرنے کی جو سخت مذمت کی ہے اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اعضاء وضو کے صرف تین تین دفعہ دھونے سے کامل مکمل وضو ہو جاتا ہے، اب جو شخص اس میں کوئی اضافہ کرے گا وہ گویا شریعت میں اپنی طرف سے ترمیم کرے گا، اور بلاشبہ یہ اس کی بڑی جسارت اور بڑی بے ادبی ہوگی۔

(۴۰) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ وَاحِدَةً فَتِلْكَ وَظِيفَةُ الْوُضُوءِ الَّتِي لَا بُدَّ مِنْهَا وَمَنْ تَوَضَّأَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُ كِفْلَانِ وَمَنْ تَوَضَّأَ ثَلٰثًا فَذَالِكَ وُضُوئِي وَوُضُوءُ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي ـــــــ رواہ احمد

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو وضو کرے ایک دفعہ (یعنی دھوئے جانے والے اعضاء کو اس میں صرف ایک ہی ایک دفعہ دھوئے) تو یہ وضو کا وہ درجہ ہے

جس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں (اور اس کے بغیر وضو ہوتا ہی نہیں) اور جو وضو کرے دو دو مرتبہ (یعنی اس میں اعضاء وضو کو دو دو دفعہ دھوئے) تو اس کو (ایک ایک دفعہ والے وضو کے مقابلہ میں) دو حصے ثواب ہوگا۔ اور جس نے وضو کیا تین تین دفعہ (جو فضل اور مسنون طریقہ ہے) تو یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے پیغمبروں کا۔ (یعنی میرا دستور اعضاء وضو کو تین تین دفعہ دھونے کا ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ بھی یہی رہا ہے)   (مسند احمد)

تشریح) یہ حدیث مسند احمد کی ہے اور اسی میں ایک دوسری روایت اس طرح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایک ایک دفعہ وضو کر کے دکھایا اور فرمایا کہ یہ وہ کم سے کم درجہ کا وضو ہو جس کے بغیر کسی کی نماز اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہی نہیں ہو سکتی، اس کے بعد آپ نے دو دو دفعہ کا وضو کر کے دکھایا اور فرمایا کہ پہلے والے وضو کے مقابلہ میں اس سے ثواب دوہرا ملے گا۔ پھر آپ نے تین تین دفعہ والا وضو کر کے دکھایا اور فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کا ـــــ اس دوسری روایت کو دارقطنی، بیہقی، ابن حبان اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (زجاجۃ المصابیح)

ان دونوں روایتوں سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے ـــــ فللّٰہ الحمد

الفرقان کے ایجنٹ صاحبان نوٹ فرمالیں

کہ جو حضرات ۱۲؍ جون ۱۹۶۰ء تک اپنا حساب صاف نہیں کر دیں گے، دفتر کو حق ہوگا کہ جولائی کی اشاعت سے (تا ادائے حسابات) اُن کے نام پرچے کی ترسیل روک دی جائے ـــــ بعض تلخ تجربات کی بنا پر یہ فیصلہ ناگزیر ہو گیا ہے ـــــ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ایجنٹ صاحبان اپنی فرض شناسی سے اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔

"مینیجر"

تجلّیاتِ مجدّد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(از:۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۱۶۳) شیخ فرید بخاری کے نام: ——————

(اسلام وکفر، اور دُنیا وآخرت، ضدِ یک دیگر ہیں!)

اللہ کا شکر ہے کہ اُسنے ہم پر انعام کیا، اسلام کی جانب رہنمائی فرمائی، اور ہمیں اُمتِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم میں پیدا کیا —— نقدِ سعادتِ کونین، حفظِ اتباعِ سیّدِ کونینؐ کے ساتھ وابستہ ہے، اور آپ کی اتباع، احکامِ اسلامیہ کے بجالانے، اور رسومِ کفریہ کے دفع کرنے کی صورت میں مضمر ہے —— اسلئے کہ اسلام وکفر ایک دوسرے کی ضد ہیں —— ایک کا اثبات دوسرے کے رفع کا موجب ہے —— ان دونوں ضدوں کا جمع کرنا محال ہے —— ان میں سے ایک کو عزت دینا دوسرے کی خواری کو مستلزم ہے ——————

ایک بزرگ نے فرمایا ہے، کہ جب تک تم میں سے کوئی دیوانہ نہ بن جائے مسلمانی کو نہیں پہنچے گا۔ دیوانگی سے مراد یہ ہے، کہ اعلائے کلمۂ اسلام کی خاطر اپنے نفع وضرر کا خیال چھوڑ دے —— مسلمانی کے ہوتے جو ہو وہ ہو، جو نہ ہو نہ ہو —— جب مسلمانی ہے تو رضائے خدا، اور رضائے حبیبِ خدا بھی حاصل ہے —— مولیٰ کی رضا سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے —— رضینا باللہ سبحانہ ربّاً وبالاسلام دیناً وبمحمدٍ علیہ الصلوٰۃ والسلام نبیاً ورسولاً (ہم راضی ہوئے

اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی و رسول ہونے پر)۔

ع ــــــ "تم بریشم بداریم یارب" ــــــ

بحرمۃ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ــــــ

جس طرح اسلام ضدِ کفر ہے، اُسی طرح آخرت بھی ضدِّ دُنیا ہے ــــ دنیا اور آخرت بھی جمع نہیں ہوتے ــــ ترکِ دنیا دو قسم پر ہے، ایک قسم یہ ہے، کہ دنیا کی تمام مُباحات کو ترک کر دیا جائے، یہ قسم بہت اونچی قسم، ترکِ دُنیا کی ہے...... اور دوسری قسم یہ ہے، کہ (صرف) محرمات و مشتبہات سے پرہیز کیا جائے، اور اُمورِ مُباحہ سے فائدہ حاصل کیا جائے، یہ قسم بھی خصوصیت کیساتھ اس زمانے میں بہت عزیز الوجود ہے ــــ ؎

آسماں، نسبت بعرش آمد فرود
ورنہ بس عالیست پیشِ خاکِ تود

پس (مردوں کو) ضروری ہے کہ سونے چاندی اور ریشم کے پہننے سے، اور اُن چیزوں سے جن کو شریعتِ مصطفویہ نے حرام قرار دیا ہے ــــ اجتناب کیا جائے ــــ سونے چاندی کے برتن اگر محض آرائش و زیبائش کے لئے ہوں تو البتہ گنجائش ہے، لیکن ان برتنوں کا استعمال کھانے پینے کے لئے کرنا، سونے چاندی کی خوشبو دانی اور سُرمہ دانی بنانا اور اُن کو استعمال کرنا، مرد و عورت دونوں کے لئے حرام ہے ــــ

الغرض، حق سُبحانہٗ و تعالیٰ نے دائرۂ اُمورِ مُباحہ کو بہت وسیع کر دیا ہے، اور اُمورِ محرّمہ کے مقابلے میں اُمورِ مباحہ سے فائدہ اُٹھانے میں کہیں زیادہ لذّت و راحت ہے ــــ علاوہ ازیں مُباحات میں رضائے حق بھی ہے، اور محرمات میں عدم رضائے حق ہے، عقلِ سلیم کبھی اِس بات کو جائز قرار نہیں دیگی، کہ کوئی محض ایسی لذت کے لئے جو ناپائدار ہے اپنے مولیٰ کی ناراضگی مول لے ــــ حالانکہ اس حرام، لذت کے مقابلے میں مُباح، لذت بھی اللہ نے تجویز فرما دی ہے ــــ

اللہ! ہمیں اور آپ کو متابعتِ شریعت، نصیب کرے ــــ

حرام و حلال کے بارے میں ہمیشہ علمائے دیندار کی طرف رجوع کیا کریں، اور اُن سے استفسار کر کے، اُن کے فتوے کے بموجب عمل کریں، کیونکہ راہِ نجات، شریعت رہی ہے، اور شریعت کے برخلاف

جو کچھ ہے وہ باطل اور بے اعتبار ہے ——— فماذا بعد الحق الا الضلال۔

والسلام اوّلاً و آخراً ———

مکتوب (۱۶۴) حافظ بہاء الدین سرہندی کے نام : ———

(فیضِ حق سبحانہ، علی الدوام سب عوام و خواص پر ہے)

فیضِ حق سبحانہ و تعالیٰ از قسم اموال و اولاد اور از قسم ہدایت و ارشاد، تمام خواص و عوام اور کرام و لئام پر علی الدوام و بے تفرقہ ہے ——— اگر تفاوت ہے تو بندہ کی طرف سے بعض فیوض کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے سبب سے ہے۔ ———

"وماظلمهم الله ولكن كانوا انفسهم يظلمون"۔ (اللہ نے اُن کفار پر ظلم نہیں کیا، وہ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں) ———

آفتاب گرما، دھوبی اور کپڑے پر یکساں چمکتا ہے، لیکن دھوبی کا چہرہ سیاہ، اور کپڑا سفید ہو جاتا ہے ——— عدم قبول اس بناء پر ہوتا ہے، کہ جنابِ قدس سے اعراض ہے، اور جو اعراض کرتا ہے، اُس کے لئے نعمت سے محرومی ضروری ہے ——— اس موقع پر کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ بہت سے اعراض کرنے والے ایسے ہیں کہ تنعماتِ دنیاوی کے ساتھ ممتاز ہیں، اور اُن کا اعراض سببِ محرومی نہیں بنا ہے ——— واضح رہے کہ یہ ایک قسم کا عذاب ہے، جو بصورتِ نعمت، بطریقِ استدراج، ظاہر کیا جاتا ہے، اعراض کرنے والے کی تباہی کے لئے ——— تاکہ اعراض و ضلالت میں برابر منہمک رہے ——— اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ———

"اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ"۔ (کیا وہ منکرین و معرضین یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اُن کو دیئے جا رہے ہیں، مال اور اولاد سے تو اُن کے حق میں اچھائی کی سعی کر رہے ہیں ——— بلکہ وہ جانتے ہی نہیں) ———

پس دُنیا اور تنعماتِ دُنیا خدا سے اعراض کے ہوتے عین خرابی اور بربادی ہیں ——— الحذر الحذر۔

والسلام اوّلاً و آخراً ———

مکتوب (۱۶۵) سیادت پناہ شیخ فرید بخاریؒ کے نام :—

(اتباعِ شریعت کی ترغیب میں)

اللہ تعالیٰ آپ کو نبیٔ اُمّی قرشی الہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراثِ معنوی سے مشرّف کرے، جیسا کہ اُسنے میراثِ صوری سے مشرّف کیا ہے —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراثِ صوری، عالمِ خلق سے تعلق رکھتی ہے، اور میراثِ معنوی، عالمِ امر سے ہے، کہ وہاں سراسر ایمان ومعرفت اور رُشد وہدایت ہے —— میراثِ صوری کی نعمتِ عظمیٰ کا شکر، یہ ہے کہ میراثِ معنوی سے مزیّن ہو جائیں، اور میراثِ معنوی سے مزیّن ہونا بغیر کمالِ اتباعِ مصطفویؐ کے میسّر نہیں ہوسکتا، لہذا آپ پر اتباعِ رسولؐ اور اطاعتِ رسولؐ —— اوامر ونواہی کے اندر —— لازم وواجب ہے —— کمالِ متابعت، کمالِ محبّتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرع ہے —— ع

"اِنَّ المحبّ لمن هواه مطيع"

(محبّ جس سے محبّت کرتا ہے اُس کا تابع ہوتا ہے)

اور کمالِ محبّت کی علامت یہ ہے کہ اعدائے آنسرورؐ سے کمالِ بغض اور مخالفانِ شریعت سے اظہارِ عداوت ہو —— محبّت میں سُستی کی کوئی گنجائش نہیں —— مُحب، دیوانۂ محبوب ہوتا ہے —— تابِ مخالفت نہیں رکھتا، اور مخالفانِ محبوب سے کسی طرح صلح نہیں کرتا —— دو منافی محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں —— جمع ضدین کو محال کہا گیا ہے —— اچھی طرح غور کرنا چاہئے —— ابھی کام ہاتھ سے نہیں گیا ہے —— گذرے ہوئے زمانے کی تلافی کی جاسکتی ہے —— کل کو جبکہ کام ہاتھ سے جاتا رہے گا، سوائے ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا —— س

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

متاعِ دُنیا، فریب در فریب ہے —— اور معاملۂ اُخروی ابدی اِسی پر مرتّب ہے —— زندگانیٔ چند روزہ اگر سیدِ اوّلین وآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں بسر کی جائے، تو اُمیدِ نجاتِ ابدی ہے، ورنہ کوئی عملِ خیر ہو، اُن کی متابعت کے بغیر ہیچ در ہیچ ہے —— س

محمدِ عربی کابروئے ہر دوسرا ست
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

متابعتِ رسولؐ کی دولتِ عظمیٰ کا حصول ـــــ دُنیا کو کلیۃً ترک کر دینے پر موقوف نہیں ہے ـــــ کہ دشوار معلوم ہو ـــــ بلکہ اگر زکوٰۃ مفروضہ مثلاً ادا کی جاتی ہے، تو یہ بھی عدمِ وصول مضرت کے لحاظ سے ترکِ کُل ہی کا حکم رکھتی ہے ـــــ اِسلئے کہ جس مال کی زکوٰۃ دے دی گئی، وہ مال ضرور نقصان سے نکل گیا ـــــ پس مالِ دنیاوی کے ضرر کا علاج اُس مال سے زکوٰۃ کا نکالنا ہے ـــــ اگرچہ ترکِ کلّی اوّل و افضل ہے، مگر ادائیگی زکوٰۃ بھی کام، ترکِ کلّی کا ہی کرتی ہے۔ ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود
ورنہ بس عالیست پیش خاکِ تود

لہٰذا لازم ہے، کہ تمام تر ہمّت، احکامِ شرعیہ کی اُدائیگی میں صرف کی جائے، اُور اہلِ شریعت علماءؒ صلحاء کی تعظیم و توقیر ملحوظ رہے ـــــ ترویجِ شریعت میں کوشش کرنا اُور اہلِ بدعت کو ذلیل و خوار رکھنا ضروری ہے : ـــــ

"من وقر صاحب بدعۃٍ فقد اعان علی ھدم الاسلام" (جسنے بدعتی کی توقیر کی، اُسنے اسلام کے ڈھانے میں اعانت کی) ـــــ

وہ اہلِ کفر و باطل جوکہ دشمنانِ خدا اُور دشمنانِ رسولِ خدا ہیں ـــــ اُن سے دشمنی رکھنا، اُور اُن کی ذلّت و خواری میں سعی کرنا چاہئے ... ... وہ راستہ جو آپ کے جدِّ بزرگوار (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچاتا ہے، یہی ہے ـــــ اگر یہ راہ نہ چلی گئی تو اُن تک پہنچنا دشوار ہے ـــــ ؎

کیف الوصول الیٰ سعاد ودونہا
قُلل الجبالِ و دونہن حیوف

(یعنی محبوب تک کس طرح پہنچ ہو، جبکہ اسکے ورے پہاڑوں کی چوٹیاں حائل ہیں، اُور اُن سے پہلے موتیں، اُور ہولناکیاں ہیں) ـــــ اِس سے زیادہ کیا بات کو طول دوں ـــــ ؎

اندکے پیشِ تو گفتم غمِ دل، ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن، بسیار است

مکتوب (۱۶۶) مولانا محمدؐ امین کے نام :

(نصیحت)

مخدوما! ___ کب تک اپنے نفس کے منافع کیلئے سرگرم رہا جائے گا؟ ___ خود کو اور سب مخلوق کو مُردہ اور بحس وحرکت سمجھنا چاہئے ___ "انک میت وانھم میتون"۔ (یقیناً آپ اے رسولؐ وصال پائیں گے، اور بیشک یہ لوگ بھی انتقال کرینگے) ___ یہ نصّ قاطع ہے۔

علاوہ ازیں اِس تھوڑی سی فرصت میں: مرضِ قلبی کے دُور کرنے کی فکر ___ ذکرِ کثیر کے ذریعے اُور علّتِ معنوی کا علاج، ربّ جلیل کی یاد سے کرنا اہم مقاصد میں سے ہے ___ جو دل "گرفتارِ غیر" ہے اُس سے خیر کی کیا توقع ہوسکتی ہے؟ - جو رُوح، دنیا کی طرف مائل ہوا اُس سے تو نفسِ امّارہ بہتر ہے ___ اللہ کے یہاں سلامتیٔ قلب اور خلاصیٔ رُوح، مطلوب ہے ___ اور ہم کوتاہ اندیش، سراسر "اسبابِ گرفتاریٔ رُوح وقلب" کی تحصیل میں مبتلا ہیں ___ ہیہات ہیہات ___ کیا کیا جائے -

وما ظلمھم اللہ ولکن کانوا انفسھم یظلمون ___

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے ضعف کی طرف سے اندیشہ نہ کریں، انشاء اللہ تعالیٰ ضعف، صحت وعافیت سے بدل جائے گا ___ ہمارا دل اس طرف سے بالکل مطمئن ہے ___ جامۂ فقرا طلب کیا گیا تھا، لہذا ایک پیراہن بھیجا گیا ہے، اُس کو پہنو، اور اسکے (عمدہ) نتائج وثمرات کے منتظر رہو ___ والسّلام ___

مکتوب (۱۶۷) ہردے رام کے نام :

(عبادتِ پروردگار کی ترغیب، اور معبودانِ باطل کی عبادت سے اجتناب کے بیان میں)

تمھارے دُو خط موصول ہوئے، دونوں سے محبّتِ فقرا، اور اس گروہ سے التجا کا جذبہ مفہوم ہوا ...... کیا عجیب نعمت ہے یہ، کہ کسی کو اس دولت سے نواز دیں ___ ؎

من انچہ شرطِ بلاغ است باتو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

جاننا چاہئے، کہ ہمارا اور تمھارا پروردگار، بلکہ تمام کائنات کا ___ خواہ آسمان ہو یا زمین، خواہ علیین ہو یا سجّین ___ پروردگار ایک ہے ___ جو "بیچون وبیچگونہ" ہے ___ وہ مثل ومانند سے

منزّہ اور شکل و مثال سے مبرّا ہے ـــــ اسکے حق میں پدری اور فرزندی کی نسبت محال ہے ـــــ ہم کفوی و ہم مثلی کو اس کی جناب میں کوئی گنجائش نہیں ـــــ اتحاد و حلول کا شائبہ بھی اس کی شان میں قبیح ہے ـــــ کسی چیز میں پوشیدہ ہو کر بیٹھ جانے، اور کسی چیز میں اُتر جانے کا گمان بھی اسکے بارے میں بُرا ہے ـــــ وہ زمانی بھی نہیں، اسلئے کہ زمانہ اُس کا مخلوق ہے ـــــ وہ مکانی بھی نہیں اسلئے کہ مکان اُس کا پیدا کردہ ہے ـــــ اسکے وجود کے لئے کوئی نقطۂ آغاز نہیں، اور اُس کی بقاء کے لئے کوئی نہایت نہیں ـــــ جو کچھ خیر و کمال ہے اُس کے لئے ثابت ہے، اور جو کچھ نقص و زوال ہے، وہ اُس سے دُور ہے ـــــ پس مستحق عبادت اور سزاوارِ پرستش وہی ہوگا......

ہمارے پیغمبر علیہم الصلوات والتسلیمات جو تقریبًا ایک لاکھ چوبیس ہزار گذرے ہیں، سب نے مخلوق کو خالق کی عبادت کی دعوت و ترغیب دی ہے، اور غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا ہے وہ خود کو بندۂ عاجز سمجھ کر عظمتِ باری تعالیٰ سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہے ہیں ......

ان پیغمبروں نے مخلوقِ خدا کو جس چیز سے منع کیا ہے، خود کو بھی بر وجہ اتم و اکمل اُس چیز سے باز رکھا ہے ـــــ وہ اپنے آپ کو مثل اور تمام انسانوں کے بشر کہتے تھے......

مکتوب (۱۷۰) شیخ نور کے نام : ـــــ

{ آدمی کو جس طرح فرمانبرداری اوامر و نواہی حق تعالیٰ ضروری ہے، ادائیگی حقوقِ مخلوق بھی ضروری ہے }

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ اے برادر ارشد!

جس طرح آدمی کو اوامر و نواہی حق تعالیٰ کی فرمانبرداری ضروری ہے، ادائے حقوقِ مخلوق کا اہتمام، اور مخلوق کے ساتھ غم خواری کا معاملہ کرنا بھی ضروری ہے ـــــ (بعض عارفین کا قول ہے، کہ) اللہ کے حکم کی تعظیم ہونی چاہئے، اور مخلوقِ خدا پر شفقت ـــــ یہ قول بھی ان دونوں حقوق کی ادائیگی کا بیان ہے، اور ان دونوں چیزوں کی رعایت پر دلالت کر رہا ہے ـــــ پس دونوں میں سے ایک پر اقتصار کوتاہی کی بات ہے، اور کُل کو چھوڑ کر جُزو پر اکتفاء کرنا "کمالیت" سے دُور ہے ـــــ لہٰذا حقوقِ مخلوقِ خدا کو ادا کرنا بھی ضروری ہوا، اور مخلوق کے ساتھ حُسنِ معاشرت بھی لازمی چیز ہوئی ـــــ مخلوق سے

بے التفاتی اُور لاپرواہی مناسب نہیں ہے ـــــــ ؎

ہرکہ عاشق شد اگرچہ نازنینِ عالم است
نازکی کے راست آید بارمی باید کشید

تم چونکہ ہمارے یہاں مدتوں رہ کر مواعظ اُور نصائح سُنتے ہوئے ہو، اِسلئے طولِ سخن سے روگردانی کرکے چند فقروں کو کافی سمجھا گیا ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اُور تمہیں شریعتِ مصطفویہ پر ثابت قدم رکھے ـــــــ

مکتوب (۱۷۱) مُلّا طاہر بدخشی کے نام : ـــــــ

(نصیحت)

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وآلہ الطاہرین ـــــ ہم فقیروں پر جو باتیں لازم ہیں، وہ حسب ذیل ہیں :ـــــ

(۱) دوامِ افتقار وانکسار وتضرع والتجا۔

(۲) ادائے وظائفِ عبودیت۔

(۳) محافظتِ حدودِ شرعیہ۔

(۴) متابعتِ سنّتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

(۵) تصحیحِ نیّت۔

(۶) باطن کو ماسویٰ سے آزاد کرنا، اُور ظاہر کو طاعات میں مشغول رکھنا۔

(۷) اپنے عیوب اور گناہوں کے غلبے کا مشاہدہ۔

(۸) خوفِ انتقامِ علّام الغیوب۔

(۹) اپنے حسنات کو چاہے وہ زیادہ ہی کیوں نہ ہوں کم سمجھنا۔

(۱۰) اپنے گناہوں کو چاہے وہ کم کیوں نہ ہوں زیادہ جاننا۔

(۱۱) اپنی شہرت اُور قبولیتِ مخلوق سے ترساں ولرزاں رہنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ :ـــ "آدمی کی بُرائی کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کی طرف (اس کی شہرت کی بناء پر) اُنگلیاں اُٹھائی جائیں، دین کے بارے میں

یا دنیا کے، مگر جس کو اللہ محفوظ رکھے، وہ اس برائی سے محفوظ ہے"

(۱۲) اپنے افعال اور اپنی نیتوں کو متہم کرنا اگرچہ وہ مثل صبح، روشن ہوں۔

(۱۳) اپنے احوال و مواجید کی طرف توجہ نہ کرنا، اگرچہ وہ صحیح اور مطابق ہی کیوں نہ ہوں۔

(۱۴) محض تائید دین، تقویت ملت اور ترویج شریعت و دعوت حق کی کوشش پر بھروسہ نہ کر بیٹھنا، کیونکہ تائید دین کبھی کبھی کافر و فاجر سے بھی ہو جایا کرتی ہے ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: — اللہ تعالیٰ (کبھی) رجل فاجر سے بھی اس دین کی تائید کرا لیتا ہے ———

(۱۵) جب مرید کی آمد طلب کے ساتھ اور مشغولی باطن کے ارادے سے ہو، تو اسکے آنے پر انتہائی خائف ہونا چاہیئے، کہ کہیں اس پیری مریدی کے راستے سے اُس پیر کی بربادی مقدر نہ ہو، اور یہ امر اُسکے لئے استدراج نہ ہو جائے ——— اگر بالفرض کسی مرید کی آمد پر خوشی اور سرور محسوس کریں، تو اُس خوشی کو کفر و شرک کی طرح بُرا جانیں، اور اس کا تدارک، ندامت و استغفار سے اس قدر کریں، کہ اُس خوشی کا اثر باقی نہ رہے، بلکہ اُس خوشی کی جگہ خوف و حزن لے لے ———

(۱۶) (اپنے خلفاء کو) اچھی طرح تاکید کریں، کہ مال مرید اور اُسکے منافع دنیوی میں ان کو لالچ نہ پیدا ہونے پائے، کیونکہ یہ بات رشد و ہدایت میں رکاوٹ ڈالنے والی ہے، اور باعث خرابی پیر ہے ——— خداوند کریم کے یہاں تو دین خالص کا مطالبہ ہے (خود فرماتا ہے) الا للہ الدین الخالص (آگاہ ہو کہ اللہ کے لئے خالص عبادت مقصود ہے)۔ اُس جناب میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں ہے ———

(۱۷) یہ بھی جانیں، کہ جو (معمولی) ظلمت و کدورت دل پر طاری ہوتی ہے، اُس کا ازالہ توبہ و استغفار اور ندامت و التجا کے ذریعے بہترین طریقے پر آسانی سے ہو سکتا ہے، لیکن جو ظلمت و کدورت، محبت دنیائے دنی کے راستے سے دل پر چھا جاتی ہے، وہ دل کو گدلا اور پلید کر دیتی ہے، اُسکے دُور کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے، کہ: "دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے"

اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو محبتِ دُنیا، محبتِ اربابِ دُنیا اور اختلاط و مصاحبت اہلِ دُنیا سے نجات دے ـــــ دنیا کی محبت اور اربابِ دنیا کی صحبت، سمِّ قاتل، مرضِ مہلک، بلائے عظیم اور بیماری عمیم ہے ... ... باقی باتیں عندالملاقات ہوں گی ـــــ

مکتوب (۱۷۴) خواجہ محمد اشرف کابلی کے نام :ـــــ

(نصیحت)

مکتوب مرغوب موصول ہوا ـــــ چونکہ وہ محبتِ فقرا اور اس گروہ سے التماس درخواست کی اطلاع دینے والا تھا، اسلئے موجبِ فرحت ہوا ـــــ المرء مع من احب ـــــ لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اس راہ کے دیوانے فقط اتنی معیت سے تسلّی نہیں پاتے، اور اس "بُعدِ قرب نما" سے تسکین نہیں حاصل کرتے، وہ تو ایسا قرب ڈھونڈھتے ہیں جو بُعد نما ہو، اور وہ وصل تلاش کرتے ہیں، جو مانندِ ہجر ہو ـــــ اس راہ کے دیوانے تاخیر کو جائز قرار نہیں دیتے، اور معطّل رہنے کو قبیح و مکروہ سمجھتے ہیں ـــــ وہ وقت کو بیہودہ ملمع سازیوں میں صرف اور سرمایۂ عمر کو لاطائل مکروہات میں ضائع نہیں کرتے ـــــ وہ عمدہ چیز کو چھوڑ کر خراب چیز کی طرف مائل نہیں ہوتے، اور پسندیدۂ حق سے ہٹ کر معتوبِ حق کی طرف التفات نہیں کرتے ـــــ وہ لقمہ ہائے چرب و شیریں کے عوض اپنے کو فروخت نہیں کرتے، اور جامہ ہائے باریک و زیبا کے لئے کسی رئیس کو خطِ غلامی نہیں لکھتے ـــــ اُن کو اس بات سے شرم آتی ہے، کہ تختِ شاہی (دل) کو تعلقاتِ دُنیاوی کی نجاستوں سے آلودہ کریں، اور ملکیتِ خداوندی میں لات وعزیٰ کو شریک کر دیں ـــــ

اے برادر! ـــــ اس راہ میں دینِ خالص کو طلب کیا جاتا ہے ـــــ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ـــــ اس راہ کے لوگ "شرکت" کا کوئی غبار تجویز نہیں کرتے ـــــ (قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے) : "لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" (اگر تو نے شرک کیا، تو ضرور بالضرور تیرا عمل، نابود و ضائع ہو جائے گا) ـــــ کچھ دیر اپنے حال کا جائزہ لینا چاہیئے، اگر "دینِ خالص" میسر ہو گیا ہے تو زہے قسمت، ورنہ علاجِ حادثہ پیش از وقوع کرنا چاہیئے ـــــ

جو واقعہ تم نے لکھا تھا، وہ جن کا اثر تھا، اور اُسی کا تصرف باطل ـــ طالبین پر اُسکے اِس قسم کے تصرفات بہت کچھ واقع ہوا کرتے ہیں ـــ غم کی بات نہیں ہے ـــ "اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا" (بیشک شیطان کا مکر ضعیف ہے) ـــ اگر پھر اس قسم کا واقعہ ظاہر ہو، تو "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ" پڑھ کر اس کا دفعیہ کریں ـــ

ـــ والسّلام اوّلاً و آخراً ــــــ

مکتوب (۱۷۶) مولانا محمّد صدّیق کے نام : ـــ

(راہِ سلوک میں محافظتِ اوقات ضروری چیز ہے)

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے) انسان کے حُسنِ اسلام کی علامت یہ ہے، کہ وہ ضروری باتوں میں مشغول ہو، اور غیر ضروری سے اعراض کرے ـــ بس اپنے اوقات کی محافظت بہت ضروری ہے، تاکہ غلط امور میں اوقات ضائع نہ ہوں ـــ "شعر خوانی" اور "قصہ پردازی" کو نصیب دشمناں قرار دے کر حفاظتِ نسبتِ باطن میں مشغول رہنا چاہئے ـــ اس راہ میں "اجتماعِ یاراں" برائے جمعیتِ باطن ہوا کرتا ہے، نہ کہ پراگندگیٔ قلب کیلئے ـــ اسی جمعیتِ باطن کے پیشِ نظر انجمن کو خلوت پر ترجیح دی گئی ہے، اور اجتماع سے جمعیت کو ڈھونڈھا گیا ہے ـــ وہ اجتماع جو "سببِ تفرقہ" ہو جائے، اُس سے اجتناب لازم ہے ـــ

اس طرح زندگانی بسر کرنا چاہئے، کہ کسی جماعت کو اس شخص کی صحبت سے جمعیتِ قلب حاصل ہو جائے، نہ یہ کہ لوگوں کو پراگندگیٔ قلب میں مبتلا کر دے ـــ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہئے، اور زیادہ بولنے کی بجائے سکوت اختیار کیا جائے ـــ یہ وقتِ مشاعرہ نہیں ہے، نہ زیادہ گوئی کا وقت ہے ـــ ع

"چہ وقتِ مدرسہ و بحثِ کشف و کشّاف است"

ـــ والسّلام اوّلاً و آخراً ــــــ

مکتوب (۱۷۸) مرزا مظفر کے نام :—

(متابعتِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب میں)

... ... جو لوگ خود، اخلاقِ نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آراستہ ہیں اُن کے لئے کیا احتیاج ہے اس امر کی، کہ کوئی شخص اُن کی رہنمائی، احسان وحُسنِ معاشرت کی طرف کرے — بلکہ ممکن ہے یہ رہنمائی و دلالت سوءِ اَدب میں داخل ہو جائے — (پھر بھی یہ چند سطریں لکھی جاتی ہیں) —

مکرّما! — احسان ہر ایک پر کرنا محمود ہے، علی الخصوص اُن لوگوں پر جو قُرب اُور پڑوس رکھتے ہوں — حضرت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائیگیٔ حقوقِ ہمسایہ کے بارے میں اس قدر تاکید فرمائی ہے، کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اُس تاکید سے یہ گمان ہو گیا تھا، کہ شاید، ہمسایوں کو آپ میراث بھی دلائیں گے — ع

چوں چنیں با یکدگر ہمسایہ ایم ؛ تو چو خورشیدی و ما چوں سایہ ایم
چہ بُود اے مایۂ بے مایگاں ؛ گر نگہ داری حقِ ہمسائیگاں

— والسلام ... ...

مکتوب (۱۷۹) میر عبد اللہ بن میر محمّد نعمان کے نام :—

(نصیحت)

— فرزندی اعزی کو ان کے نام کے مطابق توفیق عطا ہو — موسمِ جوانی کو غنیمت جان کر تحصیلِ علومِ شرعیہ میں اُور اُن علوم کے مطابق عمل میں مشغول رہیں، اُور اس بات کا اہتمام کریں، کہ یہ عمرِ گرامی، لایعنی اُور لاطائل امور میں صَرف نہ ہونے پائے، اُور لہو و لعب میں ضائع نہ ہو —

دوسری بات یہ لکھنا ہے، کہ تمھارے والدِ بزرگوار (میر محمّد نعمان) انشاء اللہ تعالیٰ چند روز کے بعد تم لوگوں کے پاس آئیں گے، اُن کے گھر پہنچنے تک اُن کے متعلقین کی خبر گیری کرتے رہیں — والسلام ... ...

مکتوب (۱۸۳) مُلّا معصوم کابلی کے نام :—

(نصیحت)

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ جادۂ شریعت مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام پر استقامت نصیب فرما کر کلیۃً اپنی جناب قدس کی جانب متوجہ کرے ——— اُمید ہے کہ تعلقاتِ گوناگوں اُور توجہاتِ پراگندہ جو بظاہر غلبہ پا گئے ہیں، وہ "مانعِ نسبتِ باطن" نہ ہوں گے، پھر بھی (مزید) کوشش کریں، کہ جمعیتِ اسباب ظاہری، نسبتِ باطن میں خلل انداز نہ ہونے پائے، اُور مقصود تک پہنچنے سے نہ روک سکے ... ... دنیا اور مافیہا اِس بات کے لائق نہیں ہیں، کہ کوئی ان کو عمر گرامی، صَرف کر کے حاصل کرے ——— خبر کرنا شرط ہے ——— خوابِ خرگوش کب تک؟ ——— ؎

اے سرو باغِ تو زندانِ تو
خان و مانِ تو بلائے جانِ تو

موت سے پہلے اگر کچھ کر لیا، تو فبہا، ورنہ خرابی درخرابی ہے ——— سبق باطن کو عزیز رکھنا اُور جو چیز اُسکے منافی ہو، اُس کو اپنا دشمن تصوّر کرنا چاہیئے ——— ؎

ہر چہ جز عشقِ خدائے احسن است
گر شکر خوردن بود جاں کندن است

——— والسلام ... ...

مکتوب (۱۸۴) قلیج اللہ کے نام :———

(متابعتِ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب میں)

مکتوب مرغوب جو ازرُوئے محبّت و اخلاص لکھا تھا، میر سید خواجہ نے پہنچایا ——— موجبِ فرحت ہوا ——— اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے بحرمۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ———

اے فرزند! ——— جو چیز فردائے قیامت میں کام آئے گی، وہ اتباعِ صاحبِ شریعت ہے علیہ الصلوٰۃ والسلام ——— احوال و مواجید، علوم و معارف اُور اشارات و رموز اگر اتباعِ رسُول کے ساتھ جمع ہو جائیں تو بہت ہی اچھا ہے، اُور اگر اتباعِ رسُول کے ساتھ نہیں، تو سوائے خرابی

اُور استدراج کے، کچھ نہیں ہیں ــــــ
سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کو ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اُور اُن کا حال دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا: ــــ "ضائع ورائگاں ہوگئیں وہ تمام عبارتیں جو ہم نے حقائق ومعارف میں بیان کی تھیں) ــــ اُور فنا ہو گئے وہ رموز واشارات (جن کا دنیا میں اظہار کیا تھا) ــــ اُور سوائے اُن چند رکعتوں کے، جو رات میں ہم نے پڑھی تھیں کسی چیز نے فائدہ نہ دیا" ــــ لہٰذا تمھارے اوپر متابعتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُور متابعتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم لازم ہے ــــ مخالفتِ شریعتِ رسُولؐ سے خواہ قولاً ہو، یا عملاً یا اعتقاداً۔۔۔۔ پرہیز کرو ــــ متابعتِ رسُولؐ، سراپا برکت ہے، اُور مخالفتِ شریعت، سراسر ہلاکت ــــ اس بات کو خوب ذہن نشیں کرلینا ــــ
علاوہ ازیں جو رسالہ تم نے بھیجا تھا، وہ پہنچ گیا ــــ بعض جگہ سے جو پڑھا گیا، اچھا معلوم ہوا، لیکن دوسرا کام (سبقِ باطن) تصنیف سے زیادہ اہم ہے، اس میں مشغول رہنا انسب اُولیٰ ہے۔
ــــ والسلام۔۔۔۔۔۔

مکتوب (۱۸۶) خواجہ عبدالرحمان مفتی کابلی کے نام: ــــ
(ترغیبِ اتباعِ سنّت اُور اجتناب از بدعت کے بیان میں)

فقیر، حضرتِ حق سُبحانہٗ سے تضرع وزاری کے ساتھ پوشیدہ طور پر اُور علانیہ طور پر دُعا کرتا ہے، کہ دین میں جو نئی بات ایجاد کرلی گئی ہے، جس کا وجود زمانۂ خیرالبشر صلی اللہ علیہ وسلم اُور زمانۂ خلفائے راشدینؓ میں نہ تھا۔۔۔ اگرچہ وہ روشنی میں مثلِ سپیدۂ صبح ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ اس ضعیف کو جماعت اہلِ بدعت کے ساتھ اس عملِ بدعت میں مبتلا نہ کرے ــــ بعض علماء کہتے ہیں، کہ بدعت دو قسم کی ہے، ایک حسنہ اُور ایک سیئہ ــــ حسنہ، اُس عملِ نیک کو کہتے ہیں، جو زمانۂ آنسرورصلی اللہ علیہ وسلم وزمانۂ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ظاہر ہوا ہو، اُور رافعِ سنّت نہ ہو ــــ سیئہ وہ ہے کہ رافعِ سنّت ہو ــــ مگر یہ فقیر بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حُسن ونورانیت، مشاہدہ نہیں کرتا ــــ سب بدعتیں "ظلمت وکدورت" محسوس ہوتی ہیں ــــ اگر آج عملِ بدعت کو

ضعف بصارت کی وجہ سے تر و تازگی کے عالم میں دیکھتے ہیں، تو کل (قیامت میں) جبکہ نظر تیز ہو جائے گی جان لیں گے، کہ خسارت و ندامت کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں ___ ؎

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شبِ دیجور

سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ___ "من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو ردّ" (جس نے ہماری شریعت میں کوئی ایسی بات ایجاد کی، جو شریعت میں نہیں ہے وہ بات مردود ہے) ___ پس جو چیز مردود ہو، اُس میں حُسن کہاں سے آجائے گا؟ ___
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے: ___ "امّا بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدیٰ محمّدٍ وشر الامور محدثاتھا وکلّ بدعۃٍ ضلالۃ" (بعد حمد و صلوٰۃ کے واضح ہو، کہ بہترین کلام، کلام اللہ ہے، اور بہترین طریقہ و سیرت، طریقہ و سیرتِ محمّدیہ ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بدترین چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت، سببِ گمراہی ہے) ___

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے: ___ "تمھارے اوپر میری سنّت اور خلفائے راشدینؓ کی سنّت کا اتباع لازم ہے ___ ان سنّتوں پر مضبوطی سے عمل کرو۔ نو ایجاد بدعتوں سے پرہیز کرو، اِسلئے کہ دین میں ہر نو ایجاد امر بدعت ہے، اور ہر بدعت، سببِ گمراہی ہے" ___

جبکہ دین میں ہر نو پیدا شدہ امر، بدعت ہے، اور ہر بدعت، ضلالت و گمراہی ہے پھر بدعت میں حُسن کیسے آئے گا؟ ___ علاوہ ازیں جو کچھ احادیث سے مفہوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے، کہ ہر بدعت، سنّت کو اُٹھا دینے والی ہے ___ اس میں بعض کی تخصیص نہیں ہے ___ لہٰذا ہر بدعت بُری ہی ہوگی ___ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ___ "نہیں نکالی کسی قوم نے بدعت، مگر کہ اُسی کی بقدر اُٹھالی گئی سنّت"......
پس سنّت پر عمل کرنا، خواہ وہ معمولی ہو ___ بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے ___
حضرت حسّان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: "جس کسی قوم نے

دین میں بدعت کو ایجاد کیا ـــــ اللہ تعالیٰ نے مثل اُسکے سنّت کو نکال لیا ـــــ پھر وہ سنّت، قیامت تک اُن کی طرف نہیں رجوع کرے گی"ـــــ

جاننا چاہئے کہ بعض بدعتوں کو جو بعض علماء و مشائخ نے حسنہ جانا ہے، جب اچھی طرح غور کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ وہ رافعِ سنّت ہے ـــــ مثلاً میّت کے کفن میں دستار شامل کرنے کو حسنہ کہا گیا ہے، حالانکہ یہی بدعت، سنّت کو اٹھا رہی ہے، اسلئے کہ (کفن میں) عدد مسنون پر ـــــ کہ مردوں کے لئے تین کپڑے ہیں ـــــ زیادتی کرنا نسخ ہے، اور نسخ ہی عین رفع ہے ـــــ اسی طرح بعض مشائخ نے شملۂ دستار کو داہنے ہاتھ کی طرف چھوڑنا مستحسن قرار دیا ہے، حالانکہ سنّت یہ ہے کہ دونوں مونڈھوں کے درمیان چھوڑا جائے... اسی پر تمام بدعات و محدثات کو قیاس کرلو ... پس تمہارے اوپر لازم ہے کہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اقتداء کرو ـــــ اسلئے کہ وہ مانند ستاروں کے ہیں، اُن میں سے جس کا اقتداء کروگے، ہدایت یاب ہوگے ـــــ مگر قیاس و اجتہاد بدعت نہیں ہیں، اسلئے کہ وہ تو معنیٔ نصوص کا اظہار کرتے ہیں، کسی امر زائد کو ثابت نہیں کرتے ـــــ فاعتبروا یا اولی الابصار ـــــ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات۔

(صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

فیصلہ کرلیا اور وہیں سے سیدھے جودھپور چلے آئے، یہاں آکے معلوم ہوا کہ بیوی نے تین دن سے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے بس رونا ہے اور اللہ سے دعا ہے اس وقت اندازہ ہوا کہ سب انکی دعاؤں کا کرشمہ تھا۔

اسکے بعد حضرت حاجی صاحب اطمینان سے اپنے کاموں میں لگے رہے دینی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیاوی برکتوں اور ترقیوں کے دروازے بھی اللہ تعالیٰ نے کھول دیے یہانتک کہ ٹھیکیداری کا دور آگیا اور اب حاجی صاحب اوسط درجہ کے ایک خوشحال آدمی ہوگئے۔

(باقی آئندہ)

اللہ کا ایک بندہ

(محمد منظور نعمانی)

۲۵-۲۶ سال پہلے کی بات ہے، الفرقان کی عمر کا غالباً دوسرا سال تھا، ریاست جودھپور کے بعض حضرات کی دعوت پر وہاں میرا جانا ہوا، اس وقت ان داعیوں سے اس ناچیز کا تعلق بس اتنا ہی تھا کہ وہ الفرقان کے خریدار اور اسکے قدر دان تھے اور ہمارے علمی اور دینی اکابر خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانوی (نور اللہ مرقدہ) سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

جہانتک یاد ہے جودھپور میں میرے خاص داعی حکیم محمد صدیق صاحب غوری تھے، خط کتابت سے میں انہی کو جانتا تھا، انہی کے مکان پر میرا قیام ہوا تھا۔ اسی قیام کے دوران میں حکیم صاحب موصوف کے والد ماجد حضرت حاجی عبد الغفور صاحب مدظلہ سے واقفیت ہوئی، اس وقت وہ ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے اور اپنے کام میں کافی مشغول رہتے تھے۔ دو ہی چار دن کے اس قیام میں انکی جو باتیں سُنیں اور زندگی کا جو طرز دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ اللہ کا یہ بندہ اگرچہ بقول خود "بے پڑھا" ہے، اُردو کی بس کچھ شُدبُد ہے مگر ایک خط بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا ہے، لیکن دین کا فہم سیکڑوں پڑھے لکھوں بلکہ بہت سے فارغ التحصیل عالموں سے بھی اچھا ہے اور عملی زندگی بھی ہم جیسوں کے لئے بڑی سبق آموز ہے، بہرحال جودھپور کے اس پہلے سفر ہی میں حضرت حاجی صاحب سے میں واقف ہوا، لیکن یہ واقفیت بہت سرسری اور بالکل اجمالی تھی۔ اسکے ایک دو سال بعد پھر ایک دفعہ جودھپور جانا ہوا حضرت حاجی صاحب ہی کے دولتکدہ پر اس مرتبہ بھی دو تین دن قیام رہا اور حضرت موصوف سے عقیدت اور تأثر میں اور کچھ اضافہ ہوا۔

اب سے کوئی دو ڈھائی برس پہلے حضرت حاجی صاحب ہی کے ارشاد پر چند ہی مہینوں کے

فاصلہ سے پی پاڑ[1] اور جودھپور کے دو سفر ہوئے، جن میں سے ایک میں رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی بھی ساتھ تھے، ان دونوں سفروں میں تقریباً ایک ایک ہفتہ حضرت حاجی صاحب کا برابر ساتھ رہا اور یہ اندازہ ہوا کہ حضرت موصوف کے بارہ میں جو کچھ ۲۰ برس پہلے جانا اور سمجھا تھا وہ اصلیت کے لحاظ سے بہت کم تھا۔ ان دونوں سفروں میں میں سوالات کر کر کے زندگی کے واقعات اور حالات حضرت حاجی سے پوچھتا بھی رہا اور وہ بڑی شفقت اور بڑے نشاط کے ساتھ بیان فرماتے رہے، کچھ عرصہ کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ چیزیں کم از کم اپنی ہی تذکیر کے لئے قلمبند کر لینی چاہئیں چنانچہ کاغذ کے ایک ورق پر مختصر اشاروں میں حافظہ کی مدد سے وہ چیزیں نوٹ کر لیں ــــــــ پھر حضرت حاجی صاحب از راہ شفقت دعنایت دوبار لکھنؤ بھی تشریف لائے اور دونوں دفعہ تقریباً ایک ایک ہفتہ قیام فرمایا آخری تشریف آوری اسی مہینہ ذیقعدہ (مطابق ۱۹۶۶ء) میں ہوئی تھی، حضرت موصوف کے جو حالات میں نے پہلے حافظہ سے نوٹ کئے تھے اس دفعہ میں نے ایک صحبت میں سوالات کر کر کے ان کے بارہ میں مزید اطمینان حاصل کیا اور کچھ اضافہ بھی ہوا۔

غور وفکر کے بعد میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ ان حالات کو ترتیب دے کے اللہ کے بندوں کی سبق آموزی اور نصیحت پذیری کے لئے شائع کر دیا جائے۔ میں اپنے اس عمل سے اللہ کے بندوں کے دینی نفع کی اور اپنے لئے اجر اخروی کی قوی امید رکھتا ہوں۔

یہ حضرت موصوف کی کوئی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ زندگی کے جستہ جستہ کچھ حالات اور واقعات ہیں جو مختلف صحبتوں میں سنے گئے تھے اور کچھ اپنے مشاہدات اور تاثرات ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصر لفظوں میں ناظرین سے حضرت حاجی صاحب کا کچھ تعارف کرا دیا جائے۔

حضرت حاجی صاحب کی عمر اس وقت ۷۱ سال ہے، خاص جودھپور کے ایک نہایت غریب تیلی گھرانے میں پیدا ہوئے جس میں دین یا علم دین کا کوئی ذکر بھی نہ تھا، ایسے غریب اور پست گھرانوں کے بچے جس طرح پلتے بڑھتے ہیں اسی طرح حاجی صاحب بھی پلے بڑھے۔

---

(۱) پی پاڑ، جودھپور کا گویا ایک قصبہ ہے، دہلی یا آگرہ سے جودھپور جاتے ہوئے تقریباً ۳۰ میل پہلے پڑتا ہے۔ ۱۲

جب مزدوری کے قابل ہوئے مزدوری کرنے لگے، اسی زمانہ میں اللہ کی توفیق سے کچھ دینی باتیں کان میں پڑیں اور دین سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اب دین و دنیا کی دونوں ترقیاں ساتھ ساتھ شروع ہوئیں، مزدوری کرتے کرتے ٹھیکیداری تک پہنچے اور اس لائن میں اللہ نے ایسا کامیاب اور نیک نام کیا کہ لوگ اپنی بلڈنگیں بنوانے کے لئے ان کی فرصت اور فراغت کا انتظار کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے کمائی میں ایسی برکت دی کہ لاکھوں کمائے اور بے دریغ مصارف خیر میں صرف بھی کرتے رہے، آخر میں شہر کے ایک مناسب مقام پر ایک بڑا پلاٹ خرید کے قلعہ نما گویا ایک چھوٹا سا محلہ بنایا جو "اشرف منزل" کے نام سے موسوم ہے جس میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ کے علاوہ، امکانات اور چند دوکانیں ہیں ——— پھر اس سب کو ٹھکانے لگا کے (جس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی) ایسے بے نوا ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

دینی ترقی کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاز تلقین بنایا، لکھنے پڑھنے میں حال یہ ہے کہ اُردو پڑھ لیتے اور سمجھ لیتے ہیں، لیکن غالباً خط نہیں لکھ سکتے ہیں، تعلیم کی اس کمی کی وجہ سے تلفظ بھی پورا صحیح نہیں ہے لیکن دینی فہم جس کو قرآن مجید میں "حکمت" کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے ایسا وافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ بعض باتیں سُن کے ہم جیسے کتاب خوانوں کو حیرت ہوتی ہے ——— اپنے مرشد علیہ الرحمہ سے بے انتہا تعلق ہے، لیکن غلو کا نام و نشان نہیں۔ دعا ان کا ہر وقت کا وظیفہ اور حال ہے، سنت و شریعت کا اتباع گویا ان کا مزاج بن گیا ہے، دیکھنے میں ایسے سادے اور لباس اتنا معمولی کہ اگر کوئی ناواقف ان کو "اشرف منزل" کے بڑے دروازے کے پاس بیٹھا دیکھے، جہاں وہ کبھی کبھی بیٹھتے ہیں، تو زیادہ سے زیادہ ان کو وہاں کا دربان سمجھے۔ اور اگر کوئی ان کو اشرف منزل کی مسجد میں دیکھے جس کا چھوٹا سا ایک حجرہ ان کی اب قیام گاہ ہے تو مسجد کا خادم اور جاروب کش تصور کرے، لباس کے علاوہ بھی ان کے کسی ڈھنگ سے کوئی آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دنیا یا دین کسی لحاظ سے بھی یہ شخص کوئی بڑا آدمی ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد میں ممدوح کے وہ حالات لکھتا ہوں جو میں نے مختلف صحبتوں میں سُن سُن کے نوٹ کئے تھے یا ذاتی مشاہدہ سے مجھے معلوم ہوئے ہیں۔

جو حالات حضرت ممدوح سے سنے ہوئے ہیں میں کوشش کروں گا کہ حضرت کے جو الفاظ یاد ہیں حتی الوسع ان ہی الفاظ میں قلمبند کروں۔

بچپن

ناچیز راقم سطور کے ایک سوال کے جواب میں حضرت حاجی صاحب نے اپنے بچپن کا حال بیان فرماتے ہوئے بتلایا۔

گھر میں گھانی کا (یعنی کولھو سے تیل نکالنے کا) کام ہوتا تھا چونکہ غربت بہت تھی اسلئے جب میں کولھو کے بیل کے پیچھے چلنے کے لائق ہوا اسی وقت سے گھر کے اس کام میں لگ گیا ــــــ جب کچھ اور بڑا ہوا تو گوبر بیننے کا کام بھی کرنے لگا، دادی میرے سر پر ٹوکری رکھ دیتی تھیں اور میں چرائی کے لئے جنگل جانے والے جانوروں کے پیچھے پیچھے ان کا گوبر بیننے کے لئے چلا جاتا تھا، جب وہ ٹوکری بھر جاتی تو میں گھر واپس آجاتا، اور دادی کے ساتھ اُپلے بھی پاتھتا۔

بچپن میں مجھے سیپارہ پڑھنے کے لئے ایک مکتب میں بٹھایا گیا تھا، بس "   " تک پڑھا تھا کہ پڑھانے والے صاحب نے اتنا مارا کہ میرا پاجامہ خراب ہوگیا، گھر آیا، دادی نے نہلایا دھلایا اور بس اسی پر پڑھائی ختم ہوگئی۔

یتیمی

میری عمر کا گیارھواں سال تھا کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا، انھوں نے گھر میں ڈیڑھ پیسہ بھی نہیں چھوڑے بلکہ کچھ قرض چھوڑا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ہی ادا کرایا،

مزدوری کا آغاز

چونکہ گھر کے کام گھانی میں پورا نہیں پڑتا تھا، بڑی تنگی سے گزارہ ہوتا تھا اسلئے جب میں باہر نکل کے مزدوری کرنے کے لائق ہوا تو مکانوں کی تعمیر میں مزدوری کرنے لگا، مجھے یاد ہے کہ پانچ پیسے یومیہ مجھے ملا کرتے تھے۔

دین سے لگاؤ کا آغاز

فرمایا ــــ شہر میں کچھ اہل حدیث حضرات تھے ان میں بعض بڑے نیک اور صالح تھے، اُنکے ہاں مزدوری کرنے کا اتفاق ہوا، انکی دینی باتیں سُن سُن کے دین سے لگاؤ پیدا ہوا اور اللہ تعالےٰ کی توفیق سے وہ برابر بڑھتا رہا، شہر میں ایک دو صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور تھانہ بھون کے کچھ باشندے بھی ریاست میں ملازم ، دینی رجحان پیدا ہونے کے بعد ان حضرات سے بھی رابطہ قائم ہوگیا۔

میں ان دنوں میں اپنی مزدوری سے پیسے بچا بچا کے ان حضرات کے مشورے سے دینی کتابیں

منگواتا تھا اور پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ اس اثنا میں میں نے خود بھی اُردو کی کچھ شد بد حاصل کرلی اور مناسبت کی وجہ سے چند ہی روز میں دینی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ دیانت دی تھی اور ذہانت بھی اسلئے مزدوری کی لائن میں بھی برابر ترقی کرتا رہا اور بات یہاں تک پہنچی کہ عمارتی کاموں والے خود مجھے تلاش کرنے لگے اور مزدوری کے ساتھ اپنے کاموں کی نگرانی کا کام بھی مجھ سے لینے لگے، اور اس سے میری آمدنی بھی بڑھ گئی، اسکے علاوہ گھر پر گھانی کا کام بھی کچھ چالو رہا۔

حضرت تھانویؒ کی زیارت اور بیعت

حضرتؒ کی کتابوں کے ذریعہ اور تھانہ بھون کے حضرات سے حالات سُن سُن کے حضرتؒ سے عقیدت ہو چکی تھی، ایک دفعہ سنا کہ فلاں دن حضرت پی پاڑ تشریف لا رہے ہیں، وہاں وعظ بھی ہوگا ۔۔ میں زیارت اور وعظ سننے کے شوق میں پیدل چل کے پی پاڑ[1] پہنچا، حضرت کی زیارت پہلی بار وہیں ہوئی وعظ بھی سنا اور الحمدللہ دل پر بہت اثر ہوا۔ موقع پا کر میں نے حضرت کے قریب جا کر عرض کیا میں جودھپور کا رہنے والا ہوں، محنت مزدوری کرتا ہوں حضرت سے بیعت ہونا چاہتا ہوں، حضرت نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اچھا فلاں وقت میرے پاس آجانا، میں اس وقت حاضر ہوا حضرت نے میرے کچھ حالات دریافت فرمائے اور بیعت فرمالیا، اور اسکے بعد سے حضرت سے تعلق قائم ہوگیا ۔۔۔۔ مجھے سب سے زیادہ مناسبت "مناجات مقبول" کی۔ دعاؤں سے تھی، اس کے اردو اشعار کا کافی حصہ حفظ ہوگیا تھا، گھانی کرتے ہوئے بھی خوب مزے سے پڑھا کرتا تھا (فرمایا) ۔۔ مجھے تو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔

"تارک الدنیا" بننے کا غلط شوق اور داعیہ

فرمایا ۔۔۔ "کچھ عرصہ کے بعد شدت سے یہ داعیہ طبیعت میں پیدا ہوا کہ دنیا اور اس کے سارے بکھیڑوں کو چھوڑ چھاڑ کے بس "فقیر" بن جائیں، بیوی تھی، کئی بچے بھی پیدا ہو چکے تھے، دادی اور ماں بھی موجود تھیں اس لئے دل میں خود سوال پیدا ہوتا تھا ان سب کا کیا ہوگا؟ ایک دن

---

[1] پی پاڑ جودھپور سے قریباً ۴۰ میل کی مسافت پر ایک قصبہ ہے۔

یہ جواب دل میں آیا کہ روزی دینے والا اور پرورش کرنیوالا تو تھوڑا ہی ہے اللہ تعالیٰ ہے وہی اب پرورش کر رہا ہے وہی انکی روزی کا کوئی انتظام کریگا اگر آج تو مرجائے تو کیا ہوگا، یہ بات دل میں جم گئی اور سب کو چھوڑ چھاڑ کے تھانہ بھون بھاگ جانے کا ارادہ کرلیا۔

ایک دن سحر کے وقت کھانی کرتے کرتے (یعنی کولھو چلاتے چلاتے) سب کو سوتا چھوڑ کے بس ایک چادر اور ایک دو کتابیں ساتھ میں لے کے چل دیا، گھر میں چالیس روپے رکھے تھے، کرایہ وغیرہ کے لئے ان میں سے بس ۱۲ روپے لئے، اور دلی کا راستہ لیا، اس خیال سے کہ جودھپور میں اگر کسی نے ریل پر سوار ہوتا دیکھ لیا تو گھر والوں کو پتہ چل جائیگا اور تعاقب کیا جائیگا، ۲۸ میل پیدل چل کر بیاوٹ سے ریل میں بیٹھا، یاد ہے کہ دلی تک راستہ میں (گویا ۲۴ گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ میں) بس ایک پیسہ کی مولی خرید کے کھائی تھی۔ —— دلی پہنچکر رات کو پہاڑ گنج میں ٹھہرا صبح کو شاہدرہ آیا جہاں سے تھانہ بھون کو ٹرین جاتی تھی، معلوم ہوا کہ اب شام کو ٹرین ملے گی، دن گذارنے کے لئے وہاں ایک مسجد میں پڑ گیا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی "کلیات امدادیہ" جو ساتھ میں تھی اُسی کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس میں ایک "تارک الدنیا درویش" کا یہ قصہ پڑھا کہ میرے ہی جیسے کسی صاحب کو "ترک دنیا" کا شوق ہوا بیچاری بیوی کو طلاق دے کے اور بچوں کو چھوڑ کے نکل گئے اور درویشی اختیار کرلی، بیوی نے مجبور ہو کر کہیں نکاح کرلیا، عرصہ کے بعد یہ درویش صاحب کہیں گھومتے پھرتے اسکے گھر کی طرف سے نکلے، اور اپنی کسی ضرورت سے گھر پر صدا دی، گھر والی (جو انکی مطلقہ بیوی تھی) نکلی، انھوں نے اسکو نہیں پہچانا لیکن اس نے ان کو پہچان لیا اور کہا میاں صاحب یہیں ٹھہر جاؤ آرام کرلو۔ انھوں نے قبول کرلیا اور اپنی جھولی وہیں رکھ کے بیٹھ گئے، اس نے ان سے اجازت لے کے ان کی جھولی کھولی، اس میں عام ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں مثلاً سوئی، دھاگہ، قینچی، نمک مرچ، آٹا، کچھ پیسے —— اس نے ایک ایک کو پوچھا کہ یہ کیا ہے اور کس لئے ہے، میاں صاحب بتاتے رہے کہ یہ یہ ہے اور اس لئے ہے، آخر میں اس نے ایک دھول رسید کی اور کہا کہ دنیا میرا ہی نام تھا اور یہ سب جو جھولی میں لئے پھرتے ہو یہ دنیا نہیں ہے —— (حاجی صاحب نے فرمایا) یہ قصہ پڑھ کے عقل کام کرنے لگی اور میں نے سوچا کہ جب کل کو تھانہ بھون پہنچوں گا تو سب سے پہلا سوال وہاں یہ ہوگا کہ کیوں آئے ہو؟ اور گھر سے کس کی اجازت سے آئے ہو۔ اگر یہ حال پہنچا تو یہ بھی ممکن ہے کہ خوب ڈانٹ پڑے اور کل ہی واپسی کا حکم ہو —— بس یہ سوچ سمجھ کے واپسی کا

باقی صفحہ ۳۴ پر

تبلیغی جماعت اور بعض شکایات

"کئی مہینے ہوئے صوبہ بمبئی سے ایک صاحبِ علم کا خط اس ناچیز کے نام آیا تھا، جس میں "تبلیغی جماعت" اور اُسکے کام سے متعلق کچھ شکایات درج تھیں، اتفاق سے گزشتہ مہینے شوال میں ایک سفر کے دوران میں اس کا جواب لکھا جا سکا۔ اسی سفر میں بعض تبلیغی احباب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح کی شکایتیں بعض خاص حلقوں میں یہاں بھی پھیل رہی ہیں، اسلئے اس جواب کی عام اشاعت مناسب سمجھی گئی" ——— محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

باسمہٖ سُبحانہٗ تعالیٰ

مکرمی و محترمی! ——— زید مجدکم ——— سلام مسنون! ———

خدا کرے مزاج بعافیت ہو ———

گرامی نامہ کا جواب آج بہت تاخیر سے دے رہا ہوں، میری یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ جن خطوط کا جواب مختصر نہیں دیا جا سکتا وہ فرصت کے انتظار میں رکھے رہتے ہیں، اور بسا اوقات کئی ہفتوں، اور کبھی کبھی تو کئی مہینوں کے بعد اُن کے جواب کی نوبت آتی ہے۔ آپکے گرامی نامہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، اِس وقت سفر میں ہوں، اور یہ جواب چلتی ٹرین میں لکھ رہا ہوں۔ آپ کو انتظارِ جواب کی بڑی زحمت ہوئی ہوگی، اُمید ہے کہ معذور تصور فرما کر معاف فرما دینگے۔

آپ نے تبلیغی جماعت اور اُسکے تبلیغی کام کے متعلق جو چند شکایتیں اور بعض اشکالات

لکھے ہیں، اور بعض اصلاح طلب امور کی طرف توجہ دلائی ہے، اُسکے بارے میں پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے، کہ آپ نے جماعت کا خاص رکن اور ذمہ دار سمجھ کر اس سلسلہ میں مجھے مخاطب فرمایا ہے، میں ذرہ برابر انکسار کے بغیر عرض کرتا ہوں کہ واقعہ میں میری یہ حیثیت بالکل نہیں ہے، میں اگرچہ اصولی طور پر اس کام کو بڑا مبارک اور مقبول کام سمجھتا ہوں، اور میرے دل میں اس کی بڑی عظمت ہے، لیکن اپنے خاص حالات اور بعض اپنے اُن مشاغل کی وجہ سے جن کو میں نے اپنا رکھا ہے، میں اس کام میں بہت کم عملی حصہ لے سکتا ہوں، اور چونکہ یہ کام سراسر عملی ہے، اس میں کسی کا کوئی منصب اور کوئی عہدہ نہیں ہے، اسلئے میں اسکے تیسرے درجے کے کارکنوں میں شمار ہونے کے قابل بھی نہیں ہوں، اسلئے اس کام کے سلسلہ میں اگر آپ کو یا کسی کو کوئی مخلصانہ مشورہ دینا ہو، یا کسی اصلاحی بات کی طرف توجہ دلانی ہو، تو اس کام کے اصل مرکز "بستی نظام الدین اولیاءؒ دہلی" کو لکھنا چاہئے، بلکہ زیادہ صحیح اور مفید طریقہ یہ ہے، کہ اس کام کے اصل روح رواں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت فیوضہم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشافہۃً اُن سے عرض کیا جائے ——

تاہم چونکہ اس کام سے اور اسکے خاص کارکنوں اور اُن کے حالات و خیالات سے بفضلہ تعالیٰ واقفیت رکھتا ہوں، اسلئے گرامی نامہ کے مندرجات کے بارے میں چند باتیں عرض کرتا ہوں :۔

—— آپ کے خط سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کام کی حقیقت سے آپ شاید بالکل واقف نہیں ہیں، بلکہ اسکے مشہور عنوان "تبلیغ" کے لفظ سے آپ کے ذہن میں جو تصوّر قائم ہوا ہے، بس اُسی کو بنیاد بنا کر آپ نے رائے قائم کی ہے، اور مشورے دیئے ہیں، اسلئے اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اصل کام سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ یہ "داخلی تبلیغ" اور "خارجی تبلیغ" کی لمبی بحث جو آپ نے لکھی ہے اسی ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

—— میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ اس کام کے لئے "تبلیغ" کا عنوان اور اسکے کرنے والوں کے لئے "تبلیغی جماعت" کا نام بہت سوں کے لئے غلط فہمیوں اور ذہنی الجھنوں کا سبب بنتا ہے[۱]۔ تبلیغ کے

---

[۱] میں نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے کسی خاص صحبت یافتہ اور قدیم رفیق سے یہ بات سُنی ہے کہ حضرتؒ نے فرمایا کہ "اپنے اس کام کا نام تبلیغ یا تبلیغی جماعت ہم نے نہیں رکھا، بلکہ نام رکھنے کے مسئلہ پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، بس آپ سے آپ یہ نام چل پڑا، اور ایسا مشہور ہوا، کہ اب کبھی کبھی ہم بھی یہی نام لیتے ہیں"

اس لفظ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ وعظ و نصیحت کا کام ہے اور "تبلیغی جماعت" وعظ و نصیحت کا کام کرنے والوں کی کوئی ٹیم یا پارٹی ہے، اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کے ہر آدمی کو دین کا اتنا علم ضرور ہونا چاہیئے جتنا کہ وعظ و نصیحت کے لئے ضروری ہے اسی طرح عملی حیثیت سے بھی اس میں کوئی نمایاں کمی نہ ہونی چاہئیے۔ پھر جب وہ پھرنے والی تبلیغی جماعتوں میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جن سے صحیح وضو کرنا بھی نہیں آتا اور جنکی وضع اور صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں ہوتی تو ان کے دلوں میں سخت اعتراض پیدا ہوتا ہے ـــــ اسی طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے سب سے زیادہ اصرار اس پر کرتے ہیں کہ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر اس کام کے لئے باہر نکلیں اور لمبے لمبے سفر کریں تو بھی لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اور انکے دلوں میں اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب وعظ و نصیحت ہی کرنا ہے اور قرب و جوار میں اور خود اپنے علاقوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن میں یہ کام کرنے کی ضرورت ہے تو یہ لمبے لمبے سفر کیوں کئے جاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کا پیسہ ریل کے کرایوں میں کیوں فضول صرف کرایا جاتا ہے ـــــ؟ بہرحال اس طرح کے سارے اعتراضات صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کا کام وعظ و نصیحت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں تبلیغ سے مراد ایک خاص نظام عمل ہے، یعنی ایک خاص قسم کے دینی اور دعوتی ماحول میں خاص اصولوں کے ساتھ کچھ خاص اعمال و اشغال کی پابندی کرتے ہوئے خاص پروگرام کے مطابق زندگی گزارنا جس سے ایمانی کیفیت میں ترقی ہو، دین سے تعلق اور واقفیت بڑھے، اعمال و اخلاق کی کچھ اصلاح ہو اور دین کے لیے جانی و مالی قربانی کی عادت پڑے ـــــ الغرض یہاں تبلیغ سے مراد یہی خاص عملی پروگرام ہے اور اس لئے ہر مسلمان کو خواہ اسکے عمل و علم میں کتنی ہی کمی ہو اسکی دعوت دی جاتی ہے، بلکہ جہاں تک بس چلتا ہے کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے ـــــ اور انکو ساتھ لینے کے لئے کوئی شرط نہیں لگائی جاتی بلکہ اس امید پر انکو لے جاتا ہے کہ انشاء اللہ جماعتی ماحول اور اسکی فضا سے یہ متأثر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جو در اصل ہادی اور مقلب القلوب ہے ہم سب پر اپنا فضل فرمائے گا ـــــ اسلئے جماعتوں میں ہر طرح کے اور ہر قماش کے لوگ ہوتے ہیں ـــــ

البتہ جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے یہ غلطی جماعتوں میں ہوتی ہے کہ عام مجمعوں میں بعض اوقات

ایسے لوگوں کو بات کرنے کے لئے کھڑا کر دیا جاتا ہے جو اسکے اہل نہیں ہوتے بلکہ اس کام سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہوتے اور پھر وہ بات کرنے میں اپنے علم کی حد کی بھی پابندی نہیں کرتے لیکن اسکو جیسے آپ غلط سمجھتے ہیں اسی طرح کام کے ذمہ دار حضرات بھی اسکو غلط اور اسکی اصلاح ضروری سمجھتے ہیں، جماعتوں کو سفر شروع کرتے وقت جو ہدایتیں دی جاتی ہیں ان میں اس بارہ میں بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ بات کس کو اور کس طرح کرنی چاہیئے اگر ان ہدایتوں کی پوری پابندی ہو تو ایسی غلطیاں نہ ہوں۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ ایسی غلطیاں بکثرت ہوتی ہیں، یہ بات کام کے ذمہ داروں کے لئے بلاشبہ بہت فکر اور توجہ کے لائق ہے۔ خود میری رائے یہ ہے کہ ایسے اہم امور کے بارہ میں زبانی ہدایات کے علاوہ اگر کوئی تحریری یادداشت بھی دیدی جایا کرے تو انشاء اللہ ایسی غلطیوں کا بہت کچھ سدباب ہو سکتا ہے۔

اسکے بعد میں آپکے خط کے سب سے اہم اور آخری جز کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں:۔

آپنے تحریر فرمایا ہے کہ "تبلیغی جماعت والے دینی مدارس اور اہل مدارس کی مخالفت کرتے ہیں اور جو لوگ تبلیغی جماعت میں کام کرنے لگتے ہیں انکا تعلق مدرسوں سے کم ہو جاتا ہے" یہ بات بڑی سنگین ہے، ایسی باتوں کو زبان یا قلم پر لانے سے پہلے جتنی تحقیق کر لینی ضروری ہے میرا خیال ہے کہ اُسکے بغیر آپنے یہ بات لکھدی ہے، اگر آپ تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے کسی خاص شخص یا چند متعین افراد کے متعلق ایسی بات کہیں تو زیادہ مستبعد نہیں، میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس کام سے تعلق رکھنے والوں میں ان تمام مزاجوں اور خیالوں کے لوگ ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے موجودہ معاشرہ میں پائے جاتے ہیں، لیکن تبلیغی کام کرنے والوں کے متعلق عموم کے ساتھ یہ بات کہنا کہ وہ دینی مدارس کی مخالفت کرتے ہیں، بڑی زیادتی کی بات ہے۔ آپنے اتنا تو سوچا ہوتا کہ اس کام سے تعلق رکھنے والوں میں کتنے ہیں جو خود مدرسے چلا رہے ہیں یا مدرسوں میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ خود حضرت مولانا محمد یوسف صاحب۔ جو اس کام کے روح رواں اور سب سے بڑے ذمہ دار ہیں ایک مدرسہ (کاشف العلوم) وہ بھی چلا رہے ہیں جس میں خود بھی پابندی سے درس دیتے ہیں، یہی حال انکے خاص الخاص رفقاء کار مولانا انعام الحسن صاحب اور مولانا عبید اللہ صاحب وغیرہ کا ہے، مجھے بھی آپ اس کام سے

خاص تعلق رکھنے والوں میں سمجھتے ہیں اور مدارس کی دنیا سے میرا تعلق آپ کو معلوم ہے، یعنی یہ کہ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور عاملہ کا رکن ہوں، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بھی میرا یہی تعلق ہے بلکہ اب تو کچھ عرصہ سے میں نے تدریس کی کچھ ذمہ داری بھی اس میں لے لی ہے۔ اور بھی ایسے بیسیوں حضرات کو آپ جانتے ہوں گے جو اس کام سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور کسی مدرسہ کی ذمہ داری بھی اُن پر ہے ـــــــ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ تبلیغی کام کرنے والے دینی مدارس کی مخالفت کرتے ہیں کس قدر غلط اور کتنی بے تکی بات ہے ـــــــ میرے نزدیک اصل حقیقت اس بارہ میں یہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جن کا ذہن کسی وجہ سے مدارس اور اہل مدارس کے خلاف بن چکا ہے اپنے اسی ذہن کے ساتھ اس کام میں لگ جاتے ہیں اور ان کی زبانوں سے وقتاً فوقتاً ایسی باتیں نکلتی ہیں، اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جو دین سے بالکل بے تعلق تھا، غفلت اور خدا فراموشی کی زندگی گزار رہا تھا اس کام میں لگنے کے بعد بس اسی کام کو اصل دینی کام اور دینی خدمت سمجھتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ بہت سے علما اور اہل مدارس جن پر دین کی خدمت کا سب سے زیادہ حق ہے یہ کام نہیں کر رہے ہیں تو اپنی کم علمی اور دینی تربیت نہ پانے کی وجہ سے ان پر اعتراض اور تنقید کرنے لگتا ہے۔ لیکن میں اپنے معلومات اور تجربوں کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا تعلق کام سے جس قدر بڑھتا ہے اور اصل کارکنوں اور ذمہ داروں سے جتنا ان کا اختلاط ہوتا ہے انکی اس غلطی کی اصلاح ہوتی رہتی ہے، البتہ دوسری علمی و عملی غلطیوں کی طرح اس غلطی کی اصلاح کے لئے بھی یہاں تردید و بحث کا طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اپنے طریقہ پر ذہن بدلنے کی کوشش کیجاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اکثر کامیاب ہوتی ہے۔ میں ایسے متعدد حضرات کو جانتا ہوں جو پہلے مدارس اور اہل مدارس سے سخت بیزار اور بڑے بیباک معترض تھے، لیکن اس کام سے اور پھر کام کے مرکز نظام الدین سے تعلق بڑھنے کے بعد ان کا ذہن بدلا اور وہ مدارس کے قدر شناس اور خادم بن گئے ـــــــ ہم نے خود حضرت مولانا محمد الیاسؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے کہ وہ اس کا پورا اہتمام کرتے تھے کہ اُن سے اور ان کے کام سے تعلق رکھنے والے لوگ، حضرات علماء کرام سے اور مدارس سے گہرا عقیدتمندانہ تعلق رکھیں

اور ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بھی اس کا پورا اہتمام اور اسکی پوری کوشش کرتے ہیں، آپ کو تو معلوم نہ ہوگا لیکن میں بتاتا ہوں کہ ہر مہینہ مولانا موصوف کی خدمت میں مختلف علاقوں اور طبقوں کے نئے نئے سیکڑوں افراد اور بیسیوں پچاسوں جماعتیں آتی ہیں ان کا یہ مستقل معمول ہے کہ اپنے پاس آنے والے ہر اہم فرد اور ہر اہم جماعت کو وہ دیوبند اور سہارنپور حتی الوسع ضرور بھیجتے ہیں تاکہ وہاں کے اکابر کی زیارت بھی کریں اور وہاں کے علمی مراکز دارالعلوم اور مظاہر علوم کو بھی دیکھیں اس طرح ہر مہینے اس تبلیغی راستہ سے مختلف اقطاع کے سیکڑوں افراد ہمارے ان علمی مرکزوں سے واقف ہوتے ہیں اور انکی عظمت اور ہمارے اکابر کی عقیدت اپنے قلوب میں لے کر اپنے علاقوں کو لوٹتے ہیں، ان علمی مرکزوں کی اور مسلک حق کی یہ ایک ایسی ٹھوس اور خاموش خدمت انجام دی جا رہی ہے جو ہم اپنی مساعی سے غالباً کسی طرح بھی انجام نہیں دے سکتے تھے۔ خود مولانا محمد یوسف صاحب دیوبند وسہارنپور وغیرہ کے اکابر سے جیسا نیازمندانہ تعلق رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کا جو رویہ ہے اس کے معلوم ہونے کے بعد ان سے محبت وعقیدت رکھنے والے کسی شخص کی رائے مدارس اور حضرات اہل مدارس کے خلاف کس طرح ہو سکتی ہے۔

اسکے علاوہ اس کام سے مدرسوں کے لئے جو مجموعی فضا بن رہی ہے اس کا احساس تو میرے نزدیک، ہر ایک کو ہونا چاہئے، معلوم نہیں آپ جیسے حضرات اسکو کیوں نہیں محسوس کرتے، میں تو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس تبلیغی کام سے ہمارے مدارس کو بالکل اس طرح کی مدد مل رہی ہے جس طرح کی مدد بارش کے پانی اور موافق ہواؤں سے کھیتوں اور باغوں کو ملتی ہے۔ میں ایسے سیکڑوں افراد واشخاص بلکہ بہت سے ایسے علاقوں اور طبقوں کو بتا سکتا ہوں جن کا ہمارے دینی مدارس سے کوئی ربط وتعلق نہیں تھا، نہ وہ ہمارے اکابر سے آشنا اور واقف تھے تبلیغی جماعتوں ہی کی آمد ورفت نے ان میں دینی احساس پیدا کیا، اور ان ہی کے ذریعہ وہ ہمارے دینی مدارس اور ہمارے اکابر کی دینی خدمات سے واقف ہوئے، پھر وہاں سے طلبہ بھی دینی مدارس میں آنے لگے اور دینی مدارس کی خدمت بھی ہونے لگی۔

اس سلسلہ میں خصوصیت سے یہ بات بھی قابلِ ذکر سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرا اندازہ ہو ہندوستان کے ہمارے دینی مدارس کو سب سے زیادہ امداد کلکتہ اور بمبئی کے اہلِ خیر سے ملتی ہو یں رجماً بالغیب نہیں، بلکہ اپنے قابلِ وثوق معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں شہروں سے جس قدر امداد ہمارے دینی مدارس کو تبلیغی جماعت کے کام اور اثر سے پہلے ملتی تھی اب اس سے کئی گنا زیادہ ملتی ہے اور بہت سے اہلِ مدارس بھی جانتے ہوں گے کہ دینی مدارس کی اس خدمت اور فکرمندی میں زیادہ حصّہ اُن ہی اہلِ خیر کا ہے جن کا تبلیغی کام سے بھی خاص تعلق ہے۔

اس سلسلہ میں ایک یہ بات بھی ہم اور آپ جیسوں کے سوچنے کی ہے کہ اب جبکہ مدارس عربیہ کی آبادی صرف ان غریب گھرانوں کے طلبہ سے ہو جو اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ ہم لوگ بھی جنھوں نے جو کچھ پایا ہے ان غریب پرور مدرسوں ہی سے پایا ہے، اپنے بچوں کو عزت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے کالجوں میں بھیجنے لگے ہیں تو ایسے وقت میں اس تبلیغی کام کے طفیل بہت سے وہ لوگ جن کا ارادہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ بھیجنے کا تھا اور ان کو اسکے پورے وسائل بھی حاصل تھے وہ اپنے ان ہی بچوں کو اسکولوں اور کالجوں سے نکال نکال کے ہمارے "دارالعلوموں" میں بھیج رہے ہیں۔

ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ تبلیغی کام اور اس کے کرنے والوں کی جو شکایت آپ نے دینی مدارس سے متعلق کی ہے، وہ کس قدر بے جا ہے۔

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کام کے کرنے والے فرشتے ہیں، یا اس کام میں غلطیاں نہیں ہو رہی ہیں، بلاشبہ اس کام میں بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں اور اس کام سے تعلق رکھنے والوں میں بہت ہی گھٹیا قسم کے افراد بھی ہیں، اس کام کی ساخت ہی ایسی ہے، بقول حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے یہ "تو دھوبی کی بھٹی ہے اس میں میلے کچیلے اور غلیظ بھرے گندے ناپاک کپڑے بھی ہیں" ——— لیکن جس قسم کی شکایتیں اور جس انداز میں آپنے کی ہیں میں انکو صحیح نہیں سمجھتا، مجھے جن غلطیوں کا احساس ہوتا ہے میں کام

کرنے والوں کو اپنی بساط کے مطابق انکی طرف توجہ دلاتا رہتا ہوں۔ ہاں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں کہ باہر کا آدمی از راہ اخلاص ان کو غلط اور قابل اصلاح سمجھے گا اور جو کام میں گھسا ہوا ہے اور اس کام کی منطق سے واقف ہے وہ اُسے ناگزیر سمجھے گا ایسی چیزوں میں اپنی رائے کے اظہار کے بعد کام کے ذمہ داروں کے علم اور اُنکی دیانت پر اعتماد کرنا چاہیے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس سلسلہ میں جو کچھ لکھنا آپ ضروری سمجھیں اس کام کے مرکز کو دہلی لکھیں، مجھے بالکل معذور تصور فرمائیں۔

(والسّلام)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

احباب اور متعارفین سے

میری گزارش

کچھ عرصہ سے میری مصروفیتیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں اسلئے شدید ضرورت کے سوا میں خط کتابت سے معذور ہوں ــــــ خاص کر فقہی مسائل کے جوابات اور کسی علمی تحقیق کے لئے وقت میں گنجائش نکالنے سے اب میں بالکل عاجز ہوں ان کاموں کے لئے مجھ سے بہت زیادہ اہل حضرات بحمد اللہ ملک میں موجود ہیں

جو حضرات کسی شدید ضرورت سے خط لکھیں وہ بھی مختصر لکھیں اور مجھ سے بھی کسی طویل اور مفصل جواب کی توقع نہ رکھیں۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مسائل و بصائر

عتیق الرحمٰن سنبھلی

"واقعہ کربلا پر آپ نے اپنے الفرقان ۱۳۷۵ھ میں یکے بعد دیگرے
ذی الحجہ اور محرم کے دو پرچوں میں جو کچھ بھی تحقیقی روایات درج فرمائی
تھیں اُن تمام کی تردید اب جناب مولانا طیب صاحب نے فرما دی ہے۔
الفرقان کی آیندہ اشاعت میں اس پر ضرور روشنی ڈالیے۔ جب تک
آپ اپنے ۱۳۷۵ھ والے مضمون اور طیب صاحب کی تازہ اشاعت
"شہید کربلا اور یزید" پر کوئی فیصلہ کن جواب نہ شائع فرما دینگے
ہم جیسے ہزاروں دو میں سے کسی ایک کو غلط فہمی میں مبتلا سمجھیں گے
لہٰذا عوام کی اعتقادی اور ایمانی فلاح و بہبود کے پیش نظر چند لفظوں
کا ہی اقراری یا انکاری بیان ضرور شایع ہونا چاہیئے۔"

یہ ایک مکتوب کی عبارت ہے جو گزشتہ ماہ ہمیں وصول ہوا ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس مکتوب کی وصولیابی پر کتاب منگانے کا اہتمام کیا گیا۔ کتاب دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ بات ٹھیک ہے اور اس سے واقعۃً ہمارے ۱۳۷۵ھ والے مضمون کی بعض باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم حضرت مولانا کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں۔ لیکن مولانا موصوف کی اور اپنی نسبت بزرگی و خوردی اور پھر علاقۂ نیازمندی کے ہوتے ہوئے اس کا تو سوال ہی نہیں کہ ہم اگر آنمحترم کے ارشادات سے متفق نہیں ہیں تو اس پر کوئی تردیدی بیان شائع کریں۔ البتہ مذکورہ کتاب کا ایک پہلو چونکہ یہ بھی ہے کہ ناشر (ادارہ تاج المعارف دیوبند)

نے اسے بہایت جلی قلم سے "جماعت دارالعلوم دیوبند" کے متفقہ مسلک حق کی ترجمان" کی حیثیت دے کر شائع کیا ہے، اور اس میں ایک ایسے عقیدے کا اثبات ہے جسے نہ ہم اپنی دانست میں "جماعت دیوبند" کا عقیدہ سمجھتے ہیں اور نہ اپنا عقیدہ تسلیم کرنے پر راضی ہیں، اس لئے کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ کتابچے اس پہلو پر مطلع ہونے کے بعد ہم اس باب میں اپنا موقف وضاحت کے ساتھ پیش کریں اس لئے کہ ہمیں بھی دارالعلوم دیوبند اور جماعت دیوبند سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔

محمود احمد عباسی صاحب کی کتاب سے بیزاری و براءت کا اظہار فرماتے ہوئے، حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب نے بحیثیت مہتمم دارالعلوم دیوبند ایک اخباری بیان میں اس کتاب کو "مسلک اہل سنت والجماعت" یا "عقائد اہل سنت والجماعت" کے خلاف قرار دیا تھا۔ ہم نے اُس وقت اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ مذکورہ کتاب میں حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی تنقیص کا جو ارتکاب کیا گیا ہے، حضرت مہتمم صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے، اور اس لحاظ سے یہ بیان غلط نہیں ہے ——— لیکن موصوف کی پیش نظر تصنیف (شہید کربلاؓ اور یزید) سے معلوم ہوا کہ صرف یہی بات نہیں ہے بلکہ جس طرح اہل بیت اطہار کی عظمت و طہارت عقائد اہل سنت میں داخل ہے اسی طرح حضرت مولانا کے نزدیک یزید بن معاویہؓ کا فسق و فجور بھی "بطور ایک متواتر عقیدے کے واجب التسلیم" ہے۔ اور انکی نظر میں عباسی صاحب کی کتاب کے خلاف مسلک اہل سنت ہونے کا ایک پہلو یہ بھی کہ اس میں یزید کو فاسق و فاجر کے بجائے ایک پاکباز اور عادل امیر دکھایا گیا تھا۔

مولانا موصوف کا یہ ارشاد اگر اپنی شخصی حیثیت میں ہوتا تو جس طرح عباسی صاحب کے اس خیال سے کہ یزید صلاح و اتقاء میں اپنی نظیر آپ تھا غلط ہونے کے باوجود ہمارے کسی عقیدے پر زد نہیں پڑتی تھی اسی طرح اس برعکس ارشاد سے بھی ہمیں چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی، لیکن یہ ارشاد جب اس حیثیت میں ہمارے سامنے آیا ہے کہ ——— یہ مسلک دارالعلوم دیوبند کی ترجمانی ہے، تو اگرچہ مولانائے محترم اپنے چند در چند امتیازات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کے مسلک کی ترجمانی کا خاص حق رکھتے ہیں ... ... مگر ہماری اپنی ذمہ داری مجبور

کرتی ہے کہ موصوف کے اس دعوے اور دلائل پر غور کریں اور پھر اختلاف کی صورت میں اپنا اختلاف ظاہر کرنے کی جرأت بھی کریں۔

ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اس دعوے کو ثابت نہیں پایا۔ اس لئے ہم بحیثیت ایک منتسب دارالعلوم دیوبند اس تلخ حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ یزید کے فسق کو ہم ایک "عقیدہ کی طرح" واجب التسلیم نہیں سمجھتے۔ ہماری ناقص رائے میں یزید کے فسق کا مسئلہ ایک خالص تاریخی مسئلہ ہو ــــ تاریخ سے اگر کسی کے نزدیک یزید کے متعلق ان اعمال وافعال کی نسبت صحیح ثابت ہوتی ہے جو موجب فسق ہیں تو بے شک اس پر فسق کا شرعی حکم لگے گا۔ لیکن شریعت یہ کسی پر لازم نہیں کرے گی کہ یزید کو فاسق مانا جائے اور اس کے لئے فسق کے ثبوت پر عقیدہ رکھا جائے۔ اس لئے کہ یہ ثبوت کسی شرعی نص سے نہیں بلکہ تاریخ سے ہو رہا ہے۔ اور تاریخ خواہ فنی اعتبار سے کسی کے فسق کا کتنا ہی پکا ثبوت پیش کرتی ہو۔ شرعی اعتقاد کی موجب نہیں ہو سکتی۔ تاریخی خبر تو تاریخی خبر ہے کسی شخص کے فاسقانہ اعمال کے بارے میں زندہ انسانوں کی شہادت بھی، جو شریعت کے معیار شہادت پر پورے اترتے ہوں، (خواہ وہ بیک وقت کتنی ہی بڑی تعداد میں بھی کیوں نہ ہوں) ہم پر لازم نہیں کرتی کہ شخص مذکور کے فسق پر عقیدہ رکھیں۔

الغرض، کسی معین شخص کی اچھائی برائی کا بطور عقیدہ واجب التسلیم ہونا صرف کتاب و سنت کی خبر کی بنا پر ہو سکتا ہو۔ اور کسی بنیاد پر کسی معین شخص کی اچھائی برائی بطور عقیدہ واجب التسلیم نہیں۔ پس کسی بھی شخص کی اچھائی برائی کا مسئلہ جو نصوص کتاب و سنت کے بجائے تاریخی روایات پر مبنی ہو عقائد کے باب میں نہیں داخل ہو سکتا۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب فرماتے ہیں کہ مسئلہ تاریخی نہیں بلکہ منصوصات کتاب و سنت سے ہے۔ اور ان نصوص میں جو اجمال وابہام تھا وہ علماء و فقہاء و متکلمین و شارحین حدیث کی تصریحات نے کھول دیا ہے۔ (صفحہ ۱۳) ہم کو مولانا محترم کے اس نقطۂ نظر پر پوری طرح کلام ہے لیکن اس کلام سے پہلے ہم یہ بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ مولانا کا اپنا شخصی نقطۂ نظر ہو تو ہو "جماعت دیوبند" کا نقطۂ نظر اس مسئلہ میں یہ نہیں ہے۔ سرخیل جماعت دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا مجموعہ فتاوی[1] اٹھا کر دیکھئے شروع ہی میں دو جگہ لعن یزید کے مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے

---

[1] مطبوعہ برقی پریس مراد آباد

پورے جزم کے ساتھ فسقِ یزید کا رجحان ظاہر فرمانے کے باوجود، اس امر کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ مسئلہ کا مدار تاریخ پر ہے۔ (صہ ۲) مسئلہ کا تعلق تاریخ واقعی سے ہے۔ (صہ ۲) یہ تو حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کی تصریح تھی، اور جماعت دیوبند کی ترجمانی کے لئے یہ بالکل کافی ہے، لیکن دوسرے اکابر جماعت کا معاملہ بھی یہ ہے کہ یزید کے معاملہ میں کافی شدّت وغلظت کے باوجود یہ ہم نے آج تک کسی کے متعلق نہیں پڑھا یا سنا کہ وہ یزید کے فسق کو بجائے ایک تاریخی حقیقت کے ایک شرعی عقیدہ کی طرح واجب التسلیم سمجھتے ہوں۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا طیب صاحب نے بھی کسی کے متعلق ایسی شہادت نہیں دی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جماعت دیوبند کے اوپر کے بزرگوں میں ہیں۔ اور جماعت دیوبند درحقیقت انھیں کے علمی سلسلہ کی ایک اہم شاخ ہے۔ یزید کے معاملہ میں اُنکی شدّت وغلظت کا یہ عالم ہے کہ بغیر "پلید" کہے اس کا ذکر نہیں فرماتے، مگر یہ بات ہمیں اُنکے ہاں بھی نہیں ملتی کہ وہ اس شدت کا سلسلہ نصوصِ کتاب وسنت یا کسی شرعی اجماع سے جوڑتے ہوں حتیٰ کہ وہ اپنے جیسے دوسرے متشدّدین کی بنیاد بھی کسی دلیل شرعی کو نہیں بتاتے بلکہ انکے تشدّد کی بنیاد بھی محض تاریخی روایات ہی پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:۔

> "لعن یزید میں توقف کی بنیاد یہ ہے کہ مقدمۂ شہادت امام حسین میں یزید کے متعلق روایات باہم متعارض ہیں۔ بعض روایات سے تو اسکی رضامندی، خوشی اور اہانت اہل بیت رسولؐ مفہوم ہوتی ہے پس جن حضرات کے نزدیک ان روایات کو ترجیح ہے انھوں نے اس پر جوازِ لعن کا فتویٰ دیا ہے، جیسے کہ احمد بن حنبل اور کیامراسی (کیا الہراسی) وغیرہ شافعیہ میں سے اور بہت سے علماء۔ اور بعض روایات سے اس واقعہ پر یزید کی ناگواری، اور ابن زیاد اور اُسکے آدمیوں پر عتاب اور اس واقعہ پر ندامت ظاہر ہوتی ہے جو اُسکے تابعین کے ہاتھوں پیش آیا۔ جن لوگوں کے نزدیک ان روایات کو ترجیح حاصل ہے وہ لعنت سے منع فرماتے ہیں مثلاً امام غزالیؒ اور دوسرے علمائے شافعیہ اور اکثر

علمائے حنفیہ علماء کی ایک جماعت ایسی ہو کہ اسکی نظر میں دونوں روایات کا وزن
برابر ہے اور کسی ایک کی ترجیح کا فیصلہ نہیں ہو پایا ہے وہ بنا بر احتیاط
توقف فرماتے ہیں۔"

(فتاویٰ عزیزی (مطبوعہ مجتبائی دہلی) جلد اوّل ص)

الغرض حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا یہ نقطۂ نظر کہ یزید کے اعمال شنیعہ کا اصل ثبوت تو کتاب و سنت کے اشارات اور انکی تشریح و توضیح میں علماء و فقہاء کے اقوال سے ہوتا ہو باقی تاریخی روایات کی حیثیت اسکے مؤیدات کی ہے۔ نہ کہ اصل و مدار کی ـــــ یہ نقطۂ نظر ـــــ حضرت مولانا کا محض شخصی نقطۂ نظر ہے، ہمارے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ جماعت دیوبند اور اسکے اکابر کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر اپنے دلائل کے اعتبار سے اس لائق ہے بھی نہیں کہ اہل علم کی یہ مقتدر جماعت اسے اختیار کرتی جہانتک "کتاب" (قرآن) کا تعلق ہے حضرت مولانا نے کوئی ایسی آیت پیش نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ کسی بھی طور سے یزید کے لیے اعمال شنیعہ کا اثبات کر رہی ہے۔ احادیث البتہ موصوف نے پیش فرمائی ہیں۔ لیکن ان سے استشہاد کی کمزوری پہلی ہی نظر میں واضح ہو جاتی ہے۔

پہلی حدیث مولانا نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے پیش فرمائی ہے کہ:-

هلكة أمتي على أيدي غلمة[1] من قريش ـ (بخاری)	(حضورؐ کا ارشاد ہے) میری امت کی ہلاکی چند قریشی لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی۔

دوسری حدیث بھی حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے انکی پہلی روایت کی توضیح کے طور پر لائی گئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

اعوذ بالله من امارة الصبيان قالوا وما امارة الصبيان قال ان اطعتموهم هلكتم اى فى دينكم وان عصيتموهم اهلكوكم	میں اللہ سے امارت صبیان (لڑکوں کی حکومت) سے پناہ مانگتا ہوں صحابہ نے عرض کیا کہ لڑکوں کی حکومت کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا اگر تم اُن کی اطاعت کروگے تو

[1] بخاری شریف جہاں سے یہ روایت لی گئی ہو اس میں "غلمۃ" آیا ہو۔ "غلیمۃ" صحیح نہیں۔ البتہ غلمۃ کی تصغیر لائیں گے تو "اغیلمۃ" ہوگی۔

اَی فی دینا کم باذھاق النفس	ہلاک ہوگے یعنی دین کے بارے میں اور ان
او رباذ ھاب المال اوبھما۔	کی نافرمانی کروگے تو وہ تمھیں ہلاک کرڈالیں

گے۔ یعنی تمھاری دنیا کے بارے میں جان لے کر یا مال چھین کر یا دونوں لے کر"

تیسرے نمبر پر حضرت ابوہریرہ کا ایک اثر نقل کیا گیا ہے جس سے مولانا موصوف کے نزدیک مذکورۂ بالا امارۃ صبیان کے زمانہ کی تعیین ہوتی ہے۔

ان اباھریرۃ کان یمشی	حضرت ابوہریرہ بازاروں میں چلتے پھرتے
فی الاسواق ویقول اللّٰھم	کہتے تھے کہ اے اللہ ۶۰ھ کا زمانہ مجھ پر
لا تدرکنی سنۃ ستین ولا	نہ گزرے اور نہ امارۃ صبیان مجھے پائے۔
امارۃ الصبیان۔	

پھر اس اثرِ صحابی کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے حضرت ابوسعید خدریؓ کی ایک مرفوع روایت پیش کی گئی ہے کہ :۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ	ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ
وسلم یقول یکون خلفٌ من	صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہو
بعد ستین سنۃ اضاعوا الصلوٰۃ	کہ ۶۰ھ کے بعد[1] ایسے خلف ہوں گے،
واتبعوا الشہوات فسوف	(جو) نمازوں کو ضائع کریں گے اور
یلقون غیّا۔	شہواتِ نفس کی پیروی کریں گے تو وہ

(عن) قریب غیّ (وادیٔ جہنم) میں ڈالدئے جائیں گے۔

اور آخر میں آکر شارحین حدیث کی وہ عبارتیں درج کی گئی ہیں جن سے ان کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ ان احادیث کا سب سے پہلا مصداق یزید ہوا۔

---

[1] "من بعد ستین سنۃ" کا یہ ترجمہ غلط ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اسی طرح اور بھی بعض عبارتوں کے ترجمہ میں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ اس نوعیت کی ہیں کہ ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ترجمہ کا کام حضرت مولانا نے کسی دوسرے کے سپرد کردیا تھا ورنہ ان سے ایسی غلطیاں مستبعد ہیں۔

اس سب کو پوری طرح پڑھ لینے کے بعد ہمارا کہنا یہ ہے کہ آخر ان روایتوں میں سے کونسی روایت میں اس امر کی واجب الاعتقاد تعیین ہوتی ہے کہ "غلمۃ من قریش" میں یزید بھی ضرور داخل ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ اگر سنہ ۶۰ھ سے پناہ مانگتے تھے تو کون قسم کھا کر کہہ سکتا ہو کہ یزید کی امارت ہی کی وجہ سے پناہ مانگتے تھے، یا کون کہہ سکتا ہو کہ حضور کے الفاظ "امارۃ صبیان" میں یزید کی امارت بھی ضرور شامل ہے؟ خصوصاً جبکہ امارت صبیان کی جو علامت حضور نے بیان فرمائی اُسے یزید پر منطبق کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس لئے کہ وہ ذاتی طور پر ہزار فسق میں ڈوبا ہوا سہی مگر اس سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں جس پر عمل کر کے امت کا دین برباد ہوتا ہو اور جب ایسا کوئی حکم ثابت نہیں تو اس کا تو سوال ہی نہیں کہ اپنے کسی ایسے حکم کی نافرمانی کئے جانے پر اُس نے لوگوں کو مارا کاٹا ہو ــــــ

ــــــ اسی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت کا مسئلہ بھی قابل غور ہے اس لئے کہ اس روایت میں "من بعد ستین سنۃ" کے الفاظ ہیں، ظاہر ہے کہ نہ الفاظ کا ترجمہ "سنہ ۶۰ھ کے بعد" ہوسکتا ہے[1] اور نہ کسی طور سے یہ مراد ہی ان الفاظ کی قرار دی جاسکتی ہے اس لئے کہ آنحضرت کے زمانہ میں سنہ ہجری سے کوئی شخص آشنا ہی نہ تھا سنہ کا یہ نظام تو عہد فاروقی میں شروع ہوا ہے۔ پس آنحضرت نے تو صرف اتنا فرمایا تھا کہ ساٹھ سال کے بعد آپ کی امت میں بعض ایسے خلف ہوں گے۔ یہ ساٹھ سال کب پورے ہوئے؟ اس کا کوئی ذریعہ علم آج کسی کے پاس نہیں۔ اس کا صحیح علم اگر ہوسکتا تھا تو صرف حضرت ابوسعید خدریؓ کو یا حضور کا یہ ارشاد سننے والے کسی دوسرے صحابی کو، مگر ہمیں صرف حضرت ابوسعید خدریؓ ہی کا نام معلوم ہے کہ انھوں نے یہ ارشاد حضور سے سنا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اب اس واقعہ کی طرف توجہ کیجئے کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں ہیں جنھوں نے حضرت حسینؓ کو یزید کی بیعت پر مستقیم رہنے کی تلقین کی۔ ابن کثیر ناقل ہیں :۔

وقال ابوسعید الخدری ــــ ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں۔ــــ

---

[1] ان الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے "ساٹھ سال بعد"۔

غلبنی الحسین علی الخروج،	خروج کے معاملہ میں حسینؓ نے میری بات
وقلت لہ: اتق اللہ	نہیں مانی۔ حالانکہ میں نے ان سے کہا
فی نفسك والزم بیتك	تھا، اللہ سے ڈرو۔ اپنے گھر کو پکڑے رہو
ولاتخرج علی امامك	اور اپنے امام پر خروج مت کرو۔

کیا اس سے یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ حضرت ابوسعید خدریؓ جو ہمارے علم میں واحد ہستی ہیں جنھیں اس "ساٹھ سال" کی مدت کا صحیح شمار ہو سکتا تھا، انکے شمار سے "ساٹھ سال" کی یہ مدت سنہ ۶۰ھ میں پوری نہیں ہوئی تھی، ورنہ آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ جن کی روایت کی رو سے یزید "قطعی جہنمی" ثابت ہو رہا تھا وہ حسینؓ (سید شباب اہل الجنۃ) کو اس "جہنمی" کے خلاف خروج کے معاملہ میں اللہ سے ڈرا رہے ہیں! آپ اس بحث کے بعد بھی نہ مانئے کہ یزید "ان آخلاف" کی فہرست سے بالیقین خارج تھا۔ مگر اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس فہرست میں اسکی شمولیت مشتبہ ہو جاتی ہے[۱] ــــــ پس مدعا صرف اتنا ہی ہے کہ ان احادیث کا

---

[۱] اس بحث سے گزر کر ہم مضمون کی تکمیل کے مراحل میں پہنچ چکے تھے کہ البدایہ والنہایہ ج۸ کی ورق گردانی کرتے ہوئے صفحہ ۲۳۱ پر مسند ابو یعلیٰ کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ مرفوع روایت نظر پڑی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا
تعوذوا باللہ من سنۃ سبعین	کہ سنہ ۷۰ھ سے اور امارت صبیان سے اللہ
ومن امارۃ الصبیان۔	کی پناہ مانگو۔

یہ روایت ابن کثیر نے ٹھیک حضرت ابوسعید خدریؓ کی مذکورہ بالا روایت کے بعد نقل کی ہے ــــ مزید اطمینان کے لئے ہم نے مجمع الزوائد دیکھی تو مسند ابو یعلیٰ کے ساتھ مسند احمد کے بھی حوالہ سے یہ روایت منقول پائی۔ البتہ الفاظ میں یہ فرق ملا کہ "سنۃ سبعین" جگہ مجمع الزوائد میں "رأس السبعین" کا لفظ ہے۔ (ملاحظہ ہو مجمع الزوائد صفحہ ۲۲۰ ج ۷، مطبوعہ قاہرہ)

ہم نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت پر گفتگو کے لمحات میں غور کرتے ہوئے سوچا تھا کہ ہم اگر بلا علم قطعی ساٹھ سال کی مدت تمام ہونے کے زمانہ کا تعین کر سکتے ہیں۔ تو اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس (باقی صفحہ ۵۸ پر)

یزید پر انطباق مشتبہ ہے۔ قرآئن کی بنیاد پر کتنا ہی غالب گمان قائم ہوتا ہو کہ یزید اس فہرست میں داخل ہے مگر یہ احتمال اپنی جگہ رہتا ہے کہ ہوسکتا ہو داخل نہو اس لئے کہ احادیث کے الفاظ کسی شخص کی تعیین کے لئے مساعدت نہیں کرتے۔ اور جب یہ صورت ہے تو ہم میں سے کسی بڑے سے بڑے کے لئے بھی اس جرأت کی گنجائش نہیں ہے کہ ان احادیث کی بنیاد پر کسی شخص معین کے فسق کو ایک ایک عقیدہ کی طرح واجب التسلیم قرار دیا جائے۔ اس کا مآل حضرت رسالت کی طرف اپنے ظن و تخمین کی بنیاد پر ایک بات کی حتمی نسبت ہے، اور اسکی جرأت کو روا رکھنے کا آج تک اسلام میں تصور نہیں کیا گیا ہو۔

مولانائے محترم نے فسق یزید کے مسئلہ کو "عقیدہ کی شان" دینے کے لئے مسئلہ پر بطور عقیدہ ائمہ وعلماء کے اجماع کا دعویٰ بھی فرمایا ہے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ :-

"قسطلانی شارح بخاری نے علامہ سعد الدین تفتازانی سے نقل کیا ہو کہ

والحق ان رضا یزید بقتل الحسین	اور حق بات یہ ہے کہ یزید کا قتلِ حسین سے
واستبشارہٗ بذلک واھانتہ	راضی ہونا اور اس سے خوش ہونا اور اہانتِ
اھل بیت النبی صلی اللہ علیہ	اہل بیت نبی کریم صلی اللہ وسلم ان چیزوں میں
وسلم مما تواتر معناہ وان	سے ہو جو معنوی طور پر تواتر کے ساتھ ثابت
کان تفاصیلہا احاداً	شدہ ہیں۔ اگرچہ انکی تفصیلات اخبار احاد
(قسطلانی صـ۱۲۴-۱۲۵/۵)	ہیں۔

قسطلانی کا بلا نکیر تفتازانی سے یہ عقیدہ اور واقعہ نقل کرنا اس عقیدہ اور واقعہ سے خود ان کی موافقت کی کھلی دلیل ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس قول کی تردید کی نہ اس پر نکیر کی بلکہ

(بقیہ حاشیہ صـ[illegible]) ساٹھ سالہ مدت کا آغاز حضورؐ کی وفات سے سمجھا جائے ـــــــ بظاہر یہی ایک تنہا شکل ہے جس سے اس ساٹھ سال کی مدت تمام ہونے کے زمانہ کا تعین قابل قبول طور پر ممکن ہوسکتا ہے ـــــــ اور اس حساب سے یہ مدت سنہ [illegible] پر نہیں بلکہ سنہ [illegible] پر تمام ہوتی ہے۔

یہ تھا ہمارے غور وفکر کا نتیجہ۔ لیکن ہم نے اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مگر اب (باقی صـ۵۲ پر)

اُسے بطور استشہاد پیش کیا ہے۔ اس لئے ایک محدث اور ایک متکلم کے اتفاق سے یزید کی رضا بقتلِ الحسین اور اس کا فسق ثابت ہوتا ہے۔ پھر جبکہ تفتازانی فسقِ یزید کو جو جوازِ لعن سے واضح ہے متفق علیہ اور اس واقعہ رضا بالقتل کو معناً متواتر بھی فرما رہے ہیں تو ان دونوں ائمہ حدیث وکلام کے نزدیک یہ بطور ایک متواتر عقیدہ وحیز کے واجب التسلیم ثابت ہوتا ہے۔ جو دو کا مسئلہ نہ رہا بلکہ اجماعی بات ہو گئی۔" (صفحہ ۱۴۱-۱۴۰)

ہمیں بہت ناخوشگوار جرأت کرکے کہنا پڑتا ہے کہ یہ دعویٰ اور یہ اندازِ استدلال مولانا کی شانِ عالی سے بہت ہی فروتر ہے اس طرح کی نقول سے اگر اجماع ثابت ہو جایا کرتا ہو تب تو اجماعی مسئلوں کی فہرست (جو بڑی مختصر ہے) بہت ہی طویل ہو جائے گی ـــــ تفتازانی نے کوئی شرعی عقیدہ اس عبارت میں بیان نہیں کیا ہے صرف اپنی ایک تاریخی تحقیق پیش کی ہے کہ تاریخی اخبارِ احاد سے قدرِ مشترک کے طور پر یہ بات اُن کے نزدیک معناً متواتر کے درجہ میں ثابت ہے کہ قتل حسین سے یزید راضی اور خوش تھا ـــــ اور یہ بات کس ذیل میں کہی گئی ہے؟ جوازِ لعنت کے ذیل میں، کہ مسئلہ کی رو سے چونکہ قتلِ حسینؓ پر راضی اور خوش ہونے والا قابل لعنت ہے، اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ یزید اس واقعہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵) حضرت ابوہریرہؓ کی جو یہ مرفوع روایت سامنے آئی ہے وہ گویا اس باب میں صراحت کا درجہ رکھتی ہو کہ آنحضرت کی مراد "ساٹھ سال بعد" سے "اپنی وفات ہی کے ساٹھ سال بعد" تھی، اور اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے حضرت ابوہریرہ نے اس زمانہ میں آکر جب سنہ ہجری کی تاسیس ہو چکی تھی، لوگوں کی سہولت کے خیال سے حضور کے اصل الفاظ کے بجائے اپنے الفاظ (رأس السبعین) میں روایت بالمعنی کے طور پر وہ زمانہ بیان کر دیا جس سے گویا حضور نے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

گویا آنحضرت کے اصل الفاظ "رأس السبعین" یا "سنۃ سبعین" نہیں تھے بلکہ حضرت ابوسعید خدریؓ والی روایت کی طرح "من بعد ستین سنۃ" جیسے الفاظ ہی آپ نے ارشاد فرمائے تھے، اور آنحضرت کے الفاظ ایسے ہی ہونے بھی چاہئیے تھے اس لئے کہ (جیسا ہم نے اوپر لکھا ہے) حضور کے زمانہ میں سنہ ۶۰ھ یا سنہ ۷۰ھ وغیرہ فرمائے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۹ پر)

راضی اور خوش تھا اس لئے اس پر لعنت کرنا جائز ہے۔"

جب تفتازانی اس عبارت میں کسی عقیدہ کا بیان ہی نہیں کر رہے ہیں تو اس کو بلا نکیر نقل کرنے سے قسطلانی کی اس مبینہ عقیدہ سے موافقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے جس کی طرف مولانا نے توجہ نہیں فرمائی کہ اگر اس عبارت اور اسکی نقل سے کوئی عقیدہ ثابت ہوتا ہے تو فسقِ یزید کا نہیں بلکہ کفر کا۔ اس لئے کہ تفتازانی کی جو عبارت قسطلانی نے نقل کی ہے وہ پوری یہ ہے۔

وقد اطلق بعضهم اللعن على	اور بعض لوگوں نے یزید پر (نام لیکر)
يزيد لما انه كفر حين امر	لعنت بھی کی ہے۔ اس لئے کہ جب اس
بقتل الحسين واتفقوا على	نے قتل حسین کا حکم دیا تو وہ کافر ہو گیا
جواز اللعن على من قتله	اور (نام کی تعین کے بغیر) نفس یہ مسئلہ
أو أمر به او اجازه ورضي	تو متفق علیہ ہے کہ جس نے حضرت حسین کو
به والحق ان رضى يزيد	قتل کیا ہو۔ یا جس نے اس کا حکم دیا ہو۔
بقتل الحسين واستبشاره	یا اس کارروائی کو جائز رکھا ہو اور
بذلك واهانته اهل	اس پر راضی ہوا ہو اس پر لعنت
بيت النبي عليه الصلوة	جائز ہے[1] اور حق یہ ہے کہ قتل حسین
والسلام مما تواتر معناه	پر یزید کی رضامندی اور اس سے اسکی
وان كان تفاصيلها احاداً	خوشی اور اہانتِ اہل بیت نبی علیہ الصلوٰۃ
فنحن لا نتوقف في شانه	والسلام معناً درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہو

(بقیہ حاشیہ صلاہ) الحاصل: حضرت ابو سعید خدریؓ والی روایت کے الفاظ کی مراد کی عین قیاس کے مطابق تبیین اور خود حضرت ابوہریرہ کی اُس مرفوع روایت سے متعلق زمانہ کی تعیین (جس کو حضرت مولانا محمد طیب نے دوسرے نمبر پر پیش کیا ہے) خود حضرت ابوہریرہ ہی کی اس مرفوع روایت سے اس طور پر ہو رہی ہے کہ اب ان روایتوں کو ستنہ ھ پر منطبق کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ واللہ اعلم بالصواب

[1] الفرقان: وہ مسئلہ میں تفصیل ہے، ملاحظہ ہو شرح فقہ اکبر۔

بل فی ایمانہ لعنۃ اللہ علیہ — اگرچہ اس کی تفصیلات کا درجہ اخبار احاد
وعلیٰ انصارہ واعوانہ — کا ہے۔ پس ہمیں یزید کو کچھ کہنے بلکہ اسکو
ایمان سے بھی خالی کہنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ لعنت ہو اللہ کی اس پر اور اس کے
انصار واعوان پر۔

پس تفتازانی تو یزید کی خوشی اور رضا بالقتل سے فسق کیا، یزید کا کفر ثابت کر رہے ہیں، نہ صرف ثابت کر رہے ہیں، بلکہ بے توقف اطلاق کر رہے ہیں۔ اور قسطلانی بلا نکیر یہ سب کچھ نقل کر رہے ہیں ——— تو کیا ہمارے محترم اور مخدوم مولانا جماعت دیوبند کو تفتازانی کے پیچھے پیچھے "عقیدۂ کفر" تک لیجائیں گے؟

ہمارے ناقص خیال میں بات وہی صحیح ہے کہ اس عبارت سے کسی عقیدہ سازی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ محض مولانا کو مغالطہ ہوا ہے' ورنہ' نہ تو تفتازانی یہاں کوئی عقیدہ بیان کر رہے ہیں اور نہ قسطلانی اسکو بلا نکیر نقل کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ قسطلانی کے بارے میں تو محض اس نقل کی بنیاد پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قتل حسینؓ کے بارے میں یزید کی رضا و خوشی تک ایک تاریخی واقعہ ہونے سے بھی اتفاق کر رہے ہیں اس لئے کہ ان کا اصل مقصد اس نقل عبارت سے محض مجوزین لعن کا موقف واضح کرنا ہے، اور وہ جس طرح مجوزین کا موقف واضح کر رہے ہیں اسی طرح اسکے بعد انھوں نے مانعین لعن کا موقف بھی بلا تردید پیش کیا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا جھکاؤ کس طرف ہے، پس یہ کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کس کی دلیل کو قبول کر رہے ہیں۔

ہمارے پیش نظر حضرت مولانا کی تصنیف پر کلام کرنے کی ضرورت اصلاً بس اسی حد تک تھی، کہ یزید کو فاسق یا کافر جو کچھ بھی چاہیے سمجھا جائے، اور ایک تاریخی کردار کے بارے میں ہر شخص کو اپنے علم کے مطابق رائے قائم کرنے کا حق ہے، مگر اس رائے کو " واجب التسلیم عقیدہ" نہ قرار دیا جائے۔ خود " واجب التسلیم " کا لفظ ہی کیا کم بھاری ہے کہ اس پر عقیدہ ——— نہ صرف عقیدہ ——— بلکہ " ایک متواتر عقیدۂ دجبر" کا اضافہ اور کیا جائے! یورپ کے ارباب کلیسا نے

اسی قسم کے غلو کا مظاہرہ کیا تھا جب انھوں نے زمین کے سکون اور سورج کی گردش جیسے خالص غیر دینی مسئلہ کو ایک دینی عقیدہ بنا کر اہل یورپ پر ٹھونسنا چاہا تھا۔ اس غلطی کا خمیازہ نہ صرف عیسائیت آجتک بھگت رہی ہے بلکہ اسکے ساتھ ساتھ دوسرے تمام مذاہب بھی مفت میں بھگت رہے ہیں۔ ایک شخص نے اگر یزید کو ولی اللہ ثابت کرنے کی کوشش کی تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم یزید کی مردودیت عند اللہ کو ایک واجب التسلیم عقیدہ قرار دیدیں۔ اس سے یہ تو ہرگز نہیں ہوگا کہ جو لوگ عباسی کے بیان سے متاثر ہوئے ہیں، وہ استغفار کرتے ہوئے تائب ہو جائیں۔ اس کا اصل نتیجہ اسی طرح کا ہوگا جس طرح کا نتیجہ یورپ میں ارباب کلیسا کی اسی قسم کی غلطی پر نکل چکا ہے ـــ اور اللہ اسلام اور خادمان اسلام کو محفوظ رکھے، کہ یہ بہت ہی برا نتیجہ ہے۔

ہم نے اپنے ایک مخدوم و محترم بزرگ کے سامنے لب کشائی کی یہ جرأت اسی احساس کے ماتحت کی ہے کہ دین کو عموماً اور حاملان دین کی اس مقتدر جماعت دیوبند کو خصوصاً جس پر اپنی خدمات حقہ کی بنا پر آج اہل ہند و پاک کی عظیم اکثریت دینی اعتماد رکھتی ہے، خدانخواستہ اسی طرح کا کوئی حادثہ پیش نہ آئے، جو مآل کار دین ہی کی طرف راجع ہو جاتا ہے، اور اس کا بھی اصل نقصان دین ہی کو پہنچتا ہے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس کتاب پر کلام کرنے کا اصل تقاضہ تو ہمیں بس اسی حد تک تھا، لیکن جب یہ جرأت کی گئی تو کوئی مضائقہ نہیں کہ چند باتیں حضرت مولانا کی توجہ کے لیے اور بھی عرض کر دی جائیں۔

(۱)

مولانا نے تفتازانی کی عبارت سے استشہاد کرتے ہوئے ـــ جیسا کہ اوپر منقول ہوا ـــ فرمایا ہے کہ

"پھر جبکہ تفتازانی فسق یزید کو جو جواز لعن سے واضح ہے متفق علیہ اور اس واقعہ رضا بالقتل کو معناً متواتر بھی فرما رہے ہیں تو ان دونوں ائمہ حدیث و کلام کے نزدیک یہ بطور ایک متواتر عقیدہ و چیز کے واجب التسلیم ہوتا ہو۔ جو دو کا مسئلہ نہ رہا بلکہ اجماعی بات ہوگئی"

ہم گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ تفتازانی کی مذکورہ بالا عبارت میں یزید پر بالتعیین لعنت کے جواز کو متفق علیہ نہیں بتایا گیا ہے بلکہ اسے صرف بعض کا قول بتایا گیا ——— ملاحظہ ہو تفتازانی کی پوری عبارت جو ہم نے نقل کی ہے ——— اور اس "بعض کے متعلق" نقل میں اولاً تو فنی اعتبار سے جو سقم ہے اُسے ملا علی قاریؒ شارح فقہ اکبر سے سنئے۔ فرماتے ہیں:-

ولا یخفیٰ ما فی نقلہ	اور اس نقل میں یہ فنی کمزوری صاف
حیث ابھم فی قائلہ	ظاہر ہو کہ قائل کو مبہم رکھا گیا ہے۔
(شرح فقہ اکبر ص۸۵[1])	

پھر ان بعض کے قول کی جو وجہ تفتازانی بیان کرتے ہیں اس پر بھی ملا علی قاریؒ کی جرح قابل ملاحظہ ہے

ثم تعلیلہ یحتاج الیٰ اثبات	پھر اس قول کی جو علت بیان کی گئی ہے
امرہ بقتل الحسین اولاً	اسکے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے
ثم ترتب کفرہ علیہ ثانیاً	یزید کا امر (حکم) بقتل الحسین ثابت کیا جائے
وکلاھما ممنوع۔	ثانیاً یہ ثابت ہو کہ اس حکم سے کفر لازم آتا
(ایضاً)	ہو اور یہ دونوں کی دونوں باتیں ثابت نہیں
	کی جا سکتیں۔

اسکے بعد تفتازانی کے اس قول کو بھی جس پر حضرت مولانا مدظلہ نے فسق یزید کے عقیدہ متواتر کی بنیاد رکھی ہے، شارح فقہ اکبر اس طرح رد فرماتے ہیں۔

ثم دعواہ انہ مما	رہا علامہ تفتازانی کا یہ دعویٰ کہ قتل حسین
تواتر معناہ فقد سبق	ے یزید کی رضامندی اور خوشی تواتراً ثابت
انہ لا یثبت اصلاً فضلاً	ہے۔ تو ہم بتا چکے ہیں کہ یہ نام کو بھی ثابت نہیں
عن التواتر قطعاً (ایضاً ص۸۵)	چہ جائیکہ تواتر قطعی کا دعویٰ۔

[1] شرح فقہ اکبر مطبوعہ مطبع حنفی کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں کتابت کی غلطی سے صفحہ پر ۸۰ کا ہندسہ پڑا ہے مگر صحیح ۸۵ ہے۔

(۲)

مولانائے محترم نے تفتازانی کے دعوائے "رضا بقتل الحسین والاستبشار" کی تائید کے لئے بعض تاریخی روایات بھی بیان فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید واقعی اس واقعہ سے راضی اور بہت ہی خوش تھا۔ ہمارا احساس یہ ہے کہ حضرت مولانا اس باب میں بغض یزید کے جذبہ میں اس کے ساتھ بڑی زیادتی فرماگئے ہیں۔ جو جماعت دیوبند کے محتاط اکابر کی شان نہیں ہے اور وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی[1] کے منصوص حکم کے خلاف ہے۔ جہاں سے مولانا یہ اپنے رجحان کی مؤید روایات لے رہے ہیں، وہیں اسکے خلاف روایات بھی موجود ہیں، اُن کا بھی آخر کچھ حق ہے۔

ہر چند کہ مولانا کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ رہا ہے کہ "جو تاریخی روایتیں قدحِ یزید کے حق میں ہیں وہ چونکہ وحی کے اشارات کی مؤید ہیں اس لئے قابل قبول ہوں گی۔ اگرچہ تاریخی معیار سے کچھ کمزور ہی ہوں" (ص۱۴۲) لیکن ان روایات سے استشہاد میں ایسا رویہ تو ہمارے بزرگوں کی شانِ تقویٰ کے کسی طرح مطابق نہیں کہ مخالف روایتوں پر بالکل پردہ ہی پڑجائے۔ مولانا اولاً اسکی خوشی اور بعدہٗ پچھتاوا ظاہر کرنے والی ایک روایت البدایہ والنہایہ سے پیش کرکے فرماتے ہیں۔

"اگر قتل حسین سے رضا و خوشی نہ ہوتی تو باول وحلہ بے ساختہ اسکی زبان سے وہ لفظ نکلتے جو آخر میں سوچ سمجھ کر اس نے اپنی رسوائی کے خیال سے نکالے" (ص۱۴۳)

اس سے صاف یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں کوئی مخالف روایت ہے ہی نہیں حالانکہ اولاً تو اسکی صریح مخالف روایت خود ابن کثیرؒ ہی نے نقل کی ہے، کہ جب کوفہ سے شہداء کے سرلے کر قاصد پہنچا اور یزید کو بشارت فتح دیدیتے ہوئے ان بدبختوں نے یہ سر یزید کے سامنے پیش کئے

فدمعت عینا یزید بن معاویۃ وقال کنت ارضی من طاعتکم

---

[1] یہ قرآن کریم کی آیت ہو۔ ترجمہ یہ ہے ــــــ اور تم کو کسی کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اسکے ساتھ ناانصافی کرو۔ (خبردار!) انصاف کی روش پر گامزن رہو کہ شانِ تقوے کے یہی مناسب ہو۔

بدون قتل الحسین۔ لعن اللہ ابن سمیہ اما واللہ لو انی صاحبہ لعفوت عنہ ورحم اللہ الحسین الخ (البدایہ والنہایہ صـ۱۹۱)

تو یزید کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے کہا (بدبختو) میں قتل حسین کے بغیر بھی تمہاری فاداری پر راضی تھا۔ اللہ اس ابن سمیہ (ابن زیاد) پر لعنت کرے، خدا گواہ ہے اگر حسین کا سابقہ مجھ سے پڑتا تو میں ان سے درگذر کرتا۔ بہرحال اللہ حسین پر رحمت فرمائے۔

دوسرے مولانا کی ذکر فرمودہ روایت کو ابن کثیر (صاحب البدایہ والنہایہ) نے "قیل" کے لفظ سے مرجوحیت کے پیرایہ میں نقل کیا ہے، اور اسکے مقابلہ میں (مخالف) روایت کا ذکر اوپر کی سطروں میں ترجیحی انداز سے کیا ہے ۔۔۔ اور جو شخص بھی ان دونوں روایتوں کو فنی اعتبار سے جانچے گا قطعی طور پر اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ دوسری روایت قوی ہے۔ خواہ درایۃً کسی کا رجحان کچھ بھی ہو۔

بہرحال حضرت مولانا نے اس مخالف روایت کو جو روایۃً قوی بھی تھی، یکسر پس پشت ڈال کر بلزم کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

علامہ تفتازانی کے دعوے کی بڑی زبردست تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سر مبارک جب یزید کے پاس لیجایا گیا تو اس نے ابن زیاد والی گستاخی کی۔ مولانا نے ان روایتوں کے ثبوت پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ ہماری گزارش اس سلسلہ میں حضرت مولانا سے یہ ہے کہ فسق یزید کے بارے میں وحی کے جو اشارات آنمحترم نے سمجھے ہیں انکا تقاضہ اگر یہ ہے کہ دنیا کی ہر برائی اور بدبختی جس کی گنجائش ملتی ہو، یزید کی طرف ضرور منسوب کی جائے، تب تو بات دوسری ہے، ورنہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یزید کے پاس سر کا پہنچنا ہی سرے سے مختلف فیہ ہے۔ کسی گستاخی کی بات تو بعد کی ہے، مولانا نے ابن کثیر کے حوالہ سے اس اختلاف کا ذکر فرمایا ہے اور پھر ابن کثیر ہی کے رجحان اور بعض محدثانہ روایات کے بنیاد پر سر لیجائے جانے کا جزم حاصل کر لیا ہے، مگر یہ دونوں بنیادیں مجروح ہیں۔ ابن کثیر کے رجحان کی بات یہ ہے کہ جہاں سے مولانا نے ان کا رجحان یہ سمجھا ہے کہ سر یزید کے پاس لیجائے جانے کا قول انکے

نزدیک صحیح ہے، وہاں انھوں نے اس قول کو "اظہر" اور دوسری جگہ (ص۲۰۲ پر) اسی سے ملتے جلتے لفظ میں ——— "اشہر" قرار دیا ہے۔ لیکن بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ ص۱۶۵ پر انھوں نے اس معاملہ میں یہ لکھا ہے:۔

قلت والصحیح انہ لم	میں کہتا ہوں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ابن زیاد
یبعث براس الحسین	نے حضرت حسین کا سر شام نہیں بھیجا
الی الشام	تھا۔

علیٰ ہذا محدث ابن ابی الدنیاؒ کی جو روایت مولانا اسکی تائید میں پیش فرماتے ہیں۔ اس میں سر مبارک کے ساتھ یزید کی مبینہ گستاخی حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کی موجودگی میں دکھائی گئی ہے اور یہ کہ انھوں نے اس پر یزید کو ٹوکا۔ اس پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ جیسے صاحب نظر محقق اور ناقد کی یہ تنقید ہے کہ اس زمانہ میں حضرت ابو برزہ اسلمیؓ ہرگز شام میں نہیں تھے۔ وہ عراق میں تھے۔ (جیسے زید بن ارقمؓ اور انس بن مالکؓ وغیرہ (جن کے متعلق آتا ہے کہ انھوں نے ابن زیاد کو سر مبارک کے ساتھ گستاخی کرنے پر ٹوکا تھا[له]) اور یزید عراق میں نہیں، شام میں تھا۔ (رسالہ رأس الحسین ص۳۱) امام ابن تیمیہ نے صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور پورے حزم و وثوق کے ساتھ یہ فیصلہ دیا ہے۔

فقد تبیّن انّ القصۃ	کہ اب یہ بات بالکل صاف ہے کہ یزید
التی یذکرون فیھا	کے پاس سر لے جانے جانے اور
حمل الرأس الی یزید	چھڑی سے اس کے ٹھونگے مارنے کا
ونکتہ بالقضیب کذبوا	جو قصہ بیان کیا جاتا ہے یہ بالکل جھوٹ
فیھا (ایضاً ص۲۵)	ہے۔

[له] امام موصوف نے اسی جگہ یہ بھی بتایا ہو کہ "مسند احمد کی روایت میں ان بزرگ کا نام جن کے سامنے ابن زیاد نے (کوفہ میں) سر مبارک کے ساتھ گستاخی کی تھی اور انھوں نے اس پر ٹوکا تھا، ابو برزہ اسلمیؓ منقول ہے"۔ ہمارے خیال میں اسی سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ابن ابی الدنیا کی روایت میں کسی سے سہو ہوا ہو ورنہ اصل میں وہ ابن زیاد ہی سے متعلق تھی۔

الغرض یہ تو وہ رخنے ہیں جو صرف اسی دعوے میں پڑجاتے ہیں کہ سر یزید کے پاس لیجایا گیا تھا لیکن اگر یہ ثابت ہو بھی جائے کہ سر یزید کے پاس لیجایا گیا تھا تو اس بات کا یقین حاصل کرنا تو بہت ہی کٹھن ہے کہ یزید نے سر کے ساتھ کوئی گستاخی کی اس لئے کہ اسکے مقابلہ میں خود ایک شیعی راوی ہشام بن محمد کلبی کی وہ روایت موجود ہے جس میں بجائے گستاخی کے آنکھوں میں آنسو بھر آنا اور قاتلین پر لعنت کرنا منقول ہوا ہے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ ص۱۹۱ کے حوالہ سے ابھی الفاظ گزرے۔

واضح رہے کہ اس گفتگو سے ہمارا مقصد صرف اس پہلو کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یزید کے پاس سر لیجائے جانے اور پھر یزید کا اسکے ساتھ گستاخی کرنے کا دعویٰ بہت مخدوش ہے۔ ایسی صورت میں اس بنیاد پر کوئی شرعی حکم لگانا کہاں تک مناسب ہوگا؟

(۳)

مولانا مدظلہٗ نے یزید پر لعن کو جائز رکھنے والوں کے اقوال بھی اسکے فسق شدید کے ثبوت کے طور پر نقل فرمائے ہیں۔ مولانا نے اگرچہ خود تو شغل لعن سے بچنے ہی کو پسند فرمایا ہے مگر ہمیں بہت افسوس یہ دیکھ کر ہوا کہ ایک طرف تو مجوزین کی عبارتوں کو اس زور شور سے پیش کیا گیا ہے کہ مولانا کے جو عقیدتمند عوام لعنت کو محض اہلسنت کے مزاج کے خلاف اور ایک بھاری بات سمجھ کر اس شغلِ مہلک سے بچتے رہے ہوں گے خدانخواستہ وہ ان عبارتوں کی اس غیر لفظی تحسین و تائید سے متأثر ہو کر شیعہ حضرات کی لے میں لے ملا سکتے ہیں۔ دوسری طرف مانعین لعن کے مسلک کی صرف یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ

> "اور بعضوں نے لعنت سے روکا ہے وہ ان کے (مجوزین کے) اثبات جواز کے منکر نہیں۔ یعنی ایک فریق یزید کو مستحق لعنت بتلاتا ہے اور دوسرا شغلِ لعنت کو پسند نہیں کرتا۔" (ص۱۳۳)

مانعین کے مسلک کی یہ حقیقت کہ جواز کے تو وہ منکر نہیں البتہ اس شغل کو پسند نہیں کرتے)۔۔

امام غزالیؒ کے اِن الفاظ سے نکالی گئی ہے کہ

فی لعن الاشخاص خطرٌ	لوگوں پر لعنت کرنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے (پس اجتناب بہتر ہے) اور لعنت سے
فلیجتنب ولا خطر فی السکوت	زبان روکنے میں تو ابلیس کے بارے میں

عربی	ترجمہ
عن ابلیس فضلاً عن غیرہ	بھی کوئی خطرہ نہیں چہ جائیکہ کسی اور
(شہید کربلا صـ۱۲۳ بحوالہ احیاء العلوم)	کا معاملہ؟

بے ادبی معاف ہو یہ مانعین لعن اور اُن کے زبردست وکیل حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمۃ کے ساتھ حضرت مولانا کی سخت زیادتی ہے۔ امام غزالی نے اس موقع پر اولاً لعن فاسق کے عدم جواز پر دلالت کرنے والی ایک حدیث بیان کی ہے۔ اسکے بعد لکھا ہے:۔

عربی	ترجمہ
وھذا ایدل علی انّ لعن	یہ حدیث بتاتی ہے کہ کسی فاسق پر تعین
فاسق بعینہ غیر جائز	کے ساتھ لعنت کرنا ناجائز ہے۔

اسکے بعد فرماتے ہیں۔

عربی	ترجمہ
وعلی الجملۃ ففی لعن الاشخاص	اور مختصرات یہ ہے کہ شخصی لعنت ایک پر خطر
خطرٌ فلیجتنب الخ	کام ہو۔ پس اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ الخ

اسکے بعد لکھتے ہیں:۔

عربی	ترجمہ
فان قیل ھل یجوز لعن یزید	اگر کہا جائے کہ کیا یزید پر لعن جائز ہے۔
لکونہ قاتل الحسین او آمرٌ	کیونکہ وہ قاتل حسین یا قتل کا حکم دینے والا
بہٖ قلنا ھذا لم یثبت اصلاً	ہے؟ ـــ میں کہوں گا کہ لعن کے جواز کا
فضلاً عن لعنہ الخ	تو ذکر ہی کیا، یہ دعویٰ ہی سرے سے ثابت
(احیاء العلوم صـ۱۲۵)	نہیں ہو کہ اس نے قتل کیا یا حکم دیا تھا۔

یہ ہو امام غزالی کا موقف متعیّن اشخاص پر لعنت اور خاصکر یزید پر لعنت کے بارے میں! پس کیونکر ان کے موقف کی وہ تعبیر ہوسکتی ہے جو حضرت مولانا نے فرمائی ہے؟

مولانا کو جماعت دیوبند کا ایک ذمہ دار بزرگ ہونے کی حیثیت سے جواز لعن یزید سے اتنی دلچسپی تو نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ مانعین کا (جن میں سے ہم سمجھتے ہیں اکابر دیوبند بھی ہیں) مسلک ہی کچھ سے کچھ کردیتے۔ صاف بات ہے کہ مولانا کے نزدیک اگر یزید پر الزام ثابت ہے، جیساکہ ان کی پیش نظر کتاب سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ تفتازانی کے اتباع میں اس جرم پر کسی کا نام لے کر لعنت کے جواز کے قائل ہیں، تو ٹھیک ہے وہ اپنے متعلق یہی فرمائیں کہ "میں اثباتِ جواز

کا منکر نہیں ہوں ویسے اس شغل کو پسند نہیں کرتا۔" لیکن مانعین کے بھی زمرہ میں رہنے کے لئے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ جیسے بے لاگ مانعین کے مسلک حق کو مشتبہ نہ فرمائیں[1]۔

حرفِ آخر ہم آخر میں ایک بار پھر اپنی اس بات کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی یہ تصنیف آں موصوف کے ذاتی مسلک کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہوتی تو ہم اپنے مذاق کے مطابق ادب کو مقدم رکھتے ہوئے یہ تنقیدی جسارت نہ کرتے، لیکن جب اس کو "جماعت دیوبند کے متفقہ مسلک کی ترجمانی" کا لیبل لگا کر شائع کیا گیا ہے۔ تو یہ جسارت ہمارے لئے ایک ذاتی ذمہ داری بھی بن گئی اور جماعت سے وفاداری کا تقاضہ بھی ہم نے یہی سمجھا، کہ جہاں تک ہوسکے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے یہ جسارت کر گزریں[2]۔ اسی لئے ہم نے صرف انھیں چند باتوں سے تعرض کیا ہے جن سے تعرض کرنا اپنے اس نقطۂ نظر سے ہمارے لئے ناگزیر تھا۔ ورنہ علمی اعتبار سے ہمیں اس کتاب کی اور بھی بعض باتوں سے اختلاف تھا ——— ہماری اس تنقید کی روح اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدحِ حسینؓ تو بے شک ہمارا اور ہمارے اکابر کا دین و ایمان ہے۔ لیکن قدحِ یزید سے دلچسپی اور اسکی آخرت خراب کرنے کی فکر ہمارے بزرگوں کا مذاق نہیں۔ یہ اسی گروہ کو مبارک ہو جو قدح کے بغیر اپنا دین مکمل نہیں سمجھتا۔

---

[1] یہاں یہ بھی سن لیجئے کہ ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر اور شرح شفا قاضی عیاض میں صراحۃً اسی مسلک کو جمہور اہل سنت کا مسلک بتایا ہے۔ شرح شفا کے الفاظ ہیں۔ لکن جمهور اهل السنة لایجوّزون لعنه (بعض علماء یزید پر لعنت کو جائز کہتے ہیں۔ لیکن جمہور اہل سنت اس پر لعنت جائز نہیں کہتے۔) ص۵۵۶

[2] یہاں ہم یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اس کتاب کے سلسلہ میں ہم نے جماعت کے بعض بلند پایہ اہل علم سے بھی خط و کتابت کی ہے اور یہ جاننے کے بعد ہی کہ اس کتاب کے متعلق ان کے احساسات بھی ہمارے ہی جیسے ہیں، اس جسارت پر ہم نے خود کو آمادہ کیا ہے۔

معانقۂ عیدین

معانقۂ عیدین کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہو لیکن بعض عوام اس کو غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں، جیسا کہ ذیل کے استفتاء سے معلوم ہوگا۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اس استفتاء کا جواب شائع کیا جا رہا ہے جس پر ہندوستان کے مشہور قدیم علمی و فقہی مرکز "فرنگی محل" کی بھی تصدیق ثبت ہو۔ وفقنا اللہ لما یحب ویرضیٰ ــــــ

واضح رہے کہ استفتاء الفرقان کا مستقل باب نہیں ہو۔ اس لیے ضرورت مند حضرات اس خدمت کے لیے الفرقان یا صاحب الفرقان کو یاد نہ فرمائیں۔ ورنہ حسب معمول جواب معذرت میں ہوگا۔ ــــــ (ادارہ)

باسمہ سبحانہ۔ حامداً و مصلیا و مسلما

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

ہندوستان میں اکثر مقامات پر عیدین میں معانقہ کا رواج ہے۔ بعض مشہور علمائے کرام کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اس کو شرعاً ثابت نہیں سمجھتے اس لیے ان کا عمل اس کے مطابق نہیں ہے۔ ان علماء کرام سے عقیدت رکھنے والے اور ان پر دینی اعتماد کرنے والے بعض عوام کا طرز عمل بھی یہی ہو۔ لیکن دوسرے بعض عوام اس مسئلہ پر اتنا تشدد کرتے ہیں کہ معانقہ نہ کرنے والوں کو ایذائیں دیتے ہیں۔ ان کے خلاف دوسرے لوگوں کو بھڑکاتے ہیں اور بعض مقامات پر ان کے بائیکاٹ تک بھی نوبت پہونچی ہے۔ دریافت طلب یہ ہو کہ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہو اور جس تشدد کا اوپر ذکر کیا گیا ہو اس کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عیدین کے معانقہ کا رواج جس کا سوال میں ذکر کیا گیا ہو اس عاجز کے نزدیک ان امور میں سے ہو جن کی کوئی شرعی اصل تو نہیں ہو لیکن

کسی زمانہ میں ان کا رواج شروع ہوا اور بہت سے حضرات نے یہ دیکھ کر کہ اس میں کوئی خاص قباحت نہیں ہے بلکہ بظاہر اظہار میل و محبت کا ایک اچھا جائز طریقہ ہے، اس لیے بدعت حسنہ ہے، اسکو اپنا لیا اور اسکی تصویب فرمائی اور اس طرح اس نے ایک مقبول عام دینی رسم کی شکل اختیار کر لی اور جو علماء بدعت حسنہ کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں اور اس بنا پر وہ کسی ایسی چیز کے دینی رسم کی حیثیت سے رائج ہونے کو صحیح نہیں سمجھتے جسکے لیے کوئی اصل شرعی موجود نہ ہو انھوں نے اسکو نہیں اپنایا بلکہ اس سے اختلاف کیا، یہ چیز خاکپائے علماء دیوبند کے سلک کے سالکوں میں ہے لیکن میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ایسے کسی مسئلہ میں کسی طرف سے کوئی تشدد نہ ہو ہمارے اسلاف میں ایسے سیکڑوں مسئلوں میں رائے کا اختلاف رہا ہے بلکہ ایسا اختلاف قطعاً ناگزیر ہے خود میرا طرز عمل یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان بھائی مجھ سے معانقہ کرنا چاہتا ہے تو میں دکھا انکار کرکے اس کا دل دکھانا اپنے لیے گناہ سمجھتا ہوں، میں کہہ دیتا ہوں کہ بھائی لوگوں نے آج کے اس معانقہ کو فرض واجب سا بنا لیا ہے اور میں اس کو ٹھیک نہیں سمجھتا ہوں اسلیے آج تو معاف کر دو، تمہارا مجھ پر قرض رہیگا کسی اور دن آؤ تو بجائے ایک دفعہ کے انشاءاللہ دو دفعہ معانقہ کرکے تمھیں خوش کرنے کی کوشش کروں گا میرا عام تجربہ ہے کہ میرے اس طرز عمل سے کسی کا دل نہیں دکھتا بلکہ وہ خاموش معانقہ سے زیادہ میری اس بات سے خوش ہو جاتا ہے، سوال میں جس تشدد کا اور مقاطعہ کا ذکر کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ شرعی حیثیت سے تو بالکل ہی ناجائز ہے، جو علماء کرام اس معانقہ کو فعل حسن اور بدعت حسنہ قرار دیتے ہیں وہ بھی یقیناً اس تشدد اور مقاطعہ کو ناجائز ہی کہیں گے ایسے کسی اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کا تفرق اور کسی مسلمان کی توہین اور ایذا رسانی اور اس کا مقاطعہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی ناراض کرنیوالی اور شیطان کو بہت ہی خوش کرنیوالی اور بڑی بدنصیبی کی بات ہے، ایسے اختلافات میں دینداری و خدا پرستی کا کوئی ذرہ نہیں ہوتا یہ باتیں صرف جہالت و نفسانیت سے ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو شیطان کے مکر و فریب سے بچائے اور اپنی مرضیات کا پابند بنائے۔

محمد منظور نعمانی، ۵ شوال المکرم ۱۳۷۹ھ

واقعی عیدین کے موقع پر معانقہ کی شرعاً کوئی اصلیت نہیں ہے جو علماء معانقہ کے جواز کے قائل ہیں وہ بھی اسکو بدعت حسنہ میں سے قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلہ میں علماء میں خود اختلاف ہے۔ اسلیے ایسے مختلف فیہ مسائل میں باہم تشدد اور سختی کسی طریقہ سے درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد قائم عبدالقیوم عفی عنہ۔ فرنگی محل، لکھنؤ

فہرست کتب

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ملاحظہ فرما لیجئے:-

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اردو میں لکھیے، اور اگر ہو سکے تو انگریزی میں بھی لکھ دیجئے۔

(۲) اگر آپ ایک دو روپئے کی کتابیں منگوائیں گے تو محصول ڈاک کا بار بہت زیادہ پڑ جائے گا۔ اور اگر زیادہ منگوائیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوائیں گے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے کم ہو جائے گا۔ اور آپ نفع میں رہیں گے

(۳) اگر کتابیں زیادہ ہوں گی تو ہم آپ کی مزید کفایت کے خیال سے ریلوے کے ذریعہ بھیجنا پسند کرینگے، اسلیے آپ زیادہ کتابوں کا آرڈر دیتے وقت اپنا ریلوے اسٹیشن ضرور لکھیے اور اردو کے ساتھ انگریزی حروف میں بھی لکھیے۔

(۴) پہلی مرتبہ آرڈر دینے کی صورت میں کم و بیش بیس روپے کے آرڈر پر ¼ رقم ضرور پیشگی بھیجئے۔

(۵) پارسل کھول کر اگر آپ کو کوئی بات قابل شکایت نظر آئے تو براہ کرم بدگمانی نہ کیجئے ہمیں لکھیے ہم آپ کی شکایت کی مناسب تلافی کرنا اپنا فرض سمجھیں گے اور اگر کوئی کتاب بدل جائے یا کم ہو تو ہمیں مطلع کرنا اپنا فرض سمجھئے۔

پاکستانی احباب کے لیے مخصوص ہدایات:-

(۱) اگر آپ کو ہماری مطبوعات منگوانی ہوں تو ان کی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے، پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور ۲ رجسٹری فیس فی پیکٹ کا اضافہ کر کے کل رقم بذریعہ منی آرڈر "ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور" کے نام روانہ کر دیجئے اور ڈاکخانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیج دیجئے، یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو فوراً روانہ کرا دی جائیں گی۔

(۲) دوسروں کی مطبوعات ہم سے طلب کرنا ہوں تو رقم بھیجنے سے پہلے ہم سے رجوع کیجئے۔

(۳) یاد رکھیے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے تو ہندوستان سے پاکستان جا سکتے ہیں لیکن ایک کتاب کے زیادہ نسخے نہیں جا سکتے۔

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات ایک نظر میں

اسلام کیا ہے؟ اردو ۲/۸ مجلد -/۳	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے مجلد -/۴	سعادت الحدیث اول مجلد -/۵ غیر مجلد -/۴	سعادت الحدیث دوم مجلد ۵/۸ غیر مجلد ۴/۸
دین و شریعت مجلد -/۳	حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ۲/۸ مجلد -/۳	ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ ۱/۸	تذکرہ مجدد الف ثانیؒ مجلد -/۴
مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ زیر طبع	آپ حج کیسے کریں؟ مجلد -/۲	آسان حج -/۴/-	کلمۂ طیبہ کی حقیقت -/۶/-
نماز کی حقیقت -/۱۲/-	برکات رمضان -/۱۲/-	انیس نسواں -/۱۰/-	دجالی فتنہ اور سورہ کہف ۱/۸
نظام سرمایہ داری -/۸/-	فیصلہ کن مناظرہ -/۱	شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور اہل بدعت کے الزامات ۱/۴/-	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ -/۶/-

دیگر اداروں کی خاص خاص مطبوعات

تفسیریں اور قرآن مجید سے متعلق دوسری کتابیں، اردو میں

تفسیر ابن کثیر اردو حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کی تفسیر جو عربی تفسیروں میں بھی مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر وہ پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے پھر صحابۂ کرام، تابعین اور بعد کے ائمہ تفسیر کے ارشادات سے۔ یہ اس کا مکمل اردو ترجمہ ہے، پانچ ضخیم جلدیں ہیں
قیمت مجلد، مکمل سٹ -/۵۵

درس قرآن قرآن کی پہلی منزل یعنی ۵½ پارے کی عام فہم تفسیر، چھوٹے چھوٹے اسباق کی صورت میں۔
ہدیہ مجلد -/۱۰

قصص القرآن قرآن مجید میں جو بصیرت افروز اور عبرت آموز واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا مکمل مجموعہ، ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ چار جلدوں میں۔ از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ مجموعی صفحات ۱۴۴۴، جلد اول -/۴، جلد دوم -/۴، جلد سوم -/۴، جلد چہارم -/۴ (مجلد کی قیمت میں ایک روپیہ فی جلد کا اضافہ)

قصص و مسائل از مولانا دریا بادی -/۲

قرآنی شخصیتیں 〃 〃 〃 ۲/۴

جغرافیہ قرآنی 〃 〃 〃 ۱/۴

حیوانات قرآنی 〃 〃 〃 -/۲

فہم قرآن از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی جس میں قرآن فہمی کے اصولوں پر مدلل اور دلنشین بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۲۰۰
قیمت غیر مجلد ۲/۴

رہنمائے قرآن اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کو سمجھنے کے لیے اپنے انداز کی بالکل نئی کتاب .... -/۱

تدوین قرآن از مولانا سید مناظر احسن گیلانی جس میں قرآن کریم کے تحفظ کو تاریخی طور پر اس طرح بے غبار کر دیا ہو کہ اس کے بعد کوئی مغالطہ اور شک آفرینی آپ کو خلجان میں نہیں ڈال سکتی

قیمت مجلد - ۱/۸

قرآن اور تعمیر سیرت ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کے ۲۰ نہایت مفید مقالات کا مجموعہ۔ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے پڑھنے کی چیز ہو۔ صفحات ۲۲۰

قیمت غیر مجلد -/۵

لغات القرآن (کامل) اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح، چھ جلدوں میں

جلد اول ۴/۸ جلد دوم -/۵ جلد سوم ۴/۸ جلد چہارم -/۶ جلد پنجم ۶/۸ جلد ششم ۴/۸ (مجلد کی قیمت میں فی جلد ایک روپیہ کا اضافہ)

صحیح لغات القرآن از مولوی شہید الدین صاحب چھوٹے کتابی سائز کے ۴۱۶ صفحے۔ قیمت مجلد ۸/

کتب حدیث مترجم اور شروح احادیث اردو میں

بخاری شریف اردو اٹھ جلدوں میں مجلد قیمت مکمل -/۲۵

موطا امام مالک مترجم بخاری شریف سے بھی پہلا مستند مجموعہ حدیث ... ... قیمت -/۱۲

شمائل ترمذی مع خصائل نبوی شمائل ترمذی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا اور آپ کے عادات و اطوار کا ایک روایتی مرقع ہو۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی شرح خصائل نبوی کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے ... ... قیمت -/۲

مشکوٰۃ شریف اردو مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتبخانہ کا انتخاب کہا جا سکتا ہو۔ اس کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں قیمت مکمل مجلد -/۱۶

نور المصابیح ترجمہ زجاجۃ المصابیح حیدرآباد کے مولانا ابو الحسنات سید عبد اللہ شاہ صاحب کے حنفی نقطۂ نظر سے مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر مرتب کردہ مجموعۂ حدیث (زجاجۃ المصابیح) کی جلد اول کا اردو ترجمہ۔ قیمت -/۴

مشارق الانوار مترجم بخاری اور مسلم کی ۲۲۴۲ قولی احادیث کا گرانقدر اور مقبول و معروف مجموعہ مجلد -/۱۵

حصن حصین رسول پاکؐ سے منقول دعاؤں کا مستند اور مقبول مجموعہ مجلد -/۵

مختصر شعب الایمان اردو از امام بیہقی قیمت -/۱

مختصر خصائل نبویؐ قیمت ایک روپیہ

لغات الحدیث از مشہور خادم حدیث مولانا وحید الزماں صاحب کی مرتب کردہ لغات حدیث (عربی سے اردو) چھ جلدوں میں سے چار جلدیں

قیمت فی جلد مجلد -/۱۲

صحیفۂ ہمام بن منبہؒ حضرت ہمام بن منبہؒ مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتابی شکل میں جمع کر لیا تھا لیکن یہ کتاب ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی ہمارے زمانے کے مشہور اسلامی محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس کتاب کا ایک نسخہ کسی طرح ڈھونڈھ نکالا اور پھر اس کو مع ترجمہ

لئے ایک فاضلانہ مقدمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ المولی تحفہ۔ قیمت ۸/۳

ترجمان السنہ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مدینہ طیبہ

یہ احادیث کا ایک جدید مجموعہ ہو جسے حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ایک خاص ترتیب پر مرتب کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک پورا اسلامی کتب خانہ ہو اور کسی تعلیم یافتہ مسلمان کو خواہ وہ جدید تعلیم کا حامل ہو یا قدیم تعلیم کا اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اب تک تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ جلد اول -/۱۰ دوم -/۹ سوم -/۱۰ (مجلد کی قیمت میں فی جلد دو روپے کا اضافہ)

علم الحدیث

از مولانا عبداللہ العمادی۔ باوجود مختصر ہونے کے اپنے موضوع پر نہایت مفید کتاب ہو جس میں حدیث کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات کا جواب بھی مل جاتا ہو۔ قیمت ۴/۱

تدوین حدیث

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی تدوین حدیث کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ احادیث کا جو ذخیرہ ہم تک پہونچا ہو وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقہ پر پہونچا ہو کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں۔ قیمت مجلد ۸/۶

تاریخ و سیرت

اصح السیر

مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی نہایت مستند سیرت نبوی مجلد -/۱۲

رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب جیسے سلامی محقق کے قلم سے، جو آنحضرت کی سیاسی بصیرت کے ایک ایک گوشے کو روشنی میں لاتی ہے۔ مجلد قیمت -/۵

اسوۂ حسنہ جلد اول

از مولانا ظفرالدین صاحب۔ مصائب سرور کونین کا مفصل بیان۔ -/۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات

یعنی شاہان عالم عرب کے حکمرانوں قبائلی سرداروں کے نام آپ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات ــــ از سید محبوب رضوی ...... قیمت -/۴/۲

عہد نبویؐ کے میدان جنگ

جس میں غزوات نبویؐ پر فن حرب (جنگی سائنس) کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ متعدد جنگی میدانوں کے نقشے بھی شامل کتاب ہیں۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب۔ ۸/۱

سیرت پاک

از مولانا بشیر محمد شارق دہلوی مصنف گو مشہور و معروف نہیں ہیں۔ مگر کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سیرت پر اس سے زیادہ کامیاب کتاب شاید ہی اس وقت کوئی اور ہو۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ قیمت ۴/۱

صدیق اکبرؓ

از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مولانا شبلی کی الفاروق کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبرؓ کا جو خلا محسوس ہوتا تھا مولانا اکبرآبادی کی اس کتاب نے اسکو کما حقہ پر کر دیا ہو۔ قیمت -/۶

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

اسلامی تاریخ کا ایک نادر و نایاب اور ایک بیش بہا دستاویز جسے ایک ریسرچ اسکالر نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہو۔ ۳۰۰ سے اوپر خطوط ایک حصہ میں خالص اردو اور دوسرے حصہ میں عربی متن، ہر قیمت پہ خریدنے کے لائق۔ مجلد -/۱۲، غیر مجلد -/۱۱

معاویہؓ

مصری مصنف عمر ابوالنصر کی تالیف کا ترجمہ۔ قیمت -/۳

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحؒ مجلد -/۱۲

تاریخ ملت

شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ عہد رسالت سے سلاطین ہند تک قیمت مکمل سٹ (گیارہ حصوں میں) غیر مجلد ۸/۳۱ مجلد -/۴۴

تاریخ دعوت و عزیمت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، خلافت راشدہ کے بعد اسلام کی حقیقی دعوت اور اس کی نصرت و حمایت کے لیے کون کون سی اہم شخصیتیں کس کس وقت میدان میں آئیں اور انھوں نے کیا کیا کارنامے کس کس نہج سے انجام دیئے۔ یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ جلد اول پہلی

صدی ہجری سے ساتویں صدی تک، جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہ نیز ان کے تلامذہ کی خدمات و حالات کے بیان میں۔

قیمت علی الترتیب -/۶ - ۶/۸

مقدمہ ابن خلدون

فلسفۂ تاریخ کے مؤسس اور عظیم اسلامی مؤرخ علامہ ابن خلدون کی تاریخ کا شہرۂ آفاق مقدمہ جسکی عظمت آج تک کم نہیں ہوسکی۔ اردو زبان میں متعلقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین۔ قیمت صرف -/۱۵

بستان المحدثین اردو

کتب حدیث کا تعارف اور محدثین کرام کا تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے قلم سے۔ مجلد -/۵

تاریخ مشائخ چشت

از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی سلسلۂ چشتیہ کی نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ نیز تصوف اور خاص کر چشتی کے سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں۔ قیمت غیر مجلد -/۱۲، مجلد -/۱۳

تذکرۂ شیخ محمد طاہر پٹنی

ہندستان کے جلیل القدر محدث کا تذکرہ۔ قیمت مجلد ۱/۸

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ موصوف ہندستان کی نہایت اہم علمی و دینی شخصیتوں میں سے ایک ہیں ان کی سوانح حیات کی کمی کو اس تحقیقی کتاب نے پورا کر دیا ہے (ایضاً از پروفیسر نظامی) قیمت مجلد -/۷

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی مشہور و معروف تحریک اور اس کے خصوصاً اُس دور کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں، جو مشہد بالاکوٹ کے بعد سے تعلق رکھتا ہو۔ مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم ... قیمت ۲/۸

تذکرۂ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے عجیب و غریب حالات۔ دل میں اتر جانے والا انداز بیان اور دیکھنے کے قابل کتابت و طباعت۔ غرض ہر لحاظ سے ایک پسندیدہ کتاب۔ قیمت مع جلد صرف ۲/۸

حیات انور

یعنی حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ کی حیات مبارکہ پر ان کے مایۂ ناز تلامذہ کے گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ -/۴

تاریخ دیوبند

قصبۂ دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخ از سید محبوب رضوی

قیمت مجلد -/۲

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

ایک مفید تاریخی مطالعہ، از خلیق احمد نظامی

قیمت غیر مجلد -/۸ مجلد -/۹

سفرنامۂ ابن بطوطہ

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان سیاح شیخ ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامہ کا ملخص اردو ترجمہ

قیمت مجلد ۲/۸

دہلی اور اس کے اطراف

از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ یہ فاضل مؤلف کا ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے جس سے دہلی اور اس کے آس پاس کے شہروں کے بارے میں آج سے ۶۵ سال پہلے کے نہایت مفید علمی و دینی اور ثقافتی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ قیمت -/۲

مختلف موضوعات پر قابل مطالعہ کتابیں

حجۃ اللہ البالغہ مترجم

شاہ ولی اللہ کی وہ لاثانی تصنیف جو اسلام کے پورے نظام کی گہری حکمتوں سے باخبر کرتی ہے۔ عربی متن مع ترجمہ دو جلدیں مجلد -/۲۰

التکشف عن مہمات التصوف

تصوف کی گہرائیاں جن پر سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے پردہ اٹھایا ہے۔

قیمت مجلد -/۱۲/ ۱۰

تعلیم ترجمۂ قرآن کا نصاب

رحمانی قاعدہ (عربی) -/۵/۶
" " (اردو) -/۵/۶
مفتاح القرآن اول -/۵/۶
" " دوم -/۶/۹
مفتاح القرآن سوم ۱/۲
" " چہارم ۱/۴
" " پنجم ۱/۸
معلم القرآن ۱/۴

بچوں کا کامیاب اردو دینی نصاب

اچھا قاعدہ ۳۰ آنے
اللہ کے رسول ۶ " "
حضرت ابوبکرؓ ۶ " "
حضرت عمرؓ ۶ " "
حضرت عثمانؓ ۶ " "
حضرت علیؓ ۶ آنے
اچھی باتیں ۶ حصے کامل ۲/۱۵
اچھے قصے ۶ آنے
حضرت خدیجہ ۸ آنے
حضرت سودہ ۴ " "
آسان فقہ ۶ آنے

سفر حج کے لیے بہترین کتابیں

آپ حج کیسے کریں؟ .... مجلد ..... -/۲
(تعارف ٹائٹل کے صفحہ ۲ پر ملاحظہ ہو)
احیاں الحجاج .... -/۴
فضائل حج ۲/۸
معلم الحجاج ۲/۱۲
رفیق حج ۱/۸
حج کا مسنون طریقہ ۱/۴
تجلیات کعبہ .... -/۲
تجلیات مدینہ ۲/۸
سفر حجاز۔ (از مولانا دریا بادی) -/۵
گلبانگ حرم۔ (زائر حرم حمید صدیقی کا روح پرور کلام ۳/۱۲

بچوں کی چند اور کتابیں

تعلیم الاسلام عکسی (از مفتی کفایت اللہ صاحبؒ) ہر چہار حصص -/۶/۱
سراپائے رسولؐ -/۱، ہمارے نبیؐ کے صحابہ -/۱، رسول اللہ کے دو محبوب -/۶/-

متفرق علمی و دینی کتابیں

فلسفہ کیا ہے (از ڈاکٹر میر ولی الدین) مجلد -/۲ غیر مجلد -/۱
عروج و زوال کا الٰہی نظام .... مجلد -/۳
کتاب الصلوٰۃ (از امام احمد بن حنبلؒ) مجلد ۱/۸
علامات قیامت .... " -/۸/-
سدّ باب ذریعہ (ایک فقہی بحث) ... " -/۱۰/-
مضامین مولانا احمد سعید دہلوی ۲/۸
علوم عرب غیر مسلموں کی نظر میں ۲/۸
مقالات سیرت، از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ۴/۸
مصباح اللغات (عربی اردو ڈکشنری) ..... -/۱۶
بیان اللسان .... مجلد -/۱۰
اردو عربی ڈکشنری .... -/۶
آئینۂ نماز .... -/۸/-
صلوٰۃ النساء .... -/۴/-
نصیحۃ المسلمین .... -/۵/-